# اٹھارہ سو ستاون

# 1857

سریندر ناتھ سین

# اٹھارہ سو ستاون

سریندر ناتھ سین

مقدمہ
ابوالکلام آزاد

مترجم
خورشیدہ پروین

پبلی کیشنز ڈویژن
وزارت اطلاعات و نشریات
حکومت ہند

پہلی بار : ۲۰۰۱ء
First Published : 2001

ATTHARA-SO-SATTAWAN
ISBN : 81-230-0958-5
قیمت : Price : Rs. 556.00

کمپوزنگ : افراح کمپیوٹر سنٹر، بٹلہ ہاؤس، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵

ناشر : ڈائریکٹر، پبلی کیشنز ڈویژن، وزارت اطلاعات و نشریات، حکومت ہند، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۱

## تقسیم کار : سیلز ایمپوریا، پبلی کیشنز ڈویژن

- ☆ پٹیالہ ہاؤس۔ تلک مارگ، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۱
- ☆ سپر بازار (دوسری منزل) کناٹ سرکس، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۱
- ☆ کامرس ہاؤس، کریم بھائی روڈ، بلارڈ پایر، ممبئی۔ ۴۰۰۰۳۸
- ☆ ۸۔ ایسپلینڈ ایسٹ، کلکتہ۔ ۷۰۰۰۶۹
- ☆ راجہ جی بھون، بسنت نگر، چنئی۔ ۶۰۰۰۹۰
- ☆ بہار سرکار کوآپریٹو بینک بلڈنگ، اشوک راج پتھ، پٹنہ۔ ۸۰۰۰۰۴
- ☆ نزد گورنمنٹ پریس روڈ، تریوندرم۔ ۶۹۵۰۰۱
- ☆ ۲۷/۶ رام موہن رائے مارگ، لکھنؤ۔ ۲۲۶۰۰۱
- ☆ اسٹیٹ آرکیالاجیکل میوزیم بلڈنگ، پبلک گارڈن، حیدر آباد۔ ۵۰۰۰۰۴
- ☆ پہلی منزل، ایف ونگ، کیندریہ سدن، کورامنگلہ، بنگلور۔ ۵۶۰۰۳۴

## سیلز ایمپوریا : پریس انفارمیشن بیورو

- ☆ سی۔ جی۔ او کامپلکس، اے ونگ، اے۔ بی روڈ، اندور
- ☆ ۸۰۔ مالویہ نگر، بھوپال۔ ۴۶۲۰۰۳
- ☆ بی۔ ۷/بی، بھوانی سنگھ روڈ، جے پور

Printed at : Akashdeep Printers, 20, Ansari Road, Darya Ganj, New Delhi-110002

# تعارف

ایس این سین کی کتاب اٹھارہ سو ستاون جو غدر کی پہلی صد سالہ برسی کے موقع پر شائع کی گئی، وہ بڑے بیانیہ کی اسی روایت کی کڑی ہے جسے انگریزوں نے انیسویں صدی میں قائم کیا تھا۔ یہ کتاب حکومت ہند کے ایما پر لکھی گئی تھی اور اسی نے اس کا سارا خرچ بھی برداشت کیا۔ دراصل اس وقت کے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد نے اس کے پہلے ایڈیشن کا پیش لفظ لکھتے ہوئے اس بات کی وضاحت کی تھی کہ کتاب کی اشاعت ایسے وقت کی جائے جو غدر کی پہلی صد سالہ برسی کا موقع ہو۔ یہ انہی کا خیال تھا۔ سین، جو ایک پیشہ ور معلم تھے اور جن کی مہارت خاص طور پر مراٹھا تاریخ میں تھی، سے اس تاریخ کو لکھنے کے لیے کہا گیا۔ یہ کتاب مورخ کی کسی اندرونی تحریک کی وجہ سے نہیں لکھی گئی۔

آزاد نے اپنے پیش لفظ میں ان باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو سین کو اس کتاب کو لکھنے سے پہلے بتائی گئی تھی۔ آزاد کا خیال تھا 'کہ اب وہ وقت آگیا ہے کہ 1857ء کی از سر نو تاریخ معروضی طور پر لکھی جائے۔'' یہ کتاب 'دستاویزی حیثیت' کی حامل ہوگی، جو صرف ''حقیقت اور حقیقت'' پر مبنی ہوگی۔ یہ کتاب ایک '' صحیح اور سچے مورخ کے نظریے'' سے لکھی جائے گی اور اس میں کسی قسم کی 'جذبات کو بھڑکانے' والی کوئی بات نہیں لکھی جائے گی۔ سین نے اپنے مقدمے میں انہیں خیالات کا اظہار کیا ہے۔ مقدمہ میں 'بالکل غیر متعصبانہ' اور 'خالص معروضی' جیسے خاص الفاظ ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ 1957ء میں بھی یہ بات تعجب خیز تھی کہ سین نے کس طرح سنجیدگی کے ساتھ مورخ کے معروضی مقصدیت کو حاصل کیا۔ پروفیسر شوبھان سرکار نے اس کتاب پر پہلے پہل تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

''تاریخ نویسی...... موجود حقائق کے ذخائر میں سے مصنف کے اپنے نظریے کہ 'کیا اہم ہے اور کیا غیر اہم ہے' کا انتخابی عمل ہے' یہ ایسی کوشش ہے جو مختلف واقعات کو ایک دھاگے میں پروتی ہے۔ ساتھ ہی ان واقعات سے ذہن میں جو نتائج برآمد ہوتے ہیں ان کا اظہار ہے۔ یہ ساری باتیں کسی نہ کسی اہمیت اور نظریے کی حامل ہوتی ہیں۔ وہ نظریہ جو مختلف تجربات اور ماحول میں پیدا ہوتا ہے۔ یہ سوچنا بھی محال ہے کہ کوئی مورخ ان باتوں سے اپنے کو الگ کر سکتا ہے۔''

حقائق میں کھو کر اور اس کے بعد بھی خالص معروضیت کے انداز نے سین کو اپنے دستاویزوں سے بہت قریب رہنے پر مجبور کیا۔ 1857ء کی ساری داستان زیادہ تر انگریزی میں ہے اور انگریز مصنفوں نے ہی اسے لکھا ہے۔ یہ اس وقت سرکاری ملازمت میں لگے برٹش افسروں کی

یادداشت یاایسے افسروں کے ذریعہ تیار کی گئی ان رپورٹوں' جو بغاوت کو فرو کرنے کے لیے تیار کی گئی تھیں' پر مبنی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی مخبروں کی اطلاعات اور ان کاموں میں ملوث بہت سے لوگوں کی گواہیاں' جو سب کی سب اس کالونیائی حکومت کے ذریعہ تیار کی گئی تھیں تاکہ بغاوت کو کچل کر اپنی حکومت اور طاقت کو استحکام بخشیں۔ سین کی کتاب 'اٹھارہ سو ستاون' پر لکھی گئی دوسری کتابوں کی طرح سے زیادہ تر آرکائیوز سے حاصل مواد پر مبنی ہے۔ اس کتاب کی خاص بات یہ ہے کہ کس طرح ان مسودوں اور دستاویزوں کے نظریے کو سین نے اپنے بیانیہ میں شامل کیا ہے۔ ایسے بھی مواقع آئے جن میں سین کے کسی خاص واقعے کا بیان' دوسرے انگریز مورخین سے مختلف نہیں رہا۔ اودھ کے باب میں ریزیڈنسی کے اندر پھنسے لوگوں کی مشکلات اور دقتوں کا بڑے ہمدردانہ انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ بلکہ ان بے چارے انگریزوں کی روزمرّہ کی زندگی کا بھی پوری تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ مصنف نے اس کے علاوہ ہیویلاک' کولن کیمبل اور ہیوروز کے جنگی نقشوں کی بھی پوری تفصیل دی ہے۔ یہاں پر اگر قاری باغیوں کی حرکات اور جنگی چالوں وغیرہ کے بارے میں کچھ تلاش کرنا چاہے تو اس کی کوشش بے سود ہوگی۔ سین نے بغاوت کی تاریخ ایسی لکھی ہے جس میں زیادہ تر باغی' جو بیانیہ کا موضوع بنتے' غائب ہیں۔

سین نے زیادہ تر 'Kaye' کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اس بغاوت کو انتظامیہ ڈویژن یا جغرافیائی خطوں کے حساب سے دیکھا ہے۔ بیانیہ کے مقصد سے اس کے اپنے کچھ خاص فوائد ہیں۔ لیکن اس سے ان واقعات پر روشنی ڈالنے میں ناکامی ہوئی جو ایک علاقے کے باغیوں کی سرگرمیوں اور دوسرے علاقے کے باغیوں کی سرگرمیوں کے درمیان پائے جانے والے روابط کی وضاحت کرتے۔ اس سے یہ بغاوت الگ الگ ٹکڑوں میں بٹی ہوئی نظر آتی ہے۔ جب کہ ایسا نہیں تھا' مثلاً اس طریقے پر چلتے ہوئے سین کسی خاص ربط کو تلاش کرنے میں ناکام رہے جو سپاہیوں کے باغی رجمنٹ میں پھیلی ہوئی تھی۔ اگر اُن کا سلسلہ وار واقعات کے پس منظر میں' نہ کہ جغرافیائی حدود میں' مطالعہ کیا جاتا تو ممکن تھا کہ گنگا کے دوآبے میں تحریک کی خاص شکل ڈھونڈی جاسکتی۔

سین نے جغرافیائی حدود میں بغاوت کے بارے میں تو لکھا لیکن اس سے پہلے ایک باب انہوں نے ان اسباب پر روشنی ڈالنے کے لیے بھی لکھا' جس کی وجہ سے یہ بغاوت پھیلی تھی۔ اس باب کا خاتمہ وہ اکثر دوہرائی گئی اس بات سے کرتے ہیں ''بغاوت کی آگ دھیرے دھیرے سلگ رہی تھی' صرف چربی والی گولی نے اسے اور بھڑکا دیا۔'' لیکن اس میں بھی دیر سے پکنے والے لاوے کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ جیسا کہ پروفیسر سرکار نے اپنے تبصرہ میں لکھا ہے' سین نے ایس بی چودھری کے اس مطالعہ کو جس میں ملک میں 1857ء سے پہلے انگریز مخالف تحریکوں کا ذکر ہے' بالکل نظرانداز کردیا ہے۔ سین نے کالونیائی سبقت اور ہندوستان کے استحصال سے بھی بغاوت کا کوئی سلسلہ نہیں جوڑا ہے۔ ان کے متن سے یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ شاید مصنف کو ہندوستان میں انگریزوں کے کیئے گئے کاموں سے کافی ہمدردی تھی۔ وہ برٹش حکومت کو ایک سماجی انقلاب کا داعی سمجھتے تھے کیونکہ وہ لوگ

''عورتوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کو کچھ ''دور کر رہے تھے۔''اور انہوں نے اس بات کی کوشش کی کہ ''قانون کی نگاہ میں سبھی برابر ہیں۔'' اور ''کسانوں اور کاشتکاروں کی زندگی بہتر'' بنانے کی کوشش کی۔ یہ باغی اس حکومت کے خلاف بغاوت کر رہے تھے جو ملک میں نئے ترقی پسند نظریات لا رہے تھے اور تنظیمیں قائم کر رہے تھے۔ وہ لوگ ''گھڑی کی سوئی کو واپس کرنا'' اور اس تحریک کو ختم کرنے کے لیے ''انقلاب لانا چاہتے تھے۔'' برٹش حکومت کا یہ تجزیہ ایک ایسے مورخ کے قلم سے' جو قومی دھارے میں پیدا ہوا ہو 'حیرت انگیز ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ وہ ان حقیقتوں سے بالکل ناواقف ہیں جو آر سی دت نے انگریز حکومت کی اقتصادی پالیسی کے خلاف لکھی تھیں۔

اس اندازِ فکر نے سین کو بار بار بیانات دینے پر مجبور کیا۔ انہوں نے صفحہ نمبر 351 پر یہ واضح طور پر لکھا'' 1857 کی جنگ کے پیچھے کوئی اخلاقی مسئلہ نہیں تھا۔'' تاہم صفحہ 353 پر وہ اس بغاوت کو ''مذہبی جنگ کی شروعات کا نام دیتے ہیں۔ مذہب کو کیسے انہوں نے اخلاقی پہلو سے جدا کیا' یہ واضح نہیں ہے۔ پورے شمالی ہند میں سپاہی اور عام رعایا سبھی برٹش حکومت کی دھرم میں مداخلت کی پالیسی سے خوفزدہ تھے۔ لفظ دھرم 'مذہب کے وسیع تر معنوں میں استعمال ہوتا ہے کیونکہ یہ ایک طرزِ زندگی کا بھی نام ہے۔ تمام روایتی عبادات کے طریقوں اور رسوم کے خلاف اپنائی گئی پالیسی سے لوگوں میں حد سے زیادہ خوف وہراس پیدا ہو گیا' اور انہوں نے اپنی روایات اور طرزِ زندگی کے بچاؤ کے لیے اسلحے اٹھا لیے۔ باغیوں کی طرف سے جاری کئے گئے ہر اشتہار اور فرمان میں جن میں سے کچھ کا استعمال خود سین نے بھی کیا ہے' مذہبی روایات کی خلاف ورزی کا خاص طور پر تذکرہ کیا گیا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ باغیوں نے اپنی ناکامی کے جو اسباب بیان کئے اس میں بھی اخلاقی پہلو پر خاص توجہ دی گئی۔

ایسا شبہ ہوتا ہے کہ سین اپنے اس اعتقاد کی بدولت' کہ بغاوت 'انتہاپسندی اور جدیدیت کے خلاف تھی' سے ہی یہ نتیجہ اخذ کر لیا ہو کہ اس میں کوئی اخلاقی جواز نہیں تھا اور نہ ہی اس کا کوئی منظم پروگرام تھا۔ تاریخی تجزیے کا آسان راستہ اپناتے ہوئے وہ ماقبل جدید اور ماقبل سیاسی تحریک کو اچانک پھوٹنے والے اشتعال کی سطح پر لے آئے ہیں' جہاں شعوری طور پر یا نظریات کا کوئی اہم رول نہیں ہوتا ہے۔ انہوں نے شعوری یا لاشعوری طور پر سیاست اور نظریات کو بورژوا سیاست اور بورژوا آئیڈیالوجی' خصوصاً قومیت کو اس سے جوڑ دیا ہے۔ سین اتنے ماہر امپریسسٹ (تجربے پر زور دینے والے) ہیں کہ وہ اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ ''یہ باغی ایک غیر ملکی حکومت سے پیچھا چھڑانا چاہتے تھے۔'' لیکن باغیوں کی یہ خواہش کہ ''وہ پرانے نظام کو پھر سے بحال کر دیں جس کا قانونی نمائندہ دلی کا بادشاہ تھا۔'' ان کے جدید اور ترقی پسندی کے نظریے سے مطابقت نہیں رکھتا۔ اس کو غدر' بغاوت' آزادی کی جنگ یا زمینداروں کی مقابلہ آرائی کا نام دینے میں لوگ اس قدر پیش پیش تھے کہ یہی مباحثہ اس صد سالہ تقریب کے دوران چلتا رہا۔ یہ وہ نام تھے جنہیں 1857 تک کے مورخوں نے اسٹوکس کے وقت تک اپنا موضوع بنایا۔ اور جس پر تفصیلی مقالے

لکھے گئے۔ اسٹوکس نے اوپری اور وسط دو آبہ کے علاقے پر زور دیتے ہوئے یہ بحث کی کہ "دیہی علاقوں میں سیاسی وفاداری کا خاص تعلق اس نازک وقت میں انگریزوں کی مالگزاری کی پالیسی سے پیدا ہوا تھا اور اس کا اثر زمین کی ملکیت پر مختلف علاقوں میں پڑا تھا۔ 1881ء میں وقت سے پہلے ہوئی ان کی موت کی وجہ سے ان کا کام ادھورا رہ گیا۔ ان کی مداخلت نے کم سے کم اس کو بغاوت کا نام دیئے جانے کے مسئلہ سے لوگوں کی توجہ ہٹادی تھی۔ اس نے سماج کی بناوٹ' دیہی سماج میں پائی جانے والی دراڑوں اور لیڈر یا رہبر کے پُرکشش کردار کی طرف لوگوں کی توجہ دلائی تھی۔ اس بغاوت کو ایک خوردبین کی نگاہ سے دیکھنے کے سبب مختلف علاقوں میں جو بندھن کا دھاگا موجود تھا' وہ نظرانداز ہوگیا۔ یقیناً اسٹوکس کا خیال کہ بغاوت میں کوئی خاص جواز نہیں شامل تھا' اس لیے اس کی کوئی عام تعریف بھی نہیں کی جاسکتی۔

ایرک اسٹوکس کے مضمون کی اشاعت کے بعد 1857ء کے بارے میں جو کچھ بھی تحریر کیا گیا' ان پر اس کا خاص اثر نمایاں دکھائی دیتا ہے کہ کالونیائی پالیسی اور مادی ماحول میں آپس کے ربط کا کیا خاص اثر پڑا اور کسی خاص علاقے میں بغاوت کے واقعات کس طرح سے ہوئے۔ اسٹوکس کے اس طریقۂ کار سے بھی ایک جیسے نتائج پر نہیں پہنچا جاسکا۔ تاہم منصوبہ بنانے' آپسی ربط پر زور دینے اور آئیڈیالوجی پر خاصی توجہ دی گئی۔ مورخین اپنی تلاش کے دوران جن دستاویزوں کو حاصل کرسکے' ان کی بدولت ان امور پر توجہ کرنے پر مجبور ہوئے۔ اس کے علاوہ ان کاموں پر عمومی اثرات بھی پڑے۔

80 کے ابتدائی سالوں میں کسان اور عوامی بغاوت کے تجزیے میں ایک نیا موڑ آگیا جو سبالٹم اسٹڈیز (Subaltem Studies) اور رنجیت گوہا کی 'Elemntary of Pleasant Insurgency in Colonial India' کی اشاعت سے پیدا ہوا۔ اب عام آدمی کی سیاست اور رویئے کو سمجھنے کی کوشش کی طرف زیادہ توجہ کی گئی بہ نسبت چنندہ لوگوں کے۔ 1857ء کے مورخوں کے لیے مطالعہ کا یہ رُخ بھی کافی پریشان کن رہا۔ جن دستاویزوں پر اسے تجزیہ کرنا تھا وہ سب زیادہ تر انگریزوں کی لکھی ہوئی تھیں۔ باغیوں کی طرف سے جو واحد مواد اس سلسلہ میں دستیاب ہوا وہ صرف باغی لیڈران کے اشتہارات ہیں۔ اس طرح 1857ء کی بغاوت اپنی تاریخ کے بغیر ہی رہ گئی۔

1857ء کا مورخ ہی اکیلے اس پریشانی سے دوچار نہیں ہے بلکہ یہ مسئلہ ان لوگوں کا بھی رہا ہے جنہوں نے کسانوں کی بغاوت کے بارے میں لکھا ہے۔ مؤخرالذکر کے بارے میں لکھتے ہوئے رنجیت گوہا نے مشورہ دیا ہے اور انہوں نے اس سلسلہ میں ایک مخصوص راستہ بھی اپنایا ہے۔ گوہا لکھتے ہیں: "ہم بغاوت کے اسباب کو کیسے سمجھ سکتے ہیں جب کہ ہمارے سامنے سارا مواد اس بغاوت کو فرو کرنے کے بارے میں کئے جانے والے اقدامات سے ہی وابستہ ہے۔ کیونکہ بغاوت کو کچلنے کی کوشش جو براہِ راست بغاوت کی پیدا کردہ ہے اور جو اسے کچلنے کی کوشش سے متاثر ہوتی رہی' یہ

سب جاننا از حد ضروری ہیں۔ لیکن اس پر کوئی تشفی بخش مطالعہ اس وقت تک نہیں کیا جاسکتا جب تک باغی لیڈروں کو اس میں شامل نہ کیا جائے۔ یہ صحیح ہے کہ رپورٹ 'مراسلے' ضابطے' فیصلے' قوانین اور خطوط جن میں پولیس 'فوجی' حکام 'زمیندار' ساہوکار وغیرہ جو بغاوت کے مخالف تھے' اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں اور جسے ان کی خواہشات کی نمائندگی کا نام دیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ سارے دستاویز صرف اس خواہش سے ہی اپنا مواد حاصل نہیں کرتے کیونکہ یہ سب ایک دوسری خواہش پر مبنی ہیں' اس لیے جو دستاویزات دستیاب ہیں ان میں باغیوں کی خواہشات کو دریافت کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

بغاوت کو کچلنے سے متعلق دستاویزات اور خواہشات خود اپنی فطرت میں باغیوں کی سرگرمیوں اور ان کے حرکات و سکنات بلکہ بعض اوقات ان کے منصوبے اور ان کے مباحثے کو ریکارڈ کرنے پر مجبور ہیں۔ چونکہ یہ سارے مواد انگریزوں کی مدد کے لیے کہ وہ بغاوت کو کچل سکیں' لکھے گئے تھے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ بغاوت کے اسباب کے بارے میں بھی وثوق کے ساتھ لکھا جاتا۔ باغیوں کے بارے میں جو کچھ بھی لکھا گیا ان کا مقصد ان کے غیر اخلاقی' غیر قانونی ناپسندیدہ افعال اور وحشی پن کے بارے میں زور دینا تھا۔ گویا جس بات کی طرف اشارہ کررہے ہیں وہ صرف لسانیاتی مطالعہ کی ایک مشق بھر ہے' وہ تاریخی مواد جسے حکمراں طبقے نے اپنے مفاد کے لیے تیار کرایا اور ان کی حفاظت کی' انہیں اس پس منظر کے ساتھ پڑھا جانا چاہیے جو ان سے پیدا ہوئے۔ اور جن کا تعلق ان سے تھا جس پر حکومت کی جارہی تھی۔

کسانوں کی بغاوت کے بارے میں کئے گئے خود گوہا کے کام سے یہ روشنی پڑتی ہے کہ یہ طرز مطالعہ کتنا سود مند ہے' اور 1857ء کے بارے میں اب جو کچھ لکھا جارہا ہے وہ مواد کے اسی تنقیدی مطالعے کی بدولت ہے۔ تاہم بغاوت کی اہمیت اور اس میں شریک لوگوں میں جو دشمنی پیدا ہوئی اور مورخین جو کچھ بھی تلاش کررہے ہیں وہ ناکافی رہتا ہے اگر ہم گوہا کی 'بغاوت کو کچلنے' سے متعلق تحریر کا مطالعہ کریں۔ باغیوں کی طرف سے دی گئی تفصیلات سے تاریخ کی تشکیل نو پر کافی فرق پڑگیا ہوتا' کیونکہ سارا مواد برٹش مفاد میں تیار کیا گیا تھا۔ اس لیے بغاوت کی تاریخ بھی کافی محدود ہو جاتی ہے۔

ان سب باتوں کا بیان اس لیے ضروری ہو جاتا ہے تاکہ سین کی کتاب پر سختی سے محاکمہ کیا جاسکے۔ سین نے ایک دیئے گئے تاریخی پس منظر میں کام کیا ہے اور جس وقت انہوں نے کام کیا یہ مطالعاتی تجزیہ حاصل نہیں تھا۔ سین کی کتاب سے نئی روشنی بھلے ہی نہ پڑتی ہو لیکن انہوں نے صرف ایک جلد میں بہت زیادہ مواد سمیٹ لیا ہے۔ اور شاید ان کی یہ کتاب اس موضوع پر جامع کتابیات کا احاطہ بھی کرتی ہے۔ بغاوت کے بارے میں ایک جلد میں بہت سی مقبول کتابیں لکھی گئی ہوں گی' لیکن سین نے جو کچھ بھی دیا ہے ابھی تک کوئی ان سے آگے نہیں جاسکا ہے۔

**رُدرانگھشو مکھرجی**

# مقدمہ

آج سے تقریباً پانچ سال قبل انڈین ہسٹاریکل ریکارڈس کمیشن (Indian Historical Records Commission) کے سالانہ اجلاس میں، میں نے 1857 'کی جسے عام طور پر سپاہیوں کی بغاوت کا نام دیا جاتا ہے،' کی از سرنو تاریخ لکھے جانے پر زور دیا تھا۔ اس وقت بھی مجھے اس بات کا پتہ تھا کہ اس موضوع پر بہت سی چھوٹی بڑی کتابیں لکھی جاچکی ہیں 'اگر ہم ان میں سے صرف مشہور تاریخ دانوں کی کتابوں کو ہی لیں تو ان کی تعداد بھی کافی زیادہ ہے۔ اس کے باوجود مجھے محسوس ہوا کہ ابھی تک اس عظیم جدوجہد کی کوئی معروضی تاریخ نہیں لکھی گئی ہے۔ جتنی بھی کتابیں لکھی گئی ہیں وہ سب انگریزوں کے نقطہ نگاہ کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہیں۔

ایک عرصے تک اس عظیم جدوجہد کی مقصدیت کو لے کر پورے ہندوستان میں اور باہر بھی عجیب طرح کا تنازعہ بنا رہا۔ اس موضوع پر جتنی بھی کتابیں لکھی گئی ہیں ان سب میں اسے قانون کے مطابق ہی اس وقت کی حکومت کے خلاف ہندوستانی فوج کی بغاوت کا نام دیا گیا ہے۔ انھوں نے یہ تو مانا کہ کچھ ہندوستانی رجواڑوں نے بھی بغاوت کا ساتھ دیا لیکن یہ ایسی حکومتیں تھیں جنھیں لارڈ ڈلہوزی کے ذریعہ قبضہ کیے جانے کی وجہ سے شکایتیں پیدا ہو گئی تھیں۔ ایسے مورخین کا کہنا ہے کہ برٹش حکومت جو اس وقت ملکہ کی قانونی اور جائز حکومت تھی،' اس نے بغاوت کو فرو کر دیا اور دوبارہ قانون کی حکومت قائم کر دی۔

اس موضوع پر جتنی بھی کتابیں لکھی گئی ہیں ان سب میں 1857 کے واقعات کو اسی طریقے سے بیان کیا گیا ہے اور اسے کسی دوسرے نقطہ نگاہ سے سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ تاہم یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا جائز حق صرف اتنا ہی تھا کہ وہ مغل شہنشاہ کے دیوان یا ایجنٹ کی حیثیت سے بنگال' بہار اور اڑیسہ کی مالگزاری وصول کرے۔ اس کے بعد سے کمپنی نے جن علاقوں کو حاصل کیا وہ فوج کی فتح کی وجہ سے،' لیکن کہیں بھی کمپنی نے شہنشاہ کی ملکیت اور علاقائیت کے اختیار کو چیلنج نہیں کیا اور جب فوج نے کمپنی کے ان حقوق کو ماننے سے انکار کر دیا تو اس نے شہنشاہ سے اس بات کے لیے اپیل کی۔ اس لیے یہ بحث کا موضوع بن سکتا ہے کہ کیا ہندوستانی افواج کی بغاوت کو ملک کی مستحکم حکومت کے خلاف بغاوت یا غداری کا نام دیا جا سکتا ہے؟ یہ بھی بتانا ضروری ہے کہ جہاں زیادہ تر مصنفین نے ہندوستانی عوام اور خواص کے ذریعہ یوروپین مرد عورت اور بچوں پر کیے گئے مظالم کو بہت تفصیل سے بیان کیا ہے،' وہاں بہت کم لوگوں

نے اتنی ہی تفصیل سے ہندوستانیوں پر کیے گئے انگریزوں کے مظالم کو بیان کیا ہے۔

میرا اپنا خیال ہے کہ بیسویں صدی کی ابتداء میں اس بغاوت کے سلسلہ میں تین جلدوں پر مشتمل جو تاریخ لکھی گئی، اس کا ذکر ضروری ہے۔ یہ تاریخ بھی مکمل طور پر انھیں دستاویزوں پر مشتمل ہے جو امپیریل ریکارڈس ڈیپارٹمنٹ کے آرکائیوز میں موجود تھی اور جسے اب نیشنل آرکائیوز آف انڈیا کا نام دیا گیا ہے اور یہ ایک عام بات ہوگئی ہے کہ پچاس سال کے بعد سبھی سرکاری دستاویزوں کو ریسرچ اسکالر کو دکھادیا جاتا ہے۔ یہ بات بھی یونائیٹڈ برٹین کے اس فیصلے کے بعد رائج ہوئی جو نپولین سے جنگ کے بعد برٹش حکومت نے کیا تھا اور یوروپ کے دوسرے ممالک نے بھی یہی رویہ اختیار کیا۔ 1907 میں ہندوستانی بغاوت کے پچاس سال پورے ہوئے اور شاید اس وقت کی حکومت نے محسوس کیا کہ 1857 کی تاریخ سرکاری دستاویزوں کو لے کر لکھی جائے جو اب ریسرچ کے لیے سبھی کو حاصل ہونے والی تھی۔

یہ تاریخ بھی اگرچہ آفیشیل ریکارڈ پر مبنی ہے اور اسی طرح سے اس جدوجہد کو بیان کرتی ہے جس طرح انگریزی مصنفین کی لکھی ہوئی کتابیں۔ اس کتاب کی اشاعت میں صرف ایک نیا پہلو سامنے آیا ہے۔ مصنف نے واضح طور پر اظہار کیا ہے کہ جہاں تک اودھ کا تعلق تھا یہاں کی جنگ میں قومی سطح پر بغاوت کے آثار پائے جاتے تھے۔ حال ہی میں کمپنی نے ایک ہندوستانی بادشاہ سے بہت کچھ چھینا تھا اور عوام اس حملے کے زبردست مخالف ہوگئے تھے۔ اور اس لیے وہ کمپنی کے خلاف بغاوت کرنے کو اپنا جائز حق سمجھتے تھے کیونکہ کمپنی نے اودھ کے ساتھ ناانصافی کی تھی۔ تاہم اودھ کی بغاوت میں قومی پیمانے پر بغاوت کی چنگاری کا پایا جانا کوئی نیا انکشاف نہیں تھا کیونکہ لارڈ کیننگ نے بھی اپنے سرکاری مراسلوں میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اودھ کی جدوجہد ایک طرح سے قومی پیمانے کی مزاحمت تھی۔ اس لیے کتاب ہٰذا کے مصنف کو ان باتوں کو دہرانے میں کوئی قباحت نہیں ہوئی، جس کا اعتراف خود لارڈ کیننگ پہلے کر چکا تھا۔ مصنف نے یہ بھی کہا ہے کہ شاید اودھ کے تعلقداروں کے ساتھ اودھ پر قبضے کے بعد جو رحم دلی دکھائی گئی تھی غالباً وہ اسی حقیقت کے اعتراف میں تھی۔

جیسا کہ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں میں نے محسوس کیا کہ اب وقت آگیا ہے کہ 1857 کی تحریک کی ایک نئی اور معروضی تاریخ لکھی جائے۔ 1954 کے موسم خزاں میں میرا ذہن اس موضوع کی طرف دوبارہ متوجہ ہوا اور میں نے محسوس کیا کہ بغاوت کے صد سالہ جشن کے دوران ہی وہ مناسب موقع ہوگا جب اس کی نئی اور عالمانہ تاریخ لکھی جائے۔ بغاوت کی پہلی چنگاری 10 مئی 1857 کو پھوٹی تھی، اس لیے 10 مئی 1957 ہی وہ نیک ساعت ہوگی جب اس جدوجہد کی مکمل اور جامع تاریخ شائع کی جائے۔

## II

مجھے اس بات کا احساس ہے کہ اب ان واقعات کو معروضی طریقے پر، جس نے ماضی میں

جذبات کو بہت زیادہ مشتعل کر دیا تھا، تفصیل سے لکھنا مشکل کام ہے اور کسی ایک شخص کے لیے یہ آسان بھی نہیں کہ وہ اس میں توازن برقرار رکھ سکے کیوں کہ وہ خود بھی ذاتی رنگ و نسل اور قومیت کے جذبے سے متاثر ہوتا ہے، تاہم اس کی لگاتار کوشش جاری رہنی چاہیے اگر وہ صحیح معنوں میں مورخ بننا چاہتا ہے۔ مجھے اس بات کا بھی اعتراف ہے کہ ہندوستان کی آزادی سے قبل اس تحریک کی معروضی تاریخ لکھنا اور بھی مشکل کام تھا۔ اب آج اس کام کو آسان بنانے والے دو اہم محرکات ہیں۔ جن واقعات کو اب بیان کرنا ہے وہ سو سال پہلے وقوع ہوئے تھے، ان کے ساتھ اس وقت جو جذبہ کارفرما تھا، وہ اب تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ اب ہم خاص کرداروں کی نفرتوں اور کشمکش کا آسانی سے مطالعہ کر سکتے ہیں کیونکہ اب انھیں کافی وقت گزر چکا ہے۔ اس کے علاوہ ان واقعات سے سیاسی فائدہ اٹھانے کا لالچ بھی اب ختم ہو چکا ہے۔ ہندوستان اور برطانیہ کے درمیان سیاسی مسئلہ حل کر لیا گیا ہے اور یہ مسئلہ بات چیت اور معاہدوں کے ذریعے حل کیا گیا ہے۔ جس سے دونوں ملکوں کے درمیان خیر سگالی کا نیا رشتہ بنا ہے۔ وہ تلخیاں جو ماضی میں ہندوستان اور برٹش تعلقات کے درمیان پائی جاتی تھیں اب ختم ہو گئی ہیں۔ آج کے حالات ایسے ہیں کہ 1857 کے واقعات بغیر کسی تعصب کے معروضانہ طریقے پر بیان کیے جا سکتے ہیں اور اس بات کی کوئی ضرورت نہیں کہ جدوجہد میں شامل کسی ایک پارٹی کی غلطی کو معاف کیا جائے اور دوسرے میں غلطی نکالی جائے۔

یہ بھی غور طلب بات ہے کہ اس زمانے کے کسی بھی ہندوستانی نے کوئی ایسی بات تحریر نہیں کی جسے ہندوستانی نقطہ نگاہ سے جدوجہد کی تفصیلات کا نام دیا جا سکے۔ لیکن جب ہم اس مسئلہ پر غور کرتے ہیں تو ہمیں یہ بات حیرت انگیز بھی نہیں لگتی۔ ہم جانتے ہیں کہ بہت زیادہ پُر تشدد طریقے سے اس جدوجہد کو کچلا گیا تھا اور کئی سالوں تک ہندوستان میں دہشت کا ماحول بنا رہا۔ بغیر مقدمہ چلائے سیکڑوں آدمیوں کو پھانسی دی گئی تھی۔ شمالی ہند کا شاید ہی کوئی ایسا علاقہ ہو جہاں پر رسیوں سے بندھی لاشیں نہ لٹکتی رہی ہوں۔ وہ عوام کو یہ یاد دلاتی رہیں کہ حکومت ایسے انتقام لیتی ہے۔ اس لیے کسی ہندوستانی کے اندر اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ 1857 کے واقعات کے بارے میں آزادانہ طریقے پر کچھ بول سکے یا لکھ سکے۔ کچھ ایسے ہندوستانیوں نے جو انگریز حکومت کے حمایتی یا ملازم تھے، انھوں نے چند تفصیلات ضرور چھوڑی ہیں لیکن کوئی بھی ایسا شخص جو نڈر ہو کر ان کے بارے میں لکھنا چاہتا، اس کے اندر ایسی ہمت نہیں تھی۔

ہندوستانی ذہن کس طرح تشدد سے خوفزدہ تھا، اس کی مثال صرف ایک شخص مرزا معین الدین سے دی جا سکتی ہے۔ وہ بغاوت کے وقت دلی کے مضافات میں پولیس کے سب انسپکٹر تھے۔ وہ فارس بھاگ گئے اور دو سال کے بعد واپس آئے۔ سر مٹکاف کے کہنے پر، جس کی زندگی اس نے بغاوت کے وقت بچائی تھی، انھوں نے اپنے تجربات پر مبنی کچھ واقعات کو قلم بند کیا، لیکن یہ مسودہ انھوں نے مٹکاف کو اس شرط پر دے دیا کہ جب تک وہ زندہ ہیں، اسے شائع نہ کیا جائے۔ ان کے

اس مسودے میں سرکار کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں ملتا۔اس میں انھوں نے ان حالات سے نبٹنے میں کیارول ادا کیا' صرف اسی کی تفصیل ملتی ہے۔اس وقت بھی ان کے دماغ پر اتنا خوف طاری تھا کہ صرف مندرجہ بالا شرائط کے تحت ہی انھوں نے سر مٹکاف کو اپنا مسودہ دیا جس نے ان سے کیے گئے وعدے کا لحاظ کیا اور معین الدین کی موت کے بعد ہی اس نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کرایا۔ یہ کتاب مٹکاف کی زندگی میں بھی شائع نہیں ہو سکی۔

## III

یہ سوال اکثر کیا جاتا ہے کہ اس بغاوت کے لیے کون لوگ ذمہ دار تھے۔اس طرح کا مشورہ دیا گیا ہے کہ کچھ ایسے لوگ تھے جنھوں نے مل کر منصوبہ بنایا اور ایسی اسکیم وضع کی جس کے تحت اس تحریک کی ابتدا ہوئی تھی۔ میں اس بات کا اعتراف ضروری سمجھتا ہوں کہ اس پہلو پر مجھے شک ہے کیونکہ غدر کے زمانے میں اور اس کے بعد بھی برٹش حکومت نے اس بات کی بہت زیادہ تفتیش کی تھی کہ اس بغاوت کے اسباب کیا تھے۔لارڈ سیلس بری نے ہاؤس آف کامنس میں یہ بیان دیا تھا کہ وہ اس بات کو قبول کرنے کے لیے قطعی تیار نہیں کہ اتنے وسیع پیمانے پر پھیلی اتنی طاقت ور تحریک صرف چربی ملی گولی کو لے کر پیدا ہوئی تھی۔انھیں یقین تھا کہ جو کچھ سطح پر نظر آتا ہے اس کے پس پشت کچھ اور بھی باتیں تھیں۔ حکومت ہند اور پنجاب کی حکومت نے بھی اس سوال کا مطالعہ کرنے کے لیے بہت سے کمیشن بنائے۔اس زمانے میں پھیلی سبھی افواہوں کا بغور مطالعہ کیا گیا۔ایک کہانی یہ بھی مشہور ہوئی تھی کہ چپاتیوں کے اندر رکھ کر اطلاعات بھیجی گئیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی ایک پیشین گوئی تھی کہ ہندوستان میں برٹش حکومت کا خاتمہ جون 1857 میں پلاسی کی جنگ کے سو سال پورا ہونے پر ہو جائے گا۔بہت زیادہ تفتیش اور جانچ پڑتال کے بعد بھی اس کا کوئی ثبوت نہیں ملا کہ یہ بغاوت پہلے سے منصوبہ بند تھی اور یہ کہ فوج اور ہندوستانی عوام اس سازش میں مشترکہ طور پر شامل تھے کہ وہ کمپنی کی حکومت کو اکھاڑ پھینکیں۔ میرا یہی خیال ایک زمانے سے تھا اور بعد میں اس سلسلہ میں جو بھی ریسرچ کی گئی اس سے کوئی نئی حقیقت ایسی سامنے نہیں آئی جس سے میرے خیالات میں کوئی تبدیلی ہو سکے۔

بہادر شاہ ظفر مقدمے میں اس بات کی کوشش کی گئی کہ یہ ثابت کیا جا سکے کہ وہ پہلے سے سوچی سمجھی سازش میں شامل تھے۔جو بھی گواہیاں پیش کی گئیں' ان سے وہ برٹش حکمراں بھی مطمئن نہیں ہو سکے جو مقدمہ چلا رہے تھے اور اس طرح کی افواہوں کو ہر ذی شعور آدمی صرف افواہ سمجھنے پر مجبور ہے' بلکہ مقدمے کے دوران بھی صرف یہی بات سامنے آئی کہ تحریک سے نہ صرف خود بہادر شاہ بلکہ انگریز بھی حیرت میں پڑ گئے تھے۔

## IV

اس صدی کے ابتدائی سالوں میں کچھ ہندوستانیوں نے بھی اس جدوجہد کے بارے میں

لکھا ہے۔ لیکن اگر یہ بات کہی ہو تو ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ جو بھی کتابیں انھوں نے لکھی ہیں، وہ تاریخ نہیں ہیں بلکہ سیاسی پروپیگنڈہ ہیں۔ ان کے مصنفین نے اس جدوجہد کو ہندوستان کی آزادی کی منصوبہ بند جنگ کا نام دیا ہے جسے ہندوستانی امرا نے برٹش حکومت کے خلاف چلایا تھا۔ انھوں نے چند افراد کو اس بغاوت کو منظم کرنے کا بھی ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ یہ کہا گیا کہ ناناصاحب جو پیشوا باجی راؤ کا جانشین تھا، اس نے تمام ہندوستانی فوجی تنظیموں سے تعلقات استوار کر کے اس کا منصوبہ بنایا تھا۔ اس کے ثبوت میں انھوں نے یہ کہا ہے کہ ناناصاحب لکھنؤ اور انبالہ مارچ اور اپریل 1857 میں گئے تھے اور اس کے بعد مئی 1857 میں اس جدوجہد کا آغاز ہوا۔ صرف اتنی سی بات کو اس بات کے لیے وافر ثبوت نہیں مانا جاسکتا۔

اس طرح کے خیالات کس قدر بے بنیاد اور افواہ پر مبنی ہیں، یہ اس وقت واضح ہو جاتا ہے جب اس طرح کے مورخین اودھ کے وزیر علی نقوی خاں کو اس جنگ کے لیے خاص سازش کرنے والا بتاتے ہیں۔ جس کسی نے بھی اودھ کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے وہ اسے حد سے زیادہ مضحکہ خیز سمجھے گا کیونکہ علی نقی خاں ایسٹ انڈیا کمپنی کے پٹھو تھے۔ یہ وہی شخص تھا جس پر انگریزوں نے اعتماد کر کے انھیں واجد علی شاہ کو اس بات کے لیے تیار کرنے کو کہا تھا کہ وہ اپنی حکومت کو اپنی مرضی سے انگریزوں کے سپرد کر دیں۔ بلکہ برٹش ریزیڈنٹ جنرل آوٹ رام نے علی نقی خاں سے یہ بھی وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ اپنے مشن میں کامیاب ہو گئے تو انھیں بہت زیادہ انعام و اکرام سے نوازا جائے گا۔ علی نقی خاں اپنے اس منصوبے کے لیے اس طرح سے جی توڑ کوشش کر رہے تھے کہ واجد علی شاہ کی ماں کو یہ خوف پیدا ہوا کہ اس طرح کسی بہانے سے وہ تخت حاصل کر لے گا۔ اس لیے انھوں نے حکومت کی مہر کو فوری طور پر اپنے قبضے میں کر لیا اور زنان خانہ میں اسے رکھا اور یہ حکم جاری کر دیا کہ ان کی اجازت کے بغیر یہ کہیں نہیں جاسکتی۔ یہ ساری باتیں لکھنؤ کے عوام کو معلوم تھیں اور اسی لیے وہ علی نقی خاں کو غدار کی حیثیت سے دیکھتے تھے۔ اس لیے یہ کہنا کہ ایسا شخص بغاوت کے پس پردہ سب سے بڑا سازشی تھا، بالکل ہی غلط ہو جاتا ہے۔

یہ بھی کہا گیا کہ منشی عظیم اللہ خاں اور رنگو باپو جی دونوں نے مل کر اس بغاوت کا منصوبہ بنایا تھا۔ عظیم اللہ خاں، ناناصاحب کا ایجنٹ تھا اور ناناصاحب نے اپنے مقدمے کی پیروی کے لیے انھیں لندن بھیجا تھا تاکہ وہ ان کے لیے وہ پنشن حاصل کر سکے جو باجی راؤ کو دی جارہی تھی۔ ہندوستان واپس آنے سے پہلے وہ ترکی گئے جہاں کریمیا کی جنگ میں ان کی ملاقات عمر پاشا سے ہوئی۔ اسی طرح رنگو باپو جی بھی ڈلہوزی کے فیصلے کے خلاف، جس کے مطابق ستارہ کو برٹش حکومت میں شامل کر لیا گیا تھا، اپیل کرنے کے لیے گئے ہوئے تھے۔

صرف اتنی سی بات کو کہ وہ الگ الگ مقاصد کے تحت لندن گئے تھے، یہ مان لیا گیا ہے کہ ان دونوں نے مل کر وہاں اس طرح کی سازش رچی۔ یہاں یہ بات بالکل صاف ہونی چاہیے کہ اس طرح کی قیاس آرائیوں کو شہادت نہیں مانا جاسکتا۔ اور اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ ان باتوں پر

انھوں نے لندن میں کوئی بات بھی کی تو اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ اس بغاوت کے وہی محرک تھے، جب تک کہ ہندوستان میں بعد میں ہونے والے واقعات کا سلسلہ ان سے نہ مل جائے۔ ایسے رشتوں کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ کسی ریکارڈ یا گواہی کی عدم موجودگی میں ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس بغاوت کے لیے انھوں نے کوئی سازش رچی تھی۔ کانپور کے نزدیک بٹھور پر قبضہ ہونے کے بعد انگریزوں نے نانا صاحب کے سبھی کاغذات اپنے قبضہ میں کر لیے تھے۔ ان کاغذات میں ایک خط عمر پاشا کے نام بھی تھا جو انھیں کبھی نہیں بھیجا گیا۔ اس خط میں انھیں اطلاع دی گئی تھی کہ ہندوستانی فوجیوں نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کر دی ہے۔ نہ تو اس خط میں اور نہ عظیم اللہ خاں کے دوسرے کاغذات میں ایسا کوئی اشارہ ملتا ہے جس میں یہ کہا گیا ہو کہ انھوں نے اس بغاوت کے لیے کوئی سازش کی تھی۔

جو بھی ثبوت موجود ہیں ان سے ہم اس نتیجہ پر پہنچنے کے لیے مجبور ہیں کہ 1857 کی بغاوت نہ تو کسی منصوبہ بند سازش کا نتیجہ تھی اور نہ ہی اس کے پیچھے کوئی سازشی دماغ کام کر رہا تھا۔ جو کچھ بھی ہوا وہ صرف اتنا کہ کمپنی کی سو سالہ حکومت کے دوران ہندوستانی عوام اس سے ناراض ہو چکے تھے کیونکہ کمپنی نے شروع میں یہ عمل دخل نواب یا شہنشاہ کے نام پر دینا شروع کیا اور بہت دنوں تک ہندوستانیوں کو یہ محسوس ہی نہیں ہو سکا کہ غیر ملکی لوگوں نے یہاں کا اقتدار حاصل کر لیا ہے۔ اور جب انھیں یہ احساس ہوا کہ خود اپنے ملک میں انھیں غلام بنالیا گیا ہے تو ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ وہ اس کے خلاف آواز اٹھا سکیں۔

## V

اگر یہ پوچھا جائے کہ اس بغاوت کے پھیلنے میں سو سال کی مدت کیوں لگی؟ تو اس کا جواب مندرجہ ذیل حقائق میں مل جائے گا۔ ہندوستان میں برٹش طاقت کے فروغ جیسی کوئی دوسری مثال تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ یہ کسی ایک ملک کے ذریعہ کسی دوسرے ملک پر فوری طور پر فتح پا کر قابض ہونے کا معاملہ نہیں ہے بلکہ کسی ملک میں دھیرے دھیرے داخل ہونے کی کہانی ہے جس میں خود ملک کے عوام نے حملہ آوروں کی مدد کی۔ یہ حقیقت بھی کہ انگریزوں نے فتح برٹش تاج کے نام پر نہیں حاصل کی اور اس وجہ سے وہ اپنے اصل مقصد پر پردہ ڈالنے میں کامیاب ہو گئے۔ اگر برطانیہ کی حکومت نے شروع سے ہی ہندوستانی معاملات میں دخل اندازی کی ہوتی تو ہندوستانیوں کو یہ احساس ہو جاتا کہ ایک غیر ملکی طاقت ملک میں داخل ہو رہی ہے۔ چونکہ یہ ایک تجارتی کمپنی تھی، اس لیے لوگوں نے اسے اصل حکمراں نہیں سمجھا۔ اسی لیے کمپنی ایجنٹس نے اپنا معاملہ اس طرح طے کیا جس طرح کوئی اور غیر ملکی حکمراں کے ایجنٹس نہیں کر سکتے تھے۔ برٹش تخت کا کوئی بھی ایجنٹ مغل دربار کے شہزادوں اور با اثر لوگوں کے اشارے پر کام کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتا۔ کمپنی کے ایجنٹ کو اس طرح کی کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ وہ چھوٹے سے

چھوٹے اہل کاروں کے سامنے بھی اسی طرح جھک جاتے جیسے ہندوستانی تجارت پیشہ لوگوں کے سامنے۔ انھوں نے رشوت بھی دی اور بہت سی بدعنوانیاں بھی کیں۔ اور انھیں کبھی یہ خوف نہیں ہوا کہ ان کا بادشاہ انھیں اس کام کے لیے سزا دے گا۔

یہ بھی نوٹ کرنے کی بات ہے کہ کمپنی نے کبھی کوئی مداخلت اپنے نام سے نہیں کی۔ اس نے ہمیشہ اپنے مفاد کو آگے رکھنے کے لیے کسی مقامی سردار کا سہارا لیا۔ اس طرح کمپنی نے جنوب میں کرناٹک کے نواب کے دعوے کی حمایت کرتے ہوئے اپنی طاقت بڑھائی۔ اسی طرح بنگال میں اس نے مرشد آباد کے نواب ناظم کے نام اور حکم کے تحت اپنے اختیارات وسیع کیے۔ حد تو یہ ہے کہ جب بنگال کی اصل حکمرانی اس کے ہاتھ آئی تو بھی اس نے اپنے کو خود مختار حکمراں نہیں سمجھا۔ لارڈ کلائیو نے شہنشاہ سے درخواست کی کہ اسے دیوانی کے اختیارات دے دیئے جائیں اور کئی دہائیوں تک کمپنی نے شہنشاہ کے ایجنٹ کی حیثیت سے کام کیا۔ یہی نہیں بلکہ کمپنی نے دوسرے صوبے کے گورنروں اور صوبے داروں کے قوانین کی بھی اتباع کی۔ صوبوں میں گورنوں کی اپنی مہر ہوا کرتی تھی لیکن انھوں نے خود کو ہمیشہ مغل شہنشاہ کا خادم ہی بتایا۔ کمپنی کے گورنر جنرل کی بھی اپنی مہر ہوتی لیکن اس نے بھی اپنے کو ہمیشہ دلی کے شہنشاہ شاہ عالم کا خادم ہی بتایا۔ گورنر اور صوبیدار دلی میں شہنشاہ کی آمد کے منتظر رہتے اور جب وہ لوگوں کے سامنے آتا تو جھک کر ان کی تعظیم کرتے، اسے ہدیہ اور تحائف پیش کرتے اور پھر بعد میں شہنشاہ سے خلعت حاصل کرتے۔ گورنر جنرل نے بھی اسی طرح شہنشاہ کی تعظیم کی اور 101 اشرفیوں کی نذر پیش کی۔ اس کے جواب میں شہنشاہ نے انھیں خلعت اور خطاب سے نوازا اور یہ خطاب گورنر جنرل ہمیشہ سارے دستاویزوں میں استعمال کرتا۔ اس طرح ملک میں شہنشاہ کی بادشاہت کا بھرم قائم رکھا گیا۔ لوگوں کو بہت بعد میں یہ احساس ہوا کہ خود کمپنی دھیرے دھیرے اس ملک پر بااختیار حکمراں ہوتی جارہی ہے۔

یہ سلسلہ 19ویں صدی کی دو دہائیوں تک چلتا رہا۔ اس وقت تک کمپنی کی حکومت دریاے ستلج تک وسیع ہو چکی تھی۔ تب اس وقت کے گورنر جنرل لارڈ ہسٹنگز کو یہ خیال ہوا کہ اب وقت آگیا ہے کہ وہ خود اپنی طاقت کا مظاہرہ کرے اور دھیرے دھیرے شہنشاہ سے اپنا رشتہ منقطع کرلے۔ اس سلسلہ میں اس نے پہلی چال یہ چلی کہ جب کبھی وہ شہنشاہ کے سامنے آئے تو اسے بیٹھنے کی اجازت ملے اور اس کو نذرانے کی روایت سے مستثنیٰ کیا جائے۔ شہنشاہ نے اس کی ان دونوں درخواستوں کو مسترد کر دیا اور کچھ وقتوں تک گورنر جنرل نے کوئی اصرار بھی نہیں کیا۔

پھر کمپنی نے شہنشاہ کی طاقت گھٹانے کے لیے چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو دلی سے آزاد ہونے کے لیے اکسایا۔ اس سلسلہ میں حیدر آباد کے نظام سے پہل کی گئی۔ اس سے درخواست کی گئی کہ وہ اپنی خود مختار بادشاہت کا اعلان کردے۔ نظام اس سے متفق نہیں ہوئے۔ لیکن انگریزوں کو ایسا ایک سہارا اودھ کے نواب وزیر سے مل گیا۔ اودھ نے فوری طور پر بادشاہ کے زیر اثر صوبے

سے آزاد ہونے کا اعلان کر دیا اور پھر شہنشاہ سے ساری وفاداری منقطع کر لی۔

1835 تک کمپنی نے اپنے کو خود اتنا مضبوط کر لیا کہ اس نے پہلی بار اپنے سکّے ڈھالے جس میں بادشاہ کا نام نہیں دیا گیا۔ بہت سے لوگوں کو اس سے صدمہ ہوا۔ تب انھیں احساس ہوا کہ شہنشاہ کے ایجنٹ یا تجارت سے نکل کر کمپنی خود ہندوستان کے ایک وسیع علاقے کی مالک بن بیٹھی ہے۔ 1835 میں ہی ایک فیصلہ اور ہوا کہ عدالتوں کی زبان فارسی کے بجائے انگریزی کر دی جائے۔ ان سب عوامل سے لوگوں میں یہ احساس پیدا ہوا کہ اب کمپنی کے رتبے میں تبدیلی آگئی ہے۔ اس احساس سے لوگوں کے دماغ پریشان ہو گئے۔ اور پریشانی صرف عوام کو ہی نہیں بلکہ مسلح افواج کے لوگوں کو بھی لاحق ہو گئی۔

انیسویں صدی کی تیسری دہائی میں حالات کا اندازہ ہمیں اس مطالعے سے ہو سکتا ہے جسے ایک معروف برٹش شہری نے اس زمانے میں پیش کیا تھا۔ عزت مآب فریڈرک جان شور 'سر جان شور کے لڑکے تھے اور مختلف حیثیتوں سے بنگال پریزیڈنسی کے شمال مغربی خطے میں پولیس مالگزاری اور عدلیہ میں کام کر چکے تھے۔ اس نے انڈین گزٹ میں گمنام طریقے سے بہت سے مضامین لکھے۔ یہ انڈین گزٹ کلکتہ سے نکلنے والا ایک روزنامہ تھا اور اس نے 1837 میں ان مضامین کو جمع کر کے 'انڈین افیرز' پرنوٹس کے نام سے ایک کتاب شائع کی۔ اس کتاب کے پڑھنے سے اس زمانے میں ہندوستانیوں کے ذہن کی مکمل عکاسی ہو جاتی ہے۔ اس نے بار بار اس بات کو دہرایا کہ گرچہ ظاہری طور پر ہر طرف امن وامان قائم ہے لیکن یہ حالات اس ڈائنامائٹ کی طرح ہیں جن میں ذرا سی چنگاری سے ہر طرف آگ کے شعلے نظر آنے لگیں گے۔ یہ وہی بڑھتی ہوئی بے چینی تھی جو 1857 کی بغاوت کی شکل میں تبدیل ہوئی۔

اس بے چینی کو دو عوامل کی وجہ سے بغاوت میں تبدیل ہونے میں کوئی وقت نہیں لگا۔ ایک تو وہ نئی پالیسی تھی جسے مسٹر تھامسن شمالی مغربی صوبے کے لیفٹیننٹ گورنر (بعد میں آگرہ اور اودھ) نے وضع کیا تھا۔ شروع میں کمپنی نے اس پالیسی کی حمایت کی تھی کہ زمین داروں کا ایک ایسا طبقہ پیدا کیا جائے جو ہمیشہ سرکار کے حمایتی رہے۔ تھامسن کا خیال اس سے جدا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ بڑے بڑے امراء اور زمینداروں کا وجود کمپنی کے لیے کبھی بھی خطرہ ہو سکتا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ اس لیے ایک طبقے کی حیثیت سے زمینداروں کو ختم کیا جانا چاہیے اور سرکار کو چاہیے کہ وہ رعایا سے خود اپنا تعلق قائم کرے۔ اس نئی پالیسی کے نتیجہ میں کمپنی نے ہر حیلہ اور بہانے سے کام لیا کہ کسی طرح امراء اور زمینداروں کو ان کی زمینوں سے بے دخل کر دیا جائے' خاص طور سے یہ کہہ کر کہ وہ خود سرکار کے تحت کاشتکار ہیں۔

سب سے زیادہ فیصلہ کن وہ دوسری پالیسی تھی جسے ڈلہوزی نے وضع کیا تھا اور جس میں رفتہ رفتہ ایک کے بعد ایک ہندوستانی ریاستوں کو برٹش علاقے میں شامل کیا جا رہا تھا۔ اس میں ہندوستان 'امراء کے آخری دور سے گزر رہا تھا۔ امراء اور زمینداروں کے تحت لوگوں کی وفاداری

صرف اپنے امیریا زمینداروں سے ہوتی۔ اس وقت ملک یا قوم سے وفاداری کا کوئی تصور نہیں تھا۔ جب لوگوں نے دیکھا کہ ایک کے بعد ایک ہندوستانی ریاستوں کو انگریزوں کا باجگزار بنایا جارہا ہے اور رفتہ رفتہ زمینداری کے نظام کو ختم کیا جارہا ہے تو اس سے بھی انھیں بہت دھکا لگا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ اب کمپنی اپنے اصل رنگ میں سامنے آرہی ہے اور وہ دھیرے دھیرے ہندوستانی سماجی اور سیاسی نظام کو تبدیل کرتی جارہی ہے۔ یہ بے چینی اپنے عروج کو اس وقت پہنچی جب اودھ پر کمپنی نے قبضہ کرلیا۔ اودھ ایک ایسا صوبہ تھا جو ستر سالوں سے کمپنی کا حلیف تھا۔ اس پورے عرصے میں اودھ نے کبھی بھی برٹش مفاد کے خلاف کوئی کام نہیں کیا۔ اس کے باوجود جب کمپنی نے بادشاہ کو تخت چھوڑنے کے لیے مجبور کیا اور سلطنت پر اپنا قبضہ کرلیا تو لوگوں کو بہت زیادہ صدمہ پہنچا۔

اودھ کی شکست کا سب سے بُرا اثر آبادی کے اسی علاقے پر پڑا کیونکہ بنگال آرمی کے زیادہ تر فوجی اسی علاقے سے بھرتی کیے جاتے تھے۔ انھوں نے کمپنی کی ہر طرح سے وفاداری کے ساتھ خدمت کی تھی اور ملک کے وسیع علاقے میں اس کی حکومت قائم کرنے میں معاون رہے تھے۔ انھیں بھی اچانک احساس ہوا کہ ان کی خدمات کی بدولت کمپنی کو جو اختیار حاصل ہوا ہے اس کا استعمال انھوں نے خود ان کے بادشاہ کو ختم کرنے میں کیا ہے۔ میرے دل میں ذرا بھی اس بات کے لیے شک نہیں ہے کہ 1856 میں جب اودھ پر قبضہ کیا گیا اسی وقت سے فوجیوں میں اور خصوصاً بنگال آرمی میں بغاوت کا موڈ پیدا ہوگیا تھا اور یہیں سے لوگوں نے سوچنا شروع کیا کہ اب کمپنی کی حکومت کو اکھاڑ پھینکنے کا وقت آگیا ہے۔ بغاوت کے دوران لارنس اور دوسروں نے عام سپاہی کے خیالات کو جاننے کی کوشش کی اور اس نظریے کی حمایت میں بہت سے شواہد موجود ہیں۔ چربی ملی گولیوں کی فراہمی سے فوج میں کوئی نئی بے چینی نہیں پیدا ہوئی لیکن اس نے یہ موقع ضرور فراہم کردیا کہ دبی ہوئی چنگاری شعلہ بن کر سامنے آگئی۔

## VI

ابتدا میں ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستانیوں کے جذبات کا بہت لحاظ کرتی تھی۔ اس نے ہندوستانی احساسات کا پورا لحاظ رکھا اور اونچی ذات کے لوگوں کے ساتھ بہت اچھا رویہ روا رکھا۔ گورنر جنرل کونسل کے ممبران کی ایک روایت یہ رہی کہ وہ امراء کا اپنے دروازے تک آکر استقبال کرتے، واپسی میں انھیں رخصت کرنے بھی جاتے اور ایسا ہر اس شخص کے ساتھ کیا جاتا جس کا سماج میں کوئی مرتبہ ہوتا۔ جیسے جیسے وہ طاقت ور ہوتی گئی' اس نے ہندوستانی جذبات کا خیال رکھنا چھوڑ دیا۔ نئے نئے قوانین وضع کیے گئے اور اس بات کا کوئی خیال نہیں کیا گیا کہ اس پر ہندوستانیوں کا تاثر کیا ہوگا۔ تاہم اس بات کا اعتراف کرنا ضروری ہے کہ اس نے اس طرح کی حرکت اپنی لاعلمی کی وجہ سے کی نہ کہ کسی تحقیر آمیز جذبے سے۔ سارے معاملات کا نظم گورنر جنرل ایک کونسل کی مدد سے کرتے جس کے سبھی ممبران صرف انگریز ہوتے۔ شاید کونسل میں کسی ہندوستانی کو شامل

کیے جانے کا خیال ہی خود کونسل کے لیے بہت حیرت انگیز ہوتا اور کوئی ایسا نمائندہ ادارہ بھی نہیں تھا جس سے حکمراں رعایا کے تاثرات کو سمجھ سکتے۔ اس طرح لوگوں کے خیالات سے واقف ہونے کا اس کے پاس کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ کمپنی اور اس کی رعایا کے درمیان خلیج بڑھتی ہی گئی۔

## VII

1857 کے واقعات کے ضمن میں مختلف بیانات پڑھنے کے بعد چند نتائج آسانی سے اخذ کیے جاسکتے ہیں۔ یہ سوال خود بخود ہی پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ بغاوت صرف قومیت کے احساس کی وجہ سے پھیلی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس میں حصہ لینے والے لوگ قومیت کے جذبے سے سرشار تھے لیکن یہ اتنا زیادہ نہیں تھا کہ جس سے کوئی بغاوت پھیل سکتی۔ حب الوطنی کے جذبے کو لوگوں کے مذہبی جذبات بھڑکا کر تقویت پہنچائی گئی اور لوگ اٹھ کھڑے ہوئے۔ چربی ملی گولی کی تشہیر اس کی ایک مثال ہے۔ دوسرے طریقوں سے بھی سپاہیوں کے مذہبی جذبات کو مشتعل کیا گیا۔ اس کے بعد ہی وہ اپنے غیر ملکی آقاؤں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔

جہاں تک چربی ملی گولی کا سوال ہے 'فورٹ ولیم میں ملی دستاویزات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کمپنی کے خلاف یہ الزام انصاف پر مبنی تھا لیکن اس کے علاوہ مذہبی مداخلت کے دوسرے الزامات بے بنیاد تھے۔ یہ افواہ بھی بہت آسانی سے پھیلائی گئی کہ کمپنی نے ستی کی رسم کو اس لیے ممنوع قرار دیا کہ وہ ہندو مذہب سے نفرت کرتی تھی۔ اس الزام کی کوئی بنیاد نہیں تھی۔ ستی کی رسم کو اس لیے ممنوع قرار دیا گیا کہ حکمراں طبقہ اور ہندوستان کے روشن خیال لوگوں کو بھی، جن کی قیادت راجہ رام موہن رائے کر رہے تھے' یہ احساس ہوا کہ یہ ایک غیر انسانی فعل ہے۔ کوئی بھی مہذب حکومت اسے برداشت نہیں کرسکتی تھی کہ انسانوں کو زندہ جلا دیا جائے۔ اب چونکہ اس جدوجہد کا جوش ختم ہو گیا ہے تو کوئی بھی ہندوستانی اس بات کو وافر جواز نہیں سمجھے گا کہ ستی پر لگائی جانے والی پابندی کمپنی کے خلاف بغاوت کا پیش خیمہ تھی۔

اسی طرح یہ الزام بھی بے بنیاد تھا کہ کمپنی گائے کی ہڈیوں کا سرمہ بنا کر آٹے میں ملا رہی ہے تاکہ ہندو سپاہیوں کے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچے۔ کوئی بھی باشعور آدمی آج اس الزام کو نہیں مانے گا۔ لیکن جس وقت یہ افواہ پھیلائی گئی تو بہت سے فوجیوں کو اس پر یقین ہو گیا اور فوجیوں کی بغاوت میں اس نے فلیتے کا کام کیا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے فیصلہ کیا کہ ہندوستانیوں کو مغربی تعلیم دی جائے اور اس کے لیے انھوں نے بہت سے اسکول اور کالج کھول دیئے۔ یہ کام بھی روشن خیال ہندوستانیوں کی مانگ کی وجہ سے کیا گیا تھا۔ تاہم عام لوگوں نے اس قدم کو بھی یہ سمجھا کہ یہ ہندوستانیوں کو عیسائیت قبول کرانے کے لیے کیا گیا ہے۔ ان تعلیم گاہوں کے اساتذہ کو کالا پادری کا نام دیا گیا اور انھیں سماج میں حقارت کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ لیکن آج کوئی آدمی یہ قبول نہیں کرے گا کہ ان تعلیمی اداروں کی بدولت بغاوت پھیلی۔

## VIII

اب 1857ء کے واقعات کو پڑھتے ہوئے میں اس نتیجے پر پہنچنے پر مجبور ہوں کہ اس وقت ہندوستانیوں کا قومی کردار بہت پست ہو چکا تھا۔ بغاوت کی قیادت کرنے والے کبھی ایک دوسرے کے ہمنوا نہیں ہو سکے۔ وہ آپس میں رقابت کا جذبہ رکھتے اور ایک دوسرے کے خلاف ہمیشہ سازش کرتے رہتے۔ انہیں کبھی یہ خیال نہیں پیدا ہوا کہ ان کی نااتفاقی کا بُرا اثر اس کام پر بھی پڑے گا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ لوگوں کی ایک دوسرے سے حسد اور سازش ہی ہندوستانیوں کی شکست کا سب سے بڑا سبب بنا۔

اس جدوّ جہد کے آخری دور میں بخت خاں نے دلّی کی کمان سنبھالی' وہ بہت ایماندار آدمی تھا اور وہ فتح حاصل کرنے کے لیے بے چین بھی تھا' جب کہ دوسرے فوجی سربراہوں نے اس کی شکست کا سامان مہیا کیا اور جب وہ لڑنے کے لیے آگے بڑھا تو ان لوگوں نے اسے کوئی تعاون نہیں دیا۔

یہی حالات لکھنؤ میں بھی تھے۔ ہندوستانی فوجیوں نے ریزیڈنسی کا محاصرہ کر لیا تھا۔ لیکن سپاہیوں نے محسوس کیا کہ اگر ایک بار وہ اس پر قبضہ کر لیتے ہیں تو پھر حکومت یا اودھ کی ملکہ کو ان کی کوئی ضرورت نہیں رہے گی۔ اس لیے ان کی خدمات اسی وقت تک درکار ہیں جب تک یہ جنگ چلتی رہے۔ اسی لیے سپاہیوں نے کبھی فیصلہ کن فتح پانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔

اس کے برخلاف انگریزوں نے ملکہ عالیہ کے تئیں پوری وفاداری سے لڑائی کی اور انہوں نے محسوس کیا کہ یہ ایک قومی سانحہ ہے اور انہیں اپنی زندگی اور فتح کے لیے جی توڑ کوشش کرنی ہے۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی بہت اہم ہے کہ سوائے چند استثنائی صورت کے جن میں سب سے نمائندہ شخصیت احمد اللہ اور تانتیاٹوپے کی تھی 'زیادہ تر قائدین' جنہوں نے اس جدوّجہد میں حصہ لیا' صرف اپنے ذاتی مفاد کی خاطر آگے آئے۔ وہ انگریزوں کے خلاف اس وقت تک کھڑے نہیں ہوئے جب تک کہ ان کے ذاتی مفاد پر ضرب نہیں پڑی۔ حد تو یہ ہے کہ بغاوت شروع ہونے کے بعد بھی ناناصاحب نے یہ اعلان کیا کہ اگر ڈلہوزی اپنا فیصلہ بدل دے اور ان کی مانگوں کو مان لے تو وہ اس سے معاہدہ کر سکتے ہیں۔ جھانسی کی رانی کو بھی اسی طرح کی ذاتی شکایت تھی۔ لیکن یہ اور بات ہے کہ جب ایک بار وہ جنگ میں کود پڑیں تو پھر پیچھے نہیں ہٹیں اور اپنے مقصد کے حصول کے لیے اپنی جان کی قربانی دے دی۔

جب بغاوت کے قائدین کی یہ حالت ہو تو آسانی سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عوام کی کیا حالت رہی ہو گی۔ وہ اکثر تماشائی بنے رہے اور اس وقت جو زیادہ طاقتور دکھائی دیتا اس کا ساتھ دینے لگتے۔ ان کے اس رویے کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ تانتیاٹوپے کا کیا حشر ہوا؟ جب اسے شکست فاش ہوئی تو اس نے عہد کیا کہ وہ مدھیہ پردیش میں نرمدا کے پار اپنی جدوّجہد جاری رکھے گا۔ اسے یقین تھا کہ اگر وہ ایک بار مراٹھا حلقے میں پہنچ گیا تو لوگ اس کی مدد کریں گے۔ ماورائی طاقت اور چالاکی سے کام لیتے ہوئے اس نے اپنے تعاقب میں آنے والوں کو

چکمہ دیتے ہوئے نرمدا کو پار کرلیا۔ لیکن وہاں جانے کے بعد اس نے دیکھا کہ کسی گاؤں میں بھی لوگ اسے پناہ دینے کے لیے تیار نہیں۔ ہر شخص اس کے خلاف تھا اور آخر کار اسے پناہ لینے کے لیے جنگل کا رُخ کرنا پڑا۔ یہاں بھی اس کے ایک خاص دوست نے نیند کی حالت میں اسے دھوکے سے پکڑوادیا۔

## IX

اب اس عظیم جدوجہد کے دوران جو قتل و غارت گری ہوئی اس کے بارے میں چند الفاظ۔ انگریز مصنفین نے اکثر ہندوستانی سپاہیوں اور ان کے قائدین کے ذریعہ جو غیر انسانی فعل کئے گئے ان کے بارے میں بہت تفصیل سے اور بڑھا چڑھا کر لکھا ہے۔ تاہم نہایت افسوس کے ساتھ اس بات کا اعتراف کرنا پڑرہا ہے کہ ان میں سے بعض الزامات بے بنیاد نہیں تھے۔ یورپین عورتوں اور بچوں کا دلی کانپور اور لکھنؤ میں قتل عام کا دفاع کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ گرچہ نانا صاحب کو اس بات کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جاسکتا کہ اس نے جنرل وہیلر سے جو وعدہ کیا تھا' وہ اسے پورا نہیں کرسکا۔ کیونکہ اس کا فوجیوں پر کوئی اختیار باقی نہیں رہا تھا جنہوں نے سارے معاملات کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا تھا۔ خود انگریز موخین نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ جب اس نے ایک بچے کی لاش کو پانی میں تیرتا ہوا دیکھا تو اسے بہت صدمہ ہوا۔ چاہے کچھ بھی ہو وہ ہندوستانی فوجی جو اسے اپنا قائد سمجھتے تھے انہوں نے ہی یہ گھناؤنا جرم کیا تھا۔ اسی طرح سے یہ ان قیدیوں کی بھی ذمہ داری تھی جنہیں جنرل ہیولاک کے اس جگہ پر پہنچنے سے پہلے ہی قتل کردیا گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے یہ قتل اس بدلے کے جذبے سے کرایا تھا جو انگریزوں نے ہندوستانیوں کے ساتھ الہ آباد میں کیا تھا تاہم ایک غلطی کے سبب دوسری غلطی کے کئے جانے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ نانا صاحب کو یقیناً ان بے چارے قیدیوں کے قتل کا ذمہ دار ٹھہرایا جائے گا۔

اگر اس طرح کے گھناؤنے کاموں سے ہندوستانیوں کا ریکارڈ بدنما ہو گیا تو انگریزوں نے بھی کوئی اچھا سلوک نہیں روا رکھا۔ انگریز مورّخین نے عام طور پر برٹش افواج کے ان بہیمانہ مظالم کو نظرانداز کیا ہے۔ لیکن کچھ نے اس پر نفریں اور دکھ کا اظہار ضرور کیا ہے جو بدلے کے جذبے سے ہندوستانیوں پر کئے گئے تھے۔ خود ہڈسن کا نام خون کا پیاسا پڑ گیا تھا۔ نیل اس بات پر فخر کیا کرتا کہ نام نہاد مقدموں کے نام پر اس نے سیکڑوں ہندوستانیوں کو پھانسی کے تختے پر چڑھایا۔ الہ آباد کے آس پاس کوئی ایسا درخت نہیں بچا تھا جس سے کسی ہندوستانی کی لاش نہ لٹکائی گئی ہو۔ ہوسکتا ہے کہ انگریزوں کو غصہ زیادہ آگیا ہو۔ لیکن یہی بات ہندوستانی بھی اپنے بارے میں کہا کرتے تھے۔ اگر بہت سے ہندوستانیوں کی اس حرکت کا کوئی جواز نہیں پیش کیا جاسکتا تو یہی بات انگریزوں کے ساتھ بھی صادق آتی تھی۔ مسلمان امراء کو سور کی کھالوں میں زندہ سی دیا جاتا۔ اور پھر زبردستی ان کے گلے میں سور کا گوشت ڈال دیا جاتا۔ ہندوؤں کو لٹکتی تلواروں کے تلے گائے کا گوشت کھانے پر مجبور کیا گیا۔ زخمی قیدیوں کو زندہ جلادیا گیا۔ انگریز سپاہی گاؤں میں نکل جاتے اور

گاؤں والوں کو پکڑ کر لاتے اور انہیں اتنی اذیت دیتے کہ آخر کار وہ مر جاتے۔ کوئی بھی ملک یا کوئی بھی شخص اس قدر نفرت انگیز پُر تشدد کام نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد بھی وہ اپنے کو مہذب ہونے کا دعویٰ کرے۔

## X

1857ء کی بغاوت کے سلسلہ میں مبہم کہانیوں کے پس منظر میں دو باتیں صاف ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ اس عرصے میں ہندو اور مسلمانوں کے درمیان بہت خاص یگانگت یا اشتراک دیکھنے کو ملتی ہے۔ اور دوسری بات یہ کہ اس پورے عرصہ میں مغل تاج کے تئیں ہر شخص نے اپنی گہری وفاداری دکھائی۔

غدر کی شروعات 10 مئی 1857ء کو ہوئی اور یہ سلسلہ تقریباً دو سال تک چلتا رہا۔ اس دوران دونوں طرف کے سپاہیوں نے بہت سے شاندار اور بہت سے کالے کرتوت کئے۔ بہت زیادہ بہادری کی مثالیں بھی ملتی ہیں اور اسی طرح ناقابل یقین تشدد کے بھی واقعات ملتے ہیں۔ اس دوران ہمیں کہیں بھی کوئی ایک مثال نہیں ملتی جب فرقہ وارانہ بنیاد پر کوئی تشدد ہوا ہو۔ سبھی ہندوستانی— چاہے مسلم ہوں یا ہندو— چیزوں کو ایک ہی نظریے سے دیکھتے اور اسی نظریے سے واقعات پر تاثر ظاہر کرتے۔

فرقہ وارانہ جذبات سے یہ بے گانگی 'لیڈروں کی کسی خاص کوشش کا نتیجہ نہیں تھی۔ ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ 1857ء کے دوران کسی نے بھی ہندو مسلم اتحاد کے لیے کوئی کوشش کی ہو۔ صدیوں کی ایک مشترکہ زندگی کے سبب ہندوؤں اور مسلمانوں میں اٹوٹ دوستانہ رشتے قائم تھے۔ اس لیے کسی خاص سبب کے لیے اتحاد کی اپیل کئے جانے کی نہ کوئی ضرورت تھی اور نہ کوئی موقع تھا۔ اور اسی لیے آسانی سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ برٹش حکومت سے قبل ہندوستان میں ہندو مسلم کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

حد تو یہ ہے کہ 1857ء سے پہلے انگریزوں نے 'پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو' کی پالیسی اختیار کر رکھی تھی۔ یہ بھی صحیح ہے کہ خود برطانیہ کے تاج نے ہندوستانی حکومت کی باگ ڈور نہیں سنبھالی تھی لیکن سو سال قبل پلاسی کی جنگ کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی زبردست طاقت بن گئی تھی۔ ان سو سالوں کے دوران برٹش افسران نے ہندوستانی سماج کے مختلف عناصر کے اختلافات کو بہت زیادہ ہوا دی تھی۔ کمپنی کے ڈائرکٹرس جو مراسلے بھیجتے اس میں اس بات پر بار بار زور دیا جاتا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان فرق کیا جانا چاہیے۔ وہ محسوس کرتے کہ مسلمانوں اور ان کی وفاداری پر کبھی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔

ٹاڈ نے Annals of Rajasthan اور ایلیٹ نے ہسٹری آف انڈیا کے تعارف میں صاف صاف لکھا ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوؤں اور مسلمانوں کے فرق کو بار بار زور دے کر اُجاگر کرتی۔ لیکن یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے اعلیٰ عہدوں کے افسران ہی ہوتے اور وہ بہت حقارت سے ان ہندو

موّرخین کی طرف دیکھتے جو مسلم بادشاہوں کی تعریف کرتے۔ انہیں اس بات پر حیرت ہوتی کہ ہندو مورخ مسلم بادشاہوں کے انصاف اور غیر تعصبانہ رویے کی بار بار تعریف کیوں کرتے ہیں۔

ٹاڈ کے Annals میں ایسے بہت سے مواد ملتے ہیں جن میں عہد وسطیٰ کی تاریخ کو یہ رنگ دینے کی کوشش کی گئی جس سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں آپس میں پھوٹ پڑ جائے۔ جہاں کسی واقعہ کے بارے میں دو طرح کا تذکرہ ملتا وہاں صرف اسی واقعہ کو ریکارڈ کیا جاتا جس سے آپسی اتحاد میں پھوٹ پڑ جائے۔ تاہم 1857ء کے واقعات یہ ثابت کرتے ہیں کہ ان کی اس زہر افشانی کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ عام زندگی میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان وہ بھائی چارگی اور ہمدردی کا جذبہ ملتا ہے جس نے سو سالوں کے تفرقہ ڈالنے کی اس کوشش کو ناکام کردیا۔ یہی وجہ ہے کہ 1857ء کی جدوجہد نے قومی جدوجہد کا رُخ اختیار کر لیا، جس میں کبھی فرقہ وارانہ علاحدگی نہیں پیدا ہوئی۔ آزادی کی اس جدوجہد میں ہندو اور مسلمان کندھے سے کندھا ملا کر لڑتے رہے۔ اور ان کی مشترکہ کوشش یہ تھی کہ وہ کسی صورت برٹش غلامی کا جُوا اپنے کندھوں سے اُتار پھینکیں۔

اتحاد کا یہ جذبہ نہ صرف ہندوستانی سپاہیوں میں، بلکہ عام شہریوں کی زندگی میں بھی ملتا ہے۔ کوئی ایک بھی واقعہ مذہب کی بنیاد پر فساد کا نہیں ملتا۔ گرچہ برٹش افسروں نے ہندوستانی فوجیوں کے آپس کے اختلافات کو اجاگر کر کے انہیں کمزور کر دینے کی برابر کوشش کی۔

ہندوستانیوں نے 1857 کی جدوجہد مشترکہ طور پر کی۔ پھر یہ کیسے ہو گیا کہ کچھ دہائیوں کے بعد ہندوستانی قومیت کی راہ میں فرقہ وارانہ اختلافات ایک روڑا بن گئے؟ یہ ہندوستانی تاریخ کا ایک المیہ ہے کہ یہ مسئلہ روز بروز اتنا گمبھیر ہوتا گیا کہ آخر کار اس سے چھٹکارا پانے کے لیے ملک کی تقسیم فرقہ وارانہ بنیاد پر کرنی پڑی۔

اس کا صرف ایک جواب دیا جاسکتا ہے کہ اس فرقہ وارانہ اختلافات کی بنیاد انگریزوں کی اس پالیسی کی وجہ سے پڑی جو 1857ء کے بعد انہوں نے وضع کی تھی۔ انہوں نے دیکھا تھا کہ اس عظیم جدوجہد کے دوران سبھی نے مل کر پورے اتحاد کے ساتھ جنگ کی ہے۔ انگریزوں کو احساس ہوا کہ اب اس ملک میں ان کی حکومت صرف اس اتحاد کو توڑنے سے ہی قائم رہ سکتی ہے۔ اور یہ نتیجہ لازمی طور پر ان مراسلوں سے بھی نکلتا ہے جو اس وقت انگریزوں نے بھیجے۔ یہ فوج کی تنظیم نو میں بھی ملتا ہے جو غدر کو فرو کرنے کے بعد انگریزوں نے کی۔ انہوں نے نہ صرف جنگجوؤں اور غیر جنگجو قوموں کے درمیان تقسیم کی، بلکہ فوج کو بھی اس طرح منظم کیا کہ ہندو اور مسلمان دونوں ایک دوسرے کی کاٹ میں لگے رہیں۔ ایسے اقدام کیے گئے جس سے مستقبل میں ہندو اور مسلمان متحد نہ ہوسکیں۔ عوام کے لیے بھی ایسی پالیسی اختیار کی گئی جس سے ہندو مسلمانوں کے خلاف اور مسلمان ہندوؤں کے خلاف ہو جائیں۔ ان اختلافات کو اجاگر کرنے کا جب بھی کوئی موقع ملا، ان سے بھرپور فائدہ اٹھایا گیا۔ فوج میں اس پالیسی کو کیسے لاگو کیا گیا اس کی پوری وضاحت لارڈ رابرٹس کی سوانح میں مل جاتی ہے۔

## XI

دوسری اہم بات یہ ہے کہ اس جدو جہد کے دوران ہندو اور مسلمان بلا کسی شک و شبہے کے دلی یا بہادر شاہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اور اس معاملے میں بھی ہم خیال تھے کہ صرف بہادر شاہ کو ہی یہ حق حاصل ہے کہ وہ ہندوستان کا شہنشاہ ہو سکے۔ تاہم یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ جب یہ جدو جہد شروع ہوئی تو فوج میں اکثریت ہندوؤں کی تھی اور جب 10 رمئی کو انہوں نے میرٹھ میں بغاوت کی تو ان کی پہلی آواز نکلی 'دلی چلو'۔ اور یہ آواز کسی بحث مباحثے کے بعد نہیں بلکہ اپنے آپ فوجیوں کے منہ سے نکلی تھی۔ جب کینٹ میں یہ بغاوت پھیلی تو وہاں بھی یہی آواز بلند ہوئی اور حد تو یہ ہے کہ اگر فوجی دلی نہ پہنچ سکے تو بھی وہ مغل شہنشاہ کی وفاداری کا دم بھرتے رہے۔

کانپور میں بغاوت کے دوران نانا صاحب نے اہم رول ادا کیا۔ لیکن اس وقت بھی وہ اپنے کو پیشوا ہی کہتے رہے۔ مراٹھا اور مغلوں کے درمیان پرانی جنگ کو بالکل بھلا دیا گیا تھا' اور نانا صاحب ہمیشہ اپنے کو صوبیدار یا گورنر کہتے رہے۔ صرف شہنشاہ کے نام پر ہی سکے ڈھالے جاتے اور ہر فرمان اسی کے نام پر جاری ہوتا۔ نانا صاحب کے اس طرح کے کچھ فرمان حیدر آباد دکن کے آرکائیوز میں رکھے ہوئے ہیں۔ اور ان میں سے ہر حکم نامہ دلی کے شہنشاہ کے نام پر ہی جاری کیا گیا۔ اور مغل دربار کی روایت کے مطابق سبھی پر تاریخ سنہ ہجری اور اس کے بعد سمت میں دی گئی ہے۔

ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ 1857ء میں بہادر شاہ کی حیثیت صرف ایک کٹھ پتلی کی تھی۔ ان کی حکومت لال قلعہ کے اندر تک ہی محدود تھی۔ دلی شہر ان کی حکمرانی سے باہر تھا۔ وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ذریعہ ہر مہینہ ملنے والے ایک لاکھ روپے کے وظیفہ پر گزارہ کر رہے تھے۔ نہ صرف وہ بلکہ ان کے پیش رو بھی صرف نام کے حکمراں تھے۔ ان کے پاس نہ تو خزانہ تھا اور نہ فوج۔ اور نہ ہی ان کا کوئی اختیار ہوتا۔ ان کے حق میں صرف ایک ہی بات تھی کہ وہ اکبر اور شاہجہاں کے جانشین تھے۔

ہندوستان کے عوام اور فوجیوں نے بہادر شاہ سے جو وفاداری دکھائی وہ ان کی شخصیت کی وجہ سے نہیں بلکہ اس لیے کہ وہ عظیم مغل حکمرانوں کے جانشین تھے۔ مغل حکومت کی عظمت نے ہندوستانی عوام کے ذہنوں کو اس طرح سے متاثر کیا تھا کہ جب یہ سوال پیدا ہوا کہ انگریزوں سے اختیار کون حاصل کرے گا تو ہندو اور مسلمان دونوں نے مل کر مشترک طور پر بہادر شاہ کا نام لیا۔ اس سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ حکومت جس کی بنیاد بابر نے رکھی اور جسے اکبر نے مستحکم کیا اس کی جڑیں بہت گہرائی تک ہندوستانی دل و دماغ میں پھیل چکی تھیں۔ ہندوستانیوں نے مغل بادشاہ کو کبھی غیر ملکی حکمراں نہیں سمجھا بلکہ اپنا بادشاہ سمجھتے رہے۔ ہندوستانیوں کی بدقسمتی سے بہادر شاہ بطور علامت ہی استعمال کئے جانے کے لائق رہ گئے۔ وہ اس قدر کمزور تھے کہ سپاہیوں پر اور نہ اپنے امراء پر کوئی قابو رکھ سکتے تھے۔ ان کی ان شخصی کمزوریوں کے باوجود ہندوستانیوں کو ان کا کوئی متبادل نظر نہیں آیا۔ آخر تک فوجی اور ہندوستانی دونوں بہادر شاہ کو اصل حکمراں سمجھتے رہے۔ ستمبر 1857ء میں جب انگریزوں نے دلی پر قبضہ کیا تو بخت خاں نے بہادر شاہ سے

درخواست کی کہ وہ شہر چھوڑ دیں اور شہر کے باہر کہیں فوجوں کو جمع کریں۔ اُس نے بہادر شاہ سے کہا کہ ابھی مکمل شکست نہیں ہوئی ہے۔ روہیلکھنڈ اور اودھ اب بھی ہمارے قبضے میں ہیں۔ لیکن بہادر شاہ اس موقعے سے فائدہ اٹھانے میں ناکام رہے۔ اس کے برخلاف انگریزوں نے سازشی الٰہی بخش کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا جس نے بہادر شاہ کو سمجھایا کہ وہ دلی میں ہی رہیں' جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں قید کر لیا گیا اور پھر پورے ملک میں یہ شورش پھیل گئی۔

## XII

جنوری 1955ء میں میں نے یہ فیصلہ کیا کہ 1857ء کی جدّوجہد کی فوری طور پر تاریخ لکھی جائے۔ میرے ذہن میں یہ بات بالکل واضح تھی کہ یہ تاریخ جدّوجہد کی سچی تصویر ہو' نہ کہ واقعات کی متعصبانہ تشریح۔ یہ صرف حقیقت اور حقیقت پر مبنی ہوگی اور اس میں جذبات کو مشتعل کرنے والا کوئی جوشیلا جملہ نہیں ہوگا۔ میں نے فوری طور پر مشہور ہندوستانی مورخ ڈاکٹر ایس این سین کو بلایا اور انہیں یہ کام سپرد کر دیا۔ اس کا اعلان انڈین ہسٹوریکل ریکارڈ کمیشن کے سالانہ اجلاس میں بھی کیا۔ اس موضوع پر ہر طرح کا ریکارڈ انہیں مہیا کرایا گیا۔ انہیں اس بات کی سہولت بھی دی گئی کہ وہ لندن کے انڈیا آفس سے ضروری مواد حاصل کریں۔ میں نے انہیں اس بات کی بھی اجازت دی کہ جب کوئی ریکارڈ فراہم نہ ہو تو وہ ذاتی طور پر لندن جائیں اور وہاں تاریخی دستاویزوں کو دیکھیں۔

یہ کتاب ڈاکٹر سین کی اسی کاوش کا نتیجہ ہے جسے حکومت ہند نے لکھنے کے لیے کہا تھا۔ اس سلسلہ میں میں نے صرف انہیں ایک اصول بتایا تھا کہ وہ ایک سچے مورّخ کی طرح کتاب تحریر کریں۔ اس ایک بات کے علاوہ ان کے کسی کام میں یا انہوں نے جو نتائج بر آمد کئے انہیں متاثر کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ اس لیے واقعات کے انتخابات اور توضیح کی ساری ذمہ داری ان کی ہے اور انہوں نے جو رائے قائم کی ہے' اس سے حکومت ہند پورے طور پر بری الذمہ ہے۔

مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ڈاکٹر سین نے بہت معروضی طریقے سے بغیر لاگ لپٹ کے اپنے موضوع سے انصاف کیا ہے۔ انہوں نے نہ تو کسی کی مذمت کرنے کی کوشش کی اور نہ ہی کسی کو نظر انداز کرنے کی۔ اور اس جدّوجہد میں شامل انگریز اور ہندوستان کو سچے تاریخی پس منظر میں دیکھا ہے۔ ان کے بہت سے بیانات سے مجھے اتفاق نہیں ہے۔ اس کے باوجود میں تعریف کئے بنا نہیں رہ سکتا کہ انہوں نے اس مشکل کام کو بہت معروضی انداز سے پورا کیا۔

**ابوالکلام آزاد**
وزیر تعلیم
حکومت ہند

نئی دہلی
9/ فروری 1957

# پیش لفظ

1955ء کے آغاز میں حکومت ہند نے مجھے 1857ء کی بغاوت کی ایک جلد لکھنے کا کام تفویض کیا تھا۔ حکومت چاہتی تھی کہ 30/جون 1956ء تک پریس کاپی تیار ہو جائے۔ جو وقت مجھے دیا گیا وہ کسی صورت میں کافی نہیں تھا۔ جو مواد دستیاب تھا گرچہ یک طرفہ تھا' لیکن کئی جلدوں میں تھا' اور یہ موضوع خود بھی مباحثہ اور تنازعہ میں گھرا ہوا تھا۔ میں نے سوچا کہ سپاہیوں کی اس جنگ کے اسباب' کردار اور نتائج کا از سرِ نو جائزہ لینے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔

ابتدائی دور کی بہت سی تلخیاں گرچہ اب ختم ہو گئیں لیکن اس سلسلہ میں بہت سے تعصبات آج بھی برطانیہ اور ہندوستان میں برقرار ہیں۔ بہت سے ایسے انگریز ہیں جو آج بھی یہ سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ حکمراں طبقے نے بہت سی غلطیاں کی ہوں گی اور جرائم کئے ہوں گے۔ ایسے ہندوستانیوں کی بھی کمی نہیں جو اس بات کا اعتراف کرنے سے کتراتے ہیں کہ باغی لیڈر حب الوطنی کے علاوہ دوسرے مقاصد سے متاثر ہوئے تھے۔ تاریخ کا طالب علم آج بھی ایسے پہلے سے قائم مفروضوں اور متعصبانہ یقین سے دوچار ہوتا ہے۔

وقت ہر زخم کا مرہم ہوتا ہے۔ آزاد ہندوستان اب سابق حکمرانوں کی بہت سی کمیوں کو فراموش کر سکتا ہے اور انگریزوں کے لیے بھی یہ ضرورت نہیں رہ گئی ہے کہ ان کی کالونیائی استعماریت پسندی کے سارے اقدام کا دفاع کیا جائے۔ اس لیے اب وقت آگیا ہے کہ ان سبھی واقعات کا غیر متعصبانہ طور پر مطالعہ کیا جائے۔ ان کے بارے میں آج بھی لوگوں کے خیالات اور فکر میں تضاد پایا جاتا ہے۔ مجھے حکومت ہند کے اس لبرل نظریے نے اس کام کو کرنے میں بہت ہمت بڑھائی ہے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ 1857ء کی تاریخ کی از سر نو تحقیق کی ضرورت کو اسی وقت محسوس کیا جا سکتا ہے' جب یہ بالکل معروضی طریقے پر بغیر کسی تعصب اور لاگ لپٹ کے پیش کی جائے اور ایسے محقق کو اس بات کی مکمل آزادی دی جائے جو اپنے نتائج کو آزادانہ طور پر بغیر کسی سرکاری مداخلت یا خوف کے پیش کر سکے۔ میں یہاں پر بالکل واضح کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے ان صفحات میں جو کچھ بھی پیش کیا ہے اس کے لیے حکومت ہند بالکل ذمہ دار نہیں۔ اور نہ ہی اس کا یہ مطلب نکالا جانا چاہیے کہ حکومت مجھ سے ہر معاملے میں متفق ہے کیونکہ اسی کے اشارے پر یہ کتاب شائع ہو رہی ہے۔ یہ کسی بھی صورت میں سرکار کی مستند دستاویز نہیں ہے۔ میرے لیے جنگ کی مفصل تاریخ اس مدت میں پیش کرنا ممکن نہیں تھا۔ میرے بہت سے قارئین' مجھے یقین ہے کہ

ان تمام خاص واقعات سے واقف ہیں، یہاں پر ان کا صرف تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔

میں یہاں پر مولانا ابوالکلام آزاد کے تئیں اپنا دلی شکریہ پیش کرنا چاہوں گا کہ انہوں نے اس کام کے لیے مجھے ہر طرح کی سہولت فراہم کیں۔ مجھے نیشنل آرکائیوز آف انڈیا اور نیشنل لائبریری کلکتہ میں ہر طرح کی دستاویز دیکھنے کی مکمل آزادی تھی۔ اور وزیر تعلیم نے انگلینڈ میں تحقیق کے لیے خرچ کی ساری ذمہ داری اٹھائی۔ اس کام کے لیے انہوں نے میرے ساتھ تین ریسرچ اسسٹنٹ کی بھی تقرری کی۔ مسٹر پی سی جوشی نے میرے کہنے کے مطابق نیشنل آرکائیوز کا سارا ذخیرہ کھنگھالا۔ اور اس دور کی بہت سی ایسی دستاویزوں کو ڈھونڈا جنہیں میں نے ضمیمہ میں پیش کیا ہے۔ اگر ان کی یہ مساعی شامل نہ ہوتی تو اس کام کو وقت مقررہ پر پیش کرنا ممکن نہ ہوتا۔ اس کتاب کا اشاریہ بھی انہوں نے تیار کیا۔ ڈاکٹر مس نہار کا مجمدار نے میرے ساتھ کلکتہ میں کام کیا اور یہ ان کی ذمہ داری تھی کہ ان سارے حوالوں کو از سر نو دیکھیں اور ٹائپ شدہ مسودے کو درست کریں۔ سردار پرتیپال سنگھ کپور نے بغاوت کے سارے ریکارڈوں کی جانچ کی۔ خاص طور پر پنجاب حکومت ریکارڈ آفس میں مولوی رجب علی کے سارے کاغذات دستیاب کرائے۔ ہسٹری آف فریڈم موومنٹ ان انڈیا کے بورڈ آف ایڈیٹرس کے ایک ممبر کی حیثیت سے مجھے بورڈ کے پاس موجود سبھی مواد کو دیکھنے کا موقع ملا۔ نیشنل آرکائیوز لائبریری کے مسٹر بی باگچی نے دلی کی لائبریریوں میں تمام عنقا ہوئی دستاویزوں کو تلاش کرنے میں سخت محنت کی۔ کانپور کے مسٹر بالک رام، جن کے پر دادا نے غدر کے دوران سخت سزائیں بھگتی تھیں، نے اس علاقے کی ساری تاریخی اطلاعات اور نقشہ جات فراہم کرنے کی رضاکارانہ طور پر ذمہ داری لی۔ مسٹر بی ایس کیسون اور نیشنل لائبریری کے ان کے دیگر رفقا کا بھی میں شکر گزار ہوں جنہوں نے مجھے ہر طرح کا تعاون دیا۔ انڈیا آفس لائبریری کے مسٹر ایس سی ستن اور ان کے ماتحت ملازمین نے میری ہر طرح سے مدد کی اور ایک نایاب مسودہ میرے پاس کلکتہ میں بھیجا۔ مہاراج کمار، سمیندر ناتھ نندی جو قاسم بازار کے تاریخی مکان میں رہتے تھے، انہوں نے اپنی خاندانی لائبریری سے بہت سے مسودے فراہم کئے۔ پروفیسر سی ایچ فلپ نے مجھے اپنی سمینار لائبریری سے اخباروں کے تین بڑے بینڈل، تراشے اور نوٹس دیکھنے کی اجازت ۔ے کر مجھے حد سے زیادہ مشکور کیا۔ میرے پرانے دوست ایم دتو پنت پونڈار نے تاتھے خاندان کے بارے میں بہت سی اطلاعات فراہم کیں اور بالاسور میں دیئے گئے بیان کی ایک کاپی بھی فراہم کی۔ پنجاب حکومت ریکارڈ آفس کے مسٹر وی ایس سوری نے اپنے سارے خالی اوقات کو ان دستاویزوں کی تلاش میں لگایا جس پر ابھی ان کی نگاہ نہیں گئی تھی۔

لیفٹیننٹ کرنل پنڈت کانجی لال دوبے جو اس وقت ناگپور یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے، نے نہ صرف مجھے بنی مادھو کی ایک مشہور بیلے فراہم کی بلکہ یونیورسٹی لائبریری سے ایک درجن سے زیادہ کمیاب کتابیں غیرمعینہ مدت کے لیے فراہم کروادیں۔ ٹھاکر بوک سنگھ نے میرے استعمال کے لیے اپنے گاؤں اور آس پاس کے علاقوں کی بھی قتل وغارت گری کی پوری تفصیلات بھیجیں۔ مجھے خاص طور پر السٹریٹڈ لندن نیوز کے ایڈیٹر کا شکریہ بھی ادا کرنا ہے جنہوں نے مجھے بیگم حضرت محل کے پورٹریٹ کی نقل دینے کی اجازت دی۔ میرے لیے اب یہ ممکن نہیں کہ ان تمام لوگوں کا جنہوں نے ہندوستان اور انگلینڈ سے غیر متوقع طور پر ہر طرح کا تعاون کیا فرداً فرداً ذکر کروں۔ ان کی یہ مہربانی اس وقت اور بھی بیش قیمتی ہو جاتی ہے جب کہ مشنری اداروں کے سربراہوں نے اپنے کالجوں میں واقع لائبریریوں کو دیکھنے سے مجھے یکسر منع کر دیا۔

پروفیسر این کے سنہانے ٹائپ شدہ مسودہ کو غور سے دیکھا اور مجھے بہت مفید مشورے دیئے۔ ڈاکٹر پی سی گپتا نے اس وقت پریس میں اس کاپی کو دیکھا جب میں جسمانی طور پر اپنی طویل بیماری کے سبب اس کام کو کرنے سے معذور تھا۔

سریندر ناتھ سین

6 اکڈیلیا پلیس کلکتہ 19

25/اپریل 1957

# فہرست

# تصاویر



## نقشہ جات

# باب اوّل

# اسباب

1857ء کے انقلاب کے اسباب کیا تھے' عام طور پر لوگ اس کی وجہ وہ کارتوس بتاتے ہیں جن پر گائے / سور کی چربی لگی ہوئی تھی۔ لیکن کچھ لوگ اسے نہیں مانتے۔ وہ نفرت انگیز چربی خود اپنے آپ میں اتنا بڑا غدر برپا کرنے کی اہل نہیں تھی اگر اس کے ساتھ یہ اندیشہ نہ ہو تا کہ ایسا تبدیلی مذہب کے لیے جان بوجھ کر کیا گیا ہے۔ "ہم نے اپنے غیر ملکی حاکموں کے لیے بغیر کسی جھجک کے اپنے خون بہائے ہیں۔" یہ شکایت ان سپاہیوں کی تھی جو ان سے متاثر تھے۔ "ہم نے ان کے لیے ایک کے بعد ایک ریاستوں سے جنگ کر کے ان پر فتح حاصل کی۔ ہم ایسا اس وقت تک کرتے رہے جب تک پورے ملک پر ان کو تسلط نہیں حاصل ہو گیا۔ لیکن اس کے عوض ہمیں کیا ملا۔ ہمارے لوگوں کی بربادی ہوئی۔ ہمارے راجاؤں اور شہزادوں کی پسپائی ہوئی اور ان سب سے بڑھ کر خود ہمارے مذہب کی غیر محسوس طریقے سے بے عزتی کی گئی۔" "ہندوستان کی فوج نے لندن کے شہنشاہ اور عزت مآب کمپنی کے لیے بھرپور وفاداری کے ساتھ جنگ کی اور ان کے لیے کلکتہ سے پیشاور تک سارے ممالک کو فتح کیا۔ ان ساری خدمات کے صلہ میں اس شہنشاہ اور انگریز حکمرانوں نے ہمیں جو صلہ دیا وہ اس طرح ہے۔ پہلے تو انہوں نے ہندوستان سے واجب الادا دو سو کی رقم سے زیادہ تین سو کی رقم مال گزاری کے طور پر وصول کی اور جہاں چار سو کی مانگ تھی وہاں پانچ سو روپے وصول کیے اور لگاتار وہ اپنے حصہ کی رقم اور بڑھاتے رہے تاکہ عوام بُری طرح برباد ہو جائیں اور سب بھکاری بن جائیں۔ دوم یہ کہ لوگوں کی معاشی بربادی کرنے کے لیے 'انہوں نے چوکیداری ٹیکس میں دوگنے' چار گنے اور دس گنے کا اضافہ کر دیا۔ تیسرے سبھی پڑھے لکھے اور باعزت لوگوں کے پیشہ کو برباد کر دیا اور اب لاکھوں لوگ ضروریات زندگی کے لیے محتاج ہو گئے اور جب کوئی شخص ملازمت کی تلاش میں ایک ضلع سے دوسرے ضلع میں جانے کا ارادہ کرتا ہے تو ہر شخص کو سڑک پر چلنے کا ٹیکس چھ پائی اور ہر بیل گاڑی کے لیے 4 سے 8 آنے کا ٹیکس دینا پڑتا۔ جو لوگ اس ٹیکس کی ادائیگی کر سکتے 'صرف انہیں کو عوامی شاہراہوں پر چلنے کی اجازت ہوتی۔ اب ہم ان ظالموں کی تفصیلات کہاں تک بیان کریں۔ ان کے ظلم کی یہ انتہا ہے کہ اب سرکار ہر شخص کے مذہب کو پامال کرنے پر آمادہ ہو گئی ہے۔"

اس طرح کی ایک اپیل ہندوستانی عوام کے نام دلّی کے ہندو اور مسلمانوں نے مل کر جاری کی۔ ایسا نہیں تھا کہ صرف فوج ہی کمپنی سرکار کی مذمت کر رہی تھی' دلّی کے شہنشاہ' لکھنؤ کے والی' اور پیشوا کے وارثین سبھی ان کے ساتھ تھے۔ جیسی کہ قدیم کہاوت ہے کہ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا' اسی طرح اس غم و غصہ' جھنجھلاہٹ اور احساس شکست کے لیے اس کارتوس کو بہانا بننا تھا۔

لیکن ایسا نہیں ہوا کہ انگریزوں نے جان بوجھ کر ہندوستانیوں کے اس احساس کو ٹھیس پہنچائی ہو۔ اس نے تو تلوار کے ذریعہ ملک پر فتح حاصل کی تھی۔ لیکن یہ اس پر تلوار کے ذریعہ زیادہ دنوں تک حکمرانی نہیں کرنا چاہتی تھی' بلکہ ان کا عقیدہ تھا کہ وہ ایک اعلیٰ نسل اور بہتر تہذیب کے نمائندہ ہیں اور وہ اس مغربی تہذیب کے ہتھیار کو مشرق کی پچھڑی ہوئی قوم سے آشنا کرنا چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ انہیں اس حکمرانی کا اخلاقی جواز حاصل ہو جائے لیکن وہ یہ بھول گئے کہ غیر ملکی حکمرانوں کا نیک قدم بھی بعض اوقات غلط فہمی پیدا کرنے کا سبب بن جاتا ہے۔ اُن کی اس حیثیت میں جو رکاوٹیں مضمر تھیں' انہیں فراموش کر کے وہ ہندوستان میں اس طرح کی اصلاحات لانا چاہتے تھے جو ان کے مطابق ضروری تھیں۔ سدھار اور اصلاح کے جوش میں اس نے ان لوگوں کے احساسات کو مدنظر نہیں رکھا جن سے لوگ متاثر ہو رہے تھے۔ اور حیرت کی بات تو یہ ہے کہ انھوں نے ضروری اور غیر ضروری کے درمیان کوئی فرق بھی ملحوظ نہیں رکھا۔

سپاہیوں کے مذہبی عقیدے پر پہلی ضرب تو 1806ء میں اس وقت لگی جب ایک غیر فوجی شخص جارج بارلو گورنر جنرل تھا۔ اس زمانے میں تینوں پریزیڈنسی کا الگ الگ فوجی انتظام ہوتا تھا۔ اور مدراس کے افسران کا خیال تھا کہ جو فوج ان کے ماتحت ہے' وہ نہ صرف چاق و چوبند رہے بلکہ ہر وقت چاق و چوبند نظر بھی آئے۔ ان کے نزدیک جو سپاہی اپنے نسب کی نشانی اپنے کاندھوں پر لگاتے ہیں وہ مناسب نہیں۔ انہوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ لمبی داڑھیاں ہندوستانی فوجی بڑے فخر سے لہراتے ہیں' وہ ان کی فوجی ہونے کی نفی کرتی ہیں اور اسی لیے یہ حکم دیا گیا کہ فوجی کی حیثیت سے مونچھیں بھی ترشوائیں۔ انہوں نے اتنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کی روایتی پگڑی کو بھی اتروا کر چمڑے کی ٹوپیاں پہنادیں۔ آج یہ ساری اصلاحیں' اگر وہ اصلاحیں تھیں' بالکل بے معنی اور غیر ضروری لگیں گی۔ لیکن آج سے ڈیڑھ سو سال قبل ہندو اور مسلمان دونوں کے خیالات بالکل مختلف تھے۔ وہ انگریزوں کے طور طریقوں سے ناواقف تھے اور جو تھوڑی بہت معلومات انگریزوں کے بارے میں تھیں بھی' اسے یہ پسند نہیں کرتے تھے۔ اس کے کندھوں پر جو نشان ہوتا' وہ فوجی کی ذات کا اظہار کرتا اور اسی لیے اسے فوجی سے الگ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اسی طرح سے کوئی مسلمان بھی اپنے عقیدے کے برخلاف اپنی داڑھی منڈوانا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن ان سب سے بڑھ کر ان کی نئی قسم کی پگڑیوں میں لگنے والی چمڑے کی کلغی ہوتی تھی۔ آخر چمڑا تھا بھی کیا؟ کیونکہ بہت سے ہندو چمڑہ چھونا بھی پسند نہیں کرتے۔ سبھی ہندوؤں کے نزدیک گائے کے چمڑے کا استعمال اعتراض کی بات تھی اور اسی طرح کوئی بھی مسلمان سور کے چمڑے کی کلغی کسی بھی صورت میں استعمال نہیں

کر سکتا تھا۔ اور ان کلغیوں کے بارے میں یہ شبہ تھا کہ یہ ایسی ہی مشتبہ چیزوں سے بنائی جاتی ہیں۔ لہٰذا اس کلغی کا ذرا سا بھی چھو جانا سپاہی کے مذہب کو نہ صرف بھرشٹ کرنا تھا بلکہ اسے دوسروں اور رشتہ داروں کی نظر میں معتوب بنانا بھی تھا۔ جب کہ انگریز افسروں کے لیے اس طرح کے اعتراضات فہم سے بالاتر تھے۔ سپاہیوں نے اس طرح کے غیر ضروری احکامات کو انگریزوں کی اسے عیسائی بنانے کی در پردہ کوشش سمجھی۔ وہ ایک پیشہ ور سپاہی تھا اور وہ کمپنی کی فوج میں صرف اس لیے داخل ہوا تھا کہ اُسے باعزت طریقے سے زندگی گزارنے کا وسیلہ مل جائے۔ لیکن وہ اس بات کے لیے قطعی تیار نہیں تھا کہ وہ اس کے عوض اپنے باپ دادا کے مذہب کو ترک کر کے ملحد بن جائے۔ اس کے حاکموں کو اس کی مکمل وفاداری حاصل رہی تھی اور وہ اپنی خدمات کسی دوسرے شخص کو' جو اس سے بہتر زندگی گزارنے کا وسیلہ کر سکے' بلا کسی جھجک کے منتقل کرنے کو تیار رہتا۔ اس کے ملک کی صرف یہ روایت رہی ہے کہ وہ جتنی دیر جس کا نمک کھائے اس کا وفادار رہے' لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ نمک اس کے مذہب سے برتر ہو گیا ہے۔ ہو سکتا ہے انگریز اپنی لاعلمی کی وجہ سے اس کی روزانہ کی عبادت اور عبادت کے طریقوں کو غیر سود مند نقل سمجھیں' لیکن اس کے لیے تو نجات کا یہی واحد راستہ تھا۔ اگر وہ اپنے عقیدے میں پختہ رہتا تو صرف اس وجہ سے کہ اسے دوسرے لوگوں کی عزت حاصل ہوتی ہے' چاہے اس کا مذہب کوئی بھی ہو۔ ایک راسخ العقیدہ مسلمان اسی طرح کٹر ہندو کا احترام کرتا جب کہ دونوں اس شخص سے نفرت کرتے جو اپنے آبائی مذہب سے الگ راستہ چنتا۔ اگر کلغی کی وجہ سے وہ برادری سے باہر ہو رہا تھا اور جس کے نتیجے میں وہ عیسائیت سے قریب ہو جاتا تو دنیا کی کوئی بھی طاقت اسے اس کام کے لیے مجبور نہیں کر سکتی تھی۔ اسی لیے یہ کلغی بھی ویلور میں ہونے والے غدر کی سب سے بڑی وجہ ثابت ہوئی۔ جب کہ پچاس سال بعد ہونے والے غدر کا سبب کارتوس ہوا۔ سپاہیوں کے ان احساسات سے بے خبری کی وجہ سے انگریز حیرت زدہ ہو گئے لیکن وہ اشتعال میں نہیں آئے۔ کرنل جلسپی' جو اس اسٹیشن کے کمانڈر تھے' انہوں نے بڑے ٹھنڈے دماغ سے اس بغاوت کو ٹھنڈا کر دیا۔ یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ اس نے باغیوں کے خلاف جو حملے کیے اس میں ہندوستانی سپاہی بھی شامل تھے اور گرچہ ان باغیوں کے خلاف انتقام سے بھرپور کارروائی کی گئی تاہم وہاں امن قائم نہیں ہوا اور پریزیڈنسی کے دوسرے اسٹیشنوں پر بھی اس طرح کی بے چینی محسوس کی گئی۔ لیکن فوراً ہی اس شرانگیز حکم نامے کو واپس لے لیا گیا اور گورنر نے اسی لمحے یہ فرمان جاری کیا کہ ہندوستانی فوجیوں کی مذہبی روایات میں کسی قسم کی دخل اندازی کرنے کا ان کا ارادہ نہیں۔ ویلور کی اس بغاوت کو فوراً سیاسی رنگ دے دیا گیا۔ کیونکہ قلعہ میں ٹیپو سلطان کی اولادیں بڑے عملے کے ساتھ مقیم تھیں۔ لیکن اس سے یہ بات تو صاف ظاہر ہو گئی کہ انگریز حکمراں ہندوستانی سپاہیوں کی نفسیات کو نہیں سمجھتے اور نہ ہی مقامی فوجیوں کے اندر اپنے افسروں کے نیک عمل کے لیے بھی کوئی وشواس تھا۔ اگر سپاہیوں یا فوجیوں کے پاس سرکار کے کسی عمل پر شبہ کرنے کا کوئی جواز نہ ہوتا تو کوئی بھی سیاسی

ردعمل اس کی وفاداری کو متزلزل نہیں کر سکتی تھی۔

اس واقعہ کو بمشکل تمام اٹھارہ سال گزرے ہوں گے جب فوجیوں کی وفاداری کی دوبارہ آزمائش شروع ہوئی۔ ہندوستان کی مشرقی سرحد پر اس وقت شورشیں شروع ہو چکی تھی جب برما نے آسام کو اپنے قبضہ میں کر لیا اور جس کی وجہ سے 1824ء میں باقاعدہ جنگ کی شروعات ہو گئی۔ فوجیوں کو آسام اور ارکان کے راستے برما میں جانے میں کوئی اعتراض نہیں تھا۔ لیکن پرانے رواج کے مطابق ہندوؤں کو سمندر کے راستے سے سفر کرنے کی ممانعت تھی اور اس رواج نے بعد میں مذہبی قانون کا درجہ حاصل کر لیا۔ فوج میں بھرتی کے وقت ہوئے معاہدہ کے تحت بنگال کے فوجیوں کو سمندر میں سفر کرنے کی ممانعت تھی۔ جب کہ مدراس کی فوج کو رنگون تک بذریعہ سمندر جانے میں کوئی قباحت نہیں تھی۔ لیکن بنگال کی فوج کو چٹاگانگ تک پیدل جانا پڑا اور وہاں سے برما کی زمینی سرحد پر وہ جمع ہوئے۔ ان کے یہاں سے وہاں تک جانے اور آمد ورفت کے وسائل مہیا کرنے پر سرکاری خزانے پر بہت زیادہ بار پڑا۔ اور اس وجہ سے بارک پور میں مقیم 47 ویں رجمنٹ کی فوج سے یہ کہا گیا کہ وہ خود اپنی بیل گاڑیوں کا انتظام کر کے اس مہم کے لیے روانہ ہوں۔ ظاہر سی بات ہے کہ اس کام میں فوجیوں کو کامیابی کی کوئی امید نہیں تھی کیونکہ سرکار خود اس معاملے میں ناکام رہی تھی اس لیے یہ حکمنامہ غیر مناسب تھا۔ کچھ اسی وقت ایک افواہ یہ بھی پھیلی کہ چٹاگانگ پہنچ کر اس رجمنٹ کو سمندری جہاز پر چڑھنا پڑے گا چاہے وہ اسے پسند کرے یا نہیں اور اسی لیے سپاہی اپنی جگہ چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھے اور انہیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ان کے حکام نے ان کی پیش رفت کا انتظام کر رکھا ہے۔ یہ بات اب بھی متنازعہ بنی ہوئی ہے۔ سپاہیوں میں یہ مزاحمت راموں میں ہوئی شکست کے بعد پیدا ہوئی یا کسی اور وجہ سے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ فوجی اس سے بالکل متاثر نہیں ہوئے اور انہوں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ سپاہیوں کو اپنی ذات پات سے باہر کیے جانے اور اس کے نتیجے میں ہونے والے مصائب کے خیال سے پریشانی تھی اور انہوں نے یہ معاملہ بھی اٹھایا کہ وہ کوئی ایسا کام کرنے کو تیار نہیں ہیں جس کا معاہدہ میں تذکرہ نہیں ہے۔ اس زمانے کے کمانڈر انچیف سر ایڈورڈ پیجٹ مضبوط ارادے کے آدمی تھے اور وہ سماجی رواج یا مذہبی عقیدے کے بارے میں کچھ بھی سننے کو تیار نہیں تھے۔ اور نہ ہی فوجیوں کے خوف کو وہ برداشت کر سکتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ حکم تو حکم ہے اور ہر قیمت پر اس کی تعمیل ہونی چاہیے۔ اور اگر فوجی اس حکم کو ماننے سے انکار کرتے ہیں تو یہ فوجی ضابطوں کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ اور فوج میں کسی بھی لمحے اور کسی بھی صورت میں اس طرح کی خلاف ورزی برداشت نہیں کی جاتی اور خصوصاً ایسے وقت میں جب کہ جنگی زمانہ ہو تو حکم کی تعمیل نہ کرنے والوں کے خلاف سخت سے سخت قدم اٹھایا جائے۔ کمانڈر انچیف بہ نفس نفیس یورپین فوجیوں کے ساتھ بیرک میں گئے۔ انہوں نے رجمنٹ کی پریڈ کرائی اور ان کی بے وقوفیوں پر انہیں متنبہ کیا۔ انہوں نے دو میں سے ایک راستہ اختیار کرنے کو کہا کہ یا تو وہ آگے بڑھیں یا اپنے اسلحے رکھ دیں۔ کا

اختیار دیا۔ حالانکہ سپاہیوں کے نزدیک مذہب کا مقام سبھی ضابطوں سے اوپر تھا۔ ان کا خیال تھا کہ وہ ایسے احکامات کی تعمیل نہ کر کے کوئی خلاف ورزی نہیں کر رہے ہیں' جو ان کے معاہدہ کے خلاف ہو۔ اور نہ انہیں اس کا خیال تھا کہ ان کے خلاف کوئی فوجی کارروائی کی جائے گی۔ لیکن ان کی اس حکم عدولی کی سزا انہیں ملنی ہی تھی۔ پیجٹ کے حکم پر ان بدقسمت فوجیوں پر گولیاں چلائی گئیں۔ انہوں نے اپنے زرہ بکتر بھی نہیں پہنے تھے' وہ گھبرا کر مارے ہیبت کے بھاگنے لگے۔ معاملہ یہیں ختم نہیں ہوا۔ ان کے جتنے لیڈران تھے' ان سب کو پھانسی دی گئی۔ 47 ویں رجمنٹ کو توڑ دیا گیا اور اس رجمنٹ کا نام ہی فوج کی لسٹ سے مٹا دیا گیا۔ نظم و ضبط کو سختی سے نافذ کیا گیا اور اس کے بعد فوری طور پر کوئی احتجاج نہیں ہوا لیکن بارک پور کے واقعہ نے اس بات کے وافر ثبوت فراہم کر دیئے کہ برٹش حکام فوجیوں کے مذہبی عقیدے سے بالکل بے پرواہیں۔ تکنیکی طور پر فوجیوں کا قدم جائز تھا اور وہ اس سے آگے بھی نہیں گئے' جب کہ حکام اپنے منطقی نظریے میں حق بجانب تھے لیکن وہ اس چیز کو بھول گئے کہ انسانی معاملات میں منطق ہمیشہ کارگر نہیں ہوتی۔

اس واقعہ کے پانچ سال کے بعد ہندوؤں کے ایک کٹر مذہبی طبقہ کے ذریعہ انگریزوں کے خلاف قدم اٹھانے کا ایک دوسرا معاملہ اس وقت سامنے آیا جب انگریزوں نے ان کے مذہبی ستی کے رواج کو ختم کر دیا۔ اس بات سے کوئی بھی انکار نہیں کرے گا کہ اس اصلاح کی بہت دنوں سے ضرورت محسوس کی جارہی تھی۔ اور انسانی نقطہ نظر سے بھی یہ رواج قابل نفریں تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی سرکار مذہبی معاملات میں پہلے تو سختی سے غیر جانبداری برتتی رہی اور کوئی ایسا قدم نہیں اٹھانا چاہتی تھی جس سے اس کی محکوم قوم کے ہندو یا مسلمان اس سے بدک جائیں۔ بلکہ یہاں تک کہ اس نے اپنے حدود میں مشن کی کارگزاریوں کی بھی ہمت افزائی نہیں کی۔ لیکن کوئی بھی مہذب حکومت زندہ انسانوں کے جلائے جانے کے معاملے کو زیادہ دنوں تک برداشت نہیں کر سکتی تھی اور کمپنی کے ڈائرکٹر اس بے رحمی کو ختم کرنے کے حق میں تھے۔ لارڈ ایمہرسٹ اپنی اس ذمہ داری سے بچتے رہے۔ کیونکہ ان کا یہ اندیشہ بجا تھا کہ یہ اصلاح کتنی ہی ضروری کیوں نہ ہو' ان کی نامقبولیت میں اضافہ کا ہی باعث ہوگی۔ لیکن ان کے بعد لارڈ ولیم بینٹنک جس کے ہم ہمیشہ احسان مند رہیں گے' اس نے بڑی ہمت سے کام لے کر اس رواج کو نہ صرف روکا بلکہ سخت ترین سزا کا مستحق بھی بنایا۔ انہیں اس کام میں وسیع النظر ہندو لیڈروں راجہ رام موہن رائے اور دوارکا ناتھ ٹیگور کا تعاون بھی ملا۔ لیکن ایسے لوگ بہت کم تھے جب کہ عوام کا عقیدہ تھا کہ جتنے بھی پرانے رسم و رواج ہیں ان کے بارے میں حکم نامے مذہبی کتابوں میں موجود ہیں۔ کٹر لوگوں نے اسے مذہبی مداخلت کا معاملہ بنا دیا۔ اپنے ایک فرمان میں خان بہادر خاں نے اس بات کی شکایت کی "اپنے شوہروں کی لاشوں کے ساتھ چتا پر بیویوں کا جلایا جانا ایک قدیم مذہبی عقیدہ تھا اور انگریزوں نے اس رسم کو ختم کر کے خود اپنا قانون وضع کر دیا جس سے کہ اس کی ممانعت کی گئی۔"

اس ستی پرتھا کے خاتمہ سے نہ صرف ہندوؤں کے بڑے طبقہ کے مذہبی جذبات کو ٹھیس

پہنچی بلکہ مسلمانوں میں بھی اس سے بے چینی پیدا ہوئی۔ وہ کہتے اگر عیسائی سرکار ہندوؤں کے رسم و رواج میں سختی کے ساتھ مداخلت کر سکتی ہے تو وہ مسلمانوں کو کب تک چھوڑے رکھے گی۔ ایک دہائی بھی نہیں گزری تھی کہ کچھ ایسا معاملہ ہوا جس سے ہندو اور مسلمان دونوں میں بے چینی پیدا ہو گئی۔ سردار بہادر ہدایت علی جو رتاری سکھ فوج کے صوبیدار تھے' انکا شاندار فوجی کارنامہ تھا اور ان کی وفاداری پر شک کرنے کی کوئی وجہ بھی نہیں تھی۔ ان کے باپ اور دادا دونوں پہلے فوج میں صوبیدار تھے اور کمپنی کی خدمت میں ان کی یہ تیسری نسل تھی۔ اپنے باپ کی طرح سے وہ بھی فوج میں پیدا ہوئے تھے اور فوج کو ہی اپنا خاندان اور ملک مانتے اور فوج کے علاوہ ان کا کوئی اور ملک نہیں تھا۔ انہوں نے سرکار کو ایک عریضہ پیش کیا جس کا عنوان تھا' بنگال آرمی کی بغاوت سے متعلق چند الفاظ۔' اس میں انہوں نے اس بغاوت کو افغان جنگ سے جوڑا تھا۔ کیونکہ سپاہیوں کے پاس ایسا کوئی قانونی جواز نہیں تھا کہ وہ کابل کی مہم سے صرف نظر کر سکیں۔ گرچہ جنگ کا میدان ہندوستان کی سرحد کے باہر تھا۔ تاہم انہیں اس بات کا شک تھا کہ ہندوستان کی سرحد کے باہر کی فوجی مہم میں ان کی ذات پات کے رواج کی خلاف ورزی ہوگی اور وہ ذات برادری سے باہر کر دیئے جائیں گے۔ ہدایت علی نے اس عریضہ میں یہ بھی کہا تھا کہ کابل میں ہندو فوجی اپنی روزانہ کی پوجا نہیں کر سکیں گے اور انہیں اپنی غذا مسلمانوں سے خریدنی پڑے گی جو ان کے مذہبی عقیدے کے خلاف ہے۔ اس بات کو لے کر ان میں سے بہتوں کو قید کر لیا گیا اور زبردستی ان کا مذہب تبدیل کیا گیا۔ ہندوستان واپس آنے پر انہیں یہ انکشاف ہوا کہ نہ صرف ان کے گاؤں والوں نے ان سے سارا رشتہ منقطع کر لیا ہے بلکہ دوسرے فوجی بھائیوں نے بھی ان کے ساتھ کھانے پینے' اٹھنے بیٹھنے سے انکار کر دیا ہے۔ نہ ہی مسلم فوجی ہی اس بات سے خوش تھے گرچہ ان کے یہاں ذات برادری نام کی کوئی چیز تھی اور نہ ہی انہیں برادری سے باہر کئے جانے کا خوف تھا۔ تاہم وہ اپنے ہم مذہب سے جنگ کرنے میں ہچکچا رہے تھے۔ ہدایت علی نے آگے لکھا: ''مسلمان ہمیشہ یہ بات فخریہ دوہراتے کہ کس طرح انہوں نے برٹش حکام کی خلاف ورزی کی کہ وہ گولی چلاتے وقت کبھی صحیح نشانہ نہیں لیتے تھے۔''

سیتارام ایک ہندو صوبیدار نے بھی اس بات کی شہادت دی۔ اس کے چچا بھی فوج میں جمعدار تھے۔ اور اس کا لڑکا بھی سپاہی تھا۔ سیتارام جو ہمیشہ نمک حلالی کرتا رہا لیکن اس کے لڑکے نے بغاوت میں حصہ لیا جس کے سبب اسے سخت سزا دی گئی۔ بدقسمتی سے باپ کو بھی یہ حکم دیا گیا کہ وہ فوجیوں پر گولی چلائے جانے والے اسکوائڈ کی کمانڈ کرے۔ لیکن ایک سمجھدار افسر نے اسے اس حکم سے بری کر دیا۔ سیتارام نے افغانستان میں بھی انگریزوں کی خدمت کی تھی اور افغان جنگ کے دوران اپنے ہندو ساتھیوں کے اندیشوں اور شبہات کے بارے میں اس نے جو بیان دیا تھا وہ قابل قبول سمجھا جا سکتا تھا۔ اپنے بیان میں وہ لکھتا ہے: ''سپاہی سندھ ندی کو پار کر کے ہندوستان کی سرحد سے باہر جنگ کرنے کو لے کر بہت خوف زدہ تھے۔ بہت سے لوگوں کا یہ بھی خیال تھا کہ

سرکار کی فوج کو شکست ہو گی۔ لیکن دوسروں کا خیال تھا کہ انگریز کابل پر قبضہ کرلیں گے اور کچھ ایسے بھی لوگ تھے جو معزول شہنشاہ سے ہمدردی رکھتے تھے۔ فوجی سندھ ندی کو پار کرنے سے خوفزدہ تھے کیونکہ یہ ہندوستان سے باہر کا علاقہ تھا' اور ہمارے مذہب میں سرحد سے باہر جانے کی ممانعت ہے۔ ایسا کرنے والے شخص کو ذات باہر کر دیا جاتا ہے۔ جس کے نتیجہ میں بہت سے سپاہیوں نے تو فوج کی نوکری چھوڑ دی اور بہت سے یونہی بھاگ گئے۔ ''انہیں قندھار کے راستے میں ریگستان کو پار کرنا تھا اور ایک ایسے ''خوفناک ملک'' جو ''جہنم کے کنارے واقع تھا۔'' جانا تھا۔ جب کوئی ہندو مر جاتا تو اسے جلانے کے لیے لکڑی بھی دستیاب نہیں ہوتی اور اگر وہ مقدس کاشی یا گنگا سے بہت فاصلے پر ہوتا۔ ایسے شخص کا انجام بہت دردناک ہوتا۔ کیونکہ پھر وہ مختلف ملک میں بھوکے بھیڑیوں کی خوراک ہی بنتا۔ کابل کی اس شورش کے بعد یہ بدقسمت لوگ دشمنوں کے ہاتھ میں پڑ گئے اور انہیں غلام بنالیا گیا۔ انگریزوں کے وہاں سے انخلا کے بعد وہ وہاں سے کسی صورت سے تاجروں کی مدد سے بھاگ نکلتے لیکن اس کے لیے اسے کم سے کم پانچ سو روپے دینے پڑتے اور یہ اس زمانے کے لیے بہت بڑی رقم تھی۔ اسے فیروز پور میں کمشنر کا انتظار کرنا پڑتا جو اسے تاوان کی آدھی رقم تو دے دیتا لیکن آدھی کے لیے اسے اپنے ملاقاتیوں کو تلاش کرنا پڑتا۔ اس کے بعد اس کی وہ دکھ بھری کہانی شروع ہوتی جو اس کے دوسرے فوجی بھائی اس کے ساتھ روا رکھتے۔ ''میں رجمنٹ کے کچھ لوگوں سے ملا اور جب میں نے انہیں بتایا کہ میں کون ہوں تو انہوں نے فوراً ہی مجھ پر نفریں کرتے ہوئے مجھے گندہ اور ملیچھ کہا اور کچھ نے تو یہ بھی الزام لگایا کہ میں مسلمان ہو چکا ہوں۔ اس لیے جب تک کہ اپنی برادری میں میرا داخلہ دوبارہ نہ ہو میں اپنے لوگوں سے کسی طرح کی محبت پانے کا حقدار نہیں تھا۔ ان کے اس رویے سے مجھے جو دکھ پہنچا وہ ناقابل بیان ہے۔ اور مجھے اس بات پر افسوس ہوا کہ میں کابل ہی میں کیوں نہیں رہ گیا۔ جہاں کم سے کم لوگ میرے ساتھ مہربانی سے تو پیش آتے تھے۔'' ''اور جب تک کہ اس کی شدھی نہ ہو جائے برہمن مجھے ذات بھرشٹ سمجھتے اور میں صرف مسلمانوں یا عیسائی باجا بجانے والوں سے ہی مل سکتا تھا اور انہیں سے بات کر سکتا تھا۔ افسروں کو اس بات کا علم تھا اور وہ میرے ساتھ مہربانی سے بھی پیش آتے۔ لیکن میرے پاس کوئی رقم نہیں تھی جسے دے کر میں شدھی کرا سکتا۔'' کچھ ایسا ہی رویہ اس کے ساتھ اس کے گاؤں میں بھی ہوا جہاں اسے اپنے باپ کے گھر میں رہنے کی اجازت نہیں تھی۔ ''میرا بھائی مجھے اپنا دشمن سمجھتا کیونکہ اس نے مجھے مرا ہوا سمجھ لیا تھا اور اس بات سے خوش تھا کہ اب وہ ساری جائداد کا اکیلا مالک ہو گا۔ میرے باپ نے برادری میں داخلے کے لیے سارے اخراجات اٹھائے جس کے بارے میں میرا خیال ہے کہ زبردستی مجھ پر جرمانہ لگایا گیا۔'' اس کے باپ نے اس بات کی بہت کوشش کی کہ سیتارام فوج سے علیحدگی اختیار کرلے۔ لیکن اسے ابھی اپنی بیوی اور بچوں کو تلاش کرنا تھا اور اسے یہ امید نہیں تھی کہ گھر پر رہ کر اس کی ملاقات ان سے نہ ہو سکے گی۔

افغان جنگ نے فوجیوں کو اس بات کا تجربہ کرادیا تھا کہ فوج کی نوکری ہمیشہ شان و شوکت

کی نہیں ہوتی اور سرحد سے باہر کی لڑائیوں میں وہ زیاں ہوتا ہے' جس کی بھرپائی ممکن نہیں۔ سوائے برما کی جنگ کو چھوڑ کر جہاں اسے سرحد پار نہیں کرنا تھا اور جہاں جنگ میں اس کی فتح ہوئی۔ اس کے افسران اس کے ساتھ ہمدردی کرتے لیکن ان کی یہ ہمدردی اجنبی ملک میں غلامی اور گھر پر برادری سے باہر کیے جانے کا معاوضہ نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ہی ہندوستانی فوجیوں کو یہ انکشاف تیسری بار ہوا کہ انگریز جنرل ہمیشہ فاتح نہیں ہوتے اور ان کی ساری شکست ایشین فوجوں کے ہاتھوں ہی ہو سکتی ہے۔ اس سے انہیں بھرت پور اور نیپال جنگ کی بھی یاد آ گئی جس میں بھی کمپنی کی فوج کو کوئی خاص کامیابی نہیں ملی تھی۔ اس لیے فوجی سرحد سے باہر کی جنگ سے بہت پُر امید نہیں تھے۔ کسی ہندو صوبے میں ہوئی جنگ سے تو سماجی اور مذہبی خامیوں کو دور کرنا ممکن تھا جیسا کہ مراٹھا کے عہد میں ان قیدیوں کو جنہیں زبردستی اسلام میں داخل کیا گیا تھا' وہ راجہ کے حکم کے منتظر تھے جس نے انہیں دوبارہ سوسائٹی میں ان کا کھویا ہوا وقار دلایا۔ لیکن عیسائی حکومت اس معاملے میں بالکل ناکام تھی کیونکہ ان کا خیال تھا کہ سپاہیوں کی گھریلو اور مذہبی معاملات میں دخل اندازی سے خود اپنی بدنامی ہو گی۔

1839ء میں مذہب کے معاملے میں حکومت کا رویہ بدلا لیکن اپنے مذہب کے بارے میں ان کا وہی عقیدہ رہا۔ ہندوستان میں حکومت ہی ہمیشہ سے سبھی مذہب اور سبھی طرح کے لوگوں کے مقدس مقامات کی سرپرست رہی ہے اور مذہبی امور کے تنازعوں کا تصفیہ راجا یا بادشاہ خود کرتا' چاہے اس کا کوئی بھی عقیدہ ہو۔ ایسے ہی ہندو سماج کے ایک متنازعہ مسئلہ پر اورنگ زیب سے امید کی گئی تھی کہ وہ انصاف کرے گا اور برہمن پیشوا نے رومن کیتھولک پادری کے حق میں اپنا فیصلہ کیا۔ اس رواج کے مطابق ایسٹ انڈیا کمپنی کے افسران نے ہندو مندروں اور مشہور پوری کے جگن ناتھ مندر کا انتظام و انصرام سرکار کی نگرانی میں دے دیا۔ اس سے خود ملک کے اندر کے عیسائیوں کے جذبے کو ٹھیس پہنچی اور انہوں نے اس بات پر احتجاج کیا کہ عوامی فنڈ سے مورتیوں اور مندروں کے رکھ کھاؤ کا انتظام کیا جائے۔ اور اصل بات تو یہ تھی کہ خود سرکار کے لیے مندروں سے ہونے والا فائدہ آمدنی کا بڑا ذریعہ تھا کیونکہ وہ اس چڑھاوے کی بیشتر رقم کا استعمال خود کرتے اور بہت کم مندروں کے رکھ رکھاؤ پر خرچ کرتے۔ تاہم یہ معاملہ اصول کا تھا اور اس میں فائدہ اور نقصان کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اور اسی لیے برطانیہ میں ہونے والے عوامی دباؤ کے تحت برطانیہ کو مجبور ہو کر ہندو اور مسلمانوں کے مقدس مقامات کو خود ان کے جائز وارثوں کے سپرد کرنا پڑا اور یہ ان کے مذہبی معاملات میں غیر جانبدارانہ رویے کا ثبوت بھی تھا اور اس سے ہندوستانی عوام خوش بھی ہوئے۔ اگر انہوں نے ہر طرف مشن کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں کا شاہدہ نہ کیا ہوتا' یہ مشنری جگہ جگہ آتے' اسکولوں میں' اسپتالوں میں' جیلوں میں اور بازاروں میں بھی۔

وہ سب سے زیادہ آزار پہنچانے والی باتیں بازاروں میں کرتے۔ اپنے مذہب کے پرچار

کے حق کو کوئی برا نہیں سمجھتا لیکن وہ صرف حضرت عیسیٰ کے پیغام کو عوام تک پہنچانے کے علاوہ ہندوستانی عوام کے عقیدوں، رسم ورواج اور عمل کو اپنے طنز کا نشانا بناتے اور اس بات میں کوئی فرق نہیں کرتے کہ وہ بہت سے خداؤں کو ماننے والے ہندوؤں یا ایک خدا کے پرستار مسلمانوں سے، جو خود حضرت عیسیٰ کو پیغمبر سمجھتے، کوئی امتیاز روا نہیں رکھتے۔ یہ مشتعل عوام عیسائی مشنریوں کو عام طور پر عیسائی سرکار کا آلۂ کار سمجھتے کیونکہ اکثر ان مشنریوں کے ساتھ پولیس بھی ہوتی۔ اس بابت سرسید احمد کا کہنا ہے۔ "عام طور پر لوگ یہ سمجھتے تھے کہ سرکار ہی ان مشنریوں کی تقرری کرتی اور اس کا سارا خرچ خود اٹھاتی ہے۔" وہ آگے لکھتے ہیں "اگر ہندو اور مسلمان دونوں اپنے مذہب کی باتیں اور تبلیغ اپنے گھروں، مندروں یا مسجدوں تک محدود رکھتے، یہ مشنری عوامی مقامات پر جاکر ان کے عقیدوں کی بہت اشتعال انگیز انداز میں تنقید اور مذمت کرتے۔ سپاہی اس بات سے بھی بے خبر نہیں تھے کہ فوج میں جو پادری ہوتے ہیں وہ سرکار سے تنخواہ پاتے اور اس زمانے میں اس کے لیے مستعمل اصطلاح پادری لاٹ کا مطلب بھی یہی نکلتا کہ وہ پادری جسے حکام کے طبقہ میں اعلیٰ حیثیت حاصل تھی۔"

ان مشن کے لوگوں کے تبلیغ کا طریقہ بہت اعلیٰ اور متاثر کرنے والا ہوتا لیکن ان کی ماہر تعلیم کی حیثیت سے یہ مہارت ہندوستان کے کٹر پنتھیوں کے نزدیک باعث تشویش تھی۔ کیونکہ مشنری صرف اپنے طبقہ کے دماغ کو روشن کرنے تک محدود نہ رکھتے بلکہ وہ اس بات کی جو ان کے نزدیک بہت اہم تھی، کوشش کرتے کہ وہ اپنے شاگردوں کی روح کو نجات کا راستہ دکھلا سکیں۔ ان کے خیال میں نجات کا صرف ایک ہی راستہ تھا کیونکہ عیسائیت اپنے کو اور صرف اپنے کو صداقت پر مبنی سمجھتی ہے۔ اور ان کے نزدیک مغربی تعلیم کا مقصد ہی تبدیلیٔ مذہب ہے۔ ایک روشن دماغ ہندو اپنی وسیع النظری کے سبب یہ کہہ سکتا ہے کہ سبھی مذاہب کا مقصد خدا تک پہنچنا ہے لیکن ایک مسلمان جس کا عقیدہ یہی ہے کہ صرف وہی سچے مذہب کا پیرو کار ہے، وہ اس طرح کی کوئی رعایت دوسروں کو دینے کے لیے تیار نہیں۔ اور ہندوؤں کی اکثریت جو اپنے پورو جوں کے پرانے فلسفے سے ناواقف ہے، وہ یہی سمجھتے تھے کہ رسم ورواج نے جن تیوہاروں اور اصولوں کو ماننا لازمی قرار دیا ہے، صرف انہیں کے ذریعہ ابدی نجات حاصل ہو سکتی ہے۔ اگر مسلمان اپنی اولادوں کے ناخلف ہو جانے یا مذہب سے بے گانہ ہو جانے کے لیے خود کو اخلاقی طور پر ذمہ دار نہیں سمجھتا تو ان کے برخلاف ایک ہندو کو یہ خوف لگا رہتا کہ اس کی آتما کو اس وقت تک چھٹکارا حاصل نہیں ہوگا جب تک کہ اس کا اپنا لڑکا موت کے بعد کی ساری رسموں کو پوری نہ کرے۔ اور اسی لیے ہندوستان میں مشنری اور غیر عیسائی عوام کے درمیان مفاہمت کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ ہندوستانی محسوس کرتے کہ ان کے ان مذہبی دشمنوں کو ہر طرح کی مراعات حاصل ہیں اور اکثر پوشیدہ یا کھلے عام بھی انھیں حکومت کی طرف سے تعاون ملتا۔ اس کے علاوہ بہت سے افسران، چاہے وہ سول یا ملٹری کے ہوں، وہ بھی اس طرح کے مذہبی جذبے سے پُر ہوتے۔ اور وہ اپنے ضمیر سے مطمئن ہو کر یہ دلیل بھی دے سکتے تھے

کہ وہ اپنی ان ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں ناکام رہیں گے اگر جن لوگوں کے مقدر کو بہتر بنانے کی ذمہ داری انہیں سونپی گئی ہے' وہ ان سے اس بیش بہا معرفت کے خزانے کو پوشیدہ رکھیں۔ کچھ دوسرے لوگ سیاسی ضرورتوں کے تحت بھی ایسا کرنا ضروری سمجھتے۔ کیونکہ عیسائیت خود حاکم اور محکوم کے درمیان ایک ایسا گہرا رشتہ قائم کردے گی جو ابھی تک مفقود ہے۔ چاہے جو بھی ہو' انجیل مقدس کی تعلیم نہ صرف مشن کے اسکولوں میں بلکہ کچھ سرکاری اسکولوں میں بھی دی جاتی تھی۔ ہنری کارے ٹکر' جو خود ایک پادری تھا' وہ اس بات کی پورے زور شور سے حمایت کرتا اور کانپور کے فری اسکول اور بنارس کے جے نورین اسکول کا حوالہ بھی دیتا۔ اسے سرکار کی طرف سے مالی تعاون دیا جاتا لیکن ایسے اسکولوں کو عیسائیت کی بنیادوں پر صرف پادری لوگ چلاتے۔ سرسید احمد خاں انجیل مقدس کی تعلیم کے اتنے مخالف تو نہیں تھے لیکن جس طریقے سے اس کی تعلیم دی جاتی تھی' وہ اس کے مخالف تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ مشن کے اکثر اسکولوں میں اس طرح کے سوالات پوچھے جاتے تھے۔ "تمہارا خدا کون ہے؟" "تمہارا نجات دہندہ کون ہے؟" اور ان کے جوابات وہی دے سکتے تھے جو طلبہ عیسائی نظریات کے حامل ہوں۔ انہوں نے اس بات کی بھی شکایت کی کہ بہت سے کانونٹ کے تعلیم یافتہ افسران اور ملٹری کے لوگ اپنے ماتحتوں سے صرف مذہب کی ہی باتیں کرتے ہیں۔

مشن کی یہ سرگرمیاں صرف تعلیمی اداروں تک محدود نہیں تھیں۔ ریوینڈ گوپی ناتھ نندی جو ایک بنگالی پادری تھے اور فتح پور میں کام کررہے تھے' جب وہاں ٹی آر ٹکر ضلع جج تھے۔ اُن کا کہنا ہے کہ "جیل کے قیدیوں کو عیسائیت اور عام معلومات کا درس عیسائی استاد دیتے اور ہر اتوار کی صبح حمد و مناجات کی دعائیں خود کراتا۔ انہیں یہ رعایت ان کے مذہبی مجسٹریٹ نے دے رکھی تھی۔ ضلع جج اور مجسٹریٹ اس کے علاوہ شہر کے دوسرے حکام مشن کی ان سرگرمیوں میں خاص دلچسپی لیتے اور ان کی عبادت میں نہ صرف مدد کرتے بلکہ نیک مشورے دیتے اور روپے پیسے سے بھی مدد کرتے۔ جب مقامی لوگوں کی تبدیلیٔ مذہب کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا تو ان میں سے آنریبل مسٹر کالون کے مشورہ پر چھ لوگوں کو چھوٹے درجے کا کاشتکار بنادیا گیا۔" اس طرح مجسٹریٹ اور فتح پور کے ضلع جج قیدیوں میں اس طرح تبلیغ کی حوصلہ افزائی کرتے بلکہ شمال مغرب صوبوں کے لیفٹیننٹ گورنر بہ نفس نفیس 'ان نئے عیسائیوں کے فلاحی کاموں میں زیادہ دلچسپی لیتے اس لیے عام لوگ یہ سوچنے میں حق بجانب تھے کہ سرکار رعایا کو عیسائی بنانے پر تلی ہوئی ہے۔

ان کے ان شبہات کو جیلوں کے لیے بنائے گئے نئے قوانین سے مزید تقویت ملی۔ 1845ء میں نیا قانون پاس کرکے جیلوں میں مشترکہ کھانے کے احکامات نافذ کیے گئے۔ ہندوستانی جیلوں میں آج بھی یہی روایات چلی آرہی ہے کہ کچھ قیدیوں کو جیل کے سارے قیدیوں کے لیے کھانا پکانے کی ذمہ داری سونپ دی جاتی ہے۔ پہلے زمانے میں قیدی بھی ذات پات کے اصول پہ سختی سے کاربند ہوتے اور اس کے تحت ہر شخص اپنا کھانا خود پکاتا لیکن اس طرح کے نظام میں بہت سی

خامیاں تھیں۔اور نئے قوانین کے تحت یہ کہا گیا کہ کسی بھی جیل میں قید سارے ہندو قیدیوں کے لیے اب کوئی برہمن قیدی کھانا پکائے گا۔اس سے اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کے جذبات مزید مجروح ہوئے کیونکہ برہمنوں کے اندر خود بھی اتنی ذاتیں تھیں کہ کوئی برہمن کسی دوسرے برہمن کے ساتھ اپنی ذات کے تشخص کے زیاں کے ساتھ ہی کھانا کھا سکتا تھا۔اس نئے نظام کو مذہب کی تبدیلی کی پوشیدہ کاوش سمجھا گیا اور اب یہ خوف صرف شہریوں تک ہی محدود نہیں رہ گیا۔بلکہ یہ بھی افواہ اڑائی گئی کہ جلد ہی مشترکہ کھانے کا نظام فوج میں بھی لاگو کیا جائے گا۔ 46-1845ء میں پٹنہ میں ہوئی بغاوت اسی شورش کا نتیجہ تھی اس کے باوجود بھی نئے قوانین ان جیلوں میں لاگو کر دیئے گئے۔ ان سے عوام کے جذبات مزید مجروح ہوئے۔اسے لے کر خان بہادر نے انگریزوں پر الزام لگایا "قیدیوں کو اس بات کے لیے مجبور کیا گیا کہ وہ اب انہیں کی روٹی کھائیں۔" جس کا مقصد تبدیلیٔ مذہب ہی ہے۔

گوپی ناتھ نندی مزید بتاتے ہیں کہ جب پٹواریوں سے یہ کہا گیا کہ وہ ناگری رسم الخط میں ہندی سیکھیں تو انہیں مسلم ڈپٹی کلکٹر حکمت اللہ خاں کے اعتراض کے باوجود مشنری کے اسکولوں میں بھیجا گیا' جہاں انہیں صرف زبان یا صرف رسم الخط کی تعلیم نہیں دی جاتی تھی۔گوپی ناتھ لکھتے ہیں:"مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی ہو رہی ہے کہ تقریباً 300 معمر اشخاص نہ صرف انجیل پڑھ رہے ہیں بلکہ عبادت میں بھی شامل ہو رہے ہیں اور ان میں سے ہر شخص کو نئی انجیل کی ایک ایک کاپی گھر لے جا کر پڑھنے کے لیے دی گئی۔ مشنری کرنل اور باغی لیفٹیننٹ جو اپنے ماتحت سپاہیوں کو عیسائیت کا درس دیتے' مجسٹریٹ اور جج مقامی پادریوں کو جیل میں جا کر روزانہ مقدس کتاب کی تعلیم دینے کے لیے بھیجتے' معمر پٹواری اپنے گھروں کو عیسائیوں کی مذہبی کتابوں کے ساتھ جاتے تو یہ غیر فطری بات نہیں تھی کہ اگر عام لوگ سرکار کی اس طرح کی ساری حرکتوں کو تبدیلی مذہب کی کوشش سمجھتے۔حد تو یہ ہے کہ عوام کا روشن خیال طبقہ بھی اب حاکم اور انتظامیہ کے درمیان کوئی فرق محسوس نہیں کرتا۔سر سید احمد خاں لکھتے ہیں کہ ڈپٹی انسپکٹر آف اسکول عام طور پر مقامی پادری ہوتا۔

اسی پس منظر میں ہم 1850ء کے اکیسویں ایکٹ کو دیکھیں گے جس کے تحت نئے عیسائیوں کو اپنی موروثی جائیداد میں وارث بنایا گیا تھا۔نظریاتی طور پر تو اس قانون میں کوئی خامی نہیں تھی۔کیونکہ کسی بھی شخص کو اس کے ذاتی عقیدے کی بدولت جب تک کہ وہ ملک کے قانون کو نہ توڑے نقصان نہیں پہنچایا جا سکتا تھا۔تاہم ہندو اور مسلمان دونوں نے اس قانون کو نئے عیسائیوں کو دی جانے والی رعایت ہی سمجھا۔ہندومت تو پرانا مذہب ہے اور اس نئے قانون سے اسے کوئی فائدہ نہیں ہوا' اسی طرح نو مسلموں کو بھی اس سے کوئی خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوا۔کیونکہ اسلام میں کسی مشرک کی جائیداد کا وارث ہونا منع ہے۔اس لیے اس قانون کو دونوں مذاہب کے خلاف سمجھا گیا۔ہندوؤں کے لیے تو یہ اور بھی سخت تھا کیونکہ مذہب تبدیل کرنے والوں کو ایسے حقوق

دیئے گئے جس کے تحت انہیں اپنے باپ کے مرنے کے بعد کی ساری ذمہ داریوں سے مستثنیٰ کر دیا گیا۔ اس لیے ہندوؤں نے دو طرح کا ہونے والا نقصان سمجھا۔ ایک تو یہ کہ زندگی میں ان کا ایک لڑکا ان سے الگ ہو جاتا۔ دوم یہ کہ مرنے کے بعد کوئی مذہبی طریقے سے مرنے والے کے لیے پوجا پاٹ کی اس پر کوئی ذمہ داری نہیں ہوتی' تاہم وہ جائیداد کا وارث بن جاتا۔ مسلمانوں کے نزدیک یہ عیسائیت قبول کرنے کے لیے ایک لالچ تھا۔ کیونکہ مسلمانوں کو بھی اب مشنریوں کی اس طرح کی سرگرمیوں سے بچنا مشکل ہو گیا تھا۔ گوپی ناتھ نے جن 24 لوگوں کی تبدیلیٔ مذہب کرائی تھی' ان میں سے دس پیدائشی طور پر مسلمان تھے۔

اس طرح کے ماحول میں سبھی عوامی رفاہی کاموں کو بھی شبہے کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔ سڑکوں اور قومی شاہراہوں کی تعمیر کے وقت راستے میں پڑنے والے ایک دو مندروں کو گرایا جانا بھی' چاہے یہ مواصلات کے ذرائع کو بہتر بنانے کے مقصد کے ساتھ ہی کیوں نہ کئے جائیں' انہیں بھی جاہل عوام اپنی مقدس عمارتوں کو ختم کئے جانے کی عیارانہ مقصدیت ہی سمجھتے۔ اسی طرح اسپتالوں کی تعمیر بھی اسی نظریے سے دیکھی گئی۔ یہاں صدیوں سے چلے آرہے پردے کے رواج کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی۔ ایسا ہمیں ہدایت علی کی تحریروں سے معلوم ہوتا اور اسپتال میں بھرتی مریضوں کو ذات پات کی تفریق کے بغیر ایک ساتھ ہی رکھا جاتا۔ قحط کے زمانے میں معصوم بچوں کا یتیم خانے میں داخلہ بھی اسی نگاہ سے دیکھا گیا کیونکہ ان کی پرورش عیسائیت کے تحت کی گئی۔

1852ء میں برما کے خلاف دوبارہ جنگ چھڑ گئی اور اس بار بھی فوجیوں کو سمندر کے اس پار بھیجنے کے لیے کہا گیا۔ لیکن اس بار لارڈ ڈلہوزی نے بنگال کے فوجیوں کو کالا سمندر پار کرنے کے لیے مجبور نہیں کیا بلکہ ان سے کہا کہ وہ رضاکارانہ طور پر اپنی خدمات دیں۔ پچھلی بار انکار کرنے پر انہیں جو سزائیں دی تھیں انہیں بھول کر 38 ویں مقامی انفینٹری نے پھر انکار کر دیا۔ لارڈ ڈلہوزی نے سخت قدم اٹھائے جانے کو مصلحت کے خلاف سمجھا۔ کیونکہ وہ قانونی طور پر انہیں بغاوت کا مجرم نہیں قرار دے سکتا تھا۔ اور کوئی مضبوط آدمی صرف انصاف کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے کمزوروں کو مجبور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ افغان جنگ کی یاد ابھی تازہ تھی اور فوجیوں کو ایک بار پھر اپنے مذہب میں مداخلت کا شبہ ہوا۔

1855ء میں ایک ایسا موقع آیا جو حکومت کو خبردار کر سکتا تھا۔ حیدرآباد میں کچھ مسلم گھوڑسواروں نے کرنل کولن میکنزی پر بولارام کے نزدیک جان لیوا حملہ کیا کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ کرنل نے محرم کے جلوس پر پابندی عاید کر دی ہے۔ ایک غلط فہمی کی بنا پر کرنل میکنزی نے 20 ستمبر کو ایک کینٹونمنٹ آرڈر جاری کر دیا۔ ''کوئی بھی جلوس باجے گاجے اور شور شرابے کے ساتھ 22/ ستمبر سنیچر کی آدھی رات سے 23/ ستمبر اتوار کو بارہ بجے تک نکالنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ حالانکہ 21/ کو آرڈر میں ترمیم کرتے ہوئے اسے دوبارہ جاری کیا گیا جس میں کہا گیا کہ 23/ ستمبر

اتوار کے دن جو تہوار کا دن ہے' اس دن جلوس نکالنا ضروری ہے۔" گورنر جنرل ان کاؤنسل نے کہا :"یہ آرڈر بہت سخت تھا۔"، "پہلا حکمنامہ نہ صرف غیر ضروری تھا بلکہ قابل اعتراض بھی۔ کیونکہ اس نے محرم کو عیسائی سبت کے مد مقابل کر دیا تھا۔ اور اس لیے اس حکم امتناعی میں عیسائی مذہبی جذبہ کار فرما تھا۔" یہ حکم نامہ دوسرے دن واپس لے لیا گیا۔ لیکن اس سے جو نقصان ہونا تھا وہ ہو کر رہا۔ اس حکم نامے کی تشہیر بہت زیادہ ہو گئی تھی اور اس لیے اہم سڑکوں پر سے جلوس کا گزرنا منع کر دیا گیا۔ ان گھوڑ سواروں نے غصہ میں مشتعل ہو کر نہ صرف اپنا جلوس اتوار کو نکالا جس کی ترمیم شدہ حکم نامے سے انہیں اجازت دی گئی تھی بلکہ اس ممنوعہ راستے سے بھی جلوس نکالا جو کرنل کے بنگلے سے ہو کر گزرتا تھا۔ وہ اپنے بنگلہ کے لان میں کچھ افسروں اور پادریوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ ایسے جلوس نہ صرف باجے گاجے کے ساتھ نکلتے بلکہ زوردار طریقے سے ماتم بھی کیا جاتا۔ وہ شور شرابہ سن کر گھبرا کر خود جلوس کے سامنے آگیا اور جلوس واپس لے جانے کا حکم دیا۔ ان میں سے جلوس کے کچھ آدمیوں نے غصہ میں آکر اس سے کہا کہ یہ سڑک ان کی ہے اور وہ اس پر جلوس نکالیں گے۔ لیکن کرنل نے' جو غصہ میں تھا' ان کے دو علم چھین لیے۔ مشتعل مجمع پسپا ہو گیا لیکن تھوڑی دیر بعد جب وہ کچھ لوگوں کے ساتھ شام کی سیر کو نکلا تو نہ صرف اس پر بلکہ اس کے ساتھ خواتین اور دیگر لوگوں پر بھی جان لیوا حملہ کیا گیا۔ ان گھوڑ سواروں نے بعد میں کرنل کارپینٹر کے سامنے بیان دیا۔ "وہ حکومت کے ملازم ہیں اور حکومت کے لیے اپنی جان دینے کو بھی تیار ہیں۔ لیکن ان کا مذہب ان کی جان سے بھی پیارا ہے اور وہ اس کی بے حرمتی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اور وہ اس وقت تک اپنا کمر بند نہیں کھولیں گے (ہتھیار نہیں ڈالیں گے) جب تک کہ بریگیڈیر اور بریگیڈیر میجر کو عدالت میں نہیں کھینچ لائیں گے۔" بعد میں کورٹ آف انکوائری بٹھائی گئی' جس نے بریگیڈیر کے رویے کی کوئی جانچ نہیں کی۔ لیکن لارڈ ڈلہوزی نے بعد میں یہ کہا کہ بریگیڈیر نے خلاف مصلحت کام کیا تھا۔ اس کے نتیجہ میں صرف دو آدمیوں کو چھوڑ کر تھرڈ کیولری کے سبھی مقامی لوگوں کو ملازمت سے برطرف کر دیا گیا اور بریگیڈیر کے محافظ دستے کے دو ہندو افسروں کو بھی اس طرح کی سزا دی گئی کہ وہ باغیوں کو روکنے میں ناکام رہے۔

یہ واقعہ اس بات کا بھی اظہار کرتا ہے کہ کس طرح سپاہیوں کے مذہبی جذبے کو ٹھیس پہنچانے والے حکم نامے بغیر کسی مصلحت کے جاری کر دیئے جاتے۔ 20ر ستمبر کو بریگیڈیر میجر کو اس بات کا کوئی علم نہیں تھا کہ 23ر ستمبر کا دن اس تہوار کا سب سے اہم دن ہوتا ہے۔ اور بریگیڈیر کو اس بات کا بھی کوئی احساس نہیں تھا کہ علم کو کھینچ لینا ان کے مذہبی عقیدے کو زبردست ٹھیس پہنچائے گا۔ اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ محرم شیعوں کا تہوار تھا اور فوج میں بہت کم شیعہ داخل ہوئے تھے۔ کیونکہ ہندوستان میں سنی بھی اور کچھ جگہوں پر ہندو بھی ان جلوسوں میں بڑی تعداد میں شریک ہوتے تھے۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے برٹش حکام اپنے ماتحتوں کے جذبات سے بالکل بے خبر تھے۔ ورنہ پچھلے پچاس سالوں میں لگاتار جو انتظامی اور قانونی ضابطے وہ جاری کرتے رہے

اس سے جذبات کو مجروح کرنے والے تاثرات کا انہیں علم ہو گیا ہوتا۔ لیکن ان کے ان شبہات کے ازالے اور پڑھے لکھے طبقے کو اپنا ہم خیال بنانے کی کوئی شعوری کوشش بھی نہیں کی گئی۔

بولارم واقعہ کے کچھ دنوں کے بعد بلکہ اسی سال کچھ ایسے لاشعوری کام بھی کیے گئے جس کی وجہ سے دبی ہوئی چنگاری شعلہ بن کر بھڑک اٹھی۔ عوام یوں بھی فلاح عام کے کاموں 'چاہے وہ ریلوے یا ٹیلیگراف یا اور اسی طرح کے دیگر کام ہوں' وہ انہیں ہمیشہ سماجی ڈھانچے کو اتھل پتھل کرنے کی کوشش کی نگاہ سے دیکھتے رہے اور ان کے شبہات کو مزید جلا 1855ء میں کلکتہ سے مسٹر ایڈمنڈ کے حکم نامہ سے ملی۔ ریلوے کی ٹرینوں میں بیٹھنے کی جگہوں پر ذات پات کی کوئی تفریق کا خیال نہیں رکھا گیا تھا۔ اور اونچی ذات کے برہمنوں کو اکثر کمتر ذات اور جنہیں وہ اچھوت سمجھتے ان کے ساتھ ان کے نزدیک بیٹھنا پڑتا۔ سفر کے دوران یا تو اکثر اسے بھوکا رہنا پڑتا یا پھر اپنے سارے ریتی رواج اور کھانوں سے متعلق پوجا پاٹ کو تیاگ کر اسے وہ کھانا کھانا پڑتا جو اسٹیشنوں پر دستیاب ہوتا اور ایسا کرنے سے انہیں بطور پشچاتاپ ان ساری تقریبات کو کرنا پڑتا جس سے کہ وہ اپنی برادری میں دوبارہ شامل ہو سکیں اور اس سے اس کی جیب پر بہت زیادہ بوجھ پڑ جاتا۔ انہیں یقین ہونے لگا تھا کہ یہ وہی شراپ ہے جس میں کالی یگ میں ذات پات کی تفریق کے بغیر یکساں سماج کا تصور کیا گیا تھا۔ اور اس یگ کو لانے میں ملیچھ غیر ملکی سرکار تعاون کر رہی ہے۔ مسٹر ایڈمنڈ نے اپنے خط میں یہ کہا تھا کہ اب چونکہ نقل و حمل کے بہتر وسائل کے ذریعہ ملک کے سارے حصوں کو ملا دیا گیا ہے اور آمد و رفت میں سہولت ہو گئی ہے اور سماج کے ڈھانچہ میں بھی مغربی تعلیم کی بدولت بہت زیادہ تبدیلی آگئی ہے' وقت آگیا ہے کہ سارے ملک کے لوگ اب روحانی نجات حاصل کرنے کے لیے ایک مشترکہ عقیدے کو بھی اپنائیں۔ شاید بلا تفریق مذہب و ملت مشنری سرگرمیاں اپنے عروج پر پہنچ چکی تھیں اور عام طور پر یہ سمجھا جا رہا تھا کہ یہ حکم نامہ حکومت نے ہی جاری کیا ہے۔ کیونکہ اس کی نقل حکومت کے ہر شعبے میں بھیجی گئی تھی۔ بعد میں لیفٹیننٹ گورنر نے ایک فرمان جاری کر کے اس بات سے انکار کیا کہ ایسا کوئی حکم نامہ سرکار کی طرف سے جاری کیا گیا ہے اور نہ ہی سرکار لوگوں کے مذہبی طور طریقوں اور عبادات کی رسموں میں کسی قسم کی مداخلت کا ارادہ رکھتی ہے۔ انہوں نے اس بات کی بھی وضاحت کی کہ مسٹر ایڈمنڈ کے خیالات سے سرکار بالکل متفق نہیں ہے۔ اس کے باوجود بھی شک و شبہات اسی طرح قائم رہے۔ کیونکہ عام لوگ ہر انگریز کو سرکار ہی سمجھتے تھے۔ لیکن اس کے ٹھیک اگلے سال کئے گئے دو قانونی اقدامات سے کٹر قسم کے لوگوں کا سکون درہم برہم ہو گیا۔

اہم واقعات سے پُر اپنی مدت پوری کرنے کے بعد لارڈ ڈلہوزی 1856ء میں ہندوستان سے چلے گئے۔ اور ان کی جگہ لارڈ کیننگ نے لی۔ اس نئے گورنر جنرل کے بارے میں لوگوں کو کچھ بھی نہیں معلوم تھا۔ اور اس کی وہ تمام صلاحیتیں جن کی وجہ سے ہندوستان پر انگریزوں کا تسلط بھی قائم رہا اور جسے عوام کا بھی اعتماد حاصل ہوا' ابھی تک اجاگر نہیں ہوئی تھیں۔ ان کی حکومت کے

پہلے دو قانونی اقدامات کو عوام نے بالکل نامنظور کر دیا اور ان کے ان اقدامات کو لوگوں نے اس سچائی کا مظہر سمجھا جس کی بابت افواہ پھیل چکی تھی کہ انہیں برٹش حکومت نے صرف اس لیے بھیجا ہے کہ وہ ہندوستان کے ہندو اور مسلمانوں کو عیسائی بنا سکیں۔ لارڈ ڈلہوزی نے اپنی رخصت کے آخری سال ہندو بیوہ دوبارہ شادی قانون (Hindu widow remarriage act) کا ڈرافٹ تیار کر لیا تھا۔ جسے منظوری لارڈ کیننگ نے اپنے تعیناتی کے پہلے سال ہی دے دی۔ اسے ستی رواج کو ختم کئے جانے جیسے قانون کا تتمہ سمجھا جا سکتا تھا۔ لیکن اس اصلاح کی وکالت پُر زور طریقے سے بنگالی ہندو اسکالر ایشور چند ودیا ساگر نے کی تھی۔ اور اس کے لیے دلیلیں بھی انہوں نے پرانی مذہبی کتابوں سے دی تھیں۔ ایسا سمجھا گیا تھا کہ یہ قانون کٹر مذہبی لوگوں کے لیے قابل قبول ہو گا کیونکہ اس کی اجازت قدیم مذہبی کتابوں میں دی گئی ہے اور یہ لوگ پرانے ریت رواجوں کے قائل ہیں، انہیں اسے ماننے میں کوئی دشواری نہیں ہو گی۔ اس سے چند بیواؤں کو راحت ملی، جو دوبارہ شادی کرنا چاہتی تھیں۔ لیکن رواج کے مطابق ایسا نہیں کر پا رہی تھیں۔ یہ بھی ملحوظ رکھنے کی بات ہے کہ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں غیر برہمن بیوائیں دوبارہ شادی کر لیتی تھیں اور ہمیشہ انہیں بیوگی کی زندگی نہیں گزارنی پڑتی تھی۔ لیکن ان اصلاح پسندوں کا عوام میں کوئی اثر نہیں پڑا۔ اور وہ مروجہ ریت رواج میں ذرا بھی تبدیلی اپنے مذہب میں راست مداخلت سمجھتے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اس قانون کا فائدہ بہت کم بیواؤں نے اٹھایا۔ عوام مستقبل کے اندیشے سے بہت پریشان تھے۔ یوں بھی عیسائی سرکار کے ہر فلاحی کام کو شبہے کی نظر سے دیکھا جا رہا تھا اور اس لیے تمام اندھی عقیدت رکھنے والے لوگوں نے اس قانون کو اپنے سماجی اور مذہبی ریت رواج میں براہ راست مداخلت سمجھا۔ اس نئے قانون کو بہت زیادہ طنز و استہزا کا نشانہ بنایا گیا۔ اور جن لوگوں نے اس کا حوالہ سنسکرت کی مقدس کتابوں سے دیا تھا، انھیں بھی نشانہ بنایا گیا۔ لیکن اس طنز و استہزاء سے عوام کے جذبات کی تسکین نہیں ہوئی اور چاروں طرف 'مذہب خطرے میں ہے' کا نعرہ بلند ہو گیا۔

اسی سال جولائی میں ایک اور حکم جاری کیا گیا جس کا براہ راست اثر جنگجو طبقے پر پڑا جس سے لوگ عام طور پر بنگال آرمی میں داخل ہوئے تھے۔ اس سے پہلے بھی دو موقعوں پر اعلیٰ ذات کے بنگالی فوجیوں نے سمندر پار جانے سے انکار کر دیا تھا۔ مدراس آرمی سے ایسی کوئی پریشانی کبھی لاحق نہیں ہوئی۔ کیونکہ ان کی ملازمت کے ضابطوں میں سمندر پار جا کر جنگ کرنے کا حکم بھی شامل تھا۔ گرچہ وہاں بھی برہمن فوجیوں کی کمی نہیں تھی۔ بنگال آرمی کی چھ رجمنٹ کو انہی شرائط کے ساتھ بھرتی کیا گیا تھا۔ اس لیے انہیں برما میں جا کر جنگی ڈیوٹی کرنے میں کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اور یہ سمجھ میں آنے والی بات بھی نہیں تھی کہ مستقبل میں ہونے والی غلطیوں کے لیے ایسی ملازمت کی شرطیں نہ رکھی جاتیں۔ لیکن جن لوگوں کے لیے ایسی شرائط نہیں تھیں، ان کے حقوق میں رخنہ پیدا کرنے کا سرکار کا کوئی ارادہ بھی نہیں تھا۔ لارڈ ڈلہوزی معاہدے کی ساری شرائط پر سختی سے

کاربند رہا اور اس کے زمانے میں 38ویں مقامی انفینٹری کے فوجیوں کے برما جانے سے انکار کرنے پر کوئی پیچٹ انہیں سزا دینے بھی نہیں آیا۔ اور اکثر سرکار کو اس بات میں دقت بھی محسوس ہوئی کہ جو لوگ برما میں ایک عرصہ سے ملازمت میں ہیں انہیں واپس بلا کر ان کی جگہ پر دوسروں کو بھیجا جائے اور لارڈ کیننگ نے بجا طور پر یہ سوچا کہ اب ہونے والی بھرتیوں میں اس طرح کے معاہدے کی شق کو ختم کر دیا جائے تاکہ مستقبل کی پریشانیوں سے بچا جا سکے۔ انہیں اس بات کا اندیشہ بھی نہیں ہوا کہ اس طرح سے تبدیل شدہ شرائط سے سپاہیوں کے مذہبی جذبات کو ٹھیس لگے گی کیونکہ یہ تو نئے بھرتی ہونے والوں کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا تھا کہ وہ ان شرائط کے ساتھ بھرتی ہونا چاہیں تو ہوں ورنہ نہیں۔ لیکن ایک بار بھرتی ہونے کے بعد انہیں سمندر پار یا افغانستان جانے سے انکار کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔ لیکن سپاہیوں نے اس عام حکم نامہ کو بہت خطرے کی نگاہ سے دیکھا۔ گرچہ اس کا براہِ راست اثر ان پر نہیں پڑ رہا تھا لیکن انہیں اندیشہ تھا کہ ان کی اولادوں کے لیے فوج کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے گا۔ اب ان کے سامنے دو ہی متبادل رہ گئے تھے۔ یا تو وہ اپنے اجداد کے پیشہ کو چھوڑیں یا پھر اپنے مذہب کو ترک کر دیں۔ انہوں نے یہ بھی سمجھا کہ سرکار اب تمام باوقار لوگوں کو عزت کی نوکری دینے سے انکار کر رہی ہے۔ اور مستقبل میں اپنے مذہبی ریت رواج کو چھوڑنے سے ہی ان کی روزی روٹی کا انتظام ہو سکے گا۔ اگر انھیں اس قانون سے مستثنیٰ کیا گیا ہے تو بھی ان کی اولادوں اور پوتوں کو گناہوں سے بھرپور روٹی کھانی پڑے گی اور اس طرح ان کا تعلق اُن سے اسی زندگی اور بعد کی زندگی میں ختم ہو جائے گا۔ اس لیے فوج میں بھرتی کے لیے اب اعلیٰ طبقہ کے لوگوں کی درخواستیں بہت کم موصول ہوتیں اور اب فوج کی نوکری بھی ان طبقوں میں مقبول نہیں رہ گئی۔ اس نامناسب وقت پر جاری کیے گئے اس نامناسب حکم نامہ نے لوگوں کو مکمل یقین دلا دیا کہ اب ان کے مذہب کو ختم کرنے کے کسی بھی حربے کو یہ فرنگی بے شرمی کے ساتھ لاگو کریں گے۔

ایک افسر جو تقریباً 25 سال قبل ملازمت سے سبکدوش ہوا تھا اور جس کا یہ دعویٰ تھا کہ وہ بنگال فوج کے بارے میں بہت اچھی طرح جانتا ہے، اس نے بہت پُر اعتماد طریقے سے یہ بات کہی کہ ساری بغاوتیں یا تو ناانصافی کی بدولت یا سرکار کے ذریعہ معاہدوں کی خلاف ورزی کرنے سے ہوئیں۔ ''ہندوستان میں ہونے والی ساری بغاوتیں چاہے وہ بنگال یا اور کہیں ہوئی ہوں، ان کی شروعات خود ہماری طرف سے ہوئی یا ہمارے احکامات کی بدولت ہوئی۔ کبھی تو یہ ہوا کہ ہم نے معاہدوں کی خلاف ورزی کی، کبھی ہم نے مقامی سپاہیوں کے احساسات، صحت یا ان کو ہونے والی دشواری کا خیال نہیں کیا جب کہ ان کے مقابلے انگریزی فوج کا ہر طرح سے لحاظ رکھا جاتا۔ کبھی مذہبی عقیدوں میں غیر دانشمندانہ مداخلت کر کے کبھی ان کی تنخواہ یا حقوق میں کچھ کٹوتی کرنے کی وجہ سے یہ ساری بغاوتیں اٹھیں۔ واضح مثال کے طور پر جاوا میں ہوئی بغاوت کا حوالہ دیا۔ وہاں لوگوں نے اس وعدے پر سمندر پار جانے پر رضامندی ظاہر کی کہ ایک معینہ میعاد گزارنے کے بعد

انہیں واپس بلالیا جائے گا۔ سرکار نے اس وعدہ کا خیال نہیں رکھا اور فوراً ہی پریشانیاں شروع ہو گئیں۔ وہ اور بھی مثالیں دے سکتا تھا (ویلور کی بغاوت) جہاں مذہبی عقیدوں کا خیال نہیں رکھا گیا' (بارک پور بغاوت) جہاں سپاہیوں کی سہولت کا کوئی خیال نہیں رکھا گیا اور درمیانی درجہ کے حکام نے جو وعدے کئے تھے ان کو نظر انداز کیا گیا یا ان کو ختم کیا گیا۔ اس طور سپاہیوں نے اکثر یہ سمجھا کہ انہیں جو حق ملنا چاہیے تھا اس کے ساتھ دھوکہ کیا گیا اور وہ یہ بھول جاتے کہ حکومت اور اس کے ماتحت حکام میں کافی فرق ہوتا ہے۔ اور اس لیے ان دونوں کے بارے میں اسے کوئی یقین نہیں رہ گیا۔ اس کی وجہ سے انھوں نے اخلاقی طور پر شکست بھی محسوس کی۔

1843-44ء میں بنگال اور مدراس کی فوج میں اٹھی شورش وعدہ خلافی کی وجہ سے ہوئی' چاہے وہ ظاہری یا پوشیدہ' اس کی وجہ سے حکومت کے وقار کو بھی کافی بٹہ لگا۔ سپاہی غیر ملکی خدمات کو پسند نہیں کرتے تھے وہ بھی رجعت پسند ذہن رکھتے تھے۔ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ ایسے علاقوں میں جن سے وہ واقف نہیں ہیں' وہاں ہونے والی دشواریوں کے لیے حکومت انہیں مالی معاوضہ بھی دے۔ اس کے لیے ہندوستان کوئی ایک واحد ملک نہیں تھا۔ وہ سندھ یا پنجاب میں جاکر فوجی خدمات انجام دینا بدیس میں جانے کے برابر سمجھتا تھا۔ پہلی افغان جنگ کے دوران جنرل پولاک نے اپنے فوجیوں کو سندھ پار کرنے پر خصوصی بھتہ دیا تھا۔ عام طور پر اسے ایک مثال سمجھا گیا اور جب سپاہیوں سے سندھ کے اس پار فوجی خدمات انجام دینے کے لیے کہا جاتا تو وہ یہ سمجھتے انہیں ہمیشہ اس طرح کا معاوضہ دیا جائے گا۔ لیکن 1843ء میں سندھ پر قبضہ کر کے اسے برٹش انڈین حکومت کا حصہ بنالیا گیا۔ اس لیے فوجی خصوصی معاوضے کا قانونی طور پر کوئی دعویٰ نہیں کر سکتے تھے کہ انہیں ہندوستان کے کسی صوبے میں چاہے وہ کتنے ہی فاصلے پر کیوں نہ ہو' جنگی خدمات کے لیے خصوصی معاوضہ دیا جائے۔ یہ قانونی نکتہ تھا جسے فوجی نہیں سمجھتے تھے۔ سندھ ندی اب بھی وہیں بہہ رہی تھی اور سندھ میں زندگی اب بھی اتنی ہی دشوار کن تھی جتنی 1842ء میں تھی تو 1842ء میں اس مطالبہ کا کوئی قانونی جواز ہو تو ہو لیکن 1844ء میں کوئی جواز نہیں رہ گیا تھا۔

34ویں بنگال رجمنٹ نے جب تک انہیں سندھ بھتہ نہ دیا جائے' سندھ جانے سے انکار کردیا۔ ان کی حمایت میں 7ویں بنگال کیویلری نے بھی اسی طرح انکار کر دیا۔ گرچہ ان کو اس ضد کی فوری طور پر سزا نہیں دی گئی۔ یہ افواہ پھیل رہی تھی کہ یورپ کے فوجی بھی ان سپاہیوں سے ہمدردی رکھتے تھے کیونکہ وہ صرف اپنا حق مانگ رہے تھے۔ ان باغیوں کو کچھ دیر کے لیے تنہا چھوڑ دیا گیا۔ اس کے بعد سے 69ویں اور چوتھی رجمنٹ نے بھی 34ویں رجمنٹ کا اتباع کرتے ہوئے سندھ پار کرنے سے انکار کر دیا۔ جب تک کہ انہیں خصوصی معاوضہ نہ دیا گیا۔ 64ویں رجمنٹ نے بھی ایسی ہی مانگ رکھی اور حالات کا تقاضہ سمجھتے ہوئے کمانڈر انچیف نے انہیں یہ بھتہ دینا منظور کر لیا۔ "اس بھتہ کے علاوہ جو لوگ سندھ میں پہلے سے تعینات تھے انہیں بھی خصوصی بھتہ دیا گیا۔ اس کے علاوہ انہیں اور بھی دیگر مراعات دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ مثلاً تنخواہ میں اضافہ یا بیماری یا

کسی اور وجہ سے خدمات کے دوران موت ہو جانے پر ان کے خاندان والوں کو فیملی پنشن بھی دیئے کا وعدہ کیا گیا۔ لیکن موزلے' جوان کا کمانڈنگ افسر تھا' اس نے ان سے کہا کہ لوگ زیادہ سے زیادہ پولاک بھتہ ملنے کی امید کر سکتے ہیں۔ اس نے یہ بھی کہا کہ یہ پوری رجمنٹ تکنیکی طور پر کمانڈر ان چیف کی مراعات پانے کا حق کھو چکی ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے کہ ان مراعات کا اعلان کیا جاتا انہوں نے راستے میں ہی بغاوت شروع کر دی۔ تاہم موزلے نے رجمنٹ کی اس بغاوت کا کوئی تذکرہ ہیڈ کوارٹر سے نہیں کیا اور رجمنٹ کو بہلا پھسلا کر سندھ تک جانے کے لیے تیار کر لیا۔ اس نے یہ بھی وعدہ کر لیا کہ ان سے پہلے جن مراعات کا وعدہ کیا گیا ہے' وہ سب پورے کئے جائیں گے۔ شکار پور پہنچنے پر فوجیوں نے ایک ساتھ مل کر اپنی تنخواہ لینے سے انکار کر دیا' کیونکہ انہوں نے دیکھا کہ جس خصوصی معاوضہ کا ان سے وعدہ کیا گیا' وہ نہیں دیئے گئے۔ انہوں نے یہ شکایت بھی کی کہ ان کے ساتھ جان بوجھ کر دھوکا کیا گیا ہے۔ حالات اور بدتر ہو جاتے اگر جارج ہنٹر نے اپنی دانشمندی سے اسے سنبھالا نہ ہوتا۔ جارج ہنٹر نے ان سارے ناراض لوگوں کو اس بات کے لیے تیار کر لیا کہ وہ خصوصی بھتہ کے ساتھ اپنی تنخواہ وصول کر لیں۔ پھر انہیں وہ آگے بڑھا کر سکر تک لے گیا۔ یہاں مقیم یورپین فوج نے ان فوجیوں کا غصہ کم کیا اور ہنٹر نے اپنی عزت پر بٹہ لگائے بغیر چند ایک کے علاوہ تقریباً سبھی کو معاف کر دیا۔ لیکن اس سے جو نقصان ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ سپاہیوں کو یہ تجربہ ہو گیا تھا کہ وہ اب اپنے افسروں پر بالکلیہ بھروسہ نہیں کر سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ 1857 میں جب حالات بد سے بدتر ہوئے' کمانڈنگ افسران کی یقین دہانیوں پر وہ بھروسہ نہیں کر سکے۔

مدراس آرمی کا حال اور بھی بدتر تھا۔ اگر ایک طرف بنگالی فوجیوں کو اپنا خاندان اپنے آبائی گاؤں میں چھوڑنا پڑتا تو دوسری طرف مدراس کے فوجی اپنے بیوی بچوں کو ساتھ لے جاتے۔ اس طرح ایک جگہ سے دوسری جگہ کا تبادلہ اس کے لیے کئی معنوں میں دشوار کن تھا۔ 1843ء میں مدراس کیویلری کو کامٹی سے جبل پور جانے کے لیے حکم دیا گیا' جو ان کے مدراس کے علاقہ سے باہر تھا۔ ان سے یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ یہاں ان کا قیام بہت قلیل مدت کے لیے ہوگا۔ اور جلد ہی وہ مدراس واپس چلے جائیں گے۔ ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ انہیں ایک لمبے عرصہ تک جبل پور میں قیام کرنا ہے۔ جہاں سے ان کا تبادلہ آرکوٹ کیا جائے گا' جو وہاں سے نو سو میل کے فاصلے پر تھا۔ مزید بر آں یہاں انہیں تنخواہ بھی کم ملتی تھی۔ فطری طور پر ان کے اندر بے چینی پیدا ہوئی اور انہوں نے نہ صرف یہ کہ شکایت کی بلکہ غیر مقبول میجر لچ فیلڈ کے رویوں کو بھی شکایت کا موضوع بنایا۔ بعد میں وہ اپنی ڈیوٹی پر واپس چلے گئے۔ انہوں نے صرف ایک مظاہرہ اپنے کمانڈر کی ناپسندیدگی کو لے کر کیا۔ جبل پور کی پریشانیاں' حکام کے کئے گئے وعدے کی خلاف ورزی کی ایک اور مثال تھی۔

بدقسمتی سے یہ بے اطمینانی صرف کیویلری تک محدود نہیں رہی۔ انفینٹری کی بھی شکایتیں

جائز تھیں۔ سندھ پر حملہ ہو چکا تھا۔ اور بنگال آرمی نے خصوصی بھتے کے بغیر وہاں جانے سے انکار کر دیا' تو فوراً ہی مدراس سرکار نے اپنی دو انفینٹری رجمنٹ کو وہاں بھیجنے کی رضامندی ظاہر کی۔ مدراس کے گورنر جو اس پریزیڈنسی کے کمانڈر انچیف تھے' انہوں نے ان منتخبہ رجمنٹ کو اس بات کی گارنٹی دی کہ انہیں وہی سارے فائدے ملیں گے جو برما جانے پر ملتے۔ اس یقین دہانی کے بعد مدراس کے فوجی اپنے خاندان والوں کا انتظام کر کے اپنے خرچ سے بمبئی پہنچ گئے۔ ایک طرف تو وہ اپنے گھروں سے دور تھے دوسری طرف انہیں یہ معلوم ہوا کہ حکومت ہند مدراس کے گورنر کے ذریعہ کیئے گئے وعدے لو پورا کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ کیونکہ یہ بنگال ضابطوں کے خلاف تھا۔ کایے (Kaye) کا مشاہدہ تھا کہ مدراس کے فوجی اسے بدترین عہد شکنی کی مثال سمجھتے ہیں اور وہ اگر اس کے خلاف احتجاج کرتے تو حیرت کی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ کھانے کے لیے شور اور لوٹ مچانے لگے اور وہاں نظم و نسق اس وقت تک برقرار نہیں ہوا جب تک کہ انہیں مجبوراً کچھ رقم پیشگی نہیں دی گئی۔ معاملہ یہیں رفع دفع ہو گیا لیکن اس سے گورنر جنرل کی کافی بدنامی ہوئی۔ کیونکہ ایک گورنر کے وعدوں کو ماننے سے انکار نے پوری سرکار کو ہی بدنام کر دیا تھا۔ سپاہی کسی طرح کا الزام لینے کو تیار نہیں تھے۔ لیکن اسے یہ معلوم ہو گیا کہ جس حکومت کی وہ خدمت کر رہے ہیں' اس کے وعدوں پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ ایک طرح سے لارڈ ایلن بارو نے بھی 1857ء کی بغاوت میں اہم رول ادا کیا۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ 1849ء میں ہوا' جب ڈلہوزی کا اقتدار تھا۔ راولپنڈی کی کچھ رجمنٹ نے اضافہ کی مانگ کو لے کر تنخواہ لینے سے انکار کر دیا۔ سر چارلس نیپئر کمانڈر انچیف ان کے آگے جھکا تو نہیں لیکن اس نے اٹھنے والی بغاوت کو دبانے کے لیے حفظ ماتقدم کے طور پر سارے انتظامات کر لیے۔ صرف ان پیشگی اقدامات پر ہی اس نے بس نہیں کیا بلکہ وہ رجمنٹ کے انسپکشن پر بھی گیا جہاں اسے ہر طرف بے اطمینانی کی لہر دکھائی دی۔ دسمبر میں 66ویں رجمنٹ نے گووند گڑھ میں بغاوت کی جسے مقامی کیویلری نے دبا دیا۔ نیپئر نے محسوس کیا کہ سپاہیوں کی شکایتیں بجا تھیں کیونکہ ان سے امید کی جارہی تھی کہ وہ نئے قبضہ والے صوبے میں اپنی خدمات دیں گے اس بات کا خیال کئے بغیر کہ انہیں اس میں کتنی دشواری کا سامنا کرنا پڑے گا اور گورنر جنرل کی منظوری کا انتظار کئے بغیر اس نے پرانے قانون کے حساب سے اونچی شرحوں پر مہنگائی بھتہ دینے کا حکم جاری کر دیا۔ ڈلہوزی نے نہ صرف یہ کہ نیپئر کے اس حکم کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا بلکہ یہ بھی سمجھا کہ اپنے اختیارات سے باہر جا کر اس نے یہ کام کیا۔ نیپئر یہ بے عزتی برداشت نہیں کر سکا۔ اور اس نے استعفیٰ دے دیا۔ اب نیپئر کے اس عمل کا جواز تلاش کرنا بے سود ہے۔ کمانڈر انچیف کو یہ یقین ہو چکا تھا کہ فوج میں بغاوت پھیل رہی ہے اور اس لیے قانونی طور پر اپنے حقوق کے حدود کو توڑ کر اس نے اس ابھرنے والے خطرے کا مقابلہ اس امید پر کیا کہ گورنر جنرل کی منظوری مل جائے گی۔ یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے کہ اس کے بعد سپاہیوں کا کیا ردعمل رہا۔ وہ صرف اس مالی رعایت کی

مانگ کر رہے تھے جو پنجاب پر قبضہ سے قبل انہیں مل رہا تھا۔ ان کے کچھ حمایتیوں نے تو اس مانگ کے حق میں تلواریں بھی اٹھالی تھیں۔ اس بغاوت کو کسی یورپین رجمنٹ نے فرو نہیں کیا بلکہ پہلی مقامی کیویلری نے اسے دبایا۔ کمانڈر انچیف کو یہ یقین ہو چلا تھا کہ وفادار سپاہیوں کے ساتھ ناانصافی کی گئی ہے۔ اس نے انہیں کچھ مراعات دینی چاہی۔ لیکن حالات کے نارمل ہونے پر مرکز نے اسے نامنظور کر دیا۔ اس لیے اس نے یہ محسوس کیا کہ اسے اپنے اختیار سے محروم کیا گیا ہے اور حکومت نے ان کے خلاف نہ صرف یہ کہ طاقت کا استعمال کیا بلکہ بغاوت کے آثار فرو ہونے پر اس نے یہ فیصلہ بھی واپس لے لیا۔

فوجیوں کو مذہبی اندیشے کے علاوہ اور بھی بہت سی شکایتیں تھیں۔ ان کے اور حکومت کے درمیان صرف تنخواہ اور پنشن کا ہی تعلق تھا اور یہ دونوں چیزیں بھی کوئی بہت زیادہ اطمینان بخش نہیں تھیں۔ انفینٹری میں یہ تنخواہ سات روپے ماہانہ تھی جب کہ گھوڑسوار دستے میں یہ ستائیس روپے ماہانہ تھی۔ وہ بھی اس وقت جب وہ خود گھوڑے کا انتظام کرتا۔ یہ مشاہرہ اسی کی برابری یا اسی کے ہمسر سفید نسل لوگوں سے بہت کم تھا۔ ہومس کا کہنا ہے "چاہے وہ حیدر علی جیسا فوجی عزم اور بہادری کا مظاہرہ کرتا، اسے معلوم تھا کہ وہ اپنے ہی ہم رتبہ کسی انگریز فوجی کی تنخواہ کے برابر کبھی نہیں پا سکتا۔" ایک ملازمت سے سبکدوش آفیسر کا کہنا تھا "ہندوستان کی ساری فوج میں کل ملا کر تین لاکھ 15 ہزار 520 نفر تھے۔ جن پر اٹھانوے لاکھ دو ہزار 235 پونڈ کا خرچ آتا تھا جس میں سے 51 ہزار 316 یورپین فوجی اور افسران تھے۔ اور ان سب پر کل ملا کر 56 لاکھ 68 ہزار 110 پونڈ خرچ ہوتا تھا۔ وہ آگے لکھتے ہیں 'اس کے علاوہ یورپین فوجی کبھی سخت اور مشکل ڈیوٹی نہیں کرتے۔ انہیں اس طرح رکھا جاتا اور کھانا دیا جاتا اور انہیں اتنا مشاہرہ دیا جاتا جس کا تصور ہندوستانی فوجی کبھی نہیں کر سکتے تھے۔" اس تفریق کا ہندوستانی فوجیوں کی بہادری پر بھی برا اثر پڑا۔

ایسا کہا جاتا تھا کہ گرچہ ان کی تنخواہ بہت کم تھی تاہم یہ ہندوستانی فوجی معاشی طور پر بہت مضبوط تھے کیونکہ ان کی ضرورتیں بھی بہت کم ہوتیں اور ان کے رہن سہن کا طریقہ بھی کمتر درجہ کا ہوتا۔ اس میں سے بھی اسے پہلے کچھ مہینوں کی تنخواہ بطور رشوت اپنے افسران کو دینی پڑتی۔ سیتا رام کا کہنا ہے کہ ڈرل سولدار اور یورپین سارجنٹ اس سے ہمیشہ اس لیے ناراض رہتے کہ اس نے ان لوگوں کی فیس ادا نہیں کی تھی۔ "یہ فیس سو روپے ہوتی جس میں سے پانچ چھ روپے اس یورپین سارجنٹ کو جاتا جس کے ماتحت وہ کام کرتا تھا۔" وہ آگے کہتا ہے: "ایک مہینے میں سات روپے تنخواہ سے تو پنجابی سکھ یا مسلمان کا کام نہیں چلتا لیکن اس کا بیان غدر کے زمانے پر صادق آتا جب چیزوں کی قیمتیں بڑھ رہی تھیں۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ غدر ہی کے بعد فوجیوں کا برا حال رہا بلکہ غدر سے پہلے بھی وہ کچھ اچھے حال میں نہیں تھے۔ 1857ء میں بریلی کے گھوڑسوار دستے سے متعلق ایک بنگالی کلرک کا کہنا ہے کہ سپاہی کو اپنے یونیفارم کے لیے قیمت ادا کرنی پڑتی اور رجمنٹ کے بازار میں بنئے سے قرض لے کر اپنے روزمرہ کا راشن حاصل کرنا پڑتا۔ تنخواہ کے دن سب

حساب کیا جاتا۔ بعض فوجیوں کو مہینے میں صرف ایک یا ڈیڑھ روپیہ تنخواہ ملتی جو بہت کفایت شعار ہوتے وہ بھی چند آنوں کے علاوہ کچھ پس انداز نہیں کر پاتے۔ اس کے روزمرّہ کا کھانا صرف دال روٹی ہوتی اور قرض پر راشن حاصل کرنے کی وجہ سے وہ مہینے میں صرف ایک یا دو بار سبزی کھانے کی عیاشی کر سکتا تھا۔ اس کی زندگی بہت کٹھن ہوتی اور جب تک اس کا پروموشن نہ ہوتا وہ زیادہ سے زیادہ نو روپے مہینے تک تنخواہ پا سکتا تھا۔ اور پروموشن بھی صلاحیت کے اعتبار سے نہیں بلکہ سینئرٹی کے اعتبار سے ہوتی۔ گھوڑسوار کی تنخواہ بھی فوجیوں سے مختلف نہیں ہوتی اور گرچہ اسے 21/ روپے سے 30/ روپے کے درمیان تنخواہ ملتی لیکن اس میں سے بہت زیادہ رقم کی کٹوتی ہو جاتی۔

تنخواہ کی ان شرح کا فوجیوں کی نفسیات پر برا اثر پڑا۔ وہ محسوس کرتے کہ اچھی تنخواہ پانے والے یورپین فوجیوں کی تعداد فوج کی کل تعداد کی نسبت سے بہت کم ہے۔ وہ یہ بھی محسوس کرتے کہ فوجی اخراجات میں کافی کمی ہو جائے اگر ان کی خدمات بھی غیر ممالک میں لی جائیں۔ اس لیے انگریز حکومت کی مذہب میں مداخلت سے متعلق ساری روایتوں پر اسے فوراً یقین آگیا۔ 9/ مئی 1857/ کو سر ہنری لارنس نے لارڈ کیننگ کو ایک خط لکھا: ''گذشتہ شب اودھ کی فوج کے ایک جمعدار سے میری گفتگو ہوئی اور میں اس کی اس کج بحثی پر دنگ رہ گیا کہ .......... اسے یقین تھا کہ پچھلے دس سالوں سے حکومت ایسے اقدامات کر رہی ہے جس میں زور زبردستی اور دھوکے سے سارے مقامی لوگوں کا مذہب تبدیل کر دیا جائے .......... جب میں نے اسے یورپ میں اپنی طاقت کے بارے میں بتایا .......... اس نے جواب دیا کہ ہاں اسے معلوم ہے کہ ہم لوگوں کے پاس بہت بڑی فوج ہے۔ اور دولت بھی، لیکن یورپین بہت خرچیلے ہوتے ہیں اور اسی لیے ہم ہندوؤں کو سمندر کے پار دنیا کو فتح کرنے کے لیے لے جایا جا رہا ہے .......... آپ چاہتے ہیں کہ جو کچھ آپ کی مرضی ہو وہی ہم کھائیں تاکہ ہم مضبوط ہو سکیں اور آپ جہاں چاہیں وہاں جا سکیں۔ اس نے ہم لوگوں کی کسی بات کی تعریف نہیں کی۔ وہ اکثر یہ جواب دیتا ''میں آپ سے وہی کہہ رہا ہوں جو آپ کے بارے میں ہر شخص کہتا ہے۔ ...... جمعدار بہت نیک کردار کا آدمی تھا۔'' لارنس اپنے خط میں مزید لکھتا ہے۔

فوج میں سفید فام اقلیت اور سیاہ فام اکثریت کے درمیان مفاہمت سے کمپنی کو اولین دور میں کوئی واسطہ نہیں تھا۔ لیکن اب یہ بات ماضی کی ہو چکی ہے۔ سیتارام لکھتے ہیں: ''میری انگریز سپاہیوں سے اچھی دوستی تھی اور وہ ہم ہندوستانی سپاہیوں سے مہربانی کے ساتھ پیش بھی آتے۔ کیا ہم سارے مشقت طلب کام نہیں کرتے تھے؟ ہم چلچلاتی دھوپ میں ان کی حفاظت کرتے، جب وہ رم پیتے ہوتے تو ہم ان کی دربانی کرتے۔ ہم انہیں اپنی ساری خوراک بھی دے دیتے لیکن آج جو فوجی ہیں، وہ دوسری سرشت کے ہیں۔ نہ تو بہت اچھے اور نہ اتنے لمبے جتنے پہلے ہوا کرتے تھے۔ وہ ہماری زبان کا ایک لفظ بھی سوائے گالی کے نہیں بول سکتے۔ .......... سترہواں پیدل (دستہ) ہمیں بھائی پکارتا لیکن سولہویں ٹکڑی کے لوگ کبھی ہمارے چولھے کے پاس نہیں آتے اور نہ ہی ہمارا کھانا

دیکھ کر تھوکتے۔ ہم مدتوں ایک ساتھ رہے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ہر فوجی ٹامی ایٹکنس کا اس طرح دوست نہ رہا ہو جیسا سیتارام تھا۔ لیکن جب کوئی انگریز سپاہی درشت لہجہ اختیار کرتا تو یہ درشتگی پوری قوم کی خاصیت بتائی جاتی۔ اور سیتارام شکایت کرتا ہے کہ پرانے زمانے میں بھی اگر کوئی یورپی سارجنٹ غلط کام کرتا تو بھی ایڈجوٹینٹ کبھی انصاف سے کام نہیں لیتا۔ "اس زمانے (1812) میں فوجیوں کی ہر کمپنی کے ساتھ ایک یورپی سارجنٹ ہوتا۔ ان میں سے کچھ تو ہماری زبان اچھی طرح جانتے اور وہ ہمارے ساتھ مہربانی سے پیش بھی آتے۔ لیکن زیادہ تر سارجنٹ نہ ہماری زبان سمجھتے اور نہ ہم ان کی۔ اور جب وہ کوئی حکم دیتے تو فوجی ان کا مطلب نہیں سمجھ پاتے۔ نتیجتاً وہ گالیوں پر اُتر آتے اور بعض اوقات فوجیوں کو زدوکوب بھی کرتے۔ اس طرح کی بہت سی شکایتیں ایڈجوٹینٹ سے کی گئیں لیکن وہ ہمیشہ سارجنٹ کی حمایت کرتا اور سپاہیوں کو اس سے کسی قسم کا انصاف نہیں ملتا۔

کمشنری کے افسران کا رویہ بھی اچھا نہیں ہوتا۔ شمال مغربی ہندوستان کے ایک گمنام باشندہ کا' جو یقیناً انگریز رہا ہو گا' کہنا ہے "افسر اور اس کے فوجی کبھی ایک دوسرے کے رفیق نہیں ہوتے بلکہ ہمیشہ ایک دوسرے کے لئے اجنبی رہتے۔" فوجی سب سے کمتر درجے کا آدمی سمجھا جاتا۔ اس کے ساتھ بہت بُرا سلوک ہوتا۔ اکثر اسے سور کہہ کر مخاطب کیا جاتا۔ تخاطب کے اس لفظ سے ہندوستانی ہمیشہ نفرت کرتے۔ خاص طور پر مسلمان جو فوراً غصہ میں آجاتے۔ ان میں سے جو معمر ہو جاتے وہ کچھ نرم پڑ جاتے۔ لیکن جو نوجوان ہوتے وہ اسے ایک بہتر طنز کا ذریعہ سمجھتے اور وہ احساس برتری کے ساتھ سپاہیوں کو حقیر جانور کی طرح سمجھتے۔ "ایک دوسرے پمفلٹ لکھنے والے نے بتایا ہے "سب سے زیادہ شکایت افسروں کی بدزبانی کی ہوا کرتی۔ میں نے خود پریڈ میدان میں کمانڈنگ افسروں کو غلیظ گالیاں دیتے ہوئے سنا ہے۔ اعلیٰ ذات کے برہمن اور مسلمان دونوں جو ہماری رجمنٹ میں تھے وہ ان گالیوں کو سن کر غصہ سے کانپنے لگتے۔" ان ساری نامعلوم شہادتوں' جن کی صداقت پر لکھنے والے کا نام نہ معلوم ہونے کی وجہ سے شبہ ہو سکتا ہے کے علاوہ ہمارے پاس بنگال فوج کے لیفٹیننٹ کرنل ولیم ہنٹر کی شہادت موجود ہے' جس میں وہ فوجیوں کی اس بے اطمینانی کا ذکر کرتا ہے جو ہندوستانی فوجیوں کو ہمیشہ کمتر درجہ دینے کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ اور اس بے چینی میں اضافہ یورپ کے نان کمیشنڈ افسران کے سفاک رویے اور گالی گلوج سے پیدا ہوتی تھی۔ وہ لکھتا ہے کہ موجودہ نظام میں "ہندوستانی فوجی ہمیشہ پس منظر میں چلے جاتے ہیں۔ اسے نہ صرف سب سے نوسکھیا نوجوان یورپین سارجنٹ کی ماتحتی قبول کرنی پڑتی بلکہ اکثر ان کو بدزبانی اور گالی کا سامنا بھی کرنا پڑتا۔ اس کی وجہ سے آپس میں ہمیشہ رقابت اور جلن پیدا ہوتی اور یہی وجہ ہے کہ جنرل جان جیکب نے افسروں اور مقامی فوجیوں کے درمیان بھروسے کی کمی کا مشاہدہ کیا۔

ایک غیر ملکی حکومت ظلم اور زیادتی کی بنیاد پر اس وقت تک قائم نہیں رہ سکتی جب تک محکوم رعایا کا بھروسہ اسے حاصل نہ ہو۔ فوج میں نظم وضبط کا ختم ہونا لازمی ہو جاتا ہے اگر سپاہیوں کو اپنے

افسروں پر اطمینان نہ ہو۔ ابتدائی دور میں یہ افسر اپنے فوجیوں کے بہترین دوست ثابت ہوتے اور ان کی فلاح میں دلچسپی لیتے۔ سپاہیوں کو اس بات کی آزادی ہوتی کہ وہ جب چاہے حسب ضرورت اپنے افسران سے صلاح و مشورہ کر سکیں۔ سیتارام کا کہنا ہے "جب میں ایک سپاہی تھا تو ہماری کمپنی کا کپتان ہمارے کچھ آدمیوں کو ہر وقت اپنے گھر پر رکھتا اور ان سے لگاتار بات کرتا رہتا۔" "ان دنوں صاحب لوگ اکثر رجمنٹ کے رقص و موسیقی اور کھیل کود میں شریک ہوتے اور شکار پر جاتے تو کئی لوگوں کو ساتھ لے جاتے۔" اگر سپاہی اپنے افسروں کی حماقتوں کو دیکھتا تو وہ ان سے کچھ اچھی عادتیں بھی سیکھتا۔ لیکن سیتارام اس وقت بھی زندہ رہا جب صاحب لوگوں میں اس نے بڑی تبدیلیاں دیکھیں اور یہی مشاہدہ ہدایت علی نے بھی کیا۔ وہ لکھتے ہیں۔ "جب کوئی سپاہی ان کے پاس ان سے ملنے یا ان سے کچھ کہنے کی غرض سے جاتا ہے تو وہ فوراً ناراض ہو جاتے ہیں۔" سیتارام نے اس تبدیلی کی وجہ پادریوں کے اثر کو بتایا جو "بہت کچھ ایسا کام کر رہے ہیں جس سے صاحب لوگ سپاہیوں سے بے پرواہ ہو جائیں۔" ہدایت علی اس تبدیلی کی کوئی وجہ نہیں بتاتے لیکن یہ ضرور کہتے ہیں کہ "یہ بھی غدر کے اسباب میں سے ایک تھا۔"

لیکن ایسا بھی ہوا کہ صاحب لوگ اور سپاہیوں کے درمیان گہرے ربط و ضبط کے باوجود نظم و ضبط میں کوئی سدھار نہیں ہوا۔ ایک غیر محتاط افسر اپنی باتوں سے سپاہیوں کے دلوں سے سرکار کے اعتبار اور اعتماد کو ٹھیس پہنچا دیتا جب وہ خود ان کے سامنے دل کھول کر اپنی شکایتیں بیان کرتا۔ لارڈ ولیم بینٹک کے معاشی اقدامات سے خود یورپ کے لوگوں میں بے چینی پھیل گئی تھی۔ اور وہ کھلے عام بغاوت کا نام لیتے اور یہ بات ہندوستانی اور یورپین فوج سے پوشیدہ نہیں رہ سکی۔ سیتارام کا بیان فوجیوں کی تاثرات پر وافر روشنی ڈالتا ہے۔ "لارڈ صاحب ہندوستان آئے جنھیں خود کے افسران بہت زیادہ ناپسند کرتے تھے۔ انھوں نے ان لوگوں کی تنخواہ میں کمی کرنی چاہی اور صاحب لوگوں نے مل کر بغاوت کا منصوبہ بنایا۔ وہ اپنے گھروں پر بہت سی خفیہ میٹنگیں کرتے اور بہت پریشان رہتے اور بہتوں نے تو کھل کر کہہ دیا تھا کہ وہ اب سرکار کی خدمت نہیں کریں گے۔ لارڈ صاحب کو کمپنی بہادر۔ نے کفایت شعاری کے لئے بھیجا تھا کیونکہ جنگ میں ہونے والے اخراجات کی وجہ سے وہ غریب ہو گئی تھی۔ لیکن ان کی اس منطق کو کون مانتا۔ میں نے ایک رجمنٹ کے افسر کو دوسرے رجمنٹ کے افسروں سے یہ کہتے ہوئے سنا کہ کیا ان کے ماتحت ان کا ساتھ دیں گے اگر کلکتہ تک مارچ کر کے جائیں تاکہ لارڈ صاحب کو اس بات کے لئے مجبور کیا جا سکے کہ وہ ان کے حقوق انہیں ادا کریں۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا کہ یورپ کے فوجی' مقامی فوجیوں کے افسروں کے خلاف اس وقت تک کام نہیں کریں گے جب تک ان کا مقصد صرف بھتہ پانا ہو۔ اس وقت سبھی صاحب لوگ غصہ میں بھرے ہوئے تھے اور سبھی سرکار کو برا بھلا کہہ رہے تھے اور زیادہ تر ان کا غصہ لارڈ صاحب کے خلاف ہوتا جسے وہ سمجھتے تھے کہ وہ ان کے ساتھ کمپنی بہادر کے حکم کے خلاف ناانصافی کر رہے ہیں صرف اس لئے کہ وہ خوشامد کر کے کمپنی بہادر کو خوش کر سکیں۔ فوجی

خود بھی اسی طرح کے خیالات سے پریشان تھے اور 1843، 1844اور 1849 میں انہوں نے اپنے حقوق کی بحالی کے لئے مظاہرہ شروع کیااور اپنے مالکان کے خلاف زائد معاوضہ کی مانگ کو لے کر طاقت کے استعمال کے بارے میں سوچا۔اگر یہ سفید نسل کے افسران اپنی تنخواہ کی بحالی کے لئے اپنی حمایت میں اپنے فوجیوں کااستعمال اخلاقی طور پر درست سمجھتے تھے تو کیامقامی فوجی ان سے زیادہ اور اس سے بہتر سبب اپنے مذہب کی حفاظت میں بغاوت کے بارے میں نہیں سوچ سکتے تھے۔

بنگال آرمی کے جونیر افسروں کی بے وقوفیوں کی وجہ سے اکثر و بیشتر ملٹری ضابطوں کی خلاف ورزی اور نظم و ضبط درہم برہم ہو جاتا تھا۔ جان جیکب نے افسروں کے درمیان اکثر اخلاقی گراوٹ اور اینگلو سیکسن ایمانداری کا فقدان پایا۔ ایک جونیر افسر اکثر اپنے خدمت گاروں کی ایک فوج اپنے پاس رکھتا۔ ''اسے دھوپ میں نہیں نکلنا چاہیے اور بجائے گھوڑسواری کے پالکی کا استعمال کرنا چاہیے۔ اس کے پاس خانساماں'ایک خدمت گار اور کئی بیرے اور کئی مختلف قسم کے خدمت گار' ایک اس کے پائپ کے لیے'ایک اس کے چھاتے کے لیے'ایک اس کی بوتل کے لیے'ایک اس کی کرسی کے لیے اور نہ جانے اور کتنے آدمیوں کی ضرورت تھی صرف ایک شخص کے آرام کے لیے۔'' حد تو یہ ہے کہ کسی غیر ملکی کو ہندوستان میں نہ اپناپانی نکالنا چاہیے 'نہ اپنا کھانا پکانا چاہیے' نہ اپناجوتا صاف کرنا چاہیے اور نہ ہی خود سے اپنی داڑھی بنانی چاہیے۔''ایک افسر اپنے حجام سے یہ امید رکھتا تھا کہ جب علی الصبح وہ نیم خوابیدہ حالت میں ہو تو اس وقت آکر اس کا شیو بنادے۔اتنے عیش و عشرت اور بے جااسراف کی زندگی'گرچہ اس نے جوا کھیلنا چھوڑ رکھا تھا جو میس میں زیادہ کھیلا جاتا'تو بھی ایک جونیر افسر کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اپنی جائز آمدنی سے یہ سارے اخراجات پورے کرتا۔ اکثر وہ اس کام کے لیے دوسروں سے قرض لیا کرتا اور قرض لیتے وقت کسی کے حفظ مراتب کا خیال نہیں رکھتا۔ بریلی کا وہ بنگالی کلرک جس کا حوالہ پہلے دیا جاچکا ہے' وہ نہ صرف سپاہیوں'گھوڑسواروں بلکہ یورپین افسروں کو بھی بہت اونچی شرح سود پر قرض دیا کرتا تھا۔ ہندوستان میں اکثر مقروض شخص کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا۔اور افسران گرچہ اپنی عزت کو برقرار رکھتے تھے وہ بھی مجبور ہوتے کہ قرض دینے والے کے ساتھ بہت نرمی کا برتاؤ کریں۔یہ قرض وہ کلرک کہاں سے دیتا تھا لیکن اگر سیتارام کے بیان پر یقین کیا جائے تو تنخواہ بانٹنے والے حوالداروں میں ایک بات مشہور تھی کہ جو فنڈ انہیں دیا جاتا' اس میں سے وہ خرد برد کرتا ان کے افسران کی اس طرح کی غلطیوں کو نظرانداز کرجاتے کیونکہ ضرورت کے وقت وہ بھی اس کے آگے ہاتھ پھیلاتے۔ تنخواہ بانٹنے والا حوالدار' صاحب لوگوں کو اسی پیسے میں سے قرض دیتا کیونکہ صاحب لوگوں کی تنخواہ وہی بانٹتا اور رقم کے ڈوبنے کا اندیشہ اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک کہ کسی صاحب کی موت نہ ہو جائے۔ گرچہ یہ پریکٹس ممنوع تھی لیکن میں نے نہیں سنا کہ کسی آدمی کو اس وجہ سے سزا ملی ہو۔افسروں کی تنخواہ گرچہ بہت زیادہ ہوتی تب بھی اس سے ان کے اخراجات

پورے نہیں ہوتے اور میرے رجمنٹ میں صرف دو افسر ایسے تھے جو مقروض نہیں تھے۔ ان میں سے زیادہ تر لوگ بڑی بڑی رقمیں قرض لیتے۔ وہ اپنا سارا پیسہ یا تو عورتوں میں اڑاتے یا جوا کھیلتے یا گھوڑ دوڑ میں بڑی رقمیں لگاتے۔ اس کھیل کے وہ سب بہت شوقین تھے اور جتنے صاحب لوگ شادی شدہ تھے وہ تو دائمی مقروض رہتے۔"

سیتارام نے بطور تنخواہ حولدار کے پانچ سو روپے صرف اس بچت سے بطور منافع کمایا جو ایک سپاہی اس کے پاس جمع کر دیتا۔ ان کی کمپنی کے ایک کپتان کا حادثہ کی وجہ سے سب کچھ برباد ہو گیا تھا۔ اسے فوری طور پر رقم کی ضرورت تھی' اس نے سیتارام سے پانچ سو روپے بطور قرض مانگا۔ لیکن چونکہ سیتارام خود ہی یہ سارا پیسہ تجارت میں لگا چکا تھا اس لیے اس کے پاس اس سپاہی کی رقم میں خیانت کرنے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں تھا۔ اور جب سپاہی نے اس سے اپنا پیسہ واپس مانگا تو کپتان اسے لوٹانے کے قابل نہیں تھا۔ اس کا کورٹ مارشل ہوا۔ اس نے اپنی اس حالت کے لیے کپتان کو تو کوئی الزام نہیں دیا لیکن مقامی افسروں کے بارے میں اس نے جو عبارت آرائی کی اور جنھوں نے اسے مجرم پایا تھا وہ روشنی دکھانے والا ہے۔ "مجھے اپنے ہی رجمنٹ کے مقامی افسروں نے بہت سی وجہوں سے مجرم قرار دیا' اس وجہ سے نہیں کہ میں نے جو کچھ کیا وہ غلط تھا اور اگر میری جگہ وہ ہوتے تو ان کا رویہ مجھ سے مختلف نہ ہوتا۔ تاہم انہوں نے مجھے صرف اس لیے مجرم قرار دیا کہ شاید کرنل کی خواہش مجھے سزا دینے کی تھی۔ اس لیے اس کی خواہش کے احترام میں مجھے مجرم قرار دیا گیا۔ یورپین افسران بھی اس بات سے بخوبی واقف تھے لیکن شاید یہ ملازمت کی روایت بن چکی تھی۔" یہ روایت کسی صورت سے نظم و ضبط میں معاون نہیں تھی۔

یورپین افسران کے جرائم ابتدائی دنوں میں ہو سکتا ہے ان کے اور ان کے خدمت گاروں کے درمیان دوستی کا باعث رہے ہوں لیکن بعد میں چل کر یہی بدعنوانی کا ذریعہ بن گئے۔

زیادہ تر افسران اپنے ساتھ ہندوستانی عورتوں کو رکھتے اور اکثر رجمنٹ پر وہ اثر انداز ہوتیں۔ انہیں جو کچھ ملتا وہ اس سے مطمئن نہ ہوتیں اور اکثر سپاہیوں کے ساتھ نرمی کا رویہ اختیار کرنے کے لیے وہ رشوت بھی لیتیں۔ سپاہی خود بھی اکثر اپنے افسروں کو اس بات کی ترغیب دیتے کہ وہ اپنی خدمت میں ان کی کچھ رشتہ دار عورتوں کو رکھ لیں۔ لیکن اکثر اس طرح کے لوگ یا تو نچلی ذات کے ہوتے یا مسلمان ہوتے۔

ایسا کہا جاتا ہے کہ فوج میں نظم و نسق اس وجہ سے ختم ہو گیا کیونکہ فوجیوں کو کوڑا مارنے کی روایت کو ختم کر دیا گیا۔ فوج میں ڈسپلن ان لیڈران کی بصیرت اور اعلیٰ کردار کی بدولت قائم ہوتی ہے جس سے فوجی بہت زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ یہ جسمانی ایذا پہنچا کر یا فوجیوں کو بے عزت کرنے سے نہیں قائم ہوتی۔ تجربہ کار مقامی افسروں نے بنگال فوج میں نظم و نسق کے فقدان کا جواز ان کے ساتھ مہربانی سے پیش آنا بتایا ہے۔ اور ہدایت علی جو بہت سخت سزائیں دینے کا قائل تھا لیکن نظم و نسق تو نظیر سے قائم ہوتی ہے نہ کہ نظریات سے۔ جہاں افسران اور اس کے فوجی مختلف

نسلوں اور قوموں سے تعلق رکھتے ہوں' ان کا مذہب الگ الگ ہو اور ملک کے مختلف حصوں سے وہ آتے ہوں اور مختلف زبانیں بولتے ہوں' وہاں اخلاقی خوبیاں ہی بہ نسبت سزا کے افسروں کو عزت کا مقام عطا کرتی ہیں۔ اور یہی نظم و نسق کی ضمانت بھی ہے۔ بنگال فوج میں جونیر افسروں کے غلط سلوک سے ان کے فوجی ان سے اجنبیت محسوس کرنے لگے۔ اور کمانڈروں کی بغاوت کے جذبے سے متاثر ہونے لگے۔ جب کوئی غیر ملکی طاقت کسی ملک پر اپنا تسلط اس ملک کے تجارتی ذہن رکھنے والے افراد سے قائم کرتی ہے تو بغاوت کے آثار بہت جلد ہی دکھائی دینے لگتے ہیں۔ یہ بغاوت فوراً ہی اس لیے نہیں ہوئی کہ بہت عرصے تک وہ مالکان کی طرف سے جنگ کرتے رہے۔ برا سلوک' اخلاقی گراوٹ اور ایک دوسرے پر عدم اعتماد نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔

جو بہترین افسر تھے وہ جنگ میں کام آگئے جب کہ ان کی شدید ضرورت تھی۔ سیاسی اور سول ملازمت سنہرے مستقبل کا خواب دکھاتی تھی۔ اس لیے بہترین صلاحیت والے مسلمانوں نے فوج کے علاوہ دیگر پیشوں میں جانا پسند کیا۔ گرچہ اس کی وجہ سے کچھ رجمنٹ کا تو نقصان ہوا لیکن پوری فوج میں ابھی باصلاحیت لوگ موجود تھے' جنھوں نے اپنی عملی سوجھ بوجھ کا ثبوت 1857 سے 59 کے درمیان دیا۔ اور ان میں سے کچھ تو فیلڈ مارشل کے عہدے تک پہنچ گئے۔ نئے قوانین کے تحت نئے افسروں کو رجمنٹس کا انچارج بنادیا گیا۔ جن سے وہ بالکل ہی ناواقف تھے نہ ہی ان کا کوئی اثر ماتحتوں پر پڑا جب نازک وقت آیا۔ اگر بریسر جیسے کمانڈر الہ آباد میں سکھ فوج کو چاق و چوبند رکھ سکتا تھا تو یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اسی صلاحیت کے آدمی دوسری جگہوں پر بھی فوج پر کنٹرول رکھ کر بغاوت کو روک سکتے تھے۔ جو بہترین سول افسران تھے وہ نئے قبضے میں آئے پنجاب صوبے میں ٹرانسفر کر دیئے گئے اور صرف اس سے کمتر درجہ کے لوگ ہی شمالی مغربی صوبے اور اودھ میں رہ گئے تھے۔ جو مقامی افسران تھے وہ صرف عام حالات میں کام آسکتے تھے گرچہ ان میں سے بہت سے وفادار بھی رہے لیکن سینئریٹی کے حساب سے پروموشن ملنے کی وجہ سے ان میں سے اکثر معمر ہو چکے تھے اور ان میں وہ جسمانی قوت اور طاقت بھی نہیں رہ گئی تھی جس کی ان سے امید کی جارہی تھی۔ سیتارام جب 65 سال کا ہوا تو چالیس سال کی ملازمت کے بعد اسے صوبیدار کے عہدے پر ترقی دی گئی۔

"میں 65 سال کا ایک بوڑھا آدمی مقامی فوجیوں کے اعلیٰ ترین منصب پر اس وقت پہنچا جب کسی کام کا نہیں رہ گیا تھا۔ اس عہدے کے لیے تو 35 سال قبل میں موزوں ثابت ہوتا۔ اب میں کمپنی کا ہیڈ ہو کر بھی کیا کر سکتا تھا۔ اب میں کیسے اپنے اندر کوئی طاقت پیدا کرتا۔ یہ مجھ سے امید کی جارہی تھی کہ میں اتنا ہی سرگرم رہوں۔ میری 48 سال کی خدمات کا کوئی صلہ نہیں ملا۔"

سیتارام اپنی جسمانی کمزوری کے بارے میں تو بتاتا ہے لیکن دماغی طور پر چاق و چوبند رہنے کے بارے میں کچھ نہیں کہتا۔ اسے تعلیم یافتہ ہونے کا کچھ تو بھرم تھا۔ لیکن اس کے جیسے دوسرے صوبیدار نہ لکھ سکتے نہ پڑھ سکتے اور انہیں ان کے اپنے فوجی بھی ہر طرح سے نکما سمجھتے۔ ایک غلط

معاشی کفالت کی پالیسی، کی وجہ سے سپاہی اور ہندوستانی افسران کو ملازمت سے سبکدوش نہیں کیا جاتا تھا گرچہ وہ کسی کام کے نہیں رہ گئے ہوں۔ اس لیے یورپین افسران ہندوستانی افسروں اور فوجیوں سے زیادہ میل جول رکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ ان میں سے اکثر جسمانی طور پر کمزور ہو چکے تھے۔ اور ان کا دماغ بھی ٹھیک کام نہیں کرتا تھا۔ اس لیے بہت سے رجمنٹ میں نظم و نسق کا سلسلہ بری طرح بگڑ گیا۔ ان باتوں میں پیچیدگی اس وجہ سے بھی پیدا ہوئی کیونکہ کالے آدمیوں کی عادت تھی کہ وہ سوالوں کا ایسا جواب دیں جو سوال پوچھنے والے کو خوش کر سکیں اور اسی وجہ سے کمانڈنگ افسران اپنے فوجیوں کے جذبات سے آگاہ نہیں ہو سکے۔ کیونکہ صوبیدار اور جمعدار بھی اپنے دل کی بات نہیں کہتے۔ وہ وہ بات کرتے جن سے کمانڈر خوش ہو سکے۔

اگر سپاہی اس غیر ہمدردی اور لاپروائی کے درمیان جھول رہے تھے تو عوام بھی سرکار سے بہت زیادہ خوش نہیں تھی۔ صرف پریزیڈنسی شہروں کے کچھ پڑھی لکھی اقلیت سرکار کے سماجی قوانین اور مغربی تعلیم کو رائج کئے جانے کو اچھا سمجھتی لیکن شمالی ہند کا ایک مقامی آدمی کلکتہ کے بابوؤں کا یہ کہہ کر مذاق اڑاتا کہ یہ سب عیسائی ہو جائیں اگر انہیں ملٹن یا شیکسپیئر کا استاد ہونے کا مرتبہ حاصل ہو جائے۔ اور یہ بھی ہے کہ پڑھا لکھا اقلیتی طبقہ بھی مکمل طور پر سرکار کی حمایت نہیں کرتا۔ ایک تعلیم یافتہ ہندو بنگالی نے ان لفظوں میں شکایت کی ہے۔ ''سو سال تک کی زورزبردستی اور سازش اور تشدد کو صرف نرم دلی کے اظہار سے نہیں دھویا جاسکتا۔'' ''سو سال تک ایک دوسرے کے درمیان ہونے والے مکالموں نے بھی ہندو اور انگریز کو ایک دوسرے کا دوست نہیں بنایا۔'' حکمراں قوم کی اس سماجی علاحدگی نے حکمراں طبقہ کے لیے صرف نفرت پیدا کی۔ جس نے بغاوت کے زمانے کی فضا کو اور مکدر کیا۔ شاتن کے لیفٹیننٹ ورنی کا کہنا ہے ''انگریز باشندے عام طور پر مقامی لوگوں سے بہت زیادہ تعصب رکھتے اور یہ تعصب ان کے رویے میں بھی نظر آتا۔''

''میرا خیال ہے کہ بغاوت کے اسباب میں ایک سبب یہ بھی جوڑا جاسکتا ہے کہ ہر انگریز کے ذہن میں مقامی لوگوں کے لیے شدید حقارت کا جذبہ پایا جاتا تھا۔ اگر انگریز کسی مقامی شخص کے ساتھ مہربانی کا رویہ بھی دکھاتا تو بھی اس کے ساتھ ہی وہ حقارت آمیز لہجہ استعمال کرتا اور ایسے الفاظ سے نوازتا جو پادری اور دوسرے لوگ ہندوؤں کی بھلائی چاہنے کے باوجود ان کے لیے استعمال کرتے اور اس سے انہیں یقین ہو چلا ہے کہ اسی رویے کی وجہ سے مقامی لوگوں نے ہم لوگوں کو غیر سمجھا۔''

ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ مٹھی بھر غیر ملکی لوگ جو کسی دور دراز ملک میں رہ کر کروڑوں لوگوں پر حکمرانی کر رہے ہوں، وہ اگر اپنے کو برتر طبقہ نہیں سمجھتے تو وہ مقامی لوگوں کی بھیڑ میں کھو جاتے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ وہ محکوم قوم سے مکمل تعاون اس وقت تک نہیں پا سکتے تھے جب تک وہ صرف اپنی تنہائی میں پناہ گزیں رہتے۔ اور ان دونوں کے درمیان کوئی

درمیانی راستہ ڈھونڈنا مشکل کام ہے اور وہ بھی جب کہ حاکم و محکوم دونوں الگ الگ نسل سے تعلق رکھتے ہوں، تو نسلی برتری کی وجہ سے پیدا ہونے والے غرور کو ختم بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ہندوستانی بھی انگریزوں سے ملنے والے حقارت آمیز رویے کی وجہ سے اپنے کو ان کے خلاف پاتا۔ سر سید احمد خاں جو کمپنی کے وفادار افسر تھے، ان کا کہنا ہے کہ ہندوستان میں برٹش حکومت کے پہلے سال سرکار عوام میں بہت مقبول تھی۔ اور سبھی لوگ اس کے لیے خیر سگالی کا جذبہ رکھتی تھی۔ وہ زور دے کر کہتے ہیں کہ سرکار اب اس خیر سگالی کے جذبے سے محروم ہو چکی ہے اور عام طور پر مقامی لوگ ان کے حقارت آمیز رویے کی شکایت کرتے ہیں۔ ایک مقامی شریف آدمی چھوٹے سے افسر کے نزدیک اتنی ہی کم اہمیت کا حامل ہوتا جتنا وہ افسر خود اپنے کو ڈیوک کے سامنے کمتر پاتا۔ ''سرکار کو یہ بھی نہیں معلوم کہ سب سے اعلیٰ درجہ کا مقامی افسر بھی اپنے افسران کے سامنے خوفزدہ اور لرزتا ہوا ہی آتا ہے۔'' سر رچرڈ ٹمپل، سر سید کی اس شکایت کو بے جا قرار دیتا ہے۔ لیکن یہ ضرور قبول کرتا ہے ''ہماری پرانی شخصی مقبولیت اب ختم ہو گئی ہے اور افسران اور عوام کے درمیان اجنبیت بڑھتی جارہی ہے۔'' کشوری چند متراجو اپنے کو بجا طور پر انگریزوں کا وفادار مانتا تھا اور جو کلکتہ میں سرکار کے سماجی اقدام کو مشتہر کرتا، وہ بھی محسوس کرتا کہ یورپین افسران اور مقامی جونیر افسران کے درمیان خلیج بڑھتی جارہی ہے۔ ''ان دونوں کے درمیان لاتعلقی کی خلیج بڑھتی جارہی ہے اور دونوں ایک دوسرے کے احساسات سمجھنے سے قاصر ہو چکے ہیں۔'' حالانکہ کہیں کہیں انگریز افسروں اور ہندوستانی شہریوں کے درمیان دوستی کا رویہ پایا جاتا تھا، مثلاً پٹنہ کا ٹیلر شاہ کبیر الدین کا مداح تھا جو اس کا اسکیچ بنایا کرتا تھا۔ اور لاک وڈ اپنے ایک بنگالی کلرک ترلوکی ناتھ لہری کی بڑی تعریف کرتا تھا لیکن اس درشت مزاجی اور غیر منصفانہ سلوک کے اکا دکا واقعات بھی بہت جلد شہرت پاجاتے اور جس سے پوری قوم پر آنچ آجاتی۔ چاہے بات کچھ بھی ہو لیکن انگریزوں نے ہندوستانیوں کو اپنے سے دور رکھنے کے لیے بہت کچھ کیا۔ بنارس جاتے ہوئے رسل نے محسوس کیا ''پورے راستے میں کسی بھی شخص نے ایک انگریز کی گاڑی کو محبت کی نگاہ سے نہیں دیکھا۔ وہ نگاہوں سے ٹپکتی ہوئی نفرت، اُسے دیکھ کر کون شبہ کرسکتا تھا اور ان کا مطلب غلط کیسے نکالا جاسکتا تھا؟ اسی ایک واقعہ سے میں نے سیکھا کہ ہماری پوری قوم سے لوگ خوفزدہ نہیں ہوتے بلکہ سبھی نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔''

بے اطمینانی کا ایک سبب مقامی ہندوستانیوں کا اعلیٰ درجے کی ملازمتوں سے منظم طریقے سے الگ کیا جانا بھی تھا۔ جس اعلیٰ ترین منصب پر کوئی ہندوستانی پہنچ سکتا تھا وہ انتظامیہ میں ڈپٹی کلکٹر کا عہدہ تھا یا عدلیہ میں صدر امین یا سب جج۔ ایسا نہیں کہ ہندوستانیوں میں صلاحیت نہیں تھی۔ خود ان کی زندگیوں میں بھی اور ان کی یادداشت میں بھی یہ بات بخوبی موجود تھی کہ ان کے والدین یا اجداد نے پورے صوبے پر حکومت کی ہے اور کامیابی سے کی اور فوج کی سربراہی بھی کی۔ یہ بات بہت پریشان کن تھی کہ ہندوستانیوں کے لیے کمترین عہدوں کے علاوہ کوئی اور متبادل

روزگار نہیں تھا۔ ہندوستان کے اعلیٰ طبقوں کو اس بات کی بھی شکایت تھی کہ قانون کی نظر میں ہر شخص برابر ہے۔ برٹش کالونی امیر اور غریب 'اعلیٰ اور ادنیٰ' راجا اور پرجا' میں کوئی تفریق نہیں کرتی تھی۔ والی لکھنؤ برجیس قدر نے اپنے ایک فرمان میں اس بات پر خصوصی زور دیتے ہوئے کہا۔ "سارے ہندو اور مسلمان اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ چار چیزیں ہر انسان کو عزیز ہوتی ہیں: (۱) مذہب (۲) عزت (۳) زندگی (۴) جائیداد۔ یہ چاروں چیزیں ایک قومی حکومت کے تحت محفوظ ہوتی ہیں۔" وہ اس کی وضاحت کرتے ہوئے آگے کہتے ہیں کہ اعلیٰ برتر طبقہ کے ہندو اور مسلمان دونوں کے ساتھ پرانے دور میں ایک جیسا برتاؤ کیا جاتا تھا۔ اور اب "انگریز ان چاروں مذکورہ چیزوں کے کیسے دشمن ہوگئے ہیں۔" ان کے نزدیک اعلیٰ اور قوموں کی عزت اور وقار کمتر لوگوں کی عزت و وقار کے برابر ہے۔ بلکہ کمتر لوگوں کے مقابلے وہ برتر لوگوں کو حقارت اور بے عزتی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔" یہ الزام بے بنیاد نہیں ہے لیکن اس الزام کی خوبی کا سارا سہرہ برٹش حکومت کو جاتا ہے کہ انہوں نے ہر آدمی کے ساتھ انصاف کا برتاؤ کیا اور ذات پات یا اعلیٰ و ادنیٰ کی کوئی تفریق نہیں رکھی۔ لیکن یہ نظریہ بہت سے ہندوستانیوں کو راس نہیں آیا اور حد تو یہ ہے کہ کچھ انگریزوں نے بھی اسے نہیں سراہا۔ رسل ایک انگریز کا تذکرہ کرتا ہے جو سارے ہندوستانیوں کو اپنا جوتا چٹوانا چاہتا تھا کیونکہ اسے قرض دینے والے ایک شخص نے اس پر نالش کردی تھی۔ اس نے کہا: "آپ کیسے یہ امید رکھتے ہیں کہ یہاں کوئی باعزت شہری آئے تاکہ کالا دھن رکھنے والے بازاری یا سمن کی تعمیل کرنے والے جاہل لوگ اس کی بے عزتی کریں۔" لکھنؤ کا فرمان بھی کچھ ایسے ہی جذبات کا اظہار کرتا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ ایک انگریز نے ایک چمار کی شکایت پر ایک نواب یا راجا کو اپنے دربار میں بلا کر بے عزتی کی۔ قانون کی نگاہ میں کسی شخص کی کوئی وقعت نہیں تھی اور اس لیے جو لوگ اب تک خود کو بالاتر سمجھتے رہے وہ اسے پوری طرح ناپسند کرتے لیکن اتنا ہی نہیں یہ ان غریب کسانوں کو بھی ناپسند تھا جن کے حقوق کے لیے یہ قانون بنا تھا۔ اس لیے نہیں کہ قانون میں کوئی برائی تھی بلکہ اس لیے کہ عدلیہ میں ہر سطح پر بدعنوانی تھی۔ پری چرڈ شکایت کرتا ہے "عدالت میں کھلی بدعنوانی اور گراوٹ تھی۔" اس تنقید میں وہ تنہا تھا۔ اس کے علاوہ انگریزی قانون کی پیچیدگیاں کسی کم علم' جاہل کاشتکار یا کسان کی سمجھ سے باہر تھی۔ یا اس کی مالی حالت ایسی تھی کہ وہ اپنے مقدمے کی پیروی کے لیے کسی وکیل کی خدمات حاصل کرے۔ پرانی روایات کے حساب سے عدالت کا دروازہ ہر آدمی کے لیے کھلا ہوا تھا اور کوئی بھی شخص وہاں بغیر کسی رکاوٹ کے جاسکتا تھا۔ سیتارام ایک بار ڈپٹی کمشنر کے آفس میں چلا گیا کیونکہ اسے بتایا گیا تھا کہ یہاں کوئی بھی شخص انصاف کے لیے جاسکتا ہے۔ وہ وہاں موجود چپراسیوں کے روکنے کے باوجود داخل ہوگیا نتیجتاً اسے دس روپے کا جرمانہ بھرنا پڑا۔ وہ یہ نہیں سمجھ سکا کہ اس پر کس بات پر یہ جرمانہ نافذ کیا گیا ہے۔ پولس اور چھوٹے موٹے اہلکاروں کی بدعنوانی مشہور تھی اور ان کی اس بدکرداری کی وجہ سے عدالتوں کی بدنامی ہوتی۔ گاؤں کے لوگ یہ سمجھتے کہ چپراسی جوان سے رشوت لیتے ہیں اس

میں صاحب لوگوں کا بھی حصہ ہوتا ہے۔ ''بڑا صاحب اس بات پر بہت ناراض ہوتا جب اسے معلوم ہوتا کہ مدعی کو رشوت دینی پڑی۔ وہ اس سے پوچھتا کہ تم نے رشوت کیوں دی؟ لیکن وہ اس بات سے بے خبر رہتا کہ رشوت دینے والا ہمیشہ اس خیال سے رشوت دیتا ہے کہ اس میں بڑا صاحب کا بھی حصہ ہوگا۔'' اس لیے عدلیہ اکثر امیروں اور عیار لوگوں کے ہاتھوں میں ظلم و زبردستی کا وسیلہ بن گئی کیونکہ پیسہ لے کر غلط لوگوں کو گواہ بنایا جاسکتا تھا اور کسی دعوے کی تصدیق کے لیے جھوٹے دستاویز بھی تیار کئے جاسکتے تھے۔ رانکس' آگرہ کی صدر عدالت کا ایک جج کہتا ہے ''شمالی مغربی صوبے کے لوگ ہمارے اس قانونی ضابطے کی ہر طرح سے مخالفت کرتے۔''

لیکن سب سے زیادہ بیع کا قانون نامقبول تھا۔ پرانے قوانین کے تحت زمین کو مالک سے الگ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اگر کوئی زمین کا مالک قرضوں کی ادائیگی نہیں کر پاتا تو اسے اس وقت تک بندھک بنا کر رکھا جاتا جب تک اس کے وارث اسے چھڑا نہ لیتے۔ اس کے علاوہ لگان کی ادائیگی بھی نقد کے بجائے جنس کی شکل میں کی جاتی اور اکثر کھڑی فصل میں ہی حصہ لگا لیا جاتا۔ گرچہ یہ طریقہ صحیح نہیں تھا اور پیچیدہ بھی تھا۔ کمپنی کی سرکار نے اس رواج کو اور آسان بنادیا اور اس نے اس طرح کے قانون وضع کئے کہ قرضدار کی زمین قرض ادا نہ کرنے کی صورت میں بیچ دی جائے۔ یہ قانون صحیح بھی تھا۔ جب کوئی مالک زمین کو غیر منافع بخش تصور کرتا تو خود اس کا فائدہ اس میں تھا کہ وہ اس زمین کو فروخت کردے لیکن 'اسے اپنی زمین ہر صورت میں بہت پیاری ہوتی۔ 'اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اسے اس کا لگان کیا ملتا ہے۔ کیونکہ کاشتکاروں کے ساتھ جو اکثر اس کے گاؤں کے لوگ ہوتے ان کے اس سے گہرے مراسم ہوتے۔ زمین کے نقصان سے نہ صرف اسے معاشی طور پر نقصان ہوتا بلکہ اکثر اس کے وقار کو بھی دھکا لگتا۔ بیع کا قانون اتنی سختی سے لاگو بھی نہیں کیا جاتا اگر لگان کی شرح معمولی ہوتی۔ سرکار نے تو تخمینہ لگانے کے لیے انصاف پر مبنی قانون بنا رکھا تھا اور اگر ان پر صحیح طور پر عملدر آمد ہوتا تو لوگوں کو اتنی دشواری بھی نہ ہوتی۔ لیکن جیسا کہ متھرا کے کلکٹر تھارن ہل کا کہنا ہے ''ایسا مشاہدہ میں آیا ہے کہ ان قانونوں پر صحیح طور پر عملدر آمد سے ترقی میں رکاوٹ پڑ جاتی ہے۔ لگان وصولی اور بندوبست کا کام نوجوان افسروں کے سپرد کردیا گیا تھا جن کے سامنے ان کا اپنا کیریئر رہتا۔ اس لیے یہ حیرت کی بات نہیں کہ ان کی مالیت اتنی قرار دی جاتی جس کی ادائیگی کرنا زمینداروں کے بس کی بات نہیں تھی۔ فصل اگر اچھی ہوتی تو انہیں کچھ فائدہ ہوتا لیکن فصل کے خراب ہونے پر وہ سب تباہ حال ہو جاتے۔

ولیم ایڈورڈ' جو بدایوں کے کلکٹر اور مجسٹریٹ تھے' وہ بھی اس بات کی عینی شہادت دیتے ہیں۔ غدر کے زمانے میں انہوں نے ایک دوست زمیندار ہردیو بخش کے یہاں پناہ لی ان کے ایک رشتہ دار سے یہ معلوم ہوا کہ سرکار کی مانگوں کو پورا کرنا ان کے لیے کتنا مشکل کام ہے۔ ''معمر قصوری نے مجھے بتایا کہ اسے ایک عرض داشت بھیجنے کے لیے ایک ہزار روپے خرچ کرنے پڑے اور ان میں سے کوئی بھی عرضی سیتاپور کے کمشنر کرسچن کو نہ پہنچی اور اس کام میں اسے چھ ہزار کی

رشوت دینی پڑی۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اس کام میں اسے اپنے کتنے گاؤں سے ہاتھ دھونا پڑا جن کا صدیوں سے وہ مورث تھا' اور وہ خود کاشت بھی کر رہا تھا اور اس کی بچی ہوئی کاشت پر اتنی زیادہ مالگزاری لگائی گئی کہ وہ پچھلے سال کی بقایا رقم اپنے کچھ گھریلو جواہرات اور اپنی قیمتی گھوڑی' جسے وہ بہت زیادہ پیار کرتا تھا' بیچ کر ادائیگی کرنی پڑی۔ اور شاید اس سال کی ساری رقم باقی رہ جاتی اور اسے باقی سارا اثاثہ بیچنا پڑتا اگر اس کی خوش قسمتی سے یہ بلوہ (غدر) نہ ہو گیا ہوتا۔" گرچہ کرچن بہت مقبول عام کمشنر تھا اور وہ اس بے طرح لگان عاید کئے جانے کا مخالف بھی تھا' تاہم اس کی اپنی کمشنری سیتاپور میں مالکان کی حالت اتنی پتلی ہو گئی تھی کہ ان سب کو اپنے زیورات کو بیچ کر موروثی جائیداد کو بچانا پڑا تھا۔ ان میں سے بہت سے لوگوں کو یہ غدر ایک راحت ثابت ہوا۔ بڑے بڑے مالکان یا تعلقدار جو زمینداروں کے مالک تھے ان کے بہت سے حقوق سلب ہو گئے۔ اور تاعمر جو لگان انہیں وصول ہوتی اس کے برابر پنشن مل گئی۔ ان دونوں طبقوں کے مفاد کو اس سے بہت ضرب پہنچی۔ زمیندار کی ساری املاک تو بنیا خرید لیتا اور تعلقداروں کو اس قانون سے کافی نقصان ہوا۔ جیسا کہ تھارن ہل لکھتا ہے: "شہزادوں اور نوبلز کے مقام سے گھٹا کر انہیں محض ایک وظیفہ خوار بنا دیا گیا۔" اس لیے اس دشواری کی گھڑی میں جب سرکار نام کی کوئی چیز نہیں رہ گئی تھی' دیہی علاقوں میں نظم و ضبط برقرار رکھنے والا کوئی شخص نہیں بچا۔ بنیا' جسے اس نئے قانون سے سب سے زیادہ فائدہ ہوا' اس سے سماج کا ہر طبقہ نفرت کرتا۔

سہارنپور کے مجسٹریٹ رابرٹسن کا کہنا ہے: "زراعت پر منحصر آبادی کو ہماری حکومت کا سب سے زیادہ قابل نفریں وہ قانون تھا جس کا سب سے زیادہ فائدہ خون چوسنے والے ساہوکاروں کو ملا جو غریب آبادی کا ہر طرح سے خون چوس کر اس کا استحصال کرتا۔"، "میں نے دیکھا ہے کہ ہم لوگوں کے خلاف سب سے زیادہ بدلے کا قدم ان چھوٹے زمینداروں نے اٹھایا جنہیں بنیوں نے ہماری عدلیہ کے ذریعہ کنگال بنا دیا تھا۔"

لیکن زمیندار اور تعلقدار ہی ایسے لوگ نہیں تھے جنہیں اپنے آبائی پیشے سے محروم ہونا پڑا۔ بیچ سے متعلق نئے قانون سے کسانوں کو بھی سب سے زیادہ چوٹ لگی تھی۔ وہ کئی پشتوں سے بنیوں کے مقروض چلے آ رہے تھے۔ گاؤں میں جو شخص قرض پر پیسہ دیتا وہ کبھی ایمانداری نہیں برتتا۔ نہ صرف یہ کہ وہ سود در سود وصولتا بلکہ اکثر دھوکہ بازی سے بھی کام لیتا۔ زمینداری کے تحت یہ جاہل کسانوں کا طبقہ اکثر اپنے کو مقروض سمجھتا لیکن نئے قانون کے تحت کبھی ادا نہ کئے جانے والے قرضوں کے لیے اس کی زمین بیچ دی جاتی اور اس طرح سے وہ اپنی روزی روٹی اور پیشے سے محروم ہو جاتا۔ اسی لیے اس موقع پر سبھی زمین سے محروم کسان اور زمیندار نہ صرف ایک ہو گئے بلکہ پہلے سے چلے آ رہے زمینداری کی روایت کے تحت جس میں اسے ہر طرح کا تحفظ حاصل تھا اس کی وجہ سے وہ ایسے تمام زمینداروں کے وفادار ہو گئے۔ زمیندار گاؤں میں رہتا اور گرچہ کسان اس کا بھی ظلم سہتے لیکن وقت ناگہانی اور پریشانی میں وہی زمیندار ان کی مدد بھی کرتا۔

بیے کی حیثیت اس نظام میں اجنبی کی تھی۔ وہ کسانوں سے ان کی زمین اور املاک کے حقوق حاصل کر انہیں بہت زیادہ فائدے پر دوسروں کو بیچ دیتا۔ اس لیے اس کے اور کسان کے درمیان نہ کوئی جذباتی وابستگی تھی اور نہ ہی کوئی وفاداری یا لگاؤ۔ اس لیے کسان اپنے سابق زمینداروں کا ساتھ دینے میں کبھی ہچکچاتا نہیں۔

پاسی جو ایک زمانے سے گاؤں کا چوکیدار ہوا کرتا تھا اسے بھی سرکار سے بہت زیادہ شکایت تھی۔ وہ بھی زمینداروں کی طرح سے اپنے موروثی پیشے سے محروم کر دیا گیا تھا۔ برجیس قدر کے ایک فرمان میں کہا گیا ہے "ہر فرد عام کو معلوم ہونا چاہیے کہ پاسی جس کی ذمہ داری موروثی طور پر گاؤں کی چوکیداری ہوا کرتی تھی ان کی جگہ پر انگریزوں نے برق اندازوں کی تقرری کر کے انہیں ان کے موروثی پیشے سے، محروم کر دیا ہے۔"

اس طرح سے دیہی معیشت انگریزوں کے سماجی انقلاب لانے کے جوش کی بدولت تباہ ہو گئی اور اسی لیے زندگی کے ہر شعبے میں انگریزوں کے خلاف نفرت کا جذبہ بھڑک اٹھا۔ شاید وقت اور تعلیم سے انہیں اس نقصان پر صبر آ جاتا لیکن نئے تعلیمی اداروں اور نئے قوانین میں انہیں کوئی راحت نظر نہیں آئی۔ جب غدر کا شعلہ بھڑکا تب سیتاپور کے کمشنر جے جی کرسچن نے رانک کو لکھا:

"گاؤں کا نظام جس میں غریبی میں ہر شخص میں مساوات پائی جاتی' اب وہ سب اتھل پتھل ہو گیا ہے اور سرکار کے پاس ایک بھی ایسا بااثر شخص نہیں رہ گیا جو ان پر کچھ اثر ڈال سکے۔ ان کی فوج میں بھی یہی مساوات پایا جاتا ہے۔ صرف مرتبہ کو چھوڑ کر ہر شخص برابر ہے۔"

نئے قوانین اور قانونی ضابطوں نے ایک ایسے طبقے کو جنم دیا جو ہم سے متنفر تھا بلکہ اس بے اطمینانی اور شورش کے زمانے میں اسے وہ موقع بھی فراہم کیا کہ وہ دوبارہ ان تمام چیزوں پر قابض ہو جائے جس پر کل تک وہ اپنی ملکیت سمجھتا تھا۔ لیکن اس سے اس کے بعد اپنی بڑھتی ہوئی بدحالی کو اس نے انگریزوں کی ا، جانی بوجھی پالیسی کا حصہ سمجھا جس کی بنا پر مشنریوں کی تبلیغی سرگرمیوں کو اور تیز اور مؤثر بنانا تھا۔ سر سید احمد لکھتے ہیں کہ 1837ء کی قحط سالی کے زمانے میں بہت سے لوگ بھوکے مر گئے۔ یتیم بچوں کو غذا اور پناہ گاہ مہیا کرائی گئی اور جنہیں بعد میں عیسائی بنالیا گیا اس کی وجہ سے لوگوں کا یہ یقین پختہ ہو گیا کہ سرکار کا منشا پوری آبادی کو حد سے زیادہ غریب بنانا ہے تاکہ انہیں بعد میں تبدیلی مذہب کے لیے اکسایا جاسکے۔ وہ لکھتے ہیں: "آخر کار ہر ہندوستانی یہ سوچنے کا عادی ہو گیا کہ تمام قانون صرف اسی لیے وضع کیے جا رہے ہیں کہ انہیں کمتر اور حقیر بنا دیا جائے تاکہ بعد میں وہ اپنے مذہب سے بآسانی محروم کیے جاسکیں۔"

اس احساس کا ثبوت ہمیں اس اپیل سے بھی ملتا ہے جو اعظم گڑھ کے باغیوں نے ہندوستانیوں کے نام جاری کرتے ہوئے ان سے بدعقیدہ انگریزوں کے خلاف شورش برپا کرنے کے لیے کہا تھا۔ کیونکہ انگریزوں کا مقصد سب کو برباد کرنا ہے۔ زمینداروں سے کہا گیا "یہ ہر شخص کو بخوبی

معلوم ہے کہ انگریز زمین کی مالیت اس قدر اونچی رکھتے ہیں جس سے آپ سب تباہ ہو جائیں اور جب کوئی مزدور یا گھریلو نوکر اور نوکرانی آپ کے خلاف کوئی درخواست دیتے ہیں تو بغیر تفتیش کے آپ کو عدالت میں بلا کر آپ کی تحقیر اور بے عزتی کرتے ہیں، اور اگر آپ کسی پر مقدمہ چلانا چاہیں تو آپ کو مہنگے اسٹامپ پیپر پر درخواست دے کر کورٹ فیس جمع کرنی پڑتی ہے۔ اس کا خرچ ناقابل برداشت ہو جاتا ہے، اس کے علاوہ آپ کو ایک حصہ سڑکوں اور اسکولوں کے لیے بھی دینا پڑتا ہے۔" تجارت پیشہ لوگوں کو یاد دلایا گیا "آپ کو معلوم ہے کہ ان بد عقیدہ انگریزوں نے ساری بڑی تجارت پر اپنا قبضہ جما رکھا ہے۔ جیسے نیل، افیم اور کپڑے وغیرہ اور جن چیزوں سے کم فائدہ ہو اس کی تجارت کی آپ کو اجازت دی جاتی ہے۔ اور اگر آپ کسی وجہ سے عدالت میں جانا چاہیں تو اسٹامپ پیپر اور کورٹ فیس کی شکل میں بڑی رقم ادا کرنی پڑتی ہے اور اس کے علاوہ سرکار لوگوں سے ڈاک ٹکٹ اور اسکول فنڈ کے نام پر بھی بہت زیادہ دولت جمع کرتی ہے اور زمینداروں کی طرح سے آپ کو بھی معمولی سے آدمی کی شکایت پر عدالت میں بلا کر نہ صرف بے عزتی کی جاتی بلکہ جرمانے اور قید کی بھی سزا ہوتی۔" حکام بھی اس بات سے بے خبر نہیں تھے کہ سول اور ملٹری کے محکموں میں صرف، چھوٹے اور بے کار عہدے ہندوستانیوں کو دیئے جاتے ہیں۔ اور سارے بڑے عہدے یورپین کے لیے مخصوص ہیں مثلاً ملٹری لائن میں جس اعلیٰ عہدے پر کوئی مقامی آدمی پہنچ سکتا تھا وہ صوبیدار کا عہدہ تھا جس کی ماہانہ تنخواہ ساٹھ یا ستر روپے ہوتی۔ اور سول محکموں میں صدر امین کے درجہ تک پانچ سو روپے تنخواہ ہوتی۔ لیکن پہلے جس طرح سے ان لوگوں کو فیس معاف جاگیریں عطا کی جاتیں وہ نظام ختم ہو گیا تھا۔ "اسی طرح سے دستکار بھی جانتا تھا" یورپین ہر طرح کی چیزیں انگلینڈ سے منگاتے اس طرح بہت حقیر اور بہت چھوٹا پیشہ ان کے ہاتھوں میں رہ گیا تھا۔" آخر میں مولویوں اور پنڈتوں کو بھی یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ انگریز آپ کے مذہب کے دشمن ہیں۔ آپ اس مسلح بغاوت میں ہمارا ساتھ دیجئے تا کہ خالق دو جہاں آپ پر رحم کر سکے ورنہ آپ سب گنہگار ہوں گے۔"

اس فرمان میں صرف راجاؤں اور نوابوں سے اپیل نہیں کی گئی لیکن وہ لوگ بھی ختم ہونے کے اندیشے سے فکر مند تھے۔ پنجاب پر 1849ء میں قبضہ کیا گیا۔ گرچہ وہاں کا راجکمار ایسٹ انڈیا کمپنی کا وارڈ تھا۔ اور وہ ملتان میں ہوئی شورش کے لیے ذاتی طور پر ذمہ دار بھی نہیں تھا۔ اس کی وجہ سے انگریزوں کی سکھوں سے دوبارہ جنگ ہوئی۔ کچھ چھوٹے رجواڑوں جیسے ستارا، جھانسی اور تانجور پر صرف اس بہانے قبضہ کیا گیا کہ یہاں کوئی فطری جانشین نہیں تھا۔ ستارا کی حکومت صرف اس لیے قائم کی گئی تھی کیونکہ جب پیشوا کے دارالحکومت پر قبضہ کیا گیا تو مراٹھا خواہش کی تکمیل کے لیے کوئی رجواڑہ ہونا چاہیے تھا تا کہ اس چھوٹے سے راج میں پرانے عمائدین کے خاندان والوں کو سول اور ملٹری کے اعلیٰ عہدوں پر پہنچنے کی آسانی ہو سکے۔ جھانسی کے حکمراں کو حکمرانی کی یہ مراعات کمپنی کی مہربانی سے ملی تھی اور کئی بار ایسا ہوا کہ کسی لاولد بھائی کی جاگیر اس

کے دوسرے بھائیوں کو ملی۔ تانجور بہت زمانے تک ایک محکوم حکومت تھی جس کے راجا مراٹھا نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن صرف یہی مراٹھا رجواڑے نہیں تھے جن کو خاتمے کا اندیشہ لاحق تھا۔ ناگپور کا آخری راجا بھی لاولد مرگیا اور کوئی اس کا قانونی وارث نہ ہونے کی وجہ سے ایسے رجواڑوں کے ختم ہونے کے قانون کے تحت اسے کمپنی حکومت میں شامل کرلیا گیا۔ ثانی الذکر حکومت پر جس طرح سے قبضہ کیا گیا اس سے عوامی جذبات مشتعل ہوگئے۔ راج محل کی خواتین کے احتجاج کے باوجود سارے زندہ اور مرے ہوئے مویشیوں کی نیلامی کردی گئی۔ اور یہ سیتا بالدی میں جانوروں کی تجارت کرنے والوں کے لیے بہت منافع کا دن تھا۔ جب شاہی اصطبل کے ہاتھی گھوڑے اور بیل اور گائے وغیرہ بہت سستی قیمتوں پر بیچے گئے۔ اور شاید یہ حکمراں گھرانوں کے لیے اور خصوصاً بانکا بائی کے لیے بہت ہی غم ناک دن تھا۔ بانکا بائی جس نے اپنی عمر کا زیادہ حصہ محل میں دانشمندی کے ساتھ گزارا تھا وہ بے عزتی کے خوف سے اتنا لرز گئی تھیں کہ اس نے سارے محل میں آگ لگانے کی دھمکی دی، اگر فرنیچر کی نیلامی کی گئی۔ لیکن اس دھمکی کے باوجود نہ صرف فرنیچر ہٹائے گئے بلکہ بھونسلے خاندان کے دوچار کو چھوڑ کر سارے زیورات اور جواہرات کلکتہ بازار میں بیچ دیئے گئے۔ اور مجھے معلوم ہوا ہے کہ ان سب چیزوں کی ضبطی اور نیلامی سے آس پاس کے صوبوں میں اتنا خراب اثر پڑا جتنا کہ حکومتوں پر قبضہ کئے جانے سے بھی نہ پڑتا۔"

سنبل پور کی چھوٹی حکومت جو کسی زمانے میں ناگپور حکومت کے تحت تھی اس پر پہلے ہی تسلط جمایا جاچکا تھا۔ اسی طرح سے مرشد آباد اور کرناٹک کے نواب جن کی حکومتیں پہلے ہی ختم ہو چکی تھیں، انہیں اس مرتبے سے 1854ء میں معزول کردیا گیا۔ اور یہی حال تانجور کے ہندو رجواڑے کا ایک سال بعد ہوا۔ یہاں حکومتوں کے ختم ہونے کے اس قانون کے جواز پر بات کرنا بے معنی ہوگا۔ کیونکہ کرولی کی راجپوت حکومت کے سلسلہ میں اس قانون کا نفاذ نہیں کیا گیا۔ اور یوں بھی رجواڑوں کے سلسلہ میں تفریق کی جاتی رہی ہے۔ اور یہ حکومتیں جنہیں برٹش حکومت نے قائم نہیں کیا تھا چاہے کتنی چھوٹی ستارا اور جھانسی جیسی کیوں نہ ہوں، ڈلہوزی اس چیز کے لیے بے چین رہتا کہ اگر کوئی قانونی جواز مل جائے تو فوراً برٹش حکومت کی توسیع کرنے میں وقت ضائع نہیں کرتا۔ اور وہ ان مسائل پر اس نگاہ سے بھی نہیں دیکھتا جو اس کے چند قدامت پسند پیش روؤں کا رویہ رہا ہے۔ اس کے اس مقصد میں کوئی برائی بھی نظر نہیں آتی کیونکہ حملہ کئے جانے کی اس کی پالیسی ہندوستان کو سیاسی اکائی بنانے میں بہت معاون رہی۔ اسی کی بدولت بعد میں ہندوستانی قوم کی بنیاد بڑی گرچہ ڈلہوزی کا ایسا کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ لیکن ڈلہوزی کے اس امپیریلزم کی خواہش کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا گیا۔ جھانسی کی رانی اپنی حکومت پر قبضہ کئے جانے کی کوشش کو حتمی نہیں سمجھتی تھی اور اسی لیے اعلیٰ ترین حکومت کو اپنی عرضداشت بھیجتی رہی۔ رنگو باپوجی تو ستارا حکومت کی وکالت کے لیے لندن بھی گئے۔ سمبل پور کے نمائندے جو اتنے دولت مند اور چالاک نہیں تھے انہوں نے مسلح بغاوت کردی۔ لیکن جس چیز نے ہندوستان

کے ذہن کو کرارا جھٹکا لگا یا وہ کرناٹک اور تنجور کی حکومت کی قسمت کا فیصلہ تھا۔ ناگپور کی حکومت نے تو برٹش طاقت کے سامنے سر جھکانے سے انکار کیا اور کئی بار مسلح ہو کر اس کے سامنے محاذ آرائی کی لیکن تنجور اور کرناٹک کے راجکمار ہمیشہ برٹش حکومت کے وفادار اور غلام بنے رہے۔ اور ان سب کا خاتمہ ایک جیسا ہوا اور ہندوستانی چاہے ایک دوسرے کے دوست ہوں یا دشمن' سب کا مقدر ایک ہی ٹھہرا۔ اگر اب بھی برٹش حکومت کی غیر متعصبانہ رویے میں کچھ شک تھا تو 1856ء میں اودھ پر قبضہ نے اسے بالکل ختم کر دیا۔

حکومتوں کو مفتوح بنانے کی اس پالیسی کو انصاف پر مبنی قرار دینا شاید اتنا مشکل نہ ہو لیکن اس کی ذمہ داری بورڈ آف کنٹرول اور کورٹ آف ڈائرکٹرس پر بھی ڈلہوزی کے ساتھ عاید کی جانی چاہیے۔ کیونکہ ان لوگوں نے مل کر ڈلہوزی کے اس نامقبول اقدامات کی حمایت کی۔ اس لیے یہ کہنا مشکل ہو گا کہ ایسے کام محکوم عوام کی فلاح کی غرض سے کیئے گئے تھے۔ لیکن جو انگریزوں کے حمایتی تھے ان کی حکومتوں پر قبضہ کیا جانا کس نظر سے دیکھا جائے گا۔ مقبوضہ بنانے والی طاقتوں کی پالیسی کی اس وقت تعریف کی جاتی اگر راجاؤں نے بغیر کسی مزاحمت کے یہ محکومیت قبول کی ہوتی۔ لیکن اگر وہ طاقت کے خلاف طاقت کا استعمال نہیں بھی کرنا چاہتے تھے تو بھی اپنے حقوق سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں تھے۔ اپنی کمزوریوں میں طاقت ور ہونے کے ساتھ جب وہ تاج سے بے دخل ہوتے تو انہیں اپنی رعایا کی پوری ہمدردی مل جاتی۔ محمد حسن نے اس کے لئے جنگ کرنے کی ٹھانی اور دھار دپور کے ہنومنت سنگھ جواب بھی قانونی طور پر اسے اپنا حکمراں سمجھتے گرچہ دونوں نے بہت بہادری سے کچھ انگریز پناہ گزینوں کو اپنے یہاں پناہ دی تھی لیکن کمپنی سرکار کے بڑے سے بڑے حمایتی اور وفادار بھی اس قدم کا کوئی جواز نہیں دے سکتے تھے جو شخصی ناانصافی پر مبنی تھا۔

سیتارام کا خیال تھا کہ تعلقوں اور ریاستوں پر قبضہ کیے جانے کی وجہ سے سبھی تعلقدار اور راجا لوگ یہ سمجھتے تھے کہ سرکار نے "کسی طرح کی کوئی رواداری نہیں برتی اور اس کا رویہ نوابین کے ساتھ بہت سخت تھا۔" ہدایت علی نے اس سے زیادہ سخت الفاظ استعمال کیے۔ وہ کہتے ہیں "جس وقت انہوں نے قبضہ کیا ہے اس وقت پورے ہندوستان میں یہ بات گونج رہی تھی کہ برٹش حکومت نے اودھ کے حاکموں سے یہ وعدہ کیا تھا (میرا خیال ہے کہ اس طرح کا کوئی تحریری معاہدہ بھی تھا) کہ اودھ کی حکومت پر انگریز کبھی قبضہ نہیں کریں گے۔ کیونکہ پہلے کے زمانے میں اودھ نے برٹش سرکار کو بہت زیادہ امداد پہنچائی تھی۔"

"اسی طرح ہندوستانی عوام یہ بھی کہتے تھے کہ 'اودھ کا علاقہ اودھ کے حکمرانوں کا علاقہ ہے اور اپنی حکومت کے ساتھ انہوں نے بھلا کیا ہو یا برا' اس نے انگریزوں کے ساتھ کبھی اپنی وفاداری کسی بھی طرح سے ختم نہیں کی اور اگر برٹش حکومت ایک ایسے راجا کو بے دخل کرتی ہے جو ہمیشہ اس کا مددگار اور وفادار رہا ہو تو پھر کیسے کوئی آزاد نواب یا راجا محفوظ رہ سکتا ہے۔" حد تو یہ ہے کہ انگریز مرد عورتیں دونوں اپنے ضمیر سے بے چین رہتے اور جب لکھنؤ میں انہیں قیدی بنایا

گیا تو اپنی اس بدقسمتی کو وہ اس ناانصافی پر مبنی اقدام کا نتیجہ سمجھتے۔ مسز ہیرس کہتی ہیں۔ "وہ آج ایک عشائیہ میں بولے اور اودھ کے قبضہ کے بارے میں اس ناانصافی کا ذکر کیا اور بتایا کہ موجودہ انتشار ہماری سلطنت کے لیے ایک زبردست سزا ہے کیونکہ جس طرح سے قبضہ کیے جانے کی نیت سے ہم نے ہندوستان پر حکومت کی اودھ پر یہ ناجائز قبضہ ہمارے لیے عرصے سے چلے آ رہے خود غرضی پر مبنی حملہ کرنے اور قبضہ کرنے کی نیت پر تابوت کی آخری کیل ثابت ہوئی۔"

اس بغاوت کی وجہ اعلیٰ ذات کے برہمن اور راجپوتوں کو بنگال فوج میں بھرتی کیا جانا بتایا جاتا ہے لیکن جیسا کہ کرنل ہنٹر کا کہنا تھا کہ یہ بغاوت صرف ذات پات کی وجہ سے نہیں ہوئی کیونکہ سنتھال قبیلہ ذات پات سے عاری ہے۔ اور ہمارے دل میں بھی ذات پات کی بنا پر کوئی تفریق نہیں کی گئی ہے۔ تاہم کچھ علاقوں میں بغاوت پر آمادہ سپاہیوں کے ساتھ ان کے دوستانہ مراسم تھے۔ کم تر ذات کے سپاہیوں نے میرٹھ میں مسلح بغاوت کی۔ ان سے بھی کمتر سپاہیوں نے اس مذہبی جنگ میں شرکت کی اور اسی طرح اعلیٰ ذات کے برہمنوں نے بھی۔ کیونکہ بے یقینی اور شبہے کا ایک ایسا ماحول نیک مقصد کے تحت بنایا گیا لیکن حالات کا اندازہ کیے بغیر ایسے قانونی اور انتظامی اقدام کیے گئے جس کی وجہ سے سرکار پر سپاہیوں کے اعتماد کو ٹھیس لگی اور بعد میں آنے والے کئی گورنر جنرلوں نے لاشعوری طور پر کچھ ایسے اقدامات کیے جن سے رہا سہا اعتماد بھی ختم ہو گیا۔ عام طور پر لارڈ ڈلہوزی کو اس بغاوت کا ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے۔ لیکن اس کا کوئی بھی قدم اکیلے بغاوت کے لیے ذمہ دار نہیں تھا۔ لارڈ ولیم بنٹنک ' لارڈ امہرسٹ 'لارڈ آکلینڈ اور لارڈ ایلن بورو نے انفرادی طور پر کچھ ایسے کام کیے جس نے کٹر عقیدہ رکھنے والوں کو سرکار سے متنفر کر دیا۔ کیونکہ ان اقدامات کی سیدھی ضرب ان عقائد پر پڑ رہی تھی 'جس کے لوگ حد سے زیادہ قائل تھے۔ سپاہی یہ محسوس کرتے کہ یہ ان کی جنگ کرنے کی قوت اور صلاحیت ہے جس کی بدولت یہ سرکار آج تک ٹکی رہی ہے۔ اور وہ جب چاہے سرکار کو اکھاڑ سکتا ہے۔ اس نے آج تک اپنے نمک کا حق ادا کیا۔ لیکن جب اس نے دیکھا کہ اس کے مالکان کا مقصد اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے کہ وہ ان کے موروثی عقائد کو ختم کر دے تو وفاداری کی یہ بنیاد بھی متزلزل ہو گئی۔ تعلیم یافتہ ہندوستانی ناخواندہ ہندوستانیوں اور سرکار کے درمیان اس خلیج کو کم کر سکتے تھے لیکن انہیں بھی حکومت کا اعتماد نہیں حاصل تھا اور ان کی تعداد بھی بہت کم ہوتی تھی اور دیہی عوام سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہی نہیں بلکہ ان کے طور طریقوں سے بھی کٹر عقائد رکھنے والوں کو اتنی زیادہ تکلیف پہنچی جتنی عیسائی حکمرانوں سے نہیں۔ اگر کچھ تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو سرکار نے اعلیٰ عہدوں پر بھی فائز کر دیا ہوتا تو بھی یہ کہنا مشکل ہے کہ حالات کے رخ مڑ جاتے۔ بغاوت بہت دنوں سے سلگ رہی تھی جسے چربی لگی گولیوں نے چنگاری کی طرح بھڑکا دیا۔

# باب دوم

# آغاز

ہر فوج کو جدید ترین اسلحوں سے لیس ہونا چاہیے۔ انیسویں صدی کے وسط تک سپاہیوں کی من پسند بندوق 'براؤن بیس' (Brown Bess) میں 1852ء میں وسکاؤنٹ ہارڈنگ کے حکم کے تحت اِنفلیڈز رائفل پر تجربہ کیا گیا تھا۔ ہارڈنگ اس زمانے میں اسلحوں کا ماسٹر جنرل تھا۔ اور اس نئی رائفل میں سبھی نئی تکنیک کا استعمال کیا گیا۔ 1853ء میں کریمین جنگ میں تجربہ کے طور پر اس کا استعمال کیا گیا اور نتیجہ بہت اچھا نکلا۔ اس لیے 1856ء میں ہندوستان میں اس کا تعارف کرایا گیا۔ رائفل کے ساتھ چربی ملی گولیاں انگلینڈ سے آئیں اور کچھ نئی گولیاں کلکتہ 'ڈمڈم اور میرٹھ میں سپاہیوں کے استعمال کے لیے بنائی گئیں۔ چنندہ سپاہیوں کو ڈمڈم' انبالہ اور سیالکوٹ میں اس نئے ترقی یافتہ اسلحے کے استعمال کی ٹریننگ کے لئے بھیجا گیا۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک چلتا رہا جب تک کہ ایک برہمن فوجی کو ایک کمتر ذات کے فوجی نے ڈمڈم میں یہ نہیں بتایا کہ جو گریس اس میں استعمال کی جارہی ہے اس میں قابل اعتراض جانوروں کی چربی استعمال کی گئی ہے۔ یہ افواہ آگ کی طرح پھیل گئی اور سپاہیوں میں بے چینی پھیل گئی۔ کلکتہ کی دھرم سبھا نے اس خبر کو سنا اور ہر طرف خطرے کی گھنٹی بجادی اور جلد ہی انگریز بھی ان خبروں سے واقف ہو گئے۔

22/ جنوری 1857ء کو لفٹیننٹ رٹ نے ڈمڈم کے کمانڈنگ افسر میجر بان ٹین نے اس بات کی خبر دی۔ دوسرے دن میجر بان ٹین نے اپنے اعلیٰ افسروں کو لکھا ''کل شام میں نے اپنے ڈپو کے سبھی مقامی حصوں کا معائنہ کیا اور ان سے کہا کہ اگر انہیں کوئی شکایت ہو تو بے دریغ سامنے کہیں۔ ان میں سے دو تہائی لوگ فوراً ہی سامنے آگئے جن میں مقامی کیشنڈ افسران بھی تھے اور بہت ہی باادب طریقے سے انہوں نے گولیوں کے بنانے کے جدید طریقے پر اعتراض کیا۔ ان کے نزدیک گولیوں پر گریس لگانے کا کام مذہبی جذبے سے ٹکراتا ہے اور انہوں نے سجھاؤ دیا کہ اس ملاوٹی چربی کی جگہ موم اور تیل کو ایسے تناسب سے ملا کر لگایا جائے جو اس مقصد کو پورا کر سکے۔''

سپاہیوں کے اس فوری تاثر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اندر اس کی وجہ سے پہلے خوف کا جذبہ پیدا ہوا' غصہ نہیں۔ اس لئے انہوں نے بہت باادب طریقے سے میجر بان ٹین سے یہ گذارش کی کہ وہ لوگ گریس کا استعمال کیوں نہیں کر سکتے اور اس کی جگہ متبادل صورت بھی بتائی۔ افواہ کے

علاوہ سپاہیوں کے اندر شک پیدا ہونے کی اور بھی وجہ تھی۔ کیونکہ گولیاں گریس سے بھری ہوتیں۔ ایک خط میں کرنل کیتھ ینگ کمانڈر انچیف نے خود بھی لکھا۔ "سپاہیوں کے اس اعتراض پر مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی جب میں نے خود گولیوں پر لگی گریس کی مقدار دیکھی۔" اس خط پر 23/ مارچ کی تاریخ پڑی ہوئی ہے' لیکن اس سے پہلے ہی اس بات کا پتہ لگالیا گیا تھا کہ سپاہیوں کے شبہات بے بنیاد نہیں ہیں۔ آرڈیننس کے انسپکٹر جنرل فورٹ ولیم بھی اس بات کی کوئی یقین دہانی نہیں کرا سکا کہ جو چربی استعمال کی جارہی ہے وہ مشتبہ جانوروں سے حاصل نہیں کی گئی ہیں۔ 29/ جنوری کو اس نے لکھا "جیسے ہی میں نے ڈم ڈم کے پریکٹس ڈپو کے مقامی فوجیوں کا اعتراض گریس کے استعمال کے بارے میں سنا' میں نے فوراً ہی گولی بنانے والے ڈپو کی جانچ کی کہ اس میں کیا استعمال کیا جارہا ہے اور میں نے دیکھا کہ کورٹ آف ڈائرکٹرس نے جس طرح کی ہدایات دی تھیں اسی کے مطابق گائے کی چربی اور شہد کی مکھی کا موم ملا کر استعمال کیا جارہا ہے۔ اس بات کا پہلے سے کوئی انتظام نہیں کیا گیا کہ اس میں قابل اعتراض چیزوں کی ملاوٹ نہ کی جائے۔" یہ کہا گیا ہے کہ اس بیان سے یہ کہیں ظاہر نہیں ہوتا کہ دراصل جو چربی استعمال کی گئی وہ گائے کی چربی تھی۔ اور میرٹھ میں برہمن لڑکوں نے اس گریس کی تیاری پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ چربی اور گریس دونوں کو بنگالی برہمن کنٹریکٹر نے سپلائی کیا تھا لیکن اس سے اس بات کا امکان اور بڑھ جاتا ہے کہ اس کے آدمیوں نے بازار میں موجود سب سے سستی اشیاء کا استعمال کیا ہو۔ خود انگریزوں کو یقین تھا کہ کنٹریکٹر نے قابل اعتراض چربی سپلائی کی ہے۔ کیونکہ اسے ایسی کوئی ہدایت نہیں دی گئی تھی کہ وہ کیسی چربی سپلائی کرے گا۔ ٹائمز کا نامہ نگار 23/ فروری کو لکھتا ہے۔ "نئی انفیلڈ رائفل کی گولیوں کے ایک سرے پر چربی لگادی جاتی ہے تاکہ وہ نالیوں میں سرعت کے ساتھ اندر داخل ہوسکے۔ اس مقصد کے لئے حکومت نے گوشت کی چربی کا حکم دیا تھا۔ کچھ کنٹریکٹر نے اپنے منافع کی غرض سے سور اور بیل کی چربی سپلائی کردی۔" آرڈیننس کے انسپکٹر جنرل نے سالگ رام سنگھ کے مقدمے میں گواہی دیتے ہوئے اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا کہ یہ چربی کنٹریکٹر نے سپلائی کی تھی۔ کچھ فوجیوں نے کلکتہ کے فورٹ ولیم کو یہ بھی مشورہ دیا تھا کہ انہیں اطمینان ہو جائے گا اگر اعلیٰ ذات کے برہمن اور مسلمان کو گولیاں بنانے کے کام کی جانچ کے لئے تقرر کردیا جائے۔ میجر فورٹ کو بھی اس مشورہ پر کوئی اعتراض نہیں تھا کیونکہ اس سے فوجیوں کا شبہ دور ہو جاتا اور وہ اس کے لئے فوری طور پر راضی بھی ہوگیا۔ لیکن گولی بنانے والے عہدیداروں کو اس بات پر اعتراض تھا۔ انہوں نے اس مشورہ کو رد کردیا۔ اس لئے فوجیوں کے اندر یہ شبہ پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا کہ عہدیدار کچھ چیزوں کو پوشیدہ رکھنا چاہتے ہیں۔ اس لئے میجر فورٹ کے اس مشورہ کو انہوں نے جان بوجھ کر نامنظور کردیا۔

گریس لگی گولی کوئی نئی بات نہیں تھی۔ سب سے پہلے 1853ء میں اسے برآمد کیا گیا۔ استعمال کے لیے نہیں بلکہ اس تجربہ کے لیے کہ اس پر موسم کا کتنا اثر پڑتا ہے۔ اسی زمانے میں

کرنل ٹکر نے ملٹری بو، ڈکو اس بات سے آگاہ کیا تھا کہ اسے ہندوستان فوجیوں میں تقسیم کرنے سے ان کا کیا ردعمل ہو گا۔ اور یہ بھی مشورہ دیا تھا کہ اسے صرف یورپ کے فوجیوں کے درمیان ہی تقسیم کیا جائے۔ ان کی اس تنبیہ پر کسی نے کوئی دھیان نہیں دیا اور ہندوستانی فوجیوں کو بھی ان کی پیٹیوں کے ساتھ یہ گولیاں تقسیم کی گئیں۔ یہ ابھی تک پتہ نہیں چل سکا ہے کہ کیا شروع میں ہی انہوں نے گریس کی اس ملاوٹ پر شبہ کیا تھا کیونکہ اس وقت اسے لے کر کسی قسم کی شورش نہیں ہوئی۔ لیکن 1857ء میں فوجیوں نے بہت قانونی طریقے سے اپنا یہ شبہ ظاہر کیا تھا کہ اگر ان گولیوں کو دانت سے کاٹنے پر انہیں مجبور کیا جاتا ہے تو اس کا ان پر سماجی طور پر بہت بُرا اثر پڑے گا۔ حکومت کو یہ طے کرنا تھا کہ کیا ان کا یہ اندیشہ حق بجانب ہے اور کیا ان گولیوں کو واپس لے لیا جائے جن پر ان کا اعتراض تھا یا اس کے متبادل کے طور پر سپاہیوں کو اس بات کی اجازت دی جائے کہ اپنی گریس وہ خود تیار کریں اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ گولیاں ڈم ڈم ڈپو سے تقسیم کی گئی تھیں۔ ایبٹ کا کہنا ہے: ''ڈپو میں پہلے پہل جب اس طرح کی گولیاں تیار کی گئیں تو ان کی تیاری ہر میجسٹی کی 'ساٹھویں رائفل' کے لیے کی گئی تھی۔ اور ایسا یقین تھا کہ بہت سے غیر ملکی آکر اس ساٹھویں رائفل میں شامل ہوں گے۔ اس کا امکان ہے کہ ان میں سے کچھ گولیاں ڈم ڈم ڈپو سے تقسیم کر دی گئی ہوں۔ سرکار کا اسلحہ کا محکمہ یقیناً اس لاپروائی کے لیے ذمہ دار تھا کہ اس نے لوگوں کے جذبات و احساسات کا خیال کئے بغیر اس قابل اعتراض چربی کا استعمال کیا۔ یقیناً کرنل ٹکر نے تین سال قبل اس اندیشہ سے انہیں آگاہ کیا تھا جسے بھلا دیا گیا۔

حکومت کا فیصلہ اس معاملہ میں بہت جلد آگیا۔ جنرل ہیرسے' جو بیرک پور کی کمانڈ کر رہے تھے' انہوں نے مشورہ دیا تھا کہ سپاہی جس طرح مناسب سمجھیں اپنی گولیوں پر خود سے گریس لگالیں۔ اور 28/ جنوری کو سرکار نے اس مشورہ کو قبولیت بھی بخش دی لیکن درمیان کے چھ دنوں میں جب لفٹیننٹ رٹ نے اپنی رپورٹ بھیجی اور کلکتہ سے سرکار کا اجازت نامہ آنے کے درمیان سپاہیوں کی بے چینی بڑھتی گئی یہ الزام لگایا گیا کہ جان بوجھ کر اسے ایسی گولیاں تقسیم کی گئی ہیں جن کے استعمال سے وہ ذات سے باہر ہو جائیں اور آخر کار عیسائیت قبول کر لیں۔ اس دوران ایڈجوٹنٹ جنرل کو یہ حکم بھی دیا گیا کہ میرٹھ میں اس طرح کی گریس لگی گولی تقسیم نہ کی جائے اور انبالہ اور سیالکوٹ کے فوجیوں سے کہا جائے کہ وہ جس طرح بھی چاہیں گریس گولیوں پر خود سے لگا سکتے ہیں۔ یہ بھی فیصلہ کیا گیا تھا کہ کمانڈر انچیف اپنی طرف سے ایک حکم نامہ جاری کر کے اس بات کو یقینی بنائیں گے کہ گریس لگی کوئی گولی سپاہیوں میں تقسیم نہیں کی جائے گی۔ لیکن یہ حکم نامہ جاری ہونے سے قبل ہی ایڈجوٹنٹ جنرل نے اپنی ایک عرضداشت پیش کر دی۔ انہوں نے اپنی عرضداشت میں کہا تھا کہ بہت دنوں سے فوجی اس طرح کی منی رائفل استعمال کر رہے ہیں جن کی گولیوں پر گوشت کی چربی نہیں لگی ہوتی اور اگر اس طرح کا حکم نامہ جاری کر دیا گیا تو وہ بھی یہ سمجھنے پر مجبور ہوں گے کہ انجانے میں انہوں نے بھی اپنی ذات اور مذہب کے خلاف کام کیا

ہے۔اور سرکار نے جان بوجھ کر ان کو اس طرح کی قابل اعتراض گولیاں دی ہیں۔ اس طرح سے کوئی حکم نامہ جاری نہیں کیا گیا اور سپاہیوں کو شبہ بنا رہا۔ یہ ایک فاش غلطی تھی۔ کیونکہ میرٹھ کے فوجیوں کو یہ نہیں معلوم تھا کہ انہیں بھی اس طرح کی ملاوٹ شدہ گولیاں تقسیم کی جائیں گی۔

وقت گزرنے کے بعد یہ کہنا مشکل ہے کہ اگر کوئی دوسرا رویہ اپنایا جاتا تو ہو سکتا ہے سپاہیوں میں اتنی بے چینی پیدا نہ ہوتی۔ اس نے بہت سے ذرائع سے سن رکھا تھا اور ان میں سے اکثر کو تو وہ معتبر بھی جانتا کہ گریس میں ایسی قابل اعتراض چربی کی ملاوٹ کی گئی ہے جس کو چھونے سے ہی اس کا مذہب خطرے میں پڑ جائے گا۔ اگر ہندو گائے کو متبرک سمجھتے تو مسلمان سور کو اتنا ہی قابل نفریں۔ ان حالات میں سب سے بہتر راستہ یہ تھا کہ براہ راست اس بات کا اعتراف کر لیا جاتا کہ نادانستہ طور پر یہ غلطی ہو گئی ہے۔ لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ اس اعتراف سے ان کے اندر مزید خوف و ہراس پیدا ہو جاتا اور حالات بد سے بدتر ہو جاتے۔ ایک متبادل صورت یہ بھی تھی کہ کچھ وقتوں کے لیے یہ مشق روک دی جاتی لیکن ایسی صورت میں ذمہ دار عہدے دار یہ سمجھتے کہ اس سے فوج کے نظم و ضبط میں فرق آئے گا اور ملٹری ڈسپلن ختم ہو جائے گی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مارچ میں جنرل ہیرسے کو یہ اطلاع دی گئی ''ڈم ڈم میں گولی چلانے کی مشق سے گولی بھرنے کو ختم کیا جا رہا ہے'میجر بانٹین کی خواہش پر پرانے حکم نامے کی تعمیل اس وقت تک جاری رہے گی جب تک کمانڈر انچیف سے گولی بھرنے کے سلسلہ میں کوئی نیا حکم نامہ نہیں آتا۔'' لیکن تب تک بہت زیادہ تاخیر ہو چکی تھی۔ مارٹین نے شکایت کے انداز میں لکھا جو پہلے رعایت دی گئی تھی وہ کافی نہیں تھی ''بجائے اس کے کہ اس تنازعہ اور کشمکش کے سبب کو مکمل طور پر فوراً ختم کیا جاتا' سرکار نے طے کیا کہ ڈپو کے فوجیوں کو اس بات کی اجازت دی جائے کہ وہ جو مکسچر استعمال کرنا چاہیں کر سکتے ہیں۔ لیکن میدان جنگ میں کیسی اور کس طرح کی گولیاں استعمال کی جائیں گے 'اس پر سرکار ابھی مزید غور کرے گی۔''

مارٹن کے اعتراض کے جواب میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ڈرل کرنے کی مشق میں تھوڑی سی تبدیلی، جس سے انہیں گولیوں کو دانت سے نہ کاٹنا پڑتا' سے جتنے مذہبی لوگ تھے ان کی تسلی ہو جاتی۔ لیکن شاید اس سے سپاہیوں کی بیدار حس کو کوئی سکون نہیں ملتا کیونکہ گائے یا سور کو ذرا سا چھونا بھی ان کے مذہب کو خراب کرنے کے برابر تھا۔ اسے یہ بھی خطرہ تھا کہ عرصہ سے پڑی ہوئی عادت اتنی جلدی جاتی نہیں اور عادت سے مجبور ہو کر وہ انگلیوں کی جگہ پھر اپنے دانتوں کا استعمال کر لیتا۔ چاہے کچھ بھی ہو، لیکن مشق میں یہ تبدیلی مارچ سے پہلے نہیں کی گئی اور بہت سی جگہوں پر سپاہیوں کو اس تبدیلی کا علم بھی نہیں ہو سکا۔ اس لیے ان کا غصہ اور شبہ اسی طرح بنا رہا اور وہ گولی پر لپٹے ہوئے کاغذ کو دیکھتے ہی اس شک میں مبتلا ہو جاتے۔ حالانکہ اس کاغذ پر کوئی گریس نہیں ہوتی لیکن کورٹ آف انکوائری کے سامنے حاضر ہونے والے ہر شخص نے یہی بیان دیا کہ اس کاغذ پر گریس لپٹی ہوئی تھی اور ان سب سے بڑھ کر ایک اور بے چین کرنے والی افواہ یہ پھیل گئی کہ

آٹے میں پسی ہوئی باریک ہڈیوں کی ملاوٹ کی جارہی ہے اور کنویں کے پانی میں بھی اس طرح کی ملاوٹ کردی گئی ہے تاکہ کوئی بھی شخص اس ملاوٹ سے بچ نہ سکے یہ سارے کام منصوبہ بند طریقے سے کیے گئے ہیں۔

فوجی افسران بھی اس گرتے ہوئے اخلاقی معیار کے خاموش تماشائی نہیں تھے۔ جنرل ہیر سے ٔجو پریزیڈنسی ڈویژن کو کمانڈ کررہے تھے ٔبہت باہمت اور جری شخص تھے۔اپنی نوجوانی کے دنوں میں انہوں نے پنجاب میں بغاوت پر آمادہ بہت سے فوجیوں کو کامیابی کے ساتھ پسپا کیا تھا۔ وہ اپنے سپاہیوں کی زبان بولتا اور ان کے شبہات سے ہمدردی بھی رکھتا جو وہ سمجھتا کہ ان کے شبہات جائز ہیں۔اس نے اپنے فوجیوں کو بتایا کہ انگریز پروٹسٹینٹ عقیدہ کے ماننے والے ہیں۔اور کسی بھی شخص کے اپنے عقیدے میں اس وقت تک مداخلت نہیں کرتے جب تک وہ ان کے نظریات سے پوری طرح واقف نہ ہو جاتے اور رضاکارانہ طور پر خود سے تبدیلی مذہب کے لیے آمادہ نہ ہو جائیں۔ سپاہیوں کو اس بات کے لیے موردالزام نہیں ٹھہرانا چاہیے ٔاگر جنرل ہیر سے کے خیالات سے انہیں اتفاق نہیں ہوا کیونکہ اسی بیرک پور کے اسٹیشن پر ایک ایسا افسر کرنل ویلر تعینات تھا جس کا اس بابت کچھ اور خیال تھا جسے اس نے سب کے سامنے عیاں بھی کردیا تھا۔اس نے کھلے عام یہ اعتراف کیا تھا کہ پچھلے بیس سالوں سے وہ لگاتار مقامی لوگوں بشمول سپاہیوں میں عیسائیت کی تبلیغ کررہے ہیں۔ ''جہاں تک اس بات کا سوال ہے کہ میں سپاہیوں اور دوسرے لوگوں کو عیسائیت کو قبول کرانے کے لیے کوشش کرتارہا'' اس نے سرکار کو لکھا'' میں اس بارے میں یہی کہنا چاہوں گا کہ یہی میرا شروع سے مقصد رہا ہے اور میں ہر عیسائی کا جو خدا کے الفاظ بولتا ہے اس کا بھی یہی نصب العین سمجھتا ہوں کہ لارڈ نے اسے اسی مقصد کے لیے بھیجا ہے کہ وہ لامذہب لوگوں کو مذہب کی طرف راغب کرکے انہیں جہنم سے بچائے۔'' ''جہاں تک مذہبی معاملوں کا سوال ہے میں سمجھتا ہوں کہ میرے اوپر دو طرح کی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ ایک تو میں وہ کام کروں جو سرکار مجھ سے چاہتی ہے ٔدوسرے میں وہ کام کروں جو خدا مجھ سے چاہتا ہے۔''

فوج میں کرنل ویلر ہی ایسا اکیلا افسر نہیں تھا جو خدا کے لیے اس کام کو کرنا اور کافروں کو جہنم سے بچانا چاہتا تھا۔ کرنل ہیر سے کے نظریے کو سن کر سپاہی کرنل ویلر جیسے لوگوں کی باتوں کو زیادہ اہمیت دیتے اور کرنل ہیر سے کے الفاظ کو کھوکھلے الفاظ سمجھتے۔ اسی طرح جب اس نے سپاہیوں سے یہ کہا کہ وہ ان کے ساتھ سیرم پور چلیں اور اپنی آنکھوں سے خود دیکھ لیں کہ کاغذ کیسے تیار ہوتا ہے تو اس کا بھی سپاہیوں پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ کیونکہ وہ سمجھ رہے تھے کہ یہ محض دعوت نامہ ہے اور انہیں سیرم پور نہیں لے جایا جائے گا۔ اور انہوں نے یہ بھی سن رکھا تھا کہ گولیوں میں لگایا جانے والا کاغذ ہندوستان میں نہیں بلکہ انگلینڈ میں تیار کیا جاتا ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ ویلر کی اس 34ویں رجمنٹ این آئی میں حال ہی میں پوسٹنگ ہوئی تھی اور یہ رجمنٹ سب سے زیادہ بے چین رجمنٹ تھی اور اس کی اس بے چینی میں مزید اضافہ کے لیے ویلر کے رول کو کم نہیں کیا جاسکتا۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ کاغذ اور گریس کے بارے میں جب ایک بار افواہ پھیل گئی تو کسی ایک مخصوص علاقے تک محدود نہیں رہی اور پورے ماحول میں شبہ کا زہر پھیل گیا۔ بیرک پور اور اس کے آس پاس کے علاقے میں ضابطہ شکنی کے بہت سے واقعات ہوئے جنہیں سپاہیوں کی بدعنوانی اور زیادتی کے سر منڈھ دیا گیا۔ اس طرح کے کچھ اور واقعات یہاں سے سو میل دور رانی گنج کے علاقے میں بھی ہوئے۔ اور گرچہ مجرموں کو پکڑا نہیں جاسکا، لیکن انہیں اچانک ہوئے واقعہ کا نام نہیں دیا جاسکتا۔ اس سے بھی زیادہ خطرناک واقعات مرشد آباد کے پاس بہرام پور میں بھی ہوئے جو نام نہاد نواب کی ملکیت تھا۔ چونتیسویں بٹالین کے دو رجمنٹ کو بیرک پور سے بہرام پور اس خاص ڈیوٹی پر بھیجا گیا جہاں انیسواں رجمنٹ کرنل مائیکل کے کمانڈ میں پہلے سے موجود تھا۔ کرنل ہیرسے کی طرح مائیکل اتنا چاق وچوبند آدمی نہیں تھا اور گریس لگی گولیوں کی کہانی یہاں بھی پہنچ چکی تھی اور ایک برہمن حولدار اس کی تفتیش بھی کر چکا تھا کہ یہ غلط ہے یا صحیح۔ یہاں اس وقت تک کچھ بھی نہیں ہوا جب تک کہ 34 ویں رجمنٹ کے لوگ یہاں نہیں پہنچے۔ چاہے انہوں نے ان شبہات کو تسلیم کیا ہو یا نہیں، لیکن 19 ویں رجمنٹ کے لوگوں نے ٹوپی پہننے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ "اس بات میں شبہ تھا کہ یہ گولیاں کیسے تیار کی گئی ہیں۔" بظاہر ان کا مقصد تشدد نہیں تھا کیونکہ بندوقیں بغیر گولیوں کے نہیں چلتیں اور ان کا اعتراض صرف شبہ پر مبنی تھا "اگر مائیکل کو اپنے فوجیوں کا اعتماد حاصل ہوتا۔" کیتھ ینگ نے لکھا "پہلے واقعہ پر انصاف سے کام لیا ہوتا تو پھر اس طرح کی کوئی پریشانی نہ ہوتی"، لیکن مائیکل نے سخت زبان کا استعمال کرتے ہوئے ان پر جرمانہ عاید کرنے کی دھمکی دی۔ وہ لائن میں گیا اور سبھی مقامی افسروں کو بلا کر بہت صاف لفظوں میں ان سے کہا کہ اگر ایک سال پہلے بنائی گئی ان گولیوں کو استعمال کرنے سے انکار کیا تو دوسرے دن صبح وہ سپاہیوں کو سخت ترین سزائیں دے گا۔ شیخ کریم بخش جو چوتھی کمپنی کا صوبیدار تھا، نے گواہی دیتے ہوئے کہا کہ انہوں نے خود کرنل کو یہ کہتے سنا ہے "انہیں گولیاں استعمال کرنی پڑیں گی ورنہ ان سب کو چین یا برما بھیج دیا جائے گا جہاں وہ سب مر جائیں گے۔" بدقسمتی سے یہ گولیاں جو کلکتہ سے حال ہی میں آئی تھیں، ان میں دو طرح کا کاغذ استعمال کیا گیا تھا اور سپاہیوں کو یہ شبہ ہوا کہ پرانی گولیوں کے ساتھ نئی گولیاں ملادی گئی ہیں اور کرنل ان سے زبردستی یہ گولیاں استعمال کرانا چاہتا ہے۔ اس کی سخت تنبیہ نے اس شبہ کو اور تقویت بخشی اور صبح کی پریڈ سے پہلے ہی شورش شروع ہوگئی۔ سپاہیوں نے تالا توڑ کر زبردستی اپنے ہتھیاروں پر قبضہ کر لیا۔ اور لڑنے کے لیے تیار ہوگئے۔ مائیکل بزدل نہیں تھا اور اس نے طاقت کو طاقت سے کچلنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن اتفاقاً آس پاس یورپین فوجی نہیں تھے۔ پھر بھی وہ ہمت نہیں ہارا اور وہ مقامی فوجیوں کو ساتھ لے کر انفنٹری لائن پہنچ گیا۔ مقامی افسروں نے مائیکل کا غصہ یہ کہہ کر ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی کہ ان فوجیوں میں یہ بدنظمی خوف کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ ان کی وفاداری پر شک نہیں کرنا چاہیے۔ انہوں نے کرنل کو یہ تنبیہ بھی کی کہ وہ اپنے ساتھ لائی ہوئی فوج کو واپس بھیج دے ورنہ انہیں دیکھ کر انفنٹری کے

لوگوں کا غصہ اور بڑھ جائے گا۔ اگر مائیکل اتنا ہی ہٹیلا ہوتا تو حالات بہت نازک ہو گئے ہوتے لیکن اس نے مقامی افسروں کی صلاح مان لی اور صرف صبح کی پریڈ کا آرڈر دے کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ صبح ہوتے ہوتے فوجیوں کو بھی ہوش آگیا اور پریڈ صحیح سلامتی سے ادا ہو گئی۔

انیسویں ریجمنٹ میں بھی اسی طرح خاموشی ہو گئی جس طرح سے اس میں اچانک شورش پیدا ہوئی تھی اور اس کے بعد سے اس نے فوج کی صالح روایت کا ہمیشہ خیال رکھا۔ اگر انہوں نے اس ضابطہ شکنی کا مستقل مظاہرہ کیا ہوتا تو یقیناً وہ سخت سے سخت سزا کے مستحق ہوتے لیکن اس میں ان کے چال چلن اور برتاؤ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ انہوں نے زور زبردستی کر کے اسلحوں پر قبضہ کر لیا تھا اور کچھ عرصے تک انہوں نے کمانڈر کی قانونی حیثیت کو چیلنج بھی کیا تھا۔ اس طرح انہوں نے بغاوت کی غلطی کی تھی اور اگر فوج کے نظم وضبط کو برقرار رکھنا تھا تو ان کی اس غلطی کو معاف نہیں کیا جا سکتا تھا۔ گورنر جنرل کو ان کے خوف کا کوئی خیال نہیں تھا اور نہ ہی وہ اس کے لیے کوئی رعایت دینے کے حق میں تھے۔ وہ اس ریجمنٹ کی مثال ہر جگہ قائم کرنا چاہتے تھے۔ ان میں سے بہت سے لوگ ایسے رہے ہوں گے جن سے ایسی غلطی سرزد نہ ہوئی ہو اس لیے ان کے سرگرم رہنما اور ان کے اتباع کرنے والوں کے درمیان کچھ فرق تو ہی رکھنا ہی تھا۔ یہ بھی صلاح دی گئی کہ اگر ایسا ہی ضروری ہے تو اس ریجمنٹ کو چین یا فارس میں تعیناتی ان کی پسند کے مطابق دی جانی چاہیے۔ جج ایڈوکیٹ جنرل کیتھ ینگ کا بھی یہی خیال تھا کہ سمندر پار کا تبادلہ اس معاملے کی نزاکت سے نپٹنے میں کامیاب ہوگا۔ لیکن اس صلاح کو بھی سنجیدگی سے نہیں لیا گیا۔ کیونکہ ایسا محسوس کیا گیا کہ فوج میں جس طرح کا ماحول بن رہا ہے اس میں حکام کی طرف سے کسی بھی رعایت کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس لیے گورنر جنرل اِن کاؤنسل نے فیصلہ کیا کہ ریجمنٹ کو ختم کرنے سے ہی اس کا خاطر خواہ اثر دوسروں پر بھی پڑے گا۔ لیکن اس فیصلے پر فوری طور پر عمل نہیں کیا جا سکا۔

مقامی کیویلری اور آرٹیلری نے نظم وضبط کے فقدان کا کوئی ثبوت نہیں دیا۔ لیکن کیا اس سے یہ امید کی جا سکتی تھی کہ وہ اپنے دوسرے ساتھیوں پر گولیاں چلائیں گے اگر انیسویں ریجمنٹ کے لوگوں نے ایسے ہی مزاحمت جاری رکھی۔ سرکار نے محسوس کیا کہ یہ سزا صرف یورپین فوج کے لوگ ہی دے سکتے ہیں اور اس لیے یورپین فوج خلیج سے بلائی گئی۔ ملکہ معظمہ کی 84 ویں ریجمنٹ اس وقت رنگون میں تھی اس لیے انہیں بنگال لانے کے لیے اسٹیمر بھیجا گیا۔ یہ حکم نامہ بھی صیغۂ راز میں رکھا گیا اور اسے جاننے کے بعد فوجیوں میں بے چینی بڑھ گئی۔ سر ایڈورڈ پیجٹ کا واقعہ بھلایا نہیں گیا تھا۔ اور اس بات کا اندیشہ تھا کہ پوری بریگیڈ کو غیر مسلح کر کے 84 ویں ریجمنٹ کے سامنے جھکنے کو کہا جائے گا۔ جنرل ہیرسے کو اس لیے اپنے لوگوں کو دوبارہ مخاطب کرنا پڑا۔ اس نے ان لوگوں کو یقین دلایا کہ سرکار ان کی ذات یا ان کے مذہب کو ختم نہیں کرنا چاہتی ہے۔ اس لیے جو مجرم ہے صرف اسی کو ڈرنے کی ضرورت ہے۔ جب 84 ویں ریجمنٹ آئے گی تو ان سے کہا جائے

گا کہ وہ انیسویں رجمنٹ کو ختم کردے اور سارے سپاہیوں کا نام فوجیوں کی فہرست سے کاٹ دے۔ 84ویں رجمنٹ جلد ہی آ گئی اور اسے چن سورہ میں ٹھہرایا گیا اور کرنل مائیکل سے کہا گیا کہ وہ 19 ویں رجمنٹ کو بیرک پور لے جائیں۔ راستے میں انہوں نے کسی قسم کی پریشانی کا مظاہرہ نہیں کیا بلکہ یہ بھی کہا گیا کہ انہوں نے بغاوت کے تمام آثار کو کچل دیا ہے۔ لیکن دوسرے فوجی بھائیوں کی نگاہ میں وہ پہلے سے ہی شہید بن گئے تھے۔ اس بدنام زمانہ گولی کو استعمال کرنے سے انکار کر کے انہوں نے کوئی غلطی نہیں کی' اور ان کا واحد جرم صرف اپنے عقیدے سے ان کی وفاداری تھی اور ایک بے عقیدہ سرکار اب اس معاملے کو لے کر ان کی اتنی بڑی بے عزتی کر رہی تھی جتنی کسی فوجی کی کی جاسکتی ہے۔

بہرام پور کا واقعہ 26/ فروری کو ہوا تھا اور 29/ مارچ کو بیرک پور میں اس سے بھی بڑا واقعہ ہوا جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خوف اور غلط فہمی سپاہیوں میں کس حد تک سرایت کر گئی تھی۔ منگل پانڈے 34ویں انفینٹری کا ایک سپاہی تھا۔ اس کا پچھلا ریکارڈ بہت اچھا تھا لیکن وہ حال کے واقعات پر بہت زیادہ سوچ وچار کر رہا تھا۔ صرف دو دن قبل دوسرے گرینیڈیر کے دو سپاہیوں کو بغاوت کا ملزم پایا گیا تھا اور دونوں کو چودہ چودہ سال کی قید بامشقت کی سزا دی گئی تھی۔ جمعدار سالگ رام سنگھ کا کورٹ مارشل کیا گیا تھا اور گریس لگی گولیوں کو اپنے ساتھیوں میں دکھانے اور اکسانے کے لیے اسے نوکری سے برطرف بھی کر دیا گیا تھا۔ اپنے مذہب کے لیے انیسویں این آئی نے ان سارے حقوق کو چھوڑ دیا تھا جو سپاہیوں کی متاع ہوتے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ان واقعات کی سپاہیوں میں بہت زیادہ شہرت ہوئی اور ان سے یہ نتیجہ نکالنا حق بجانب ہوگا کہ منگل پانڈے بھی ان واقعات سے متاثر ہوا تھا۔ 29/ مارچ بروز اتوار شام کے وقت لیفٹیننٹ باگھ جو 34ویں این آئی کے ایڈجوٹنٹ بھی تھے' نے سنا کہ ان کی رجمنٹ کا ایک سپاہی پاگل ہو گیا ہے اور اس نے سرجنٹ میجر پر گولی چلا دی ہے' وہ جائے وقوعہ پر فوراً پہنچا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کر سکے اس کے گھوڑے کو گولی مار دی گئی۔ باگھ سرجنٹ میجر کو لے کر گولی چلانے والے پر ٹوٹ پڑا۔ لیکن وہ سپاہی ان دونوں سے زیادہ طاقت ور تھا اور اگر ایک مسلم سپاہی شیخ پلٹو نے مداخلت نہ کی ہوتی تو یہ دونوں مارے گئے ہوتے۔ اس وقت ڈیوٹی دے رہے کوارٹر گارڈ وہاں سے بہت زیادہ فاصلے پر نہیں تھے لیکن وہ صرف تماشائی بنے رہے۔ کچھ سپاہیوں نے ان زخمی افسروں کو مزید زدو کوب کیا اور باگھ کی حالت پر انہیں ذرا رحم نہیں آیا۔ اور وہ اس جائے وقوع سے ہٹ گیا۔ اس درمیان یہ خبر جنرل ہیرسے کو بھی پہنچی اور اسے یہ تاثر دیا گیا کہ پوری بریگیڈ نے بغاوت کر دی ہے۔ وہ اپنے محافظ اور اپنے دو لڑکوں کے ساتھ گھوڑسواری کرتے ہوئے پریڈ گراؤنڈ پر پہنچا۔ اور اس نے اس سپاہی پر قابو پالیا۔ منگل پانڈے کو یقین ہو گیا کہ اب اس کی موت نزدیک آ گئی ہے۔ اس نے اپنے مذہب کے لوگوں کو آواز دی کہ وہ اس کی مدد کو آئیں لیکن اس کی پکار پر کوئی آگے نہیں آیا۔ یہ دیکھ کر کہ حالات اس کے خلاف ہیں اس نے بندوق اپنے سینے پر رکھ کر گولی چلالی۔

لیکن اس کا زخم کاری نہیں ہوا۔ اسے ہسپتال بھیجا گیا اور اس کا کورٹ مارشل کر کے اسے پھانسی دی گئی۔ ایشوری پانڈے جمعدار جو اس وقت کوارٹر گارڈ تھا' اسے بھی موت کی سزا دی گئی لیکن کچھ تکنیکی امور کی وجہ سے اس وقت پھانسی نہیں دی گئی۔ پھانسی پر چڑھنے سے پہلے اس نے معافی مانگ لی اور اپنے ساتھیوں کو آگاہ کیا کہ وہ اس کی موت سے سبق لیں۔

34 ویں رجمنٹ کا حالیہ کار یکارڈ بہت زیادہ خراب نہیں تھا۔ ان کے کمانڈر وہیلر نے ان کو اچھے چال چلن کا سرٹیفکٹ بھی دیا کیونکہ اس کے ایک صوبیدار نے سکنڈ گرینیڈ کے ان دو سپاہیوں کو گرفتار بھی کیا جو اس کے پاس سازش کا خاکہ لے کر آئے تھے۔ کورٹ آف انکوائری نے بھی ایسی کوئی چیز نہیں پائی جس سے ثابت کیا جا سکے کہ 34 ویں رجمنٹ کا بہرام پور کی شورش میں کوئی ہاتھ تھا اور یہ ایک بدقسمتی ہی تھی کہ اس رجمنٹ کے وہاں پہنچنے کے فوراً بعد یہ واقعات ہو گئے لیکن منگل پانڈے نے جو جان لیوا حملہ کیا تھا اور ایشوری پانڈے نے جس طرح ان واقعات کی ان دیکھی کی تھی' اس نے حکام کو یہ یقین دلا دیا کہ پوری رجمنٹ ہی اس سازش میں شریک ہے۔ یہ بات فضول ہے کہ اس وقت منگل پانڈے بھانگ کے اثر میں تھا کیونکہ بظاہر کہیں سے نہ اس سے پہلے ہوئی سازش کا پتہ چلتا ہے اور نہ ہی اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ منگل پانڈے نے اپنے آدمیوں کو بھروسے میں لیا تھا۔ کیونکہ جب اس کے ساتھیوں نے اس کی پکار پر اس کا ساتھ نہیں دیا تو بھی اس وقت وہ خاموش تماشائی بنے رہے' جب لیفٹیننٹ پر جان لیوا حملہ کیا گیا تھا اور انہیں اپنے انگریز افسران سے ذرہ برابر بھی ہمدردی نہیں رہ گئی تھی۔ گریس لگی گولیوں نے ان کے ذہن میں زہر بھر دیا تھا اور ان سے اب اپنی ملٹری ذمہ داریوں کی یاددہانی کرانا فضول تھا۔

19 ویں انفینٹری کو بغیر کسی واقعہ کے غیر مسلح کر کے ختم کر دیا گیا تھا۔ اگر سرکار اپنے فیصلے میں سخت تھی تو وہ اپنے کمانڈنٹ افسران کی ان دیکھی بھی نہیں کر رہی تھی۔ اس بات سے فکر مند ہو کر کہ سپاہیوں نے اپنے رحم دل مالکوں کے ارادوں کو غلط طریقے سے لیا ہے' انہوں نے کچھ اچھے کام بھی کیے۔ اگر سپاہی کو غیر مسلح بھی کر دیا گیا تو بھی اس سے اس کی وردی نہیں چھینی گئی۔ اگر اس کی پنشن اور تنخواہ ضبط ہو گئی تو بھی اسے گھر جانے کا خرچ دیا گیا۔ گھر جاتے ہوئے اگر وہ چاہتا تو کسی مقدس مقام کی زیارت کو بھی جا سکتا تھا۔ سرکار اس کے مذہب کے معاملے میں کوئی مخالفت نہیں کر رہی تھی اور وہ جیسے چاہتا اپنے مذہبی رواجوں کو پورا کر سکتا تھا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ 19 ویں رجمنٹ کو ختم کرنے کی وجہ سے شمالی ہند کے سیکڑوں گاؤں میں یہ پریشان حال سپاہی پہنچ گئے اور انہوں نے اس مشتبہ گولی کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کیں جس کی وجہ سے دیہی عوام میں بھی غلامی کی زنجیر توڑنے کی خواہش بیدار ہو گئی۔ کسی واقعہ کے بعد عقلمندی سیکھنا آسان ہے۔ سپاہیوں کو چین یا فارس بھی بھیجا جا سکتا تھا لیکن منطقی طور پر یہ دلیل دی جا سکتی ہے کہ غیر ممالک میں سروس کرنے کو لے کر سرکار دو بار پریشانی میں پڑ چکی تھی اور جنرل سروس انلسٹمنٹ ایکٹ کی وجہ سے سپاہی عیسائی سرکار کے مقصد کو اچھی طرح سمجھ گئے تھے۔ جنرل سر اور فریکوانگ کو معلوم

ہوا کہ بہت سے فوجی اس خیال کے حامی تھے "کہ مقامی رجمنٹ کے بہت سے لوگ ریٹائرمنٹ کے بعد دوسرے ممالک میں ملازمت کرنا پسند کرتے ہیں۔ لیکن غیر مسلح ہونے کو وہ اپنی بے عزتی سمجھتے ہیں۔" اس کا کہنا ہے کہ "میں نے یہ مشورہ دیا تھا کہ انہیں چین بھیجا جائے جہاں فوجیوں کی سخت ضرورت ہے اور اس مشورہ پر بعد میں عمل بھی کیا گیا جس کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا۔" کسی ایک واقعہ پر نظریہ قائم کرنا مناسب نہیں ہوگا کیونکہ کسی اقدام کی کامیابی اس وقت کے عام ماحول پر بھی منحصر ہے جس بات کو لے کر پہلے کامیابی ملی۔ کوئی ضروری نہیں کہ وہی قدم دوبارہ اٹھانے پر بھی کامیابی ملتی۔ جب سرکار کی نیت پر سوالیہ نشان لگ گیا ہو اور جب سپاہیوں میں تبدیلی مذہب کا خوف جاگزیں ہو گیا ہو اس وقت اس کا کوئی یقینی حل نہیں نکالا جاسکتا تھا۔ اور چھوٹی سی بھی غلطی بغاوت کا فلیتہ ثابت ہو سکتی تھی۔

جلد ہی یہ بات صاف ہو گئی کہ عوامی مزاحمت کی بدولت ایسی بھی بے عزتی کی سزا دی جاسکتی ہے جو غیر مسلح کیے جانے سے بھی بڑی ہو اور سرکار جس میں کوئی رعایت دینے کو تیار نہ ہو۔ مارچ 1857ء میں کمانڈر انچیف شملہ جاتے ہوئے انبالہ میں رکے۔ شاید سرکار کلکتہ کے آس پاس اٹھنے والی غصہ کی لہر کو کوئی اہمیت نہیں دے رہی تھی اور کمانڈر انچیف نے بھی گورنر جنرل کے ساتھ رہنے کو بھی کوئی اہمیت نہیں دی۔ انبالہ ان تین ٹریننگ ڈپو میں سے ایک تھا جہاں مختلف رجمنٹ کے کچھ لوگوں کو روک کر نئی رائفلوں کے استعمال کی ٹریننگ دی جارہی تھی۔ ان میں سے ایک کاشی رام تیواری حولدار اور جیولال دوبے' 36ویں این آئی کا نائک' شامل تھے۔ یہ 36ویں این آئی تھی جو کمانڈر انچیف کو اسکورٹ کر رہی تھی۔ اور دونان کمیشنڈ افسروں نے اس این آئی کے صوبیداروں کو بلایا۔ اور اس وقت ان افسروں نے کیا کیا' جب صوبیدار نے انہیں گولیاں چھونے کی وجہ سے بے دین سمجھتے ہوئے انہیں عیسائی سمجھا۔ اپنی آنکھوں میں آنسو بھر کے لیفٹیننٹ مارٹینو کے پاس گئے اور ان سے جا کر یہ داستان سنائی کہ گاؤں پہنچنے پر ان کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے گا۔ جب ان کے اپنے رجمنٹ کے صوبیدار نے انہیں مذہب تبدیل کرنے والا بتایا۔ لیفٹیننٹ مارٹینو نے یہ واقعہ کمانڈر انچیف کے سامنے دوہرایا اور جنرل اینسن نے مسکیٹری ڈپو کی جانچ کرتے ہوئے وہاں جمع لوگوں کو یقین دلایا کہ گولیوں کے بارے میں جو افواہ پھیلائی گئی ہے وہ بالکل غلط ہے۔ انہوں نے لیفٹیننٹ مارٹینو سے کہا کہ ان کے خطاب کا سپاہیوں پر کیا اثر ہوا؟ اس بابت وہ رپورٹ بھیجیں۔ اور 23/ مارچ کو اس افسر نے آرمی کے اسسٹنٹ ایڈجوٹنٹ جنرل کو یہ خط لکھا: "اس ڈپو کے مقامی افسروں نے اپنے تین نمائندوں کے ذریعہ مجھے یہ اطلاع بھیجی ہے کہ ہزایکسی لنسی کے خطاب سے وہ اپنے کو بہت بڑا سمجھ رہے ہیں۔ کیونکہ ہزایکسی لنسی نے بہ نفس نفیس ان کو خطاب کرتے ہوئے ان کے دل میں پیدا ہونے والے سارے شکوک کو دور کر دیا۔ اور اس طرح ان کے دلوں میں اب سرکار کے لیے کوئی مخالفانہ جذبہ نہیں ہے۔ وہ یہ جانتے ہیں کہ یہ افواہ بالکل غلط ہے لیکن انہیں یہ بھی یقین ہے کہ ہندوستان میں اگر ایک آدمی ان افواہوں پر یقین نہیں رکھتا تو دس

ہزار سے زیادہ ان پر یقین رکھتے ہیں اور یہ افواہ نہ صرف ان کے ریجمنٹ میں پھیلی ہے بلکہ ان کے گاؤں اور گھروں میں بھی پھیلی ہے وہ سب ایک حکم پر گولی چلانے کو تیار ہیں لیکن وہ مؤدبانہ یہ گذارش بھی کرنا چاہیں گے کہ ہزایکسی لنسی ملٹری کا یہ حکم ماننے پر پیدا ہونے والے سماجی دباؤ اور تناؤ' دونوں کو ملحوظ خاطر رکھیں گے۔ وہ فوراً ہی بغیر جانے بوجھے برادری باہر کر دیئے جائیں گے۔ نہ صرف اپنے ریجمنٹ میں بلکہ اپنے خاندان اور گھروں سے بھی۔ سرکار کے تئیں ان کی وفاداری اور ملٹری حکام کا کہنا ماننے سے انہیں ایسی سخت سے سخت سزا ملے گی جو اس دنیا میں ان کے لیے برداشت سے باہر ہو گی۔ وہ اپنی ذہانت اور وفاداری کے سبب ملٹری میں منتخب ہوئے ہیں۔ لیکن ان کی یہ وفاداری ان کی سماجی زندگی میں سب سے بڑا عذاب ثابت ہو گی۔ وہ ملٹری حکام کا کہنا مانیں گے اور اس کہنا ماننے کے سبب سماجی طور پر ختم ہو جائیں گے۔"

لیفٹیننٹ مارٹینو نے آگے لکھا کہ ان کا یہ شبہ اور خوف نہ تو بے بنیاد ہے اور نہ ہی مبالغہ آمیز۔ ٹریننگ لینے والے سبھی سپاہیوں نے اپنی پریشانیاں بہت صاف لیکن مؤدبانہ زبان میں بھی بتادیں اور لیفٹیننٹ مارٹینو نے صوبیدار کے خلاف لائی گئی شکایتوں کی فوری جانچ کیے جانے کی سفارش کر دی۔ لیکن کوئی جانچ نہیں کی گئی۔ 16/اپریل کو سپاہیوں نے سنا کہ صوبیدار درگ پال سنگھ کے برتاؤ کو فوجیوں کے لیے مناسب نہیں سمجھا گیا اور ان دونوں شکایتوں کو آسانی سے ختم بھی نہیں کیا گیا۔ چونکہ اس بات کی زیادہ شہرت بھی کی گئی اس وجہ سے ڈپو کے دوسرے سپاہیوں میں بے چینی پیدا ہونا فطری تھا اور وہ سمجھ رہے تھے کہ جب وہ اپنے کور میں واپس جائیں گے تو وہاں بھی انہیں اسی طرح کا طعنہ سننا پڑے گا۔ اس بے عزتی کے کام کے لیے انہیں سب کے سامنے سنسر کیا گیا اور حولدار کو بتایا گیا کہ اس کی ترقی روک دی گئی ہے۔ کیونکہ اس نے اپنے پورے ریجمنٹ کو بدنام کیا ہے۔ کیو براؤن لکھتا ہے: "صرف اتنا ہی نہیں تھا بلکہ یہ بھی طے کیا گیا کہ سپاہیوں کو اپنے خوف اور شبہے کے باوجود گولی چلانے پر مجبور کیا جائے۔" اور دوسری صبح انہیں یہ گولیاں چلانی تھیں کیونکہ اپنے نمائندوں کے ذریعہ وہ یہ مان چکے تھے کہ ان گولیوں کو چلانے پر انہیں کوئی اعتراض نہیں ہے اور وہ اس کے لیے تیار ہیں۔ ہزایکسی لنسی کے جس پدری شفقت کو مدنظر رکھتے ہوئے ان سے اپیل کی تھی؟ اس نے ان کی وفاداری کو یاد رکھا لیکن ان کے خوف کو فراموش کر دیا۔ لیکن سپاہیوں پر اس طرح کا کوئی الزام نہیں آسکتا تھا اگر ان سے یہ کہا جاتا کہ وہ سرکار یا اپنے مذہب میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لیں۔

کمانڈر انچیف کا حکم نامہ اس سے بھی زیادہ خطرناک تھا کیونکہ سرکار پہلے ہی یہ فیصلہ کر چکی تھی کہ مشق کے طریقے میں کچھ ایسی تبدیلی کی جائے جس سے سپاہیوں کو دانتوں سے گولی نہ کاٹنی پڑے۔ میرٹھ کے لیفٹیننٹ کرنل ہاگ نے فروری کے آخری ہفتہ میں یہ مشورہ دیا تھا کہ دانتوں سے کاٹنے کے طریقے کو ختم کیا جاسکتا ہے اگر گولی کے آخری حصے میں سوراخ کر دیا جائے اور ان کے اس مشورہ کو تجربہ کار افسران کی حمایت بھی حاصل تھی۔ گورنر جنرل نے اس معاملہ کو کمانڈر

اِنچیف کے پاس بھیج دیا تھا اور ان کے جواب دینے سے پہلے یہ حکم نامہ بھی جاری کر دیا تھا کہ ڈم ڈم میں گولی چلانے کی مشق میں گولی بھرنے کے کام کو روک دیا جائے۔ 5؍مارچ کو سرکار نے عام حکم نامہ جاری کر دیا کہ دانتوں سے گولی کاٹنے کو روک دیا جائے' لیکن حیرت ہے کہ اس حکم نامے کو سپاہیوں سے پوشیدہ رکھا گیا۔ مئی کے شروع میں لکھنؤ میں بھی کچھ شورش کا پتہ چلا لیکن یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ اس وقت انبالہ کے واقعہ کی اطلاع اودھ پہنچی تھی یا نہیں۔ لیکن فوجی' اپنے افسروں کے احتجاج کے باوجود ان گولیوں کو شک کی نگاہ سے دیکھتے اور انہیں دانتوں سے کاٹنے سے انکار کر دیا۔ یہ بھی نہیں معلوم ہو سکا کہ انہیں دانتوں سے کاٹنے کے لیے کیوں کہا جارہا ہے' جب کہ یہ سلسلہ دو ماہ پہلے ہی ختم کر دیا گیا تھا۔ یہ بھی تعجب کی بات ہے کہ اودھ کے فوجیوں کو جن کا کمپنی سرکار سے حال میں تعلق پیدا ہوا تھا' اتنا سخت حکم کیوں دیا گیا۔ وہ بھی چیف کمشنر سر ہنری لارنس کی موجودگی میں جو نہ صرف ہندوستان کو بلکہ ہندوستانیوں کو بھی بخوبی جانتے تھے۔ لیکن جو نوٹ کرنے والی بات ہے کہ ساتویں اودھ اِرریگولر انفینٹری کے سپاہی ان گولیوں کو استعمال کرنے سے انکار نہیں کر رہے تھے بلکہ وہ صرف اسے دانت سے کاٹنا نہیں چاہتے تھے۔ 3؍مئی کو سرہنری کے علم میں یہ بات لائی گئی کہ ساتویں اودھ اِرریگولر انفینٹری نے تشدد اور جان لیوا حملے کی دھمکی دی ہے۔ اور سر ہنری نے اس چیلنج کو قبول کر لیا۔ بھری ہوئی بندوقوں کے ساتھ بہت سے باغی بھاگ گئے اور تقریباً 120 نے اپنے اسلحے زمین پر رکھ دیئے' سرکار نے انہیں صرف جائز سزا دیئے جانے پر ہی اکتفا کر لیا۔

4؍مئی کو منگل پانڈے کی رجمنٹ 34 ویں این آئی کو بارک پور میں ختم کر دیا گیا۔ سپاہیوں کو وردی پہننے کی اجازت نہیں دی گئی لیکن جیسا کہ ہومز نے لکھا ہے: "وہ صرف اس کلما رنک ٹوپی کو تو رکھ سکتے تھے جس کی قیمت انہوں نے خود ادا کی تھی بہت حقارت کے ساتھ انہوں نے اس ٹوپی کو اپنے قدموں سے روند ڈالا جو کمپنی سے ان کی خدمات کی واحد نشانی تھی۔ اور اپنی اس سزا کو غلامی کی بندشوں سے آزادی کا نام دیتے ہوئے ہنسی خوشی جا کر دشمنوں کی تعداد میں اضافہ کا باعث ہوئے۔" ان کو بہت ہلکی سزا دی گئی اور اس رجمنٹ کو ختم کئے جانے کا اعلان ہر ملٹری اسٹیشن پر پڑھ کر سنایا گیا۔ اس وقت یہ نہیں محسوس کیا گیا کہ اس سے ختم کئے گئے رجمنٹ کے لوگ اپنے بھائیوں کی نگاہ میں ہیرو بن جائیں گے۔ کیونکہ ان میں سے بہتوں نے خود ہی اپنے مذہب کے لیے اپنی دنیاوی خواہشات کو تج دیا تھا۔ یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ 34 ویں این آئی کے کمانڈر کرنل ایس جی وہیلر تھے جو خود بھی مشنری تھے۔

جنوری 1857ء میں نئے اسلحوں کے بارے میں افواہ پھیلی جو ذات برادری کے فرق کو ختم کرنے کے لیے بنائے گئے تھے۔ اب یہ سوچنا بیکار ہو گا کہ اگر سرکار نے خاموشی سے انہیں سمجھایا بجھایا ہوتا تو اس کا کیا اثر ہوتا۔ ایک غیر ملکی حکومت اس بات کی کبھی اجازت نہیں دے سکتی کہ اس کی اتھارٹی کو اس طرح مذاق کا نشانہ بنایا جائے' جس سے اس کے وقار کو ٹھیس پہنچے اور اس کی طاقت

بھی کم ہو جائے۔ بہت سے افسر اس خیال کے بھی حامی تھے کہ سپاہیوں کے احساسات کا ذرہ برابر بھی خیال نہ کیا جائے اور ذرا سی بھی ڈھیل دے کر اپنی کمزوری کو ظاہر نہ کیا جائے۔ ایک طرف تو جنرل ہیر سے اپنے آدمیوں کو جو اس پر اعتماد نہیں رکھتے تھے' سمجھاتا بجھاتا رہا' دوسری طرف مقامی فوجیوں اور افسروں کو گولی کی بات کرنے پر سزائیں بھی دیتے رہے۔ پورے رجمنٹ کو' جیسے 19 ویں این آئی کے ساتھ کیا گیا تھا' ختم کرنے سے سپاہیوں کے تبدیلی مذہب کے خوف کو اور تقویت مل رہی تھی' نہ کہ ان کے شبہ کو ختم کیا جارہا تھا۔ کیونکہ ایسا کوئی جواز نہیں ہے جس سے یہ سمجھا جاسکے کہ سپاہی یہ نہیں جانتے تھے کہ گریس میں جو چربی ملائی جارہی ہے اس کے خالص ہونے کی کوئی گارنٹی نہیں دی جاسکتی۔ سرکار نے فوجیوں کے اس فطری خوف اور اندیشوں کو دور کرنے کے لیے جو رعایت کی تھی وہ بہت تاخیر سے تھی اور تاخیر کے سبب اس کا اثر بھی ختم ہو گیا۔ انبالہ کے معاملے میں کمانڈر انچیف نے بہت جلد بازی میں قدم اٹھایا۔ اس قدم سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے انصاف سے کام نہیں لیا۔ سپاہیوں کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ کسی بھی مشکل گھڑی میں انہیں اپنے اعلیٰ افسروں سے کوئی ہمدردی نہیں مل سکتی۔ گرچہ کچھ افسران جیسے مارٹینو' ہاگ اور بانٹین سپاہیوں پر بہت مہربان تھے۔ لیکن یہ بھی بہت بدقسمتی کی بات ہے کہ بہت سے ناسمجھ افسران کو اس بات کی چھوٹ دے دی گئی کہ وہ اپنی من مانی کریں اور مئی کے شروع میں سر ہنری لارنس کو اس کے کچھ جوشیلے ماتحتوں نے اس کام کے لیے مجبور بھی کیا۔ اس سے پہلے کے مہینے میں نظم و نسق کے کچھ حامیوں نے اس طرح کا کچھ سلسلہ شروع کر دیا تھا جو 10/ مئی کو میرٹھ میں خطرناک تشدد کے واقعے میں تبدیل ہو گیا۔

کرنل کارمیکائل اسمتھ میرٹھ میں تیسرے مقامی کیولری کی کمانڈ کر رہے تھے۔ وہ بہت ضدی فطرت کے تھے اور اپنے آدمیوں میں غیر مقبول بھی' اس لیے جو بعد کے واقعات ہوئے اس میں انہیں کسی طرح بھی شجاعت کا کریڈٹ نہیں دیا جاسکتا۔ انہوں نے بعد میں یہ دعویٰ بھی کیا کہ انہوں نے حکومت کو بچالیا' ایک ایسے منصوبہ کا پتہ لگا کر جو 31/ مئی کو اس پورے برصغیر میں پھیلنے والا تھا۔ اگر انہیں اس طرح کی کسی سازش کا پتہ لگا بھی تھا تو بھی انہوں نے اپنے دوسرے افسران اور جنرل کمانڈنگ سے یہ راز ظاہر نہیں کیا۔ 23/ اپریل کو انہوں نے حکم جاری کیا کہ دوسرے دن صبح پریڈ ہو گی جس میں سارا رجمنٹ نہیں بلکہ مختلف ٹروپس سے نوے آدمی شریک ہوں گے۔ اس کا مقصد نیک تھا۔ کرنل اپنے آدمیوں کو یہ دکھانا چاہتا تھا' کہ وہ کس نئے طریقے سے اپنی بندوقوں میں گولیاں بغیر کاٹے بھر سکتے تھے۔ فوجیوں کو نہ تو کوئی نیا اسلحہ دیا گیا تھا اور نہ ہی نئی گولیاں' اس لیے ملاوٹ کا اس میں خطرہ بھی نہیں تھا۔ اس کے علاوہ یہ بھی سمجھ لیا گیا تھا کہ صرف کٹر ہندو ہی گریس ملی ہوئی گولیوں کو تبدیلی مذہب کا ہتھیار سمجھ رہے تھے اور مسلمان اس طرح کی بے وقوفیوں سے علاحدہ تھے۔ اگر ختم کیے گئے 19 ویں رجمنٹ میں اکثریت ہندوؤں کی تھی تو اسمتھ کی اس رجمنٹ میں اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ لیکن اس طرح کی یہ مشق ناموزوں

وقت پر ہو رہی تھی۔ کیونکہ فوجی یہ پوچھ سکتے تھے کہ اب اس نئے طریقے کے مشق کی ضرورت کیا تھی اگر اسلحے پرانے تھے اور ان میں کوئی ملاوٹ نہیں تھی۔ کیونکہ گولیوں کے بارے میں اس اسٹیشن پر بہت بات ہو چکی تھی۔ ایک شخص جس کا نام برج موہن تھا' اس پر یہ الزام لگ چکا تھا کہ اس نے نئی گولیاں استعمال کی ہیں۔ وہ کردار کا اچھا آدمی نہیں تھا۔ ایک کمتر درجے کے سور پالنے والے کے لڑکے کی حیثیت سے اسے چوری کے الزام میں اِنفینٹری سے نکالا جا چکا تھا۔ بعد میں وہ ایک دوسرا غلط نام رکھ کر فوج میں داخل ہو گیا اور کسی صورت سے کرنل اسمتھ کا مخلص بن گیا اور اپنا زیادہ وقت ان کے بنگلے پر گزارتا۔ اس کمتر درجے کے کمانڈنگ افسر کے اس چہیتے نے سب کے سامنے نہ صرف اپنے جرم کا اظہار کیا بلکہ طنزیہ لہجے میں یہ بھی کہا کہ رجمنٹ کے ہر شخص کو وہی کرنا پڑے گا جو اس نے کیا ہے۔ یہ سننے پر فوجیوں نے قسم کھائی کہ وہ اس وقت تک اس نفرت انگیز چیز کو نہیں چھوئیں گے جب تک کہ فوج کے دوسرے لوگ ایسا کرنے سے باز نہ آ جائیں۔

ایسا نہیں کہ کرنل ان حالات سے بے خبر رہا ہو۔ اس سے مشق کو روک دینے کی درخواست پہلے ہی کی جا چکی تھی لیکن وہ اپنے فیصلے پر اٹل رہا۔ کیونکہ اس نے سن رکھا تھا کہ پوری فوج بغاوت کر رہی ہے۔ اور اس بغاوت کے لیے میرٹھ سب سے غیر مناسب مقام تھا۔ کیونکہ میرٹھ کی چھاؤنی ان چھاؤنیوں میں سے ایک تھی جہاں مناسب تعداد میں یورپین فوجی موجود نہیں تھے۔ کرنل نے سوچا کہ ان دھمکیوں کے باوجود پریڈ کو ختم کرنا ایک بزدلانہ فعل ہوگا۔ یہاں بھی اس نے جنرل کمانڈنگ کو بغاوت کے امکانات سے اندھیرے میں رکھا۔ جو نوے آدمی صبح پریڈ میں جمع ہوئے' ان سے کرنل نے بتایا کہ کس طرح سے ان کے اندیشوں کو دیکھتے ہوئے نئے ضوابط بنائے گئے ہیں لیکن اس کی ساری نصیحت بے کار گئی کیونکہ صرف پانچ کو چھوڑ کر باقی سبھی نے گولیاں لینے سے انکار کر دیا۔ پریڈ ہو نہیں سکی۔ کورٹ آف انکوائری قائم کی گئی اور جس نے جانچ کے دوران یہ پایا کہ سپاہیوں کا برتاؤ عوام کی رائے کے خوف سے ایسا ہوا۔ کمانڈر انچیف نے یہ حکم دیا کہ مجرموں پر مقامی کورٹ مارشل کے ذریعہ مقدمہ چلایا جائے۔ برٹش قانون میں اس سے زیادہ انصاف کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ مجرموں پر خود ان کے بھائیوں کے ذریعہ مقدمہ قائم کیا جائے۔ لیکن ہندوستانی فوجی اس مقامی کورٹ مارشل کو ناانصافی کا ایک موثر ذریعہ سمجھتے' اس لیے انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے کمانڈر سے اس سلسلہ میں بات کریں گے اور مقامی کورٹ مارشل سے انہوں نے کوئی بات نہیں کی۔ جنرل سر ہیوگف جو اس وقت میرٹھ میں تھے' ان کا کہنا ہے کہ اس کورٹ مارشل میں صرف ایک برٹش افسر اپنا تعاون دے رہا تھا جسے سپرنٹنڈنگ افسر کا نام دیا گیا۔ اور جس کے مشورے اور قانونی صلاحیت نے کورٹ کو متاثر کیا۔ قیدیوں نے کہا کہ انہوں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے اور گواہوں کا بھی کوئی کراس اکزامنیشن نہیں کیا گیا ہے۔ کیونکہ سبھی نے ایک ہی آواز میں لیفٹیننٹ میلول کلارک کے سامنے جھوٹ بولا تھا۔ کورٹ بھی اپنے فیصلے میں ایک رائے نہیں تھی کیونکہ پندرہ میں سے ایک ممبر نے اپنا فیصلہ ان سب کے خلاف دیا تھا۔ تاہم

قیدیوں کو مجرم پایا گیا اور انہیں قید بامشقت کی دس سال کی سزا دی گئی۔ تاہم اس فیصلے میں اس بات کی سفارش بھی کی گئی کہ سزا دیتے وقت ایک لمبے عرصے سے ان کے چال چلن اور افواہ کی وجہ سے پیدا خوف کو بھی مدنظر رکھا جائے۔ ڈویژنل کمانڈر جنرل ہیوٹ ایک سادہ مزاج آدمی تھا اور اس نے اس سزا کو دینے کے لیے کوئی خاص وجہ نہیں سمجھی اور اس نے ان میں سے گیارہ آدمیوں کی سزائیں ان کی عمر کے پیش نظر کم کر دیں۔

"9 مئی کو صبح کے وقت" ہومز کا کہنا ہے "اس وقت جب آسمان بادلوں کے گھنے اندھیرے میں ڈوب گیا تھا تو ساری بریگیڈ وہاں مجرموں کی بے عزتی دیکھنے کے لیے جمع تھی۔ اپنی وردیوں سے محروم کیے جانے کے بعد انہیں لوہاروں کو سونپ دیا گیا جنہوں نے ان کے بازوؤں اور پیروں کو زنجیروں سے جکڑ دیا۔" یہ لوہار بہت سست رفتاری سے کام کر رہے تھے اور فوجیوں نے بہت خاموشی کے ساتھ اپنے ان ساتھیوں کے بے عزتی کا مشاہدہ کیا۔ تکنیکی طور پر وہ مجرم ضرور تھے لیکن انہوں نے کوئی شرانگیز کام نہیں کیا تھا۔ ساتھ ہی وہ چنندہ لوگ تھے جنہیں فوج کا بہترین سپاہی کہا جا سکتا ہے۔" جنرل گف کا کہنا ہے کہ ہمارے فوجیوں میں بہت زیادہ بڑبڑاہٹ سنی جا رہی تھی اور وہاں برٹش فوج موجود نہ ہوتی تو خدا جانے کیا ہو گیا ہوتا۔" پریڈ خاموشی سے ختم ہو گئی۔ اور اگر کچھ فوجیوں کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات پیدا بھی ہوئے تو بھی کوئی بدنظمی پیدا نہیں ہوئی۔ "جب انہیں ایک بار یہ احساس پیدا ہو کہ ہر طرف سے ان کی شکست ہو رہی ہے۔" گف کا کہنا ہے: "تو ان کی ساری دھیرج ختم ہو گئی۔ پرانے فوجی جنہوں نے برٹش آقاؤں کے لیے جنگ جیت کر بہت سے میڈل حاصل کیے تھے، بری طرح رونے لگے اور اپنے مقدر پر افسوس کرتے ہوئے افسروں سے منت کرنے لگے کہ وہ ان کے مستقبل کی ضمانت لیں۔ نوجوان فوجی بھی ان کے ساتھ مل کر رونے لگے اور میں نے اپنی ساری زندگی میں ایسا دلدوز منظر کبھی نہیں دیکھا۔ میرے نزدیک ایسے نوجوان جن کی سروس صرف چار سال کی تھی اپنے مستقبل کو لے کر بہت زیادہ پریشان تھے اور میرا یقین ہے کہ میں اس وقت اپنے کو بہت کمزور محسوس کر رہا تھا اور مجھے بھی ان سے ہمدردی ہو چلی تھی۔ اور اس سے صاف ظاہر تھا کہ انہیں ذرا بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس کے بعد اور کیا واقعات ہونے والے ہیں اور نہ ہی ہم میں سے کسی کو اس کا قیاس تھا۔"

گرمیوں کا یہ لمبا دن گزر گیا اور شورش کا کوئی امکان نہیں نظر آیا اور نہ رات میں ہی کوئی اس طرح کا واقعہ ہوا۔ صبح کے وقت سپاہی بالکل خاموش تھے۔ بلکہ ان میں سے کچھ تو رات کے وقت وکیلوں کے پاس گئے تھے کہ کیا اس کی کوئی اپیل ہو سکتی ہے؟ جنرل گف کے فوجیوں میں سے ایک مقامی افسر نے اسے 9 تاریخ کی شام کو بتایا تھا کہ دوسرے دن بغاوت ہو سکتی ہے۔ لیکن کرنل کارمیکائل اسمتھ نے اس رپورٹ کو بھی افواہ سمجھا اور مقامی افسر کی اس بات کے لیے سرزنش بھی کی کہ وہ فالتو باتیں سنتا رہتا ہے۔ بریگیڈیر ولسن نے بھی اس افواہ کو بے بنیاد سمجھا کیونکہ عام دنوں کی طرح اس دن شام کو فوجی بازار میں ٹہل رہے تھے جو ان کی بہترین تفریح

گاہ تھی۔

مجرموں کو بھی زنجیروں میں جکڑ کر سول جیل میں ڈال دیا گیا تھا اور آنے والے طوفان کا کوئی اندیشہ کسی کو نہیں تھا۔ لیکن افواہ کی کوئی حد نہیں تھی۔ ایک خاتون خدمت گار نے ایک کشمیری لڑکی یا اس کی ماں سے سنا کہ فوجی مسلح بغاوت کرنا چاہتے ہیں اور فوجیوں نے بھی سنا کہ تقریباً دو ہزار لوہے کی ہتھکڑیاں بنا کر تیار کرلی گئی ہیں۔ اور سبھی فوجیوں کو نہتا کیے جانے کا ارادہ ہے' لیکن شہر کے لوگوں نے ان افواہوں کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ کیونکہ دکانیں اسی طرح سے کھلیں اور ان میں ہمیشہ کی طرح خرید و فروخت ہوتی رہی اور بازار کی سڑکوں اور گلیوں میں لوگوں کی بھیڑ اسی طرح آتی جاتی رہی۔

پانچ بجے کے بعد اچانک وہ طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک کھانا بنانے والا لڑکا سپاہیوں کی لائن کی طرف اس خبر کے ساتھ دوڑ پڑا کہ آرٹیلری اور رائفل کے لوگ رجمنٹ کے اسلحوں کو قبضہ کرنے کے لیے اس طرف جا رہے ہیں۔ اس خبر سے لاعلم ہونے کی وجہ سے فوجیوں میں دہشت پھیل گئی۔ یونہی بغیر کپڑا پہنے اور بغیر کسی اسلحے کے وہ اپنی لائن کی طرف دوڑ پڑے اور انہیں یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اب وہ کیا کریں۔ جیسا کہ اس طرح کے مواقع پر ہوتا ہے 'خود حفاظتی کا جذبہ غالب آگیا۔ تیسری کیویلری کے گھوڑ سوار دوڑ کر پرانی جیل تک گئے اور وہاں سے انہوں نے اپنے ساتھیوں کو بٹھالیا۔ ان میں سے کچھ تو اپنی وردی میں تھے اور کچھ بغیر وردی کے۔ بیسویں این آئی' اپنے پریڈ گراؤنڈ پر پہنچ گئی اور اسلحہ خانہ پر دھاوا بول دیا۔ گیارہویں این آئی بھی بہت زیادہ خوفزدہ تھی لیکن ان میں یہ بدنظمی کم تھی۔ دکانداروں نے فوراً اپنی دکانوں کے دروازے اور کھڑکیاں بھی بند کرلیں۔ بازار میں گھوم رہے کچھ اوباش لوگوں نے موقعے سے فائدہ بھی اٹھانا چاہا۔ لیکن ابھی چار گھنٹے بھی نہیں گزرے تھے کہ پاس کے گاؤں کے اجڈ گوجر بھی شورش کو محسوس کرتے ہوئے شہر میں گھس آئے۔ بہادر کرنل کارمیکائل اسمتھ بھی وہاں نظر نہیں آرہے تھے۔ ماتحتوں کو رجمنٹ کی نگرانی کے لیے چھوڑ کر پہلے تو کمشنر کے یہاں گئے۔ پھر بریگیڈیئر کے یہاں اور آخر کار جنرل کمانڈنگ کے یہاں اور رات وہیں کیفٹیننٹ میں آرٹیلری کی حفاظت میں گزاری۔ حالانکہ ان افسروں میں ہمت کی کوئی کمی نہیں تھی اور آرٹیلری کی کمانڈ میجر ٹامس کررہے تھے جنہوں نے بعد میں دلّی دیوار کے سامنے اپنی شجاعت کا مظاہرہ بھی کیا۔ ان میں نوجوان گف بھی تھا جسے بعد میں وکٹوریہ کراس بھی ملا۔ وہ بہادر ہڈسن کے ساتھ بہت سی مہموں میں شریک بھی رہا۔ ان میں جانس بھی تھا جو دلّی پر حملہ آور فوج کی کمانڈ کررہا تھا۔ بریگیڈیئر آرڈیل ولسن بہت زیادہ جدوجہد کرنے والا شخص نہیں تھا لیکن اس نے دلّی کے محاصرہ کو ختم کرانے میں اہم رول ادا کیا۔ جنرل کمانڈنگ ہوٹ البتہ اس موقع پر اپنی ہمت نہیں جتا سکا۔ ستر سال کی عمر کو پہنچنے کے بعد وقت کی ضرورت کے تحت مقابلہ کرنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ اس کی اپنی پریشانیاں بھی تھیں۔ اس کے پاس جتنے گھوڑ سوار تھے ان میں سے بہت سے گھوڑ سواری نہیں کرسکتے تھے اور جو کرسکتے

تھے ان کے لیے گھوڑے نہیں تھے۔ کار بینرس کو اپنے اسلحے تو مل گئے لیکن انہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ اسلحے کہاں ہیں کیونکہ سپاہیوں کے پاس پہلے سے کوئی منصوبہ نہیں تھا اور ہر شخص اپنی من مانی کر رہا تھا۔ حالات ابھی قابو سے باہر نہیں ہوئے تھے اور تھوڑی سی ہمت کے ساتھ اسے بگڑنے سے بچایا جا سکتا تھا۔ جہاں تک جنرل ہیوٹ کا سوال ہے۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ اچانک ہونے والے واقعات کو وہ بخوبی سمجھ نہیں سکا۔ اور ہمیں اس کے اس فعل کے لیے اسے بزدل بھی قرار نہیں دینا چاہیے۔ اگر ہم یہ یاد رکھیں کہ ان کی جگہ آنے والے جنرل پینی نے بہت سے اعلیٰ افسروں کے ساتھ کیون تھالی میں اپنے کو نظر بند کر لیا تھا اس وقت جب شملہ میں ناصری رجمنٹ نے مزاحمت کی تھی اور کلکتہ کے افسر بھی اس سیاہ اتوار کے دن کوئی نمایاں کارنامہ انجام نہیں دے سکے۔

اگر اُس کھانا پکانے والے بچے کی وجہ سے افراتفری ہوئی تو دوسرے اور بھی وجوہ تھے جنہوں نے اس آگ کو اور ہوا دی۔ رائفل کے لوگ دراصل چرچ پریڈ کی تیاری کر رہے تھے اور ان کے انداز سے پہلے پھیلی افواہ کی صداقت کا اندازہ ہو رہا تھا۔ جب کہ تھرڈ کیویلری کے ٹھنڈے مزاج کے لوگ وکیلوں سے مشورہ کر رہے تھے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ ان کے کچھ جوشیلے لوگ اسلحے کے ساتھ انہیں بچانا چاہتے ہوں اور جب یہ گڑبڑی پیدا ہوئی تو وہ فوری طور پر قید خانے کے دروازے کے اندر کود گئے۔ اور وہ صرف اپنے آدمیوں کو چھڑانا چاہتے تھے۔ یا مجرموں کو بھی۔ اس کی بابت کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ نہ تو اس وقت ڈیوٹی کر رہے گارڈ نے ان کی کوئی مخالفت کی اور نہ ہی ان لوگوں نے جیلر یا اس کے خاندان والوں کے ساتھ کوئی چھیڑ خانی کی۔ اس کے بعد کے واقعات کا اس لیے کچھ پتہ نہیں چلتا کیونکہ ہر طرف لوٹ مار، قتل و غارت اور آگ زنی کے واقعات پھیل چکے تھے، جس میں عمر یا صنف کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا۔ خوف نے سپاہیوں کو پاگل کر دیا تھا لیکن انہوں نے زیادہ تر دہشت گردی کے کام میں حصہ نہیں لیا۔ دراصل جو لوگ اپنی ڈیوٹی پر تھے وہ اپنی جگہوں پر ہی ڈٹے رہے۔ تیسری کیویلری کے کچھ فوجی تو گھوڑسواری کرتے ہوئے بازار تک گئے اور بازار میں پھنسے کچھ انگریز سپاہیوں کا نام لیتے ہوئے انہیں بچا کر نکال لائے۔ ان میں کنر میک کارٹنی، میک الوائے، کارڈویل اور میک کویڈ شامل تھے۔ ایک انگریز میڈیکل افسر کو گیارہویں این آئی کے حوالدار میجر نے کرنل فنس کی موت اور فوجیوں کی بغاوت کے بارے میں اطلاع دی۔ ایک مقامی وفادار نان کمیشنڈ افسر توگف کے بنگلے تک گیا اور انہیں اس واقعہ کی اطلاع دی۔ انفرادی طور پر بہت سے افسران اور خواتین نے اس خوفناک شام کے بہت سے واقعات قلمبند کئے ہیں۔ لیکن ان سب کا بیان کہیں نہ کہیں ادھورا سا ہے۔ اسی طرح سے میجر جنرل ہیوٹ نے دوسرے دن جو آفیشیل رپورٹ بھیجی اس میں بھی تمام واقعات کی تفصیلات نہیں ملتیں۔ اور ہمیں یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ کس ترتیب سے یہ واقعات ہوتے گئے اور ایک کے بعد دوسرا کون سا تشدد کا واقعہ ہوا۔ یہ تو خیر واضح ہے کہ کوئی بھی رجمنٹ اس الزام سے مکمل طور پر بری نہیں تھی۔ تاہم یہ بھی صاف ہے کہ ہر رجمنٹ میں کچھ نہ کچھ وفادار لوگ موجود تھے۔ خود تیسری کیویلری

سے جسے اس اسٹیشن پر سب سے زیادہ غصہ تھا' اس میں سے بھی تقریباً سو گھوڑسوار وفادار رہے اور سب سے کم اثر تو گیارہویں این آئی پر ہوا جس میں سپاہیوں کی اکثریت شورش شروع ہونے پر الگ الگ ہو گئی اور تقریباً ان میں سے ایک سو بیس بعد میں میرٹھ واپس آگئے۔ اسی طرح سے شورش پر آمادہ بیسویں این آئی میں بھی کچھ سمجھ دار اور وفادار لوگ تھے اور یہ بھی ہے کہ جن لوگوں نے اکثریت کا ساتھ بھی دیا' ان میں سے بعضے ان کے خیالات سے اتفاق نہیں کرتے تھے۔ ایک معاملے میں ایک نان کمشنر افسر جو برٹش حکومت کا ابھی تک وفادار رہا' اس نے اپنے مذہبی عقیدے سے بڑھ کر سرکار کی وفاداری مقدم سمجھی۔ وہ اور اس کے دو آدمیوں نے گف کو بحفاظت تمام آرٹیلری لائن تک پہنچایا'' یہاں تک وہ مجھے بحفاظت لائے۔'' لیفٹیننٹ گف لکھتا ہے:
''انہوں نے مجھے آخری سلام کیا اور مجھ سے جدا ہو گئے جب کہ میں ان سے منت سماجت کرتا رہا کہ وہ میرے ساتھ رکے رہیں لیکن شاید مقامی افسران نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ ان کی ساری ذمہ داری رجمنٹ کے ساتھیوں کے ساتھ ہے اور چاہے وہ مریں یا جئیں' انہیں رجمنٹ تک واپس پہنچنا چاہیے۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جب تھرڈ کیویلری کے گھوڑسوار پرانی جیل گئے ہوئے تھے' تو بیسویں این آئی کے لوگ بھی پریڈ گراؤنڈ چھوڑ کر ہٹ گئے اور ان کے پڑوسی گیارہویں این آئی کے لوگوں نے بھی ایسا ہی کیا۔ ان کے کمانڈر کرنل فنس فوراً موقع پر پہنچے اور انہیں نظم و ضبط برقرار رکھنے میں کچھ کامیابی بھی ملی۔ حد تو یہ ہے کہ بیسویں این آئی کے لوگ بھی بات سننے کو رضامند ہو گئے۔ اسی وقت تیسرے کیویلری کا ایک سوار دوسری بار ادھر سے خطرے کے گھنٹی بجاتا ہوا گزرا کہ یورپین فوجیں آرہی ہیں۔ اسی لمحے سے ہر طرف انتشار پھیل گیا۔ ایک نوجوان سپاہی نے کرنل فنس پر گولی چلائی اور انہیں مار ڈالا۔ ان کے کمانڈر کی موت نے ابھی تک ڈھل مل یقین گیارہویں اور بیسویں این آئی کے لوگوں کو بھی گولی چلانے پر مجبور کیا کیونکہ وہ ڈر رہے تھے کہ کرنل فنس کی موت کے لیے انہیں ذمہ دار ٹھہرایا جائے گا اور اب ان کی بھلائی اسی میں تھی کہ وہ دوسرے رجمنٹ کے ساتھ مل کر انہی جیسے قدم اٹھائیں۔ نہ تو گیارہویں اور نہ تیسرے رجمنٹ کے لوگوں نے اپنے افسروں کو کوئی نقصان پہنچایا۔ لیفٹیننٹ گف کہتا ہے: ''میں اس بات کو یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ کسی بھی افسر کی جان ہمارے آدمیوں نے نہیں لی ہے۔ وزیر علی خاں ڈپٹی کلکٹر کا کہنا تھا کہ گرچہ ساری رات لوٹ پاٹ چلتی رہی لیکن سپاہیوں نے کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا۔'' انہوں نے صرف بنگلہ میں آگ لگائی اور یورپین کو مارا۔ ایسی افواہ شہر میں پھیلی تھی۔'' بلکہ ایسے بھی واقعات دیکھنے میں آئے جب سپاہیوں نے لوٹ مار کرنے والوں کو کھدیڑ کر بھگایا جب اس شخص کے پاس اپنے بچاؤ کا کوئی راستہ نہیں رہ گیا تھا۔

جتنے شاطر مجرم تھے وہ شہر کے پاس کے مضافات یا توڑی ہوئی جیل کی چہار دیواری سے نکلے ہوئے تھے۔ اس وقت میرٹھ کا قائم مقام کوتوال دھنا سنگھ گوجر تھا۔ اور اس کا زیادہ تر تعلق اسی

قانون شکن قبائل سے تھا۔ اس موقع پر وہ اپنے آدمیوں پر قابو نہیں پا سکا جس سے لوٹ مار کی ان کی خواہش کو اور بڑھاوا ملا۔ سڑک پر چلنے والے مسافروں کو لوٹا گیا اور قتل تو کیا ہی گیا۔ اور ان کے ہاتھوں نہ صرف ہندوستانی شہری بلکہ یورپین بھی زبردست شکار ہوئے۔ بابو بیر بل کا مکان جلایا گیا اور کیلاش چندر بوس ایک بنگالی کی دکان لوٹی گئی اور اس پر حملہ کیا گیا۔ لیکن سب سے خطرناک قتل اس رات کیپٹن کریگ کے بنگلہ کے پاس ہوا۔ مسز چیمبر اس وقت اپنے مکان میں تنہا تھیں اور اس وقت ان کے شوہر ڈیوٹی پر گئے تھے وہ اس جگہ نئی نئی آئی تھیں۔ ان کے جلد ہی ولادت ہونے والی تھی۔ ان کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ اپنا خیال خود کر سکیں۔ کریگ کے مکان کی حفاظت وفادار سوار کر رہے تھے۔ مسز کریگ اپنے پڑوسیوں کو نہیں بھولی تھیں لیکن اس شور شرابے کے ماحول میں ان کا نوکران کے حکم کو بھول گیا تھا۔ اس نوجوان عورت کا ایک طرح سے قیمہ بنا دیا گیا۔ مجرم ایک قصائی تھا' بعد میں پکڑا گیا اور اسے پھانسی کی سزا دی گئی۔ یورپین کے احساسات کو اس واقعہ سے جتنا زیادہ گہرا صدمہ ہوا' بعد میں بدلہ لینے والی فوج نے ہر سپاہی کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا۔

یہ بغاوت اس اسٹیشن پر چونکہ اچانک ہوئی اس لیے لوگ اس کے لیے تیار نہیں تھے۔ لیفٹیننٹ گف ڈیوٹی پر جانے کے لیے وردی پہن رہے تھے۔ ان کے دونوں ملازم چرچ گئے ہوئے تھے۔ لیفٹیننٹ میکینزی اپنے بنگلے میں خاموشی کے ساتھ کتاب پڑھ رہے تھے۔ مس میکینزی اور مسز کریگ شام کی عبادت کے لیے کہیں جا رہی تھیں۔ اسی وقت فوجیوں کی لائن میں شور ہوا۔ گف فوراً گھوڑے پر سوار ہوئے۔ 28ویں این آئی کے پریڈ گراؤنڈ پر تیز رفتاری سے پہنچے۔ انہوں نے لائن کا راستہ چھوڑ دیا۔ ان کا کہنا ہے: ''جب میں ان کے سامنے پہنچا تو مجھے وہ منظر نظر آیا جو میرے ذہن پر ہمیشہ کے لیے نقش ہو گیا۔ جھونپڑیاں جل رہی تھیں۔ فوجی اپنے اسلحوں اور گولیوں کے ساتھ پاگلوں کی طرح ادھر ادھر بھاگ رہے تھے' چیخ رہے تھے' گولیاں چلا رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے پاگل شیطانوں کی ایک بھیڑ ہے جو اپنے افسروں خصوصاً یورپین کا خون پینا چاہتی ہے۔ کسی صورت وہ اپنے فوجیوں کے پاس پہنچا۔ لیکن وہاں ہر طرف انتشار نظر آیا۔ اس پر کوئی حملہ تو نہیں کیا گیا لیکن اس کی کسی دھمکی کو بھی نہیں سنا گیا۔ وہ بہت دیر میں پہنچا تھا اس لیے مجبوراً اسے یورپین لائن کی طرف مڑنا پڑا۔ واپسی پر اس نے گریٹ ہیڈ کو متنبہ کرنا چاہا لیکن وہ پہلے ہی سے روپوش ہو گیا تھا اور اس کے وفاداروں نے اسے وہاں سے فوراً چلے جانے کو کہا۔ میکینزی نے بھی اپنے اسلحے سنبھالے اور بڑی ہمت کے ساتھ لائن کی طرف گھوڑ سواری کرتے ہوئے پہنچا۔ اس نے پورے راستے میں کیویلری کے فوجیوں کو دیکھا اور بچتے بچاتے کیپٹن کریگ کے پاس پہنچا۔ فوجی ادھر ادھر منتشر تو ہوئے لیکن تب تک اس پر ایک دو زخم آ چکے تھے۔ پھر اس پر یقین کرتے ہوئے کہ ان کی جگہ پریڈ گراؤنڈ ہے' وہ دونوں افسر وہاں پہنچ گئے۔ تقریباً رجمنٹ کے سبھی برٹش افسر گراؤنڈ پر پہنچ گئے۔ اور انہوں نے ہر طرح کا حربہ نظم وضبط قائم کرنے کے لیے استعمال کیا جس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ یہ بڑی بات تھی کہ فوجیوں نے ان پر حملہ نہیں کیا۔ لیکن ان سے

واپس چلے جانے کے لیے ضرور کہا اور یہ نعرہ لگایا کہ "برٹش حکومت اب ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔" کریگ نے محسوس کیا کہ کچھ فوجی ان باغیوں کے ساتھ ملنے سے ہچکچا رہے ہیں اس لیے اس نے انہیں کی زبان میں ان سے بات کی۔ آخر کار تقریباً چالیس فوجی اس کے ساتھ مل گئے۔ جنہیں لے کر وہ جیل کی طرف گیا۔ لیکن وہاں وہ بہت تاخیر سے پہنچا۔ سارے قیدی جیل سے باہر آرہے تھے' اور جیل کے محافظ بھی باغیوں سے مل گئے تھے۔ اس وقت تک پورے کنٹونمنٹ میں آگ پھیل چکی تھی۔ کریگ اور کلارک نے وفادار فوجیوں کے ساتھ پریڈ گراؤنڈ کی طرف مراجعت کی اور میکینزی چند محافظوں کو لے کر یہ دیکھنے کے لیے کہ ان کی بہن اور بیوی کے ساتھ کیا ہوا' اس طرف گیا۔ کوچوان کی حاضر دماغی کی بدولت وہ اپنے بنگلے پر تو پہنچا لیکن وہاں بھیڑ ہر طرف آگ لگا رہی تھی اور لوگوں کو مار رہی تھی۔ میکینزی نے اپنے فوجیوں کی شجاعت کو للکارا اور بڑی ہمت کے ساتھ عورتوں کو گھر سے باہر نکالا اور اپنے فوجیوں کی حفاظت میں سونپ دیا۔ اس کے محافظ دستے گھوڑوں سے اتر کر عورتوں کے سامنے سربسجدہ ہو گئے اور ان کے پیر اپنے سروں پر رکھتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ قسم کھائی کہ اپنی جان دے کر بھی ان کی عزت اور جان کی حفاظت کریں گے۔

فوجی میرٹھ کی طرف زیادہ آگے نہیں گئے اور یہ ان کی حماقت ہوتی اگر وہ ایسا کرتے۔ پوری طرح مسلح تقریباً پندرہ سو یورپین فوجی ان کے ساتھ تھے اور خود اپنی شجاعت کے بارے میں انہیں یقین کم تھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ان کی لائن میں بھی کچھ ڈھلمل یقین لوگ ہیں۔ تاہم انہیں نہیں معلوم تھا کہ انہیں کہاں جانا چاہیے؟ کچھ نے سمجھاؤ دیا کہ وہ سب روہیل کھنڈ کی طرف چلے جائیں جب کہ کچھ دوسروں نے امپریل شہر یعنی دہلی کو اولیت دی جو وہاں سے صرف چالیس میل کے فاصلے پر تھا۔ پھر چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹ کر وہ محفوظ جگہ کے لیے نکل پڑے۔ ان کی لائن راکھ میں تبدیل ہو گئی تھی۔ انہوں نے عورتوں اور بچوں کو وہیں کسی پناہ گاہ یا گزر گاہ کا انتظام کیے بغیر چھوڑ دیا۔ کچھ نے ہاپوڑ کی راہ پکڑی۔ کچھ باغپت کے راستے پر نکل پڑے اور کچھ دنوں کے بعد گڑگاؤں کے راستے پر پائے گئے لیکن زیادہ تر لوگ دلّی کی شاہراہ پر چلے۔ بابو ہرشن داس دلّی کا ایک تاجر اس وقت میرٹھ کی طرف جا رہا تھا۔ ہنڈن ندی کو پار کرنے کے بعد تقریباً بارہ ایک بجے کے درمیان اسے آٹھ سواروں کی ایک پارٹی ملی۔ اس سے چار میل آگے جانے پر اسے پچیس آدمیوں کا ایک ٹولہ ملا۔ علی الصبح وہ مراد نگر پہنچا اور خاص شاہراہ کو غیر محفوظ سمجھتے ہوئے اس نے دوسرا راستہ پکڑا۔ مری گاؤں کے پاس اسے جیل کے کچھ محافظ ملے۔ جنہوں نے اسے دکھ کے ساتھ بتایا کہ کس طرح سواروں نے صدر بازار کے بدمعاشوں کے ساتھ مل کر جیلوں کو توڑ دیا ہے اور پھر وہ سزا کے خوف سے میرٹھ چلے گئے جہاں باغیوں کے ساتھ مل گئے۔ رام لال ایک نوجوان کو رات میں ایک بجے کے قریب آٹھ سوار ملے جب وہ غازی الدین نگر پل سے ہوتا ہوا میرٹھ کی سڑک پر چلا مراد نگر سے پانچ میل کے فاصلے پر اسے ایک بڑی پارٹی ملی۔ میرٹھ کے نزدیک اس نے اور بہت

سی پارٹیوں کو دیکھا جن میں کچھ مسلّح تھے اور کچھ خالی ہاتھ ۔ بہت سے گاؤں والوں نے دیکھا کہ یہ باغی بہت عجلت میں تھے۔ اس لیے سارے راستے وہ اپنے اسلحے اور دوسری چیزیں پھینکتے رہے۔

صبح کے وقت بھیڑ منتشر ہو گئی تھی۔ مسز گریٹ ہیڈ لکھتی ہیں: "دن کی روشنی میں مجھے نظر آیا کہ کس طرح سے بربادی کی گئی ہے۔ سب کچھ کھنڈرات میں بدل گیا تھا اور ہمارے خوشحال گھرانے اب سیاہ راکھ میں تبدیل ہو گئے تھے۔" لیکن کینٹونمنٹ میں بہت سے ایسے ناقابل تلافی نقصان ہوئے تھے جس کا غم ہمیشہ رہا۔ پادری اسمتھ کا کہنا ہے: "میں نے اور مسٹر رائن نے مل کر اکتیس شہیدوں کو دفن کیا۔ اس کے علاوہ اور بہت سی لاشیں ادھر ادھر پڑی ہوئی تھیں جو ابھی تک قبرستان نہیں لائی گئی تھیں۔ اس نے گیارہویں این آئی کی تعریف کرتے ہوئے انہیں لوٹ پاٹ اور غارت گری۔ سے بری کرتے ہوئے لکھا کہ انہوں نے ہمارے فوجیوں کی عورتوں اور بچوں کی حفاظت کی۔

10ر مئی کی رات جہنم کی رات تھی۔ تو بھی اس نے بہت سے بہادری اور نیک نامی کا بھی مشاہدہ کیا۔ گلاب خاں جو کمشنر کا جمعدار تھا' اس کی کہانی بہت مشہور ہوئی۔ اس کی وفاداری کے سبب ہی گریٹ ہیڈ بچ سکا ورنہ جلتی ہوئی چھت کے وہ نیچے جل کر راکھ ہو گیا ہوتا۔

بختاور چوکیدار نے اپنی جان کی بازی لگا کر اپنی مالکن مسز میک ڈونلڈ کو بچانے کی کوشش کی لیکن اس کی یہ کوشش کامیاب نہیں ہو سکی۔ ماں کی موت کے بعد وہ بچوں کی حفاظت کرنے میں کامیاب ہوا اور اس نے اسے ایک خادمہ نصیبن کے سپرد کر دیا جس نے اسے اپنے سے کبھی الگ نہیں کیا۔ مسز کورنی کی زندگی تھرڈ کیویلری کے کچھ گھوڑ سواروں نے بچائی۔ اصغر علی کے بنگلے پر حملہ کیا گیا لیکن اپنی جان کی بازی لگا کر اس نے عیسائی کرائے داروں کو بچا لیا۔ مقامی ہندوستانیوں کی اس انسانیت کی بدولت جان و مال کا بہت سا نقصان ہونے سے بچ گیا۔

میرٹھ کی بغاوت بالکل اچانک ہوئی تھی' بہت کم وقفوں کے لئے جیسے لو کے تھپیڑے ہوں۔ بغاوت پھیلنے سے پہلے اس کے کوئی آثار نہیں تھے۔ اور ختم ہوتے ہوتے اس نے بہت زیادہ نقصان کر دیا اور جس تیز رفتاری سے یہ پھیلی تھی اسی تیز رفتاری سے یہ ختم بھی ہو گئی۔ کرنل اسمتھ کی پریڈ اس آگ کو پھیلانے کی محرک ہوئی۔ جنرل ہیوٹ نے بہت دکھ کے ساتھ کرنل سے پوچھا "تم نے آخر پریڈ کیوں کرائی۔ میرے پورے ڈویژن میں خاموشی تھی۔ اگر تم ایک ماہ اور خاموش رہتے تو سب کچھ اپنے آپ ختم ہو جاتا" باوجودیکہ سپاہیوں میں بے اطمینانی پھیلی ہوئی تھی تاہم کوئی ناخوشگوار واقعہ نہ ہوتا' اگر کوئی تجربہ کار اور چالاک شخص حالات پر نگاہ رکھتا۔ لیکن حکمراں قوم کسی بھی فرد کی ذراسی لاپروائی بھس میں چنگاری کا کام کرتی۔

اس حادثہ کے بعد ملٹری حکام نے کچھ تیزی دکھائی اور فوجیوں کی لائن میں کچھ کمزور مظاہرے بھی کیے گئے۔ رائفلز کی ایک کمپنی روک کر کلکٹر کے کچھری کے خزانے کی حفاظت کی گئی۔ ولسن اپنی آرٹیلری اور رائفل کے فوجیوں کو لے کر پریڈ گراؤنڈ پر پہنچا لیکن وہاں کوئی باغی

سپاہی نظر نہیں آیا۔ کچھ فوجی کیویلری کے آس پاس ٹہل رہے تھے۔ لیکن جیسے ہی گولی چلنے کی آواز آئی وہ منتشر ہو گئے۔ ولسن کو خطرہ محسوس ہوا کہ یہ فوجی یورپین کے مکان پر حملہ کر سکتے ہیں اس لئے وہ اتنے آدمیوں کو لے کر وہاں چلا۔ راستے میں اسے کارابائن والے بھی ملے جو اس سے پہلے تو چلے تھے لیکن راستہ بھول گئے تھے۔ پھر اس رات کوئی کارروائی نہیں کی گئی اور نہ باغیوں کی تلاش کی گئی۔ ایک جونیئر افسر نے دلّی سڑک کی طرف اپنی فوج کو لے کر جانے کا ارادہ کیا لیکن کسی نے اسے سنجیدگی سے نہیں لیا۔ اگلے کچھ دنوں تک میرٹھ بریگیڈ خاموشی سے اپنے بیرک میں پڑی رہی اور جس بزدلی کا شکار ہوئی تھی اس سے نجات نہیں حاصل کر سکی۔ یہ بات یقینی ہے کہ اگر باغیوں کا پیچھا کیا جاتا اور ان پر حملہ کیا جاتا تو دلّی کو بچایا جاسکتا تھا گرچہ ہر طرف پھیلی ہوئی بے اطمینانی کے سبب اکادکا واقعات تو ضرور ہوتے لیکن دلّی میں پھیلنے والے واقعات کو روکا جاسکتا تھا۔ اور میرٹھ کے بعد دلّی میں ہونے والے لوٹ پاٹ کے بڑے واقعات کو روکا جاسکتا تھا۔

میرٹھ بریگیڈ میں پھیلی اس بزدلی اور تساہلی کا کوئی جواز نہیں دیا جاسکتا جب تک کہ یہ نہ مان لیا جائے کہ بڑے سے بڑا جری شخص بھی کبھی بزدل ہو جاتا ہے۔ رائن جو اس وقت وہاں موجود تھا' کا کہنا ہے "حقیقت میں ہماری ملٹری وہاں بالکل مفلوج ہو گئی تھی۔ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ وہاں کیا کرنا بہتر ہوگا' اس لئے کچھ کیا بھی نہیں گیا۔" اس سے پہلے کبھی بھی ہندوستان میں بہادر برٹش لوگوں نے اپنے کو اتنا مجبور اور بے بس نہیں محسوس کیا تھا۔ ایک دشمن اکثریت کے درمیان ایک غیر محفوظ اقلیت کو ہر چہرے پر دشمنی نظر آتی اور ہر جگہ سازش کا شبہ ہوتا۔ "ایک دن ہم سب کو ہمارے مقامی خدام زہر دینے والے تھے۔ دوسرے دن کسی مسلم کی سالگرہ کی تقریب میں ہم سب کو قتل کیا جانا تھا۔ اس طرح کی ہر وقت افواہیں پھیلتیں۔" اس لئے بچوں اور عورتوں اور غیر مسلح لوگوں کو ڈمڈمہ میں حفاظت سے رکھا گیا جو ایک چہار دیواری سے گھرا ہوا تھا۔ جنرل اس کے اسٹاف اور دوسرے افسر بیرکوں میں پناہ گزیں ہو گئے تھے' جن کی حفاظت کے لئے ایک گھوڑ سوار موجود ہوتا۔ ہر وقت فوجی ادھر سے ادھر کیے جاتے۔ اور ہر طرح کی تدبیر کی جاتی کہ بڑا بازار کے بدمعاشوں اور آس پاس کے گوجروں کو کینٹونمنٹ آنے سے روکا جاسکے۔

# باب سوم

# دہلی

دہلی میں ایک بادشاہ رہتا تھا۔ اس کی کوئی سلطنت تو نہیں تھی، لیکن اس کے اجداد کی سلطنت کی یاد اسے باقی تھی۔ اس کا دائرۂ اقتدار لال قلعہ تک محدود تھا۔ اور اسے بھی برٹش نگرانی اور دخل اندازی نے اور بھی محدود کر دیا تھا۔ پرانے زمانے کے آداب اور رسم و رواج کے مطابق اسے عزت تو ملتی اور عوام اسے شہنشاہ سمجھ کر اس کی تعظیم تو کرتے لیکن جس کی بادشاہت حقیقت سے پرے تھی۔ اس کا گزارہ پنشن سے ہوتا جسے اس کے درباری اپنی رضا سے خراج کا نام دیتے۔ اسے یہ شاہی آداب بھی برٹش حکومت سے بطور تعظیم ملا تھا۔ لیکن ایک عام آدمی کے لیے وہ اب بھی ہندوستان کا مالک تھا۔ بابر اور اکبر کا جانشین اور دوسرے سبھی حکمرانوں کا بادشاہ، کمپنی سرکار نے اس غیر حقیقی جانشینی اور حکمرانی کے فسانے کو جان بوجھ کر برقرار رکھا۔ کچھ وقتوں پہلے ہی انہوں نے اس کو اسی طرح سے تعظیم پیش کی تھی، جیسی اس کے اجداد کے زمانے میں ان کی حکومت کے دوران کی جاتی تھی۔ جب گورنر جنرل اس شاہی شہر سے گزرا تو اس کے نمائندہ نے خاص تخت کے سامنے باادب ننگے پیروں کھڑے ہو کر بڑے تعظیم کے ساتھ شہنشاہ کی خیریت دریافت کی اور اس کے سامنے اپنی نذر پیش کی جس نے اس کے جواب میں روایتی خلعت دیا۔ قلعہ معلیٰ سے ایک خبرنامہ جاری کیا گیا جیسا کہ پہلے جاری کیا جاتا تھا۔ اور باہر کی دنیا والوں کو یہ خبر دی گئی کہ شہنشاہ عالم نے کیا کیا اور کیا کہا۔ کچھ رجواڑوں میں اب بھی بادشاہ کے نام سے سکے جاری کیے جاتے تھے۔ عہد ماضی کی اس شان و شوکت کا جو ہندوستانیوں کے ذہن میں آج بھی جاگزین تھا، یہ ایک زندہ مثال تھی۔ اور اس لیے بادشاہ اپنے غیر ملکی آقاؤں کے لیے اب بھی خطرے کا باعث بنا ہوا تھا۔ کیونکہ وہی اختیار کا قانونی نمائندہ تھا جو کمپنی سرکار کے خلاف ہونے والی مسلح جدوجہد کو قانونی حیثیت دیتا تھا۔

سرکار اس خطرے سے آگاہ تھی۔ انہوں نے بہت چالاکی کے ساتھ ہندوستان کی سبھی مشہور حکومتوں کو ختم کر دیا تھا اور ان کے جانشینوں کو گدی سے بہت دور کر دیا تھا۔ پیشوا جو پورے مراٹھا سلطنت کی وفاداری کو کمانڈ کرتا، اسے شمالی ہند کے ایک دور دراز گاؤں میں بھیج دیا گیا۔ ٹیپو سلطان کے جانشینوں کو ویلور سے کلکتہ منتقل کر دیا گیا۔ رنجیت سنگھ کے بیٹے کو برٹش جزیروں میں

رہنے کو گھر دیا گیا جہاں وہ ہر طرح کی شورش سے محفوظ تھا۔ لیکن اس نام نہاد شہنشاہ کو شاہ جہاں کے محل کے اندر ہی رہنے کی اجازت دی گئی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس مفروضے کو بنائے رکھنے میں اپنا مفاد دیکھا کہ وہ دہلی سلطنت کی باج گزار ہی رہے۔ لیکن بنگال اور کرناٹک میں اپنی حکومت کی بنیاد مضبوط کرنے اور مراٹھا اور سکھ طاقت کے ختم ہو جانے کے بعد دلی کی بادشاہت سے سارے سیاسی مفاد ختم ہو چکے تھے۔ اس کے برخلاف دلی کی گدی اب بھی اس قانونی تضاد کا شکار بنی ہوئی تھی جس کے تحت ایک طرف تو قانونی حکمرانی تھی اور دوسری طرف نام نہاد حکمرانی۔ اس لیے اس شاہی آداب کو ختم کرنا اور شاہی خاندان کو لال قلعہ سے الگ کرنا ان کے لیے ضروری ہو گیا تھا۔

بہادر شاہ 1837ء میں تخت نشین ہوا اور اپنے باپ کی طرح اس نے بھی بادشاہ اور غازی کا لقب اختیار کیا کیونکہ عوام بہت دنوں سے سلطنت کے بغیر شہنشاہ اور بغیر کسی جنگی تجربے کے نام نہاد غازی کے عادی ہو چکے تھے۔ اپنی زندگی کا زیادہ وقت گزارنے کے بعد وہ ایسا شخص نہیں رہ گیا تھا جو دور دراز کے مسائل کو حل کر سکتا۔ عام دنوں میں اس سے زیادہ کی کوئی امید بھی نہیں کی جاتی تھی کہ وہ سلطنت کا ہوائی خاکہ پیش کرتے رہے اور اسی طرح کے آداب بھی بجالائے۔ اس کے پاس نہ تو ہمت تھی نہ شجاعت جو اس کے اجداد کا طرہ تھی، لیکن اس نے ان سے کچھ ادبی ذوق ضرور وراثت میں پایا تھا۔ اپنے خالی اوقات میں وہ غزلیں کہا کرتا۔ درباروں کے سازشی ماحول میں پیدا ہونے اور ہر وقت مختلف قسم کی سازشوں میں ملوث ہونے کے باعث وہ اپنے وقت اور اپنے عہد کی خام خیالی سے آزاد نہیں تھا۔ وہ کسی بھی سازشی ذہن سے فوری طور پر متاثر ہو جاتا۔ اس کے روحانی پیر حسن عسکری ایک شیطانی کردار رکھتا تھا۔ ہر مغل شہزادہ اپنی گذشتہ شان و شوکت کو یاد کرتا، لیکن بہادر شاہ ایسا شخص نہیں تھا جو اپنے برٹش آقاؤں کو ذرا بھی تنگ کر سکے۔ اپنے والد کی طرح اس نے بھی برٹش حکومت سے درخواست کی کہ اس کے بھتے میں کچھ اضافہ کیا جائے۔ لیکن کمپنی اس کی پنشن میں اضافہ کے لیے اس وقت تک تیار نہیں تھی جب تک وہ اپنا لقب اور اپنا محل چھوڑنے کے لئے نہ تیار ہوں۔ صرف ایک دوسرے معاملے میں وہ تھوڑا سنجیدہ تھے اور وہ تھا اپنے نابالغ لڑکے کو اپنا جانشین بنانا۔ اس کی ضعیفی کی اولاد جواں بخت اس کی چہیتی ملکہ زینت محل کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ لیکن اس کے علاوہ بہت سے دوسرے بڑے شہزادے بھی تھے۔ یہ سبھی اس کا جانشین بننا چاہتے تھے۔ جب بھی موقع ملتا، بہادر شاہ کمپنی سرکار سے یہ معاملہ اُٹھاتے۔ سرکار مناسب موقع کی تلاش میں تھی کہ ان کو اس بات کے لیے آمادہ کر سکے کہ وہ اپنے القاب کو چھوڑ دیں اور شاہی محل سے چلے جائیں اور قطب کے آس پاس کہیں گاؤں میں جا بسیں جہاں انہیں اپنی شہنشاہی کی کوئی یاد باقی نہ رہے۔ بہادر شاہ اپنی اس بے عزتی اور چھوٹے سے گھر میں رہائش کے لیے اپنے کو تیار نہیں کر سکے۔ برٹش سرکار بھی اس ڈھکوسلے کو ختم کرنا چاہتی تھی۔ جس کی بدولت اس کا مرتبہ ایک باج گذار کا ہو گیا تھا۔ لیکن وہ اس معاملے پر زیادہ دباؤ نہیں ڈالنا چاہتے تھے کیونکہ

مغل تاج و تخت چاہے کتنا بھی فرسودہ ہو گیا ہو' اب بھی کروڑوں لوگوں کے دلوں میں اس کے لئے جگہ تھی اور یہ بات مناسب نہیں تھی کہ کروڑوں لوگوں کو ان کے اس احترام کے جذبے سے محروم کیا جائے اور یہ بھی سیاسی دانشمندی نہ ہوتی کہ کروڑوں لوگوں کے جذبے کو اس متضاد کیفیت کی وجہ سے محروم کیا جائے جس کی وجہ سے اب تک انہیں کوئی خاص پریشانی نہیں ہوئی تھی۔ لیکن خارجی آداب کے طریقوں کو ایک ایک کر کے ترک کر دیا گیا۔ لارڈ ایلن بورو نے اپنی طرف سے یا ریذیڈینٹ کی طرف سے نذر دینا ختم کر دیا تھا۔ گرچہ اسی تناسب سے رقم کی ادائیگی کی ایک شق موجود تھی۔ لیکن تخت سے منسوب ان آداب کے نقصان کے لیے کوئی مالی معاوضہ نہیں دیا گیا اور بہادر شاہ خود بھی اور ان کے خاندان والے بھی یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ ان کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے۔ گرچہ کھلے طور پر وہ اس کا اظہار نہیں کر سکے۔ اس دوران لارڈ ڈلہوزی اپنے ملک میں حکام پر اس بات پر دباؤ ڈالے ہوئے تھا کہ وہ جلد سے جلد سارے شاہی آداب و القاب کو ختم کر دیں اور لال قلعہ کے خانہ نشینوں کو وہاں سے کسی اور جگہ منتقل کر دیں۔ لیکن کورٹ آف ڈائرکٹرس' بورڈ آف کنٹرول اس جلد بازی کی تجویز سے متفق نہیں تھے۔ اور جب آخر کار گورنر جنرل کو اس قسم کا اختیار مل گیا تو بھی اسے ہاب ہاؤس کے اس خیال سے متفق ہونا پڑا کہ وہ اس امر کے لیے کسی طاقت کا استعمال نہیں کریں گے۔ یہ بھی فیصلہ کیا گیا تھا کہ بہادر شاہ کی موت تک انتظار کیا جائے۔ کہ یہ سانحہ بہت جلد ہونے والا تھا۔ کیونکہ بادشاہ بہت ضعیف اور معذور ہو چلا تھا۔ 1849ء میں تخت کے جانشین کی موت ہو گئی اور کورٹ آف دہلی کے ریزیڈنٹ نے شہزادہ فقیر الدین سے سمجھوتہ کر لیا جو تخت نشینی کے دوسرے دعویدار تھے۔ یہ کہ ان کے والد کے مرنے کے بعد انہیں شاہی خاندان کا ہیڈ سمجھ لیا جائے گا اور وہ اپنے لیے شہزادہ کا لقب استعمال کر سکیں گے۔ اور یہ کہ یہ قلعہ سے ملحق شہر' دریا اور اسلحہ خانے سبھی کچھ چھوڑ دیئے جائیں گے لیکن یہ سمجھوتہ بہت دنوں تک راز نہیں رہ سکا اور دوسرے شہزادوں نے اس کے خلاف احتجاج کیا۔ 1856ء میں شہزادہ فقیر الدین کی موت ہو گئی۔ شبہ ظاہر کیا گیا کہ انہیں زہر دے کر مارا گیا اور بادشاہ جو زینت محل کے زیر اثر تھا' اس نے دوبارہ پھر جواں بخت کو ولی عہد بنانے کی کوشش کی لیکن اس میں بھی زیادہ کامیابی نہیں مل سکی کیونکہ دلی کے بادشاہ کے دن گنے چنے رہ گئے تھے۔ بہادر شاہ کی موت کے بعد شاہ جہاں اور عالمگیر کے ان ناخلف شہزادوں کو ان کے اس موروثی مقام سے بے دخل کر دیا جائے گا' اگر اس درمیان کوئی دوسرا واقعہ نہ ہوا۔

11/ مئی 1957ء کی صبح نے مشاہدہ کیا کہ میرٹھ کے باغی ناؤ کے پل سے دلّی کے نزدیک جمنا کو پار کر رہے ہیں۔ یہ شہر ابھی تک میرٹھ کی بغاوت سے بے خبر تھا۔ گرمیوں میں مقامی کالج صبح کے وقت جلدی کھلتا تھا پروفیسر رام چندر وہاں پہنچ چکے تھے۔ اس بات سے بے خبر کہ یہ دن ان کے لیے کیا لانے والا ہے۔ منشی موہن لال جو مشہور سیاح تھے' اس وقت اپنے ایک انگریزی دوست کے ساتھ محو گفتگو تھے۔ کلکتہ سے ایک دن پہلے کاغذات آچکے تھے۔ کاشی پرساد جو جھجر

کے نواب کے نمائندے تھے، حسب معمول صبح کو سیر کو نکلے۔ انہیں کوئی انہونی بات کے آثار نظر نہیں آئے جس سے وہ آنے والی قیامت سے باخبر ہو سکتے۔ منشی جیون لال نے کیپٹن ڈوگلس سے ملاقات کر کے اپنی ڈائری کی نقل کے ساتھ گھر واپس آ کر عدالت جانے کے لیے پالکی والوں سے کہا۔ معین الدین حسن، جو پہاڑ گنج پولیس اسٹیشن کے افسر انچارج تھے، وہ ایک مجرمانہ مقدمہ کے سلسلہ میں کلکٹر کی عدالت میں پہنچ چکے تھے۔ سائمن فریزر کمشنر ابھی تک اپنے بستر میں تھے۔ اسی وقت اچانک خطرے کی گھنٹی بجی کہ میرٹھ کے گھوڑسوار شہر پناہ کے دروازے پر پہنچ گئے ہیں، انہوں نے چنگی کلکٹر کو مار ڈالا ہے اور اس کے دفتر کو آگ لگا دی ہے۔ ہچنسن جو کلکٹر تھے، فوراً اپنی عدالت کو چھوڑ کر کمشنر کے بنگلے کی طرف چل پڑے۔ گرمی کی یہ صبح جو بہت پُرسکون شروع ہوئی تھی، اس نے دلی کی سڑکوں پر قتل و غارت گری اور دہشت گردی کا دلدوز منظر پیش کیا۔ بادشاہ بھی اسی طرح حیرت میں پڑ گیا جس طرح کمشنر۔ محل کے نیچے کی کھڑکیوں سے آنے والے شور نے اس بوڑھے آدمی کو باغیوں کے آنے کی اطلاع دی۔ پرانے زمانے میں جب بادشاہت اپنے پورے دبدبے کے ساتھ قائم تھی تو شہنشاہ بالکونی کے جھروکے سے اپنی رعایا کو درشن دیا کرتے تھے۔ بہادر شاہ کے پاس اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اس بے قابو بھیڑ کا سامنا کر سکے۔ اس لیے انہوں نے کیپٹن ڈگلس کو بلوایا۔ ڈگلس نے ان سے کہا کہ وہ تتر بتر ہو جائیں کیونکہ بادشاہ کو شور شرابہ پسند نہیں۔ باغی اس کے بعد کلکتہ دروازے کی طرف چلے جو انہیں بند ملا۔ اس دوران کمشنر سائمن فریزر کلکٹر ہچنسن جائے واردات پر پہنچ گئے۔ یہیں کیپٹن ڈگلس بھی پہنچ گئے۔ اگر سارے دروازے سختی سے بند ہوتے تو باغیوں کا شہر میں داخلہ مشکل ہو جاتا۔ لیکن ان سے ہمدردی کرنے والے بھی کم نہ تھے۔ جیسے ہی یہ افواہ پھیلی کہ سپاہیوں نے میرٹھ کے سارے یورپین کو مار ڈالا ہے اور اب دلی اپنی مذہبی لڑائی لڑنے آئے ہیں، سبھی سڑکیں متجسس بھیڑ سے بھر گئیں، اور جلد ہی غنڈہ عناصر سامنے آ گئے۔ ان میں سے بہت سے لوگ اب بھی انگریزوں کو گھس پیٹھیا اور تخت و تاج ہڑپنے والا سمجھتے تھے۔ اور ابھی حال ہی میں ایسا سمجھا جاتا تھا کہ ایران کے شاہ کی طرف سے ایک فرمان جاری ہوا تھا جس میں دلی کے شہریوں سے کہا گیا تھا کہ وہ ان سے نجات حاصل کریں۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جن ہاتھوں نے راج گھاٹ دروازہ کھولا تھا جہاں سے باغی نظر آ رہے تھے وہ کسی سیاسی مقصد کی وجہ سے تھا یا لوٹ مار کی نیت سے۔ لیکن وہ جوشیلے گھوڑسوار فوراً اندر داخل ہو گئے اور ان کی تعداد میں بدمعاشوں کی وجہ سے بہت زیادہ اضافہ ہو گیا۔

شہر میں پہلا خون ہندوستانی عیسائی ڈاکٹر چمن لال کا ہوا جو اپنی ڈسپنسری کے سامنے کھڑے ہوئے تھے۔ یہ باغی محل کی طرف گئے۔ محل کے محافظوں نے کوئی مزاحمت نہیں کی اور سپاہیوں کے ساتھ ہو گئے۔ فریزر ڈگلس اور ہچنسن اس دوران محل کو لوٹ آئے تھے جہاں ان سب کو مار ڈالا گیا۔ پادری جیننگ، اس کی لڑکی مس جیننگ، اس کی دوست مس کلیفورڈ کا بھی یہی حشر ہوا۔ باغیوں نے بادشاہ سے کہا کہ وہ ان کی کمان سنبھال لے۔ اس نے انہیں اپنی غریبی اور بیماری کا حوالہ

دیا لیکن اس کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ بادشاہ کی خدمت میں آئے تھے، اپنے مذہب کی جنگ لڑ رہے تھے اس لیے ان کے نزدیک تنخواہ اور ترقی کا معاملہ اہم نہیں تھا۔ لیکن وہ تب بھی ان کی باتوں سے انکار کرتا رہا اور اپنے دوست اور معالج حکیم احسان اللہ کے مشورے سے ایک اونٹ سوار کو خاموشی سے آگرہ بھیجا کہ وہ لیفٹنٹ گورنر سے مل کر میرٹھ کی اس بغاوت اور باغیوں کے دہلی پہنچنے کی اطلاع دے دے۔ یہ امید کی جا رہی تھی کہ میرٹھ کے یورپین فوجی بہت جلد یہاں پہنچ جائیں گے۔ وقت گزرتا رہا لیکن کہیں سے کوئی کمک نہیں پہنچ سکی اور لحہ بہ لحہ حالت بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔ بادشاہ کی نظر میں یہ پہلا واقع تھا جب ایک مسلح بھیڑ نے محل کے آداب کو بالائے طاق رکھا تھا اور سوار اس جگہ پر پہنچ چکے تھے جہاں شاہی خاندان کے افراد اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایجنٹ بھی اپنے گھوڑے سے اُتر کر تعظیم دیتے۔ بوڑھا بادشاہ اس تشدد سے گریز کرنا چاہتا تھا اور جب رات ہو گئی تبھی اس نے اپنے کو تقدیر کے حوالے کیا۔ اس سانحہ میں شہزادوں کا کیا رول تھا' یہ کوئی نہیں جان سکا۔ کیونکہ یہ ایک موقع آ گیا تھا جب وہ اپنے محل کی پرانی عظمت کو دوبارہ بحال کر سکتے تھے۔ دوسری صورت میں انہیں اپنے اس موروثی محل سے بے دخل ہونا پڑتا اور وہ اپنے القاب سے بھی محروم کر دیے جاتے۔ اس لیے ان صورتوں میں سے ایک کا انتخاب کیا گیا۔ بعد کے واقعات سے ظاہر ہوا' مرزا مغل مرزا خضر سلطان اور مرزا ابو بکر نے اس موقع سے بہت فائدہ اُٹھایا جو ان کے ہاتھ آ گیا تھا۔ آدھی رات کے قریب اکیس توپوں کی گونج کے درمیان یہ فرمان جاری ہوا کہ بابر کے جانشین نے سلطنت کی باگ ڈور سنبھال لی ہے۔

میرٹھ کی طرح سے دلی میں کوئی یورپین فوج نہیں تھی اور دلی کے کچھ سپاہیوں کے افسر جو میرٹھ کے کورٹ مارشل کے ممبر ہوئے تھے' ان کے لیے بھی گریس ملی ہوئی گولیاں اتنی ہی پریشانی کا باعث تھیں جتنی ان غریب فوجیوں کے لیے جن پر مقدمہ چلانے کے لیے وہ شریک ہوئے تھے۔ اسی دن صبح ایشوری پانڈے کے کورٹ مارشل کی کارروائی انہیں پڑھ کر سنائی گئی تھی۔ جس جمعدار کو سزا دی گئی تھی وہ دلی کے سپاہیوں کی نظر میں کیا تھا؟ کیا وہ ایک ہیرو تھا؟ مجرم تھا؟ حق کے لیے اس نے جان دی تھی؟ اپنے مذہب کے لیے شہادت پائی تھی؟ یا برٹش شیطنت کا شکار ہوا تھا اور یہ بھی ایک بدبختی تھی کہ یہ مخصوص دستاویز 11 مئی کی صبح عوام میں مشتہر کی گئی تھی اور ایک دوسری بدبختی یہ تھی کہ 38 ویں این آئی رجمنٹ' جس نے برما جانے سے انکار کر دیا تھا' وہ اس سیاہ دن شہر کی ڈیوٹی پر تھی۔ لیکن یہ ایسے واقعات تھے جو انسانی دسترس سے باہر تھے۔ اور ایسے سانحے اکثر تاریخ کے دھارے کو موڑ دیتے ہیں۔

کینٹ شہر سے کچھ میل کے فاصلے پر راجپور گاؤں تھا جہاں اب یونیورسٹی کی بلڈنگ ہے' اس لیے بریگیڈیر گریوز کو اس بات کی اطلاع ملنے میں کچھ تاخیر ہوئی۔ لیکن سپاہیوں کے اندر کچھ ہمدردی نہیں تھی۔ 54 ویں این آئی کرنل ریلے کے ساتھ ساتھ کشمیری گیٹ تک تو گئی لیکن اس نے جنگ کرنے سے اس وقت بھی انکار کر دیا جب ان کے کمانڈر کو کاٹا گیا اور افسروں کو گولی ماری

گئی اور یہ شہر کی تقدیر میں آخری کیل تھی۔ 74 ویں رجمنٹ کے میجر ایبٹ بھی حالات کو تبدیل نہ کر سکا۔ جو خاص حفاظتی عملہ تھا اس نے سہ پہر تک تو مورچہ سنبھالا لیکن شام ہوتے ہوتے 38 ویں این آئی کے سپاہیوں نے افسروں پر گولیاں چلانی شروع کر دیں اور وہ اپنی بیویوں کے ساتھ جان بچانے کی فکر میں لگ گئے۔

اس دوران شہر کے سبھی عیسائی ہندوستانیوں اور یورپین لوگوں کو مار دیا گیا۔ دریا گنج کا علاقہ جہاں زیادہ آبادی یورپین اور اینگلو انڈین کی تھی، وہ بالکل مقتل بن گیا اور ہر عیسائی کو قتل کر دیا گیا۔ بینک کو لوٹ لیا گیا اور میجر اور اس کے خاندان کے لوگوں کو بھی قتل کر دیا گیا۔ ایک مقامی اخبار کے دفتر پر حملہ کر کے سبھی کمپوزیٹرس کو مار دیا گیا۔ بہت سے مرد اور عورتوں نے کشن گڑھ کے راجا کے مکان میں دو دنوں تک پناہ لی۔ بعد میں بادشاہ نے اپنے اکیلے زندہ لڑکے کو ان لوگوں کو بحفاظت نکالنے کے لیے بھیجا۔ وہ اس مقام پر دیر سے پہنچا اس کی باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا اور سبھی پناہ گزیں مار دیے گئے۔ تقریباً پچاس قیدیوں کو محل میں لے جایا گیا جہاں کچھ دنوں بعد انہیں پھانسی دے دی گئی۔ لیکن کچھ لوگ معجزاتی طور پر اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو گئے۔ ان میں نمایاں شخصیت سر تھیوفیلس منکاف جوائنٹ مجسٹریٹ کی تھی۔ بہت سے لوگوں نے فلیگ اسٹاف ٹاور میں پناہ لے لی تھی اور جب انہیں بچنے کی کوئی امید نظر نہیں آئی تو رات کے وقت وہ مختلف سمتوں میں نکل گئے۔ ان میں سے کچھ تو بحفاظت میرٹھ پہنچ گئے، کچھ کرنال اور کچھ انبالہ۔ دن کے وقت تو وہ سڑکوں کے آس پاس جنگلوں میں چھپ جاتے اور رات کے وقت چھپتے چھپاتے شاہراہ سے ہٹ کر اِدھر اُدھر کے راستوں سے سفر کرتے جب تک کہ مطلوبہ مقام تک نہ پہنچ گئے۔ دیہاتوں میں کچھ رحم دل قسم کے لوگ بھی تھے جو ان کی حالت پر رحم کھا کر انہیں کھانا بھی دیتے اور پناہ بھی۔ اس کے برخلاف کچھ ایسے بھی بد طینت لوگ تھے جو ان کے بچے کھچے سامان کو بھی لوٹ لیتے اور انہیں ان کی جائے پناہ سے کھدیڑ دیتے۔ اس شورش کے زمانے میں گوجروں، رنگھڑ میواتیوں اور کچھ دوسرے قبائلیوں کی بن آئی۔

اس پر آشوب وقت میں شجاعت سے فتح پائی گئی۔ شہر ویران ہو چکا تھا۔ کنٹونمنٹ خالی کرا لیا گیا تھا لیکن میگزین نے خود کو سپرد نہیں کیا تھا۔ اس ٹکڑی میں تو انگریز شامل تھے۔ ان کے ساتھ کوئی ہندوستانی نہیں تھا۔ کیونکہ ان پر بھروسہ نہیں تھا۔ صبح کے وقت سر تھیوفیس منکاف میگزین میں پہنچا تاکہ وہاں سے دو توپوں کو لے کر پل پر حملہ کر سکے۔ لیکن لوگ پل کو پہلے ہی پار کر چکے تھے اور بار برداری کے مویشی کم ہونے کی وجہ سے توپوں کو لے جانا بھی ممکن نہ ہوا۔ لیفٹیننٹ ولوبائی نے میگزین کی حفاظت کے لیے ہر ممکن کوشش کی۔ اس نے طے کر رکھا تھا کہ جب اسے بچانا ممکن نہ ہو گا تو اسے اڑا دے گا۔ اسے کینٹونمنٹ سے کسی مدد کی امید نہ تھی اور باہر بھیڑ اور پر تشدد ہوتی جا رہی تھی۔ آخر کار ان سے کہا گیا کہ وہ بادشاہ کے نام پر اپنے کو سپرد کر دیں اور پھر سیڑھیاں اکٹھی کی گئیں تاکہ حملہ کر کے اس جگہ پر قبضہ کیا جا سکے۔ پہلے سے طے شدہ ایک اشارے

بہادر شاہ ظفر

کے ذریعہ ٹرین پر گولی چلائی گئی اور زبردست دھماکے کے ساتھ یہ اعلان کیا گیا کہ میگزین ختم ہو گئی۔ ان نو بہادر آدمیوں میں سے تین تو اپنی جگہ پر مر گئے ولو بائی اور پانچ دوسرے اپنی زندگی بچانے میں کامیاب ہو گئے۔ فارسٹ 'رینز' شا' بکلے اور اسٹیورٹ تو وکٹوریہ کراس پانے تک زندہ رہے لیکن ان کا لیڈر ولو بائی جو اس دھماکے سے بچ گیا تھا' میرٹھ جاتے ہوئے گاؤں والوں کے حملے کا شکار ہو گیا۔

جیلر لالہ ٹھاکر داس بھی شام پانچ بجے تک مزاحمت کرتا رہا اور قیدیوں کو نہیں چھوڑا لیکن جب محافظوں میں بدنظمی بڑھی تو اس کے سامنے وہاں سے ہٹنے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں تھا۔ دو اینگلو انڈین نوجوانوں نے ٹیلی گراف آفس سے انبالہ' لاہور' راولپنڈی اور پیشاور یہ تار بھیجا "سپاہی میرٹھ سے آئے ہیں اور وہ سب کچھ جلا کر ختم کر رہے ہیں۔ مسٹر ٹاڈ ختم کر دیئے گئے اور ہم نے سنا ہے بہت سے یورپین بھی۔" اس طرح سے دلی کی قسمت کا حال پنجاب کو بتا دیا گیا۔

چند ہفتوں تک سپاہیوں کا کوئی پرسان حال نہیں رہا۔ میرٹھ کی طرف سے کوئی مزید شورش نہیں ہوئی اور دوسری جگہوں پر اس کے کیا اثرات ہوئے' سپاہی کچھ نہیں جانتے تھے۔ لیکن بادشاہ عجیب کشمکش میں گرفتار تھا۔ ابھی تک تو اس کی عادت تھی کہ ہر چیز اسے اپنے آپ مہیا ہو جاتی۔ لیکن اب اس پر ذمہ داری آپڑی تھی کہ وہ سپاہیوں کی ضرورتوں کو پوری کرے۔ اس کے قابل اعتماد مشیر حکیم احسان اللہ کو انتظامی امور کا کوئی تجربہ نہیں تھا اور بادشاہ امن پسند طبیعت کا تھا۔ اس کے علاوہ نہ تو اسے سپاہیوں پر اور نہ سپاہیوں کا اس پر بھروسہ تھا۔ حکیم کو مکمل بھروسہ تھا کہ انگریز جلد یا بدیر واپس آجائیں گے اور جس چیز کو وہ ختم ہوا سمجھ رہا تھا' اب اسے دوبارہ زندہ کرنے کی اسے کوئی خواہش بھی نہیں تھی۔ 12/ تاریخ کو بادشاہ نے شہر کے کچھ مسلم عمائدین کو مشورے کے لیے بلایا۔ ان میں سے جھجر کے نواب کے ایک چچا بھی تھے۔ انہیں اس لیے بلایا گیا تھا کہ وہ سب مل کر ایگزیکیوٹیو کونسل کی تشکیل کریں۔ شہر میں امن وامان قائم کیا جانا اشد ضروری تھا۔ سپاہیوں کے لیے جگہ اور مکان کی فراہمی بھی کی جانی تھی اور نئے سپاہیوں کو بھرتی بھی کیا جانا تھا۔ شہر میں پوری طرح بدنظمی پھیلی ہوئی تھی۔ بدکردار اور بدقماش قسم کے لوگ یورپین اور عیسائیوں کو تلاش کرنے کے بہانے دولتمند لوگوں کو پریشان کر رہے تھے۔ دکانیں بند تھیں اور سارا تجارتی کام ٹھپ ہو گیا تھا۔ خزانے میں کوئی دولت نہیں تھی اور فوج کے لیے فنڈ کی ضرورت تھی۔ یہ ایک بہت بڑا کام تھا جو بڑے سے بڑے ہمت ور کے چھکے چھڑا دیتا اور اس نئی کونسل کے پاس نہ تو صلاحیت تھی اور نہ ہمت۔ اس لیے کوئی تعجب نہیں ہونا چاہئے کہ بادشاہ کی اپیل کا کوئی اثر نہیں ہوا اور ایک مدعو امیر نے تو کونسل کا ممبر ہونے سے بھی انکار کر دیا۔ تاہم گورنر کی تقرری کی گئی۔ مرزا مغل کمانڈر انچیف بنائے گئے اور دوسرے شہزادوں کو بھی اعلیٰ فوجی مقام عطا کئے گئے۔ لیکن یہ شہزادے بھی اسی طرح نااہل تھے جیسا کہ بادشاہ۔ ان میں سے کوئی بھی اس قابل نہیں تھا کہ وہ اس فوج پر کنٹرول کر سکے جو ایک بڑی بدنظمی کا مزہ چکھ چکی ہے۔ بادشاہ خود ہاتھی پر بیٹھ کر سڑکوں سے گزرا اور لوگوں خصوصاً تاجروں سے اپیل کی کہ وہ اپنے معمولات جاری رکھیں۔ لیکن

ان کا خوف کم نہیں ہوا۔ فوجی زیادہ تر محل کے باغات میں رہنے لگے اور امن پسند شہریوں کے لیے مصیبت بن گئے۔ منشی جیون لال لکھتے ہیں۔ "ہر گھر سے بادشاہ کے نام آہ و فغاں اور گریہ وزاری جاری رہتی اور ہر گھر سے یہ اطلاع ملتی کہ کوئی نہ کوئی مارا گیا۔ کبھی دکاندار اُسے اپنی دکانیں لوٹے جانے کی اطلاع دیتے۔ ہر شخص بادشاہ کی طرف منتظر نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس سے منت و سماجت کی جاتی کہ شہر میں ہر طرف پھیلی لوٹ مار اور قتل و غارت گری کو روکیں۔" بادشاہ نے اپنی حد تک کوشش بھی کی لیکن اس کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہوئی۔ وہ لوگوں سے اپیل کرتا' فوجیوں کو ڈراتا۔ اور اس نے یہاں تک دھمکایا کہ وہ اپنی بادشاہت سے دست بردار ہو جائے گا لیکن ان سب کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ ایک کمزور آدمی اچھا بادشاہ نہیں ہو سکتا اور آخری مغل تاجدار کے اندر انقلابی لیڈر ہونے کی کوئی صلاحیت ہی نہیں تھی۔

اس نئے انتظامیہ کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اس میں کوئی کمی نہیں آئی باوجودیکہ فوج کے کچھ باشعور لوگ بادشاہ اور کمانڈر انچیف کے ساتھ ہر طرح کا تعاون کرنے کو تیار تھے۔ گرچہ وہ سب انگریزوں کے طور طریقوں سے نفرت کرتے لیکن مغربی طرز فکر اور برٹش اداروں کے اثرات سے اپنے کو آزاد نہیں کرا سکے۔ 'ایک کورٹ یا ملٹری اور سول مینجمنٹ کمیٹی' کا تقرر ہونا تھا جو "سول ملٹری کے اداروں سے بد نظمی کو دور کر سکے"۔ اس کمیٹی میں دس ممبران کی تقرری ہونی تھی۔ ان سب سے چھ کا انتخاب فوج کرتی اور ان میں سے دو دو فوج کے تینوں شعبوں انفینٹری، کیویلری اور آرٹیلری سے ہونا تھا۔ ان کی خاص ذمہ داری فوجی معاملات کی دیکھ بھال تھی جبکہ باقی چار سول ایڈمنسٹریشن کو دیکھتے۔ یہ واضح نہیں ہو سکا کہ سویلین ممبرس کو کون اور کیسے منتخب کرتا۔ لیکن کورٹ کے فوجی شعبہ کے لیے سینئرٹی اور صلاحیت کو مقدم سمجھا گیا اور اس میں بھی اکثریت کا انتظام کیا گیا۔ یہ کمیٹی اپنا صدر خود منتخب کرتی اور اسے اس کے لیے ایک زائد ووٹ کا حق بھی دیا گیا۔ یہ کورٹ کمانڈر انچیف کے تحت ہوتا۔ جس کی منظوری کے بغیر کوئی فیصلہ لاگو نہیں ہو سکتا۔ کمانڈر انچیف کو اس بات کا حق دیا گیا تھا کہ وہ اس کمیٹی کے کسی فیصلے کو جس سے وہ متفق نہ ہوتا' دو بارغور کرنے کے لیے کہہ سکتا تھا۔ لیکن اگر کورٹ اپنی رائے پر اٹل رہتی تو پھر بادشاہ کے سامنے یہ معاملہ لایا جاتا جس کا فیصلہ حتمی ہوتا۔ بادشاہ اور کمانڈر انچیف اگر ان کی مرضی ہو تو کورٹ کی میٹنگ میں حصہ لے سکتے تھے۔ کاغذ پر یہ کورٹ ایک جمہوری ادارہ تھا اور اس کی نمائندہ حیثیت اور فوج کی اکثریت کی بنا پر فوج پر قابو پا سکتی تھی اور فوجیوں کی آزادی پر رکاوٹ ڈال سکتی تھی لیکن درحقیقت یہ کچھ حاصل نہیں کر سکی۔ کورٹ کا انتخاب کب کیا گیا یہ واضح نہیں ہے کیونکہ اس کے آئین میں کوئی تاریخ درج نہیں ہے۔ یہ دلی کے خاتمے تک برقرار رہی لیکن نہ تو اس قلیل مدتی حکومت کے فوجی یا سول افسران پر اس کا کوئی اثر ہوا اور شہر میں اسی طرح بد نظمی پھیلی رہی۔

جیسے جیسے مئی کا مہینہ ختم ہوتا گیا' بادشاہ کو نئی نئی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ 28/ مئی کی ایک رپورٹ کے مطابق فوجیوں نے تین دنوں تک دلی کو تاراج کیا۔ انہیں اس بات کا شبہ تھا کہ

بیگم زینت محل انگریزوں سے ملی ہوئی ہیں۔ بادشاہ نے آس پاس کے کچھ زمین داروں سے اپیل کی کہ وہ راشن کے ساتھ کچھ فوجی بھیجیں۔ لیکن فنڈ نہ ہونے کی وجہ سے انتظامی امور ناکام ہوتے رہے۔ اس لیے شہر کے کچھ بینکروں کو قلعے میں بلایا گیا اور ان سے کہا گیا کہ وہ خزانے کو بھرنے میں اپنا تعاون دیں۔ جیون لال ریکارڈ کرتے ہیں "بادشاہ کے بہت زیادہ دباؤ اور نئے افسروں کے خوف سے شہر کے بینکروں نے فوج کی ادائیگی کے لیے ایک لاکھ روپے جمع کیے۔" لیکن ان حالات کو دیکھتے ہوئے ایک لاکھ روپے ناکافی تھے۔ کچھ دنوں بعد فوجیوں نے حیدر آباد کے ایک آدمی کو لوٹ لیا۔ فوراً ہی حکمنامہ جاری کیا گیا کہ بینکرس اور ان دولت مند آدمیوں کی ساری املاک کو ضبط کر لیا جائے جو انگریزوں کے حمایتی تھے۔ مئی کے آخری ہفتہ میں حالات کچھ بہتر ہوئے کیونکہ روہتک سے انہیں دو لاکھ کی رقم آگئی تھی لیکن پورا ماحول اب بھی شک اور بے یقینی میں گھرا ہوا تھا۔ اسلام گڑھ ٹکڑی کی توپوں کو بیکار کر دیا گیا۔ اور یہ افواہ پھیل گئی کہ بادشاہ کے انگریز نواز منسٹر اور دوست حکیم احسان اللہ اس توڑ پھوڑ کے پیچھے تھے۔ اور سب سے بڑی خرابی تو یہ تھی کہ دلی اور میرٹھ کے باغیوں میں کوئی مفاہمت نہیں تھی۔ میرٹھ کے باغیوں نے شکایت کی کہ دلی والے مقامی خزانے کو لوٹ کر خود امیر ہو گئے ہیں جب کہ وہ ہر طرح کی ضرورتوں کے لیے محتاج ہیں۔

برٹش سرکار کی طرف سے اس اچانک ہونے والے واقعات کی پیش بندی نہ کیے جانے اور تیاریوں کی کمی کے سبب ان باغیوں اور ان کے رہنماؤں کو لمبی چھوٹ مل گئی۔ 12/ مئی سے لے کر جس دن دلی پر قبضہ کیا گیا' 8/ جون تک جب بادلی کی سرائے میں جنگ ہوئی اور رج پر قبضہ پالیا گیا' بغاوت کے ان رہنماؤں کو اتنا وقت مل گیا تھا کہ وہ اپنے حالات کو درست کر لیتے اور ہونے والے حملوں سے اپنے بچاؤ کی تدبیر کر لیتے۔ لیکن انہوں نے اس موقع کو کھو دیا۔ اور جون کے مہینہ میں سپاہیوں میں خود کئی گروپ بن گئے۔ تاجر پیشہ لوگ ملٹری کے دشمن ہو گئے تھے۔ اور بادشاہ اپنی رعایا کو شہزادوں کی زیادتی سے محفوظ رکھنے کی بے کار کوشش کرتا رہا۔

جنرل آنسن کمانڈر انچیف کی ان دنوں صحت ٹھیک نہیں تھی' جب یہ بغاوت پھیلی وہ ہمالیہ کی اونچی پہاڑیوں پر اپنی قوم کے بیکار لوگوں کی طرح تفریح اور آرام کے لیے گیا ہوا تھا۔ برٹش فوجیں گرمیوں کے مقام دگشائی' کسولی اور سہاتو میں تعینات تھیں۔ جان لارنس پنجاب کے کمشنر مری سے لوٹتے ہوئے راولپنڈی میں مقیم تھے۔ جب برقی تار کے ذریعہ اس بغاوت کی خبر اسے ملی تو اس نے لاہور اور پیشاور میں اپنے ہم منصب لوگوں سے رابطہ کیا۔ آنسن نے دگشائی کے فوجیوں کو حکم دیا کہ وہ میدانی علاقوں میں جانے کے لیے تیار رہیں۔ دہرہ دون کے گورکھا رجمنٹ سے میرٹھ جانے کے لیے کہا گیا۔ انبالہ کے سپاہی تذبذب کے شکار تھے۔ لیکن آنسن وہاں 16/ تاریخ کو پہنچ گیا۔ اگر دلی پر فوری طور پر قبضہ پایا جا سکا تو سارے ہندوستان کو بچایا جا سکتا تھا۔ لارنس نے آنسن کو تابڑ توڑ خط لکھے کہ وہ جلدی کرے لیکن آنسن کی بھی اپنی مجبوریاں تھیں۔ اسے آنے جانے کے وسائل مہیا کرنے تھے اور ساتھ میں اسلحہ اور خیموں کی مزید تعداد کے ساتھ

ہی رسد کا انتظام اور ایسی توپوں کا بھی انتظام کرنا تھا جنہیں لے کر وہ اس حصار بند شہر تک پہنچ سکے جو سات مربع میل میں پھیلا ہوا تھا۔ اور جس کی حفاظت بہترین برٹش افسر ان کی تربیت یافتہ فوج کر سکے۔ دلی کے قلعہ کی دیواریں ایسی نہیں تھیں جو بگل بجتے ہی گر جاتیں۔ بہادر سے بہادر سپاہی بھی حفاظتی انتظام کی اس وقت اَن دیکھی نہیں کر سکتا تھا جب پورے ہندوستان کی قسمت داؤں پر لگی ہوئی تھی۔ اگر فوری طور پر کئے جانے والے اقدامات سے غیر مطمئن لوگوں کے دلوں میں ہیبت پیدا کی جا سکے کیونکہ ان میں شکست سے وہ بدبختی اور شکست خوردگی پیدا ہوئی جو پورے برٹش حکومت کو متزلزل کر دے گی۔ کیونکہ دور دراز کے اسٹیشنوں کے بہت سے افسروں کا یہ خیال تھا کہ باقی ماندہ ہندوستان کی عام رعایا کی ناکہ بندی کر دی گئی ہے۔ اس لیے آنسن کو بہت سوچا سمجھا قدم اٹھانا تھا۔ اس نے اپنے کو اور نہ اپنے افسروں کو آرام دیا لیکن سپاہی کی حیثیت سے وہ اپنی ذمہ داری جانتا تھا کیونکہ وہ اپنے سویلین حکام کے کہنے سے اتنی جلد بازی نہیں کر سکتا تھا جو اپنی لاعلمی کی بدولت فوجیوں کی مشکلات کو سمجھ نہیں رہے تھے اور نہ یہ سمجھ رہے تھے کہ ایک دوسری ناکامی کے سیاسی نتائج کیا ہوں گے۔

جلد ہی اس کا بھی موقع مل گیا کہ لوگ سمجھ سکیں کہ برٹش عزائم اب کمزور پڑ رہے ہیں۔ گورکھا ناصری رجمنٹ شملہ کے نزدیک جو لوگ تعینات تھے' پہاڑی میں مقیم سبھی فوجیوں کی طرح انہیں بھی فوری طور پر انبالہ جانے کے لیے کہا گیا۔ لیکن ابھی ان کی بقایا قوم کی ادائیگی نہیں ہوئی تھی اور نہ ان کی عدم موجودگی میں ان کے بیوی بچوں کی حفاظت کا کوئی انتظام کیا گیا تھا اس لئے وہ اس وقت تک آگے بڑھنے کے لیے تیار نہیں تھے جب تک انہیں یہ اطمینان نہ دلایا جاتا کہ ان کی غیر حاضری میں ان کے کنبہ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ ہر طرف غصہ کی لہر تھی۔ لوگ سخت زبان بول رہے تھے۔ بدنظمی کے ایسے اشارے بھی مل رہے تھے جنھیں دیکھ کر خطرہ تھا کہ کہیں یہاں بھی بغاوت نہ پھیل جائے۔ پہاڑوں پر رہنے والی یورپین آبادی نے سنا کہ گورکھا شملہ کی طرف جا رہے ہیں۔ وہاں فوراً بدنظمی پھیل گئی۔ وہاں کا ڈپٹی کمشنر لارڈ ولیم نرم مزاج کا آدمی تھا۔ غیر محفوظ عورتوں بچوں سے کہا گیا کہ وہ بینک کے احاطے میں داخل ہو جائیں جہاں ان کی حفاظت کی جا سکے۔ لیکن بہت سے لوگ ہمت ہار گئے اور فوراً اس غیر محفوظ شہر سے دور دراز کے علاقوں میں چلے گئے۔ بدقسمتی سے فوج کے کچھ افسروں کا رویہ بھی اس سے مختلف نہیں رہا۔ انہوں نے تو کوئن تھال کے راجہ کے شملہ محل کو بھی غیر محفوظ سمجھا اور اس کے دیہات کے محل میں چلے گئے۔ جن لوگوں نے راجہ سنسار سین کے دیہی محل میں پناہ لی ان میں میجر جنرل پینی' لیفٹیننٹ جنرل کیتھ ینگ' گریٹ ہیڈ' تھوس' کوئن اور کولیسر' چار کیپٹن اور تین لیفٹیننٹ شامل تھے۔ لیکن گورھا فوجیوں نے کچھ ایسا نہیں کیا اور پناہ گزیں اپنے گھروں میں واپس آ گئے۔ گریٹ ہیڈ نے بعد میں دلی کے محاصرہ میں بڑا نام کمایا اور ناصری رجمنٹ نے بھی سہارنپور ضلع میں نام کمایا جہاں بعد میں ان سب کو ملازمت میں لے لیا گیا۔ اس معاملے میں انہوں نے بھروسہ کیا اور انہیں بھروسہ ملا۔

اس سے پہلے کہ وہ مشرق کی طرف بڑھتا اس نے ہوٹ سے رابطہ قائم کرنا اور میرٹھ سے مواصلاتی سلسلہ جوڑنا ضروری سمجھا۔ اس کا منصوبہ تھا کہ میرٹھ کی فوجیں اس سے باغپت میں ملیں اور تب مجموعی فوج دلی کی طرف پیش قدمی کرے۔ کچھ سکھ گھوڑ سواروں کے ساتھ لیفٹیننٹ ہاٹسن کمانڈر انچیف کا آرڈر لے کر میرٹھ کی طرف گیا۔ لیکن اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ کیپٹن فورڈ تھرڈ کیویلری کے بیس سواروں کو لے کر انبالہ کے لیے پہلے جا چکے ہیں۔ ان دونوں افسروں کو راستے میں کسی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ پٹیالہ کے راجہ' جیند کے راجہ اور اور کرنال کے نواب نے برٹش حکومت کا وفادار بنے رہنے کا فیصلہ کیا۔ اور اپنی حکومتوں کے مال و متاع کو برٹش حکومت کو پیش کرنے کا بھی فیصلہ کیا۔ ان کو اہم ذمہ داری انبالہ سے دلی تک کی سڑک کی حفاظت سونپی گئی تھی۔ اس طرح سے لڑائی کے خاص میدانوں سے مواصلات کو کھلا رکھا گیا جبکہ برٹش فوج مسلم دارالحکومت سے نبرد آزما تھی۔ لیکن آنسن کی قسمت میں دلی پہنچنا نہیں تھا۔ کیونکہ برٹش فوجیں بھی شمالی ہند کے میدانی علاقوں سے مارچ کرنے کی عادی نہیں تھیں۔ خصوصاً گرمیوں کے زمانے میں۔ اس لیے ان میں سے زیادہ تر دن کے بڑے حصے میں آرام کرتیں اور صرف رات کے وقت مارچ کرتیں۔ کیمپ میں صفائی ستھرائی کی حالت بھی اطمینان بخش نہیں تھی اور ہیضے اور لُو کی وجہ سے موت عام ہو گئی تھی۔ 27/ مئی کو آنسن جو پہلے سے ہی بیمار اور فکر مند تھا اس کی ہیضے کی وجہ سے موت ہو گئی اور جنرل سر ہنری برنارڈ اس کی جگہ کمانڈر انچیف مقرر ہوئے۔

برنارڈ کریمین جنگ کا ماہر تھا۔ وہ ہندوستان میں نیا نیا وارد ہوا تھا۔ میرٹھ کی فوج بریگیڈیر وِلسن کے تحت اس سے باغپت میں منصوبے کے مطابق ملی۔ ان کی باغیوں کے ساتھ دو کامیاب جنگیں غازی الدین نگر اور ہنڈن ندی پر دلی پہنچنے سے پہلے ہو چکی تھیں۔ 8/جون کو ان کا مقابلہ باغیوں کی فوج سے دلی سے پانچ میل دور بادلی کی سرائے میں ہوا۔ اس جنگ میں باغیوں کی شکست ہوئی اور 26 توپیں ان سے چھین لی گئیں۔ گرچہ ان کی تعداد زیادہ تھی اور وہ میدانی علاقہ میں تھے لیکن مہارت کے سبب فتح ہوئی۔ جبکہ انگریزوں کی طرف سے کل چار افسر مارے گئے اور کئی زخمی ہوئے۔ جو مارے گئے ان میں کرنل چسٹر بھی تھا جو آرمی کا ایڈجوٹنٹ جنرل تھا۔ اسی دن فاتح فوج آگے بڑھی اور اس نے رج پر قبضہ کر لیا۔ وہ چھوٹی پہاڑیاں جو دلی کا حصار کرتی ہیں۔ سپاہیوں کے پاس عزم کی کمی نہیں تھی لیکن ان کے پاس کوئی ایسی فوجی صلاحیت نہیں تھی جو ان کی رہنمائی کرتی ورنہ رج کو بغیر کسی مزاحمت کے یوں نہ چھوڑ دیتے۔ برٹش فوج 11/ مئی کو دلی کے باہری علاقوں سے گزرتے ہوئے 8/جون کو کینٹونمنٹ پہنچی۔ صرف ایک مہینے میں۔

رج شہر کے شمالی علاقے میں تھا اور شہر کے تین دروازے اس علاقے میں تھے۔ جنرل برنارڈ کی فوج کم تھی۔ اس لیے انہوں نے مزید حملہ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ 1857ء میں نہ تو دلی شہر اور نہ رج کے پاس دشمن فوج پر کوئی قبضہ کیا گیا اور متھرا روڈ تو ہمیشہ کھلی رہی اس لیے اودھ اور روہیل کھنڈ جھانسی سے لے کر کانپور تک اور نصیر آباد سے نیچ تک کی باغی فوجیں دلی میں آ کر ان کی

تعداد میں اضافہ کرتی رہیں۔ جبکہ دوسری طرف برٹش فوج کے صدر مقام انبالہ سے مواصلاتی نظام کو نہ تو کوئی خطرہ پیدا ہوا اور نہ ان کی سپلائی کاٹنے کا کوئی انتظام کیا گیا۔ پہلا کام جو برنارڈ نے کیا وہ رج پر حملے کے لیے مناسب مقام کا انتخاب تھا۔ رج کے بالکل آخری کنارے پر جہاں اس کا ڈھلان جا کر سبزی منڈی سے مل جاتا ہے 'ایک پتھر کی عمارت تھی جسے ہندو راؤ کا مکان کہا جاتا ہے' اس مکان کا مالک جو کا گل کے گھنگے خاندان کا فرد تھا اور دولت راؤ سندھیا کا رشتہ دار تھا' وہ مر چکا تھا اور اس مکان میں کوئی کرایہ دار بھی نہیں تھا۔ یہاں میجر اِیڈ کو گورکھا فوج کے ساتھ تعینات کیا گیا۔ پرانے زمانے میں اس مکان میں بڑی بڑی تقریبات ہوا کرتی تھیں۔ کیونکہ اب اس نئے مالک کو کوئی مالی دشواری نہیں ہو رہی تھی اسے احساس بھی نہیں تھا کہ اس کی موت کے بعد اس مکان کی دیواریں گولیوں اور توپوں کی وجہ سے گر جائیں گی اور اس کا مکان برٹش دستوں اور باغی فوجوں کے درمیان موت وزیست کا تماشہ دیکھے گا۔ بائیں طرف فلیگ اسٹاف ٹاور جو دو منزلہ گول عمارت تھی جو بہترین آبزرویشن پوسٹ ہو سکتی تھی' اس لیے فوج کی ایک پکٹ یہاں رکھی گئی تھی۔ اس ٹاور کے نزدیک ہی ایک پرانے پٹھان کی مسجد تھی اور ہندو راؤ کے مکان کے پاس ہی ایک آبزرویٹری تھی۔ یہ دونوں عمارتیں پکٹ پوسٹ کے کام آئیں۔ فلیگ اسٹاف ٹاور کے پیچھے ندی کے کنارے سر مٹکاف کی آرام گاہ تھی۔ جس کے سائبان سے فوجی برٹش لیفٹ ونگ کو تنگ کر سکتے تھے۔ لڈلو کیسل جوائنٹوں کی عمارت تھی' اس کا بھی استعمال برٹش فوج کے خلاف کیا جا سکتا تھا۔ لیکن سپاہیوں نے ان کا بھی استعمال نہیں کیا۔ یہ ہندو راؤ کا مکان اور برٹش کی داہنی فوج تھی جنہیں حملہ آوروں کا زیادہ مقابلہ کرنا پڑا۔

برنارڈ نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ شہر پر فوراً حملہ کیوں نہ کر دے جبکہ دشمن کی فوجیں اس کے لیے بالکل تیار نہ تھیں۔ رات اندھیری تھی اور یہ امید کی جا رہی تھی کہ باغی سپاہی جو پے در پے تین شکستوں سے دوچار ہو چکے تھے' کوئی خاص مزاحمت نہیں کریں گے۔ اس طرح مغل دارالسلطنت پر قبضہ کیے جانے سے جو سیاسی فائدے ہوں گے ان کے سامنے دوسری باتوں کی کوئی حقیقت نہیں اور سر جان لارنس' جنرل برنارڈ سے لگاتار کہتے رہے کہ فوری طور پر یہ شجاعت بھرا کام کیا جائے۔ رابرٹ کلائیو کے عزم اور اس زمانے کے دوسرے انگریز بہادروں کی مثالیں بار بار دی جاتی رہیں اور یہ کہا جاتا رہا کہ دلی پر فوری طور پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیا جائے۔ جب ایک بار دلی پر قبضہ ہو جائے گا تو دوسرے مقام پر ہونے والی بغاوت کو رفتہ رفتہ کچل دیا جائے گا۔ یہی احساسات رج کے کیمپ میں رہنے والے دوسرے جونیئر افسروں کے بھی تھے۔ جن کو جنگ کا ابھی کوئی تجربہ نہیں تھا۔ انجینئرس سے ولفورس گریٹ ہیڈ نے بھی ایسا ہی منصوبہ بنایا تھا جنہیں برنارڈ نے بہت سوچنے کے بعد منظور کر لیا۔ چونکہ اسے ہندوستان کا کوئی تجربہ نہیں تھا اس لیے فیصلہ لینے میں وہ ہچکچا رہا تھا۔ کیونکہ وہ اس بات کو جانتا تھا کہ سیاسی ضرورتیں ملٹری ضروریات کا خیال نہیں رکھتیں اور ایسے نازک موقع پر سیاسی ضرورتیں حاوی ہو جاتی ہیں۔ گریٹ ہیڈ کے

منصوبے کے مطابق رات کے اندھیرے میں شہر کے دو دروازوں کو اُڑا کر شہر پر اچانک قبضہ کرنا تھا۔ اس منصوبے کی کامیابی راز کو راز بنائے رکھنے پر منحصر تھی۔ جب دو ٹکڑیاں اس بات کے لیے تیار ہو گئیں تو بریگیڈیر گریوز' جو ان کی کمان کر رہا تھا صرف زبانی حکم پر آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ وہ جنرل کے خیمے میں گیا اور جب برنارڈ نے اس مہم کی کامیابی کے بارے میں پوچھا تو اس نے بہت ہمت کے ساتھ جواب دیا کہ یہ تو صحیح ہے کہ اچانک حملہ کر کے شہر پر قبضہ کیا جا سکتا ہے لیکن یہ دوسری بات ہے کہ یہ قبضہ کب تک بنا رہتا ہے۔ کیمپ میں جتنے لوگ تھے ان میں سے گریوز سب سے بہتر طریقے سے دلی کو جانتا تھا اور اس لیے اس کے مشورے کو آسانی سے رد بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چاہے کچھ بھی ہو اس تاخیر کی وجہ سے منصوبے کے تحت کامیابی کا جو چانس تھا وہ ختم ہو گیا کیونکہ اب اچانک حملہ کرنا ممکن نہیں تھا۔ صبح کی پو پھٹ رہی تھی اس لیے اس بہادری کے کام کو روکنا پڑا۔ گرچہ اس وقت اس سے بہت ناامیدی ہوئی اور لوگوں نے چہ میگوئیاں بھی کیں لیکن بعد میں احساس ہوا کہ برنارڈ نے عقلمندی کا کام کیا تھا۔ کیونکہ اگر اس منصوبے میں ناکامی ہوتی تو بہت بڑی شکست ہوتی۔ راٹن کا خیال ہے کہ دلی پر اس وقت بہت کم فوج اور بہت کم سامان کے ساتھ حملہ کیا جانا بیوقوفی کا کام ہوتا "میرا خیال ہے کہ کوئی بھی جنرل اس طرح کا بیوقوفی کا کوئی بھی کام نہیں کرتا اگر دلی میں ہندوستانی کی جگہ برٹش فوج ہوتی۔" اس کا کہنا ہے "جس دشمن سے ہمارا مقابلہ تھا' اگر وہ ہوش و حواس سے عاری ہوتی اور غصے سے پاگل ہو گئی ہوتی تو بھی کیمپ سے آگے اور پیچھے سے حملہ کرنا جو ایک مدت تک چلتا رہتا اور چاہے کتنی بھی کمک پہنچ جاتی اور چاہے برٹش فوج کی نمایاں شجاعت کا ہم کتنا بھی خیال کریں فوجی طویل مدت تک چلنے والے اس محاصرے سے تھک جاتے۔ کچھ اس طرح کے خیالات کرنل کیتھ ینگ کے بھی تھے۔ جس کا کہنا ہے کہ اگر جنرل نے دوسروں کی رائے سے مجبور ہو کر فوج کی اسی ٹکڑی کے ساتھ حملہ کیا ہوتا اور کسی وجہ سے یہ حملہ ناکام ہو جاتا تو نہ صرف ہماری فوج کو خدا حافظ کہنا پڑتا بلکہ ہندوستان کو بھی۔ حد تو یہ ہے ہاروے گریٹ ہیڈ کا بھی یہ کہنا تھا "وہ موقع ختم ہو چکا جو ہم ۱۲ر تاریخ کی رات میں کرنے والے تھے۔ ملٹری کمان کا ہر شخص مزید کمک پہنچنے تک انتظار کرنا چاہتا تھا۔"

اگر برٹش افسروں نے رج پہنچنے کے تین دنوں کے اندر شہر پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنایا تھا تو باغیوں کی فوج بھی چپ نہیں بیٹھی تھی۔ ان کے پاس نہ تو ہمت اور شجاعت کی کمی تھی اور نہ ہی ایسا تھا کہ وہ ساری صلاحیت سے عاری تھے۔ 9ر جون کو بادلی کی سرائے کے ایک دن بعد انہوں نے ہندو راؤ کے مکان پر حملہ کیا۔ یہ تو انگریزوں کی خوش قسمتی تھی کہ اسی دن ڈالی کے گائیڈ پیشاور کے نزدیک مردان سے تقریباً 580 میل کا سفر طے کر کے وہاں پہنچ گئے اور سہ پہر کے وقت باغیوں کے حملے کو ناکام کر دیا۔ دوسرے دن باغیوں نے دشمن کی پچھلی فوج پر حملہ کیا اور انگریزوں نے اس کے بدلے مٹکاف ہاؤس پر دوبارہ قبضہ بحال کر لیا اور وہاں اپنی فوج کی ٹکڑی تعینات کر دی۔ اس طرح سے بائیں ہاتھ کی ان کی فوجی ٹکڑی دریا تک پہنچ گئی اور مضبوط باندھ بن گئی۔

منکاف ہاؤس پر دوبارہ قبضہ کے لیے پھر خطرناک جنگ ہوئی۔ باغی سپاہیوں نے اس کے بعد عید گاہ کے اندر اپنی فوج تعینات کی جو ہندو راؤ کے گھر کے پاس ہی تھی۔ برنارڈ کو فوراً ہی یہ خیال ہوا کہ اگر یہ باغی سپاہی اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو داہنی طرف سے ان کی وہ پوزیشن کمزور ہو جائے گی جسے ہر قیمت پر روکنے کا اس نے عہد کیا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ باغیوں کے پاس کوئی ایسا رہنما نہیں تھا جو انہیں مشورہ دے سکتا۔ جب انہیں تھوڑی سی فتح حاصل ہوئی تو ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے دیرپا کیسے بنائیں۔ 19/ تاریخ کو فوج کے عقبی حصے کو خطرہ پیدا ہو گیا۔ ایک وقت ایسا آیا کہ شام کی آرٹیلری تقریباً شکست کھا چکی تھی۔ بریگیڈیر ہوپ گرانٹ بری طرح زخمی ہو گئے تھے۔ اور ان کی جان کو ایک بہادر مسلح سوار نے بچایا تھا۔ سورج ڈوبنے لگا لیکن اس وقت تک جنگ کا فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ سپاہی یہ نہیں سمجھ سکے کہ اگر وہ کچھ دیر اور ٹکے رہتے تو دشمن کی فوج بری طرح پسپا ہو گئی ہوتی اور پنجاب سے برٹش مواصلاتی ذرائع بالکل برباد ہو گئے ہوتے اور ساری برٹش فوج رج پر محصور ہو کر رہ جاتی۔ جب دوسرے دن صبح انگریز پھر لڑنے کے لیے آئے تو انہوں نے دیکھا کہ سارے باغی رات کے اندھیرے میں غائب ہو گئے۔ رج کے اس طرف بہت سے مذہبی انگریز یہ سمجھ رہے تھے کہ ان کا خدا ان کے ساتھ ہے اور اسی لیے وہ باغیوں کو گمراہ کر رہا ہے۔ تین دنوں کے سکون کے بعد سپاہی دوبارہ لڑنے کے لیے آئے اور یہ دن کلاسیکی جنگ کی صد سالہ سالگرہ کا دن تھا۔ نجومیوں نے اس بات کی پیشن گوئی کی تھی کہ کمپنی کی حکومت کلائیو کی فتح کے سو سال بعد ختم ہو جائے گی۔ اس لیے بہت ہیبت ناک جنگ لڑی گئی یہ سوچ کر ان کے ستارے بھی ان کے ساتھ لڑ رہے ہیں۔ میجر ریڈ، جن کی پوسٹ کو بھی خطرہ پیدا ہو گیا تھا لکھتے ہیں۔ "کوئی بھی آدمی اس سے بہتر طریقے سے نہیں لڑ سکتا تھا۔ انہوں نے ہمارے اپنے آدمیوں پر بار بار حملے کیے۔ رائفل پر حملہ کیا اور ایک وقت ایسا آگیا کہ ہماری فوج شکست کھا جاتی۔ وہ شہر سے بھاری توپیں اور بندوقیں چلا رہے تھے اور چاروں طرف سے ہمیں بارود کے دھوؤں نے گھیر لیا تھا لیکن آخر کار تعداد کے مقابلے میں تکنیک اور بھیڑ کے مقابلے دماغ کی فتح ہوئی۔ گریٹ ہیڈ کا یہ یقین تھا کہ سپاہیوں کا بہت زیادہ نقصان ہوا۔ رج کے کیمپ میں بھی دشمنوں کی بہت زیادہ جانی نقصان کی خبر تھی۔ لیکن راٹن کا کہنا ہے کہ ان کے مہلوکین کی تعداد کو بہت زیادہ بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے۔ میرا یقین ہے کہ حالات ان کے لیے اتنے بُرے نہیں تھے جتنے کہ ہمارے لیے اور جہاں تک نقصانات کا سوال ہے، وہ ان کے زیادہ ہوئے اور ہمارے کم۔ حقیقت یہ ہے کہ نو ہی دن کے اندر سارے اسپتال زخمیوں سے بھر گئے اور مزید زخمیوں کو میرٹھ منتقل کرنے کا انتظام کیا گیا۔ برٹش فوجیوں کو نہ صرف اس ملک کے مقامی لوگوں سے بلکہ دشمن کے جغرافیائی حالات کا بھی سامنا تھا۔ ان کے اتنے ہی لوگ ہیضہ اور پیچش سے مرے جتنے کہ تلوار اور بندوقوں سے۔

24/ تاریخ کو نیول چیمبر لین کیمپ میں آئے۔ ان کی پہلی تقرری پنجاب موبائل کالم میں ہوئی تھی اور بعد میں تبادلہ دلی کر دیا گیا۔ کہ وہ ایڈ جوٹنٹ جنرل کا جو عہدہ جنرل چسٹر کی موت کی

دلّی بغاوت کے معاملوں کا فیصلہ کرنے کے لئے قائم عدالت کا آئین

وجہ سے خالی ہوا تھا، اسے پُر کریں۔ اس کی آمد سے رج پر موجود ان کے آدمیوں میں ایک نیا جوش اور ولولہ پیدا ہو گیا اور یہ امید ہو چلی کہ شہر پر جلد ہی قبضہ پالیا جائے گا۔ گریٹ ہیڈ اب بھی اپنے منصوبے پر کام کر رہا تھا اور اس کے بھائی ہاروے نے اسی دن اپنی بیوی کو خط میں لکھا۔ چیمبرلین یہاں آگیا ہے اور اس کی آمد سے یہاں ہر آدمی خوش ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ جنرل ول بی کے تصورات کو اب زیادہ تقویت ملے گی۔ جنرل برنارڈ ہمیشہ ان کے بارے میں سوچتا رہا۔ لیکن ان سے زیادہ تعاون نہیں ملا۔ چیمبرلین کے ساتھ ایک نوجوان انجینئر لیفٹیننٹ الگزینڈر ٹیلر بھی آیا تھا جسے ستمبر میں آخری حملے کی تیاری کے منصوبے کو کرنل بیرڈ اسمتھ کو بتانا تھا۔ بیرڈ اسمتھ کو بھی رڑکی سے بلا لیا گیا تھا۔ وہ خود جنگ میں شریک ہونا چاہتا تھا۔ اس لیے وہ 29/ جون کو ہی دلی کے لیے روانہ ہو گیا۔ پنجاب سے مستقل کمک پہنچتی رہی اور انگریزی فوجوں کی تعداد بڑھ کر تقریباً چھ ہزار چھ سو تک پہنچ گئی۔ وقت بھی نہایت مناسب اور سازگار تھا۔ منصوبہ بھی تیار تھا۔ کیمپ میں لوگوں کی ہمت میں بھی کمی نہیں تھی۔ ہڈسن کو انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ کا انچارج بنایا گیا تھا۔ کانا سید علی نہ صرف جاسوسی بلکہ مخالف فوج میں نا اتفاقی پیدا کرنے میں لگا ہوا تھا۔ برنارڈ کو یہ معلوم ہوا کہ باغیوں نے خود بھی انگریز فوجوں پر 3/ جولائی کو حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا ہے جس دن کا انگریزوں نے بھی پروگرام بنایا تھا۔ اس منصوبے کی کامیابی اس بات پر منحصر تھی کہ باغیوں کو اچانک دبوچ لیا جائے اور اگر وہ اس بات کے لیے تیار نہیں ہوتے تو پھر شہر پر اچانک قبضہ پانا ناممکن تھا اور برنارڈ کوئی بھی خطرہ نہیں مول لینا چاہتا تھا۔

اس دوران دلی میں باغیوں کی فوج کو بھی کافی کمک پہنچ گئی۔ بریلی کی فوجیں دلی میں پہلی جولائی کو پہنچ چکی تھیں۔ 2/ جولائی کو اس کے کمانڈر بخت خاں نے بادشاہ کو سلامی دے کر اپنی خدمات انہیں پیش کیں۔ وہ چالیس سال سے زیادہ تجربہ کار آرٹیلری صوبیدار تھا اور افغان کی پہلی جنگ میں بھی شریک ہوا تھا۔ گرچہ 1857ء میں وہ جوانی کا جوش نہیں تھا اور گھوڑ سواری بھی مشکل سے کرتا تھا۔ جیون لال کے مطابق "وہ ایک شریف گھرانے سے تعلق رکھتا تھا اور اسی خاندان سے اس کی وراثت چل رہی تھی جس خاندان سے دلی کے بادشاہ کی۔" ایک دوسری جگہ پر جیون لال اس کے بارے میں لکھتا ہے "وہ لکھنؤ کے نزدیک سلطانپور کا رہنے والا تھا اور اودھ کے شاہی خاندان سے اس کا تعلق تھا۔" کیپٹن ویڈی نے کچھ اور باتیں سنیں۔ اس نے کہا کہ بخت خاں بہت لمبا چوڑا اور قوی الجثہ آدمی تھا۔ "پانچ فٹ دس انچ لمبا چوالیس انچ سینہ ہندو خاندان سے تعلق رکھنے والا لیکن جاگیر حاصل کرنے کی لالچ میں مذہب تبدیل کرنے والا، بہت نکلی ہوئی توند اور موٹی جانگھوں کی وجہ سے اچھا گھوڑ سوار نہیں تھا لیکن بہت چالاک اور عیار شخص تھا۔" دوسرے افسروں نے بھی اس کے بارے میں لکھا ہے کہ "وہ بہت لحیم شحیم آدمی جو انگلش سوسائٹی کا دلدادہ تھا اور ساتھ ہی ذہین بھی۔ بخت خاں کی بادشاہ سے ملاقات ہوئی تھی اور بادشاہ نے اسے مرزا مغل کی جگہ باغی فوجیوں کا کمانڈر انچیف مقرر کیا تھا۔ اسی تاریخ کو شہزادے کو ایڈ جوٹنٹ جنرل

مقرر کیا گیا۔ یقیناً شہزادے کو اس سے کوفت ہوئی ہوگی کہ ایک نووارد کو اس کی جگہ پر کمانڈر انچیف بنادیا گیا۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بخت خاں کے اندر وہ صلاحیتیں نہیں تھیں جو ایک کمانڈنگ افسر میں ہونی چاہئیں۔اس نے اپنے فوجیوں کو چھ مہینے کی تنخواہ پیشگی دے رکھی تھی اور بادشاہ کو یہ یقین بھی دلادیا تھا کہ وہ اس سے اس سلسلے میں مزید کوئی رقم نہیں مانگیں گے۔بات بھی کچھ ایسی تھی کہ وہ بریلی سے اپنے ساتھ بہت زیادہ روپے لے کر آئے تھے اور کچھ وقتوں کے لیے بادشاہ کی مالی مشکلات کا حل نکل آیا تھا۔

بادشاہ کے سامنے اور بھی بہت سی مشکلات تھیں۔ بنیادی طور پر وہ ایک امن پسند آدمی تھے۔وہ ملٹری کی بڑھتی ہوئی بدعنوانیوں پر کوئی قابو نہیں رکھ سکے اور اسی لیے انہوں نے بخت خاں سے کہا تھا کہ وہ شہر میں نظم وضبط برقرار رکھنے کے لیے ہر مناسب تدبیر کریں۔23/جون کو ہوئی شکست سے شہر میں افراتفری پھیل گئی اور دکانداروں نے احتیاطاً اپنی دکانیں بھی بند کردیں۔ لیکن اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی تھی کیونکہ فوجیوں کے لیے ضرورت کے سامان فراہم کرنا ضروری تھا ورنہ شہر میں اور زیادہ بے چینی پھیل جاتی۔اسی لیے بادشاہ نے جبراً دکانوں کو کھولے جانے کا حکم صادر کیا۔ لیکن ایک بار ایسا ہونے کے بعد سے انہیں امید تھی کہ فوجی شہر والوں سے کوئی مطلب نہیں رکھیں گے اور جن چیزوں کی انہیں ضرورت ہوگی اسے جائز طریقے سے قیمتاً خریدیں گے۔ لیکن سپاہی نظم وضبط کے قائل نہیں تھے۔14/تاریخ کو جمنا داس کی دکان لوٹ لی گئی کیونکہ وہ زیادہ قیمت پر آٹا فروخت کررہا تھا۔20/تاریخ کو فوجیوں نے بلی محلہ میں فساد برپا کیا اور کئی گھروں کو لوٹ لیا۔ پہاڑ گنج کا علاقہ بھی اس کی زد میں آگیا اور دو شہریوں نے بادشاہ سے شکایت کی کہ فوجیوں نے بغیر قیمت ادا کئے دکانوں سے سامان لوٹا ہے اور غریب لوگوں کے گھروں میں گھس کر ان کا بستر اور لکڑی تک اُٹھالے گئے۔ چاہے کتنی بھی کمزوریاں رہی ہوں' بہادر شاہ نے پوری ایمانداری کے ساتھ رعایا کے تئیں اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی کوشش کی اور باوجود یہ کہ وہ ضعیف اور بیمار تھا' اس نے اپنی ذمہ داریوں سے کبھی کوئی لاپروائی نہیں برتی۔ مستقل ملنے والی شکایتوں سے پریشان ہو کر اس نے 27/جون کو مرزا مغل کو ایک سخت خط لکھا جو اس وقت باغی فوجیوں کے کمانڈر انچیف تھے اور ایک خط مرزا خیر سلطان کو بھی لکھا جو باغی فوج میں کرنل کے عہدے پر تھے۔ "جب سے فوج یہاں آئی ہے اور شہر میں بسنے لگی ہے' لوگوں کے ذریعہ روز عرضداشتیں پیش کی جارہی ہیں' جن میں فوجیوں کی زیادتیوں کی شکایتیں ہوتی ہیں۔ لیکن بادشاہ نے شہر میں امن وامان برقرار رکھنے کے لیے جن شہزادوں کو ذمہ داریاں دی تھیں وہ خود کو بھی دوسروں کی جائداد ہڑپ کرنے کے لالچ سے محفوظ نہیں رکھ سکے۔ ایک بے تاریخ کی عرضداشت جو دو تاجروں جگل کشور اور شیو پرساد نے پیش کی تھیں' سے معلوم ہوتا ہے کہ عوام کو زیادہ پریشان شہزادے اور ان کے کارندے کررہے تھے۔ شاہی فوجیں اب بھی ان کے گھروں کو لوٹنے کے لیے آیا کرتیں اور ہر وقت انہیں گرفتار کرنے کی دھمکی بھی دیتیں۔ 4/جولائی کو جس

سے دو دن قبل صوبیدار بخت خاں کو کمانڈر انچیف بنایا گیا تھا' ایک شخص احسان الحق نے شکایت کی کہ بادشاہ کے پوتے مرزا ابو بکر نے بہت سی چیزیں لوٹ لی ہیں مرزا مغل کو حکم دیا گیا کہ وہ لوٹی املاک کو واپس کرائیں۔ دوسرے دن اس سے بھی ایک سنگین شکایت اس شہزادے کے خلاف ایمانی بیگم جیسی شخصیت نے داخل کی جو کہ بہادر شاہ اول کی بہو تھیں۔ انہوں نے اپنی شکایت میں کہا "کہ گذشتہ شب ابو بکر نشے کی حالت میں ان کے گھر پر بہت سے سواروں کے ساتھ آیا اور انہیں پکڑ لیا اور اپنی رائفل اور پستول سے کئی گولیاں چلائیں اور محلہ کے بہت سے لوگوں کو مارا پیٹا بھی۔ جب پولیس آئی تو ابو بکر نے کوتوال پر تلوار سے حملہ کیا اور انہیں پکڑوا لیا' انہیں قید کر لیا اور ان کی بے عزتی کی اور آخر کار ان کے گھر کو لوٹ لیا۔" بادشاہ کو بہت افسوس ہوا۔ بادشاہ نے مجرم کو فوج کے عہدے سے معطل کر انہیں قید کرنے کا حکم صادر کیا۔ لیکن شہزادے کے لیے اس سزا سے بچنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ بادشاہ نے شہزادوں کو ذلیل بھی کیا اور انہیں اپنی نظروں سے دور بھی کر دیا۔ محلوں کے سبھی سرداروں کو یہ اطلاع دی گئی کہ شہزادوں کو عام رعایا کی طرح ہی سمجھا جائے۔ اور اگر وہ کوئی غلط کام کرتے ہوئے پکڑے جائیں تو انہیں عام آدمیوں کی طرح ہی سزا دی جائے گی۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بادشاہ کی ناراضگی کا بھی ان بگڑے شہزادوں پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

اگر شہر کے لوگوں کو باغیوں اور شہزادوں کی وجہ سے جو ان باغیوں کو کمانڈ کر رہے تھے' تکلیف پہنچی تو گاؤں والوں کی عادت بھی کوئی بہتر نہیں تھی۔ ہمیں سید عبد اللہ کی 29/ جون 1857ء کی عرضداشت میں ملتا ہے کہ "فصلی سال 1265 میں موسم خزاں کی پوری فصل (ربیع) برباد ہو گئی ہے۔ اس سے بھی زیادہ نقصان دہ بات یہ ہوئی کہ زراعت کے تمام آلات' ہل' کنویں پر پڑی لکڑی کی منڈیر سبھی لوٹ میں فوجی اُٹھا لے گئے۔" گوجر پورے ملک کو لوٹ رہے ہیں اور تاراج کر رہے ہیں۔

جنگ کے زمانے میں سڑک پر چلنے والا آدمی امن کے دنوں کے تحفظ کی امید نہیں کر سکتا۔ لیکن عام شہریوں کو دونوں طرح سے تکلیف اُٹھانی پڑی۔ اپنے ان لوگوں کے ذریعہ بھی جو غیر ملکی حکومت کو اکھاڑ پھینکنا چاہتے تھے اور ان لوگوں کے ذریعہ بھی جو اس غیر ملکی حکومت کے وفادار تھے اور اکثر و بیشتر ان کے عزیز بھی۔ سپاہیوں کی حمایت میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہیں برٹش حکومت کے ایجنٹوں سے چوکنا رہنے کے لیے ہر طرح کی تدبیر کرنی پڑتی کیونکہ شہر کے ویرانوں کے اندر بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں تھی جو برٹش حکومت کے ایجنٹ تھے' اور شہر کا کوئی آدمی شک و شبہ سے بالاتر نہیں رہ گیا تھا۔ حد تو یہ ہے کہ بادشاہ کے بھروسہ مند حکیم احسان اللہ بھی اس شبہ سے بالاتر نہیں تھے اور انہیں بھی بلاوجہ برٹش سے ساز باز کرنے والا نہیں سمجھا گیا۔ ایک آدمی کو محل کے ایک کمرے میں سرنگ بناتے ہوئے پکڑا گیا تھا۔ بسا اوقات دولت مند اور صاحب ثروت لوگوں پر بھی جائز طریقے سے شبہ کیا گیا۔ مہاراجہ پٹیالہ انگریزوں کے گہرے

دوست تھے، دہلی کی بھی فوج مواصلاتی ذرائع کو برقرار رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اجیت سنگھ، پٹیالہ گھرانے کے ایک شہزادے، نے اس شہر میں بہت دنوں سے آنا شروع کر دیا تھا۔ انہوں نے اپنی حکومت کی تقسیم کیے جانے کی مانگ کی تھی اور اپنے بڑے یا سوتیلے بھائی سے موروثی جائیداد میں برابر کا حصہ نہ پانے پر پنشن کی ایک رقم لے کر خود سے جلا وطنی اختیار کر لی تھی۔ 10/جون کو کچھ سپاہیوں نے اس کے گھر پر حملہ کیا اور اسے قیدی بنا کر بادشاہ کے سامنے پیش کیا۔ بادشاہ نے حکیم احسان اللہ کی اس یقین دہانی پر کہ اب اجیت سنگھ اور پٹیالہ کے حکمراں کے درمیان کسی طرح کا کوئی تعلق نہیں رہ گیا ہے' بادشاہ نے انہیں رہا کر دیا۔ آرٹیلری کا ایک آدمی قلی خاں جو بادشاہ کی خدمت میں نام کما چکا تھا' اس کی بیٹری سے گولی چلائے جانے پر تین فوجی زخمی ہو گئے جو 23/جون کو سارے دن کی جنگ میں حصہ لینے کے بعد واپس لوٹ رہے تھے' اس پر انگریزوں سے مل کر سازش کرنے کا الزام لگایا گیا اور اسے قید کر لیا گیا۔ انگریزوں پر حتمی طور پر ملی ہوئی فتح سے حالات شاید بہتر ہو گئے ہوتے لیکن خوف اور شبہ نے مل کر ہر جگہ سازش کا بازار گرم کر رکھا تھا اور ہر شخص خود کو غیر محفوظ محسوس کر رہا تھا۔

گرچہ برٹش کیمپ میں لوگوں کی ہمتیں بڑھی ہوئی تھیں اور ان کے افسران ہر فکر سے آزاد ہو کر ٹہلنے پھرنے کا تصور دے رہے تھے لیکن وہاں بھی ماحول شک و شبہ سے بالاتر نہیں تھا۔ بھاری بندوقوں کے لیے گولہ بارود کی کمی تھی اور باغی فوجی جو 24 پونڈ کے گولے پھینکتے وہ کسی وجہ سے پھٹ نہ پاتے' انہیں یہ لوگ احتیاط سے جمع کرتے اور پھر انہی سے باغیوں کو مارتے۔ جیسا کہ روٹن کے بیان سے ظاہر ہے پہلے تین ہفتوں تک سرکاری فوجیوں کی تعداد میں ہوتی ہوئی کمی اور باغیوں کی بڑھتی ہوئی فوج کی وجہ سے انھیں مستقبل کی کوئی فکر نہیں تھی۔ کبھی کبھی ان کا جوش بہت بڑھ جاتا جب وہ سنتے کہ سر ہیو وہیلر ایک بڑی فوج کے ساتھ مغرب کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ کبھی کبھار ایسی بھی افواہیں سننے میں آتیں کہ وہیلر کالون کی جگہ پر شمال مغربی صوبے کے لیفٹیننٹ گورنر بنائے جا رہے ہیں۔ وہ ہندوستانی فوجیوں کی وفاداری پر مکمل طور پر بھروسہ نہیں کر سکتے تھے' جواب بھی ان کی خدمت میں رہ کر اپنی جان کی قربانی دے رہے تھے۔ دشمن کی فوج میں نا اتفاقی کی خبروں سے انھیں اطمینان ہوتا اور نہ اس خبر سے انہیں کوئی تسلی ہوتی کہ تین یورپیوں کو پھانسی دے دی گئی ہے اور پوری کمپنی کو برخاست کر دیا گیا ہے۔ اس پورے مہینے میں مختلف جگہوں سے جنگ بھڑکنے کی خبریں آتی رہیں اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ انہیں اپنے جنرل پر پورا بھروسہ نہیں رہ گیا تھا' جس کی بنا پر امید اور ہمت دونوں پیدا ہوتی۔ کیتھ ینگ ان کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتا تھا اور اس کی اس رائے سے بہت سے لوگ اتفاق کرتے تھے۔ وہ لکھتا ہے۔ ”سچ تو یہ ہے کہ یہ جنرل برناڈ بہت شریف' بہت نرم دل اور بہادری سے بھرپور بوڑھا آدمی ہے اور اب وہ اس موجودہ منصب کے لیے موزوں نہیں رہ گیا۔ جیسے کہ روم کے پوپ کے لیے اور جہاں تک جنرل ریڈ کا سوال ہے میرا خیال ہے یہ بھی اس سے بہتر نہیں۔ لیکن یہ بہت عقلمندی سے ہر چیز

میں دخل اندازی کرنے سے کتراتا ہے۔" برنارڈ کے اندر نہ تو نکلسن کی شجاعت تھی، نہ ہڈسن کی ہٹ دھرمی۔ اس سے امید کی جا رہی تھی وہ ایسا کارنامہ انجام دے گا جسے زیادہ تر لوگ عملی طور پر خارج از امکان سمجھ رہے تھے۔ ہڈسن نے کہا تھا "اینگلو سیکسن لوگ ایشیا کے لوگوں کو آسانی سے اکھاڑ سکتے ہیں۔" لیکن صرف یہ ایک بیانیہ جملہ تھا اور کوئی بھی ذمہ دار فوجی افسران جملوں سے متاثر نہیں ہو سکتا۔ ایشیائی لوگوں کے ذریعہ انگریزوں کی شکست کی بہت ساری مثالیں تھیں اور برنارڈ اس سلسلہ میں کوئی جوا نہیں کھیلنا چاہتا تھا کیونکہ اس جوئے میں پوری حکومت داؤں پر لگتی اور وہ حکومت کے ساتھ کسی قسم کا جوا نہیں کھیلنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنی ذمہ داریوں کو بہت سنجیدگی سے لیا اور اس میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ پیرانہ سالی کے ساتھ ہندوستانی موسموں سے قطعی ناواقف اور اجنبی ہونے کے باوجود وہ دن کے ہر حصہ میں کیمپوں میں جاتا اور رات میں بھی نہیں سو پاتا۔ بہت زیادہ ذہنی اور جسمانی تکان کا شکار ہو کر ہیضے کی معمولی شکایت سے وہ 5/ جولائی کو چل بسا۔ بستر مرگ پر بھی اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کا اس نے عملی درس دیا۔ ہاروے گریٹ ہیڈ نے لکھا "وہ بہت اعلیٰ ظرف افسر تھا اور شاید یورپ کی آب وہوا اور یورپین جنگ میں اس نے حکومت اور ملک کی بہت زیادہ خدمت کی ہوتی لیکن اچانک اسے سب سے دشوار اور مشکل خدمت کے لئے ہندوستان میں تعینات کر دیا گیا اور پھر اس نے اپنے سامنے اس فوج کو پایا جسے جنرل اینسن نے کمانڈ کیا تھا۔ اسے مجبوراً اس طرح حملوں کی پیش بندی کرنی پڑی جو شاید اس کے پاس موجود فوج کی بدولت وہ نہ کرتا۔ کسی نے بھی دلی پر براہ راست حملے کی وکالت نہیں کی تھی جتنی کے ہاروے گریٹ ہیڈ نے اور اس لیے اس نے اس مرتے ہوئے آدمی کے لیے جو خراج عقیدت پیش کیا ہے اسے سچا اور خلوص پر مبنی سمجھنا چاہئے۔ دلی کی فوج کو کمانڈر کے موت کی اطلاع اس طرح سے دی گئی جیسے انگریزی کمانڈر انچیف نے خودکشی کر لی ہو۔

سرہنری برنارڈ کی جگہ جنرل ریڈ دلی فیلڈ فورس کے کمانڈر مقرر کئے گئے۔ وہ معذور شخص تھے اور "صرف اس حد تک صحت مند تھے کہ دن بھر بستر پر لیٹے رہیں۔" فعال کمانڈان کے لیے بہت مشکل کام تھا۔ گرچہ کچھ عرصہ تک شہر پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کرنے کا کوئی سوال نہیں تھا اور فوج کے پاس رسد کی بھی کوئی خاص کمی نہیں تھی۔ تاہم عیش و آسائش کے اشیا کی کمی تھی۔ 8/ جولائی کو انگلش بیکن 5 روپے میں ایک پونڈ بک رہا تھا اور ایک پونڈ کی موم بتی جسے آسائش کا سامان نہیں کہا جا سکتا، تین روپے مین مہیا تھی۔ دوسری چیزیں نسبتاً سستی تھیں۔ کیمپ کے لوگ آسائش کی وہ چیزیں مہیا نہیں کر سکے جو ریڈ جیسی صحت کے آدمی کے لیے ضروری تھیں۔ اس لیے اس بات پر کوئی حیرت نہیں ہونی چاہئے کہ 16/ تاریخ کو ہی اس نے کمانڈ سے سبکدوشی حاصل کر لی۔ یہ عرصہ گرچہ مختصر تھا لیکن واقعات سے پُر تھا۔ 9/ تاریخ کو کچھ باغی سوار آرٹیلری پکٹ سے گزرے۔ بیچ میں کچھ کارابائنرس کو ختم کیا اور مقامی آرٹیلری پوسٹ پر پہنچ کر انھیں بندوقوں کے ساتھ دلی آنے کی دعوت دی۔ آرٹیلری کے لوگ اپنی جگہ جمے رہے۔ لیکن نویں

اِرریگولر پر حملہ آوروں کے ساتھ سازش کرنے کا شبہ ہوا۔ اس طرح سبزی منڈی کی طرف بھی ایک جھڑپ ہوئی۔ دونوں طرف کافی لوگ ہلاک ہوئے۔ انگریزوں کے 223 سپاہی مارے گئے اور زخمی ہوئے۔ جبکہ باغیوں کے تقریباً پندرہ سو لوگ ہلاک ہوئے یا زخمی ہوئے۔ اسی حملے میں لیفٹیننٹ ہل اور میجر ٹومبز کو وکٹوریہ کراس ملا۔ نویں اِرریگولر میں ان کا ایک زبردست حمایتی بریگیڈیر چیمبرلین تھا جس نے عام لوگوں کی طرح ان پر قطعی کوئی شبہ نہیں کیا۔ جس کی وجہ سے ان کے خلاف زیادہ کارروائی نہیں کی گئی سوائے اس کے کہ انہیں غیر مسلح کر کے پنجاب میں سترہویں کے ساتھ ختم کر دیا گیا۔

اگر نویں اِرریگولر کو معاف کر دیا گیا تو ان کے سفید فام فوجیوں نے اپنا غصہ کیمپ کے دوسرے بے قصور ملازمین پر اُتارا۔ ان لوگوں نے اپنے آقاؤں کی بڑی خدمت کی تھی۔ بلکہ اکثر اپنی جان کی بازی بھی لگا کر اپنے آقاؤں کے کھانے کا انتظام کرتے۔ انہوں نے بہت سی جگہوں سے خالی گولیاں جمع کیں تاکہ کیمپ کے کم ہوتے ہوئے اسٹاک کو پورا کیا جا سکے۔ وہ بھی ایک گولی چند سکوں کے عوض۔ فوج ان کے بغیر ایک دن بھی نہیں رہ سکتی تھی لیکن نویں رجمنٹ کے حملے نے برٹش فوجیوں کے غصے کو بھڑکا دیا تھا۔ کے کہتا ہے "ایسا کہا جاتا ہے کہ کھلا دشمن نہ ہونے کے سبب ہمارے اپنے کچھ سپاہی جو اس موقع پر سامنے آ گئے تھے' انہوں نے کیمپ کے بہت سے خدمت گاروں اور نوکروں کی تکابوٹی کر دی جو کہ کرسچین قبرستان کے پاس خطرے کی گھنٹی سن کر جمع ہو گئے تھے۔ ان کی وفاداری' خدمت گزاری' غلامی اور مالکوں کے لیے حد سے بڑھی ہوئی تعظیم بھی ایک لمحے کے لیے سفید فام سپاہیوں کی نفرت اور غصہ کو کم نہیں کر سکی۔ اور ان کا یہ غصہ مشرق کے ہر اس شخص کے لیے تھا جس کی جلد سیاہ تھی۔" ان مجرموں کے خلاف کوئی تادیبی کارروائی نہیں کی گئی۔ روٹن کا کہنا ہے "اس معاملے کو لے کر کچھ شور شرابہ تو ہوا جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ ان میں سے زیادہ تر لوگوں کی موتیں انگریز فوجیوں نے کی ہیں۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس معاملے پر حکام بہت سنجیدہ تھے اور میرا خیال ہے کہ وہ حق بجانب بھی تھے کیونکہ کسی انسان کی جان معقول جواز کی عدم موجودگی میں نہیں لی جا سکتی۔ لیکن کیمپ میں اچانک دشمنوں کے آجانے سے مچی بھگدڑ اور ہمارے اپنے آدمیوں کی لاعلمی کہ وہ اپنے دشمنوں کو نہیں بلکہ دوستوں کو قتل کر رہے ہیں۔ اس بات کو جواز کے طور پر پیش کر سکتے ہیں۔ یہ جنگ کا ایک اتفاقی عمل تھی جو نفرت انگیز تو تھی لیکن اسے روکا نہیں جا سکتا تھا۔

14/ تاریخ کو، اس سے بھی زیادہ اہم جنگ ہوئی۔ باغیوں نے ہندو راؤ کے مکان اور سبزی منڈی میں جمع فوجی ٹکڑی پر حملہ بول دیا اور شہر کی دیواروں سے ان پر گولہ باری کرتے رہے اور یہ جنگ سارے دن چلتی رہی۔ شام کے وقت بریگیڈیر چیمبرلین ایک فوجی ٹکڑی کے ساتھ ان کو واپس کھدیڑنے کے لیے آگے آیا لیکن اس کے کندھوں پر لگے ایک گولے نے اسے زخمی کر دیا۔ بہت ممکن ہے اسی وجہ سے جنرل ریڈ نے فوج سے سبکدوش ہونے کا فیصلہ کیا ہو۔ کیونکہ ایڈ

جو ننٹ جنرل چیمبر لین ان کا داہنا ہاتھ تھا۔
لگا تار تین کمانڈر انچیف کا نقصان ہندوستانی فوج کے لیے ایک ایسا عظیم نقصان تھا جس کی تلافی ممکن نہیں تھی۔ لیکن برٹش فوجیوں نے نہ صرف اس سانحہ کو برداشت کیا بلکہ بڑی ہمت کے ساتھ غیر منظم دشمنوں کے سامنے ڈٹے رہے۔ آرک ڈیل ولسن کیمپ میں سب سے سینئر افسر تھے لہٰذا وہی نئے کمانڈر انچیف ہوئے۔ 10/ تاریخ کی شام کو ہوئے واقعات کے دوران انہوں نے میرٹھ میں اپنی اسی صلاحیت کا ہی لوہا نہیں منوایا تھا۔ بلکہ وہ بڑی ہمت والا شخص تھا اور اس نے دھیرے دھیرے غازی الدین نگر اور ہنڈن میں ہوئی فتح سے ظفر مند ہونے کی شہرت پائی تھی۔
اس نے فوراً ہی کیمپ کے روز مرہ کے مسائل پر توجہ کی۔ کیتھ ینگ ۲۲/ جولائی کو لکھتا ہے "اب کیمپ میں ہر کام بہت آسانی اور تیزی سے ہو رہا ہے کیونکہ بریگیڈیر وِلسن کمانڈ کر رہا ہے۔ وہ ایک شریف، خاموش اور پُر عزم بوڑھا شخص ہے جو ہر چیز کو خود اپنی نگاہ سے دیکھتا ہے اور پھر بہت واضح احکام جاری کرتا ہے۔ اب ہر شخص اس کی ماتحتی میں بہت راحت محسوس کر رہا ہے اور اتنی تو انہیں اس سے پہلے کے کمانڈر کے زمانے میں کبھی نہیں ملی تھی۔ بریگیڈیر ولسن بہت محتاط شخص ہے۔ شاید یہی اس کی سب سے بڑی کمزوری ہے "فی الحال اس کے محتاط رویے اور جوش کی کمی کا کوئی اثر نہیں پڑنے والا تھا۔ کیونکہ امروز فردا میں باغیوں کا دار الحکومت پر کوئی بڑا حملہ کرنے کا منصوبہ نہیں تھا۔ ہاروے گریٹ ہیڈ نے اس تاخیر سے نہ صرف مطابقت پیدا کر لی تھی بلکہ اس بات سے بھی خوش تھے کہ حملے کے سلسلہ میں پہلے کی تمام اسکیمیں چھوڑ دی گئیں۔ اس نے 29/ جولائی کو لکھا "حالات تیزی سے بدل رہے ہیں۔ لہروں کا رُخ مُڑ گیا ہے اور اب یہ لہریں ہماری حفاظتی چٹانوں سے ٹکرا کر واپس ہو رہی ہیں۔ "میرا خیال ہے کہ اس فوج نے جو کردار ادا کیا ہے اسے تاریخ میں اچھی طرح یاد رکھا جائے گا۔ خاص طور پر اس وقت جب ان کے سامنے پیدا مشکلات کا خیال رکھا جائے گا۔ یہ بہت اچھا ہوتا کہ اگر انہوں نے بیک وقت شہر پر حملہ کر کے فیصلہ کن جنگ لڑی ہوتی۔ لیکن اگر انہیں شکست ہو گئی ہوتی تو نتیجہ بڑا بھیانک ہوتا اور اب یہ بات بالکل صاف ہو گئی ہے کہ اس تاخیر سے ہماری اپنی شہنشاہیت کو کوئی خطرہ نہیں ہے اور میں سوچتا ہوں کہ جن تاریخوں اور دنوں میں دوسری جگہوں پر جھڑپیں ہوئیں اس کا سبب یہ نہیں تھا کہ جس دن ہم لوگ یہاں آئے ہم نے دلّی پر قبضہ کیوں نہیں کر لیا۔ مشرق سے مدد پہنچنے کی امید چھوڑ دی گئی تھی کیونکہ کانپور سے وہیلر کی بد قسمتی کی خبر آ رہی تھی۔ تاہم یہ یقین کیا جا رہا تھا کہ شہر کی چہار دیواری کے اندر کام صحیح ڈھنگ سے نہیں ہو رہا ہے۔ اس طرح کی خبریں آ رہی تھیں کہ فوجی اپنی تنخواہوں کے لیے نعرے لگا رہے ہیں اور بڑی تعداد میں فوج کو چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ پریشان کیے جا رہے بینکر اور شہری دونوں انگریزوں کی واپسی کے منتظر تھے۔ باغی فوجی لیڈروں اور بادشاہ کے مشیروں کے درمیان نا اتفاقی اور ایک رجمنٹ کا دوسرے رجمنٹ کے لیڈروں سے اختلاف، اسلحوں کی کمی اور اس کے علاوہ بقر عید کے موقع پر قربانی کو لے کر ہندو اور مسلمانوں کے درمیان

پھیلنے والی کشیدگی کا خطرہ بھی بڑھ گیا تھا۔

یہ رپورٹیں بے بنیاد تھیں گرچہ بنیوں پر یہ شک کیا جارہا تھا کہ وہ برٹش کیمپ سے دھات کی ٹوپیاں خرید کر شہر میں بیچ رہے ہیں تاہم شہر میں گولیوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ اصل کمی تو بارود کی تھی۔ 18/ جولائی کو میگزین کے داروغہ رجب علی نے رپورٹ کی کہ بندوق کا پاؤڈر ختم ہو گیا ہے۔ 24/ جولائی کو محمد بخت خاں کمانڈر انچیف نے اسی طرح کی رپورٹ بادشاہ کو پیش کی۔ شہر میں سلفر کی کمی ہو گئی تھی۔ اور شہر میں جو گولیوں کا پاؤڈر باغی سپاہی بناتے وہ برٹش کے معیار کا نہیں ہوتا۔ جولائی کے شروع میں ہی بادشاہ نے کمانڈر انچیف کو حکم دیا تھا کہ وہ بینکر اور دکانداروں سے روپے جمع کرنے کا انتظام کریں۔ خزانہ بالکل خالی ہو گیا ہے۔ مشورہ یہ کیا گیا کہ اس نازک حالات کا مقابلہ قرض اور چندہ لے کر کیا جائے اور بادشاہ نے اس طرح کا ایک بیع نامہ بندرابن کے ساتھ لکھا۔ ریواڑی کے راؤ تلارام کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنے علاقے سے مالگزاری جمع کریں اور دوسرے اطراف کے مالگزار افسروں کو اسی طرح کے احکامات دیے گئے۔ ایسا لگتا ہے کہ بادشاہ کو جولائی کے مہینہ میں کوئی خاص مالی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا کیونکہ وہ زیادہ تر چندوں کی جگہ قرض لینے کو ترجیح دیتا۔ ایک بینکر رام جی مل سے انہوں نے کہا "میں آپ سے رقم بطور قرض مانگ رہا ہوں۔ میں اسے ٹیکس کے نام پر نہیں لینا چاہتا۔ میرے دوست جیوتی پرشاد (آگرہ کے ٹھیکیدار) نے انگریزوں کو 33 ہزار روپے قرض میں دیے ہیں۔ آپ اس وجہ سے قرض دینے میں ہچکچا رہے ہیں۔

گرچہ لوگوں سے چندہ یا عطیہ نہیں مانگا گیا تھا تاہم عام شہری سپاہیوں کی وجہ سے بہت پریشان تھے، جنہوں نے نظم و نسق اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا اور جب وہ کسی شخص پر شبہ کرتے کہ یہ انگریزوں کا دوست ہو گا تو اس کی شامت آجاتی۔ 7/ جولائی کو کرنل بچر نے کیتھ ینگ کو ایک خط بلبھ گڑھ کے راجہ ناہر سنگھ کے نام دیا۔ ابھی تک راجہ دلی کے بادشاہ کو آدمی اور رسد فراہم کر رہا تھا لیکن اب اس نے اہل برطانیہ کو اپنی وفاداری اور دوستی کی یقین دہانی کرائی اور ان کے کیمپ کا دورہ کرنے کے لیے کہا۔ اسی مہینے کے آخری دن اسی افسر نے ایک اور خط کا تذکرہ کیا ہے۔ جو جھجھر کے نواب کی طرف سے تھا۔ جس میں سلام کرنے کے لیے بہ نفس نفیس پیش ہونے کی بات کہی گئی تھی۔ جنرل بخت خاں نے بادشاہ سے شکایت کی کہ بہت سے لوگ ان کے خلاف بطور سازش یہ کہہ رہے ہیں کہ وہ دشمن کے سپاہیوں سے ملے ہوئے ہیں۔ راؤ تلارام دوہرا کھیل کھیل رہے ہیں۔ ایک طرف تو وہ بادشاہ کو نذر پیش کرتے اور زبانی اپنی وفاداری کا اظہار کرتے، دوسری طرف اپنے املاک کو بڑھانے کی فکر کرتے۔ ایک دوسرے زمیندار کو ایسا کہا جاتا ہے کہ اس نے خط لکھا "کیا تم نے نشہ کر رکھا ہے جو یہ سمجھتے ہو کہ انگریز ہندوستان سے چلا جائے گا۔ وہ پوری طاقت کے ساتھ دوبارہ لوٹیں گے اور تم کو تہہ و بالا کر دیں گے۔" اس طرح کے بڑے راجاؤں اور زمینداروں نے اگر ایک طرف اپنے کو بادشاہ سے جوڑ رکھا تھا تو دوسری طرف بہت رازدارانہ طریقے سے انگریزوں سے دوستی گانٹھنے میں بھی لگے تھے اور ایسا وہ اس وقت کر رہے تھے جب

انگریزوں نے جنگ میں باغی فوجیوں کے خلاف کوئی کامیابی نہیں حاصل کی تھی۔ ان راجاؤں کی دوہری چال خاموشی سے چلتی رہی۔ جب تک کہ الپ پرشاد جو نواب کا ایجنٹ تھا' پر یہ الزام نہیں لگ گیا کہ وہ انگریزوں کو پناہ دے رہا تھا۔ "انہوں نے اس کے گھر کی تلاشی لی اور پچاس ہزار روپے وہاں سے لے گئے۔ جنرل بخت خاں اس تاراجی کو روکنا چاہتے تھے۔ اور اسے روکنے کے لیے انہوں نے جس فوج کو بھیجا اس نے مداخلت کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ معاملہ بعد میں بادشاہ کے علم میں لایا گیا جنہوں نے مرزا مغل سے اس کی جانچ کرنے کے لیے کہا۔

مسلمانوں کا تہوار عید الاضحیٰ نزدیک آ رہا تھا اور ہڈسن کو یہ پورا یقین تھا کہ کچھ کٹر مسلمان ہندوؤں سے جامع مسجد میں گائے کی قربانی کو لے کر ضرور لڑائی کریں گے۔ ان کے جاسوسوں نے بھی اس طرح کے تفرقے کی خبر دی تھی۔ ہم لوگوں کو بتایا گیا ہے "کہ کچھ کٹر مسلمانوں نے اپنے اس ارادے کو ظاہر کر دیا ہے کہ وہ عید الاضحیٰ کے موقع پر جامع مسجد میں گائے کی قربانی کریں گے۔ امید کی جاتی ہے کہ وہ اپنے اس عہد پر مکمل طور پر کاربند رہیں گے اور اس کے بعد یقینی ہے کہ اس معاملے کو لے کر ہندو مسلمان فساد ہو گا۔"

دلی میں رہنے والے بہت سے مغلوں نے اپنے کو مجاہد اعلان کر دیا ہے اور ان کی تعداد میں باہر والوں کی وجہ سے اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ جولائی میں اس طرح کے بہت سے لوگ ٹونک سے بھی آ گئے ہیں۔ یہ مجاہدین تربیت یافتہ فوجی نہیں ہیں اور گرچہ وہ بہت ہمت کے ساتھ موت سے مقابلہ کرتے ہیں تاہم جنگ کے میدان میں وہ کبھی کار آمد ثابت نہیں ہو سکتے۔ ان کے لیے جنگ کا تصور صرف سروں کے اوپر تلوار نچانے تک محدود ہے۔ ان میں سے ایک عورت ایسی تھی جس نے بڑی شجاعت سے حملہ کیا اور اپنے دو مخالفین کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ زخمی ہونے پر اسے قید کر لیا گیا۔ یہ مجاہدین بادشاہ کے لیے اور پریشانی کا باعث تھے۔ ان کی خدمات سے انکار نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن ان کی اس مانگ کو کہ اس جنگ کو مقدس جنگ یا جہاد کا نام دیا جائے' وہ بھی قبول نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لکھنؤ میں جہاد کی فضیلت کے بارے میں ایک فرمان والی کے نام سے جاری کیا گیا تھا۔ لیکن دلی میں باغی فوجیوں میں بہت سے ہندو بھی تھے۔ اس لیے سوچنے سمجھنے والے مسلمانوں نے انہیں اپنے سے الگ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اسی وجہ سے بریلی کے خان بہادر خاں نے یہ اعلان کیا کہ اگر انگریزوں کے ساتھ جنگ میں ہندو بھی ساتھ دیتے ہیں تو وہ اپنے علاقے میں گائے کی قربانی پر پابندی عائد کر دیں گے۔ ہر آدمی یہ غور کر رہا تھا کہ اس یگانگت کو برقرار رکھنے کے لیے بادشاہ کہاں تک جا سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ صاف ظاہر تھا کہ اس سلسلہ میں لیا گیا کوئی بھی فیصلہ عام طور پر مقبول نہیں ہو گا۔ حکیم احسان اللہ ایک زمانے سے چلی آ رہی اس روایت کو ختم کرنے کے موڈ میں نہیں تھے اور مولویوں کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ لیکن بادشاہ نے بڑی ہمت سے کام لیتے ہوئے فوج کے جنرل اور افسروں کو یہ حکم دیا "شہر کے حدود کے اندر بقر عید کے موقع پر گائے کی قربانی نہیں دی جائے گی اور اگر کوئی مسلمان ایسا کرتے ہوئے پایا گیا تو اسے گولی

مار دی جائے گی اور اس کام میں اگر کسی مسلمان نے معاونت کی تو اسے بھی گولی مار دی جائے گی۔
بادشاہ نے خود بھی عام مسلمانوں کے سامنے عید گاہ پر بھیڑ کی قربانی دے کر اس کی مثال پیش کی۔
اس لیے یکم اگست کو عید کے دن دلی میں کوئی مذہبی جھگڑا نہیں ہوا۔ صبح کا وقت عبادت میں گزر گیا۔ بادشاہ نے ایک روایتی دربار کیا جس میں انہیں نذرانے دئے گئے اور انہوں نے بھی بہت سی خلعتیں لوگوں کو عطا کیں۔ کیتھ ینگ نے دوسرے دن اپنی بیوی کو خط لکھا ''شہر میں بقر عید کے موقع پر بڑے پیانے پر دنگا ہونے کی امید پوری ہوتی نظر نہیں آئی۔ شہر سے جو خبریں موصول ہوئی ہیں ان میں اس طرح کی کوئی خبر نہیں ہے۔ بادشاہ نے گائے کی قربانی کے بارے میں سخت حکم امتناعی جاری کر دیا ہے۔ اور اس پر عمل در آمد سے ہندوؤں کو اطمینان ہو گیا ہے اور بجائے اس کے کہ وہ آپس میں لڑتے مرتے' انہوں نے مل کر ہم پر زبردست حملہ کیا تاکہ زمین سے ہمیں نیست و نابود کر دیں۔ اس دن دوپہر کے بعد سے ساری رات شدید جنگ ہوتی رہی جو دوسرے دن تک جاری رہی۔ فوجی لگاتار برٹش حفاظتی فوج کے سامنے خود کو پھینکتے رہے جو فوراً ہی برٹش گولیوں کی زد میں آجاتے۔ لگاتار گولیوں کی بوچھار سے ان کی ہمت میں کوئی کمی نہیں آئی اور وہ تابڑ توڑ حملے کرتے رہے۔ ان کی اس بہادری کا انہیں انعام ملنا چاہئے تھا لیکن وہ بہادری جس کے ساتھ تکنیک نہ ہو وہ کسی کام کی اس وقت نہیں رہتی جب رج پر بیٹھی منظم فوج سے اس کا سامنا ہو۔ دو مہینے تک انہوں نے دشمن کی دفاعی طاقت مٹانے کی کوشش کی۔ ان کے حملے لگاتار داہنی طرف سے ہوتے۔ کبھی کبھار عقب سے یا بائیں طرف سے ہوتا اور کبھی اس بات کی کوشش نہیں کی گئی کہ دائیں بائیں وسط یا عقب سے ملا کر ایسا حملہ کریں جس سے دشمن کی پوری فوج قابو میں آجائے۔
جب کوئی باغی رجمنٹ کمک کو پہنچتی تو اپنی آمد کی اطلاع وہ رج پر حملہ کر کے دیتی اور اپنی طاقت کا مظاہرہ کرتی۔ لیکن کوئی بھی سوچا سمجھا جنگی منصوبہ نہیں تھا اور نہ ہی کوئی ایسا جنرل تھا جو اس حملے کو کوئی سمت دے سکتا۔ کثرت تعداد بجائے فائدہ مند ہونے کے نقصان دہ ثابت ہو رہی تھی۔
کیونکہ ایسے لوگ جن کے ہاتھوں میں بندوقیں ہوں اور جن میں کوئی نظم و ضبط نہ ہو وہ ملٹری سائنس سے ناواقف ہوتے ہیں۔ وہ اپنے ہی لوگوں میں انتشار پھیلا دیتے ہیں بجائے اس کے کہ کوئی کامیابی ملے۔ بار بار ہونے والی ناکامی سے ان کا جوش بھی کم ہو گیا تھا اور فوجی اپنی اس ناکامی کو اعلیٰ طبقوں کی سازش کا نام دینے لگے اور انہوں نے حکیم احسان اللہ خاں پر اس وقت مکمل شبہ ظاہر کیا جب 7/اگست کو میگزین کا دھماکہ ہوا۔

ابتدا سے ہی حکیم احسان اللہ خان کو باغیوں سے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان کے خیالات کا علم باغیوں کو بالکل نہ ہوا ہو۔ یہ دھماکہ کیسے ہوا کوئی نہیں جانتا۔ یہ ایک اتفاقیہ عمل ہو یا جان بوجھ کر کیا گیا کوئی عمل۔ کچھ جاسوس لوگ انگریزوں کی طرف سے کام کر رہے تھے۔
یہ دھماکہ اس وقت ہوا جب حکیم نے میگزین کا معائنہ کیا تھا۔ اس لیے یہ شبہ کیا گیا کہ وہ انگریزوں سے مل کر سازش کر رہے ہیں۔ کیتھ ینگ کا کہنا ہے کہ یہ شبہ بے بنیاد بھی نہیں تھا۔ جب حکیم کے

گھر پر حملہ کیا گیا اور تلاشی لی گئی تو ان کے گھر سے سمجھوتے کا ایک خط بر آمد ہوا۔ کوپر کا کہنا ہے کہ یہ خط جان بوجھ کر رجب علی نے لکھا تھا تاکہ حکیم کو بدنام کر سکیں۔ یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کیتھ ینگ کی اطلاع کے مطابق اگرچہ حکیم کو حراست میں لے لیا گیا تھا۔ جیون لال کو بتایا گیا کہ بادشاہ نے اپنے محل کے تہہ خانے میں حکیم کو چھپا دیا تھا لیکن آخر کار انہیں باغی فوجیوں کے سپرد کرنا پڑا۔ حکیم کے خاندان کی عورتیں بہر حال بچ بچا کر نکل گئیں اور مزید بے عزت ہونے سے بچ گئیں۔ لیکن بادشاہ کے اس بھروسے مند مشیر پر اعتبار ختم ہونے سے فوجیوں کی ہمت پر بھی کافی اثر پڑا۔ جو دربار میں بھی مردنی چھا گئی۔ باغیوں کو یہ نہیں معلوم تھا کہ بادشاہ حکیم کی اتنی تعظیم کرتے ہیں اور انگریزوں سے جون سے ہی گفت و شنید میں لگے ہوئے ہیں۔ کچھ بھی ہو صرف بادشاہ اپنے فوجیوں کے خلاف سازش کرنے میں تنہا نہیں تھے۔

جیون لال کو قلعہ معلیٰ اور برٹش کیمپ کے درمیان ہونے والی خفیہ خط و کتابت کا علم نہیں ہو سکا، لیکن فوجیوں نے کچھ عجیب و غریب باتیں ضرور محسوس کی ہوں گی اس لیے ان کے اندر شبہ پیدا ہوا ہوگا۔ انہوں نے کھلے عام خاص الخاص ملکہ زینت محل پر بے وفائی اور سازش کرنے کا الزام لگایا۔ غدر نے ان کے سارے منصوبوں پر پانی پھیر دیا۔ وہ اپنے بیٹے جواں بخت کو بادشاہ کا جانشین بنانا چاہتی تھیں۔ لگا تار ہونے والی فطری اور غیر فطری اموات نے اس کے دو رقیبوں کو راستے سے ہٹا دیا تھا۔ باقی ماندہ شہزادوں میں سے مرزا کابوس کو چھوڑ کر باقی سب جانشینی کے عہدے سے دستبردار ہو چکے تھے۔ اب صرف برٹش حکام کو اس بات کے لیے راضی کرنا باقی تھا کہ جوان بخت ہی اس عہدہ کے لیے موزوں ترین شخص ہیں اور وہی سب سے زیادہ مقبول بھی ہوں گے۔ غدر نے تمام پرانے شہزادوں کو سامنے لا دیا تھا اور اگر انگریزوں کی شکست ہوتی ہے تو مرزا مغل 'نہ کہ جوان بخت فوج کے ذریعہ منتخب کئے جائیں گے۔ مرزا الٰہی بخش انگریزوں کے مفاد کے لیے کام کر رہے تھے۔ ممکن ہے کہ احسان اللہ نے ان کے ساتھ تعاون کیا ہو۔ مولوی رجب علی نے بھی اس سلسلہ میں فعال تعاون دیا ہو۔ منصوبہ بالکل سیدھا سادا تھا۔ اگر برٹش حکام اس بات کی یقین دہانی کرا سکیں کہ بادشاہ کو ملنے والی پنشن اور مراعات کو دوبارہ بحال کر دیں گے تو ان کی پارٹی ناؤوں کے پل کو تباہ کر دے گی۔ کیویلری کو ملا لے گی اور ان کی مدد سے انفینٹری پر قابو پا کر انگریزوں کو شہر میں گھسنے کا موقع دے گی۔ جبکہ انگریزوں کی فوجی قوت میں کافی اضافہ ہو گیا تھا اور ان کے منصوبے پر عمل کرنے کا مطلب ہوتا کہ انگریزوں کو اپنی کمزوری کا اعتراف ہے۔ حال میں ملنے والی فتح سے سرشار برٹش حکام نے ان منصوبوں پر کوئی دھیان نہیں دیا۔

دوبارہ یہ مذاکرات کب شروع ہوئے اس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں۔ 6/ اگست کو اپنے خط میں گریٹ ہیڈ سر ولیم میور کو اطلاع دیتا ہے کہ منکاف کو ڈاک کے ذریعہ بادشاہ کا ایک خط ملا ہے جس میں اس کی صحت کے بارے میں پوچھا گیا ہے۔ بظاہر یہ ایک اشارہ تھا۔ لیکن اس پر کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ 20/ اگست تک یہ افواہ پھیل گئی کہ بادشاہ نے گورنر جنرل سے مصالحت کرنے کی

کوشش کی ہے اور اڈ منڈ اسٹون نے مندرجہ ذیل مضمون کے ساتھ ایک تار کالون کو بھیجا۔ ''اس طرح کی افواہ گورنمنٹ کے پاس پہنچی ہے کہ دلّی کے بادشاہ نے وہاں فوج کے کمانڈنگ افسر کو اس طرح کا اشارہ دیا ہے اور یہ اشارہ پھر دیا جائے گا۔ اس بنیاد پر کہ میرٹھ میں غدر سے پہلے بادشاہ کی جو پوزیشن تھی وہ برقرار رکھی جائے گی، گورنر جنرل یہ امید ظاہر کرتے ہیں کہ یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ بادشاہ کو دی جانے والی کوئی رعایت جس میں بادشاہ کی سابقہ پوزیشن برقرار رکھنا شامل ہو' اس پر گورنمنٹ ایک لمحے کے لیے بھی اپنی منظوری نہیں دے سکتی۔'' 27/ اگست کو میور نے ہیویلاک کو ایک خط لکھا ''مسٹر گریٹ ہیڈ کو شہزادوں کی طرف سے دو تین پیغام ملے ہیں جس میں وہ اپنی فوج کی کچھ ٹکڑیوں کی خدمات پیش کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا گیا۔'' گریٹ ہیڈ نے اس طرح کے پیغامات کا تذکرہ 19/ اگست کے خط میں بھی کیا ہے۔ لیکن وہ یہ نہیں بتاتا کہ یہ سلسلہ کب سے شروع ہوا۔ گریٹ ہیڈ سے کوئی جواب نہ ملنے پر انہوں نے اس طرح کے اشارے بریگیڈیر ولسن سے کئے جیسا کہ میور نے بعد میں ہیویلاک کو بتایا، ''شہزادوں کی طرف سے اپنی خدمات دینے کے لیے کہا ہے جسے ایک بار مسٹر گریٹ ہیڈ انکار کر چکے ہیں۔ اس کا اعادہ جنرل کے ساتھ ایک دوسرے طریقے سے کیا گیا۔ اس میں کھلے عام پل کو برباد کرنے، کیویلری کو اپنے ساتھ ملانے اور ان کی مدد سے انفینٹری کو اس شرط کے ساتھ ختم کرنے کی بات کی گئی ہے کہ شاہی خاندان کے ساتھ بہتر سلوک کیا جائے۔ جنرل ولسن نے قلعہ معلیٰ سے کسی طرح کے مواصلات سے انکار کر دیا۔ اس کا امکان ہے کہ یہ مذاکرات بھروسے مند آدمی کے ذریعہ کئے گئے ہوں لیکن تحریری طور پر نہیں۔ 21/ اگست کو ایک ''ایلچی زینت محل کی طرف سے آیا جو بادشاہ کی چہیتی بیگم تھیں کہ وہ کسی طرح سے صلح کر لیں۔ میں نے (گریٹ ہیڈ) جواب دیا کہ ہم ذاتی طور پر ان کی ساری خوشیاں چاہتے ہیں۔ ہمارا عورتوں اور بچوں کے ساتھ کوئی ذاتی جھگڑا نہیں ہے لیکن محل کے کسی شخص کے ساتھ ہم کوئی بات چیت کرنے کو تیار نہیں۔ گرچہ ان کے اس طرح کی پیش کش کو مصلحت کے ساتھ ٹھکرا دیا گیا تھا' لیکن انگریزوں کے ایجنٹ ان کے تعاون پر بھروسہ کر رہے تھے اور انہیں یقین تھا کہ گیریسن پر اب بھی ان کا کچھ اثر ہے۔ ایک کاغذ کے ٹکڑے پر فارسی میں لکھ کر ہڈسن نے کیتھ ینگ کو دیا تھا۔ ایک جملہ آتا ہے۔ ''مرزا الٰہی بخش اور زینت محل کے نام ایک دستاویز سے گیریسن کو مکمل مدد مل جائے گی۔'' اس رقعہ پر 24/ اور 25/ اگست کی تاریخ درج ہے۔ ملکہ پر شبہ ضرور ہوا لیکن فوجیوں نے انہیں چھوڑا نہیں ہوتا اگر ان کی سازش کا انہیں مکمل علم ہو جاتا۔ یہ ظاہر ہے کہ بادشاہ کا باغی فوجیوں کے بارے میں کوئی اچھی رائے نہیں تھی۔ برٹش فوجیوں کو رج سے خالی کرانے میں باغیوں کی ناکامی سے ان پر بُرا اثر پڑا اور انہوں نے کھلے عام یہ شکایت کی کہ باغیوں نے اس تخت و تاج کو تاراج کر دیا جس نے تقریباً پانچ صدی تک حکومت کی تھی۔ بادشاہ نے خودکشی کی بھی دھمکی دی' جب حکیم احسان اللہ کو قید کر لیا گیا۔ باغیوں کے ظالمانہ سلوک سے وہ شہریوں کی جان و مال کی حفاظت نہیں کر سکے اور کھلے عام

تخت و تاج چھوڑنے کی بات کرنے لگے۔ اکثر قطب میں جا کر بسنے یا اس ملک کو چھوڑ کر سکون کی تلاش میں مکہ معظمہ جانے کی بات کرتے۔ شہزادوں کی طرف سے نظر انداز کیے جانے 'فوجیوں کی طرف سے ذلیل کیے جانے کی وجہ سے وہ اکثر شاعری میں پناہ ڈھونڈتے کیونکہ ہتھیار چلانے سے وہ واقف نہیں تھے اور نہ اس بات کی اہلیت تھی کہ وہ اپنے لوگوں کی رہنمائی کر سکتے۔ ناکامی سے دو چار ہونے پر انہوں نے کہا تھا:

"اپنے کو کفن میں ڈھانک کر میں کنج باغ میں گذارنا چاہتا ہوں۔"

لیکن انہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ مقدر میں ان کے لیے کیا ہے اور اب بھی ملکہ اور شہزادے یہ سوچ رہے تھے کہ انہیں ماضی کے عیش و عشرت کے دن دوبارہ حاصل ہو جائیں گے۔

یہ بات چیت بہت رازدارانہ طریقے پر ہوئی تھی اور اُسے صرف چند سر بر آوردہ اشخاص ہی جانتے تھے 'لیکن ان کے علاوہ اعتماد کی بحالی کے کچھ اور بھی آثار دکھائی دے رہے تھے جن سے سب کو خوشی ہوئی ہوگی۔ دکاندار رج کو تجارت کے لیے بہترین جگہ سمجھ رہے تھے اور اپنے ساتھ ایسا سامان لے کر آتے جن کی سپاہیوں کو ایک عرصے سے ضرورت تھی۔ 18/ اگست کو کیتھ ینگ نے اپنی بیوی کو خط لکھا "کیا میں نے تمہیں یہ بتایا ہے کہ پیک اور ایلن نے اپنا نمائندہ بہت سے سامان کے ساتھ یہاں بھیجا ہے۔ ان کے علاوہ کیمپ میں دو پارسی دکاندار بھی ہیں' جہانگیر اور کواس جی جن کے پاس بہت سارے سامان ہیں۔ خصوصاً بیئر' برانڈی اور سوڈا واٹر۔ پہلے وہ ایک درجن بیئر کی بوتلوں کی قیمت 24 روپے لے رہے تھے لیکن بعد میں انگریزی بوتلوں میں بند بیئر کی قیمت گھٹا کر پندرہ روپے درجن کر دی۔ اور ہیڈ کوارٹر کے میس میں کسی قیمت پر سو درجن بوتلیں خرید لی گئیں۔" منافع کی امید پر ان پارسیوں نے جو کھم اُٹھایا تھا لیکن ان کی آمد سے یہ ثابت ہو گیا کہ اب سڑکیں اور آس پاس کے علاقے سپاہیوں کی دسترس سے محفوظ ہیں۔"

باغی فوج' جو اس طرح کی سازش سے بے خبر تھی' نے دوبارہ جنگ کرنے کا عزم کیا اور اسی لیے اگست کے مہینے میں رج پر موجود لوگوں کو کوئی سکون نہیں ملا۔ لیکن ان کی امید نے ان کے اندر ایک نئی تحریک پیدا کی اور 7/ تاریخ کو جان نکلسن اپنی فوج سے آگے نکل کر گھوڑ سواری کرتے ہوئے وہاں پہنچا۔ جان نکلسن اس بہادری کے عہد کا وارث تھا جس میں بے پناہ ہمت کے ساتھ ظلم کرنے کی بے پناہ قوت تھی۔ وہ صرف ایک تلوار لے کر خوفناک شیر سے بھی نڈر ہو کر مقابلہ کر سکتا تھا۔ اس کی ناقابل شکست جرأت نے کبھی تکان کو سامنے آنے نہ دیا۔ سال کے سب سے گرم موسم اور دور دراز سے گھوڑ سواری کر کے آنے کے بعد بھی ساری دقتوں سے لڑنے کے لیے وہ تیار ہو گیا۔ باغیوں کے لیے اس کے دل میں کوئی رحم نہیں تھا اور اس کا ارادہ "ان کی زندہ کھال کھینچنے 'ان کے جسمانی حصوں کا کوٹنے اور ان قاتلوں کو زندہ جلانے کا تھا جنھوں نے دتی میں بچوں اور عورتوں کو قتل کیا تھا۔ ایسے ظلم کرنے والے لوگوں کو صرف سولی پر لٹکانا اس کے نزدیک ایک مضحکہ خیز بات تھی۔ اس نے لکھا کہ "میری خواہش ہے کہ میں دنیا کے اس حصہ میں

بستا جہاں وقت ضرورت قانون کو اپنے ہاتھ میں لیا جا سکتا۔" اپنے بہت سے ہم عصر ہندوستانیوں کی طرح وہ ایک راسخ العقیدہ عیسائی تھا۔ لیکن اسے ساری تحریک پرانے عہد نامے سے ملتی اور وہ جی ہوا کے اس عقیدے کا ماننے والا تھا کہ ظلم کا بدلہ ظلم سے لیا جائے نہ کہ نئے عہد نامے کے فرشتہ صفت انسان کی اولاد سے۔ اس کے خوف سے لوگ لرزیدہ ہو جاتے اور اسی لیے سرحد کے قبائلی اسے خود خدا کی طرح سمجھتے کیونکہ قبائلی اس خدا کو زیادہ مانتے ہیں جس سے وہ خوف کھا سکیں نہ کہ اس خدا کو جس سے محبت کی جا سکے۔ اور اسی لیے وہ دیوتا جو خوف پیدا کر سکیں اس کے لیے وہ ہر طرح کی قربانی دینے کے لیے تیار تھے۔ بے رحمی سے کوڑے برسانے سے اس کے عقیدت مندوں کی توقیر اس کے تئیں اور بڑھ جاتی۔ اسے نہ تو ہندوستان پسند تھا اور نہ یہاں کے لوگ۔ شاید بڑھتی ہوئی عمر اور اس کی بیوی کے اثر سے اس کا غصہ زائل ہو جاتا۔ اور اسی لیے اس نے شادی بھی نہیں کی۔ ابھی وہ 35 سال کا ہی تھا کہ اس کو چیمبر لین کی جگہ فوج کے کمان کی باگ ڈور سونپی گئی۔ اور بہت سے سینئر پر اسے فوقیت دی گئی۔ گرچہ فوج میں وہ بھی کیپٹن کے ہی عہدہ پر تھا تاہم بریگیڈ کا عہدہ جنرل کا رینک سونپ گیا اور اس نے اپنے انتخاب کا بھرپور ثبوت بھی پھلور میں فوجیوں کو غیر مسلح اور سیاہ کوٹ میں باغیوں کو تہہ تیغ کر کے دیا۔ وہ اپنی فوج سے پیشتر انبالہ سے گھوڑ سواری کرتے ہوئے دہلی آیا تاکہ جنرل ولسن سے مشورہ کر سکے۔ 14/ اگست کو اس کی فوج جو دو ہزار چار سو انفینٹری، 6 توپچی اور کچھ کیولری پر مشتمل تھی، نکلسن کی قیادت میں کیمپ کی طرف آگے بڑھی اور وہاں لوگوں نے اس کا خیر مقدم خوش دلی اور جوش سے کیا۔

نکلسن کے آنے کے بعد حملہ کرنے کی پالیسی کو اولیت دی گئی۔ نکلسن فوری طور پر کوچ کرنا چاہتا تھا۔ وہ صرف ابتدائی مرحلوں کے پورا ہونے کا ہی انتظار کر سکتا تھا جس میں سیج ٹرین کی آمد، بیٹری کا پورا ہونا اور دشمن کی فوج کی جاسوسی شامل تھی۔ تاہم ولسن ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کر سکا تھا۔ "اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس حملے میں ناکامی کا مطلب نہ صرف اس کی فوج کی تباہی بلکہ پورے ہندوستان سے ہاتھ دھونا ہوگا۔ اس وقت تک پنجاب میں خاموشی طاری تھی۔ لیکن وہاں بھی کچھ بغاوت کی لہر پیدا ہو رہی تھی۔ ہر گاؤں میں جوشیلے پوسٹر لگا دیے گئے تھے۔ بمبئی کی فوج بھی پست ہمتی کا شکار ہو چکی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے ہندوستان ہمارے قابو سے باہر ہو رہا ہے۔" لیکن ولسن کوئی جوکھم نہیں اُٹھانا چاہتا تھا۔ وہ اس جوکھم بھرے قدم سے گھبرا رہا تھا اور حملہ کرنے سے پہلے جب تک اسے کامیابی کا مکمل یقین نہ ہو جائے حملہ نہیں کر سکتا۔ شہر سے ملنے والی خبروں کے مطابق باغی فوج چالیس ہزار نفر پر مشتمل تھی۔ اس نازک ترین دن کو ولسن نے اپنا کیمپ بغیر کسی حفاظت کے چھوڑ دیا۔ اور اگر دشمن کیمپ کے عقب سے حملہ کرتا، خصوصاً اس وقت جب اس کی زیادہ تر فوجیں دوسری طرف مشغول تھیں تو یہ سپاہیوں کا آسانی سے شکار ہو جاتا۔ گرچہ قسمت اس کی یاوری کر رہی تھی اور شہر والے بھی اس کا ساتھ دے رہے تھے تو بھی کیا وہ اتنی بڑی تعداد کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ اس کی چھوٹی سی فوج جس کی کل تعداد نو ہزار نفر پر مشتمل تھی ایک اجنبی شہر

میں دشمن شہریوں کے بیچ سڑکوں پر کیسے جنگ کر سکتی ہے۔ یہ اور اس طرح کے بہت سی تفکرات تھے جس میں وہ گھرے ہوئے تھے۔ بعد کے واقعات نے ثابت کیا کہ اس کے تفکرات بے بنیاد نہیں تھے۔ جس دن نکلسن کے فوجی وہاں پہنچے (14راگست کو) باغی کیویلریوں کا ایک دستہ وہاں سے نکلتا ہوا پایا گیا۔ فوجیوں نے شاید جنگی مورچے میں توسیع کی ضرورت کو محسوس کیا تھا۔ جنگ کے ابتدائی دنوں میں جب برنارڈ مواصلاتی لائن کی حفاظت کے لیے اپنے کسی فوجی کو نہیں چھوڑ سکتا تھا تو یہ امید کی جارہی تھی کہ باغی فوجی دشمن کی پنجاب سے سپلائی لائن کو کاٹ دیں گے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ جیند کے فوجی ناؤ کے پل کی باغپت میں حفاظت نہیں کر سکے۔ اور شاید پٹیالہ کی فوج ان کے مدمقابل بھی نہ آتی' لیکن حالات اب بدل چکے تھے۔ اور ہڈسن کو گائڈ کیویلری اور نئے تقرر کئے گئے دو سو گھوڑسواروں کے ساتھ ان کی حفاظت پر لگا دیا گیا تھا۔ ہڈسن ایک بہت کامیاب کیویلری لیڈر تھا۔ لیکن شاید نکلسن کی طرح یہ بھی عہد رفتہ سے تعلق رکھتا تھا۔ عمر کے درمیانی منزل میں بھی وہ شاید ایک جری شخص ثابت ہوتا لیکن انیسویں صدی میں اس کے سادہ ضمیر اور وقار کا پیمانہ اب اس کے لیے ایک دھبہ بن گئے تھے۔ خاص طور پر ان لوگوں کے لیے جو اس کی جنگی شجاعت کی تعریف کرتے۔ اپنے ملک کی خدمت کرتے ہوئے وہ ایسا کوئی موقع نہیں چھوڑتا جس میں اس کا ذاتی مفاد ہوتا' چاہے ایمانداری سے چاہے بے ایمانی سے جیسے بھی ہو۔ اس کی شجاعت اور اس کے عزم کی وجہ سے بہت سے اچھے لوگ اس کے دوست بن گئے تھے۔ لیکن اس کی بے رحمی اور ظلم کی وجہ سے بہت سے اچھے لوگوں نے جو اس کے دوست ہو چکے تھے' اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔

ہڈسن ہارس کے غیر مستقل لوگ ابھی نظم وضبط سے عاری تھے۔ لیکن اس کمی کی تلافی اس کے گائیڈ نے پوری کردی۔ اس کی یہ فوج سکھ پنجابی مسلمان آفریدی اور دوسرے سرحدی قبائلیوں پر مشتمل تھی اور کچھ ہندوستانی بھی تھے جن میں سے آخرالذکر ہمیشہ اس کے وفادار بنے رہے چاہے انہیں اپنے ہم وطنوں سے ہی جنگ کیوں نہ کرنی پڑے۔ یہ سبھی لوگ اِدھر اُدھر سے اکٹھا کئے گئے تھے۔ لیکن وہ سب تجربہ کار تھے کیونکہ نوجوانی سے ہی وہ سرحد کی جنگوں میں حصہ لے رہے تھے اور ان کے بارے میں یہ آسانی سے کہا جا سکتا تھا کہ سب پرانے تجربہ کار ہیں۔ اس کا پہلا حملہ ایک محاصرہ کئے گئے گاؤں پر تھا۔ جہاں زیادہ تر غیر مستقل سوار رہتے تھے۔ اور جنہوں نے غدر سے پہلے ہی جھڑپوں میں حصہ لیا تھا۔ ان کے بارے میں یہ سوچ لیا گیا کہ یہ لوگ وفادار نہیں ہیں کیونکہ یہ اپنی ڈیوٹی پر واپس نہیں آئے۔ غیر مستقل کیویلری کا ایک مقامی فرسٹ افسر 'ہڈسن اور اس کی پارٹی سے ملاقات کے لیے آیا۔ اسے فوراً حراست میں لے لیا گیا۔ یہ خبر جب سواروں میں پہنچی تو ان میں خوف پیدا ہو گیا اور انہوں نے اپنے کو ایک چھوٹی سی عمارت میں محصور کر لیا۔ بعد میں دھوئیں سے ان سب کا دم گھونٹ کر ان کا قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد ہڈسن روہتک کی طرف گیا۔ وہاں ایک پرانا قلعہ تھا جہاں بہت سے مسلح لوگوں کی بھرتی کی جاتی۔ ہڈسن سیدھے شہر میں پہنچا۔

مقامی لوگ معاندانہ رویہ نہیں رکھتے تھے۔ وہ اس کے پاس بہت سی چیزیں لے کر آئے۔ اسے غیر دانشورانہ قدم سمجھتے ہوئے کہ دشمن پر شہر میں حملہ کیا جائے جن کے بارے میں یہ خبر پھیل چکی تھی کہ بہت سی کیویلری کی ان کو مدد پہنچ چکی ہے۔ ہڈسن نے مشہور طریقہ اپنائے تاکہ انہیں شہر سے باہر کھلی جگہ پر آنے کے لیے آمادہ کیا جاسکے۔ اس نے ایسے قدم اٹھائے جس سے معلوم ہو کہ وہ پسپا ہو کر واپس جارہا ہے۔ اور جب روہتک کے لوگ باہر نکل آئے تو اُس نے ان کی طرف مڑکر ان پر حملہ بول دیا۔ جس کے نتیجہ میں مقامی لوگوں کو مکمل شکست ہوئی۔ اپنی ان دو فتحوں کے ساتھ وہ چار دنوں بعد دلی واپس آیا اور اس کی بھرپور تعریف کی گئی جس کی بدولت اسے جنگ میں فتح نصیب ہوئی تھی۔

انگریزوں پر جلد ہی اس بات کا انکشاف ہو گیا کہ اگر شہر میں ان کے کچھ لوگ ان کے دوست اور وفادار ہیں تو ان کی اپنی فوج میں بھی کچھ ان کے اپنے دشمن موجود ہیں۔ 16/ اگست کو "اس طرح کی ایک کوشش کا پتہ چلا۔ ہندو راؤ کے نزدیک دو بیٹری میں بندوقوں کو مارنے کی صلاحیت کو ختم کرنے کے لیے اس میں چھوٹے چھوٹے پتھر کے ٹکڑے رکھ دئے گئے۔ اس جرم کا پتہ کسی کو نہیں چل سکا۔ لیکن بندوقوں کے کچھ خلاصی پاؤڈر میں ملاوٹ کرتے ہوئے پکڑے گئے۔ مقصد گولی چلانے کو ناممکن بنانا تھا۔ ان میں سے دو کو تو فوراً پھانسی دے دی گئی۔ بریگیڈیر وِلسن تو ہمیشہ سے ہندوستانی آرٹیلری کے افراد پر شک کرتا کیونکہ ان کی اکثریت پوربیوں کی تھی۔ مصیبت تو یہ تھی کہ وہ بغیر ہندوستانی فوجیوں کے کام بھی نہیں کر سکتا تھا لیکن ان پر بھروسہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ گورکھا اور پنجابیوں نے کیتھ ینگ کے مطابق اس طرح کے شبہہ کا کوئی موقع نہیں دیا۔ شہر میں اور شہر کی دیوار کے باہر بہت سے سکھ رہتے تھے۔

فوج آنے والے خطرات کی طرف سے بہت چوکنا ہو گئے تھے۔ انہوں نے سن رکھا تھا کہ سیج ٹرین اب آنے والی ہے۔ بہت دنوں تک برٹش آرمی میں کام کرنے کی وجہ سے انہیں اس کے نتائج سے بھی آگاہی تھی۔ اگر اسے راستے میں روکا جاسکتا تو شہر کو کچھ دنوں کے لیے بچایا جاسکتا تھا۔ وہ 24/ اگست کو 18 بندوقچیوں کے ساتھ اس کام کے لیے باہر نکلے لیکن انکا منصوبہ راز نہیں رہ سکا۔ واقعہ یہ ہے کہ برطانیہ کا خفیہ محکمہ اس قدر چاق و چوبند تھا کہ شہر میں کسی طرح کا کوئی بھی فیصلہ ہوتا اس کی اطلاع فوراً برٹش ہیڈ کوارٹر کو ہو جاتی۔ دوسرے ہی دن نکلسن دو ہزار انفنٹری اور کیویلری اور سولہ گھوڑ سواروں کے ساتھ ان کے تعاقب میں نکلا۔ سڑک بہت خراب تھی اور بارش بھی ہو رہی تھی۔ ان توپوں کو بالوؤں اور پتھروں میں لے کر چلنا آسان نہیں تھا۔ لیکن نکلسن نے سورج غروب ہونے سے پیشتر ان سے مقابلہ کرنے کا عزم کر رکھا تھا۔ اس نے انہیں نجف گڑھ نہر کی دوسری طرف دیکھا اور فوراً دشمن کے ٹھکانے پر حملہ بول دیا۔ برٹش فوج شعلہ زنی کے درمیان آگے بڑھتی رہی۔ جب تک کہ وہ بیٹری کے 30 گز کے فاصلے پر نہیں آگئے۔ نیزوں کے حملہ کے وجہ سے سپاہی بھاگنے لگے لیکن ابھی جنگ ختم نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ سپاہیوں

کا ایک دستہ عقب کے گاؤں میں ٹھہرا ہوا تھا اور انہیں ایسے ہی نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ اس لیے جنگ کو جاری رکھا گیا۔ لیکن سپاہی رات کے اندھیرے میں بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس کا مشن پورا ہو گیا تھا۔ اس لیے نکلسن رج پر واپس آگیا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اس کے بعد سیج ٹرین کو روکنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ اور یہ ٹرین بہت زیادہ بارود اور توپوں کے ساتھ 3 ر ستمبر کو اپنے مقام پر پہنچ گئی۔ ہم کو نہیں معلوم کہ ایسا بخت خاں اور غوث خاں جو نیمچ باغیوں کے افسر تھے' کی دشمنی اور رقابت کی وجہ سے ہوا یا کسی اور وجہ سے؟ لیکن بخت خاں نے کھلے عام یہ شکایت کی کہ اس کے احکام کو مانا نہیں جا رہا ہے۔ اور جلد ہی وہ کمانڈر انچیف کے عہدے سے دست بردار ہو گیا۔

اگست کے مہینے میں بادشاہ کی مالی دشواریاں اور زیادہ بڑھ گئیں۔ اب کوئی قرض لینے کی بات بھی نہیں تھی اور نہ پہلے کی طرح سے سود دینے کی بات تھی اور نہ ہی قرض دینے والوں کی طرف سے کوئی بانڈ بھرنے کی بات تھی۔ شہر میں سکہ ڈھالنے کا کارخانہ قائم کیا گیا۔ لیکن اس سے بھی کوئی سہولت پیدا نہیں ہوئی۔ اس لیے مسلمانوں اور ہندوؤں سے عطیات کی مانگ کی گئی۔ سارے بڑے بینکرز اور چھوٹے موٹے دکانداروں سے جنگی فنڈ میں عطیہ دینے کے لیے کہا گیا۔ صرف غریبوں کو اس ٹیکس سے بری کیا گیا۔ لیکن شاید بینکرز کو پہلے ہی سرکار کی شکست کا احساس ہو گیا تھا۔ بہت سے لوگوں نے اس ٹیکس کی ادائیگی نہیں کی۔ کچھ لوگوں نے اپنے کو گھروں میں محصور کر لیا۔ اور کچھ کی تو اتنی ہمت بڑھی کہ انہوں نے صاف صاف کوئی عطیہ دینے سے انکار کر دیا۔ جو ان میں کچھ چالاک تھے انہوں نے رشوت سے کام چلایا اور حکمراں طبقے کے لوگوں کو چھوٹی سی رقم کے عوض بادشاہ کے بڑے فائدے کو نظر انداز کر دیا۔ پٹودی کے محمد اکبر علی خاں نے بادشاہ سے شکایت کی کہ لکھنؤ فوج کے رسالدار شمشیر علی خاں نے ان سے بہت سی رقم لے لی ہے اور ان کی املاک کو لوٹ بھی لیا ہے۔ تب مجرم کی ہلکی سی سرزنش کی گئی اور اس کو حکم دیا گیا کہ لوٹی ہوئی املاک کو واپس کر دیں۔ بادشاہ نے مظلوم شخص سے تین سو ہزار رقم دینے کی مانگ کی۔ عوام کے لیے قرض حاصل کرنے اور عطیات کی وصولیابی کے لیے کوئی ایک شخص ذمہ دار نہیں تھا۔ فوجی شہزادے کمانڈر انچیف جنرل بخت خاں اور باغی عدالت سبھی ایک دوسرے سے الگ ہو کر پیسہ جمع کر رہے تھے اور نتیجتاً بہت سے لوگوں کو کئی بار اس طرح کا عطیہ دینا پڑا۔ جن لوگوں پر انگریزوں سے ساز باز کرنے کا شبہ تھا' ان سے بہت زیادہ مانگ کی گئی۔ جیون لال ابھی تک چھوٹ گیا تھا لیکن اگست میں اسے پچیس ہزار دینے کے لیے کہا گیا۔ مرزا الٰہی بخش نے اس کی طرف سے وکالت کی اور اسے فوری طور پر کچھ آرام مل گیا۔ لیکن بعد میں اس کے مکان پر حملہ بول کر جیون لال کو قید کر لیا گیا۔ اس کے گھر سے دو ہزار روپے کے زیورات لوٹے گئے۔ جس پر مرزا مغل نے قبضہ کر لیا۔ الٰہی بخش نے دوسری بار مداخلت کی اور اس کی گذارش کی بدولت اسے قید سے رہائی حاصل ہو گئی۔ مفتی صدرالدین بھی مشتبہ لوگوں میں تھے۔ اس لیے باغیوں نے ان سے دو لاکھ روپوں کی مانگ کی۔ ایسا لگتا ہے کہ روپے کی قیمت بہت زیادہ گھٹ گئی تھی اس لیے چالو

روپے پر چھوٹ کی مانگ کی گئی۔ کوتوال شہر کو یہ حکم دیا گیا کہ اگر کوئی شخص ایک روپے پر ایک آنہ کی مانگ کرتا ہے تو اسے سخت سزا دی جائے۔ یہ خیال بھی پیدا ہوا کہ سلیم گڑھ قلعہ کے اندر بڑا خزانہ دفن ہے اس لیے باغیوں نے وہاں کھدائی شروع کر دی۔ 31/ اگست کو حکم دیا گیا کہ صرف باغی عدالت ہی فوج کے لیے روپیہ جمع کرنے کی مجاز ہے۔

اس دوران بندوق کے پاؤڈر اور ضروری اشیا کی قلت پیدا ہو گئی۔ کھلے بازار میں باغیوں کو سلفر پاؤڈر دستیاب نہیں تھا۔ اس لیے انہوں نے دیوی داس کی دکان پر حملہ کر دیا اور وہاں سے بڑی مقدار میں سلفر حاصل کر لیا۔ بہت سے لوگوں کو صرف اس بنا پر گرفتار کیا گیا کہ وہ برٹش فوج سے ساز باز کر رہے تھے۔ سید نظیر علی جو چاندنی چوک پولس اسٹیشن کے ایک افسر تھے' ان کے بہت سے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ شہر میں کوئی قصائی نہیں موجود تھا۔ سُتلی کے بورے بھی نہیں مل رہے تھے۔ کوئی خیمہ بنانے والا بھی نہیں تھا اور مٹھائی والے ادھار مٹھائی بھی نہیں دے رہے تھے۔ کیونکہ ان کے پرانے بقایوں کی ادائیگی نہیں ہوئی تھی۔ اس نے کئی بار قلیوں کو بھیجا لیکن کوئی موچی نہیں ڈھونڈا جا سکا اور نہ ہی اسے کہیں اونٹ یا گاڑی مل سکی۔ چاندنی چوک گندگی سے بھر گئی تھی کیونکہ جھاڑو دینے والے بھی اپنا کام نہیں کر رہے تھے۔ افسر لکڑیوں کی سپلائی تو کرتے لیکن کوئی بیچہ یا حقہ دستیاب نہیں ہو سکا جس کی ہر سپاہی کو ضرورت تھی۔ نظیر علی شکایت کرتا ہے کہ اس نے گاڑیوں میں جوتنے کیلیے جو بھینسیں اکٹھا کی تھیں' اسے بھی انفنٹری کے لوگوں نے چھڑا لیا۔
ہر طرف دستکاروں اور مزدوروں کی' جن کی سپاہیوں کو شدید ضرورت تھی' قلت ہو گئی۔ سپاہیوں کے نزدیک سول حکام کی کوئی عزت نہیں تھی۔ وہ دکانوں میں گھس جاتے اور بقالوں کو تنگ کرتے۔ کمانڈر اِنچیف نے شہر میں نظم و ضبط قائم کرنے کی بہت کوشش کی لیکن ان کی کوششوں کا خاص نتیجہ نہیں نکلا۔ اگست میں حالات اس وقت اور خراب ہو گئے جب ایک سوار نے ایک عورت کا اغوا کر لیا۔ فوج کے گھسیارے بھی کھڑی فصل کو نقصان پہنچانے لگے۔ انگریزوں کو ملنے والی خبروں کے مطابق' چاہے یہ درست ہو یا غلط' سپاہی فوج کو چھوڑنے لگے لیکن فوج کو چھوڑنے کا عمل ایک طرفہ نہیں تھا۔

سیج ٹرین کے بحفاظت پہنچنے کے بعد برطانوی انجینئر نے کھلے طور پر اپنی آخری کوشش شروع کر دی۔ ایک کھائی کھود کر برٹش لائن کے داہنی طرف بیٹری قائم کی گئی۔ اس سے لاہور یا کابل دروازے کی طرف سے اچانک ہونے والے حملہ سے بچاؤ کر لیا گیا تھا اور اس سے باغیوں کو دھوکہ بھی دیا گیا۔ جون کے ابتدائی دنوں سے جب ایک چھوٹی سی فوج نے رج پر قبضہ کیا' اگست کے آخری ایام تک جب برٹش فوجی شہر پر فیصلہ کن حملہ کی تیاری کر رہے تھے' برٹش فوج کا داہنا دستہ جو ہندو راؤ کے مکان میں مقیم تھا' کو زبردست جنگ کا سامنا کرنا پڑا۔ اگر باغی اس محاذ پر کامیاب ہو جاتے تو باقی فوجیوں کا وہ صفایا کر دیتے۔ اس لیے باغی فوج نے یہ سوچا کہ داہنی طرف سے شہر پر حملہ کیا جانا چاہیے اور کھائی پار کرنے پر انہیں بڑے انعام کا اعلان بھی کیا گیا۔ ساتھ ہی

باغی عدالت نے یہ بھی اعلان کیا کہ اس کوشش میں جو لوگ مارے جائیں گے ان کے گھر والوں کو بھرپور معاوضہ دیا جائے گا۔ لیکن بائیں طرف لڈلو محل اور قدسیہ گارڈن سے انگریزوں نے کشمیری اور موری گیٹ پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہاں باغیوں نے ان دروازوں کو بغیر کسی محافظت کے چھوڑ دیا تھا۔ ٹیلر لڈلو کیسل میں تنہا گیا اور پھر وہاں پوری تیاری کرنے کے بعد واپس آگیا۔ لڈلو کیسل پر انگریزوں کے قبضے سے باغی بھونچکا رہ گئے۔ باغیوں نے اتنی بھی حفاظتی تدبیر نہیں کی کہ وہ پرانی عمارتوں کو ڈھا دیتے جو مستقبل میں دشمنوں کے لیے فائدہ مند ہو سکتی تھیں۔ جلد ہی لڈلو کیسل، قدسیہ باغ اور پرانے کسٹم ہاؤس کے سامنے تین بیٹری قائم کی گئیں۔

ایسا نہیں ہوا کہ یہ کام بغیر کسی جانی نقصان کے ہوا۔ لیکن ان میں جو جانیں گئیں وہ مسلح فوجیوں کی نہیں بلکہ غیر مسلح ہندوستانی دستکاروں کی گئیں۔ ستمبر 1857ء میں رج پر لڑنے والی فوج میں آدھے سے زیادہ ہندوستانی تھے اور کیمپ کے پیچھے چلنے والے لوگ جو فوجیوں سے زیادہ تعداد میں تھے، وہ بھی مقامی ہندوستانی تھے۔ ان کے اندر بھی ہمت کی کمی نہیں تھی اور انہوں نے موت کا سامنا عدم دلچسپی سے کیا۔ 10/ ستمبر کو جب نمبر تین بیٹری قائم کی گئی تو 39 آدمی مارے گئے۔ "یہ سب غیر مسلح ہندوستانی خدمت گار تھے۔ اور فوجی نہیں تھے۔ مقامی ہندوستانی جو بغیر کسی گرمجوشی کے اپنی بہادری دکھاتا ہے، جب ان کا کوئی آدمی مارا جاتا تو وہ ایک منٹ کے لیے رک کر اس پر آنسو بہاتے، اس کی لاش کو ایک جگہ قرینے سے رکھتے اور پھر اپنے کام میں مشغول ہو جاتے۔ برٹش فوج تو کسی مقصد سے لڑ رہے تھے۔ وہ اس حکومت کے لیے لڑ رہے تھے جنہیں ان کے مورث اعلیٰ نے قائم کیا تھا لیکن ان بدقسمت لوگوں نے صرف ایک وقت کے کھانے کے لیے اپنی جانوں کی بازی لگا دی۔ یہ ان کے بھائی لوگ تھے جو بغیر چلی گولیوں کو جمع کرنے کے لیے دوڑتے اور پھر انہیں چند سکوں کے عوض انگریزوں کو بیچ دیتے۔ دیکھنے والوں کے لیے یہ تماشہ بنے ہوتے۔ لیکن چیپلین واٹن انہیں حقارت کی نگاہ سے دیکھتا "یہ واقعہ ثابت کرتا ہے کہ لالچ اور غربت کس طرح انسانوں کو اپنی جان گنوانے پر آمادہ کر دیتی ہے۔ یہ غربت تھی، نہ کہ لالچ جس کی وجہ سے یہ لوگ اپنی جان گنوانے کے لیے بھی تیار ہو گئے تھے۔"

خندق کی کھدائی اور تین بیٹریوں کے قیام کا کام چار راتوں میں ختم ہو گیا اور چوتھی بھی تقریباً مکمل ہو گئی تھی۔ انجینئرز نے اور تیز کام کرنے کی امید دلائی اور اسی حساب انہوں نے کام بھی کیا۔ لیکن اپنے بے چین رفیقوں کی طرف سے انہیں اس کی کوئی تعریف نہیں ملی۔ کیتھ ینگ نے 16/ تاریخ کو جب تیسری بیٹری تکمیل کے مرحلہ میں تھی، لکھا۔ "سارا قصور ان انجینئرز کا ہے جنہوں نے جنرل کو غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے کہا تھا کہ وہ بہت کم مدت میں ساری بیٹری قائم کر لیں گے۔ انہوں نے تو ایک ہی رات میں سارا کام مکمل کر لینے کی بات کہی تھی لیکن کسی کو اس پر یقین نہیں تھا۔ لوگوں کو امید تھی کہ دو یا تین راتیں لیں گے۔ لیکن چوتھی رات بھی گزر گئی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ انجینئرز نیک نفس لوگ ہیں۔ ان کے بارے میں کوئی شبہ بھی نہیں لیکن وہ ناممکنات کو

کر دکھانے کے بعد اپنی تعریف چاہتے تھے۔'' یہ سارے انجینئر ابھی نوجوان تھے اور نوجوانی کے جوش میں انہوں نے آنے والی دقتوں کا کوئی خیال نہیں کیا' جسے معمر لوگ یقیناً ملحوظ رکھتے۔ تاہم انہوں نے بھرپور کوشش کی اور تاریخ' دلی پر قبضہ کے لیے انھیں ہر طرح سے قابل ستائش سمجھتی ہے۔

11/ اگست کی صبح توپوں سے دیواروں پر گولے برسنے شروع ہوئے اور 13/ تاریخ کو ان میں دو جگہ شگاف پڑ گئے۔ لیفٹیننٹ مڈلے نے رات کے اندھیرے میں ان شگافوں کی جانچ کی اور انہیں سود مند پایا۔ فیصلہ کیا گیا کہ دوسرے دن صبح شہر پر یلغار کی جائے۔ انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور عمل کا وقت آ گیا۔ یہ لمحہ جان نکلسن کا تھا۔ کیمپ میں یہ بات راز نہیں رہ گئی تھی کہ حملہ کے بارے میں ولسن کو اب بھی شبہ تھا لیکن رچرڈ بیرڈ اسمتھ کے بار بار اصرار کے بعد انہوں نے اس کی اجازت دے دی۔ انہیں مشرق کی طرف سے کوئی مدد کی امید نہیں تھی اور مغرب کی طرف وہ مزید کمک نہیں بھیج سکتے تھے۔ نکلسن کو ہر طرح سے امید تھی کسی طرح کا خطرہ اس کے اعتماد کو متزلزل نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اس جوکھم بھرے کام کے لیے ہر طرح تیار تھا اور فطرتاً وہ ہی اس کا لیڈر تھا۔ حملہ آور فوج کو چار کالموں میں تقسیم کیا گیا۔ پہلا کالم جس کی کمانڈ خود نکلسن کر رہا تھا' وہ ان شگافوں پر کشمیری گیٹ کی طرف سے حملہ کرتا۔ دوسرا کالم جس کی قیادت بریگیڈیر جانس کر رہا تھا' وہ پانی کی طرف سے دوسرے شگاف پر حملہ آور ہوتا۔ تیسرا کالم کرنل کیمپبل کی قیادت میں کشمیری دروازے کو توڑ کر شہر میں داخل ہونا تھا جبکہ چوتھا کالم لاہوری گیٹ سے پہاڑ پور اور کشن گنج کے علاقوں کو صاف کر کے شہر میں داخل ہوگا۔ اس کالم کی کمانڈ ہندو راؤ کے مکان کے ہیرو میجر ریڈ کر رہے تھے۔ جس نے ابھی تک باغیوں کے حملے کا کئی بار مقابلہ کیا اور انہیں پسپا کیا۔ ریزرو کالم بریگیڈیر لانگ فیلڈ کی قیادت میں تیار ہو گیا تھا لیکن ایک دن کے لیے اسے حملہ کرنے سے روک دیا گیا۔ میڈلے کی فوج کی پیش قدمی سنتریوں کے لیے راز نہیں رہ گئی تھی اور خاص شگاف کو رات میں بھر دیا گیا تھا لیکن انگریزوں کی خوش قسمتی کہ اسے چونا اور پتھر سے نہیں بلکہ ریت کے بوروں سے بھرا گیا تھا۔ اس لیے شگاف کرنے والی بیٹری نے دوبارہ گولے برسانے شروع کیے اور جلد ہی اس شگاف کو خالی کر لیا گیا۔

بیرڈ اسمتھ شہر کو اچھی طرح جانتا تھا اس لیے اس نے اور اس کے لوگوں نے ہر بات تفصیل سے لکھ دی تھی اور اس کی کاپی ہر کمانڈنگ افسر کو دے دی گئی تھی۔ لیکن جنگ کی بھی اپنی قسمت ہوتی ہے۔ ریڈ کی فوج نہ صرف اپنا مقصد پورا کرنے میں ناکام رہی بلکہ اسے پسپا بھی ہونا پڑا۔ اس کے گورکھا' جموں کی فوج کے ساتھ مل کر آر سی لارنس کی قیادت میں لڑ رہے تھے۔ حملہ کے شروع میں ہی میجر ریڈ زخمی ہو گیا اور اسے عقب کی جانب لے جایا گیا۔ تبھی باغیوں نے محسوس کیا کہ ان پر زبردست حملہ ہوگا اور اسی لیے انہوں نے پورے جوش کے ساتھ حملہ بول دیا۔ جموں کی فوج شکست کھا گئی جبکہ دوسرے لوگوں نے بھی کچھ خاص کارکردگی کا مظاہرہ

نہیں کیا۔ پورا کالم ہی پسپا ہوتے ہوئے سبزی منڈی کی طرف گیا اور ہوپ گرانٹ کے گھوڑ سوار بھی لاہوری گیٹ سے چلنے والی توپ کے گولوں سے مر گئے۔ اگر باغیوں کے پاس کوئی تجربہ کار سردار ہوتا تو اس کامیابی کا وہ خاطر خواہ فائدہ اُٹھاتا۔ اگر اس نے برٹش کیمپ کے پیچھے سے حملہ کر دیا ہوتا تو نہ صرف شہر محفوظ رہ جاتا بلکہ برطانیہ کی حملہ آور فوج دو طرف سے گولیوں کی زد میں آجاتی۔ لیکن اس دن دلی کی فوج میں ایک شخص بھی ایسا نہیں تھا جسے یہ معلوم ہوتا کہ کب اور کہاں سے حملہ کرنا ہے۔ چوتھے کالم پر ہوئی فتح سے بھی دلی کو نقصان سے بچایا نہیں جاسکا۔

نکلسن کی قیادت میں پہلا کالم شگاف سے اندر داخل ہو کر موری گیٹ پر قابض ہو گیا اور یہ اس وقت تک آگے بڑھتا رہا جب تک کہ کابل گیٹ پر قبضہ نہیں کر لیا۔ جہاں سے وہ برن بیسشن کی طرف آگے بڑھے لیکن اب مزید آگے بڑھنا ان کے لیے ناممکن تھا۔ باغیوں نے ایک ایک انچ کے لیے زبردست مزاحمت کی لیکن حملہ آور فوج کو ان کی توپوں سے بہت نقصان ہوا۔ ان کے افسران ان کی ہر طرح سے ہمت بڑھاتے رہے۔ لیکن انسانی شجاعت کی بھی ایک حد ہوتی ہے، جب جب وہ آگے بڑھے، بچاؤ کرنے والوں کی گولیوں کا شکار ہو گئے۔ میجر جیکب زخمی ہو کر گر گیا اور جلد ہی نکلسن ان کی جگہ لینے کے لیے آگیا۔ اپنے آدمیوں کو آواز دے کر کہ وہ ان کے پیچھے آئیں، وہ خود آگے بڑھا لیکن فوراً ہی گولی کھا کر گر گیا۔ اتنی زیادہ جانوں کا نقصان ہوا کہ کابلی دروازے کی طرف پسپا ہونے پر مجبور ہونا پڑا۔

دوسرا کالم جس کی قیادت جانس کر رہا تھا وہ شگاف کے ذریعہ برجیوں پر چڑھ گیا لیکن نکلسن کے آدمیوں سے آگے نکلنا اس کے لیے بھی ناممکن ہو گیا۔ تیسرے کالم نے اپنے مقصد کو پورا کر لیا اور برٹش انڈین فوج کی تاریخ میں اپنا نمایاں نام درج کرا لیا۔ کشمیری گیٹ پر پہنچ کر انہوں نے دیکھا کہ پل کو نقصان پہنچا دیا گیا ہے لیکن انہوں نے باقی بچے شہتیروں کی مدد سے بندوق کے بارودوں کے ساتھ اسے پار کر کے دروازے کے اس طرف پہنچ گئے اگرچہ لگاتار چھوٹنے والی توپوں سے ہر طرف موت برس رہی تھی۔ آدمی پر آدمی زخمی ہو کر یا مر کر گر رہے تھے۔ کسی طرح سے انہوں نے بارودوں میں آگ لگانے میں کامیابی حاصل کر لی۔ دروازے زوردار آواز کے ساتھ پھٹ کر دور جا پڑے اور بگل نے انہیں آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ اس فتح کے نمائندہ کردار لیفٹیننٹ ساکیڈ اور ہوم کارپورل برگیس، سرجنٹ اسمتھ اور چار میکائیل، حولدار مادھو اور تلک سنگھ اور سپاہی رام ناتھ تھے۔ پھر تیسرے کالم نے اپنی ترتیب دوبارہ منظم کی اور شہر میں جامع مسجد تک گھس گئے۔ مسجد کی میناروں سے لگاتار ہونے والی گولی باری سے وہ پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گئے لیکن دن کے خاتمے پر برٹش فوج نے شہر کی دیواروں کے ایک حصہ پر قبضہ کر کے شہر میں اپنے قدم جما لیے۔ آفیسر اِس رات اسکنر ہاؤس میں سوئے۔ چرچ اور کالج کی بلڈنگ بھی ان کے قبضہ میں آگئی۔ لیکن اس کے لیے بہت زیادہ جانوں کو انہیں کھونا پڑا۔" 1104 فوجی 66 افسر یعنی ہر نو میں سے دو آدمی یا تو زخمی ہو گیا تھا یا مر گیا تھا۔ انجینئر کے ساتھ جو 18 افسر تھے ان میں سے ایک مر گیا

تھااور آٹھ بری طرح زخمی ہو گئے تھے۔"

ولسن فطری طور پر بہت پریشان تھا۔ سلیم گڑھ کا قلعہ اب بھی باغیوں کے قبضہ میں تھااور باغیوں کے پاس ہتھیار بھی بہت تھے۔ ہر سڑک کی حفاظت دونوں طرف بنے ہوئے مکانوں سے کرنی تھی۔ کیا یہ دانشمندی ہو گی کہ وہ اتنے کم آدمیوں کے ساتھ اب بھی محاذ آرائی کرے؟ وہ سوال کرتا۔ کیا وہ شہر کو چھوڑ کر ایک بار پھر رج کی حفاظت پر چلا جائے اور وہاں مزید کمک کا انتظار کرے۔ ناامیدی کے اس مشورے کی بیرڈ اسمتھ نے سختی سے مخالفت کی۔ نکلسن مرتے ہوئے کراہا۔ انگریزوں کی خوش قسمتی کہ دانشمندی شجاعت پر فتح پا گئی لیکن دوسرے دن کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ ولسن کی ہچکچاہٹ صرف خوف کی وجہ سے نہیں تھی۔

چارلس جان گریفتھس جو دلّی میں ولسن کی فوج کے ساتھ تھا' وہ 15/ ستمبر کے واقعات قلم بند کرتا ہے۔ "برٹش فوج کی عادت ہر زمانے میں بے تحاشہ پینے کی رہی ہے۔ نہ تو وہ اس عادت کو امن کے زمانے میں بھی چھوڑتی اور جب جنگ ہو رہی ہو تو اس کی یہ طلب دس گنا بڑھ جاتی ہے اور جبکہ معاملہ دلی کا ہو۔ کب اور کس نے یہ شروع کیا میں نہیں جانتا لیکن 15/ تاریخ کی صبح سبھی اسٹور پر دھاوا بول دیا گیا تھا اور فوجیوں نے ہر طرح کی شراب بے تحاشہ پی ڈالی۔ حالانکہ یہ ریکارڈ کے لیے اچھی بات نہیں ہے کیونکہ اس کے بعد سے پیدا ہونے والی مستی فوج کے لیے بہت بری ثابت ہوتی اگر دشمنوں نے ہماری اس حالت کا فائدہ اُٹھا لیا ہوتا۔ اسے روکنے کی ہر طرح سے کوشش کی گئی اور جب جنرل کا یہ آرڈر پہنچا کہ جو بھی شراب ملے اسے پھینک دیا جائے' تبھی یہ مستی رُکی اور تب سپاہیوں نے شرم محسوس کی۔ اسے پھینکنے کا کام خاص طور پر سکھوں اور پنجابیوں نے کیا۔ لیکن باغیوں نے دشمن فوج کی خاموشی کو محسوس نہیں کیا اور صرف شام کے وقت انہوں نے کالج کمپاؤنڈ میں اور آس پاس کے مکانوں میں سلیم گڑھ سے گولیاں چلانی شروع کیں۔"

16/ تاریخ کو میگزین پر قبضہ پا لیا گیا۔ 17 سے 19/ تاریخ تک سلیم گڑھ پر لگاتار بم باری کی گئی اور انگریزوں کی فوج آگے بڑھتی گئی۔ 20/ تاریخ کو محل اور سلیم گڑھ قلعہ میں داخل ہو گئے۔ وہاں کوئی بھی شخص مزاحمت کے لیے موجود نہیں تھا سوائے ان چند لوگوں کے جو بے عزتی پر موت کو ترجیح دیتے تھے۔ شہر کو خالی کرا دیا گیا۔ لیکن لاپروائی برتتے ہوئے وہ اپنی جگہوں پر مستعد رہے۔ ایسا کہا جاتا ہے۔ Kaye کا کہنا ہے "ہر دروازے پر ایک سنتری کھڑا تھا اپنے کندھے پر گولا بارود لیے ہوئے۔ سنجیدہ لیکن غیر متزلزل' اپنے انجام کے لیے تیار۔ محل میں پایا جانے والا کوئی بھی شخص زندہ نہیں چھوڑا گیا۔ اور نہ ہی کسی نے رحم کی طلب کی۔ کوئی نہیں جانتا کہ ان بے نام بہادروں کی تدفین کہاں اور کس نے کی؟"

اس رات جنرل ولسن نے اپنا ہیڈ کوارٹر محل میں منتقل کیا۔ "انگریزوں نے اپنی فتح کا جشن دیوان خاص میں کھانے کا حکم دے کر منایا۔ دیوان خاص جس میں ہر طرف سنگ مرمر کی دیواریں

سونے اور چاندی سے مزین آرٹ کے نمونوں سے آراستہ کھمبے تھے۔ جس کی شان و شوکت اور خوبصورتی کے آگے انیسویں صدی کے انگریزوں کے فنی کارنامے جنگلی اور مضحکہ خیز ثابت ہوئے۔

اس طرح دلی پر قبضہ مکمل ہو گیا لیکن کس قیمت پر اور کتنی انسانی جانوں کے ضائع ہونے پر۔ صرف انگریزوں کی طرف سے 3837 فوجی یا افسر مارے گئے یا زخمی ہوئے اور لاپتہ ہوئے' صرف 30/ مئی سے 20/ ستمبر کے درمیان۔ اس کے علاوہ انفرادی رجمنٹس کو جو نقصان ہوا وہ ناقابل بیان ہے۔ سیمور گورکھا جو ہندو راؤ کے مکان میں مقیم تھے اور جنھوں نے برٹش فوج کی داہنی طرف سے حفاظت کی۔ شروع میں ان کی تعداد صرف 450 تھی۔ بعد میں 90 آدمی ان کی مدد کو اور پہنچے۔ اس طرح 540 آدمیوں میں سے 60 فیصد یا تو مارے گئے یا زخمی ہوئے۔ دلی کے لیے ہوئی جنگ میں کتنے فوجیوں کی جان گئی اس کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ باغی فوجیوں کی تعداد کا شہر کے اندر کوئی حساب نہیں لگایا جا سکا۔ حملہ کی رات میں ولسن کا اندازہ 40 ہزار آدمیوں کا تھا۔ جبکہ ہڈسن ان کی تعداد ستر ہزار بتاتا ہے۔ اگر ہم پہلی تعداد کو ہی بھروسہ مند سمجھیں تو ہمیں نہیں معلوم کہ ان میں سے کتنے نئے بھرتی ہوئے تھے اور کتنے غازی اور جہادی ان میں داخل ہوئے تھے۔ دلی کی حفاظت کرنے والی باغی فوجیوں کی تعداد اور ان کے جانی نقصان کے بارے میں مبالغہ سے کام لیا گیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود حملہ آور برٹش اور ہندوستانی فوجیوں کی کامیابی جو انہوں نے بڑی مشکلات سے حاصل کیں' کم نہیں کہا جا سکتا۔ برٹش فوجی دیوار سے پیٹھ لگا کر لڑ رہے تھے' نہ صرف مرے ہوئے لوگوں کا بدلہ لینے کے لئے بلکہ زندہ لوگوں کی حفاظت کے لیے بھی۔ جبکہ اس کے علاوہ بہت سے چاپلوس اور خود غرض لوگوں نے بھی اپنے غیر ملکی آقاؤں کے لیے شجاعت اور وفاداری کا ثبوت دیا۔ گرفتھ لکھتا ہے۔ "مقامی فوجیوں نے بہت زیادہ شجاعت اور وفاداری کے ساتھ انگریزی فوج میں شامل ہو کر مقابلہ کیا۔ ان میں سکھ پنجابی اور گورکھا بھی انگریزوں کے ساتھ آگے آگے تھے اور انہیں کی بدولت اس دن فتح نصیب ہوئی۔"

لیکن یہ فتح بھی اس وقت تک ادھوری رہتی جب تک بادشاہ اور شہزادے آزاد تھے۔ بخت خاں نے بادشاہ کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ فوج کے ساتھ اودھ چلے جائیں اور وہاں سے جنگ جاری رکھیں لیکن الٰہی بخش نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ چند شرائط کے ساتھ شکست قبول کر لیں۔ ان کے اس مشورہ کو مزید تقویت ملکہ کے اصرار سے بھی ملی۔ وہ ہر قیمت پر اپنے بیٹے اور ان کے والد کو بچانا چاہتی تھی اور یہ بھی امید کر رہی تھی کہ اس طرح وہ اپنے کل زیورات اور نقدی بھی بچا لے گی۔ صرف ایک کو چھوڑ کر باقی کسی بھی شہزادے کو نہ وہ جرأت اور توانائی وراثت میں ملی تھی جس کی بدولت بابر نے اپنا ملک ہارنے کے بعد ایک نئے ملک اور سلطنت کی بنیاد رکھی تھی۔ شہزادہ فیروز شاہ اس وقت دلی میں نہیں تھے۔ مرزا مغل' مرزا خضر سلطان اور مرزا ابو بکر کے اندر ایک دوسری ہی امید کروٹ لے رہی تھی کہ وہ اپنی شہنشاہیت کو بچا لیں گے۔ کیونکہ قلیل عرصے میں انہیں جو اختیارات حاصل ہوئے تھے اس میں انہوں نے سازشیں کر کے گروپ بنا لیا تھا اور اب

انہیں صرف اس بات کی فکر تھی کہ وہ کسی بھی صورت سے اپنی اس شہنشاہیت کو محفوظ کر لیں۔ بادشاہ پہلے تو قطب چلے گئے۔ مرزا الٰہی بخش نے ان سے اصرار کیا کہ وہ ہمایوں کے مقبرے میں واپس آ جائیں۔ برٹش خفیہ نظام کے مولوی رجب علی نے ہڈسن کو ان بھگوڑوں کے بارے میں پوری اطلاع فراہم کی۔ ہڈسن جنرل ولسن کے پاس گیا اور ان سے اس بات کی اجازت حاصل کر لی کہ وہ الٰہی بخش کے ذریعہ بادشاہ کو کہیں گے کہ اس شرط کے ساتھ خود کو سپرد کر دیں کہ ان کی جان بخش دی جائے گی۔ یہ سیاسی چال تھی اور عام طور پر اس طرح کے سیاسی مذاکرے کیمپ میں موجود سویلین افسر کیا کرتے تھے۔ یہ ذمہ داری ہاروے گریٹ ہیڈ کی تھی لیکن گریٹ ہیڈ کی ہیضہ سے 20/ تاریخ کو موت ہو گئی اور ان کی جگہ سانڈرس نے لی۔ ہڈسن نے انہیں جنرل کے حکم کی زبانی اطلاع دے کر یہ کہا کہ شاہ کی جاں بخشی کے وعدے پر وہ ان سے خود سپردگی کے لیے کہیں گے۔ ہڈسن نے اپنے دائرۂ اختیار سے باہر جا کر شہزادہ جواں بخت اور بادشاہ کے سسر احمد قلی خاں کی جاں بخشی کر دی۔ اس کے اس عمل کی بہت سے انگریزوں نے جو اچھے مرتبوں پر فائز تھے، کھل کر تنقید کی۔ کیونکہ وہ محل میں ہوئے قتل و غارت گری کے لیے بادشاہ کو ہی ذمہ دار سمجھتے تھے۔ سسل بیڈان نے میور کو 13/ اکتوبر کو لکھا "میرے نزدیک یہ سب سے غلط اور بدبختی کی بات ہے کہ دلی کے بادشاہ کے ساتھ کسی طرح کی شرط رکھی جاتی جو اس لائق تھا کہ اسے بغیر مقدمہ چلائے فوراً سزا دی جائے۔ جیسی سزائیں اس کے لڑکوں اور پوتوں کو دی گئیں ...... میں اس بات میں ذرا بھی شک نہیں کر سکتا کہ وہی سب سے بڑی شخصیت ہے جسے فوری طور پر موت کی سزا دی جانی چاہئے تھی اور مجھے یقین ہے کہ اسے محل کی دیواروں کے پاس پھانسی دی گئی ہوتی تو پورے ملک میں اس کا اچھا اثر پڑتا لیکن ہمارا ایسا نہ کرنا اس بات سے منسوب کیا جائے گا کہ ہم خوفزدہ ہو گئے۔" بادشاہ پر جب مقدمہ چلایا گیا اور ان کے خلاف جو شہادتیں پیش کی گئیں انہیں غیر جانبدارانہ طریقے سے دیکھنے سے ہی معلوم ہو جائے گا کہ وہ حالات کے شکار تھے۔ ان کے اندر جسمانی اور نہ دماغی طور پر اتنی طاقت تھی کہ وہ حالات کا رُخ پھیر سکیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے نذر کی رسم ختم کئے جانے پر احتجاج کیا ہو جو ان کے پیش روؤں کو پیش کی جاتی تھی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جب کہیں بھی انگریز دشواری میں پڑے ہوں تو انہیں پُر سکون انبساط حاصل ہوا ہو لیکن انہوں نے کبھی بغاوت کی چنگاری نہیں بھڑکائی اور نہ ہی وہ محل میں قیدیوں کو قتل کئے جانے کے ذمہ دار تھے۔ یہ ان کی بدبختی تھی کہ وہ ایک مجبور شخص کی طرح قتل کا نظارہ کرتے رہے لیکن انہیں روکنا ان کے بس سے باہر تھا اور نہ ہی اس بات کی کوئی شہادت ملتی ہے کہ اس جرم میں مرزا مغل کو ملوث پایا گیا ہو۔ ان پر الزام رکھا گیا کہ وہ اپنی چھت سے اس قتل کا منظر دیکھتے رہے۔ لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس نے اس میں کوئی حصہ لیا ہو۔

21/ ستمبر کو بادشاہ نے ہڈسن کے سامنے خود سپردگی کر دی۔ انہیں دلی واپس لایا گیا۔ دوسرے دن ہڈسن پھر ہمایوں کے مقبرے میں گیا اور شہزادوں سے کہا کہ وہ بغیر کسی شرط کے خود

سپردگی کردیں۔ وہ اس بات کی فضول کوشش کرتے رہے کہ انہیں یقین دلایا جائے کہ ان کی جاں بخشی کر دی جائے گی۔ مرزا مغل، مرزا خضر سلطان اور مرزا ابو بکر کو ایک بیل گاڑی میں ڈال دیا گیا۔ ہڈسن کا کہنا ہے کہ وہاں بہت سے مسلح لوگ جمع ہو گئے لیکن انہیں غیر مسلح کرنے میں اسے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ پھر وہ انہیں لے کر دلی کی طرف چلا اور ان کے پیچھے بھیڑ چلتی رہی۔ جب پارٹی دلی گیٹ کے پاس پہنچی تو ہڈسن نے قیدیوں کو حکم دیا کہ وہ اپنے کپڑے اُتار دیں اور پھر اپنے ہاتھوں سے ان پر گولیاں چلا دیں۔ اس نے اپنے اس عمل کی تاویل یہ پیش کی کہ لوگوں کی بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی اور شاید وہ غصہ میں آ کر انہیں بچانے کی کوشش کرتے۔ اس لیے اپنی اور اپنے لوگوں کی حفاظت کے لیے اسے ایسا کرنا پڑا۔ ہڈسن کے اس عمل کی بہت سے دوسرے لوگوں نے بھی تائید کی جیسے سویلین افسر سسیل بیڈان جسے اس قتل کے بارے میں اپنا جواز پیش کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی تھی، اس لیے اس پر کوئی حیرت نہیں ہونی چاہئے کہ عام عورت اور مرد جو بدلے کے طلب گار تھے انہیں اس عمل میں کوئی غلطی نظر نہیں آئی۔ لیکن اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ہمایوں کے مقبرے سے لے کر شہر کی دیوار کے درمیان تمام کھلی ہوئی جگہ میں اس نے کسی قسم کا کوئی خطرہ محسوس نہیں کیا۔ اور شہر کے دروازے پر آ کر اس نے اپنے لیے خطرہ محسوس کیا۔ اس سے ایک دن پہلے جب وہ بادشاہ اور ملکہ کو قیدی بنا کر شہر میں لایا تو بھی اسے مجمع کی طرف سے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوا۔ کچھ بھی ہو شہزادوں کی قسمت کا فیصلہ تو اسی لمحہ ہو گیا تھا جب انہوں نے اپنے کو سپرد کر دیا تھا۔ سوال صرف یہ تھا کہ پھانسی کا پھندہ یا بندوق کی گولی دونوں میں سے کون ان کی قسمت میں ہے۔ اس کے بعد شاہی خاندان کے اکیس شہزادوں کو پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ اور یہی حشر بلب گڑھ کے راجہ اور جھجھر کے نواب کا ہوا۔ ان دونوں نے بادشاہ کو اپنا خراج پیش کیا تھا اور غدر کے حامی ہو گئے تھے لیکن دونوں نے دوسری پارٹی سے بھی مراسلت کا سلسلہ جاری رکھا۔ بلکہ راجا نے تو بغاوت کے ابتدائی دنوں میں بہت سے انگریز بھگوڑوں کو اپنے یہاں پناہ بھی دی تھی اور اگر ایک سال کے بعد ان پر اس وقت مقدمہ چلایا جاتا جب انگریزوں کو یہ احساس ہو چلا کہ یہ انتقامی کارروائی زیادہ دنوں تک جاری نہیں رکھی جا سکتی تو شاید ان کی جاں بخشی کر دی جاتی لیکن دلی کی شکست کے بعد جب محل میں ان کے کچھ خطوط پائے گئے تو ان کی اس دوہری چال کا پتہ لگ گیا۔ ورنہ ان کی سازش کبھی بے نقاب نہ ہوتی۔

بادشاہ کے لیے بہتر ہوتا کہ انہوں نے جان کی امان نہ طلب کی ہوتی۔ ان کے ساتھ ایک خطرناک مجرم کا سا رویہ روا رکھا گیا۔ یہ صحیح ہے کہ انہیں زنجیروں میں نہیں جکڑا گیا۔ لیکن انہیں اس انداز میں رکھا گیا کہ ہر انگریز مرد و عورت جو دلی سے گزرے، وہ ان کی تنہائی میں مخل ہو اور حقارت کی نگاہ ان پر ڈالتے ہوئے تھوک دے۔ گرفتھ جس نے انہیں 22 ستمبر کو سپردگی کے ایک دن کے بعد دیکھا، لکھتا ہے "کسی آنگن کے برآمدے میں ایک چارپائی پر بستر کے سہارے پالتی مارے سر جھکائے بیٹھا ہوا وہ شخص کسی بھی صورت میں عظیم مغل حکومت کا نمائندہ نہیں

نظر آ رہا تھا۔ نہ تو اس کی شکل سے کوئی شان و شوکت ٹپک رہی تھی' نہ جلال' سوائے ایک سفید لمبی داڑھی کے' جو اس کی ناف تک پہنچ رہی تھی۔ میانہ قد اور ستر سال سے زیادہ عمر کا وہ بوڑھا سفید کپڑوں میں' سفید صافہ باندھے ہوئے تھا۔ جس کے پیچھے دو خدمت گار مور کے پنکھ سے بنا ہوا پنکھا جھل رہے تھے جو شہنشاہیت کی واحد علامت تھی اور یہ بڑی مضحکہ خیز صورت تھی۔ خاص طور پر اس وقت جب وہ اپنے دشمن کے ہاتھوں میں ایک قیدی تھا۔ اس کے ہونٹوں سے ایک لفظ بھی نہیں نکلتا۔ وہ خاموشی کے ساتھ دن رات بیٹھا رہتا۔ اس کی نگاہیں زمین کی طرف جھکی رہتیں۔ وہ شاید اس حالت سے بے نیاز ہو چکا تھا جس میں وہ اس وقت مبتلا تھا۔ بادشاہ سے تین فٹ دور محافظ بیٹھا ہوا تھا۔ جبکہ دو چاق و چوبند یورپین سنتری جن کی بندوقوں میں سنگینیں لگی تھیں' دونوں طرف کھڑے تھے۔ انہیں یہ حکم تھا کہ اگر بادشاہ ذرا بھی فرار ہونے کی کوشش کرے تو وہ اسے اپنے ہاتھوں سے مار دیں۔ ریکس نے انہیں 18/ دسمبر کو دیکھا۔ 19/ تاریخ کو اس نے لکھا "کل ہم سب عورت اور مرد بشمول مسٹر اور مسز سائنڈرس بادشاہ کو دیکھنے گئے۔ وہ نوے سال کا ایک نحیف و نزار شخص ہے۔ میں نے اسے ایک بستر پر ایک چھوٹی سی کوٹھری میں بیٹھے ہوئے دیکھا جہاں پہلے کوئی حقیر شخص رہا کرتا تھا۔ میں ان کے قریب ہی رکھی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے سنا کہ شاید وہ اپنا کوئی خواب یا اپنی ہی لکھی کوئی غزل دھیرے دھیرے دوہرا رہے تھے۔ میں پھر انہیں مخاطب کئے بغیر واپس چلا آیا۔" ملکہ بھی آنے والوں کی حقارت بھری نگاہوں سے نہیں بچ سکی اور اکثر بہت سی دیکھنے والی عورتیں انہیں سخت سست صلواتیں بھی سناتیں۔ مسز کوپ لینڈ جن کا شوہر گوالیار میں مارا گیا تھا' وہ بھی ان بے چارے قیدیوں کو دیکھنے گئی۔ لیکن اسے ان میں شہنشاہیت کے کوئی آثار نہیں دکھائی دئے۔ وہ لکھتی ہے۔ "ہم محرابوں سے زینہ بہ زینہ نیچے گئے۔ جہاں کچھ محافظ سپاہی دروازے کے باہر ٹہل رہے تھے اور پھر ایک گندے سے مکان میں داخل ہوئے۔ جو اس وقت شاہوں کے شاہ اور بڑے مغل شہنشاہوں کے جانشین کا مسکن تھا۔ پردہ ہٹا کر ایسے چھوٹے سے تنگ گندے کمرے میں داخل ہوئے جس کی دیواروں پر سفیدی پوتی ہوئی تھی اور وہاں ایک نیچی سی چارپائی پر ایک بوڑھا آدمی سر جھکائے بیٹھا ہوا تھا۔ جس کے جسم پر گندہ سفید لباس تھا اور جو پھٹی پرانی رضائی ٹھنڈ کے سبب اوڑھے ہوا تھا۔ جب ہم اندر داخل ہوئے تو اس نے اپنے حقہ کو جسے وہ پی رہا تھا' کنارے کر دیا۔ وہ شخص جو اپنے برابر کسی کے بیٹھنے پر ہتک محسوس کرتا تھا' اس نے جھک جھک کر ہم لوگوں کو سلام کرنا شروع کیا اور کہا کہ ہمیں دیکھ کر اسے بڑی خوشی ہو رہی ہے۔ رسل' جس نے انہیں بہت بعد میں دیکھا' اسے اس کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آئی کہ وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا مشکور ہو تا کیونکہ اس کے نزدیک بادشاہ ایک ظالم شخص تھا۔ "جس نے اپنے محل کی چار دیواری کے اندر بے دردی سے قیدیوں کو قتل کئے جانے کا حکم دیا تھا۔" تاہم اس نے قیدی اور اس ماحول کے بارے میں جو بیان کیا ہے وہ بہت دردناک ہے۔ "ایک گندے اندھیرے راستے سے جو کھلے آنگن سے ہو کر گزرتا ہے جہاں ہم کھڑے ہوئے تھے اور اس کے

پیچھے وہ ایک اندھیرے، کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اپنی چھوٹی سی ننگی چارپائی پر ایک منحنی شخص جو بہت معمولی لیکن گندے لباس میں ملبوس تھا اس کے پتلے پتلے اور ننگے پیر تھے لیکن اس کے سر پر ایک پتلی سی دو پلی ٹوپی تھی۔" ملاقاتیوں کی آمد کے بارے میں بادشاہ سے کوئی وقت طلب نہیں کیا جاتا کیونکہ وہ اس وقت بیمار تھا اور پیتل کے ایک بیسن میں کانپتے ہوئے بلغم تھوک رہا تھا۔ شہزادہ جواں بخت بھی بیمار تھا، لیکن کسی کی بھی آمد پر اسے کھڑے ہو کر خوش آمدید کہنا پڑتا اور اس وقت تک آرام نہیں کر سکتا تھا جب تک کمشنر اسے اجازت نہ دیتا۔ جب اس پر مقدمہ چلایا جا رہا تھا تو نہ ججوں نے اور نہ ہی وکیلوں نے بادشاہ کے ساتھ معمولی سا ادب بھی ملحوظ رکھا۔ وہ خاموشی سے صرف اپنی شاعری کیا کرتا اس کے پاس کاغذ اور قلم بھی نہیں تھا۔ کوئلے سے قید خانے کی دیواروں پر اپنے اشعار لکھا کرتا۔ ایک وقت یہ بھی مشورہ دیا گیا کہ اسے انڈمان کے جزیرے میں بھیج دیا جائے جہاں مجرم رکھے جاتے تھے۔ کبھی جلا وطنی کے لیے افریقہ صحیح ملک سمجھا جاتا۔ سسل بیڈون نے مشورہ دیا کہ چین کا ساحلی علاقہ ہانگ کانگ مناسب رہے گا لیکن آخر کار اسے رنگون بھیجا گیا۔ جہاں برما میں اس نے دم توڑ دیا۔ بہادر شاہ اپنی اس بد قسمتی کے لیے کسی کو الزام بھی نہیں دے سکتا کیونکہ اگر اس کے پاس فوج ہوتی اور جنگ کے میدان میں وہ لڑتے ہوئے مارا جاتا تو اسے اپنے ہم وطنوں سے اور شاید دشمنوں سے بھی عزت و توقیر ملتی لیکن اس نے چپ چاپ بزدلی کے ساتھ خود سپردگی کر دی۔ پہلے تو سپاہیوں کی طاقت سے اسے لالچ آئی اور بعد میں رجب علی اور الٰہی بخش نے جاں بخشی کی لالچ دلائی اور وہ مر گیا قسمت کا مارا ایک اجنبی ملک میں اپنے موروثوں کے ملک سے دور بغیر کسی عزت یا مرثیہ کے، کوئی اس پر آنسو بہانے والا بھی نہ تھا۔

دلی اور یہاں کے لوگوں کے ساتھ اور بھی سخت مظالم ہوئے۔ حملے سے پہلے ہر طرف انعام کے لالچ میں ایجنٹس (پرائز ایجنٹ) مقرر کئے گئے تھے اور جنرل ولسن نے انہیں سختی سے عورتوں اور بچوں کے ساتھ تشدد آمیز رویہ رکھنے سے منع کر دیا تھا۔ لیکن ایسا کون سا فوجی ہے جو فتح کے نشہ میں رحم کے حکم کو مانے۔ سکھوں کو خاص طور پر اس پیشن گوئی کی یاد دلائی گئی۔ جس میں گرو کے معتقدین کو دلی کی تاراجی کے بارے میں کہا گیا تھا۔ لوٹ مار کی لالچ کو لے کر وہ برٹش فوج میں داخل ہوئے تھے۔ ساتھ ہی پوربیوں سے بدلہ لینے کی انہیں امید بھی قوی ہو گئی تھی۔ برٹش فوجیوں کو بھی بچوں کو بے دردی سے مارنے، عورتوں کی بے حرمتی کرنے اور ساتھیوں کو زندہ جلائے جانے کی داستان یاد تھی۔ وہ سب بدلہ لینے کے لیے بے چین تھے۔ حد تو یہ ہے کہ عیسائی پادریوں کو بھی اس میں کوئی غلطی نہیں نظر آئی کہ ظلم کا بدلہ ظلم سے لیا جائے۔ جس شہر پہ فتح حاصل ہوئی ہو، اسے لوٹنے کا حق فوجیوں کو فطری طور پر مل جاتا ہے۔ کسی کو بھی ٹھہر کر یہ سوچنے کی فرصت نہیں ملی کہ جب تک بادشاہ اور اس کی فوج کو حملہ آور دشمن فوج کا نام نہ دیا جائے، عام آدمیوں کی املاک کو مال غنیمت کے طور پر نہیں لوٹا جا سکتا۔ لیکن ظفریاب فوجوں کی ہوس منطقی دلائل سے نہیں پوری ہوتی۔ دلی اس معاملے میں خوش قسمت تھی کہ اس کا مقدر کار کھیج

جیسا نہیں ہوا حالانکہ ایک برٹش افسر نے یہ مشورہ دیا تھا کہ پورے شہر کو مسمار کر دیا جائے، صرف مسجد اسقف کو باقی رکھا جائے۔ جسے بھی چرچ بنادیا جائے تا کہ وہ برٹش قوت و طاقت کی ایک نشانی کے طور پر بنی رہے۔

21/ستمبر کو گرفتھ نے سڑکوں کو "ویران اور خاموش پایا۔ جیسے کہ کسی مرے ہوئے شہر کی سڑکیں ہوں جس پر کوئی بربادی آئی ہو۔ یہ سوچنا بھی مشکل ہو رہا تھا کہ ہم ان راہوں سے گزر رہے ہیں جو چند دنوں پہلے ہزاروں آدمیوں کا مسکن تھا۔ شہر کے جس حصے سے ہم لوگ گزر رہے تھے، اسے بری طرح سے مسمار کر دیا گیا تھا۔" سپاہیوں اور شہر کے مکینوں کی لاشیں ہر طرف بکھری پڑی تھیں جو فضا کو کئی دنوں سے اس حد تک متعفن اور مکدر کئے ہوئے تھیں کہ سانس لینا بھی مشکل تھی۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس ویران شہر میں فوراً ہی ہیضے کا مرض پھیل گیا اور تمام ہسپتال مریضوں سے بھر گئے۔ اس کے باوجود بھی منظم طریقے سے لوٹ مار کا کام اسی جوش کے ساتھ چلتا رہا۔ ویران مکانوں کے فرش کھود دئے گئے تھے اور دیواروں کے پلاسٹر دفن خزینہ کی تلاش میں ادھیڑ دئے گئے تھے اور اگر کہیں کوئی خزانہ مل گیا تو اسے لوٹنے والوں نے اپنا انعام سمجھا جو قانون کے مطابق سرکاری تحویل میں جانا چاہئے تھا۔ سومناتھ کی کہانی بھولی نہیں تھی اور مندروں کی مورتیوں کو وہاں سے ہٹا کر ان استھانوں کی کھدائی کی گئی تھی کہ شاید وہاں کوئی دفن خزینہ مل جائے۔ 31/اکتوبر کو میور نے شیرر کو اسسٹنٹ انٹیلی جنٹ سرجنٹ کی رپورٹ کا اقتباس بھیجا۔ "دلی اب بھی اپنی شان و شوکت کے ساتھ قائم ہے۔ یہاں سے وہاں تک کہیں بھی گولی کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ لیکن سارے مکانات لٹے اور ویران پڑے ہیں۔ ان میں رہنے والے مکینوں کو بھوکے مرنے کے لیے باہر چھوڑ دیا گیا ہے اور میں یہ سوچنے پر مجبور ہوں کہ ان کے ساتھ بے رحمی کا سلوک کیا گیا ہے۔ آپ مجھے ہر سپاہی کو بے رحمی سے مار ڈالنے پر الزام دیتے رہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ سرکاریوں اور کاشتھوں کے ساتھ بہت بُرا سلوک کر رہی ہے۔ شہر میں روز جو لوٹ مار کی جارہی ہے اور اس میں جو مال حاصل کیا جارہا ہے، اس کا اندازہ مشکل ہے۔ بلکہ اس قدر مال مل رہا ہے جس کا یقین بھی نہیں کیا جاسکتا۔ میرا خیال ہے کہ اس محاصرہ اور لوٹ پاٹ میں شامل ہر شخص فوری طور پر ریٹائر ہونا پسند کرے گا۔ یہ اندازہ بے بنیاد نہیں تھا۔ گریفتھس ایک ایسے افسر کے بارے میں بتاتا ہے جسے اس طرح کی لوٹ سے دو لاکھ روپے ملے تھے۔ "ایسے ہی اور دوسرے معاملے بھی اس وقت ہم لوگوں کو معلوم ہوئے جس میں لوٹی گئی رقم اس سے کچھ کم رہی ہو گی۔ لیکن بہت سے لوگوں نے سو پونڈیا اس سے زیادہ کی رقم لوٹی۔" وہ آگے کہتا ہے۔" ہمارے رجمنٹ کے بہت سے نجی سپاہیوں نے لوٹ میں بہت زیادہ قیمتی اشیا حاصل کیں۔ جن کی نمائش انگلینڈ پہنچ کر انہوں نے کی اور بہت سے نان کمیشنڈ افسران اور دوسرے لوگ لوٹی گئی اشیا کو لندن لے آئے اور یہاں انہوں نے تین تین سال تک انہیں زیادہ قیمت پانے کی لالچ میں دبائے رکھا۔ شہر کے بہت سے جوہریوں نے اپنے نمائشی خانوں میں اُن سارے زیورات و جواہرات کو

سجا رکھا تھا جو یقیناً مشرقی سناروں نے بنائے تھے اور جانچ کے بعد یہ پایا گیا کہ یہ سب ہمارے اپنے لوگ ہندوستان سے لائے تھے۔"

پرائز ایجنٹس کا یہ خیال تھا کہ فتح کے بعد پورا شہر اب فوج کی ملکیت ہو گیا ہے لیکن سانڈرس نے اس عجیب و غریب نظریے کے خلاف احتجاج کیا۔ اسے اس بات میں سر جان لارنس کا تعاون بھی حاصل ہوا' اس لیے اس نظریے پر عمل در آمد رک گیا۔ لیکن نومبر تک ان کا اس طرح کام ختم نہیں ہوا۔ اور گرچہ اب پرائز ایجنٹس گھر کے سامان اور دیگر اشیا کو بطور تاوان ضبط نہیں کر رہے تھے تاہم سڑکوں کے کنارے رہنے والے مکینوں سے وہ یکمشت رقم اس بات کے لیے لیتے کہ ان کے گھروں کی تلاشی نہیں لی جائے گی اور نہ ہی اسے تاراج کیا جائے گا۔ لیکن تلاشی اور لوٹ مار اس دوران ایک سائنس کی شکل میں ترقی پا چکی تھی اور لوگوں کو اس قدر لوٹا گیا تھا اور عمارتوں کو تاراج کیا گیا تھا کہ اب وہ اس قسم کی ضمانت کے لیے کچھ بھی دینے کو تیار نہیں تھے۔

اگر ملکیت کا قانون ختم ہو چکا تھا تو زندگی کا تقدس اس سے پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔ مشہور اردو شاعر غالب جو اس زمانے میں دلی میں تھے' بہت افسردہ لہجے میں لکھتے ہیں "میری نظروں کے سامنے خون کا بہتا ہوا سمندر رہے اور اب خدا ہی جانتا ہے کہ مجھے مزید کیا کچھ دیکھنا ہے۔" انہوں نے اپنے تمام دوستوں اور عزیزوں کو اتنی بڑی تعداد میں مرتے ہوئے دیکھا تھا ان کے خیال میں خود ان کا ماتم کرنے والا کوئی نہیں بچا تھا "میرے ہزاروں دوستوں کی موت ہو چکی ہے۔ اب ان میں سے میں کس کس کو یاد کروں اور کس کس کو روؤں۔ شاید کوئی ایک شخص بھی اب ایسا نہیں بچا ہے جو میرے مرنے پر آنسوؤں کے چند قطرے بہا سکے۔" گرچہ اسے شاعرانہ مبالغہ آرائی کا نام دیں تو بھی دوسرے ذرائع سے ملنے والی تفصیلات سے پتہ چلتا ہے کہ انسانی زندگی کی ساری حرمت ختم ہو چکی تھی اور معصوم لوگوں کا بھی وہی حشر ہوا جو مسلح باغیوں کا۔ ظہیر دہلوی داستان غدر میں لکھتے ہیں "گناہگاروں کے ساتھ اکثر بے گناہ بھی مارے جاتے ہیں اور غدر کے بعد یہی ہوا۔ انگریز سپاہیوں نے جو کوئی بھی راستے میں انہیں ملا' اُسے گولی مار دی۔ اس وقت شہر میں جو لوگ رہ گئے نہ تو اُن کا ثانی ان سے پہلے پیدا ہوا اور نہ ہو سکے گا۔ میاں محمد امین پنجہ کش بہترین ادیب مولوی امام بخش صہبائی اپنے دو لڑکوں میر نیازی علی اور کوچہ چیلان کے سبھی باشندوں (جن کی تعداد 14 سو بتائی جاتی ہے) سبھی قید کر لیے گئے اور انھی راج گھاٹ گیٹ تک لے جایا گیا۔ وہاں انہیں گولیوں سے بھون دیا گیا اور ان کی لاشوں کو جمنا میں پھینک دیا گیا۔ جہاں تک عورتوں کا سوال ہے وہ بھی اپنے گھروں سے نکل آئیں اور کنوؤں میں چھلانگیں لگا دیں اور اپنی جانیں دے دیں۔ میرے قلم میں اب اس سے زیادہ تفصیل لکھنے کی کوئی تاب نہیں۔" غالب نے اپنی کتاب دستنبو میں لکھا "صرف خدا ہی کو یہ معلوم ہے کہ کتنے لوگوں کو پھانسیاں دی گئیں۔ فاتح فوج شہر میں خاص سڑک سے داخل ہوئی۔ جو بھی اسے راستے میں ملا

اسے گولی مار دی گئی۔ جب سفید فام لوگ شہر میں داخل ہوئے اور انہوں نے تمام مجبور بے بس اور معصوم لوگوں کو مارنا شروع کیا تو دو تین محلوں میں انگریزوں نے خود املاک لوٹی اور لوگوں کو جان سے مار دیا۔ اس طرح بغیر کسی تفریق کے گولی مارنے کے ایک واقع کا ذکر گرفتھ نے بھی کیا ہے جس سے ظہیر دہلوی اور غالب کے بیانات کی تصدیق ہوتی ہے۔ ان کے رجمنٹ کے ایک افسر نے شہر کے کچھ بھگوڑوں کو پکڑا اور انہیں گورنر کے پاس بھیج دیا جسے زندگی اور موت کی سزا دینے کا اختیار تھا۔ اسے رحم دل سمجھا جاتا تھا۔ اس نے ان قیدیوں کو رہا کر دیا۔ ایک دوسرے موقع پر تین آدمی وہاں پکڑے گئے لیکن انہیں کسی با اختیار شخص کے پاس سزا کے لیے بھیجا جانا نامناسب سمجھا گیا۔ اس افسر نے "اپنے فوجیوں کو بلایا۔ ان قیدیوں کو اجمیری گیٹ کی خندق کے پاس کھڑا کیا اور انہیں گولی مار دی اور پھر وہیں ایک گڑھا کھود کر ان کی لاشوں کو گڑھے میں ڈال دیا۔" اس سے بہتر افسروں کے جذبات کی ترجمانی نہیں ہو سکتی جو اس وقت دلی میں پوسٹ تھے کہ جنرل ولسن نے انہیں حکم دیا تھا کہ وہ باغیوں کو نہ بخشے۔ انہوں نے بہتر سمجھا کہ وہ مجرموں کی جگہ تمام معصوم لوگوں کی جانیں ہی لے لے۔

اس بات کا خاص خیال رکھتے ہوئے کہ رعایت دینے کے معاملے میں وہ کوئی غلط کام نہ کر بیٹھیں، ملٹری کے افسروں نے سبھی ہندوستانیوں کو ان کے مذہب اور پیشے کا خیال کئے بغیر ایک جیسا برتاؤ کیا۔ پروفیسر رام چند عیسائی تھے۔ 11 رمئی کو اپنی جان کا خطرہ محسوس کرتے ہوئے انہیں اپنا گھر چھوڑنا پڑا۔ اعلیٰ حکمراں طبقے میں ان کے بہت سے دوست تھے اور مسٹر میور (جو بعد میں سر ولیم میور ہوئے) نے خصوصی طور پر انہیں اس کام پر معمور کیا تھا کہ جہاں تک ہو سکے وہ دلی کے پرانے مخطوطوں کی حفاظت کرے۔ کیونکہ فوجی لوٹ مار اور تاراجی میں مشغول تھے انہوں نے فرنیچر پینٹنگ اور مخطوطے کی کوئی تمیز نہیں کی اور سب کو برباد کر دیا اور دلی کے زوال کے بعد وہ پرائز ایجنٹ کے دفتر میں ملازم بھی ہو گئے تھے تاہم انہیں ہر طرح سے تنگ کیا گیا اور ان کی بے عزتی کی گئی۔ کسی جاہل سپاہی کے ذریعہ نہیں بلکہ ایک افسر کے ذریعہ، گرچہ انہوں نے اسے صاف صاف بتایا کہ وہ عیسائی ہیں اور سرکاری ملازم بھی۔ صرف وہی سرکار کے واحد حمایتی نہیں تھے جن کے ساتھ یہ بے رحمی کا سلوک کیا گیا۔ وہ لوگ بھی جن کی سرکار سے وفاداری پر کوئی شک نہیں کیا جا سکتا تھا ان کے بھی خاندان والوں کو ایسا ہی تنگ کیا گیا۔ ان کے مکانوں اور املاک کو لوٹا گیا اور مکانوں کو ڈھا دیا گیا۔ مسلح باغیوں کی طرح سے انہیں بھی ان کے مکانوں سے نکال کر انہیں شہر بدر کر دیا گیا۔ ان کی معصومیت بھی انھیں اس بے دخلی اور بے عزتی سے نہیں بچا سکی۔

خوش قسمتی سے جو سویلین افسر تھے وہ فوج میں اپنے دوستوں کو اچھی نگاہوں سے نہیں دیکھتے تھے۔ اور سانڈرس کو اس بات کا خیال تھا کہ دوست اور دشمن کے درمیان کسی قسم کی کوئی تفریق نہیں کی جا رہی ہے اس لیے اس نے پُر زور الفاظ میں شہری آبادی کی حفاظت کئے جانے کی وکالت کی۔ اس کے اس خیال سے بہت سے اعلیٰ سویلین عہدیدار نے بھی اتفاق کیا، جن میں

سر جان لارنس بھی تھے۔ میور نے 18؍نومبر کو بیڈان کو لکھا ''ملٹری حکام کی پالیسی کی وجہ سے تمام معصوم لوگوں کو حد سے زیادہ تکلیف اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو پہلے دلی میں باغیوں کی حکومت کے زمانے میں بھی ہر طرح کے مظالم برداشت کر چکے تھے۔ لیکن اب اس سلسلہ میں کچھ نہیں کیا جا سکتا اور مجھے یقین ہے کہ آنے والے دنوں میں انصاف پر مبنی پالیسی اختیار کی جائے گی۔ لیکن سر ٹیفکیٹ وغیرہ کے لیے میرے سامنے جو درخواستیں آ رہی ہیں ان میں ان لوگوں کی بھی ہیں جو ہر صورت میں سرکار کے وفادار رہے اور ملازمت میں رہے جن دنوں ہم لوگ آگرہ میں پریشانی کے دور سے گزر رہے تھے اور جن کے خاندان والے آج انتہائی غربت میں دلی کے گاؤں میں چالوں میں زندگی گذار رہے ہیں، جن کے پاس پہننے کا کپڑا ہے نہ سر پر چھت ہے۔ زندگی کے کوئی آثار نہیں اور ہماری یہ پالیسی کہ شہر میں واپس آنے والا شخص اپنی وفاداری کو ثابت کرے انہیں اور مصیبتوں میں ڈال رہی ہے۔'' دوسری طرف ملٹری حکام نے آدمیوں کی کمی کے باعث شہر کی حفاظت کرنے کی ذمہ داری لینے سے انکار کر دیا۔ ہر دروازے کی حفاظت نہ کرنے کے باعث انہوں نے صرف دو کو چھوڑ کر باقی سارے دروازے بند کر دیئے۔ کشمیری گیٹ آنے والوں کے لیے کھلا تھا اور لاہوری گیٹ شہر سے جانے والوں کے لیے۔ لیکن یہ دلیل دی گئی کہ بنیوں اور کائستھوں کو شہر میں داخلے کی اجازت دینے میں کوئی نقصان نہیں۔ نہ ہی ان سے کوئی نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ ملٹری حکام نے اس بات پر زور دیا کہ پچھلی حکومت کے حمایتوں پر جرمانہ لگایا جائے اور عام طور پر یہ خیال کیا گیا کہ ہندو سماج عام طور پر انگریزوں کا حامی ہے جبکہ مسلم سماج ان کا دشمن۔ اس لیے ہندوؤں کو شہر میں آنے کی اجازت دی گئی لیکن جو لوگ شہر سے باہر رہ رہے تھے، سردیوں میں انہیں بہت زیادہ مصائب کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ وہ کھلی جگہوں پر رہ رہے تھے۔ بعد میں یہ خیال پیدا ہوا کہ برٹش حکومت سے بے اطمینانی کسی ایک خاص فرقہ کی اجارہ داری نہیں ہے اور دونوں میں استثنائی صورتیں پائی جاتی ہیں۔ اگر سارے مسلمانوں پر جرمانہ لگایا گیا تو وہ لوگ جو وفادار تھے، انہیں بھی بے وفا لوگوں کی طرح سزا بھگتنی پڑے گی اور اگر اسی طرح سے سارے ہندوؤں کو ہر طرح کی سزا اور جرمانے سے بری کر دیا جائے تو ان میں سے بھی بے وفا لوگ آزاد چھوٹ جائیں گے اس لیے یہ فیصلہ کیا گیا کہ ہر وہ شہری جو واپس آنا چاہے، جرمانہ ادا کرے۔ لیکن فرقوں کی بنیاد پر جرمانے کی شرح میں فرق ہونا چاہئے۔ ایک مسلم کو اس کی اپنی جائداد کا 25 فی صد جرمانہ ادا کرنا تھا جبکہ ہندوؤں کو اس سے 15 فی صد کم۔ ان کی سبھی غیر پائیدار املاک تو ختم ہو چکی تھیں ''کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ سوائے ننگی دیواروں اور خالی گھروں کے۔'' اس لیے دلی کو اس کے بعد پنجاب سے ملحق کر دیا گیا اور پھر جنگ کے تمام بد قسمت متاثرین کو شہر میں ان کے آبائی مکانوں میں ویران شہر کے اندر بسانے کی ساری کریڈٹ سر جان لارنس اور ان کے سویلین حکام کو جاتی ہے۔

# ضمیمہ

خفیہ خارجہ مشورے نمبر ۵۲۴۔۲۹ر جنوری ۱۸۵۸

کرنل ایچ۔ پی۔ برن
ملٹری گورنر برائے دلی

عزت مآب

میں بصد احترام آپ کی خدمت میں گوش گزار کرنا چاہتا ہوں کہ چاندنی چوک بازار میں رہتے ہوئے مجھے اکثر محل میں اور شہر کی بہت سی سڑکوں پر سرکاری اور نجی کاموں سے جانا پڑتا ہے۔ اس کام میں مجھے جو خطرہ محسوس ہوا ہے اور جس طرح کی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اس سے بچنے کی کوئی صورت نہیں، سوائے اس کے کہ آپ سے اپیل کروں کیونکہ میں اور دوسرے مقامی باشندے اب یہاں آپ کی حفاظت میں رہ رہے ہیں۔

ایک ماہ پہلے مجھے حکم دیا گیا کہ میں چرچ کے نزدیک مسٹر مرفی کے گھر جاؤں جہاں مجھے فارسی کے کچھ دستاویزوں کو انگریزی میں ترجمہ کرنا تھا۔ جب میں اس سڑک سے گزر رہا تھا جو میگزین سے چرچ کو جاتی ہے تو میں نے کچھ انگریز افسروں کو گورنمنٹ کالج کے پیچھے حامد علی خاں کی مسجد میں کھڑے ہوئے دیکھا جو ہر مقامی راگیروں پر غلیل سے گولیاں چلا رہے تھے۔ میرے ان سے بار بار اصرار کیے جانے کے باوجود کہ میں سرکاری ملازم ہوں اور عیسائی ہوں، کوئی نتیجہ نہیں نکلا اور انہوں نے مجھے گالیاں دیں اور مجھ پر اور طاقت سے غلیل چلائیں۔ اس دن کے بعد سے تیرہ دنوں تک میں اس سڑک سے نہیں گزرا۔ اس کے بعد سے جب مجھے اس مسجد کے پاس ایک گلی سے گزرنا پڑا، کچھ کتابوں کی تلاش میں، جس کی تلاش کے لئے مجھے پرائز ایجنٹ ڈاکٹر جیمس نے ملازم رکھا تھا، مجھ پر پہلے کی طرح حملہ کیا گیا۔ گرچہ میرے پاس پرائز ایجنسی کے دو پاس تھے اور میں نے چلا کر انگریز افسر کو مطلع کیا کہ میرے پاس پرائز ایجنٹ کا پاس ہے۔ اس کے بعد مجھے یہ جان کر اور بھی حیرت ہوئی کہ اس ویران گلی میں نہ صرف میری جان کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے بلکہ میرے گھر کو بھی۔ بارہ دنوں قبل رات کے نو بجے جب میں اپنے دوستوں کے ساتھ اس بات پر غور کر رہا تھا کہ ہندوستان میں غدر سے پہلے کا امن کیسے قائم کیا

جائے اور بات چیت کے دوران انگلینڈ کے لارڈ ایلن برو کی انگریزی اخباروں میں چھپی تقریر پر بحث کر رہے تھے۔ ہم اچانک گھبرا گئے جب ہمارے دروازے اور گھر کی دیواروں پر پتھر برسنے لگے۔ اور ایک پتھر خود میرے بستر پر گرا اور جب ہم لوگوں کو یہ معلوم ہوا کہ ہمارے گھر کے ٹھیک سامنے رہنے والے ایک انگریز افسر اور اس کے ہاں آنے والے ملاقاتیوں نے یہ پتھر پھینکے ہیں۔ ہم نے اپنے دروازے بند کر لیے اور خاموش ہو گئے۔ یہ سوچ کر کہ شاید ہماری بات چیت کی وجہ سے ان کے آرام میں خلل پڑ رہا ہے۔ دن میں بھی اس جنٹلمین اور اس کے ملاقاتیوں نے ایک بار یہی حرکت کی اور پھر رات کے گیارہ بجے جب ہم اور ہمارے دوست سونے چلے گئے تھے اور ہم نے دروازے کو بند کر لیا تھا۔ میں مٹی کے ڈھیلوں سے دروازہ توڑنے کی آواز سے جاگ گیا۔ یہ آوازیں کچھ دیر آتی رہیں۔ پھر بند ہو گئیں۔ پچھلے اتوار کی شام پانچ بجے مجھے اور میرے ملاقاتیوں پر اسی طرح حملے کیے گئے۔ صرف دروازہ بند کرنے پر ہم چوٹ سے محفوظ رہے۔ یہی واقعہ منگل کی شام کو بھی ہوا۔

سوموار کی شام کو جب اندھیرا ہو چکا تھا تو میں میجر ایچ لووس کے وہاں سے لوٹ رہا تھا جو حال ہی میں یہاں آئے ہیں اور ایڈورڈ کیمبل کے مکان میں مقیم ہیں، مجھے اپنے سر پر زبردست مکے کی چوٹ لگی جو ایک انگریز افسر نے جو دیوانی اوم اسکوئر سے اپنے ایک دوست کے ساتھ گھوڑ سواری کرتے ہوئے واپس آ رہے تھے، میرے سر پر زوردار چابک مارنے کے بعد میری طرف گھوم کر کہا میں نے اسے سلام کیوں نہیں کیا؟ میں نے اسے ایک نہیں کئی بار زور زور سے سلام کیا اور چلا کر کہا کہ سر میں عیسائی ہوں اور پرائز ایجنسی میں ملازم ہوں۔ اس کے بعد اس نے میری جان بخشی اور دیوان خاص کی طرف مجھے گالیاں بکتے ہوئے مڑ گیا۔

اس اچانک زوردار چوٹ لگنے کی وجہ سے میں کچھ دیر سن رہ گیا اور وہیں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ یہ دیکھ کر وہ شخص جس نے مجھے مارا تھا، گھوڑے کی راس موڑ کر اسے دوڑاتا ہوا پھر میرے پاس آیا اور گھوڑے سے اتر کر میرے بائیں بازو اور پیٹھ پر کئی چابک اور مارے اور مجھے اس جگہ کو چھوڑنے پر مجبور کیا۔ جہاں تک انگریز افسروں کو سلام کرنے کا سوال ہے، میں ہمیشہ انہیں سلام کرتا ہوں، چاہے انہیں جانوں یا نہ جانوں۔ سوائے اس صورت کے جب مجھے یقین ہو کہ میرے سلام کرنے کا کوئی نوٹس نہیں لیا جائے گا۔ جیسا کہ اس معاملہ میں ہوا تھا۔

8/ مئی (یا جون) میں کینٹونمنٹ میں انگلش کیمپ قائم کیے جانے کے بعد، جسے میں نے بارہ تاریخ کو جوائن کیا، میں گاؤں میں بہت خطروں میں گھرا رہتا تھا۔ اور مجھے سوائے جان سے ختم کرنے کے ہر طرح کی اذیت اور ذلت میں جینا پڑ رہا تھا۔ تاہم اپنی مصیبتوں میں بھی مجھے یہ خیال رہتا تھا کہ میری یہ مصیبتیں ان لوگوں کے مقابلے کچھ بھی نہیں ہے جو مجھ سے کہیں زیادہ بڑے عہدوں پر فائز انگریز افسر سول اور ملٹری اور مشنری کے لوگ تھے اور جنہیں اپنی بیویوں کے ساتھ دلّی کے باغیوں اور بدمعاشوں نے بے رحمی سے قتل کر دیا تھا۔ اس کے

علاوہ مجھے یہ بھی ڈر رہتا تھا کہ اگر باغیوں نے مجھے ڈھونڈ نکالا اور مار ڈالا تو ایسا اس لئے کریں گے کہ میں نے اپنے باپ داداؤں کے مذہب کو چھوڑ کر عیسائیت قبول کرلی تھی تاہم مجھے یہ امید نہ تھی کہ میری یہ موت عیسائیت کے ابتدائی عہد کے شہیدوں جیسی ہوگی۔ ان ساری مصیبتوں میں مجھے اسی بات کی تسلی رہتی تھی۔ لیکن اب میرے لئے سکون کا باعث کچھ بھی نہیں ہے جب ایک مقامی عیسائی 'افسروں سے خطرہ محسوس کررہا ہے کیونکہ وہ نہ تو انگلینڈ میں پیدا ہوا اور نہ ہی اس کی چمڑی سفید ہے۔ دلی کے ان باغیوں کے ساتھ بھی جو جھوٹے مذاہب کے پیروکار ہیں کے ساتھ بھی یہ رویہ نہیں رکھا گیا ہے۔ وہ ایک مسلمان یا ہندو کو اپنا دوست سمجھتے ہیں۔ وہ صرف عیسائیوں سے نفرت کرتے ہیں اور ان لوگوں سے جو آج تک آپ کے وفادار ہیں۔ میری یہ اپیل آپ سے صرف مقامی عیسائیوں کے لئے نہیں ہے جن کی تعداد دلی میں بہت کم ہے 'بلکہ ان ہندوؤں اور چند مسلمانوں کے لئے بھی ہے جنہیں شہر میں رہنے کی اجازت دی گئی ہے لیکن جو انگریز سپاہیوں اور خصوصاً انگریز افسروں سے خطرہ محسوس کررہے ہیں۔

میں ہوں آپ کا وفادار
دستخط: رام چندر
پرائزا یجنسی ملازم

دلی
27/نومبر 1857ء

## پس نوشت

کل شام میرے ایک ہندو ملاقاتی دُھنیا کے یہاں سے جو دریا گنج میں رہتا ہے 'اپنے دو نئے لحاف بھروا کر واپس آرہے تھے 'راستے میں ایک انگریز افسر جس کے ساتھ اس کے دو سائیس بھی تھے ملے 'انہوں نے ان سے زبردستی ایک لحاف لے کر اپنے سائیس کو دے دیا اور گھوڑ سواری کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ میرے ملاقاتی نے افسر کے پاس جا کر شکایت کرنا چاہی لیکن سائیس نے انہیں بتایا کہ اگر وہ شور شرابہ کریں گے تو افسر ان کی بہت پٹائی کریں گے۔ اس لئے وہ خاموشی سے گھر لوٹ گئے۔ یہ دونوں لحاف میرے اپنے گھر والوں کے لئے تھے اور میرے ملاقاتی نے صرف میرے لئے انہیں بھروایا تھا۔ میں اس افسر کا اس بات کے لئے شکر گزار ہوں کہ صرف ایک لحاف سے اپنی تسلی کرلی اور انہوں نے دونوں لحاف نہیں چھینے۔

# باب چہارم

# کانپور

دلّی کا اپنا شاہی گھرانہ تھا۔ لیکن کانپور، رہنمائی کے لئے مہاراشٹر کے ایک شاہی گھرانے پر منحصر تھا۔ نومبر 1817ء میں پیشوا باجی راؤ دوم نے ہندوستان میں برٹش حکومت کو چیلنج کیا۔ مئی میں ان کی بُری طرح ہزیمت ہوئی اور برٹش شرائط کے مطابق انہوں نے خودسپردگی کردی۔ ان کی سابقہ حکومت کے باہر ان کے لئے کوئی محفوظ گھر تلاش کیا گیا۔ ان کی خواہش گو بنارس کی تھی لیکن وہاں پہلے سے ہی بہت زیادہ جلاوطن شاہی گھرانے کے افراد رہ رہے تھے۔ اور ابھی تک کی سب سے طاقتور ہندو سلطنت کے سربراہ کو ہندوؤں کی تیرتھ استھان پر رکھنا مناسب نہیں سمجھا گیا جہاں وہ اپنی سابق رعایا کے ساتھ مستقل تعلقات بنائے رکھ سکتے تھے۔ انگریز سرکار نے انہیں مونگیر یا گورکھ پور میں رکھے جانے کا بھاؤ دیا لیکن مونگیر بہت گرم علاقہ تھا اس لئے پیشوا نے اعتراض کیا۔ گورکھ پور میں کوئی بڑا مندر نہیں تھا۔ انہوں نے جمنا کے کنارے بسے شہر خصوصاً متھرا کو اہمیت دی، اگر برٹش حکام کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہو یا اس کے آس پاس کا کوئی شہر جو وہ پسند کریں۔ لیکن حکمرانوں نے بٹھور پسند کیا جو کانپور سے کچھ میل کے فاصلے پر تھا اور یہاں آخر کار پیشوا جا بسے جہاں انہیں ایک جاگیر عطا کی گئی۔ اور اس جاگیر کے اندر رہنے والے سبھی شہریوں کو عمومی سول اور دیوانی قانون ریگولیشن نمبر ا/1832ء سے مستثنیٰ قرار دیا گیا۔ اس کے علاوہ آٹھ لاکھ سالانہ کی پنشن بھی انہیں اور ان کے خاندان والوں کی گزربسر کے لئے عطا کی گئی۔ پیشوا نے آخر کار جلاوطنی کی ایک خشک زندگی قبول کرلی۔ ان کے ساتھ بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی تھی جو ان پر منحصر تھے اور یہ لوگ ان کے سامنے ہر طرح کے شاہی آداب بجالاتے۔ جس چیز سے انہیں کافی آزار پہنچا وہ افسران کی اس بات سے انکار کہ انہیں ان کے پرانے لقب پنتا پردھان سے مخاطب کریں اور یہ بھی کہ عمومی خط و کتابت میں انہیں مہاراجہ کے لقب سے پکارا جائے۔ ان کی جو کچھ بھی بچت ہوتی وہ اسے بخوشی سرکار کو بطور قرض دے دیتے۔ لیکن اپنی کشتیوں پر فیری ٹیکس لگانے کے خلاف انہوں نے احتجاج کیا جو ان کے پرنس کے اسٹیٹس کو کم کرنے والا تھا۔ برٹش افسران ایک جلاوطن حکمراں کے اس جذباتی اعتراض کو نہیں سمجھ سکے لیکن ہندوستانی ذہن مادی تکلیفوں کے بجائے جذباتی تکالیف کے خلاف زیادہ احتجاجی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ باجی راؤ مطلق

العنان حکومت کے لئے مستقل پریشانی کا باعث بنے رہے۔ کیونکہ اکثر اس طرح کی افواہیں پھیل جاتیں کہ وہ نیپال کے کورٹ کے ساتھ ساز باز کر رہے ہیں یا برما اور تبت کے ساتھ مل کر کوئی سازش کر رہے ہیں۔ یہ افواہ زیادہ زوروں سے گشت کرنے لگی۔ ان کے ساتھ مختصر سا خاندان تھا اور خود سپردگی کے وقت ان کی صحت بھی ٹھیک نہیں تھی۔ سرکار نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ وہ بہت دنوں تک عوامی خزانے پر بوجھ نہیں بنیں گے۔ اور جس آسائش کی زندگی بٹھور میں گزاری تھی اس کی وجہ سے ان کی عمر ستر سال سے آگے تجاوز کر گئی اور وہ جنوری 1851ء تک جیتے رہے۔

چونکہ ان کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی اس لئے باجی راؤ نے تین لڑکوں کو گود لے لیا۔ دھونڈو پنت عرف نانا، سداشیو پنت عرف دادا اور گنگادھر راؤ عرف بالا۔ ان کی موت کے وقت نانا صاحب اور بالا صاحب زندہ تھے۔ دادا صاحب کی موت پہلے ہو چکی تھی۔ ان کا لڑکا پنڈورنگا راؤ جنھیں لوگ راؤ صاحب کے نام سے جانتے تھے۔ اس کے علاوہ دو نابالغ لڑکیاں جوگا بائی اور کسما بائی بھی زندہ تھیں۔ ایک نواسا جوان کے بھائی چمن جی اپّا کی لڑکی دوار کا بائی سے تھا، یہ سب سابق پیشوا کے دست نگر تھے اور ایسا قانونی طور پر مان بھی لیا گیا تھا۔ 1839ء میں ایک تحریری وصیت نامہ کے تحت باجی راؤ نے اپنا لقب اور اپنی ملکیت اپنے سب سے بڑے لے پالک لڑکے نانا صاحب کے نام منتقل کر دیا تھا۔

نانا صاحب کی ابتدائی زندگی اور پرورش و پرداخت کے بارے میں ہمیں کچھ بھی نہیں معلوم۔ جو شخص بھی انہیں جانتا تھا اسے ان کے اندر غیر معمولی صلاحیت کبھی نظر نہیں آئی۔ جان ینگ جو کچھ دنوں تک ان کے مہمان رہے، انہیں وہ اوسط صلاحیت کا آدمی سمجھتے رہے "مجھے وہ نہ تو باصلاحیت نظر آئے نہ ہی بے وقوف۔ وہ خود غرض تھے لیکن کون ہندوستانی خود غرض نہیں ہے۔ مذہب کے معاملے میں وہ مجھے کٹر بھی نظر نہیں آئے۔" ہنری منکاف نے انہیں چرچ جاتے ہوئے دیکھا۔ "اس پر مشکل سے یقین کیا جائے گا۔" منکاف لکھتے ہیں "نانا صاحب اتوار کو رجمنٹ کے ساتھ چرچ گئے، اس سے پہلے کہ ہم کانپور سے لکھنؤ کے لئے روانہ ہوں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں نے انہیں خود اپنی آنکھوں سے بگھی پر جس میں دو بھورے گھوڑے جتے ہوئے تھے بیٹھ کر جاتے ہوئے دیکھا۔" اگر لینگ یا نانا کے خانساماں پر یقین کیا جائے تو اس برہمن شہزادے کو اپنے انگریز مہمانوں کے لئے کسی بھی طرح کا گوشت پروسنے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ "مہاراجا کی یہ عادت تھی کہ وہ اکثر یورپین لوگوں کو اپنے یہاں مہمان بناتے اور گرچہ وہ خود پکے ہندو تھے لیکن ان کے اندر کوئی تعصب نہیں تھا۔ اس لئے اگر میں بیف یا کوئی اور گوشت کھانا چاہتا تو مجھے صرف اس کا حکم کرنا پڑتا۔" موبرے ٹامسن اس کا تذکرہ اس طرح کرتا ہے "حد سے زیادہ فربہ جسم، گندمی رنگ، اوسط قد جس پر سارے نقوش تیکھے، عام مرہٹہ کی طرح چہرہ اور سر دونوں شیو کیے ہوئے۔ وہ انگریزی کا ایک لفظ نہیں بولتے۔" شیرر نے بہت سے ایسے لوگوں سے جو انہیں جانتے تھے خصوصاً ڈاکٹر جے این تریسورے جو ان کے معالج تھے، سنا کہ دھونڈو پنت بہت ہی غیر دلچسپ

شخصیت کے مالک تھے۔ تقریباً تیس اور چالیس کی درمیانی عمر' اوسط قد' ٹھوس نقوش جن سے سختی ظاہر تھی اور راستہ چلتے ہوئے انہیں کوئی دکاندار سمجھتا' اگر ان کے سر پر مراٹھا اسٹائل کی پگڑی نہ ہوتی۔ جسے نمایاں کرنے کے لئے وہ محنت نہ کرتے۔ وہ انگریزی نہیں بولتے اور نہ ہی ان کے اندر سے کہیں کوئی شاعرانہ خصوصیت جھلکتی۔ ایک انگریز مسٹر ٹاڈ انہیں انگریزی اخبار اور میگزین پڑھ کر سناتا۔ عام دنوں میں کسی شکست خوردہ شاہی گھرانے کے نام نہاد سربراہ سے کچھ زیادہ امید بھی نہیں کی جاتی تھی۔ اور شاید نانا بھی اپنی زندگی گمنامی میں گزار دیتے۔"

یہ کہنا بھی مشکل تھا کہ کیا باجی راؤ نے اپنے خاندان والوں کے لئے کافی بچت کر لی تھی۔ سرکاری اندازے کے مطابق انہوں نے نقدی اور جائداد چھوڑی تھی وہ 30 لاکھ سے زائد روپے کی نہیں تھی۔ نانا سے امید کی جاتی تھی کہ اس رقم سے وہ اپنے ذاتی اخراجات کے علاوہ اپنے والد کے خاندان اور دوسرے تمام لوگ' جو ان پر منحصر تھے' کی کفالت کریں۔ مورلینڈ جو انہیں ذاتی طور پر جانتے تھے کو یقین تھا کہ نانا اپنی اس آمدنی میں گزارا نہیں کر سکیں گے۔ گرچہ وہ "بہت سادہ سے نوجوان تھے اور ان کے اندر فضول خرچی کی کوئی عادت نہیں تھی۔" لیکن سرکار نے باجی راؤ کی زندگی میں ہی یہ واضح کر دیا تھا کہ ان کے بعد ان کے جانشینوں کو پنشن کا کوئی بھی حصہ نہیں ملے گا۔ اور اس پالیسی کے تحت انہوں نے چمن جی اپاّ کی بیوہ اور لڑکی کو 1832ء میں ان کی موت کے بعد پنشن دینے سے انکار کر دیا۔ گورنمنٹ کا یہ فیصلہ کہ باجی راؤ کی موت کے بعد ملنے والی پنشن بند کر دی جائے گی۔ ان کے لئے کوئی حیرت کی بات نہیں تھی۔ بشرطیکہ نانا کو انگریزوں کی رحم دلی پر بہت زیادہ یقین نہ ہوتا۔ جبکہ بہت سے انگریزوں کا خیال تھا کہ قانونی جواز چاہے جو کچھ بھی ہو' انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ ان کے بعد ان کے خاندان والوں کو پنشن کا ایک حصہ ملنا چاہیے۔ نانا جی اور ان کے وکیلوں نے یہ مدعا بھی اٹھایا کہ باجی راؤ کو یہ پنشن ان کے اور ان کے خاندان والوں کے گزارے کے لئے دی گئی تھی۔ اور اس لئے خاندان والوں کا اس پنشن پر قانونی حق ہے اور اس سے کوئی مطلب نہیں کہ باجی راؤ نے اپنی زندگی میں کتنی بچت کی۔

بدقسمتی سے اس معاملے پر خاندان میں بھی پھوٹ پڑ گئی۔ دو نابالغ لڑکیوں کی طرف سے ان کے دادا بلونت راؤ اٹھاؤلے نے دعوی دائر کیا۔ انہوں نے اپنی بحث میں کہا کہ ہندو قانون کے مطابق کوئی مرد جانشین نہ ہونے کی صورت میں لڑکیوں کو بھی لڑکوں کی طرح برابری سے وارث سمجھا جائے گا اور ان کے مقابلے میں لے پالک کے لڑکے کا کوئی حق نہیں بنتا۔ ان کے اس نظریے سے سرکار نے اتفاق نہیں کیا اور مدعی کو صاف لفظوں میں بتا دیا گیا کہ دھوندو پنت ہی اصلی اور قانونی طور پر پیشوا خاندان کے ہیڈ ہیں۔ اس سازش میں پیشوا کی بیوی نے کیا رول ادا کیا اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن اس یقین کے لئے کافی جواز ہے کہ وہ چمن جی اپاّ کے پوتے میں دلچسپی رکھتی تھیں اور شاید نوجوان چمن جی اپاّ اس میں شامل تھے۔ پیشوا پر منحصر وارثین اور خادم اکثر اس طرح کی سازش کرتے اور خاندانی جھگڑے کو بڑھانے میں ان کی دلچسپی رہتی۔ انہیں اس

میں پڑوس کے صنعتی شہر سے بہت سے ایسے لوگ بھی مل گئے جو اس طرح کی سازش میں شریک تھے۔ 1832ء کا وہ قانون جس کے تحت باجی راؤ اور ان کی جاگیر میں بسنے والے لوگوں کو عمومی عدالتوں کے اثر سے محفوظ رکھا گیا تھا۔ وہ پیشوا کی موت کے بعد ختم ہو گیا۔ فروری 1852ء میں اس ریگولیشن کو ختم کرنے کے لئے ایک قانون بھی پاس کیا گیا۔ اس سے نہ صرف نانا اور ان کے بھائی کو عام شہری کی حیثیت مل گئی بلکہ عدالتوں میں انہیں گھسیٹے جانے کے بھی بہت سے مواقع مل گئے۔ ہو سکتا ہے کہ وقت کے ساتھ وہ اپنی اس بے عزتی کے عادی ہو جاتے لیکن باجی راؤ کی موت کے بعد انہیں یہ جان کر دھکا لگا کہ ان کے خاندان کے پاس کہیں بھی ایک انچ زمین نہیں ہے۔ جب پیشوا کی موت ہوئی تو ان کے شرادھ کے وقت برہمنوں کو پانچ خصوصی عطیات مہادان کی شکل میں ہاتھی، گھوڑے، سونے جواہرات اور انہیں اور ان کے وارثوں کے لئے زمین دی گئی۔ باجی راؤ کا شرادھ اسی دھوم اور شان و شوکت کے ساتھ کیا گیا جیسے ان کے مورثین کے ساتھ کیا گیا تھا۔ اور کوئی بھی خرچ ایسا نہیں تھا جو نہ کیا گیا ہو۔ لیکن ان کے جانشین کی اب وہ حیثیت نہیں تھی کہ وہ کوئی زمین دے سکتے۔ اور نہ ہی اس کے پاس کوئی زمین تھی۔ سردار رگھوناتھ راؤ وِنچورکر اس وقت بٹھور میں تھے۔ اور اس بھول کو دیکھ کر انہیں دکھ ہوا۔ انہوں نے نانا صاحب کو مشورہ دیا کہ چونکہ سارے مہادان کیے جا چکے ہیں اس لئے زمین کا عطیہ ختم نہیں کیا جانا چاہیے۔ ان کی جاگیر اور انعام میں ملنے والے گاؤں جن کی تعداد 52 تھی، وہ سب پیشوا کی ملکیت میں تھے، ان میں سے نانا صاحب برہمنوں کو جو دینا چاہیں دے سکتے ہیں۔ اپنے خاندان کے ساتھ اس عقیدت کو دیکھ کر نانا صاحب کی آنکھیں بھر آئیں اور وہ رونے لگے۔ اس وقت برٹش افسروں میں سے کسی کو یہ خیال نہیں آیا کہ وہ اس بدقسمت شہزادے کو ایسا عطیہ دے کر زندگی بھر کے لئے اسے غلام بنالے۔

اس بات کو اکثر نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ کبھی کبھار چھوٹی چھوٹی رعایتیں بھی حساس آدمی کے لئے بہت کارگر ہوتی ہیں۔ نانا کو اس بات کی اجازت ملنی چاہیے تھی کہ وہ اپنے فوت شدہ والد کی مہر استعمال کر سکیں۔ عام آدمیوں کی نظر میں وہ پیشوا کے قانونی وارث تھے۔ اور انگریز بھی انہیں رسمی طور پر مہاراجہ کے لقب سے پکارتے۔ اس سے ان کی سیاسی حیثیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا اگر اپنے خطوط میں وہ پیشوا کی مہر استعمال کرتے لیکن بٹھور کے کمشنر مورلینڈ نے اس پر اعتراض کیا اور نانا نے اپنے لئے ایک نئی مہر بنوائی جس میں انہوں نے اپنے کو پیشوا بہادر لکھنا شروع کیا۔ یہ نئی مہر اور زیادہ تکلیف دہ تھی اور اس کے استعمال پر بھی پابندی لگا دی گئی۔ مایوس شہزادے کو اب صرف اپنے کو شریمان نانا دھوندو پنت بہادر لکھنے پر اکتفا کرنا پڑا۔ اپنے کم مرتبے کی پہچان کے طور پر ان کا یہ لقب پنشن کے خاتمہ کے ساتھ ان کے لئے اور تکلیف دہ بن گیا۔

ان دنوں ہندوستانی راجے حکومت ہند کے خلاف حکومت برطانیہ سے اور گورنر جنرل کونسل کے خلاف کورٹ آف ڈائرکٹر سے اپیل کرنے کے عادی ہو چکے تھے۔ بے دخل کیے گئے

سبھی راجاؤں کی طرح نانا کو بھی یہ امید تھی کہ اگر ان کا مقدمہ صحیح طور پر انگلینڈ میں حکام کے سامنے پیش کیا گیا تو شاید ہمیں انصاف مل سکے۔ جب ان کی عرض داشتیں شمالی مغربی صوبے کے گورنر اور گورنر جنرل اِن کونسل کو بھیجی گئیں، کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ تو انہوں نے کورٹ آف ڈائرکٹر سے اپیل کی اور جب کورٹ آف ڈائرکٹر نے حکومت ہند کے فیصلے پر نظر ثانی کرنے سے انکار کر دیا تو انہوں نے اپنا پرسنل ایجنٹ انگلینڈ بھیجا کیونکہ بار بار کے انکار سے بھی انہیں ناامیدی نہیں ہوئی تھی اور وہ پُر امید زندگی گزارنا چاہتے تھے۔

ان کا یہ ایجنٹ عظیم اللہ خاں عجیب و غریب شخصیت کا مالک تھا۔ ان کے لئے یہ بات باعث تحقیر نہیں تھی کہ وہ ایک پچھڑے خاندان سے تھے اور ایک زمانے میں وہ ویٹر کی نوکری کرکے اپنی زندگی گزارتے تھے۔ انہوں نے اپنی پوزیشن بہتر بنانے کے لئے تعلیم حاصل کرنا شروع کیا۔ انہوں نے جلد ہی انگریزی اور فرانسیسی لکھنا پڑھنا اور بولنا شروع کر دیا' اور جلد ہی اسکول ماسٹر بن گئے جو اس شخص کے لئے بہت بڑی کامیابی تھی جس نے اپنی زندگی تنگی میں گزاری ہو۔ خود قدرت نے بھی اسے بہت خوبصورت بنایا تھا اور اپنی کوششوں سے انہوں نے انگریزی اطوار سیکھ لئے تھے اور جب وہ انگلینڈ پہنچے تو وہاں کے اعلیٰ طبقے میں انہیں داخل کر لیا گیا۔ جہاں وہ فطری آسانی کے ساتھ رہتے تھے۔ ان کے طور طریقوں اور جسمانی کشش کے لئے یہ معمولی اعزاز نہیں تھا کہ وہ جلد ہی برٹش ارسٹوکریسی کی ملکاؤں کے منظور نظر بن گئے اور نوجوان دوشیزائیں انہیں محبت اور تحسین کی نظر سے دیکھتیں۔ لیکن عظیم اللہ کو جلد ہی یہ معلوم ہو گیا کہ اس برٹش جزیرے کے معمر سیاست دانوں پر ان کی عرض داشتوں کا خاطر خواہ اثر نہیں پڑ رہا ہے اور ملکہ کے صلاح کاروں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹرس پر ان کی اپیل کا کوئی اثر نہیں ہو رہا ہے' اس لئے انہوں نے وطن واپس لوٹنے کا فیصلہ کیا لیکن عام آدمیوں کی طرح وہ سیدھے ہندوستان واپس نہیں لوٹے۔ مالٹا میں انہیں یہ خبریں ملیں کہ مشترکہ انگریزی اور فرانسیسی فوجوں پر روسی فوجوں کو فتح مل رہی ہے' اس لئے انہوں نے فوراً ہی قسطنطنیہ جانے کا ارادہ کر لیا۔ جہاں ان کی ملاقات سابق صحافی ولیم ہوورڈ رسل سے ہوئی۔ رسل نے اس پرجوش مسلم نوجوان کا خاکہ ان لفظوں میں پیش کیا۔ "کچھ دنوں کے لئے میں قسطنطنیہ گیا اور اکثر مواقع پر مصر کے ہوٹل میں مجھے ایک خوبصورت پتلا دبلا نوجوان نظر آتا جس کا رنگ گندمی ہوتا اور وہ مشرقی لباس میں ملبوس ہوتا جو میرے لئے نئی بات تھی۔ اس کی انگلیوں میں خوبصورت انگوٹھیاں ہوتیں۔ وہ فرنچ اور انگریزی بولتا' ہوٹل کے ٹیبل پر انگریزی اطوار سے کھانا کھاتا اور جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں وہ ایک ہندوستانی شہزادہ تھا جو لندن سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف کیے گئے دعوے سے ناکام لوٹ رہا تھا۔" عظیم اللہ وہاں سے کریمیا جانا چاہتا تھا تاکہ اپنی نظروں سے ان بہادر رستموں یا روسیوں کو دیکھ سکے جنہوں نے مشترکہ انگریزی اور فرانسیسی فوجوں کو شکست دی تھی۔ اس نے ایک فاصلے سے روسی بیٹریوں کو کام کرتے ہوئے مشاہدہ کیا۔ مذہبی رکاوٹوں کی اس نے ہنسی اڑائی اور رسل کو بتایا: "میں اتنا بڑا بیوقوف نہیں

ہوں کہ ان بے وقوفی کی باتوں میں یقین رکھوں۔" بعد میں رسل نے تبصرہ کیا۔ "کیا یہ تعجب کی بات نہیں ہے کہ اسے اتنی دلچسپی پیدا ہوئی کہ اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہا کہ کریمیا میں کیا ہو رہا ہے؟ کسی یورپ والوں میں اس طرح کا تجسس ہونا تعجب کی بات نہیں ہے۔ لیکن ایشیا کے کسی باشندے کے اندر اور وہ بھی جس کا فوج سے کوئی تعلق نہ ہو' یہ حیرت کی بات ضروری ہے۔ اس نے برٹش فوج کو ناکامی سے شکستہ دیکھا اور جیسا کہ میں نے سنا ہے اس نے برٹش فوج کی ہمت اور شجاعت کے بارے میں فرانسیسی فوجوں کے مقابلے میں کوئی اچھی رائے قائم نہیں کی۔"

اس دوران نانا ایک ہندوستانی شہزادے کی طرح عام زندگی گزار رہے تھے۔ وہ کانپور کے انگریز افسروں کی میزبانی کرتے تو انہیں اچھی طرح تفریح کراتے۔ کبھی کبھار وہ کانپور شہر سے بھی گزرتے لیکن ان کے انگریز دوست اس طرح سے ان کی خاطر تواضع نہیں کرتے۔ اس لئے انہوں نے فیصلہ کیا کہ اب وہ ان کے ساتھ کھانا کھائیں گے اور نہ کچھ پئیں گے۔ لیکن موبرے ٹامسن نے نانا کے اس انکار کا جواز ان کے مذہبی کٹر پن میں نہیں بلکہ شکستہ پندار کو بتایا۔ "نانا کی یہ عادت تھی کہ کانپور فوج کے افسروں کی وہ بہت خاطر تواضع کرتے لیکن اس کے بدلے میں ان سے میزبانی قبول نہیں کرتے کیونکہ اس بات کی اجازت نہیں تھی کہ انہیں سیلوٹ کیا جائے۔" چاہے جو بھی وجہ رہی ہو' نانا کو مقامی افسروں کا اعتماد ہمیشہ حاصل رہا۔ اور جب کوئی نازک مرحلہ آیا تو وہ انہیں سے تعاون اور مدد حاصل کرنے کے لئے رجوع کرتے۔

باجی راؤ کے معاملے میں ایک جلاوطن شہزادے کو محصور خشک زندگی سے کچھ رعایت اس معاملے میں حاصل تھی کہ جب وہ چاہیں بنارس' پریاگ اور گیا تیرتھ کے لئے جا سکتے تھے۔ گرچہ اس دوران ان کی تمام حرکات و سکنات پر نظر رکھی جاتی۔ لیکن ماحول کی تبدیلی ہمیشہ اپنا خوشگوار اثر چھوڑتی۔ نانا کے پاس بھی وسیع و عریض محل کے اندر "بہت سے تیز رفتار گھوڑے' اچھی نسل کے کتے' ہرنوں اور بارہ سنگھوں کی ختم ہوتی ہوئی نسل کے کچھ اچھے جوڑے اور ہندوستان میں ہر جگہ سے جمع کئے ہوئے جانور ہوتے تھے۔" تاکہ وہ ان کے درمیان اپنے فارغ کے لمحات کو گزار سکیں لیکن اس کے باوجود فعال تفریح کی ضرورت وہ محسوس کرتے۔ 1856ء میں وہ نظارہ کی غرض سے لکھنؤ گئے۔ کاوانگ نے انہیں وہیں دیکھا اور رسل اس میں اضافہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ نانا تیرتھ کے بہانے گرینڈ ٹرنک روڈ پر واقع ملٹری کیمپوں میں بھی گئے۔ وہ شملہ بھی جانا چاہتے تھے۔ ان کے ساتھ ان کے ہم سفر عظیم اللہ خاں بھی تھے۔ جو ایک ہندو تیرتھ یاتری کے لئے عجیب و غریب ہم سفر تھے۔ رسل ان انگریز ہندوستانی افسران کی ذہانت پر شک کرتا ہے۔ جن کی اجازت کے بغیر نانا اپنے محل سے ایک میل بھی نہیں جا سکتے تھے۔ کیونکہ معمولی شخص بھی یہ جانتا ہے کہ ہندوؤں کی نظر میں کالپی اور لکھنؤ کوئی تیرتھ استھان نہیں ہے۔ آفیشیل ریکارڈ میں ان کا اس طرح کا کوئی ٹور پروگرام بھی نہیں ملتا۔ لیکن جب مارٹینو نے جنوری 1857ء میں عظیم اللہ سے انبالہ میں ملاقات کی' اس وقت ان کے ساتھ نانا نہیں تھے۔ شاید ان کا یہ سفر لکھنؤ تک ہی محدود کر دیا گیا

تھا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ وہ اپنے سفر کے دوران کسی ایسے شخص سے نہیں ملے ہوں گے جنہیں سرکاری طور پر مناسب نہیں سمجھا جاتا ہو۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان کے اس سفر سے سر ہنری لارنس کے ذہن میں شبہ پیدا ہوا اور اس نے فوراً لکھنؤ کو چھوڑ دیا۔ جب کہ وہاں وہ بہت آزادانہ طور پر ملٹری افسروں سے ملاقات کر رہے تھے۔ ہنری منکاف کا کہنا ہے کہ نانا نے لکھنؤ میں رجمنٹل گھوڑ دوڑ میں بھی شرکت کی۔ "یہ کھیل تماشے اور دوڑ تین دنوں تک چلتے رہے اور ان تین دنوں میں وہ باغی نانا ہمارے افسروں کے ساتھ کافی پیتا رہا اور بغاوت کے منصوبے بناتا رہا۔" گرچہ وہ اس طرح مشغول رہے لیکن کانپور اور لکھنؤ کے افسروں میں ان کے ان منصوبوں کے بارے میں کوئی شک نہیں پیدا ہوا۔ کیونکہ وہ بہت چالاکی اور عیاری کے ساتھ اپنا وقت گزار رہے تھے۔ اس دوران نانا کے خلاف چمن جی اپّا نے مقدمہ کیا جسے خارج کر دیا گیا۔

کانپور بہت اہم جنگی اسٹیشن تھا۔ شروع میں یہ شہر اور قصبہ دونوں اودھ کے بادشاہ کی ملکیت میں تھے۔ اس سے وصول ہونے والی لگان کی رقم سے ایک فوج یہاں رکھی گئی تھی اور آخر میں 1801ء میں یہ ضلع انگریزوں کی تحویل میں چلا گیا۔ گنگا کے کنارے بسا یہ شہر جہاں عام دنوں میں چھوٹی چھوٹی کشتیاں چلتیں اور برسات کے دنوں میں بڑے پتوار والی ناؤ' اس شہر کو کچھ تجارتی اہمیت حاصل ہو گئی تھی۔ یہ فروغ پا رہے چمڑے کی صنعت کا ایک مرکز بن گیا تھا۔ الٰہ آباد سے سو میل اور لکھنؤ سے چالیس میل کے فاصلے پر ہونے کی وجہ سے ایک طرف یہ گرینڈ ٹرنک روڈ اور دوسری طرف اودھ کی شاہراہ سے ملا ہوا تھا۔ اس کی دفاعی اہمیت محسوس کر کے کانپور کو ایک بڑا فوجی مرکز بنایا گیا۔ مئی 1857ء میں یہاں 61 آرٹیلری فوجی جن کے پاس چھ توپیں تھیں، اس کے علاوہ تین ہندوستانی انفینٹری رجمنٹ، پہلا 53 ویں اور 56 ویں کے علاوہ سکنڈ کیویلری اور کچھ مقامی آرٹیلری فوجی تھے۔ ان کی مجموعی تعداد تین ہزار سے کم تھی۔ ان کی کمانڈ میجر جنرل سر ہیو ویلر کے سی بی کر رہے تھے۔ یہ بہت کامیابی کے ساتھ پچاس سال کی سروس کر چکے تھے۔ انہوں نے لارڈ لیک کے ماتحت بھی کام کیا تھا اور جب 1804ء میں دلّی پر قبضہ کیا گیا اس وقت بھی وہاں موجود تھے۔ بعد میں انہوں نے افغانستان اور پنجاب کی جنگوں میں بہت نام کمایا تھا اور اگرچہ اب وہ جوانی کی دہلیز کو پار کر چکے تھے۔ پھر بھی ان کی شہرت اس قدر تھی کہ دلّی میں رج پر واقع برٹش فوج کو ہمیشہ یہ امید رہی کہ جہاں سب ناکام ہو جائیں گے وہاں ہیو ویلر ان کا بخوبی دفاع کر لیں گے۔ سر ہنری لارنس کے خیال میں "وہیلر اس وقت کا سب سے بہادر شخص اور طاقت کا منبع تھا۔"

14/ مئی کو میرٹھ اور دلّی کی خبریں کانپور پہنچیں اور اگر اس سے کوئی پریشانی بھی ہوئی ہو تو بھی وہیلر نے اسے ظاہر نہیں کیا۔ اس نے 18/ مئی کو گورنر جنرل کو یہ اطلاع بھیجی کہ کانپور میں ہر طرف امن وامان ہے۔ اگر دوسری جگہوں پر ایسے واقعات نہیں ہوئے جس سے اس کی اپنی فوج کے لوگ متاثر ہوتے تو بھی اسے امید تھی کہ وہ ہر صورت میں اپنے اسٹیشن کو بچا لے گا، کیونکہ

اسے خالی کرانا ممکن نہیں تھا۔ شمالی مغربی صوبے کے دوسرے اسٹیشنوں کے بالمقابل کانپور میں آبادی کا بڑا حصہ یورپین اور عیسائی آبادی پر مشتمل تھا۔ ہر مجسٹی کی 32ویں ریجمنٹ کے فوج کے بہت سے افسران جو لکھنؤ میں تعینات تھے انہوں نے اپنے خاندان والوں کو کانپور میں چھوڑ رکھا تھا۔ وہیلر کو اس بات کی کوئی امید نہیں تھی کہ خود اگر اس کے سپاہی بھی بغاوت پر آمادہ ہو جائیں تو وہ انہیں کسی محفوظ جگہ پر پہنچا سکے گا۔ ابھی تک کسی قسم کی شورش کا کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا۔ اس شخص نے اپنے سپاہیوں کے ساتھ تقریباً پچاس سال کا عرصہ گزارا تھا۔ وہیلر جانتا تھا کہ اگر اس نے کسی قسم کا بھی کوئی غلط کام کیا تو اس سے بہت بڑا حادثہ ہو سکتا ہے۔ دوسری طرف یہ کہ اگر اس نے گھبراہٹ کا اظہار نہیں کیا تو مسئلہ کی سنگینی ایک گولی چلائے بغیر ہی اپنے آپ ختم ہو جائے گی۔ 19/ تاریخ کو حکومت ہند کی طرف سے اسے ایک تار ملا۔ جس میں حکم دیا گیا تھا۔ "تم فوری طور پر یورپین فوج کے ٹھہرنے کا انتظام شروع کرو۔ اور یہ بھی اطلاع دو کہ تم ایسا کر رہے ہو۔" اگر یورپ کی فوجیں وقت پر آ گئیں تو وہیلر کو کسی قسم کا کوئی خوف نہیں ہوگا۔ لیکن اس خبر کو عام کرنے کا مطلب فوجیوں کو متنبہ کرنا ہو تا کہ ان کی وفاداری پر شک کیا جا رہا ہے۔ 21/ مئی کو سکینڈ کیویلری کے لوگ پریشان ہو اٹھے۔ ایک افواہ پھیل گئی' کہ ان کے گھوڑے اور ان کے اسلحے ان سے لے کر یورپین فوجیوں کو دیئے جائیں گے۔" اس افواہ کی کوئی بنیاد نہیں تھی لیکن کیویلری کے لوگوں نے انفینٹری میں اپنے بھائیوں سے پوچھا کہ اگر انہیں غیر مسلح کر دیئے جانے کی کوشش کی گئی تو کیا وہ ان کا ساتھ دیں گے؟

22/ تاریخ کو تقریباً 55 یورپین اور اودھ غیر مستقل کیویلری کے 240 سوار لکھنؤ سے کانپور پہنچے۔ گرچہ وہاں ہر طرح کا سکون تھا لیکن سپاہیوں کو الزام نہیں دیا جا سکتا' اگر اس سے ان میں کوئی شک پیدا ہوا ہو۔ یورپین اور یوریشین لوگوں کو کچھ نامعلوم خطرے کا احساس ہو رہا تھا۔ "اسٹیشن پر ہر شخص سہا ہوا تھا کہ کوئی خطرناک واقعہ ہونے والا ہے لیکن کوئی یہ نہیں جانتا تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ اس زمانے میں مقامی فوج گرچہ سکون اور آرام سے تھی لیکن ان کے ذہنوں پر بھی خطرات کے سائے منڈلا رہے تھے۔" کچھ یورپین تاجر پیشہ لوگوں نے کشتیاں کرائے پر لے رکھی تھیں کہ اگر کسی لمحے کوئی خطرہ محسوس ہو تو وہ الہ آباد کے لئے روانہ ہو سکیں۔ کچھ دوسرے لوگوں نے ڈاک کے ذریعہ یہاں سے رخصت ہونے کا انتظام کر رکھا تھا' اپنے مکان اور جائیداد خدمت گاروں کی حفاظت میں چھوڑ کر۔ ہر شخص نے اپنی دولت کے حساب سے زیادہ سے زیادہ چوکیداروں کو بھرتی کر رکھا تھا۔ "کوئی بھی کشیدہ حالات صرف ایک جگہ محدود نہیں رہ سکتے۔ بظاہر نظر آنے والی خاموشی کے پس پردہ فوجی بے چین سے نظر آ رہے تھے اور 21/ تاریخ کو ان میں سے ایک شخص نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ وہ لوگ "محتاط رہیں کیونکہ صاحب لوگ کسی وقت کوئی بھی حرکت کر سکتے ہیں اور چھٹے بٹالین کی پہلی کمپنی کے بندوقچیوں کو تیار کر دیا گیا کہ وہ اپنی بندوقوں کا نشانہ کیویلری لائنس کی طرف لگالیں۔" مجرم کو پکڑا گیا' مقدمہ چلایا گیا' موت کی سزا سنائی گئی لیکن

نانا صاحب

اسے اس لئے پھانسی پر نہیں چڑھایا گیا کہ وہ دوسرے فوجیوں کو اکسارہا تھا۔ اس موقع پر لکھنؤ سے آنے والی فوجوں سے نہ ہی ان کی ہمت پست ہوئی، نہ ہی ان کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ وہ سب خوفزدہ ہوسکیں۔

بدقسمتی سے اسی وقت بازار میں سڑا ہوا آٹا سستے داموں پر بیچا گیا۔ یہ پرانے گھن لگے گیہوں کا آٹا تھا اور پکانے پر روٹی سے بدبو آتی۔ اس سے یہ شبہ پیدا ہوا کہ آٹے میں سور اور گائے کی ہڈیاں پیس کر ملادی گئی ہیں۔ اس سے فوجیوں میں گھبراہٹ پیدا ہوئی۔ جانچ کے بعد یہ پایا گیا کہ شبہ کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ لیکن اس سے ہر شخص مطمئن نہیں ہوسکا اور جو لوگ کمزور طبقے کے تھے ان میں یہ شبہ جاگزیں ہو گیا کیونکہ وہ اس بات پر یقین نہیں کرسکے کہ اس کے لئے صرف تاجر ذمہ دار ہیں۔

21/ تاریخ کو ایک واقعہ ہوا اور خطرہ محسوس کرتے ہوئے وہیلر نے ہر قسم کے واقعے کے لئے اپنے کو تیار کرلیا۔ تاہم اس دن کچھ بھی نہیں ہوا۔ اور اس نے گورنر جنرل کو یہ خوشخبری دے دی۔ لکھنؤ سے آنے والی کمک کی اطلاع بھی انہیں کلکتہ میں دے دی۔ ''سب سے بڑی خوش خبری تو یہ تھی کہ بٹھور کے مہاراجہ نے اسلحہ سے لیس اپنے تین سو آدمی انگریزوں کی خدمت کے لئے بھیج دیے تھے۔ ایک بار جب کلکتہ سے یورپین فوجی یہاں آجائیں گے تو مجھے امید ہے یہاں کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔'' جنرل نے اطلاع دی۔ اس نے مزید لکھا ''گرچہ اس وقت یہاں مکمل خاموشی ہے لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ کس لمحہ کیا ہو جائے'' اس وقت تک کلکتہ سے یورپین فوجی وہاں نہیں پہنچے تھے اور جب وہ پہنچے تو بہت تاخیر ہو چکی تھی اور ساری قیاس آرائیوں کے برخلاف مراٹھوں نے دیہاتی ہندوؤں اور مسلمانوں سے دوستی کرلی تھی۔

یہاں ایک سوال خاص طور پر پیدا ہوتا ہے کہ کیا نانا نے بخوشی اور اپنی رضا سے اپنی خدمات انگریزوں کو دی تھیں یا کانپور کے سول حکام نے ان سے یہ طلب کیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے اسٹیشن کی انگریز خواتین کو اپنے تحفظ میں رکھا تھا۔ جب میرٹھ کی بغاوت کی خبر وہاں پہنچی تو نانا نے ہیلرس ڈان کو یہ مشورہ دیا کہ وہ اپنی بیوی اور دیگر خواتین کو بٹھور بھیج دیں۔ لیکن کیا انہوں نے اپنے آپ ہی اسلحوں سے مدد کی تھی۔ شیفرڈ کا کہنا ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کیا۔ اس کا کہنا ہے کہ نانا کے شہر کے بہت سے افسروں کے ساتھ دوستانہ اور گہرے مراسم تھے۔ اس نے کانپور کے مجسٹریٹ اور کلکٹر مسٹر ہیلرس ڈان کا اتنا اعتماد حاصل کرلیا تھا کہ انہوں نے اپنے خاندان اور دوسرے خاندان کی خواتین کو نانا کی حفاظت میں بغاوت شروع ہونے سے پہلے بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن خواتین اس سے اتفاق نہیں کریں گی۔ کیونکہ انہیں خندقوں میں پناہ لینا پڑی تھی۔ ان کے اوپر اس قدر اعتماد تھا کہ انہیں نواب گنج کے خزانے کا محافظ بھی بنایا گیا اور اس بات کی اجازت دی گئی کہ وہ اپنے ماتحت پانچ سو کیویلری اور انفینٹری ہر وقت رکھیں۔ جن کی مدد کی وجہ سے وہ میگزین حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے جب باغی اسٹیشن سے بھاگ گئے۔ مزید بتایا گیا ''نانا

صاحب جو بٹھور کے رہنے والے تھے انہوں نے اپنی خدمات پیش کیں اور سرکار کے سب سے وفادار خادم ہونے کا بہانا بنا کر ہمارے اپنے محافظ سپاہیوں کے ساتھ خزانے کی حفاظت کی ذمہ داری لی۔ ایسا لگتا ہے کہ ان پر بہت زیادہ اعتماد کیا گیا اور ان کی پیش کش کو قبول کر لیا گیا۔ اس کے بعد وہ خزانے کے نزدیک ایک بنگلہ میں منتقل ہو گئے اور اپنی ملازمت میں پانچ سو مسلح آدمیوں اور دو چھوٹی توپوں کے ساتھ انہوں نے اس جگہ کا چارج لے لیا۔ ہیلرس ڈان ایک ایسا شخص تھا جس کی شہادت حتمی ہوتی لیکن وہ بھی خندق میں شکار ہو گئے۔ موبرے ٹامسن جو چار بچے لوگوں میں سے ایک تھے، بیان کرتے ہیں کہ مجسٹریٹ نے نانا کو بلا کر خزانے کا چارج دینے کے لئے کہا "مقامی مجسٹریٹ مسٹر ہیلرس ڈان جو خزانے میں موجود بڑی رقم کو لے کر بہت زیادہ متفکر تھے۔ خزانے میں اس وقت تقریباً سو ہزار پونڈ سے زیادہ کی رقم موجود تھی، اس نے سر ہیو وہیلر سے مشورہ کرنے کے بعد ایک آدمی بٹھور بھیجا۔ اس درخواست کے ساتھ کہ نانا صاحب کی موجودگی اور ان کی مدد کی ضرورت ہے۔ وہ وہاں فوراً آئے۔ ان کے ساتھ ان کے باڈی گارڈ بھی تھے اور انہوں نے دو سو کیویلری چار سو انفینٹری اور دو توپوں کو خزانے کی حفاظت کے لئے بھیج دیا۔ یہ خزانہ خندق سے پانچ میل کے فاصلے پر تھا۔ یہ ضروری سمجھا گیا کہ اسے اپنے سابق مقام پر واپس لایا جائے۔ نتیجتاً یہ بٹھور کی ایک کمپنی اور 53 ویں مقامی انفینٹری کی ایک کمپنی کی حفاظت میں رکھا گیا اور نانا صاحب خود بھی کینٹ کے سول لائنز میں رہنے لگے۔ اس آدمی کے ساتھ ہم لوگوں کے تعلقات ہمیشہ سے دوستانہ تھے اور اس کی فطرت یا اس کی وفاداری کے بارے میں ہمارے ذہنوں میں کبھی کوئی شبہ پیدا نہیں ہوا۔ بلکہ انہوں نے اپنی فوج سے جو مدد کی اس میں ہماری اپنی نازک حالت کی وجہ سے اور سرگرمی پیدا ہوئی بلکہ یہاں تک کہا گیا کہ خواتین کو ان کے بٹھور کے محل میں بھیج دیا جائے تاکہ وہ وہاں حفاظت سے رہ سکیں۔" ظاہر ہے کہ ہیلرس ڈان، نہ وہیلر کے پاس ایسا کوئی جواز تھا جس کی وجہ سے وہ نانا پر اعتماد نہ کرتے۔ جس کی میزبانی سے اکثر انہوں نے لطف اٹھایا تھا۔ گرچہ وہ اس بات کو اچھی طرح جانتے تھے کہ ان کے والد کی پنشن بند ہونے کی وجہ سے نانا بہت زیادہ خوش نہیں ہیں۔ یہ نوٹ کرنے والی بات ہے کہ نانا کی توپوں کی تعداد کے بارے میں ہر شخص کا ایک ہی خیال ہے لیکن ان کی مسلح فوج کے بارے میں دو سو سے لے کر چھ سو تک نفر کا اندازہ لگایا گیا۔ ہم نہیں جانتے کہ ان دونوں تعداد میں سے کون زیادہ قابل اعتماد ہے۔ کیونکہ وہ اپنی اطلاع کا کوئی ذریعہ نہیں بتاتے۔ شیفرڈ کمشنر آفس میں یوریشین کلرک تھا جب کہ موبرے ٹامسن فوج کا کمیشنڈ افسر تھا جو اکثر ریزیڈنٹ مجسٹریٹ یا کانپور ڈویژن کے کمانڈنگ افسر کے پاس جاتا رہتا تھا۔

سر ہیو وہیلر نے کچھ جاسوسوں اور مخبروں کو ضرور اپنی ملازمت میں لگا رکھا تھا تاکہ شہر اور فوجی لائن میں ہونے والے واقعات سے اپنے کو باخبر رکھ سکیں۔ بدقسمتی سے انہوں نے اپنی رپورٹ جنرل کے کان تک نہیں پہنچائی اور اپنے راز کو اپنے چند دوستوں تک ہی محدود رکھا۔ اس طرح انہوں نے بھی اس عام انتشار کے پھیلانے میں مدد کی۔ اکثر ان کی رپورٹیں غلط بھی

ہوتیں۔ 24/ تاریخ کو انہوں نے بڑے اعتماد کے ساتھ بغاوت کی خبر دی لیکن کچھ بھی نہیں ہوا۔ صرف سپاہی ہی ان کی بے چینی اور خوف کا سبب نہیں تھے بلکہ یورپین اور یوریشین بعض پھیلنے والی افواہوں سے بھی پریشان ہو جاتے۔ جیسے لوٹ مار کرتے ہوئے گوجروں کی بڑی تعداد آرہی ہے۔ لگاتار پیدا ہونے والے تناؤ' غیر یقینی صورت حال اور بے عملی کی وجہ سے ان پر خاصا دباؤ پڑنے لگا۔ اور ان میں سے اکثر کا خیال تھا کہ فوری طور پر اس کے تدارک کے لئے کوئی عمل کرنا زیادہ بہتر ہو گا بہ نسبت موجودہ صورت حال کے۔ ان میں سے ایک نے اپنے گھر لکھا: "میری خواہش ہے کہ مجھے اس بات کا حکم مل جائے کہ میں اپنے رجمنٹ کے ساتھ یا اکیلے اپنی کمپنی کے ساتھ جاؤں اور ان لوگوں کے خلاف کوئی کارروائی کروں تاکہ ہم اپنے لوگوں کا امتحان لے سکیں۔ اور یہ جان سکیں کہ ان میں سے کتنے ہمارے ساتھ ہیں تاکہ اس غیر یقینی صورتِ حال کا خاتمہ ہو سکے" 31/ مئی کو کرنل ایورٹ نے لکھا: "میں ناامیدی کی بات تو نہیں لکھنا چاہتا لیکن میں اس حقیقت کو بھی پوشیدہ نہیں رکھنا چاہتا کہ اس وقت ہم بہت زیادہ خطرات سے گھرے ہوئے ہیں اور جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں کہ اگر ہماری فوجیں بغاوت پر آمادہ ہو جائیں تو شاید مجھے اپنی جان کی قربانی دینی پڑے لیکن میرا خیال ہے کہ وہ اس بات کی جسارت نہیں کریں گے کہ خندق میں موجود یورپین فوجیوں پر حملہ کریں" مسز ایورٹ نے حالات کا ایک عورت کی آگہی کے حساب سے صحیح تجزیہ کیا تھا "اگر اچانک ہی کوئی بات ہو جائے تو پوری انفنٹری رجمنٹ اور ایک کیویلری بغاوت کے شعلوں میں گھر جائے گی۔ انہوں نے لکھا: "اور ہم جس طرح سے خندق میں اپنے کو محصور کئے ہوئے ہیں چھ توپوں کے ساتھ' افسروں کی قربانی ضرور دینی پڑے گی۔ اور میں اپنے اس اندیشے کو پوشیدہ نہیں رکھ سکتی کہ میرے شوہر کو پوری فوج کے مقابلے میں سب سے زیادہ خطرہ ہے۔"

اور یہ چنگاری نشے میں دھت ایک افسر نے لگادی۔ نشے میں ہونے کی وجہ سے اس بیوقوف آدمی نے سکنڈ کیویلری کی چھوٹی سی پٹرول پارٹی پر گولی چلادی۔ ان کا کورٹ مارشل کیا گیا تو انہیں اس بنیاد پر چھوڑ دیا گیا کہ جب انہوں نے جرم کیا تو اپنے ہوش میں نہیں تھے اور بے ہوشی کے عالم میں کئے گئے کسی کام کے لئے وہ ذمہ دار نہیں۔ یہ ایک عجیب منطق تھی۔ کیونکہ قانون کی نگاہ میں نشے کی وجہ سے کوئی رعایت نہیں ملتی۔ اس ناانصافی کی بدولت سپاہیوں کا یہ شبہ اور پکا ہو گیا کہ ان کے افسر کچھ خاص شرارت کرنے والے ہیں۔ شیفرڈ کی ملاقات غصہ میں بھرے کچھ گھوڑسواروں سے ہوئی۔ اور انہوں نے اپنے جذبات کو پوشیدہ بھی نہیں رکھا۔ اس میں سے ایک نے شکایت کی کہ جب افسران فوجیوں کو چربی ملی گولیاں دینے میں ناکام ہوئے تو انہوں نے چالاکی سے رڑکی سے ایسا آٹا منگایا جس میں گائے اور سور کی ہڈیاں پیس کر ملائی گئی تھیں۔ ایک دوسرے نے پوچھا کہ اگر کوئی سازش نہیں کی جارہی ہے تو افسروں نے اپنے کو خندقوں میں کیوں چھپالیا ہے۔ ایک تیسرے نے تو یہ الزام لگایا کہ اب انگریزوں کو ہندوستانی فوجیوں پر بھروسہ نہیں رہ گیا ہے کیونکہ انہوں نے میگزین اور خزانے پر سے مقامی فوجیوں کو ہٹا کر یورپین فوجیوں کو تعینات

کر دیا ہے۔ بات چیت کے دوران میرٹھ کے ان گھوڑ سواروں کا بھی ذکر نکلا جنہوں نے چربی ملی گولیوں کو دانت سے کاٹنے سے انکار کر دیا تھا۔ "اس طرح کا برتاؤ ہم سب مقامی فوجیوں کے ساتھ بھی کیا جائے گا جیسے ہی یورپین فوجیں کانپور پہنچیں گی اس لئے ہم اس وقت کا انتظار نہیں کریں گے اور آج حالت یہ ہے کہ ہم سب کو سب سے آخری عہدے پر تنزلی کر دی گئی ہے کیونکہ ابھی کل ہی رات ایک افسر نے ہمارے چند محافظوں کو ڈیوٹی کرتے وقت گولی سے مار دیا۔ اور عدالت نے یہ کہہ کر اس افسر کو چھوڑ دیا کہ وہ پاگل ہے۔ اگر ہم مقامی لوگوں نے کسی یورپین کو ایسے مارا ہوتا تو ہم سب کو پھانسی لگ گئی ہوتی۔" یہ واقعہ فوجیوں کے لئے بہت زیادہ تکلیف دہ تھا اور وہ محسوس کرتے تھے کہ مجرم کو حکمراں قوم کے جج نے صرف اس لئے بَری کر دیا کہ وہ بھی حکمراں قوم سے تعلق رکھتا تھا۔ لیکن تیسری رات بھی خاموشی سے گزر گئی۔

وہ خندق جس سے سپاہی بہت زیادہ متاثر ہوئے تھے اور جسے وہ بے اعتمادی کی شہادت کے طور پر دیکھ رہے تھے۔ وہ بہت زیادہ محفوظ جگہ نہیں تھی۔ کیونکہ یہ اینٹوں سے بنی ڈھائی منزلہ بیرک کی عمارت تھی جس میں سب سے اوپری چھت گھاس پھوس کی تھی۔ اس کے چاروں طرف کی خندق بہت زیادہ گہری نہیں تھی اور اس کی دیواریں بھی نہ بہت اونچی تھیں نہ بہت مضبوط۔ عظیم اللہ نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے اسے "ناامیدی کا قلعہ" کا نام دیا۔ اس کا مقصد صرف عارضی پناہ گاہ تھی۔ کیونکہ سر ہیو ہیلر کو اس کے جاسوسوں نے یہ خبر دی تھی کہ اگر مقامی فوجیوں نے بغاوت کی بھی تو وہ سیدھے دلی کی طرف مارچ کریں گے۔ کیونکہ ان کا مقصد کانپور کے عیسائی باشندوں کو تنگ کرنا ہے نہ پریشان کرنا۔ خطرناک اور لگاتار جنگ کی صورت میں خندق سے لوگوں کو بہت کم حفاظت ملتی ہے بلکہ اس کے مقابلے میں شہر کی آبادی نے میگزین کو پناہ گاہ کی صورت میں بہت زیادہ اہمیت دی۔ لیکن سر ہیو ہیلر سپاہیوں کی لائن سے بہت زیادہ دور نہیں جانا چاہتے تھے۔ جہاں انہوں نے اپنے افسروں کو رات کو سونے کا حکم دے رکھا تھا۔ وہ اس قدم سے اپنے سپاہیوں کے اعتماد کو دوبارہ بحال کرنا چاہتے تھے اور دوسری طرف یورپین لوگوں کو بحفاظت پیچھے ہٹنے کے لئے جگہ کا بھی انتظام کر رہے تھے 'اگر کوئی ایسی آفت آپڑی تو ہر خطرے کی گھنٹی سنتے ہی حکمراں طبقے کی عورتیں اور بچے فوراً خندق میں پہنچ جاتے اور جب یہ ثابت ہو جاتا کہ یہ خطرے کی گھنٹی غلط بجی ہے تو وہ واپس آجاتے۔ فوجی اس سے دوسرا ہی مطلب نکالتے اور افسر اس کی جو تعبیر کرتے وہ اس سے مطمئن نہیں ہوتے۔ ایک سیدھی سادی پالیسی نے شاید کانپور کو بچالیا ہوتا اگر وہیلر نے میگزین پر یورپ کی سویلین اور ملٹری آبادی کے ساتھ مل کر قبضہ کر لیا ہوتا اور باغیوں کو اس بات کی اجازت مل جاتی کہ وہ جو چاہے کریں تو شاید وہ اس وقت تک مقابلہ کر سکتا تھا جب تک کہ مزید کمک نہ آجاتی۔ اگر وہ ہندوستانی فوجیوں کی عزت کے ساتھ اپنی عقیدت قائم رکھتا اور اس میں حملے کا کوئی خوف نہ پیدا ہونے دیتا تو اس کا زیادہ امکان تھا کہ تقریباً سمجھ بوجھ کے سبھی لوگ اس کا ساتھ دیتے۔ لیکن بے اطمینانی کے دبیز پردے کے پیچھے ہر طرف خاموشی کا منظر پیش

کرنے سے معاملہ بگڑ گیا۔ کیونکہ براہ راست اور کھل کر ڈرانے کا وقت جا چکا تھا۔

30/ مئی کو سر ہیو نے ہر میجسٹی کے 32ویں رجمنٹ کو لکھنؤ بھیجنے کا فیصلہ کیا کیونکہ وہاں بے اطمینانی نظر آ رہی تھی۔ جب کہ کانپور میں خاموشی تھی۔ اس کے ساتھ اب بھی اپنی فوج کے علاوہ ہر میجسٹی کے 84ویں فُٹ (پیدل) کے کچھ افسران موجود تھے جو کلکتہ سے وقتاً فوقتاً آئے تھے۔ 30/ مئی کو لکھنؤ میں کھلی بغاوت ہو گئی اور 3/ جون کو دو افسروں کے ساتھ 52 آدمیوں کو گاؤں بھیج دیا گیا۔ اس موقع پر وہیلر نے لارڈ کیننگ کو لکھا: ''اس قوم سے میں خود کو کمزور محسوس کر رہا ہوں لیکن یقین ہے میں اس وقت تک مقابلہ کر سکوں گا جب تک یورپین فوجی نہ آ جائیں۔'' اسی شام اس کو خبر ملی کہ تشدد فوری طور پر پھوٹنے والی ہے اور تمام سویلین لوگوں کو حکم دیا گیا کہ وہ فوراً خندق میں پہنچ جائیں۔ دوسرے دن 4/ جون کو ایک مہینے کا رسد اور ایک لاکھ روپے جو خزانے سے لایا گیا تھا وہ بھی خندق میں پہنچا دیا گیا۔ یہ بغاوت کی پہلی علامت تھی۔ فوجیوں نے مارے خوشی کے شیفرڈ کو بتایا کہ وہ یورپین فوج کے پہنچنے کا انتظار نہیں کریں گے۔ اور انہوں نے انتظار نہیں بھی کیا۔ یہ بغاوت 4/ جون کو رات میں پھوٹ پڑی اور اس نے ساری غیر یقینی صورت حال کا خاتمہ کر دیا۔

جیسی کہ امید تھی سیکنڈ کیولری نے پہل کی اور اس کے بعد ان کے ساتھ فرسٹ انفنٹری کے لوگ بھی شامل ہو گئے لیکن انہوں نے اپنے افسروں کے ساتھ کوئی بد تمیزی نہیں کی۔ 53ویں اور 56ویں رجمنٹ 5/ تاریخ کی صبح تک لائن میں رہے۔ لیکن 56ویں نے فوراً اپنے بھائیوں کی پکار پر لبیک کہا۔ موبرے ٹامسن لکھتا ہے: ''53ویں رجمنٹ لائن میں موجود تھی۔ لیکن جنرل کی کسی غلطی کی وجہ سے ان پر گولیاں چلائی گئیں۔ آگے کے واقعات بیان کرنے سے میں قاصر ہوں۔ کیونکہ یہ سبھی لوگ بہت امن کے ساتھ لائن میں رہ رہے تھے۔ اپنا کھانا پکا رہے تھے اور ان میں بغاوت کے کوئی آثار بھی نہیں تھے۔ کیونکہ انہوں نے اپنے بھائیوں کی آواز پر لبیک کہنے سے انکار کر دیا تھا۔ اور بڑی وفاداری کے ساتھ جمے ہوئے تھے۔ جب ایش کی بیٹری سے سر ہیو وہیلر کے حکم سے ان پر گولیاں چلائی گئیں تو وہ اچانک گھبرا کر دھڑ ادھڑ بھاگنے لگے اس قدم سے پہلے جو واحد اشارہ کیا گیا تھا وہ خندق میں موجود مقامی افسروں کو پکارنے کا تھا۔ سبھی لوگ ہمارے ساتھ وفاداری کا اظہار کرتے ہوئے ہمارے ساتھ رہے۔ ان کے علاوہ کچھ گرینڈیر کمپنی کے ڈیڑھ سو پرائیویٹ لوگ بھی ساتھ تھے۔ 53ویں رجمنٹ کے جو لوگ خزانے پر تعینات کئے گئے تھے وہ باغیوں سے تقریباً چار گھنٹے تک ڈٹ کر مقابلہ کرتے رہے۔ ہم دور سے ان کی گولیوں کی آواز سن رہے تھے لیکن ہم میں سے کسی نے ان کو مدد نہیں پہنچائی۔ رجمنٹ کے وفادار لوگ آخر تک اپنے افسروں کا ساتھ دینے کا اعادہ کر چکے تھے۔ ان سب کو خندق سے چھ سو گز کی دوری پر ایک پوسٹ پر تعینات کیا گیا جسے وہ نو دنوں تک اس وقت تک سنبھالے رہے جب تک کہ عمارت میں آگ نہیں لگ گئی۔ انہیں خندق میں داخل ہونے سے منع کر دیا گیا۔ کیونکہ وہاں رسد کی کمی

ہو گئی تھی اور ان میں سے ہر شخص کو چند روپے اور وفاداری کے سرٹیفکیٹ کے ساتھ برطرف کردیا گیا۔ سر جارج فارس نے شیفرڈ کی شہادت پر وہیلر کے اس عمل کا جواز پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔اس کا کہنا ہے کہ 53اور 56ویں کے مقامی افسروں نے جنرل کو اطلاع دی تھی کہ اس کے آدمی اب رخصت چاہتے ہیں' اسی وقت ان پر ایک دو گولیاں چلائی گئیں۔ اس بات کا احساس بہت کم کیا گیا ہے کہ کانپور کی بغاوت اور اس کے بعد کے واقعات کے بارے میں ہماری معلومات بہت محدود ہے۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہاں بغاوت ہوئی اور جون جولائی میں بے رحمی سے قتل کئے گئے۔ لیکن ان ناخوشگوار واقعات کی تفصیلات جو پیش کی گئی ہیں وہ اتنی مخالف بیانات پر مبنی ہیں کہ ان کی پرکھ نہیں کی جاسکتی۔ موبرے ٹامسن' ایک ذمہ دار ملٹری افسر' کے پاس اس کے زیادہ مواقع تھے کہ وہ واقعات کو اچھی طرح سے جان سکتا۔ بہ نسبت اس یوریشین کلرک کے جس کی معلومات اس دن صبح کے واقعات کے بارے میں صرف سنی سنائی باتوں پر مبنی تھی۔

باغی فوجی انفینٹری اور کیویلری دونوں خزانے کی طرف گئے جس پر قبضہ کر کے انہوں نے لوٹ لیا۔ قید خانے پر بھی حملہ کر کے انہوں نے سارے مجرموں کو آزاد کرالیا۔ اس کے بعد وہ دلّی کی طرف بڑھے اور کلیانؔ پور میں قیام کیا۔ وہیلر کی پیشین گوئی سچ ہونے والی ہی تھی کہ اچانک یہ باغی فوجی کانپور واپس آگئے۔ نانا نے جنرل کو لکھا کہ وہ خندق پر حملہ کرنے جارہے ہیں۔ اس وقفہ کے دوران کیا ہوا؟ تانتیا ٹوپے نے بتایا کہ نانا کو مجبور کیا گیا کہ وہ باغی فوجیوں کی حمایت کریں اور ان کی کمان سنبھالیں۔ پہلے تو انہوں نے دلّی جانے اور کانپور میں برٹش فوجیوں سے جنگ کرنے سے انکار کر دیا لیکن ایسا کرنے کے لئے بعد میں مجبور کیا گیا۔ لیکن سر جارج فارسٹ بتاتا ہے کہ نانا کے پاس دو توپیں اور بہت سے مسلح سپاہی تھے اس لئے ان پر جبر کئے جانے کی کہانی کو غلط مانا جائے۔ برٹش گورنمنٹ نے باجی راؤ کو دو توپیں دی تھیں کہ وہ تہواروں کے موقع پر اس سے گولے چھوڑ سکیں۔ جنگ کے لئے وہ دونوں بیکار تھیں اور بچاؤ کے لئے بھی ان کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ یہ بھی حد سے زیادہ مشتبہ بات ہے کہ نانا کے مسلح باڈی گارڈ جن کی تعداد تین سو تھی' تین انفینٹری اور ایک کیویلری ریجمنٹ کا مقابلہ کر سکیں۔ اس لئے تانتیا ٹوپے کے بیان میں صداقت کی جھلک ملتی ہے۔ ہو سکتا ہے مجبور ہو کر نانا کے مسلح محافظوں نے باغی سپاہیوں سے مفاہمت کرلی ہو۔ جیسا کہ گوالیار اور اندور کے فوجیوں نے کیا۔

ایک دوسرے بیان کے مطابق "کچھ مقامی افسروں نے نانا سے ملاقات کی۔" اور انہیں مشورہ دیا کہ اگر وہ ان کے ساتھ مل جائیں تو بادشاہت ان کا انتظار کر رہی ہے۔ لیکن اگر انہوں نے دشمنوں کا ساتھ دیا تو ان کی موت یقینی ہے۔ نانا نے شاید اس لالچ کے آگے یا دھمکی کے سبب یا شاید دونوں وجہ سے ان کی بات مان لی۔ یہ واقعہ تانتیا کی گواہی سے ملتا جلتا ہے۔ جو کچھ بھی ہمیں نانا کے کردار کے بارے میں معلوم ہے اس سے یہ مطابقت رکھتا ہے۔ ہم یقینی طور پر یہ بھی نہیں جانتے کہ کیا وہ باغی فوجیوں کے ساتھ کلیان پور گئے اور پھر انہیں واپس مڑنے کے لئے مجبور کیا' یا

ان کے کچھ ایجنٹ فوج کے پیچھے گئے اور انہیں بھاری مالی منفعت کا لالچ دے کر ان سے کانپور واپس لوٹنے کے لئے کہا تاکہ وہ خندق میں موجود مٹھی بھر انگریزوں کو پہلے ختم کر دیں۔ نانک چند کے مطابق جو نانا کے جانی دشمن تھے' یہ مراٹھا شہزادہ فوجیوں کے رہنماؤں سے اکثر خفیہ طور پر ملتا رہا اور اصل حملے سے پہلے ان سے کئی بار گفت و شنید بھی کی۔ لیکن شیرر کا خیال تھا "نانا مقامی فوجیوں سے پہلے تو کوئی ربط ضبط نہیں رکھتے تھے ورنہ ان کے لئے یہ ضروری نہ ہوتا کہ وہ کلیان پور میں انہیں لالچ دیتا کہ وہ کانپور کی طرف واپس مڑے۔" تھارن ہل بھی کچھ ایسا ہی بیان تھوڑے اختلاف کے ساتھ دیتا ہے۔ اس کا کہنا ہے "اگر نانا اور اس کی فوج کے درمیان پہلے سے کوئی مفاہمت ہوتی تو دلی سڑک پر یادلی کی طرف جانے میں اسے کوئی اعتراض نہ ہوتا۔" کرنل ولیمس کو کانپور کی بغاوت اور اس کے بعد کے واقعات کا جائزہ لیتے ہوئے ایسا کوئی ثبوت نہیں ملا جو ثابت کر سکے کہ نانا اور فوجیوں کے رہنماؤں کے ساتھ پہلے سے کوئی سمجھوتا رہا ہو۔" یہ کہنا مشکل ہے کہ کس تاریخ کو ان کی فوجیوں سے پہلی ملاقات ہوئی کیونکہ ان سبھی لوگوں سے جو اس بغاوت کے لئے ذمہ دار ہیں' ان میں سے کسی بھی شخص سے اس قسم کی گواہی حاصل کرنا مشکل ہے۔" حالات نے شاید سپاہیوں کو اس بات کی ضرورت محسوس کرائی کہ ان کی کمان کرنے کے لئے کسی اونچے مرتبہ کے شخص کا ہونا ضروری ہے۔ اور اسی لئے انہوں نے نانا کو لالچ اور خوف دلا کر اس بات کے لئے آمادہ کیا کہ وہ ان کی کمان سنبھال لیں۔ 1859 میں لکھے گئے ایک خط میں نانا نے اظہار کیا کہ وہ خود بھی اور ان کے خاندان والے بھی باغیوں کے رحم و کرم پر تھے اس لئے انھیں ان کا ساتھ دینے کے لئے مجبور ہونا پڑا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ نانا باغیوں کو لے کر دلی جانے کے لئے تیار ہو گئے تھے لیکن عظیم اللہ نے ان کے کان بھرے کہ دلی میں نانا کی حیثیت معمولی ہوگی جب کہ کانپور میں وہ سب کچھ ہوں گے۔ اس لئے باغی فوجی کانپور کی طرف واپس لوٹے اور شہر کے دولت مند لوگوں کو لوٹنا شروع کیا۔ تاہم اس بات کا کوئی جواز نہیں دیا جا سکتا کہ نانا نے وہیلر کو تحریری طور پر خندق پر حملہ کرنے کے ارادے سے کیوں آگاہ کیا؟ کیا یہ خود کو اہم تصور کرنے کی وجہ سے پیدا ہوئے غرور کے سبب تھا' یا اس پرانی روایت کی پاسداری تھی جس میں ہندو بہادروں کے لئے اس پالیسی پر چلنا ضروری تھا کہ دشمنوں کو آگاہ کئے بغیر ان پر اچانک حملہ نہ کریں۔ خندق پر کئی دنوں تک گولے برسائے گئے لیکن گرچہ باغیوں کی تعداد زیادہ تھی' تاہم ان پر مکمل طور پر حملہ کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ بلکہ ایسا یقین بنا ہوا تھا کہ آس پاس کے علاقوں میں بارودی سرنگیں بچھا دی گئی ہیں۔

اس ناکامی سے قلعہ کے اندر جو لوگ پناہ گزیں تھے' ان میں تقریباً پچاس فیصد تعداد عورتوں اور بچوں کی تھی۔ ہر شخص جو وہاں موجود تھا اس سے جنگ کرنے کی امید کی گئی تھی۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اس کا پیشہ کیا تھا۔ اور قلعہ پر چوبیس گھنٹے پہرا ضروری ہو گیا تھا۔ سر ہیو وہیلر اس قدر ضعیف ہو چکے تھے کہ وہ کسی حملہ کا سامنا نہیں کر سکتے تھے۔ اور اسی لئے

حفاظت کی ساری ذمہ داری نوجوان کیپٹن مُور کے کندھوں پر آپڑی تھی۔ وہاں اسلحوں اور بارود کی کوئی کمی نہیں تھی اور سات یا آٹھ مسکٹ میں سے ہر جنگ کرنے والے کے حصہ میں تین مسکٹ آتی تھیں۔ لیکن رسد کوئی بہت زیادہ نہیں تھی اور نہ ہی اس کی تقسیم کا کام دانشمندی سے کیا گیا۔ ماؤبرے تھامسن کے مطابق ضروری اشیاء کی فراہمی نے پہلے کچھ دنوں تک عجیب مضحکہ خیز منظر پیش کیا جہاں لوگ شمپین کی بوتلوں' ڈبہ بند کھانوں' جیلی کی بوتلوں یا میس الاؤنس کے لئے دوڑ رہے تھے' وہیں دوسری طرف رَم اور مٹھائیوں کے لئے۔ چاول اور آٹا عورتوں اور بچوں کے لئے ضروری تھا۔ لیکن آسائش پسند اس زندگی کا خاتمہ ہونا تھا اور پھر سبھی کو مجبور ہونا پڑا کہ وہ ایک وقت کے سوکھے کھانے پر گزارہ کرے۔" ہر طرح کی کوشش کی گئی کہ راشن کی بحالی کو برقرار رکھا جائے۔ کبھی کبھار گھوڑوں کو گولی ماردی جاتی جب دشمن کیویلری نزدیک آتی۔ ایک بار ایک برہمنی بیل "ان حدود کے اندر چرتا ہوا آیا جہاں اس کے تقدس کو پامال کیا گیا۔" جانوروں کو مارنا تو آسان تھا لیکن ان کے ڈھانچوں کو دیوار تک لے جانا مشکل لیکن بھوک نے اس جوکھم بھرے کام کو آسان کردیا۔ اور بیل کو بہت جلد چٹ کرلیا گیا۔ گرچہ نگرانی کرنے والے بہت سے لوگ اس پُر تکلف غذا سے محروم رہ گئے۔ ایک دوسرے موقع پر ایک گھوڑا دو پکٹ کے لئے دو وقت کی خوراک بن گیا۔ گرچہ بہت سی خواتین اس خوراک کو لینے سے گھبرائیں۔ کیپٹن ہالی ڈے جب گھوڑے کا سوپ لے جارہا تھا' تو اسے گولی ماردی گئی۔

بیرکوں کی پتلی دیواروں سے جون کی جھلستی گرمی میں کوئی آرام کی صورت نہیں تھی اور بہت سے لوگ لو سے مرگئے۔ "یہ ناممکن تھا کہ اس جھلستی گرمی میں بندوق کی بیرل کو چھوا جائے اور دوپہر کے وقت مسکٹس ایک دوبار اپنے آپ چھوٹ جاتیں' چاہے سورج کی گرمی سے ان کی کیپ اپنے آپ دغ جاتیں یا دھات کی گرمی سے وہ پگھل جاتیں۔" گرمی کی وجہ سے مرے ہوئے جانوروں کے ڈھانچے گلنے لگے اور ان کی بدبو سے ہوا زہریلی ہوگئی تھی لیکن خوش قسمتی سے فطرت کی طرف سے صفائی کرنے والے گدھ یا اسی طرح کے دوسرے پرندے محصور لوگوں کی مدد کے لئے آگئے۔

پیاس کی شدت جان لیوا تھی اور خندق کے اندر موجود واحد کنویں کے حصار کے لئے کچھ بھی موجود نہیں تھا اور جو کوئی اس سے پانی کھینچنے آتا' باغی فوجی اس پر فوراً گولی چلادیتے۔ رات کے اندھیرے میں بھی بالٹی کی آواز کی وجہ سے کوئی بھی پانی کھینچنے کا جوکھم نہیں اٹھاتا۔ ایک بالٹی پانی کی قیمت اس وقت آٹھ سے دس شلنگ تھی۔ اور ایک سویلین جان میک لپ نے خود کو کنویں کا کیپٹن کا لقب اختیار کرلیا اور پیاسوں کے لئے پانی کھینچنے کی ذمہ داری لے لی۔ بچتے بچاتے آخرکار وہ بھی اس انسانیت کے کام میں زخمی ہوگیا۔ اور بعد میں مر بھی گیا۔ ماؤبرے تھامسن کہتا ہے: "عورتوں اور بچوں کی جان جارہی تھی اور مرد پانی کے لئے بچوں کی چیخ و پکار کو برداشت نہیں کرپا رہے تھے۔ کیونکہ بچے اس بات سے قطعی بے خبر تھے کہ پانی نکالنے کی اتنی بڑی قیمت ادا کرنی پڑے

گی۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ دوسرے افسروں کے بچے کس طرح پرانے پانی کے تھیلوں کے ٹکڑوں کو چباتے یا چمڑے یا کینوس کے ٹکڑے اپنی زبان پر رکھتے تاکہ ان کے سوکھے ہونٹوں کو کچھ نمی مل جائے۔"

گھیرا بندی کے ایک ہفتہ بعد محصور لوگوں پر ایک اور آفت آپڑی۔ بیرکوں میں جہاں بیمار اور زخمی رکھے جارہے تھے' کی چھتوں پر پھوس لگی ہوئی تھی' اس میں جانوروں کے ڈھانچوں کی رگڑ یا کسی گولی سے آگ لگ گئی۔ اور ساری کوششوں کے باوجود آرٹیلری کے دو آدمی شعلوں میں جھلس کر مر گئے۔ جب بیرک جل رہی تھی تو اس کے ساتھ میڈیکل اسٹور بھی جل گیا اور پھر زخمیوں کو اس طرح کی راحت پہنچانا ناممکن ہو گیا۔ "یہ دیکھ کر دل دہل جاتا تھا کہ یہ مصیبت زدہ لوگ جن کی زبانیں پیاس سے خشک ہو رہی تھیں اور جو بخار میں جل رہے تھے' ان کی مدد کے لئے ہمارے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔" چھتوں سے محروم ہونے کے بعد کچھ عورتوں کو خندق میں پناہ لینی پڑی' جہاں خشک اور ننگی زمین ان کا بستر تھی۔

ہر طرف اور ہر لمحے موت کا رقص جاری تھا۔ میجر لنڈ سے ایک گولی کے ریزے سے اندھے ہو گئے اور کچھ دنوں بعد مر گئے۔ ان کی بیوی بھی ان کے دو ایک دن بعد مر گئیں۔ ہیرڈن کچھ عورتوں کو پانی فراہم کرنے کی کوشش میں زخمی ہو گئے۔ اور سخت اذیت جھیلتے ہوئے ایک ہفتہ بعد مر گئے۔ لیفٹیننٹ اِکفورڈ اپنے برآمدے میں بیٹھے تھے' مار دیئے گئے۔ مسز وائٹ اپنے شوہر کے ساتھ ایک دیوار کے سہارے چل رہی تھیں۔ ان کے جڑواں بچے ان کے دونوں بازوؤں میں تھے' ایک اکیلی گولی نے ان کے شوہر کو مار دیا اور ان کے دونوں بازوؤں کو توڑ ڈالا۔ وہائٹ اینڈرسن مجسٹریٹ اپنے برآمدے میں اپنی بیوی سے بات کرتے ہوئے ختم ہو گئے۔ لیفٹیننٹ وہیلر جو جنرل کا لڑکا تھا' خندق میں زخمی ہو گیا' اور جب وہ اپنے والدین اور بہن کے ساتھ کمرے میں صوفے پر بیٹھا تھا' گولی لگنے سے مارا گیا۔

ہندوستانی ملازم بھی اسی طرح اپنے یورپین آقاؤں کے ساتھ ساری مصیبتیں جھیلتے رہے۔ ان میں سے کوئی بھی خندق میں نہیں تھا۔ تھامسن کا کہنا ہے کہ لیفٹیننٹ بریجز کی خدمت میں گئے تین آدمی ایک گولی سے مارے گئے۔ لیفٹیننٹ گوڈ کا خدمت گار جب وہ ایک بیرک سے دوسرے بیرک میں اپنے ہاتھوں میں کھانا لے کر جا رہا تھا' سر میں گولی لگنے سے مارا گیا۔ ان میں بہت سے لوگ سواری پر چڑھتے ہوئے مارے گئے۔ مرے ہوئے لوگوں کو مناسب طریقے سے دفنانا بھی ممکن نہیں تھا۔ رات کے اندھیرے میں ایسے سارے مرے ہوئے لوگوں کو کنویں میں پھینک دیا جاتا۔ خندق میں جو واحد تابوت موجود تھا' اس کا استعمال صبح کو پہلے مرنے والے آدمی مسٹر مرفی کے لئے استعمال کر لیا گیا تھا۔ جنہیں خندق میں ہی دفن کر دیا گیا۔ اس کے بعد اسی طور پر دفنانا ممکن نہیں ہوا۔

لیکن قدرت نے اس وقت بھی جب انسان موت بو رہا تھا' اپنا تخلیقی سلسلہ ختم نہیں کیا۔

"اس خطرناک اور پُر آشوب وقت میں بھی بچے پیدا ہو رہے تھے اور مر رہے تھے اور تین چار ماؤں کو ولادت کی تکالیف سے بھی گزرنا پڑا اور ایسے میں ان سے نہ کوئی امید بندھی نہ کوئی خوشی ہوئی جو دردِ زہ کی تلافی کرتی۔" والدین کے لئے بچے اور بھی پریشانی کا باعث تھے۔ باہر کے خطروں سے لاپرواہ اور اندر کی یکسوئی کی زندگی سے تھک کر جب وہ اپنی ماؤں کی آنکھوں سے ذرا بھی اوجھل ہوتے، وہ باہر کی طرف دوڑ پڑتے اور گولیاں، عمر اور جنس میں کوئی تفریق نہ کرتیں۔

یہ بڑی ہیبت ناک جنگ تھی۔ جس میں ماضی کی کسی رسم یا انسانی قانون کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا۔ دونوں میں سے کوئی بھی پارٹی قیدیوں کے ساتھ رحم کا کوئی سلوک نہ کرتی اور جب ایک بار باغیوں میں سے پکڑا گیا ایک قیدی چھوٹ کر بھاگ نکلا۔ ماؤبرے تھامسن کا کہنا ہے: "اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا کہ اس کے ذریعہ ہماری پریشانیاں باغیوں کو ظاہر ہو جاتیں، اس لئے اس سے اپنے کو پوشیدہ رکھنے کا ایک ہی طریقہ رہ گیا تھا کہ جو باغی پکڑے جائیں انہیں ہیڈ کوارٹر کو اطلاع دیئے بغیر بھیج دیا جائے۔" اپنے گھٹتے وسائل اور لگاتار کم ہوتے ہوئے آدمیوں کی وجہ سے خندق میں چھپے ہوئے لوگ بہت زیادہ دنوں تک مقابلہ آرائی نہیں کر سکتے تھے۔ کلکتہ سے سارے مواصلاتی ذرائع کو کاٹ دیا گیا تھا۔ اور چونکہ مشرق سے یورپین فوجیوں کے آنے کی امید تھی، ایسے میں لکھنؤ ہی وہ واحد شہر تھا جہاں سے یہ محصور لوگ کسی مدد کی امید کر سکتے تھے۔ جنرل وہیلر نے گھراؤ کے پہلے ہفتہ کے بعد لکھنؤ میں اپنی اپیل بھیجی۔ "ہم سب لوگ 6/ تاریخ سے نانا صاحب کے ذریعے سارے مقامی فوجیوں کے ساتھ محصور کر دیئے گئے ہیں۔ ہمارے دشمنوں کے پاس 24/ پاؤنڈر ہیں۔ اور بہت سی بندوقیں ہیں۔ ہمارے پاس صرف آٹھ پاؤنڈر ہیں۔ ساری عیسائی آبادی ہمارے ساتھ عارضی خندق میں موجود ہے۔ ہم جی جان سے حفاظت کے کام میں لگے ہیں ہمارا بہت زیادہ نقصان ہوا ہے۔ ہم مدد چاہتے ہیں مدد، مدد اور مدد۔ اگر ہمارے پاس دو سو آدمی ہوتے، ہم ان بدمعاشوں کو سزا دیتے اور آپ کی مدد کرتے۔" لیکن لکھنؤ کا اپنا ہی مسئلہ تھا اور وہ کوئی بھی آدمی مدد کے لئے نہیں دے سکتے تھے۔ گرچہ ابھی لکھنؤ کی گھیرابندی نہیں شروع ہوئی تھی، تاہم دشمن کی فوجیں بہت دور نہیں تھیں۔ سر ہنری لارنس اور ان کے مشیروں نے اپنے کو بے بس پایا اور کانپور میں اپنے لوگوں کو خدا کی حفاظت میں چھوڑ دیا۔ "گرچہ ہم خندقوں میں محفوظ ہیں" لارنس نے جواب دیا: "لیکن ندی کے ذریعہ آپ کی مدد کے لئے فوجیوں کو بھیجنے کا مطلب ہے آپ کی مدد کے بغیر بہت سے آدمیوں کو قربان کرنا۔ مجھے معاف کیجئے گا اور مجھے خود غرض بھی نہ سمجھئے گا۔ اگر مجھے کامیابی کی کوئی صورت نظر آتی تو میں اتنا بڑا جوکھم اٹھانے کو تیار تھا" اس لئے اب کانپور کے فوجیوں کے پاس سوائے صبر اور انتظار کے کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ گورنر جنرل کے وعدے پر یورپین فوجیوں کا انتظار کرتے اور ہر طرف سے ناامید ہونے کے بعد دشمنوں سے مصالحت کر لیتے۔

لیکن جنرل وہیلر نے ناامیدی کو راہ نہیں دی۔ خندق میں کچھ یورشین بھی موجود تھے جو

مقامی زبان سے اچھی طرح واقف تھے۔ اور ان کا رنگ بھی سیاہی مائل ہوتا۔ اس لئے وہ مقامی لوگوں کے حلئے میں آسانی سے ادھر ادھر آجاسکتے تھے اور ان کی شناخت بھی نہیں ہوسکتی تھی۔ ان میں سے بلین مین نانا کے کیمپ میں ایک دو بار آئے گئے اور انہیں کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ ان سے کہا گیا کہ وہ الہٰ آباد جانے کی کوشش کریں تاہم وہ پکڑے گئے اور ان کا سارا اثاثہ چھین لیا گیا۔ لیکن شاید اس کی شناخت پر کوئی شبہ نہیں کیا گیا اس لئے اسے کسی قسم کا نقصان نہیں ہوا۔ اسی طرح کی مزید کوششیں، کہ نشیبی علاقے کے لوگوں سے رابطہ قائم ہوسکے، اس میں کامیابی نہیں مل سکی۔ آخر کار شیفرڈ جو کمشنری آفس میں کام کرتا تھا، اس نے شہر جانے کی خدمات پیش کی تاکہ وہ کچھ خبریں جمع کر کے لا سکے۔ اس سے یہ کہا گیا کہ اگر ممکن ہو تو وہ باغیوں کے چند بااثر لوگوں میں جو برٹش حکومت میں دلچسپی رکھتے تھے، ان میں اختلافات کے بیج بونے کی کوشش کریں۔ شیفرڈ کا کہنا ہے کہ وہ اس سلسلہ میں صحیح معلومات حاصل کریں۔ "کہ دشمن فوج کے کیا ارادے ہیں اور وہ کیا کر رہے ہیں۔" "اور یہ بھی پتہ لگائیں کہ کیا الہٰ آباد یا لکھنؤ سے کمک آنے کی امید ہے؟ کچھ دیر غور کرنے کے بعد "اس نے مجھے حکم دیا کہ میں ننھے نواب عرف محمد علی خاں کے پاس جاؤں کیونکہ وہ ہمارے وفادار ہیں اور میں ان پر بھروسہ کرسکتا ہوں۔ وہاں جاکر ان سے کہیں کہ وہ باغیوں میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کریں اور اگر وہ ہمیں صرف پریشان کر کے چھوڑ دیں یا یہاں سے جانے کی کوشش کریں تو میں ان کے لئے بہت کچھ کروں گا۔" اس نے مجھے مزید حکم دیا کہ اگر میں ننھے نواب سے ملاقات نہ کرپاؤں تو میں دوسرے بااثر مہاجنوں کے پاس یا شہر کے دوسرے بااثر لوگوں کے پاس جاؤں اور اگر وہ ہماری مدد کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، انعام کے اس وعدے پر تو ان سے کہنا کہ انہیں اس بات کا اختیار ہے کہ میں ایک لاکھ روپے اور تمام عمر کے لئے باقی پنشن دینے کا مجاز ہوں ہر اس شخص کو، جو ہماری منشا کے مطابق اس بغاوت کا خاتمہ کرا سکیں۔" یہ حیرت کی بات نہیں کہ ایسے نازک موقعے پر بھی وہیلر کو ننھے نواب پر اعتماد تھا جو بیٹری پر قابض تھا اور دن رات خندق پر گولے برسا رہا تھا۔ نواب کو ان باغی فوجیوں کے ہاتھوں بے عزتی برداشت کرنی پڑی تھی، جنھوں نے کانپور واپس آکر ان کے گھر کو لوٹ لیا تھا۔ بعد میں ان کا فوجیوں کے ساتھ معاہدہ ہو گیا اور انہیں آرٹیلری کی کمان سونپ دی گئی۔ اس کے بارے میں انہیں ذرا بھی تکنیکی مہارت نہیں تھی۔ ایسے بد خواہ کی فوجی باغیوں کی حمایت کھلے دل سے نہیں کرسکتے تھے۔ اور پہلا موقع ملتے ہی وہ ان کے ساتھ غداری کر بیٹھتے۔ لیکن شیفرڈ بلین مین سے زیادہ بدقسمت ثابت ہوا۔ جیسے ہی وہ خندق سے باہر آیا پکڑ لیا گیا اور اسے جیل میں بند کر دیا گیا۔ جہاں سے اسے اس وقت آزادی ملی جب ہیولاک کی فوجیں کانپور پہنچ گئیں۔

اس دوران نانا نے رسمی طور پر اپنی حکومت قائم کرلی۔ سکنڈ کیویلری کے صوبیدار ٹیکا سنگھ کو ترقی دے کر جنرل بنایا گیا۔ اور صوبیدار دل بھنجن سنگھ اور گنگا دین کو کرنل، جوالا پرشاد جو نانا کی اپنی فوج کے کمانڈر تھے، انہیں ترقی دے کر بریگیڈیر بنایا گیا۔ مجرمانہ مقدموں کے لئے سارا انتظام

نانا کے بھائی بابا بھٹ کو سونپ دیا گیا۔ ان کے سامنے چور اور دوسرے مجرم لائے جاتے اور وہ انہیں سزائیں دیتے۔ لیکن ان پر جو جرمانہ عاید کیا جاتا وہ ابھی تک ہندوستان میں لاگو برٹش قانون سے منظور شدہ نہیں تھا۔ ہندو کرمنل لا جس سے مراٹھا جوڈیشیل افسران کی حکومت پر قبضہ کئے جانے سے پہلے واقف تھے' دوبارہ نافذ کیا گیا۔ اس میں مجرموں کے اعضا کو کاٹ دیا جاتا۔ اس کے پیچھے نظریہ یہ تھا کہ جسم کے جس حصے سے جو مجرمانہ فعل سرزد ہوا ہو' اسے کاٹ دیا جائے۔ ان ساری سخت سزاؤں کا سماج پر کیا اثر پڑا' اس کے بارے میں ہم زیادہ واقف نہیں ہیں۔ غدر کے آغاز سے ہی اسلام کا سبز جھنڈا لہرا دیا گیا تھا لیکن اس کے بارے میں مختلف عقیدہ رکھنے والے لوگوں میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ وہ سب ماضی کی روایات کو اور پرانے اداروں کو اور پرانے دنوں کو دوبارہ واپس لانا چاہتے تھے۔ ہو سکتا ہے عظیم اللہ کے ذہن میں مذہب کی کوئی خاص اہمیت نہ ہو لیکن بہت سے راسخ العقیدہ مسلمان نانا کے کورٹ میں آتے اور نئی حکومت کو اپنا تعاون دے دیتے۔

24/جون کو وہیلر نے اپنا آخری پیغام لکھنؤ بھیجا۔ ناامیدی' مایوسی اور کرب میں ڈوبا ہوا یہ آخری پیغام تھا۔ "برٹش شجاعت ابھی باقی ہے لیکن یہ زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہ سکتی۔ ہم لوگ پنجرے میں بند چوہوں کی طرح مرنا نہیں چاہتے۔ گیریسن کا راشن آدھے سے زیادہ ختم ہو گیا اور جو باقی ہے وہ چار دنوں سے زیادہ نہیں چل سکتا۔ اسلحوں کی فراہمی کی مانگ کی گئی تھی لیکن اسے پورا کئے جانے کی کوئی امید نہیں تھی۔ اگر بارش ہو جاتی اور یہ کسی دن بھی ہو سکتی ہے تو برٹش حکومت کی پوزیشن خطرے میں پڑ جائے گی۔ شاید اس کے خاتمے کا وقت آ گیا۔"

دشمنوں نے آخر کار کچھ راحت بہم پہنچائی اور امید کی یہ کرن ایک مشرقی ہندوستانی عورت' جس کی شخصیت متنازعہ تھی' نے بہم پہنچائی۔ "گھیراؤ کے اکیسویں دن مابوبرے تھامسن لکھتا ہے۔ "شاید وہ اس تاریخ کو 5/جون سے گن رہا تھا۔ میرے پکٹ کی گولی باری تھوڑی دیر کے لئے رک گئی۔ دوربین سے دیکھنے والے ایک شخص نے دور سے دیکھ کر پکارا 'ایک عورت نظر آ رہی ہے' جسے لوگوں نے جاسوس سمجھا اور شاید کسی نے اسے گولی بھی مار دی ہوتی لیکن میں نے اس کے بازو کو نیچا کر کے اس کی زندگی بچالی۔ اس کی گود میں ایک بچہ تھا۔ وہ کپڑے بھی صحیح طور پر نہیں پہنے ہوئے تھی اور بغیر جوتے موزے کے تھی۔ میں نے اسے بیریکیڈ سے اوپر اٹھا دیا۔ وہ نیم بیہوشی کی حالت میں تھی۔ شناخت کرنے پر میں نے پایا کہ وہ مسز گرین وے تھی۔ اس دولت مند خاندان کی ایک فرد جو کانپور میں رہ رہا تھا اور کینٹونمنٹ کے علاقہ میں تجارت کرتا تھا۔ مسز گرین وے کے پاس ایک غیر دستخط شدہ انگریزی میں خط تھا جو "ہر موسٹ گریشیس میجسٹی کوئن وکٹوریہ کے نام تھا" تھامسن نے وہ خط کیپٹن مور کو دکھایا۔ خط بہت مختصر تھا اور اس میں پیش کش کی گئی تھی کہ "ہر وہ شخص جو لارڈ ڈلہوزی کے کاموں سے تعلق نہیں رکھتا اور اپنے اسلحے چھوڑنے کو تیار ہے.....

الہ آباد تک بحفاظت راستہ" وہیلر کو اب بھی کلکتہ سے مدد آنے کی امید تھی اور وہ نانا سے صلح کرنے میں جھجک رہا تھا لیکن مور نے اس سے کہا کہ پہلی توجہ عورت اور اس کے بچہ کی طرف کی

جانی چاہیے۔ انہیں بہت زیادہ نقصان ہو چکا تھا اور چونکہ تقریباً کھانے پینے کی ساری اشیاء ختم ہو چکی تھیں اس لئے باعزت طریقے سے صلح کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ دوسرے دن عظیم اللہ اور جوالا پرشاد مذاکرے کے لئے آئے اور یہ طے پایا کہ خندق کو خالی کر دیا جائے گا اور ہر شخص کو اس بات کی اجازت ہو گی کہ وہ اپنے اسلحے اور ساٹھ راؤنڈ کی گولیاں لے کر چلا جائے۔ زخمیوں، عورتوں اور بچوں کے لئے سواری کا انتظام کیا جائے گا اور گھاٹ پر کھانے کے سامان کے ساتھ ناؤ تیار رہے گی۔ عظیم اللہ یہ تفصیل لے کر نانا کے پاس گئے۔ لیکن نانا نے اس بات پر زور دیا کہ خندق آج رات ہی خالی کی جائے۔ گیریسن صبح سے پہلے خالی کرنے کو تیار نہیں تھے۔ آخر کار ایک آدمی نانا کی زبانی رضامندی لے کر آیا۔ تب ٹاٹ معاہدے کی کاپی لے کر نانا کی قیام گاہ پر گئے اور شکست کے اس معاہدے پر نانا سے دستخط کرالائے۔ جوالا پرشاد دو آدمیوں کو برٹش کیمپ میں بطور ضامن لے کر آئے۔ سورج ڈوبنے سے پہلے ہی انگریزوں نے اپنے اسلحے رکھ دیئے۔ اور کیپٹن ٹرنر لیفٹیننٹ ڈیلا فوس اور گوڈ کی تین نفری کمیٹی بنائی گئی جنہیں دریا کے کنارے لے جاکر دکھایا گیا کہ ناویں تیار ہیں۔ کچھ کے اوپر چھت پڑی ہوئی تھی اور باقی پر ڈالی جا رہی تھی۔ رات کے وقت سوتے ہوئے ایک سنتری کی مسکٹ گرنے سے کچھ خطرہ پیدا ہوا جس سے جوالا پرشاد نے شخصی طور پر مداخلت کر کے رفع دفع کر دیا۔

27ر تاریخ کو صبح سولہ ہاتھی اور ستر سے اسی پالکیاں وہاں لائی گئیں تاکہ ان لوگوں کو ناؤ تک لے جائیں۔ لیکن ان سب کے لئے یہ سواریاں ناکافی ہوئیں۔ اور کیپٹن مور، جو ان سارے کاموں کی نگرانی کر رہا تھا اسے دوسری بار یہاں آنا پڑا۔ "عورتوں اور بچوں کو ہاتھیوں اور بیل گاڑیوں پر بٹھایا گیا اور جو صحت مند لوگ تھے وہ پیدل ہی چل پڑے۔" جیسے ہی پہلا قافلہ رخصت ہوا کچھ سپاہی خندق تک آئے "اور انہوں نے اپنے سابق افسروں کے بارے میں دریافت کیا جنہیں اب وہ مس کر رہے تھے اور ان کی اموات کی خبر سن کر وہ سب بہت دکھی ہوئے۔" موبرے ٹامسن لکھتا ہے: "میں نے 53ویں کے ایک سپاہی سے پوچھا کہ کیا ہم الہ آباد بغیر کسی تکلیف کے پہنچ جائیں گے؟ اس نے جواب دیا کہ ہاں اس کا یہی خیال ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ ان لوگوں کے قتل کا جو منصوبہ بنایا گیا تھا، اسے منصوبہ بنانے والے ظالموں کے علاوہ کوئی اور جان سکا تھا۔ وہ بے چارا بوڑھا سر ہیو وہیلر، اس کی اہلیہ اور اس کی لڑکی بھی ناؤ تک پیدل پہنچے۔ سب سے آخری دستہ میجر بائی برٹ لے کر آئے جو خندق میں سب سے پیچھے رہ گئے تھے۔ باغیوں میں سے کچھ جنہوں نے اس افسر کی رجمنٹ میں کام کیا تھا، انہوں نے اصرار کیا کہ وہ اپنے ساتھ اپنی ساری املاک کو لے کر جائیں۔ انہوں نے ایک بیل گاڑی میں ان کے سارے بکس رکھے اور میجر کی بیوی اور اہل خاندان کو اپنی حفاظت میں ناؤ تک لے گئے۔ اور وہاں پہنچ کر انہوں نے اسے سلامی بھی پیش کی۔" نو بجے تک آخری کشتی میں بھی سب لوگ سوار ہو گئے۔ اگر راستے میں کچھ ہوا ہوتا تو بھی باغی ٹامسن اور ڈیلا پھوس اس سے بے خبر تھے۔ پانی اُتھلا تھا اور ناؤ کے لئے راستہ نہیں تھا۔ اس لئے

مسافروں کو بشمول بچوں، عورتوں اور مردوں کو پانی میں سے پیدل جانا پڑا۔
اس کے بعد جو کچھ ہوا۔ اس بارے میں موبرے ٹامسن سے سنیں: "کوئی بھی شخص خفیہ مقاصد کو نہیں جان سکا تھا کیونکہ کسی بھی شخص نے کچھ بھی نہیں دیکھا تھا۔ اس دن صبح گھاٹ پر بھیڑ جمع ہو گئی تھی اور ہزاروں لوگ صرف اپنے پرانے آقاؤں کو شہر سے رخصت ہوتے ہوئے دیکھنے کے لئے جمع ہوئے تھے۔" لیکن اس کے بارے میں سوائے موبرے ٹامسن اور ڈیلافوز کے کوئی یقینی طور پر شہادت دینے والا نہیں تھا کیونکہ عام قتل سے جان بچانے والے چار لوگوں میں سے یہی دو بچ گئے تھے، جنہوں نے ان ناخوشگوار واقعات کو بیان کیا۔ مشاہد کی حیثیت سے ان دونوں کو ٹریننگ دی گئی تھی۔ لیکن جہاں ڈیلافوز کی تفصیل بہت مختصر ہے وہاں ماؤبرے تھامسن کا بیان کافی طویل ہے۔ کیونکہ ان دونوں کو نانا اور ان کے مشیروں پر مکمل اعتماد نہیں تھا۔
تھامسن لکھتا ہے: "جیسے ہی میجر وائبرٹ ناؤ پر بیٹھے 'بھاگو' کا لفظ سنائی دیا۔ لیکن ساحل سے اشارہ ملتے ہی مقامی ملاح جن کی تعداد آٹھ تھی اور ان کے ساتھ ایک اور کھینچنے والا، سبھی ناؤ سے کودے اور پانی سے ہوتے ہوئے ساحل کی طرف بھاگے۔ ہم نے ان پر فوراً گولیاں چلائیں۔" لیکن ان کی اکثریت زندہ بچ گئی اور اس وقت کانپور کے پڑوس میں اپنے پرانے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ اس سے پہلے کہ وہ ناؤ سے کود کر بھاگیں، انہوں نے رازدارانہ طور پر چتوار سے گھاس کی چھت پر جلتے ہوئے کوئلے ڈال دیئے۔ ناؤ سے کودتے ہی وہ لوگ جو میجر وائبرٹ کو گھاٹ تک بحفاظت لائے تھے، انہوں نے کاربائنوں سے ہم پر گولیاں چلانی شروع کر دیں۔ ناؤ کے جلنے سے ہوئی افراتفری میں ہم کو جو وقت ملا، اس میں ہم نے ان پر گولیا چلائیں جن کی تعداد پندرہ یا سولہ تھی لیکن ہم پر گولیاں برسانے کے بعد وہ فوراً غائب ہو گئے۔ اس کے بعد ہر طرف بدنظمی پھیل گئی۔ اکثر ناؤوں کو ہلایا بھی نہیں جاسکا۔ گرچہ ان کے سارے مسافر پانی میں کود کر ان کو بہانے کی کوشش کرنے لگے۔ چھپی ہوئی بندوقوں سے گولیاں چلائی گئیں اور ناؤ کی چھت میں آگ لگ گئی۔ بچے عورتیں کود کر ناؤ کے پیچھے چھپ گئیں اور گولیوں سے بچنے کے لئے ٹھوڑی تک پانی میں ڈوب گئیں۔ وائبرٹ کی ناؤ گہرے پانی میں بہنے لگی اور اس کی چھت بھی جلنے سے بچ گئی۔ ماؤبرے تھامسن تیر کر اس ناؤ تک گیا اور اسے اندر کھینچ لیا گیا۔ ایک دوسری ناؤ بھی گھاٹ سے بہاؤ لے کر آگے بڑھی لیکن اس کے نچلے حصے میں گولی لگنے سے وہ ڈوبنے لگی۔ جو لوگ بچ گئے، انہیں کھینچ کر کسی صورت سے وائبرٹ کی ناؤ میں سوار کیا گیا۔ لکڑی کے ٹکڑوں کی مدد سے مسافروں نے ناؤ کو خطرے کی حدود سے باہر دھکیلنے کی کوشش کی۔ لیکن چاروں طرف سے گولیاں برسنے لگیں۔ دوپہر تک کچھ لوگ کسی صورت سے گولیوں کی زد سے باہر تو نکل گئے لیکن تمام دن ان پر مسکٹ سے گولیاں چلتی رہیں۔ رات کے وقت جلتے ہوئے تیر پھینکے گئے۔ ایک کشتی چھوڑی گئی تاکہ وہ دوسری ناؤ میں آگ لگا سکیں۔
صبح انہیں کچھ راحت ملی۔ لیکن کچھ گاؤں والے جو ندی میں نہا رہے تھے، نے انہیں بتایا

کہ علاقہ کا سب سے طاقت ور زمیندار بابو رام بخش نجف گڑھ میں انہیں روکنے کے لئے منتظر ہے۔ دو بجے کے قریب وہ اس خطرناک جگہ پر پہنچ گئے۔ بدقسمتی نے ان کا پیچھا یہاں بھی نہیں چھوڑا۔ ناویں کشتیاں خشکی پر پہنچ گئیں اور اس سے ساحل پر موجود مسکیٹیر کو صحیح نشانہ لگانے میں کامیابی مل گئی۔ بعد میں ایک توپ بھی لائی گئی لیکن اسی وقت پڑنے والی بوندوں کی وجہ سے یہ کام میں نہیں لائی جا سکی۔ شام کے وقت کچھ مسلح لوگ کانپور سے ایک ناؤ میں سوار ہو کر آئے۔ لیکن ان کی ناؤ بھی ریت میں پھنس گئی۔ بھگوڑوں کو ان کے حملے کا پہلے سے اندازہ ہو گیا اور انہوں نے انہیں شکست دے دی۔ دوسری مرتبہ پھر ناؤ خشکی میں پھنس گئی لیکن ایک طوفان نے انہیں جلد ہی اس مصیبت سے نجات دے دی۔ تاہم خطرہ نے ان کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ صبح کے وقت پتہ چلا کہ ان کی کشتیاں راستہ بھٹک کر روانی سے باہر ہو گئیں اور جلد ہی ان کا تعاقب کرنے والے پھر پہنچ گئے۔ دو رات اور دو دن سخت خطروں میں گھرے ہونے اور کھانے پینے کا کوئی سامان' سوائے اس کے کہ جو کچھ ندی سے مل جائے' نے انہیں بری طرح تھکا دیا تھا۔ لیکن وہ اپنی جان بچانے کے لئے لڑ رہے تھے اور خود حفاظتی کی جبلت ان کے کام آ رہی تھی۔ وائبرٹ نے تھامسن ڈیلافوز اور بارہ دوسرے آدمیوں کو حکم دیا کہ وہ کشتیوں سے اتر کر حملہ آوروں پر جوابی حملہ کریں۔ گاؤں والوں اور باغیوں کی ملی جلی بھیڑ ان کے اس پاگل پن کے حملے کی تاب نہ لا سکی اور جب وہ اس بھیڑ سے کسی صورت سے باہر نکلے تو انہیں پتہ چلا کہ ان کی ناؤ غائب ہو گئی ہے۔ تعاقب کرنے والوں سے پیچھا نہ چھڑا پانے کی وجہ سے ان مایوس لوگوں نے مندر میں پناہ لی۔ مندر میں بھی انہیں کھانے کا کوئی سامان نہیں ملا۔ لیکن ایک سپاٹ برتن میں موجود تھوڑے پانی سے انہوں نے اپنی پیاس بجھائی۔ جلد ہی انہوں نے مندر کو خالی کیا اور پھر ندی پر واپس آ گئے۔ اب ان کی تعداد گھٹ کر سات رہ گئی تھی۔ تیرتے ہوئے ان میں سے دو آدمیوں کے سروں میں گولی مار دی گئی اور ایک تیسرا ریت میں پھنس گیا' جہاں اس کے سر کو شدید ضرب پہنچائی گئی۔ تعاقب کرنے والوں نے آخر پیچھا چھوڑ دیا۔ تین گھنٹے تک تیرنے کے بعد ان بچے کھچے لوگوں نے کچھ آرام کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ ساحل کے پاس گردن تک پانی میں بہہ گئے' جہاں انہیں ساحل سے کچھ دوستوں کی آوازیں سنائی دیں۔ انہیں اپنی خوش قسمتی پر یقین نہیں ہوا' لیکن جب انہیں یہ یقین ہو گیا کہ اب وہ بچ گئے تو ان کے اندر اتنی بھی ہمت نہیں تھی کہ وہ پانی سے باہر نکل سکیں۔ ابھی تک زندگی کو لاحق خطرے سے بچنے کے لئے وہ اس طرح کی کوشش کرتے رہے۔ لیکن اب انہیں معلوم ہوا کہ وہ بغیر کسی مدد کے اُتھلے پانی سے باہر نہیں آ سکتے۔ ٹامسن صرف ایک قمیص پہنے ہوئے تھا۔ ڈیلافوز لنگوٹ میں تھا۔ سَنی ون اور مرفی کے جسم پر کوئی کپڑا نہیں تھا۔ ان کی میزبان دگ وجے سنگھ مرار مئو کا رہنے والا اودھ کا زمیندار تھا' جس کے مکان پر وہ 29/جون کی شام کو پہنچے۔

ڈیلافوز کا مختصر بیان اپنی تفصیلات میں موبرے ٹامسن سے کچھ مختلف ہے۔ ''ہم ندی پر

پہنچ کے ناؤ میں بحفاظت تمام بیٹھے۔ راستے میں کسی نے تنگ نہیں کیا۔ لیکن جیسے ہی ہم ناؤ میں بیٹھے' اپنی مسکٹ رکھی اور اپنے کوٹ اتارے تاکہ ناؤ میں آرام سے بیٹھ سکیں۔ اسی لمحے کیویلری نے حکم دیا کہ وہ ان دو بندوقوں کو چلائیں جو چھپی ہوئی تھیں۔ وہ فوراً نکالی گئی اور ہم پر گولیاں چلائی گئیں۔ جب کہ چاروں طرف سے سپاہی آئے اور انہوں نے بھی گولیاں چلانی شروع کر دیں۔ سارے لوگ ان ناؤوں سے کود گئے اور بجائے اس کے کہ ناؤ کی لنگر اُٹھاتے سب پہلے ہی ناؤ کی طرف بھاگے' جس کا لنگر اٹھایا جاچکا تھا۔ صرف تین ناویں ندی کے مخالف بہاؤ میں چل سکیں' لیکن ان پر بھی چاروں طرف سے کیویلری اور انفینٹری کے لوگوں نے گولیاں برسائیں۔ اس سے پہلے کہ ناؤ آدھا میل کا فاصلہ طے کرتیں' ہماری پارٹی کے تقریباً آدھے لوگ یا تو مارے جاچکے تھے یا زخمی ہو چکے تھے۔ اور ہماری دو کشتیوں میں سوراخ بھی ہو چکا تھا۔''

ٹامسن اور ڈیلافوز شاید دو مختلف ناؤ میں بیٹھے تھے۔ ان کے بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اگر راستے میں کوئی چھیڑ چھاڑ ہوئی تو وہ ان سے ناواقف تھے۔ ماؤبرے تھامسن صاف صاف یہ بیان کرتا ہے کہ ہمارے ناؤ میں بیٹھنے سے پہلے سپاہی بہت ہی مہربان تھے۔ جیسا کہ اس کا کہنا ہے' اس وقت تک کچھ نہیں ہوا جب تک میجر وائبرٹ جو کیمپ چھوڑنے والا آخری آدمی تھا اپنی ناؤ پر نہیں سوار ہو گیا۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ راستے میں کرنل ایورٹ کو مارے جانے اور جنرل وہیلر کا سر اتارنے کا واقعہ جب وہ اپنی پالکی سے اتر رہا تھا' کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ ہو سکتا ہے ایورٹ کو گھاٹ پہ پتہ نہ چلا ہو اور وہیلر تو پالکی میں بیٹھے ہی نہیں بلکہ ندی تک اپنی اہلیہ اور بیٹی کے ساتھ پیدل گئے تھا۔ یہ بھی واضح نہیں ہے کہ پہلی گولی کس نے چلائی۔ ماؤبرے تھامسن کی ناؤ میں سوار لوگوں نے یا ساحل پر کھڑے گھوڑ سواروں نے۔ کیونکہ وہ اس پر زیادہ زور دیتا ہے کہ جب ملاح ناؤ چھوڑ کر بھاگے' ان پر گولیاں چلائی گئیں۔ اور اسی لمحے ان لوگوں نے جو میجر وائبرٹ کو بحفاظت لائے تھے انہوں نے گولیاں چلائیں۔ لیکن یہ واضح ہے کہ جب کچھ ملاح بھاگ رہے تھے' مارے گئے۔ کیونکہ ماؤبرے تھامسن لکھتا ہے کہ ان میں سے اکثر بھاگ گئے۔ یہ کہانی کہ پہلے سے اس بات کی سازش کی جاچکی تھی کہ انگریزوں کو کسی بہانے ندی تک لایا جائے اور پھر ان کا قتل کیا جائے کو ان حقائق کے پاس منظر میں دیکھا جانا چاہیے۔

ان سارے بیانات جن کے بارے میں شہادتیں کمزور ہیں' سے آسانی سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ نہ اس بات سے انکار کیا جاسکتا کہ وہاں توپیں رکھی گئی تھیں اور ساحل کے کنارے فوج تعینات کی گئی تھی۔ ان ناؤوں کے بارے میں چودھری گوردیال اور لوچن نے اپنی شہادتیں گزارتے ہوئے بتایا کہ گنل سے ایک ناؤ پر گولی چلائی گئی تھی اور اس کے اثرات آس پاس لنگر انداز دوسری ناؤ پر بھی پڑے۔ زمین کے چوہان مالکان کی موجودگی کا پہلے سے شاید انتظام نہیں کیا گیا تھا کیونکہ برٹش فوج کے شکست کھانے اور خود سپردگی کی کہانی بہت جلد مشہور ہو گئی اور آس پاس کے گاؤں کے لوگ صبح کے وقت گھاٹ پر انگریزوں کو رخصت ہوتے دیکھنے کے لئے جمع ہو گئے۔ اور

یہ بھی یقینی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ اس سازش میں نانا کا کیا رول تھا۔ باغی فوجیوں کے سربراہ ہونے کے سبب ان غلط اعمال کی ذمہ داری سے اسے بری نہیں کیا جا سکتا اور تکنیکی طور پر سارے قتل و غارت گری کا الزام بھی اسی پر آتا ہے۔ لیکن جون لینڈ انہیں شبہ کی بنیاد پر انھیں بری الذمہ سمجھتا ہے "بغیر کسی ثبوت کے۔ مجھے افسوس ہے خاص طور پر اس موضوع پر ڈھیر سارے خطوط پڑھنے کے بعد کہ کانپور میں جولائی 1857ء میں ہوئی قتل و غارت گری اور سازش کی ذمہ داری کسی ایک شخص پر عاید کی جائے۔ نانا صاحب بذات خود انگریز جنٹلمین تھے اور ساری خواتین ان سے ذاتی طور پر اس حد تک واقف تھیں کہ بجا طور پر یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ جب انہوں نے ناؤ کو تیار کئے جانے کا حکم دیا تو وہ اس بات میں مخلص تھے کہ عیسائی بحفاظت تمام کلکتہ تک پہنچ جائیں اور جو کچھ ان کی حکم عدولی کے باعث ہوا' یہ ان لوگوں کا کارنامہ تھا جو ہمیشہ اس بات کے خواہشمند رہے کہ نانا صاحب اور برٹش حکومت کے درمیان ایسی کھائی بن جائے جس سے مصالحت کی ہر کوشش ناممکن ہو جائے۔ شاید یہ بات نانا صاحب سے کوئی اور اچھی طرح نہیں جانتا تھا کہ اگر انگریز ہندوستان میں دوبارہ فاتح بن گئے۔ تو صرف یہی ایک بات کہ انہوں نے ان لوگوں کی جاں بخشی کی جنہوں نے خود سپردگی کر دی تھی تو اسی وجہ سے ان کی بھی جاں بخشی ہو جائے گی۔ شاید اسی وجہ سے انہوں نے سر ہیو ویلر سے وعدہ بھی کیا تھا۔" اور یہ بات بھی صحیح ہے کہ وہ عورتیں اور بچے جو سپاہیوں کی گولیوں سے اس صبح بچ گئے' انہیں نانا صاحب نے بچایا تھا۔ اور انہیں کے حکم کی وجہ سے قتل عام بھی رکا تھا۔ کرنل ماڈ نے اس واقعہ کے 37 سال بعد لکھتے ہوئے محسوس کیا کہ ان پُر تشدد واقعات میں نانا کا ہاتھ ہونے پر شبہ کرنا لایعنی ہے۔ "ان ساری شہادتوں کو جنہیں کرنل ولیم نے جمع کیا تھا' بغائر اور بغیر کسی تعصب کے مطالعہ کرنے کے بعد نانا کے سلسلہ میں جو الزامات عاید کئے گئے تھے کہ وہ عورتوں اور بچوں ے قتل کی سازش میں شریک تھے' صرف شبہ کیا جاسکتا ہے۔ بلکہ میرا تو خیال یہ ہے کہ انہیں ان کے بعض ساتھیوں نے انہیں ایسا کرنے کے لئے مجبور کیا جن کے اس عمل سے وہ انکار نہیں کر سکے۔ آج کے زمانے میں بھی خود ہمارے اپنے ملک میں ایسے واقعات ہوئے ہیں کہ لوگوں نے مجبوراً تشدد کے واقعات کو برداشت کیا ہے۔ یہ بھی یقینی بات ہے کہ ایک بار نہیں بلکہ کئی بار نانا نے ان مجبور عورتوں اور بچوں کو پناہ دی' زندگی بچائی اور ان کے ساتھ رحم دلی سے پیش آئے۔ گھاٹ پر جو قتل عام کا واقعہ ہو' اس کی کسی شیطان صفت درندے نے منصوبہ بندی کی تھی اور وہ ایسا چالاک دماغ تھا جس کی نانا میں جھلک بھی نہیں ملتی۔"

اب یہ معلوم کرنا فعل عبث ہوگا کہ اس سازش میں کس کا دماغ شامل تھا۔ لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ 1857ء میں شامل دونوں پارٹیوں میں سے کسی کا بھی مقصد انسانیت کی فلاح نہیں تھا۔ یہ عام طور پر مانا جاتا ہے کہ جب کانپور میں بغاوت شروع ہوئی تو کسی بھی سپاہی نے اپنے افسران پر کوئی حملہ نہیں کیا۔ بلکہ جیسا کہ موبرے ٹامسن نے قبول کیا ہے کہ گھیرابندی کے ابتدائی کچھ دنوں میں انگریزوں نے جس کسی کو قیدی بنایا' اسے بغیر کسی کارروائی کے جیل بھیج دیا۔

کرنل ایورٹ اور ان کی اہلیہ کو پہلے سے ہی خطرہ محسوس ہونے لگا تھا کہ ان کے ساتھ کیا واقعہ ہونے والا ہے۔ کیوں؟ کس شخص نے کرنل ایورٹ کو در پیش آنے والے خاتمہ کے سلسلہ میں پہلی گولی چلائی۔ کیوں؟ اس منحوس صبح کس شخص نے پہلی گولی چلائی۔ سکنڈ کیویلری کے کار بائنڈرس نے گولیاں کب چلائیں؟ ٹامسن کی ناؤ سے ملاحوں پر پہلی گولی چلائے جانے کے پہلے یا اس کے بعد؟ اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ کیا سپاہی اس بات سے بے خبر تھے کہ نیل اور اس کے آدمیوں نے غیر انسانی تشدد برپا کیا تھا؟ مولوی لیاقت علی کانپور پہلے ہی پہنچ چکے تھے اور انہوں نے یقیناً نیل کی سفاکانہ حرکات کی خبر الٰہ آباد دی ہوگی۔ "وہ بوڑھا شخص جس نے ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔" ہومس لکھتا ہے: "بچوں کو دودھ پلاتی ہوئی مجبور عورتوں نے سب سے پہلے ہمارے بدلے کی کارروائی کا مزہ چکھا" اور جن لوگوں کے ساتھ بدلے کی یہ کارروائی کی گئی ان کے رشتہ داروں کو اس بات سے کوئی تسلی نہیں ہوگی کہ نیل نے گاؤں کو جلانے کے بعد اور بے قصور لوگوں پر گولیاں چلانے کے بعد کوئی خوشی نہیں محسوس کی۔ کیونکہ ستی چورا گھاٹ پر ہوئے قتل عام نیل کی حرکتوں کے بعد ہوا نہ کہ اس سے پہلے۔ اگر نانا کو ان کے ساتھیوں کے جرائم کے سلسلہ میں قانونی طور پر ذمہ دار سمجھا جاتا ہے تو یہ ذمہ داری نیل پر بھی عاید ہوتی ہے۔ اگر اس نے اپنے بہیمانہ افعال سے گاؤں والوں میں خوف وہراس نہ پیدا کیا ہوتا تو اس پر آسانی سے یقین کیا جاسکتا ہے کہ وہ ہیلر کی شکست سے پہلے کانپور پہنچ گیا ہوتا۔

جوالا پرشاد، عظیم اللہ اور بالا راؤ کو تانتیا ٹوپے کے ساتھ 27/جون کی سازش کے لئے مجرم پایا گیا۔ لیکن ان کے علاوہ بھی کچھ ایسے لوگ تھے جنہیں اپنے پرانے معاملات طے کرنے تھے۔ ہولاس سنگھ جو کوتوال تھے، اس وقت گھاٹ پر نہیں گئے کیونکہ انہوں نے دو دن پہلے ہی اس قتل عام کے بارے میں سُن رکھا تھا۔ ہولاس سنگھ نے کہا کہ قاضی وسیم الدین نام کا شخص اس قتل عام کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ "جب یورپین کے لئے ناؤ تیار کرائی جارہی تھی اس سے دو دن قبل ایک شام قاضی کیویلری رجمنٹ کے دوسردار کے ساتھ جن کے نام میں نہیں جانتا، اس کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ اس وقت میں ان کے دروازے پر پہنچا اور میں نے سنا وہ کہہ رہے تھے کہ یورپین کو خندق سے باہر نکال کر قتل کرنا قانونی طور پر جائز اور صحیح ہے، میں نے سنا لیکن مجھے یہ یاد نہیں کہ کہا کس نے تھا؟" ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ بہت سے گواہی دینے والے اشخاص ایسے تھے جو اپنی گردن بچانا چاہتے تھے اور کچھ انعام کے لالچ میں بھی اس طرح کے بیانات دے رہے تھے۔ عام حالات میں اس طرح کی شہادتوں کو کوئی بھی عدالت قبول کرنے سے انکار کر دیتی۔ لیکن غدر کے زمانے میں اس طرح کی بہت سی بے بنیاد اور فرضی گواہیاں بھی حقیقت سمجھی گئیں۔ فورجٹ بتاتا ہے کہ بمبئی کے بہت سے یورپین نہ صرف اس بات پر یقین رکھتے تھے بلکہ انہوں نے لارڈ ایلفنسٹن سے رپورٹ بھی کی کہ جگن ناتھ شنکر سیٹھ جیسی شہرت رکھنے والا سرکاری ملازم اور بھاؤ داجی جیسا مشہور عالم اسکالر نانا کے ساتھ خط وکتابت کے ذریعہ سازش کر رہے تھے۔ اسے یقین تھا کہ جام

کھنڈی کے راجہ نے اگر بمبئی کے مشہور بیرسٹر مسٹر بارٹن کو اپنے مقدمے کے لئے رکھا نہ ہوتا تو اس کا زیادہ امکان تھا کہ اسے پھانسی دے دی جاتی۔

یہ ساری کشتیاں بہت کم مہلت میں جمع کی گئی تھیں اور ان پر چھتیں ڈالی گئی تھیں۔ یہ ملاحوں کی نہیں تھیں بلکہ مہیشوری اور اگروال بنیوں کی تھیں۔ ان کے مالکان کو اچھا خاصا معاوضہ بھی دیا گیا تھا۔ 26ر کی شام کو جب جانچ کمیٹی کے ارکان انہیں دیکھنے گئے تو بہت سی ناؤ میں بانسوں کا پلیٹ فارم بنا تھا اور نہ ہی ان پر پھوس کی چھت ڈالی گئی تھی۔ چنانچہ ہزاروں مزدور کو لگا کر راتوں رات اس کام کو پورا کرایا گیا۔ اگر نانا نے سازش کے بارے میں پہلے سے سوچا ہوتا تو پھر اتنی زیادہ رقم خرچ کر کے اور اتنے مزدور لگا کر ناؤوں کو تیار کیوں کیا جاتا۔ چونکہ خندق سے ایک بار باہر نکلنے پر انگریز دشمن بھیڑ کے سامنے میدانی علاقے میں ہی اتنے مجبور ہو جاتے جتنے کہ ناؤ پر ہوئے تھے۔ ان کے پاس ان کے اسلحے تھے اور ان سے یہ امید بجا طور پر کی گئی تھی کہ وہ اپنے بچوں اور عورتوں کو بغیر کسی مزاحمت کے بیدردی سے قتل نہ ہونے دیں گے۔

جب وہیلر اور اس کے رفقا پاہی بھکمری سے شدت کے ساتھ لڑ رہے تھے۔ نیل الہ آباد میں بغاوت فرو کرنے میں لگا ہوا تھا۔ جیسے ہی میرٹھ اور دہلی کی خبریں کیننگ کو ملیں، نیل اور اس کے آدمیوں کو مدراس سے کلکتہ بلایا گیا جو ایک سخت اور ہمت نہ ہارنے والا شخص تھا اور ادھورے کاموں میں یقین نہیں رکھتا تھا۔ ایک کٹر پرانے عقیدے کا عیسائی ہونے کی بدولت وہ اس لائق تھا کہ کرامویل کے ساتھیوں میں سے ہوتا۔ اس کی خود اعتمادی نے اسے اچھا رہنما بنایا تھا۔ لیکن وہ فوجی کی شکل میں ایسا لیفٹیننٹ تھا جس سے اس کے ساتھی ہمیشہ پریشان رہتے۔ نیل کلکتہ پہنچا اور ہاوڑہ اسٹیشن پر ریلوے کے ملازمین کے ساتھ اس نے جو سلوک کیا وہ اس کی خصوصیت کو ظاہر کرتا ہے۔ ریلوے کا اسٹاف اس کے فوجیوں کے لئے ٹرین کو روکنا نہیں چاہتے تھے۔ اس نے فوراً ہی اسٹیشن ماسٹر، انجینئر اور گارڈ کو اپنی حراست میں لے لیا۔ اس کے سارے فوجی جب ڈبوں میں بیٹھ گئے اور دس منٹ کے بعد جب ٹرین روانہ ہوئی تو اس نے ریلوے کے افسروں کو تنبیہ کرتے ہوئے کہا کہ اس وقت ان کا رویہ باغیوں اور سازشیوں جیسا تھا اور وہ خوش قسمت ہیں کہ عجلت میں ہونے کی وجہ سے وہ انہیں فوری طور پر کوئی سزا نہیں دے رہا۔ نیل کا مقصد کانپور اور لکھنؤ میں فوجی مدد پہنچانا تھا۔ لیکن وہ بنارس کے لئے روانہ ہوا۔

بنارس اس وقت حکومت ہند کے لئے پریشانی کا باعث بنا ہوا تھا، اس وجہ سے نہیں کہ ہندوؤں کا مقدس مقام ہے بلکہ اس وجہ سے کہ رفتہ رفتہ ہر طرح کے مذہبی خیالات رکھنے والے حکومت کے قیدیوں کے لئے یہ گڑھ بن گیا تھا۔ اور کئی سال قبل دتی سلطنت کے کچھ متعلقین نے اسے اپنا شہر بھی بنا لیا تھا۔ یہ اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ سرکار کی سیاسی پریشانیوں کو وہ اپنے فائدے کے لئے استعمال کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ اسٹیشن کی جو دفاعی اہمیت تھی کہ یہ پٹنہ الہ آباد شہروں کو ملاتا تھا، اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لیکن بنارس ان دنوں گرچہ مضبوط نہیں، لیکن محفوظ

ہاتھوں میں تھا۔ گبنز جو بنارس کے جج تھے انہوں نے اس ضلع کے مجسٹریٹ اور کلکٹر لنڈ (Lind) کی شجاعت، ہمت اور ارادوں کی وافر گواہیاں پیش کیں۔ وہاں کا کمشنر ٹکر عیسائی مبلغ تھا۔ نیل کا اعتقاد تھا کہ خدا انہیں کی مدد کرتا ہے جو آپ اپنی مدد کرتے ہیں۔ ٹکر جو راسخ العقیدہ تھا وہ اپنی فراست پر زیادہ یقین رکھتا تھا۔ وہ اپنی ذمہ داریاں آنے والے طوفان کو نظر انداز کر کے پوری کرتا۔ وہ شہر سے غیر مسلح ہو کر گزرا کرتا۔ سوائے اس وقت کے جب گھوڑے پر سوار ہوتا اور اس کے ہاتھ میں چابک ہوتا۔ اس نے گورنر جنرل کو لکھا۔ میرا مقصد لوگوں میں انگریز فوجیوں کی شجاعت کو برقرار رکھنا تھا۔ اور وہ اپنا کھیل بہت کامیابی سے کھیل رہا تھا۔ جب تک کہ نیل وہاں "حملہ کرنے اور برباد کرنے" کے لئے نہیں پہنچا۔ اسٹیشن پر فوجی ٹکڑی بہت زیادہ تیاری کی حالت میں بھی نہیں تھی۔ پانسن بائی جو اس ٹکڑی کا بریگیڈیر تھا، پندرہ سال قبل افغانستان میں بہت نام کما چکا تھا۔ اپنی ہمت و شجاعت میں وہ بے مثال تھا۔ جب بغاوت کی خبر بنارس پہنچی تو آلفرنس اور واٹسن نے اسے مشورہ دیا کہ عقلمندی کا کام یہ ہوگا کہ بنارس کو خالی کر کے چنار کے مضبوط قلعوں میں حصار بند ہو جایا جائے۔ ناامیدی کے اس مشورے کے برخلاف سویلین افسروں نے ایک متحدہ محاذ بنا لیا۔ وہ نہ صرف اپنی جگہوں پر جمے رہے بلکہ جو بھی یورپین فوجی ادھر ادھر سے بنارس آتے، انہیں وہ کانپور بھیج دیتے۔ گرچہ فوجی مشورہ اس کے خلاف تھا لیکن ٹکر سر ہنری لارنس کی درخواستوں کو مسترد نہیں کر سکتا تھا۔

نیل 3/ جون کو بنارس پہنچا۔ کانپور گرچہ پُر سکون تھا لیکن لکھنؤ میں بغاوت پھیل چکی تھی۔ 4/ جون کو اعظم گڑھ میں بغاوت کی خبریں پہنچیں۔ سپاہیوں نے خزانے پر قبضہ کر لیا تھا اور غیر مستقل (ارریگولر) نے اپنے افسروں کو محفوظ مقام پر پہنچا دیا۔ لیکن اپنے ساتھیوں کے ساتھ جنگ کرنے کو تیار نہیں ہوئے۔ فوجی حکمراں ہزیمت میں مبتلا ہو گئے۔ انہیں اندیشہ ہوا کہ اعظم گڑھ کی چنگاری اور جگہوں پر پھیل سکتی ہے۔ ان کے اندیشے کو مزید تقویت گبنز کے جاسوسوں نے پہنچائی۔ یہ واضح نہیں ہے کہ پانسن بائی نیل سے کب ملے اور کہاں ملے؟ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس نے 37 ویں این آئی کو دوسری صبح غیر مسلح کرنے کا جو فیصلہ لیا تھا، وہ اسے پہنچ گیا۔ لیکن نیل نے فوری اقدام کا مطالبہ کیا۔ یہ ثابت نہیں ہو سکا کہ 37 ویں این آئی بھی باغی ہو گئے تھے سوائے اس منطق کے کہ پہلے ہوئے واقعات کو مثال بنا کر پیش بندی کر لی جائے۔ ان کے کمانڈر میجر بیرٹ کو ان کی وفاداری پر کوئی شک نہیں تھا۔ سکھ رجمنٹ پر پورا اعتماد تھا۔ اسی طرح ارریگولر کیویلری پر بھی۔ ان کی مدد اور کچھ یورپین کی مدد سے مشتبہ سپاہیوں کو غیر مسلح کیا جانا تھا۔ شام کو پانچ بجے پریڈ بلائی گئی۔ 37 ویں رجمنٹ کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ اپنے مسکٹس کو بندوق سے لٹکا دیں۔ کوئی مزاحمت نہیں ہوئی۔ لگاتار چھ کمپنیوں نے اپنے اسلحے جمع کرا دیئے تبھی اس وقت یورپین فوجی اپنے ہاتھوں میں اسلحہ لئے ہوئے نظر آئے۔ پنجاب میں یورپین فوجیوں کے آنے کا مقصد مقامی فوجیوں کی موت سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے یہ بات فوری طور پر گونجنے لگی کہ یورپین

انہیں مارنے آرہے ہیں۔ پانسن بائی نے انہیں یقین دلانا چاہا۔ مقامی فوجیوں نے احتجاج کیا کہ انہوں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ پانسن بائی کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ سوائے اس کے کہ انہیں جو حکم دیا گیا وہ اس پر عمل کریں۔ "کیونکہ ان کے بہت سے بھائیوں نے اپنے عہد کو توڑ دیا اور ایسے حاکموں کی جان لے لی جنہوں نے انھیں کبھی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔" مقامی فوجیوں کو الزام بھی نہیں دیا جاسکتا اگر انہوں نے اس اقدام کو غیر ضروری سمجھا اور ان میں سے کچھ خود حفاظتی کی جبلت کے تحت اپنے اسلحوں کی طرف دوڑے اور اپنی حفاظتی تدابیر کرنا شروع کیں۔ یورپین نے فوراً ہی گولی چلانی شروع کر دیں۔ اسی لمحے سکھ اور اررےگولر بھی پریڈ کے لئے آئے۔ جس کے مقصد سے وہ واقف نہیں تھے۔ اور جان بوجھ کر چلائی جانے والی گولی سے وہ شبہ میں پڑگئے۔ اور انہوں نے بھی گولی چلانی شروع کر دی۔ اس طرح جب وفادار فوجیوں کو بغاوت کے لئے آمادہ کیا گیا' نیل نے فوراً کمان سنبھال لی۔ یہاں واقعات صاف نہیں ہیں اور یہ پتہ لگانا مشکل ہے کہ پانسن بائی جولو کے مرض میں مبتلا تھے' جان بوجھ کر کمان نیل کو سونپی یا اس افسر نے اس جوش میں کہ وہی حالات کو سنبھال سکتے ہیں' اپنے سینیئر افسروں کو ذمہ داریوں سے بری کر دیا۔ یہ کوئی بہت ہمت کی بات بھی نہیں تھی کہ چند مسلح لوگوں نے غیر مسلح لوگوں پر گولیاں چلا کر انہیں منتشر کرنا شروع کیا۔ لیکن ٹکر کو پکا یقین تھا کہ غیر مسلح کرنے کا کام دانشمندی سے نہیں کیا گیا۔ اور گورنر جنرل نے بھی اس کی رائے سے اتفاق کیا۔

نیل صرف بغاوت کچلنے سے ہی مطمئن نہیں ہوا یہ اُس کی اپنی پالیسی تھی۔ باغیوں اور شہر کے دوسرے لوگوں کو یہ سبق بھی سکھانا تھا کہ برٹش فوج ابھی مفلوج نہیں ہوئی ہے۔ "ہمارے فوجی حکمراں ہر طرح کے مجرموں کا شکار کر رہے تھے اور انہیں اتنی ہی آسانی سے پھانسی پر لٹکا رہے تھے جیسے وہ انسان نہ ہوں کتے' گیدڑ یا اسی قبیل کے جانور ہوں" Kaye لکھتا ہے۔ اس واقعہ کے ایک مہینہ کے بعد سے ایک پادری نے لکھا کہ آنکھوں کے سامنے جو منظر نظر آرہا تھا وہ ہر طرف پڑے ہوئے پھانسی کے پھندے تھے جس پرُ جوش کرنل "ایک ایک کر کے لائے جارہے باغیوں کو لٹکا رہا تھا۔ ایک موقع پر کچھ نوجوان لڑکے جنہوں نے کھیل ہی کھیل میں باغیوں کا پرچم اٹھا لیا تھا' پر مقدمہ چلا کے موت کی سزا دی گئی۔"، "رضاکارانہ طور پر پھانسی پر لٹکانے والے لوگ ضلعوں میں دیہی علاقوں میں جاتے اور وہاں سے پکڑ پکڑ کر لوگوں کو لاتے اور اس موقع پر شوقیہ پھانسی پر لٹکانے والوں کی کمی نہیں تھی۔ ایک آدمی جس نے بہت سے لوگوں کی جانیں لی تھیں' اس نے بہت ہی پر مسرت انداز میں ڈینگ ہانکتے ہوئے کہا کہ "آم کے پیڑوں پر پھندے لٹکائے جاتے اور وہاں سے گرنے والی لاشوں کو ہاتھیوں سے کچلوایا جاتا اور یہ ہم لوگوں کے لئے تفریح کا ایک سامان تھا۔" مقامی لوگ بلاوجہ یورپین فوجیوں کو "انسانی جسم میں راکھشس" نہیں سمجھتے تھے۔

بنارس کی بغاوت کا چاروں طرف اثر ہوا۔ الہ آباد' فتح پور' فیض آباد اور جونپور میں مقامی

فوجیوں کو جلد ہی معلوم ہو گیا کہ کس طرح بے قصور فوجیوں کے ساتھ ان پر شبہ کرنے والے افسروں نے ظلم کیا ہے۔ اور جلد ہی انہیں احساس ہو گیا کہ ان میں سب سے زیادہ وفادار شخص بھی انگریز بے وفاؤں کے ہاتھوں محفوظ نہیں ہیں۔ یہ نیل کا ہاتھ تھا جس نے کانپور میں قیامت اور لکھنؤ میں تہلکہ خیز خونریزی کے حکم نامے پر دستخط کیے تھے۔

بنارس کی خبر دوسرے ہی دن الہ آباد پہنچ گئی۔ یورپین عورتوں اور سویلین لوگوں کو فوراً ہی حکم دیا گیا کہ وہ قلعے میں محصور ہو جائیں۔ لیکن بہت سے لوگوں نے اس تنبیہ کو سنجیدگی سے نہیں لیا۔ رات میں بغاوت کا شبہ تھا لیکن چونکہ رات میں کوئی واقعہ نہیں ہوا' بہت سے لوگ صبح کے وقت اپنے بنگلوں میں واپس آ گئے۔ کانپور سے یہ حکم موصول ہوا تھا کہ جو کوئی بھی موجود یورپین ہو اسے قلعہ بند کر دیا جائے۔ لیکن بہت سے لوگ اس وقت موجود نہیں تھے۔ چنار سے ساٹھ آرٹیلری پنشن یافتہ لوگ آ گئے تھے۔ کچھ سرجنٹ بھی تھے اور 80 لوگوں نے رضاکارانہ طور پر اپنی خدمات پیش کیں۔ گیریسن کی پوری طاقت چار سو سکھوں پر مشتمل تھی جن کی کمان کیپٹن بریسر کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ چھٹے مقامی انفینٹری کے 80 لوگ بھی تھے۔ رجمنٹ کے باقی لوگ دو میل کے فاصلے پر لائن میں موجود تھے۔ انہوں نے خود کو دلی کے خلاف مورچے میں حصہ لینے کے لئے پیش کیا تھا۔ اور ان کی اس پیشکش اور وفاداری کے لئے گورنر جنرل کی طرف سے 6/ تاریخ کی شام کو پریڈ میں ان کا شکریہ بھی ادا کیا گیا تھا۔ لیکن ابھی اس کو چند گھنٹے بھی نہ گزرے ہوں گے کہ انہوں نے بغاوت میں اسلحے اٹھا لئے۔ ایسا کہا جاتا ہے کہ شروع سے ہی چھٹے این آئی میں بغاوت کے آثار پائے جا رہے تھے۔ انہوں نے اتنے دن صرف اس لئے انتظار کیا کہ وہ سکھوں کو اپنا ہمنو ابنالیں لیکن بنارس سے بہت سے لوگ لائن میں پہنچ گئے اور مقامی فوجیوں کو یہ علم ہو گیا کہ 37 ویں این آئی کے لوگوں کو پہلے غیر مسلح کر کے پھر انہیں مار دیا گیا۔ برٹش افسروں نے منصوبہ بنا لیا تھا کہ پوری بنگال آرمی کو وہ ختم کر دیں گے۔ فیلٹ نقارچی نے بعد میں گواہی دیتے ہوئے بتایا کہ مقامی سپاہیوں نے یہ سن لیا تھا کہ یورپین انہیں غیر مسلح کرنے کے لئے آ رہے ہیں' اس نے سازش کی کوئی خبر نہیں سنی تھی جیسے ہی سپاہیوں کو موقع ملا انہوں نے تلاش کر کے یورپین کو مارنا شروع کیا۔ ان کے مکانوں میں آگ لگائی اور لوٹ مار کرنے لگے۔ بدنظمی ہر طرف پھیل گئی۔ صرف عیسائی ہی نہیں بلکہ ہندو تیرتھ یاتریوں کو بھی ان لوگوں کے ہاتھوں تکلیف پہنچی۔

قلعے کے اندر گرچہ سکھ بے چین تھے لیکن بریسر نے انہیں قابو میں رکھا۔ اس نے اپنی زندگی کی شروعات ایک مالی کی حیثیت سے کی تھی اور اس کی طاقت کی بدولت اسے یہ کمیشن ملا تھا۔ اس نے نہ صرف اپنے آدمیوں کو قابو میں رکھا بلکہ ان کی مدد سے قلعے میں تعینات چھٹے این آئی کے لوگوں کو غیر مسلح کر دیا۔ چھٹے رجمنٹ کے لوگوں نے گھبرا کر بغاوت کر دی اور لوٹ کا مال جمع کرنے کے بعد اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے اور بعد کی جنگ میں انہوں نے کوئی حصہ نہیں لیا۔

اس وقت اس افراتفری کے عالم میں ایک گمنام شخص انتظامیہ کی باگ ڈور سنبھالنے کے

لئے آگے آیا۔ مولوی لیاقت علی چیل پرگنہ کے ایک کم تر خاندان سے تعلق رکھتے تھے، پیشہ سے اسکول ماسٹر تھے، اور تمام لوگ ان کی عزت کرتے تھے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کیونکہ سب نے فوراً ہی ان کی رہنمائی قبول کرلی۔ چونکہ اعلیٰ مرتبہ حاصل کرنے میں دولت یا نسل کا کوئی رول نہیں تھا۔ اس لئے یہ آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے کہ ان کے ذاتی کردار اور ان کی نیک نفسی کی شہرت کی بدولت ہی لوگوں نے انہیں اپنا رہنما بنایا۔ وہ نہ صرف اپنے عقیدے کے رکھوالے کے طور پر بلکہ پرانے نظام کے چمپئن کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔ وہ پرانا نظام جس کی علامت دلّی کے بادشاہ تھے، انہوں نے جیسا ان کی سمجھ میں آیا، نظم و نسق درست کرتے اور قانون کی بالادستی قائم کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں کہ وہ اپنی اس کوشش میں ناکام رہے۔ کیونکہ انہیں فوج کا کوئی تجربہ نہیں تھا جس کی بدولت وہ سرکشوں پر قابو پاتے، نہ ہی ان کی شخصیت اتنی بارعب تھی جو اپنے آپ لوگوں کو وفادار بنادیتی۔ ان کا یہ کارنامہ قابل ستائش ہے کہ بہت سے ہندوستانی عیسائیوں کو اپنے مذہب کی بنا پر زندگی کی امان کی قیمت ادا کرنے کی اجازت دی گئی، جو ان حالات میں بڑا کارنامہ تھا کیونکہ ذرا سا بھی شبہ پر موت کی سزا عام تھی۔

لیکن نیل جلد ہی الہ آباد پہنچ گیا۔ اس نے 9/جون کو بنارس چھوڑا اور 11/جون کو الہ آباد پہنچا۔ سڑک ویران تھی اور گھوڑے بھی دستیاب نہیں تھے۔ لیکن اس سے کوئی رکاوٹ نہیں ہوئی۔ اس نے کسانوں کو مجبور کیا کہ وہ اس کی گاڑی کھینچیں لیکن موسم کی سختی سے وہ محفوظ نہ رہ سکا۔ جب وہ قلعہ پر پہنچا "بنارس سے آنے میں وہ بُری طرح تھک چکا تھا اور وہ ذرا سی دیر کے لئے کھڑے ہونے کے قابل نہ تھا۔" لیکن حالات ایسے تھے کہ ذرا بھی توقف نہیں کیا جاسکتا تھا۔ یورپین اور سکھ بُری طرح پی رہے تھے اور اگر فوراً ہی نظم و ضبط قائم نہ کیا جاتا تو قلعہ کی حفاظت بھی خطرے میں پڑ جاتی۔ فوراً ہی تارا گنج اور پیر گنج کے علاقے میں گولے برسائے گئے اور شہر کو فوراً ہی حملہ آوروں سے خالی کرالیا گیا۔ مولوی کو 17/جون کو اپنی ہیڈ کوارٹر خالی کرنا پڑا۔

نیل فوراً ہی کانپور کے لئے روانہ نہیں ہوا۔ اس نے اپنی پہلی ذمہ داری مجرموں اور سازشیوں کو سزا دینی سمجھی اور سزا دینے والے لوگوں کو زمین اور ندی کے راستے چاروں طرف بھیجا گیا۔ فوجی سے زیادہ سویلین لوگوں نے گاؤں کو جلانے اور مشتبہ لوگوں کو پھانسی پر لٹکانے میں جوش دکھایا۔ بعد میں حکومت کو معلوم ہوا "کہ اس طرح بغیر کسی تفریق کے ہر طرح کے مجرم اور وہ لوگ جن پر جرم کا ہلکا سا شبہ تھا انہیں پھانسی دینے اور گاؤں کو لوٹنے اور جلانے میں، ان لوگوں کو بھی سزائیں مل گئیں جو ابھی تک حکومت کے وفادار تھے۔" نیل یہ بھول گیا کہ ہندوستان کی ساری آبادی کو نہ مارا جاسکتا ہے نہ بے دخل کیا جاسکتا ہے اور مقامی لوگوں کے تعاون کے بغیر گاڑیاں اور جانوروں کا ملنا ناممکن ہے۔ اس کے سخت اقدام کی بدولت کسان اور مزدور دیہی علاقوں کو چھوڑ کر بھاگنے لگے اور ان کے ساتھ ہی وہ مزدور بھی غائب ہوگئے جو فوج کی روزمرہ ضروریات کو پوری کرتے تھے۔ اگر وہ 20/ کو ہی الہ آباد چھوڑ دیتا تو کانپور کو بچایا جاسکتا تھا۔ کیونکہ وہیلر اپنے

جاسوسوں کو روز کمک آنے کی خبر لانے کے لئے بھیجا کرتا تھا۔ لیکن 23/ تاریخ کو ہی رسد اور گاڑیوں کو اکٹھا کرنا مشکل ہو گیا تھا گرچہ 400 یورپین اور 300 سکھ مارچ کرنے کے لئے تیار تھے۔ اس کے پانچ دن بعد بھی حالات میں بہتری نہیں پیدا ہوئی۔ اور یہ امید کی جارہی تھی کہ میجر ریناڈ 30/ تاریخ کو اپنے دستے کے ساتھ آگے بڑھیں گے۔ 30/ جون کو ہیولاک الہ آباد پہنچ گئے اور اس نے فوج کی کمان سنبھال لی۔ اس کے بعد ہی اسے لکھنؤ سے وہیلر کی شکست کا علم ہوا۔

ہنری ہیولاک فوج میں بیالیس سالوں سے خدمت کر رہا تھا اور یہ اس کی غلطی بھی نہیں تھی کہ اسے بہت دنوں بعد ترقی ملی۔ اس نے افغانستان، پنجاب اور فارس میں بھی فوجی خدمت انجام دی تھی۔ جب وہ کانپور اور لکھنؤ میں چارج لینے کے لئے بلایا گیا، وہ ملٹری سائنس کا ذہین طالب علم تھا اور اس کی شہرت اس وجہ سے اور بھی تھی کہ اس نے نپولین کی ساری جنگی چالوں کا بغور مطالعہ کیا تھا۔ لکھنؤ میں بھی وہ اپنے خالی اوقات میکالے کی History of England پڑھنے میں گزارتا۔ ایک راسخ العقیدہ عیسائی ہونے کی بدولت اس نے سیرام پور مشنریز سے اپنا تعلق قائم کیا۔ بہت سادی زندگی گزارنے کی وجہ سے وہ ایسا نہیں تھا کہ کلکتہ کی سوسائٹی میں کوئی اسے جانتا۔ لیڈی کیننگ نے لکھا: ''جنرل ہیولاک کی زیادہ پوچھ نہیں ہے، تاہم ہمیں یقین تھا کہ اس کے ہاتھوں انجام بخیر ہوگا۔ گرچہ وہ بہت زیادہ مین میخ نکالنے والا اور تھکا دینے والا شخص ہے، تاہم اس عمر میں بھی اس کی جسمانی ساخت ایسی ہے جیسے وہ لوہے کا بنا ہو۔'' اور صرف ایسا ہی فولادی آدمی نیل کو اپنی جگہ رکھ سکتا تھا۔ ہیولاک نے ریناڈ کو حکم دیا کہ ''وہ جہاں ہے وہیں ٹھہرے اور اپنے چاروں طرف کے سپاہیوں پر گہری نگاہ رکھے۔ تب میں تمہیں اس دستے کی مدد بھیجوں گا جو کل یعنی 4/ تاریخ کو روانہ ہوگی۔ اب کسی گاؤں کو مت جلانا۔ جب تک کہ وہاں باغی نہ موجود ہوں۔ اور اپنے یورپین فوجیوں کا کم سے کم استعمال کرو۔'' نیل کو اب بھی یقین نہیں تھا کہ کانپور کی شکست ہو چکی ہے ''میرے خیال میں جہاں تک ممکن ہو ہمیں قیام بالکل نہیں کرنا چاہیے بلکہ ہمیشہ آگے بڑھنا چاہیے۔'' اس نے قائم مقام کمانڈر انچیف سر پٹرک گرانٹ کو لکھا۔ اور سارے فوجی قاعدے کے برخلاف ہیولاک کے حکم کو بدلوانے کی کوشش کی۔ ریناڈ کی خوش قسمتی تھی کہ ہیولاک اپنے الفاظ کی طرح ہی صادق تھا اور اس سے پہلے کہ اس کی فوجیں 12/ جولائی کو نانا کی فوجوں سے محاذ آرائی کرتیں، وہ وہاں پہنچ گیا۔ ہیولاک نے آدھی رات کے قریب ہی اپنے کیمپ کو چھوڑا اور صبح کے وقت ریناڈ کے پاس پہنچ گیا۔ دونوں دستوں کو ایک دوسرے کو دیکھ کر تعجب ہوا۔ ریناڈ کو امید تھی کہ فتح پور میں بہت کم فوجی ہوں گے اور نانا کے آدمیوں کو ہیولاک کی آمد کی کوئی اطلاع نہیں تھی لیکن اس کے آنے سے جو بر وقت فوجی مدد ملی، اس کی وجہ سے ریناڈ کی فوجیں نیست و نابود ہونے سے بچ گئیں۔

برطانیہ کے افسران سوائے جج ٹکر کے 9/ جون کو ہی فتح پور چھوڑ کر جا چکے تھے۔ 6/ تاریخ تک یہاں مکمل خاموشی تھی۔'' تبھی بازار کے مقامی لوگوں نے بنارس کی بغاوت کے بارے میں

افواہیں سنیں۔ کہا جاتا ہے کہ یورپین فوجیوں نے پوربیوں اور سکھوں پر اس وقت گولی چلائی جب وہ خاموشی سے پریڈ گراؤنڈ میں کھڑے تھے“ اس کے تین دن بعد حالات میں کافی کشیدگی پیدا ہوگئی۔ گرچہ 32 دن کے وقفے کے بعد اس اسٹیشن پر قبضہ پالیا گیا۔ اس کے بعد 15/ جولائی کو آؤنگ کی جنگ ہوئی اور اسی دن پانڈو ندی کو پار کیا گیا۔ ندی میں طغیانی آئی ہوئی تھی لیکن پل اب بھی محفوظ تھا اور یہ خطرہ محسوس کیا جارہا تھا کہ اسے کسی بھی وقت اڑایا جاسکتا ہے۔ اس لئے ہیولاک نے اس پر قبضہ کرنے میں بہت عجلت کی۔ اس نے اپنے تھکے ہوئے سپاہیوں کو آرام کرنے کا بالکل موقع نہیں دیا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس پل کو لوگوں نے توڑ کیوں نہیں دیا؟ لیکن اسے پار کرنے کے سلسلہ میں اختلاف ہے۔ ندی کو تو پار کرلیا گیا لیکن کانپور کے لئے جنگ ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ ہیولاک کو اس بات کی فکر تھی کہ کسی صورت میں قیدیوں' عورتوں اور بچوں کو بچایا جاسکے جو نانا کے یہاں قید تھے۔ نانا بغیر جنگ کے اپنا ہیڈ کوارٹر چھوڑنے کو تیار نہیں تھے لیکن ان کی یہ آخری مزاحمت بھی اتنی ہی ناکام ہوئی جتنی کہ پہلی۔ اور ہیولاک فاتح فوجوں کے ساتھ 17/ جولائی کو کانپور میں داخل ہوگیا۔ الہ آباد چھوڑنے کے دس دن بعد۔ لیکن اپنی ہم وطن بدقسمت عورتوں کو آزاد کرنے کی خوشی اسے حاصل نہیں ہوسکی۔

گھاٹ پر ہوئے قتل عام کے بعد جو لوگ بچ گئے تھے انہیں قیدی بنالیا گیا تھا۔ بعضوں کو تو گولی ماردی گئی تھی لیکن عورتوں اور بچوں کو سواداہاؤس میں رکھا گیا تھا۔ یہاں سے انہیں ایک دوسری عمارت بی بی گھر میں منتقل کردیا گیا۔ جب باغی لیڈروں کو یہ یقین ہوگیا کہ وہ کانپور پر زیادہ دنوں تک قبضہ نہیں رکھ سکیں گے تو ان معصوم قیدیوں کو ماردیا اور ان کی لاشوں کو کنویں میں پھینک دیا۔ جب ہیولاک کی فوجیں کانپور میں داخل ہوئیں تو ان کے جسم نہیں تھے اور قید خانہ کے فرش ان کے خون سے بھیگے ہوئے تھے۔ اس سفاکانہ قتل عام کی پُردرد تفصیلات اس قدر ادبی زبان میں مبالغہ آرائی کے ساتھ لوگوں نے پیش کیں جن کی شہادت بالکل نہیں ملتی۔ سر جارج فارسٹ اس واقعہ کے پچاس سال گزرنے کے بعد بجاطور پر لکھتا ہے: ”یہ صحیح ہے کہ 63 آدمیوں کی شہادتیں جو مقامی اور کمتر ذاتوں کے تھے 'کرنل ولیمس شمالی مغربی صوبے کے کمشنر کے مشورہ پر لی گئی تھیں۔ لیکن ان سارے لوگوں نے شہادتیں اس وقت دیں جب ان کے گلے میں پھانسی کا پھندہ پڑچکا تھا اس لئے ان کی شہادتوں میں بہت زیادہ اختلاف پایا جاتا ہے اور انہیں بہت زیادہ احتیاط کے ساتھ پرکھنے کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ افسروں کی خفیہ رپورٹیں' نجی طور پر دی گئی عرضداشتیں' لوگوں کی گواہیاں' غیر سرکاری طور پر ان کی جانچ پرکھ' ان سب کا میں نے بغور مطالعہ کیا۔ ان سے یہ پتہ چلا کہ گرچہ کافی مبالغہ آرائی کی گئی تھی تاہم صورتِ حال ایسی نہیں تھی جیسی کی پیش کی گئی ہے۔“ حاشیوں پر لاشعوری طور پر دی گئی تنبیہوں پر کوئی غور وفکر نہیں کیا گیا۔ جب کہ کانپور کے واقعات کی تفصیلات جنہیں ان شہادتوں کی بنیاد پر تشکیل دی گئی اور جس سے فارسٹ نے انکار کیا ہے' وہی شہرت پاگئی۔ سر جارج ٹری ویلین کے بیانیہ کی ادبی شان' جن میں

وہ ان واقعات کو پیش کرتا ہے' قاری کو اس قدر متاثر کردیتی ہے کہ وہ ان شہادتوں کا تفصیلی مطالعہ کرنے کی ضرورت نہیں محسوس کرتے۔ اور ٹریویلین نے خود بھی ان گواہی دینے والوں کی حیثیت کا کوئی پتہ نہیں کیا۔ نہ ہی رائس ہومس نے اس کی ضرورت محسوس کی۔ ان دونوں نے نانک چند کے جرنل کو اصلی ریکارڈ سمجھا اور گرچہ سر جان نے اس میں ایک فاش غلطی کی نشاندہی کی تاہم انہوں نے ان پر غور نہیں کیا۔

بی بی گھر کے قتل عام کے لئے بھی نانا کو مجرم قرار دیا گیا لیکن کرنل ولیمس کے سامنے جو شہادتیں پیش کی گئیں' اس کی بنا پر کوئی بھی عدالت بڑے سے بڑے مجرم کو بھی سزا نہیں دے سکتی۔ یقینی شہادتوں کی عدم موجودگی کے باعث بھی جرم کا نہ کیا جانا ثابت نہیں کرتا۔ نانا قانونی اور اخلاقی طور پر اپنے قیدیوں کی زندگی کا محافظ تھا اور یہ قتل عام بھی اسی کے نام پر ہوا تھا۔ اور جب تک کہ یہ قطعی طور پر ثابت نہ ہو جائے کہ وہ اس جرم کی سازش میں شریک نہیں تھا' اس گھناؤنے جرم کی ساری ذمہ داری اس پر عائد ہوتی ہے۔ نانا نے اس بات سے انکار کیا ہے کہ انہوں نے اپنے ہاتھوں کسی کو قتل کیا ہے۔ ہر میجسٹی ملکہ' پارلیمنٹ' کورٹ آف ڈائرکٹرس' گورنر جنرل' لیفٹیننٹ گورنر اور دیگر سول اور ملٹری افسران کو دیئے گئے اشتہار نامہ' جسے اپریل 1859ء میں میجر رچرڈسن کو دیا گیا تھا' انہوں نے دعویٰ کیا کہ بچوں اور عورتوں کے قتل سے انہیں کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ "کانپور میں سپاہیوں نے میرا حکم نہیں مانا اور انگریز عورتوں اور ان کی رعیت کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ جن لوگوں کو میں اپنی تدابیر کے ساتھ بچا سکتا تھا' انہیں میں نے بچایا۔ اور جب وہ خندق سے باہر آئے تو میں نے انہیں کشتیاں فراہم کیں اور انہیں الہ آباد بھیجا۔ تاہم آپ کے فوجیوں نے ان پر حملہ کیا۔ بہت زیادہ منت سماجت کرنے کے بعد میں نے اپنے فوجیوں کو روکا اور دو سو انگریز عورتوں اور بچوں کی زندگی بچائی۔ میں نے سنا ہے کہ آپ کے فوجیوں اور بدمعاشوں نے انہیں جان سے مار دیا۔ وہ بھی اس وقت جب میرے فوجی کانپور سے بھاگ رہے تھے اور میرا بھائی زخمی ہو گیا تھا۔ اس کے بعد میں نے آپ کی طرف سے شائع اشتہار نامہ کے بارے میں سنا۔ اور تب میں نے آپ سے لڑنے کا فیصلہ کیا اور جب سے آپ سے لڑ رہا ہوں۔ اور جب تک زندہ رہوں گا لڑتا رہوں گا۔" تانتیا توپے کی گواہی اسی مہینے میں دس دن قبل لی گئی تھی۔ تانتیا توپے کا کہنا تھا کہ نانا کو ان کے باغیوں نے چاروں طرف سے گھیر کر قید کر لیا تھا اور نانا کا کہنا ہے کہ انہیں ان فوجیوں کی جنہوں نے بغاوت کی تھی دھمکیوں کی بدولت جھکنا پڑا۔ تانتیا نے ستی چورا گھاٹ پر قتل عام کے لئے سپاہیوں کو ذمہ دار تو بتایا لیکن کتنے آدمی مارے گئے اس کا کوئی حوالہ نہیں دیا۔

سوال یہ ہے کہ بی بی گھر کا قتل عام کب ہوا' جب نانا بھور کے لئے روانہ ہوئے یا اس کے بعد یا پہلے؟ اب اس کا فیصلہ کرنا اتنی مدت کے بعد ناممکن ہے جب تک کہ کوئی اور ثبوت سامنے نہیں آتا۔ یہ بھی غور طلب بات ہے کہ باجی راؤ کی لڑکی کسم بائی کو یہ یقین تھا کہ ان کا بھائی بے قصور ہے۔ جب ضعیفی میں وہ ایک بار پونا گئیں تو وی کے راج واڈے اور پنڈو باپور دھن نے ان

سے انٹرویو لیا اور انہوں نے انہیں بتایا کہ نانا نے باغی فوجیوں کو روکنے کی بھرپور کوشش کی اور اس قتل عام سے ان کا کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ اس بغاوت کے وقت ان کی عمر دس سال کی تھی اور یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک لڑکی اپنے بھائی کی سیاست اور ہنگامی عدالت کی کارروائیوں کے بارے میں کتنا جان سکتی ہے۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ اس قتل عام میں نانا کا کیا رول تھا۔ شیر رشاید صداقت کے قریب تھا'اس نے یہ کہا"اس میں ان کا شخصی اثر کتنا تھا۔ اس کی بابت کوئی حوالہ نہیں ملتا۔ عظیم اللہ نے جو کچھ کیا ہم اس کے بارے میں کچھ تو جانتے ہیں۔ اور اس نازک لمحے میں جوالا پرشاد بابا بھٹ' تانتیاٹوپے اور دوسرے لوگوں کا ہاتھ ہونے کے بارے میں کہنا مشکل بھی نہیں ہے۔ لیکن نانا کی شخصیت ہمیشہ پس منظر میں رہی ہے۔" جب وہ کہتا ہے کہ اس کی اپنی فوج کو آس پاس کے لوگوں نے مجبور کیا کہ وہ باغیوں کا ساتھ دیں۔ جب اس کے خاندان والے باغیوں کے رحم وکرم پر تھے اور چونکہ مقامی لوگوں کے درمیان وہ ایک اجنبی کی طرح تھا جن کا ان سے کوئی تعلق نہیں تھا' تو اس کی درخواست کو ناقابل قبول کہہ کے انکار کرنے کا کوئی جواز نہیں بنتا۔ اور جب وہ یہ بھی دعویٰ کرتا ہے کہ ستی چورا گھاٹ پر منصوبہ بند طریقے سے لوگوں کو مارا گیا' اس میں اس کا کوئی رول نہیں تھا۔ اور یہ بھی کہ عورتوں اور بچوں کا قتل عام اس کی عدم موجودگی میں ہوا' تو ہم مجبور ہوتے ہیں کہ ایسی شہادتوں کے بارے میں تلاش کریں جن پر یقین کیا جا سکتا ہو۔

شیر ر' اُن چند آدمیوں میں سے ایک تھا جنہوں نے فوراً ہی بی بی گھر کا معائنہ کیا۔ اس کا کہنا ہے: "یہ پوری کہانی اس حد تک دردناک تھی کہ اب اس اذیت ناک ماحول کو جو وہاں موجود تھا' بڑھا چڑھا کر پیش کرنا قطعاً غلط ہوگا۔ اور میں حتمی طور پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ جو بھی تفصیلات بیان کی گئیں وہ سب مبالغہ پر مبنی تھیں۔"، "سارا راستہ خون کے موٹے دھبوں سے بھرا ہوا تھا اور یہی اتنا کافی ہے کہ بجائے یہ کہنے کے کہ گھٹنے تک خون میں ڈوبا ہوا تھا' جو اپنے آپ میں تکلیف دہ بھی ہے اور سراسر غلط ہے۔"، "اور یہ کہ اس مکان میں لاشوں کو پوری طرح مسخ کیا گیا' اس کا کوئی نشان نہیں ملتا۔" شیر ر نے ہیولاک کی اجازت سے کنویں کو بھروا دیا۔

نانا نے رات کے اندھیرے میں 18/ جولائی کو بٹھور خالی کردیا۔ اس نے ڈرامہ کیا کہ گنگا میں ڈوب کر اس نے خودکشی کرلی ہے۔ لیکن جلد ہی یہ معلوم ہوگیا کہ بحفاظت تمام تیر کر وہ اودھ پہنچ گئے۔ 19/ تاریخ کو میجر اسٹیفن سن بٹھور پہنچا اور اس نے پیشوا کے محل کو تاراج کردیا۔ 20/ تاریخ کو نیل وہاں پہنچا اور ہیولاک نے لکھنؤ میں مدد پہنچانے کی تیاری شروع کردی۔ ہیولاک نے 25/ تاریخ کو گنگا پار کیا۔ اس کی فاتح فوجیں ندی کے دوسری طرف اودھ کی سرحدوں تک پہنچ چکی تھیں۔

نیل کو کانپور میں چھوڑ دیا گیا۔ اسے ذمہ داری سونپی گئی کہ وہ شہر میں نظم و نسق برقرار کرے۔ ہیولاک نے صاف لفظوں میں یہ تنبیہ کی تھی کہ جب تک وہ کانپور میں ہے نیل کو کسی بھی قسم کا کوئی اختیار نہیں ہے اور وہ ایک بھی حکم نامہ جاری نہیں کرسکتا۔ 25/ تاریخ کو اسے اس

بات کی چھوٹ مل گئی کہ اپنے حساب سے کام کریں۔ "اس کا یقین تھا کہ پہلے بڑھی ہوئی سختی ہی آخر کار رحم دلی کا کام کرتی ہے۔ "اور اس نے حکم نامہ جاری کیا جو "کچھ ضعیف برہمن لوگوں کے نزدیک بہت زیادہ باعث اعتراض تھا۔ "اس نے اسے "موقع کے لئے مناسب سمجھا" نیل نے حکم دیا کہ ہر وہ شخص جسے موت کی سزا دی گئی ہے وہ پہلے پھانسی گھر لے جایا جائے گا اور وہاں خون کے دھبوں کو صاف کرنے کے لئے مجبور کیا جائے گا۔ ان غریب بے چاروں کو مجبور کیا گیا کہ اس خون کو زبان سے صاف کریں جس کے بہانے میں ان کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ شیر ر کا کہنا ہے کہ اس حکم نامہ کی تعمیل لازمی تھی۔ سوائے دو معاملات کے۔ نیل بھی دو اور معاملوں کا حوالہ دیتا ہے۔ شیر ر کا کہنا ہے کہ نیل اپنی تعریف کے سلسلہ میں نفسیاتی طور پر بہت زیادہ بیمار تھا۔ "اس کا خیال تھا کہ وہ جس عہدے پر اور جہاں بھی ہے اسے کچھ ایسا کارنامہ انجام دینا چاہیے کہ لوگ اسے یاد رکھیں۔ اسی لئے اس کا یہ حکم خاص طور پر خون کو چاٹ کر صاف کرنا تھا۔"

جن لوگوں کو موت کی سزا دی گئی تھی ان کی تعداد کم نہیں تھی، انہوں نے بہت خاموشی کے ساتھ یہ سزا برداشت کی۔ مسلمانوں میں جو غصہ ور زیادہ ہوتے ہیں، انہوں نے حقارت کے ساتھ اور ہندوؤں نے ایسی بے پروائی کے ساتھ اس سزا کو قبول کیا جو اپنے آپ میں حیرتناک ہے۔ کچھ ہندوؤں نے موت کو ایسے لیا، جیسے یہ اگلے پڑاؤ کے لئے سفر ہے۔"

# ضمیمہ

# نانک چند اور اس کا مجلّہ

انگریزوں میں سے جنہوں نے 27/ جون کو خندق چھوڑا' ان میں سے اس دن کے قتل عام سے صرف چار آدمی زندہ بچ سکے۔ اور بی بی گھر کے قیدیوں میں سے ایک شخص بھی زندہ نہیں بچا جو 16/ جولائی کے قتل عام کی داستان سنا سکتا۔ اور اس کے باوجود بھی سر جارج ٹریویلین کو اس میں کوئی دشواری نہیں ہوئی کہ وہ کانپور کی دہشت گردی کا آنکھوں دیکھا حال پوری تفصیل کے ساتھ بیان کرے۔ ان کا بیان چار باتوں پر مبنی ہے۔

(i) مقامی اور نچلی ذات کے ان 63 عینی شاہدوں کی گواہی جو شمال مغربی صوبے کے پولیس کمشنر کرنل ولیمس کے حکم کے تحت قلم بند کی گئی۔

(ii) ایک مقامی وکیل نانک چند کے اس بیان سے جو کانپور کے واقعات پر مبنی تھا۔

(iii) کیپٹن تھامسن کی کانپور کی کہانی۔

(iv) گورنمنٹ کے غدر کے ان بیانوں پر جو مختلف ضلعوں میں تعینات سویلین افسروں نے جمع کیا تھا۔

کیپٹن تھامسن کی کہانی جو اس کے ذاتی تجربات پر مبنی ہے' جب کہ افسروں کا بیان اور خود کرنل ولیمس کا بیان گواہیوں پر مبنی ہے۔ ان 63 گواہوں میں سے جن میں نانک چند بھی ایک تھا' جو کرنل ولیمس کے سامنے حاضر ہوئے' وہ اہم معاملوں میں ایک دوسرے سے بالکل مخالف تھے۔ اور سر جارج فارسٹ نے ان کے بیانوں کو ظاہری طور پر قبول کرنے کو غیر عقلی بتایا۔ لیکن ٹریویلین اور رائس ہومس دونوں کو نانک چند کی گواہی پر پورا بھروسہ تھا اور کانپور میں روز بروز کے واقعات پر اس کے رسالے کو حقیقت پر مبنی سمجھا۔ جب کہ ہمعصر انگریز افسروں نے اس رسالے کو نہ تو حقیقی دستاویز سمجھا اور نہ ہی اس کے مصنف کی صداقت کی کوئی ستائش کی۔

سر جارج ٹریلوین نے یہ سمجھا کہ نانک چند وکیل تھا اور کرنل ولیمس کے سامنے گواہی دیتے ہوئے اس نے اپنے کو مہاجن یا تاجر بتایا۔ وہ کانپور کے مضافات' پرانے جرنل گنج میں رہا کرتا تھا۔ 1842ء میں وہ باتھ گریٹ پورٹر اینڈ کمپنی' جو سرکار کے لئے رسد کنٹرکٹر تھے' ان کے کمیشن

ایجنٹ کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ اور اس بات پر بھی یقین کرنے کے کئی اسباب ہیں کہ وہ ایک وقت کانپور کے دولت مند تاجر لالہ ایسری پرساد کا ملازم تھا۔ جب نانک چند نے بٹھور میں نانا کے خزانے کے بارے میں راز افشا کیا تو اس نے انعام کا دعویٰ کیا۔ اس کی درخواست کانپور کے کلکٹر جی ای لانس کو پیش کر دی گئی۔ 15 / مئی 1862ء کو لانس نے مندرجہ ذیل تحریر رقم کی۔

"نانک چند ایک عام مخبر تھا اور جس شخص کے نزدیک وہ آیا وہ اس سے نفرت کرنے لگتا۔ مجھے وجہ نہیں معلوم جس کی بنا پر انعام کے دعوے کو شیرر نے ماننے سے انکار کر دیا۔ (اگر اس نے واقعی خزانے کا پتہ دیا تھا) لیکن مجھے یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ اس افسر نے کبھی اسے اپنے کمپاؤنڈ میں داخل نہیں ہونے دیا۔ اس مجوزہ رسالہ کی بدولت یہ کہا جاتا ہے کہ اس سے اسے کافی رقم ملی کیونکہ یہ اس بات پر منحصر تھا کہ اس نے کس شخص کا نام باغی یا وفادار کی فہرست میں ڈالا۔ اگر اس نے وہ خدمت انجام دی ہوتی جس کے بارے میں اس کا دعویٰ ہے تو میرا یقین ہے کہ میرے پیش رو نے اسے بغیر انعام کے نہ رہنے دیا ہوتا۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ صرف شرارت کی غرض سے نانا نے یہ حکم دیا تھا کہ اس کی دولت کا ایک حصہ اس کنویں میں ڈال دیا جائے۔ بٹھور لوٹنے پر جب ہیولاک گنگا کو پار کر رہا تھا' پوری رات اس کے وفاداروں کو کنویں خالی کرانے کی کوشش میں لگائے گئے تھے" شیرر بھی لانس کا ہم خیال تھا اور اس کا کہنا تھی کہ خزانے کو پوشیدہ رکھنے کی جگہ کا سب کو پتہ تھا اور یہ کوئی ایسا راز نہیں تھا جسے اکیلے نانک چند جانتا۔ یہ دستاویز شاید اس وقت جارج ٹریویلین اور رائس ہومز کے سامنے نہیں تھا۔ اس کے بھی کافی ثبوت ملتے ہیں کہ اس کا مجوزہ رسالہ روزانہ نہیں لکھا جاتا تھا۔ بلکہ کافی بعد میں لکھا گیا یا جمع کیا گیا۔ ہمارے لئے اہم بات تو یہ ہے کہ جب بغاوت اور بعد میں کانپور کے واقعات کے بارے میں لکھا تو اس نے اس رسالے کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ گرچہ نانک چند کا کہنا ہے کہ اس نے اپنے رسالے کی ایک کاپی شیررا اور میجر بروز کو 7 / دسمبر 1857ء کو دی تھی۔ شیررا نے اکاؤنٹ میں اس کا کوئی حوالہ نہیں دیتا اور جو نتائج اس نے اخذ کئے ہیں وہ نانک چند کے بیان سے بالکل متضاد ہیں۔ مثلاً نانا کی بغاوت سے پہلے سپاہیوں کے ساتھ سازش۔ یہ بھی واضح نہیں ہے کہ نانک چند نے کلکٹر اور سپرنٹنڈنٹ پولیس سے اپنا یہ رسالہ 1857ء کے آخری ماہ تک کیوں پوشیدہ رکھا۔ گرچہ اس کا کہنا ہے کہ اگست کے آخری ہفتہ سے ہی شیررکو یہ دینا چاہتا تھا۔

ٹریویلین کا خیال تھا کہ نانک چند ایک وکیل تھا اور چمن جی اپا کے مقدمے میں اس نے کافی دلچسپی لی تھی' لیکن حیرت کی بات تو یہ ہے کہ نانک چند کو اپنے موکل کے والدین کے بارے میں کچھ پتہ نہیں تھا۔ وہ اسے چمن جی اپا کے لڑکے کے طور پر متعارف کراتا ہے جو باجی راؤ کا بھائی تھا۔ لیکن لڑکے کا نام کبھی باپ کے نام پر نہیں رکھا جاتا۔ گرچہ مہاراشٹر میں کبھی کبھی پوتے کا نام دادا کے نام پر رکھ دیا جاتا ہے۔ سرکاری رپورٹ کے مطابق باجی راؤ کا بھائی چمن جی کا 30 / مئی 1832ء میں انتقال ہوا جو اپنے پیچھے اپنی بیوہ کاویری بائی جس کی عمر گیارہ سال تھی اور ایک کنواری لڑکی

دوار کا بائی جو کمسن تھی' چھوڑا۔ بعد میں دوار کا بائی کے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام چمن جی اپا رکھا گیا۔ جب باجی راؤ دوم مرا تو سرکاری رپورٹ میں اس نوجوان کو اس پر منحصر بتایا گیا۔ جوان ہونے پر اسے پچاس ہزار روپے دیا جانا تھا۔ وہ باجی راؤ کی دولت کا کسی طرح سے دعویدار نہیں ہو سکتا تھا۔ چاہے ہندو قانون ہو یا دوسرا قانون۔ اس لئے نانا کو اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی کہ وہ اس مقدمہ کو خارج کرنے کے لئے جج کو رشوت دیتا۔

اسی طرح سے یہ الزام بھی بے بنیاد تھا کہ "مہاراجہ نے اپنے پیش رو کی بیوہ کو اس کی مرضی کے خلاف قید کر رکھا تھا جس کی کمسن لڑکی سے اس نے شادی کرنے کا منصوبہ بنایا تھا یہ خاندانی روایت کے بالکل خلاف ہوتا اور برہمنوں کے نزدیک یہ بغاوت ہوتی۔ اس نے بڑی بہن کی شادی ایک ایسے آدمی سے کر دی جسے اسے دیکھنے کی کبھی اجازت نہیں ملی۔ اور جب جلد ہی اس کی موت ہو گئی تو پاس پڑوس میں یہ افواہ پھیل گئی کہ اس میں کوئی نہ کوئی سازش کارفرما رہی ہے۔"

باجی راؤ دوم کی کئی شادیاں ہوئی تھیں۔ ان میں سے صرف دو بیویاں سائیں بائی اور مینا بائی اس کے بعد زندہ رہیں۔ اس نے صرف دو نابالغ لڑکیاں یوگا بائی اور کسم بائی چھوڑی تھیں جن کی ماں کی موت شوہر کی موت سے پہلے ہو گئی تھی۔ ان کے نانا بلونت راؤ اٹھاولے (جسے نانک چند نے پیشوا کا سالا بتا کر فاش غلطی کی) نے ان کی سرپرستی قبول کی۔ ان کی سرپرستی کے دعوے کو حکومت ہند نے قبول نہیں کیا۔ یوگا بائی کی شادی مشہور پٹوردھن خاندان کے ایک عزیز سے ہوئی اور وہ ایک سال یا اٹھارہ مہینے بعد ہی مر گئی۔ سوائے نانک چند کے کسی اور نے اس میں سازش کی بات نہیں دوہرائی۔ کیونکہ شادی کے بعد اپنے والدین کا گھر نہ چھوڑنا ایک عام سی بات تھی۔ کسم بائی جسے بیا بائی بھی کہتے ہیں' اس کی شادی گوالیار کے سردار بابا صاحب آپٹے سے ہوئی تھی اور یہ شادی ہر طرح سے مناسب ہوئی تھی۔ نانک چند اس شادی سے ناواقف تھا۔ حالانکہ یہ شادی اس کے رسالہ لکھنے سے پہلے ہوئی تھی۔ وہ اپنے بھائی کے ساتھ جیسا کہ اس کی دونوں سوتیلی ماؤں نے کیا تھا' نیپال چلی گئی اور جب ہر طرف امن بحال ہو گیا تو وہ اپنے شوہر کے پاس آ گئی۔

چمن جی دوم باجی راؤ کے پوتے کا تعلق تھتے خاندان سے تھا۔ ان کے لڑکے کی طرف سے پیش کئے گئے دعوے میں کہا گیا تھا کہ باجی راؤ دوم ایک چوتھے لڑکے کو گود لینا چاہتے تھے۔ اور ان کی نظر انتخاب چمن جی پر پڑی تھی۔ رواج کے مطابق اس کہانی کو درست سمجھنے میں قباحت ہے۔ کیونکہ گود لینے کی مروجہ روایت اور ان کے خاندانی شجروں کے بارے میں ان کے انتخاب کو بہت محدود کرتی ہے۔ نانا' دادا اور بالا کے معاملے میں روایت کی پوری پاسداری کی گئی تھی۔ چمن جی کے لڑکے بھمن تھتے کا کہنا ہے کہ 1880ء کے قریب انہیں سائیں بائی نے نیپال میں گود لیا تھا۔ اس سے معاملہ بالکل صاف ہو جاتا ہے کیونکہ ایک ہی آدمی کے ذریعہ باپ اور بیٹے دونوں کو گود نہیں لیا جا سکتا۔ جب ان کی طرف سے دعویٰ پیش کیا گیا تو چمن جی اس وقت تک نابالغ تھے۔ اس کا امکان نہیں ہے کہ نانک چند نے اس مقدمہ میں دلچسپی لی ہو۔ ہندوستان میں کچھ ایسے بھی لوگ

پائے جاتے ہیں کہ جنہیں حقارت سے ٹاؤٹ کہا جاتا ہے جو لوگوں کی پریشانیوں سے فائدہ اٹھا کر اپنی زندگی گزارنے کا سامان کرتے ہیں۔ 28/ جنوری 1858ء کو سسل بیڈون کو لکھے گئے ایک خط میں لالہ ایسری پرساد کہتے ہیں: ''دو سال قبل اور اس بغاوت کے بارے میں پیدا ہوئے شبہے سے بہت پہلے میں نے کچھ آپسی دوستوں کے مشورے پر یہ کہا تھا کہ ایک مقدمہ کے سلسلہ میں چمن لیا کو مالی مدد دی جائے۔ اور اس خزانے سے جو سرکار کے پاس محفوظ تھا انہیں ملنے بھی لگی تھی۔ جو غلطی سے مہادیو کنٹھ کو دے دی گئی تھی۔ اس میں یہ کہیں نہیں کہا گیا ہے کہ نانک چند ان دوستوں میں سے ایک تھا جس نے چمن جی کو ایسری پرساد سے متعارف کرایا۔ کیونکہ نانک چند اس وقت خود ایسری پرساد کی ملازمت میں تھا۔ (گرچہ وہ انکار کرتا ہے) اور بہت ممکن ہے کہ کچھ چھوٹے موٹے موکلوں سے اس کی کچھ دوستی ہو گئی ہو۔

نانک چند کو اس ڈائری کے لکھنے میں اس کا جو مفاد تھا' اسے بھی اس نے راز نہیں رکھا۔ وہ اس کے ذریعہ اپنی وفاداری ثابت کر کے انعام حاصل کرنا چاہتا تھا۔ یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ اسے 1865 تک کوئی انعام نہیں ملا۔ جو ملا بھی وہ اس نے اپنے دعوے میں جتنے اخراجات سرکار کے فائدے کے لئے دکھائے تھے' اس سے بھی بہت کم ملا۔ یہ بھی غور طلب بات ہے کہ اس کے رسالے میں اور بعد میں اس نے جو عرضیاں دیں ان دونوں میں بہت زیادہ تضاد پایا جاتا ہے۔ اپنے رسالے کے دیباچہ میں لکھتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ اس نے دس مہینے کمانڈر انچیف کے کیمپ میں ان کے لئے مخبری کرنے میں گزارے لیکن کمانڈر انچیف نانک چند کا کہیں بھی نام نہیں لیتا۔ بعد میں دی گئی عرضیوں میں وہ قبول کرتا ہے کہ وہ میجر بروس کی ملازمت میں تھا اور انہیں کی سفارش پر سرکار نے اسے پانچ ہزار روپے کا انعام دینا منظور کیا۔ اور وہ بھی کسی فوجی مخبری کے لئے نہیں بلکہ صرف اس لئے دی گئی کہ اس نے نانا کے خزانوں کا پتہ بتایا تھا۔

یہ بھی توجہ طلب ہے کہ نانک چند کی عادت ڈائری لکھنے کی نہیں تھی لیکن جب میرٹھ اور دلی کی بغاوت کی خبریں کانپور پہنچیں تو اس نے کانپور کی بغاوت کے بارے میں قیاس آرائی کی اور یہ سمجھا کہ یہاں کے روزانہ کے واقعات کو قلمبند کرنا حکومت کے لئے فائدہ مند ہوگا۔ اپنی جان کا خطرہ محسوس کرتے ہوئے وہ روپوش ہو گیا لیکن اسی کے مطابق شام کے وقت وہ لازماً شہر میں ہونے والے واقعات کو قلمبند کرتا۔ اور کوئی بھی واقعہ جو شہر میں یا نانا کے بٹھور کیمپ میں یا خندق میں ہوتا' اسے نظر انداز نہیں کیا۔ تاہم وہ یہ کہیں نہیں بتاتا کہ جب انگریز خندق میں محصور تھے تو ان کے بارے میں اطلاعات جمع کرنے کے لئے اس نے کس ایجنسی سے کام لیا۔ 8/ جون کو اپنی جان کا خطرہ محسوس کرتے ہوئے وہ اپنے گھر کو چھوڑ کر لالہ ایسری پرساد کے مکان میں چلا گیا جو اس وقت خالی تھا۔ یہاں اس نے دن کا وقت گزارا۔ لالہ کے ایجنٹ نے اسے کھانا کھلایا۔ لیکن ہمیں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ڈائری لکھنے کے بعد موم بتی کی روشنی میں اپنے گھر کو اس نے چھوڑ دیا اور سرسی گھاٹ چلا گیا جہاں ہیرا گنگا پتر نے اسے رات گزارنے کے لئے کمرہ دیا۔ شاید وہ شام ہونے

سے پہلے اپنے گھر لوٹا کہ ڈائری لکھ سکے، لیکن رات گزارنے کے لئے غیر محفوظ سمجھ کر ندی کے کنارے چلا گیا۔ شاید وہ اپنی ڈائری کو اپنی زندگی سے زیادہ قیمتی سمجھ رہا تھا۔ 13/ تاریخ کو جب اس نے اپنی 'ڈائری کا پہلا پیرا جاج مئو میں لکھا' اسی وقت نانا کے آدمی اسے پکڑنے آگئے۔ اپنی پیاری زندگی کو بچانے کے لئے وہ بھاگا لیکن راستے میں کچھ کسانوں نے اسے لوٹ لیا اور زدو کوب کیا۔ ایک رحم دل زمیندار نے رات گزارنے کے لئے اسے پناہ دی۔ وہاں سے وہ ندی پار کرنے کی غرض سے چلا گیا۔ جب وہ دوسرے کنارے پر پہنچا' چار گھنٹے تک بے ہوش پڑا رہا۔ جب اسے ہوش آیا تو اس وقت دن کے دس بج چکے تھے اور وہ اپنی پناہ گاہ بدر کا سے 3 میل کے فاصلے پر تھا۔ کیا اس کی ڈائری غائب ہو گئی تھی؟ نہیں۔ لوٹ مار اور زدو کوب کئے جانے کے بعد بھی وہ اسی کے پاس رہی اور اس دن کے واقعات بھی اس میں قلمبند کئے گئے۔ اس کے باوجود اس میں واقعات کا لگاتار اندراج نہیں ملتا۔ یہ 15/ مئی سے شروع کی گئی اور 22/ جولائی تک چلی۔ اور پھر 25/ نومبر سے شروع ہو کر 7/ دسمبر تک چلی۔ 17/ اگست کو اس نے وفادار اور غیر وفادار تحصیلداروں کی فہرست بنائی۔ شاید وہ اپنے کو محتسب سمجھ رہا تھا۔ لیکن اس نے اسے قبول کیا کہ اس کا رسالہ اوریجنل شکل میں نہیں پیش کیا گیا۔ وہ لکھتا ہے ''اس رسالے کا آغاز بغاوت سے پہلے کیا گیا تھا اور جس دن بغاوت فرو ہوئی' تب تک کے واقعات اس میں رقم کئے گئے ہیں۔ بہت سے اندراجات جانچ پرکھ کے بعد درست کئے گئے' جب تک کانپور پر انگریزوں کا دوبارہ قبضہ نہیں ہو گیا' تاکہ حکام کو یہ ثابت کر سکوں کہ میں ان کا وفادار شہری ہوں اور اس کی بدولت نام بھی کما سکوں۔''

لیکن اس کے باوجود وہ شیرر کے سامنے اپنی وفاداری ثابت نہیں کر سکا' جس نے اپنے گھر میں اس کا داخلہ ممنوع کر رکھا تھا۔ لانس اسے ایک عام مخبر اور بلیک میلر سمجھتا تھا۔ گرچہ وہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس نے جانچ پرکھ کے بعد ڈائری کے اندراجات کو درست کیا تاہم ان تضادات سے نہیں بچ سکا جو عام طور پر جھوٹی گواہیوں میں پائی جاتی ہیں۔ اور اس طرح کے ایک تضاد کی نشاندہی سرجون نے بھی کی ہے۔ نانک چند یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس نے جنرل ہیولاک اور نیل کو کانپور کی کوتوالی میں 17/ جولائی کو دیکھا تھا لیکن نیل 20/ تاریخ تک کانپور نہیں پہنچا تھا۔ نانک چند نے اپنے اس دعوے کو 17/ فروری 1866ء کو دی گئی عرضی میں خود غلط قرار دیا ہے' وہ لکھتا ہے:

''17/ جولائی 1857ء کو جنرل ہیولاک کی کانپور میں آمد ہوتی ہے اور جنرل نیل اس کے ایک یا دو دن کے بعد یہاں آتے ہیں اور دونوں 19/ اگست کی شام تک رہتے ہیں۔'' اپنی ایک غلطی کے سدھارنے میں نانک چند دوسری غلطی کا مرتکب ہوتا ہے۔ کیونکہ ان دنوں میں جنرل ہیولاک کانپور میں نہیں تھے۔ صرف یہی ایک غلطی نہیں ہے بلکہ اور بھی بہت سی غلطیاں ہیں۔ ڈائری کے مطابق جنرل بٹھور میں 18/ جولائی کو پہنچے اور نانا نرائن راؤ کی سرزنش کی کہ وہ کچھ بندوقوں کو اپنے گھر کیوں لے گئے۔ 31/ جولائی 1863 کو دی گئی عرضی کے پیرا 14 میں وہ اپنی غلطی درست کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جنرل 9/ جولائی کو بٹھور پہنچے۔

یہ دلچسپی کی بات ہے کہ روزنامچہ کے اس ریکارڈ میں اکثر واقعات کی تاریخیں غلط دی گئی ہیں۔اس غلط تاریخ کے تحت ایک اہم واقعہ جو بیان کیا گیا ہے وہ فتح گڑھ فوجیوں کے دوسرے بیچ سے متعلق ہے جس میں کرنل گولڈی' کرنل اسمتھ اور میجر رابرٹسن شامل تھے۔ انہوں نے 4/ جولائی کو فتح گڑھ چھوڑا۔ جب کہ پہلا بیچ ایک مہینہ پہلے آگیا تھا۔ اور ان کی گرفتاری کو نانک چند نے 11/ جون کو تحریر کیا۔اس وقت وہ جاج مئو میں تھے۔"میرے خادم جھین سنگھ نے مجھے اطلاع دی کہ جو یورپین فرخ آباد سے آئے' انہیں ایک ساتھ باندھ کر قتل کردیا گیا۔" چونکہ بھگوڑوں نے فتح گڑھ کو 4/ جون کو چھوڑا تھا' اس لئے نانک چند کے بیان میں ایسی کوئی بات پائی جاتی کہ دس تاریخ کو انہیں پکڑ کر قتل کر دیا جائے۔15/ جون کو نانک چند نے دوبارہ لکھا: "کانپور کی خبریں اور کل کے واقعات کی اطلاع مجھے آج دس بجے ملی۔ پہلی اطلاع تو یہ ہے کہ فرخ آباد سے وہ سبھی یورپین مرد و عورت جو پیچھے چھوٹ گئے تھے اور جن کی تعداد تقریباً چالیس تھی' انہیں' جسہ سنگھ بدمعاش نے پکڑ لیا...... اور انہیں بٹھور راؤ صاحب بدمعاش کے پاس بھیج دیا جنہوں نے انہیں بٹھور میں قید کیا اور سب سے بڑے بدمعاش نانا کے پاس اس کی خبر ہوئی اور نانا نے ان قیدیوں کو اپنے سامنے بلوایا۔ مجھے انتظار ہے کہ ان قیدیوں کا حشر کیا ہونے والا ہے۔" چونکہ فتح گڑھ کے بھگوڑوں کی پہلی پارٹی کا 10/ جون کو فیصلہ کر دیا گیا۔ اور دوسری پارٹی قلعہ سے 4/ جولائی کو رخصت ہوئی۔اس لئے 14/ جون کو یورپین کو قید کئے جانے کی بات مانی نہیں جاسکتی۔نانک چند کی اس بات کی تصدیق چھ اور لوگوں نے کی۔ جن میں سے تین اپاجی لکشمن 'اپا شاستری اور نانا ابھینکر کا تعلق بٹھور سے تھا۔نانک چند کے جاسوس فتح سنگھ نے صاف صاف بتایا کہ کوئی یورپین جولائی میں نہیں آیا۔نانک چند نے فتح گڑھ کے قیدیوں کی دو پارٹیوں کے بارے میں سنا تھا۔ لیکن چونکہ دوسری اور آخری بیچ کے پہنچنے کی تاریخ سے وہ واقف نہیں تھا اس لئے اس نے غلط اندراج کیا اور اس کے جاسوسوں کی یہ مجبوری تھی کہ وہ اس پر صاد کرتے۔

اسی طرح ہولاس سنگھ کی کوتوال کی حیثیت سے تقرری کی تاریخ بھی مشکوک ہے۔نانک چند کے ریکارڈ کے مطابق اس کی تقرری 9/ جون کو ہوئی۔ لیکن ہولاس سنگھ کا خود کہنا ہے کہ اس کی تقرری باغیوں کے کلیان پور لوٹنے کے سات یا آٹھ دنوں بعد ہوئی۔ چونکہ اس سے پہلے بہت سے اور لوگ بھی کوتوال مقرر کئے گئے تھے جن میں سے ایک شخص صرف دو تین دن ہی اپنے عہدے پر رہا اس لئے ہولاس سنگھ کی تقرری دس تاریخ سے پہلے نہیں ہو سکتی۔

نانک چند یہ بھی دعویٰ کرتا ہے کہ خندق سے آگ کے شعلوں کو نکلتے ہوئے اس نے 11/ تاریخ کو دیکھا جب وہ جاج مئو میں تھا۔ شیفرڈ جو اس وقت خندق میں تھا' کا کہنا ہے کہ بیرکس میں 13/ جون کی شام پانچ بجے آگ لگی۔ڈیلا فوس اس واقعہ کو 12/ جون کو بتاتا ہے اور موبرے ٹامسن کا یہ کہنا ہے کہ یہ مصیبت ایک ہفتہ بعد درپیش آئی جس کی تاریخ 13/ نکلتی ہے۔ لیکن رائس ہومس نے نانک چند کی تاریخ اس لئے قبول کی "کہ وہ بہت محتاط ڈائری نگار تھا۔ اس کی

احتیاط کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ 17/جولائی کو وہ اپنے قارئین کو بہت رازدارانہ طور پر بتاتا ہے کہ ایک مہینہ سے وہ اپنے گھر سے باہر نہیں نکلا ہے'' گرچہ اس دوران اسی کی روداد کے مطابق وہ جاج مئو بدرکا بھی گیا اور کانپور واپس آیا۔

نانا کے لوگ بھی اس پر بہت مہربان تھے۔ اس کے سر کی قیمت ایک ہزار روپے لگائی گئی۔ نانا کے آدمیوں نے اسے بدرکا میں چھپی ہوئی جگہ پر ڈھونڈ لیا' لیکن اسے چھوڑ دیا۔ انسانی محبت میں نہیں' بلکہ پیسے کی لالچ میں۔ گرچہ ایک روپیہ بھی نقد نہیں ادا کیا گیا۔ لیکن ان بدمعاشوں نے ایک سو پچیس روپے کی دستاویز کو قبول کر لیا' صرف اس کا دس فیصد جو نانا سے اسے قید کرنے کے عوض میں ملتا۔

کبھی کبھی نانک چند کے اپنے مخبر بھی اس کی باتوں کی مخالفت کرتے۔ ولیمس کے سامنے اس نے گواہی دیتے ہوئے کہا کہ منشی کالکا پرساد جو ٹامسن گرین وے کا ملازم تھا' وہ بھی ان آدمیوں میں سے تھا جس کی اطلاع پر وہ بھروسہ کرتا۔ کالکا پرشاد کا کہنا ہے ''اس وقت بھی جب مجھے قید کیا گیا اور بریگیڈیر جوالا پرساد نے مجھے رہا کیا۔ اس نے مجھے حکم دیا کہ میں اس کے سامنے روز حاضر ہوا کروں تاکہ وہ میرے آقا کی دولت کے بارے میں مجھ سے سوال کر سکے۔'' یہی اس بات کو ظاہر کر دیتی ہے کہ کیسے کالکا پرساد' شاہ علی کے خیمے میں 25/جون کو پہنچا جہاں اس نے عظیم اللہ جوالا پرشاد اور دوسروں کو قتل کا منصوبہ بناتے ہوئے سنا۔ لیکن اگر گرین وے کے خزانے کا پہلے پتہ چل گیا تھا تو کالکا پرساد کے شاہ علی کے کوارٹر میں جانے کا کوئی جواز نہیں ملتا۔ نانک چند بہت یقین کے ساتھ یہ کہتا ہے کہ گرین وے کا کمپاؤنڈ کھدائی کر کے ساری دولت 6/جون کو لے جائی گئی۔ نانک چند ایڈورڈ گرین وے کی بھی مخالفت کرتا ہوا پایا گیا۔ جب اس نے کہا کہ اس کی ماں اور بہنوں کو 9/جون کو نجف گڑھ سے قیدی بنا کر لایا گیا۔ جب کہ کالکا پرساد نے گواہی دی کہ نانا کے فوجی 8/جون کو نجف گڑھ گئے اور گرین وے کے قیدیوں کو لائے۔ یہی وجہ تھی کہ سر جان کے (Sir John Kaye) نے نانک چند کو غیر معتبر گواہ بتایا۔

کم سے کم ایک واقعہ میں سر جارج نانک چند کو اہمیت دینے کی تفصیل بتاتے ہوئے کہتا ہے کہ کیوں وہ نانک چند کو ان لوگوں میں اولیت دے رہا ہے جنہوں نے خندق کے بارے میں گواہیاں دیں۔ وہ ماؤبرے تھامسن کی نانا کی مشرقی ہندوستانی سفیر مسز گرین وے کی شناخت سے انکار کرتے ہوئے کہتا ہے: ''مسٹر گرین وے کا خصوصی ملازم اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ نانا نے مسز جیکوبی کو اپنا سفیر بنایا تھا اور اس کے اس بیان کی تائید گواہوں کی اکثریت نے کی تھی۔'' یہ پہلے ہی بتایا جاچکا ہے کہ گواہوں میں بہت سے لوگ نانک چند سے ملے ہوئے تھے۔ اور جو کچھ وہ بیان دیتا' وہ سب اس کی تائید کرتے لیکن صرف سفارت کا ہی معاملہ ایسا نہیں تھا جس پر ماؤبرے تھامسن نانک چند اور کالکا پرساد سے اختلاف کرتا ہے۔ کالکا پرساد نے یہ گواہی دی تھی کہ اس نے مسز جیکولی کو 24/جون کو دن میں نو اور دس بجے کے قریب خندق میں جاتے ہوئے دیکھا تھا اور وہاں سے 12

بجے کے قریب نکل کر نانا کے خیمے میں جاتے ہوئے دیکھا۔ یہ گواہ ہر جگہ صحیح مقام اور صحیح وقت پر موجود رہتا تاکہ وہ ان سارے واقعات کو دیکھ سکے اور سن سکے جس سے 27/جون کے قتل عام میں نانا کا ملوث ہونا ثابت کیا جا سکے۔ لیکن ڈیلا فوز کو یہ پکا یقین تھا کہ نانا کا سفیر 25/جون کو خندق میں پہنچا اور رماؤ برے تھامسن نے اسے بیر یکیڈ سے اوپر اٹھایا تھا' مسز گرین وے کی حیثیت سے پہچانا تھا۔ تھامسن مزید لکھتا ہے کہ "جب یہ گفت و شنید چل رہی تھی مسز گرین وے کا قیام میرے ٹینٹ میں تھا" اور وہ رات کے وقت نانا کے خیمے میں واپس گئی۔ اس کے دوسرے ہی دن نانک چند کو مجوزہ سازش کی خبر ملی۔ وہ لکھتا ہے کہ اس کے بارے میں ایڈورڈ گرین وے کو کالکا پرساد نے چیتاؤنی دی تھی' اس نے اس تنبیہ کو سنجیدگی سے کیوں نہیں لیا؟ جب کہ اس کے وفادار ملازم نے اس کی خبر لی تھی۔ یہ ایک پہیلی ہے جسے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس طرح کی غلط بیانیاں ٹریویلین یا ہومز کو پریشان نہیں کرتیں' جہاں نانک چند کا معاملہ آتا ہے۔

سر جارج ٹریویلین نے "عینی شاہد" کا ہر جگہ حوالہ دیا ہے جس نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ اس نے سواداہاؤس اور بی بی گھر کے قتل عام کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ جان فیلشٹ ڈرم بجانے والا ایک عیسائی تھا جو چھٹے این آئی الہ آباد سے جڑا ہوا تھا۔ جب وہاں بغاوت پھیلی تو دوسرے لوگوں کی طرح اس نے اپنی جان بچانے کے لئے اسلام قبول کر لیا۔ وہ مذہب تبدیل کرنے والے اپنے تمام ساتھیوں کے ساتھ کانپور گیا اور اس وقت موجود تھا جب وہیلر نے شکست قبول کی اور ہیولاک نے دوسری مرتبہ برٹش حکومت کو قائم کیا۔ وہ کہتا ہے کہ وہ اس وقت سواداہاؤس میں موجود تھا جب ندی سے عورتیں وہاں آئیں اور نہ صرف اس نے دیکھا بلکہ دوسرے قتل عام کے ایک ایک واقعہ کو دوہرایا۔ اس نے بیان دیا کہ جس دن وہ کانپور پہنچا' اسے سواداہاؤس لے جایا گیا۔ اور ایک چھوٹے سے کمرے میں جو مکان کے جنوب مشرقی حصہ میں تھا' محصور کیا گیا۔ اس کے ساتھ کلارک اور ڈی روز بھی تھے۔ مکان کے اس خاص حصہ سے اس نے ان عورتوں اور بچوں کی دُردِشا دیکھی جو پھٹے ہوئے کپڑوں اور کیچڑ اور خون سے تر تھے' ندی کی طرف سے آئے۔ کلارک اور ڈی روز نے سختی سے اس بات سے انکار کیا ہے کہ وہ کبھی فیلشٹ کے ساتھ سواداہاؤس یا کسی اور جگہ محصور کیا گیا تھا۔ کلارک کا کہنا ہے کہ جان فیلشٹ کا یہ بیان "سراسر جھوٹ پر مبنی ہے کیونکہ ہم لوگ کبھی بھی سواداہاؤس میں نہیں رکھے گئے تھے۔ ڈی روز بھی اسی طرح انکار کرتا ہے بلکہ اس سے ایک قدم آگے جاتا ہے۔ اس نے کرنل ولیمس سے بتایا کہ فیلشٹ ان کے ساتھ کیمپ میں تھا نہ کہ سواداہاؤس میں۔" جان فیلشٹ کا بیان سراسر جھوٹ پر مبنی ہے۔ ہم میں سے کوئی کبھی قید نہیں کیا گیا بلکہ ہم کھلے میدان میں اپنے سپاہیوں کے ساتھ کیمپ میں تھے اور فیلشٹ بھی ہمارے ساتھ تھا۔ ہمارا یہ کیمپ سواداہاؤس سے ایک میل کے فاصلے پر میدان میں تھا۔ وہ 27/جون کے بعد اس جگہ پر دوبارہ نہیں گیا۔ یہ فطری تھا کہ چونکہ یہ لوگ کیمپ میں تھے اور آزادانہ اِدھر اُدھر آجا رہے تھے۔ اگر فیلشٹ سواداہاؤس میں نہیں تھا' بلکہ ایک میل کے فاصلہ پر کیمپ میں تھا۔ اس نے ستی چورا

کے قتل عام کے بچے ہوئے لوگوں کو قید خانے میں آتے ہوئے نہیں دیکھا ہوگا۔اور یہ بھی حیرت کی بات ہے کہ اکیلے اس شخص کو بی بی گھر میں قید میں رکھا گیا۔ جس وقت کہ قیدی یہاں لائے جارہے تھے۔اس معاملے میں بھی جارج ٹریویلین اور ہومز نے سر جان کے کی تنبیہ کو نظرانداز کردیا۔اس نے کہا تھا "ہمارا خاص گواہ جس نے بہت تفصیل سے بیان کیا ہے اور جسے مصدقہ سمجھا جارہا ہے (جان فیلشٹ) جس نے بیان دیا کہ وہ ہمارے لوگوں کے ساتھ قید تھا' سراسر جھوٹ پر مبنی ہے۔اور صرف اسی جگہ پر جہاں اس کے بیان کی تصدیق اور لوگوں نے بھی کی ہے' بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔" لیکن اس کے دیگر ڈرم ساتھیوں کی طرف سے انہیں بھی اپنی گردن بچانی تھی۔ انہوں نے خود ہی اعتراف کیا ہے کہ انہوں نے اسلام قبول کرلیا اور سپاہیوں کے ساتھ مل گئے۔

نانک چند نے اپنے رسالے میں بعد میں دی گئی اپنی عرضیوں اور 62 دیگر گواہوں سے اکثر نے مخالف بیان دیا ہے۔ اس معاملہ میں نہ تو سر جاج ٹریویلین اور نہ ہی ڈاکٹر ٹی رائس ہومز اپنے کو اتھارٹی ثابت کرسکے ہیں سوائے اس مواد کے جو انہوں نے نانک چند سے حاصل کیا۔ اور ان گواہوں کے بیانوں پر جنہوں نے کرنل ولیمس کے سامنے بیان دیا اور ان میں سے زیادہ تر بھروسہ کے قابل نہیں۔

# باب پنجم

# اودھ

اودھ ایک قدیم صوبہ اور نئی سلطنت تھی۔ اس صوبے کا وجود مغل شہنشاہوں کے دور میں ملتا ہے۔ لیکن اس سلطنت کی تاریخ صرف 38 سال پرانی تھی۔ اس دوران پانچ بادشاہ اس کی گدی پر بیٹھے، یہ سبھی حکمران فارسی النسل تھے اور شیعہ عقیدے کو ماننے والے تھے۔ اس حکومت کا بانی مغل دربار کا ایک نواب تھا۔ جب مغل حکومت کا زوال شروع ہوا تو وزیر کا منصب ایک ہی خاندان میں نسل در نسل چلتا رہا۔ اور اودھ کا صوبہ اس کے ماتحت ہوتا۔ لمبے عرصے تک اودھ کے حکمرانوں نے اپنے کو شہنشاہ دہلی کا ماتحت سمجھا۔ نواب شجاع الدولہ نے شاہ عالم کے ساتھ مل کر اپنے والد کی جاگیر بہار کے صوبے پر حملہ کیا۔ شہزادے اور وزیر اعظم کی مشترکہ فوج کو 1764ء کی بکسر کی جنگ میں سر ہکٹر منرو کے ہاتھوں شکست ہوئی۔ جلد ہی ایک سفارتی عہد نامہ تیار کیا گیا۔ کلائیو نے الہ آباد کے عہد نامے پر بادشاہ اور وزیر سے دستخط کرائے۔ شہنشاہ نے بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی، ایسٹ انڈیا کمپنی کو عطا کی۔ اور وزیر کے کسی غیر ملکی طاقت کے ساتھ سیاسی سمجھوتہ کرنے کے سارے حقوق ختم کر دیئے گئے، سوائے برٹش حکمرانوں کے۔

اودھ کے نوابوں نے اس معاہدے کی پابندی لگاتار کی۔ لیکن اس کے باوجود طاقتور پارٹی اپنا کنٹرول لگاتار بڑھاتی رہی اور مطالبوں میں اضافہ کرتی رہی۔ جب تک کہ صوبہ اودھ کے حدود گھٹ کر آدھے نہیں ہوگئے۔ حکمران کا مرتبہ گھٹ کر ایک محکوم جاگیر دار کا ہوگیا۔ آصف الدولہ کی موت کے بعد، شجاع الدولہ کا بیٹا اور جانشین نے کمپنی کے ساتھ وفاداری کا ایک اور معاہدہ کیا۔ ان کے بعد ان کی جانشینی کو لے کر ان کے لڑکے مرزا علی اور بھائی سعادت علی کے درمیان تنازعہ کھڑا ہوگیا۔ سعادت علی کے دعوے کو ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنی منظوری دے دی لیکن اس شرط پر کہ انہیں ان کی حفاظت کے لئے رکھی گئی برٹش فوج کو دی جانے والی سالانہ گرانٹ میں کافی اضافہ کرنا پڑے گا۔ چار سال کے اندر ہی یہ معاہدہ دوبارہ تحریر کیا گیا۔ اور سعادت علی کو دو آبے کا سارا علاقہ برٹش حکومت کے سپرد کرنا پڑا۔ جس سے ہر سال تقریباً ایک کروڑ 35 لاکھ 25 ہزار 474 روپے کی مالگزاری وصول ہوتی تھی۔ 1801ء کے اس معاہدے کی آرٹیکل 6 کے مطابق سعادت علی کو "اپنے مخصوص علاقے میں انتظامیہ کا وہ نظام لاگو کرنا ہوگا جو انگریزوں کے اپنے افسران لاگو

کریں گے' جو رعایا کی فلاح اور ان کی جان مال کی حفاظت میں معاون ہوگا۔"اس نے یہ بھی وعدہ کیا "آنریبل کمپنی کے افسروں کے مشورے کے مطابق ہی وہ کام کرے گا۔"اس طرح ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے آپ کو اودھ کے لوگوں کی فلاح کے لئے اخلاقی طور پر ذمہ دار بنالیا۔ اور "نواب کو اندرونی انتظام کے معاملے میں بھی کمپنی کے افسروں کے مشورے کے مطابق کام کرنا ہوگا۔" انہیں بجا طور پر یہ امید تھی کہ انگریز فوجیں ان کے لئے ان کے جاگیر داروں سے جنگ کریں گی۔ جو اپنے مسلح عملوں اور قلعوں کی وجہ سے اپنے آپ کو آزاد سلطنت سمجھتے تھے۔ اور یہ سمجھتے رہے کہ ملک کے قانون سے وہ بالاتر ہیں۔ برٹش حکام نواب اور ان کے جاگیر داروں کے درمیان مداخلت کرنے میں ہچکچاہٹ دکھاتے جب تک کہ انہیں یہ اطمینان نہ ہو جاتا کہ نواب کا کہنا جائز ہے۔ سعادت علی ہمیشہ محسوس کرتے کہ برٹش حفاظت کی انہوں نے بہت بڑی قیمت ادا کی ہے۔ اور جب وہ فوجی مدد کے لئے ان سے کہتے تو اس میں اپنی بے عزتی محسوس کرتے۔ 1814ء میں سعادت علی کا انتقال ہوگیا۔ اور ان کی جگہ ان کے لڑکے غازی الدین حیدر، تخت نشین ہوئے۔ نئے نواب نے نیپال جنگ کی دشواری کے زمانے میں اپنے ماتحتوں کی مالی امداد کرکے ان کا تعاون حاصل کرلیا۔ اور کمپنی کی حکومت نے ان کے لئے نہ صرف اودھ کے حدود میں اضافہ کیا بلکہ ان کے مرتبہ کو بلند کرکے بادشاہ کا لقب دے دیا۔ نصیر الدین حیدر، محمد علی شاہ اور امجد علی شاہ نے اپنے اپنے دور میں اسی لقب کو اختیار کیا۔ اور 1847ء میں اس سلطنت کے آخری وارث واجد علی شاہ بادشاہ بنے۔ سوائے ان کے اودھ کے دوسرے بادشاہوں نے حکومت کو بڑے پیمانے پر قرض فراہم کیا جن کا دوہرا مقصد ہوتا۔ ایک تو یہ کہ کمپنی کے افسران ان کے ممنون ہوں۔ دوم اپنے خاص لوگوں کی موت کے بعد انہیں مستقل مزاجی سے پنشن کی رقم عطا ہوتی رہے۔

1801ء میں کیے گئے معاہدے میں خاص ضابطوں کے باوجود انتظامیہ کی حالت روز بروز بگڑتی گئی۔ بادشاہ جو غیر ملکی تحفظ کی بنیاد پر اپنے کو محفوظ سمجھتا رہا' نے حکومت کا سارا معاملہ اپنے چہیتوں کے سپرد کر رکھا تھا۔ جو اس کو موقعہ غنیمت سمجھ کر زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔ جو طاقت ور جاگیر دار تھے وہ بدعنوان افسران سے اپنے کو کسی صورت محفوظ کئے رہے۔ لیکن چھوٹے موٹے زمیندار مستقل مصیبتوں کا شکار ہوتے رہے۔ حالات بد سے بدتر ہوتے رہے۔ اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ بدعنوانی اور بدنظمی کا نام ہی اودھ پڑ گیا۔ کمپنی کی حکومت نے اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کیا اور جب بار بار کی تنبیہوں کا کوئی اثر نہیں ہوا تو محمد علی شاہ کے ساتھ ایک نیا معاہدہ 1837ء میں زبردستی کرنے کی کوشش کی۔ اس معاہدے کا آرٹیکل 7 بہت سخت اور اپنے مقصد میں واضح تھا۔ "پہلے جس معاہدے کے آرٹیکل 6 کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس میں اب ترمیم کی جارہی ہے اور اس ترمیم کے مطابق اودھ کے بادشاہ برٹش ریزیڈنٹ کے ساتھ مل کر اس بات کی فوری طور پر کوشش کریں گے کہ پولیس عدالت اور مالگزاری کے محکمے میں ان کے دارالسلطنت کے اندر جو خامیاں ہیں' انہیں فوری طور پر دور کریں گے۔ اور اگر بادشاہ برٹش حکومت یا اس

کے مقامی نمائندے کے مشورے کو ماننے سے آنا کانی کریں گے اور (خدانہ کرے) اس کے بعد بھی اودھ کی حکومت کے اندر اسی طرح کی بدانتظامی' بدعنوانی کا سلسلہ جاری رہا' جس کی وجہ سے امن عامہ کو کوئی خطرہ لاحق ہو تو برٹش حکومت اپنے اس حق کو محفوظ رکھے گی کہ وہ اودھ کے کسی بھی حصہ میں اپنے افسروں کی تقرری کرے' چاہے چھوٹے یا بڑے پیمانے پر' جس میں مندرجہ بالا شق کے تحت بدانتظامی پائی جاتی ہے اور جتنی مدت کی ضرورت ہو وہ انتظام سنبھالیں گے اور پھر مالگزاری سے وصول ہونے والی رقم سے یہ سارے اخراجات وضع کرنے کے بعد فاضل رقم بادشاہ کے خزانے میں جمع کی جائے گی۔ اور ان علاقوں کے انتظام سے وصول ہونے والی رقم اخراجات کا صحیح صحیح بیورا بادشاہ کو دیا جائے گا۔" آرٹیکل 8 کے تحت گورنر جنرل کو یہ اختیار ہو گا کہ وہ جب مناسب سمجھے آرٹیکل 7 کے تحت دیئے گئے اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے "جہاں تک ممکن ہو کوشش کریں گے کہ وہ مقامی اداروں اور انتظامیہ کی سطح پر ان علاقوں میں ترقی کے کام کریں گے لیکن ایسے سارے علاقے بعد میں امن قائم ہونے کے بعد اودھ کے حکمراں کو لوٹا دیئے جائیں۔" کوئی بھی عزت دار حکمراں اس بات کو کبھی قبول نہیں کرے گا کہ اس کے دور حکومت میں اس طرح کی بدنظمی پھیلی رہے۔ وہ معاہدے کے اس دستاویز پر دستخط بھی نہیں کرے گا۔ محمد علی شاہ نے بجا طور پر یہ سمجھا کہ معاہدے کا مطلب تخت سے دستبردار ہونا ہے۔ لیکن وہ یہ بھی جانتے تھے کہ وہ برٹش حکومت کے رحم و کرم پر ہیں۔ اس لئے بدرجہ مجبوری آخرکار انہیں اس کے لئے راضی ہونا پڑا۔ برٹش حکومت کے محکمۂ داخلہ نے اس معاہدہ کو منظوری نہیں دی۔ اور یہ منسوخ ہو گیا۔ لیکن اس کے بعد بھی بُرے دن ختم نہیں ہوئے۔ صرف کچھ دنوں کے لئے ٹل گئے۔

ماتحت نظام کی اپنی برائیاں تھیں۔ کسی بھی اندرونی یا باہری دشمن کے خلاف برٹش امداد کی یقین دہانی کی وجہ سے ہندوستانی شہزادے جانفشانی کے عادی نہیں رہ گئے تھے اور ہر طرح کی بے راہ روی کے شکار ہو گئے تھے۔ زیادہ سے زیادہ ان کا وجود نہیں کے برابر ہو گیا تھا اور کم سے کم کی سطح پر وہ ان بدمعاشیوں میں ملوث ہو گئے تھے جو عوام کی اخلاقی سطح کو برباد کرنے والی تھی صرف ایک شخص جس سے وہ خائف رہتے اور جسے ذرّہ برابر بھی کوئی نقصان پہنچانے کے بارے میں تصور نہیں کر سکتے تھے' وہ برٹش ریزیڈنٹ ہوتا اور ریزیڈنٹ عام طور پر ان کے معاملات میں اس وقت تک مداخلت نہیں کرتا جب تک کہ پانی سر سے اونچا نہ ہو جاتا۔ اودھ میں ایک کے بعد ایک ہونے والے بادشاہوں نے اپنی ساری ذمہ داریوں کو اپنے چمچوں کے سپرد کر کے عہدہ برآ ہو گئے اور کمپنی کے افسروں کی تنبیہوں پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ حد تو یہ ہے کہ سب سے زیادہ نرم خو گورنر جنرل لارڈ آکلینڈ جیسا شخص بھی ان بادشاہوں کو اپنے ایجنٹ سے رہا کرنے کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔

واجد علی شاہ بھی اپنے پیش روؤں کے نقش قدم پر چلنے لگے۔ انہیں موسیقی اور شاعری کا

شوق تھا۔ انہوں نے اپنے خاندان کی منظوم تاریخ لکھنی شروع کی۔ ان کے لئے یہ کہیں بہتر ہوتا کہ وہ عالموں اور شاعروں کی مجلسوں پر اکتفا کرتے لیکن ان کے والد نے انہیں اس بات کی اجازت دے دی تھی کہ وہ کم تر نسل کے موسیقاروں اور گویوں اور رقاصاؤں کی صحبت کو عالموں کی صحبت پر ترجیح دیں۔ ان کے وزراء بھی انہیں ہفتے یا پندرہ دن میں صرف چند منٹ کے لئے محل میں نہیں بلکہ ان کی منظور نظر رقاصاؤں کے گھر پر مل سکتے تھے۔ اور ان چہیتے لوگوں سے جن سے خوش ہو کر انہیں حکومت کا اعلیٰ عہدہ سونپ دیتے۔ ''اودھ اب اس وقت بغیر کسی حکومت کے ہے۔'' یہ بات سلیمن نے 1849ء میں لکھی ''بادشاہ سوائے موسیقاروں' بھانڈوں اور رقاصاؤں کے' کسی بھی شخص سے نہیں ملتے اور نہ ہی عوامی معاملات کے بارے میں جانتے ہیں اور نہ جاننے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔'' ''صرف وزیروں کو تبدیل کر دینے سے کچھ بھی نہیں ہوگا' اس کا خیال تھا۔ جب تک یہ کمترین لوگ تخت کی باگ ڈور سنبھالتے رہیں گے۔ اس نے مشورہ دیا کہ اودھ کا انتظام ایک بورڈ کے سپرد کر دیا جائے اور بادشاہ سے کہا جائے کہ آپ اپنے سارے اختیارات بورڈ کو سپرد کر دیں یا اپنے جانشین کے حق میں دستبردار ہو جائیں۔ اس معاملے میں بورڈ کونسل آف ریجنسی کی حیثیت سے کام کرے گا۔ لیکن حکومت ہند سخت قدم اٹھانے سے ہچکچا رہی تھی اور اپنی پرانی پالیسی' صلاح اور تنبیہ پر چلتی رہی۔ بادشاہ اپنی راہ چلتا رہا۔ اس پر کسی بھی بات کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ نہ ہی اسے یہ معلوم تھا کہ 1837ء کا معاہدہ منسوخ ہو چکا ہے۔ اسے صرف یہ سوچ کر تسلی ہوتی کہ زیادہ سے زیادہ اس سے حکومت کرنے کا اختیار چھین لیا جائے گا۔ اپنے اس اختیار کا وہ کبھی استعمال بھی نہیں کرتا اور یہ کہ حکومت کا خزانہ تو بہر حال اس کے ہی پاس رہے گا۔

1854ء میں سلیمن کی جگہ آوٹ رام ریزیڈنٹ بنا۔ اس نے اودھ کے معاملات کو ''اسی حالت میں پایا' جس کا ذکر سلیمن وقتاً فوقتاً کرتے تھے۔'' بادشاہ کا سارا وقت صرف زنان خانوں میں گزرتا اور ایسا لگتا کہ ہر طرح کی جنسی بدفعلیوں کو ہی انہوں نے اپنا وطیرہ بنالیا۔'' 1801ء کے معاہدے میں حکومت کے ضم کرنے کی بات نہیں کی گئی تھی۔ اس میں صرف مقامی افسروں کے ذریعہ' انتظامیہ میں سدھار لانے کی بات کہی گئی تھی۔ 1837ء کے منسوخ ہوئے معاہدے میں حکومت کی تبدیلی کی بات کی گئی تھی۔ لیکن حکومت کے انضمام کی بات نہیں کی گئی تھی۔ ڈلہوزی حکومت پر قبضہ کرنے کے حق میں نہیں تھا اور نہ ہی بادشاہ کے لقب کو ختم کرنے کے۔ وہ زیادہ سے زیادہ انتظامیہ کو اپنی مرضی سے ایسٹ انڈیا کمپنی کو منتقل کرنے کے لئے ایک نئے معاہدے کے حق میں تھا جس کے عوض میں بادشاہ ان کے جانشین اور شاہی خاندان کے دوسرے افراد کو پنشن دیئے جانے کی ضمانت دی جاتی۔ کونسل میں اس کے دوسرے رفقاء کا خیال تھا کہ موجود معاہدوں میں یہ صاف طور پر کہا گیا ہے کہ کمپنی کی حکومت کی یہ اخلاقی و قانونی ذمہ داری ہوگی کہ اودھ کے پانچ لاکھ لوگوں کی بھلائی کے لئے وہ اس کے اندرونی انتظام میں مداخلت کر سکتی ہے۔ کیونکہ کسی ایک فرد کے عیش و عشرت کے لئے عوام کی فلاح کو قربان نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ ان میں سے

ایک نے یہ مشورہ دیا کہ دلی کے بادشاہ کو جو اختیارات حاصل تھے' وہ سب اب کمپنی کو حاصل ہو گئے ہیں' اس لئے اسے ماتحت حکومتوں پر ہر طرح کا مکمل اختیار حاصل ہو چکا ہے۔ مرکزی حکومت کا محکمۂ داخلہ اس معاملے میں اپنا فیصلہ نہیں کر سکا۔ اور اس کی منظوری 1856ء میں موصول ہوئی۔ اس دوران ڈلہوزی خاموش نہیں بیٹھا۔ اس نے اپنے منصوبے کو حتمی شکل دے کر سارے انتظامات کر لئے۔ "اگر بادشاہ اس نئے معاہدے پر دستخط کرنے سے انکار کرتا ہے تو سلطنت کا انضمام کر لیا جائے گا۔" آوٹ رام کے سامنے مشکل کام آ پڑا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ بادشاہ اپنی مرضی سے اپنے عہدے سے دستبردار ہونے کے معاہدے پر دستخط نہیں کرے گا۔ اگر وہ اپنی افواج کے سہارے اس کی مزاحمت کرتا تو ریزیڈنٹ کے لئے اس کی فوجوں پر قابو پانا اور حکومت پر قبضہ کرنا آسان نہیں رہ جاتا۔ لیکن بادشاہ نے اپنے آپ کو ریزیڈنٹ کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ اس نے اپنی پگڑی ریزیڈنٹ کے قدموں میں ڈال دی۔ جو مکمل غلامی کی علامت تھی۔ اور اس سے درخواست کی کہ وہ اس کے حق میں گورنر جنرل سے بات کرے۔ اس نے ریزیڈنٹ کو یہ بھی یاد دلایا کہ اس کے پیش روؤں نے کمپنی حکومت کے ساتھ کس طرح وفاداری کے ساتھ تعاون کیا اور معاہدے پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ اگر وہ اور اس کے مشیروں نے اس بات پر بھروسہ کیا کہ حکومت ہند نے اب تک ان کے ساتھ ہر طرح کی رعایت جاری رکھی ہے اور اس بار بھی رعایت دیں گے لیکن جلد ہی ان کی یہ ساری امیدیں پاش پاش ہو گئیں۔ واجد علی شاہ نے برٹش حکومت کی تنبیہ سے انکار کر دیا اور ان کی سلطنت برٹش انڈیا کا ایک صوبہ بن گئی۔

اس نئے صوبے کی حکومت سر جیمس آوٹ رام کو بطور چیف کمشنر تفویض کی گئی۔ تین سینئر سول سرونٹس کو مزید بھیجا گیا ضروری افواج کے ساتھ تاکہ وہ ڈویژنل سطح کے انتظام کو قائم کریں۔ یہ امید کی جا رہی تھی کہ اودھ کے لوگ برٹش حکمرانوں کو اپنے دوست اور نجات دہندہ کے طور پر استقبال کریں گے لیکن یہ نہیں محسوس کیا گیا تھا کہ جب تک اس کے ٹھوس نتائج نہ برآمد ہوں' وہ انتظار کرنا مناسب سمجھیں گے' اور یہ بھی فراموش کر دیا گیا تھا کہ بدنظمی اور بدعنوانی جس کی ہر ریزیڈنٹ نے شکایت کی تھی' کے باوجود بہت کم کسانوں نے اودھ سے باہر جانے اور برٹش انڈیا کے دوسرے اضلاع میں پناہ ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی۔ کسی ملک کے انتظامیہ کو درست اور چاق و چوبند کرنے میں کئی سال کی مشقت ہوتی ہے اور صرف ایک ہفتہ میں نئی تبدیلی نہیں لائی جا سکتی۔

ایک غیر ملکی حکومت کسی ملک کے سبھی سماجی اور معاشی نظام کو درہم برہم کر دیتی ہے۔ سلطنت پر قبضہ کے بعد اودھ کے شرفا حکومت کے اعلیٰ عہدوں کے لئے خواہش مند نہیں ہو سکتے تھے کیونکہ یہ صرف حکمراں قوم تک محدود ہو گیا تھا۔ بادشاہ کے ساتھ ہی ان کے فوجی فوری طور پر ملازمت سے ہٹا دیئے گئے۔ ان میں سے بہت کم لوگ مسلح پولیس فوج میں ملازمت پا سکے تھے۔ اس سیاسی انقلاب سے زندگی کے مختلف شعبوں میں بے چینی عام ہو گئی تھی کیونکہ سلطنت

میں بہت بڑی تعداد میں دستکار اور کرافٹس مین رہا کرتے تھے جو بظاہر اب ہر طرح سے ذریعۂ معاش سے محروم ہوگئے تھے' کیونکہ نئے حکمرانوں کا ایک مختلف ثقافت کی وجہ سے مزاج بھی مختلف تھا۔ اگر سر جیمز آوٹ رام اپنے عہدے پر بنا رہتا یا سر ہنری لارنس جیسا مدبّر اس نئے نظام کا سربراہ بنایا جاتا تو شاید ان لوگوں کو جو اس نئی حکومت کی وجہ سے پریشان حال ہوگئے تھے' ان کے لئے کچھ انتظام کیا ہوتا۔ لیکن آوٹ رام بہت جلد ہی چھٹی پر چلے گئے اور ان کی جگہ سر کوورلی جیکسن سربراہ بنے جس کے پاس سول حکومت کا ایک لمبا تجربہ تھا۔ جس نے کمپنی کے پرانے صوبوں میں نمایاں کام انجام دیا تھا۔ لیکن اس کے پاس اس تدبر کی کمی تھی جو اس نئے عہدے کی ضرورت تھی۔ اس نے اپنی رہائش کے لئے چھتر منزل کا انتخاب کیا' وہ محل جہاں شاہی خاندان کے افراد رہا کرتے تھے۔ بعد میں گرچہ اسے اس پر تنبیہ کی گئی اور اسے محل چھوڑنا پڑا لیکن تب تک عوام کے خیالات اور احساسات مجروح ہو چکے تھے۔ مسلمان عام طور پر قدم رسول کو ایک متبرک عمارت سمجھتے کیونکہ اس میں ایک ایسا پتھر تھا جس کو سمجھا جاتا تھا کہ حضور پاکؐ کے قدموں کے نشان ہیں۔ نئی حکومت نے اسے اسلحہ خانہ بنالیا۔ بادشاہ کے بہت سے وثیقہ دار جو بادشاہ کے خاندان سے تھے' انہوں نے ایک سال تک بطور احتجاج پنشن نہیں لی۔ جب تک کہ سر ہنری لارنس نے لکھنؤ آکر ان کی پریشانیوں کو دور نہ کر دیا۔ اس دوران بہت وقت گزر چکا تھا اور اودھ کے لوگوں کے خوف کو دور کرنے کے لئے کچھ نہیں کیا گیا بلکہ اس کے برخلاف مال گزاری افسروں کے اصلاح کے جوش میں ہر طرف بے چینی پھیل گئی۔

یہ پہلے سے ہی طے شدہ تھا کہ مالی بندوبست کے نئے انتظام سے کسانوں کے حقوق کی حفاظت ہوگی جب کہ پرانی حکومت میں کسانوں کی حالت کا خیال نہیں رکھا گیا تھا۔ اگر پرانے ٹیکسوں کو معاف کیا جاتا تو بھی ان سدھاروں سے عام آدمی کی حالت میں کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ ان کی جگہ پر اور زیادہ نئے ٹیکس لگا دیئے گئے تھے۔ ریس کا کہنا ہے کہ ''ہم اپنی بیلنس شیٹ کو اپنے لئے سودمند بنانے کے واسطے اس قدر پرجوش تھے کہ ہم نے لوگوں کو خوش کرنے کے خیال کو ترک کر کے صرف اپنے خزانے کو بھرنا شروع کیا۔ اب ٹکٹ' عرضی دینے' کھانے کے سامان' مکانوں' پکے ہوئے کھانوں اور کشتیوں سے آمد و رفت پر نئے محصول لگا دیئے گئے۔ اب افیم کا ایک کنٹریکٹر ہوتا۔ رسد فراہم کرنے کا کنٹریکٹر ہوتا۔ نمک اور اسپرٹ کا ایک کنٹریکٹر ہوتا بلکہ زندگی کی ہر ضرورت کے لئے کنٹریکٹ دیئے گئے تھے۔ جسے پیرس میں چنگی کا نام دیا گیا۔'' افیم پر لگائے جانے والے ٹیکس سے نہ صرف پورے صوبے میں بلکہ اس خاص شہر میں بھی عام بے چینی پھیل گئی۔ لکھنؤ میں افیم کا اسی طرح استعمال کیا جاتا جس طرح چین میں۔ اور اس دوا سے اچانک محروم ہونے سے غریب افیمیوں پر بہت برا اثر پڑا۔ بہت سے لوگ جو اب اس بڑھتی ہوئی قیمتوں پر افیم نہیں خرید پاتے' وہ ناکام ہو کر خودکشی کرنے لگے۔ جنرل میکلیڈ انس معاہدے کی خلاف ورزی کرنے کے لئے اودھ انتظامیہ کو ذمہ دار بتاتا ہے۔ کیونکہ لارڈ ڈلہوزی کے اعلانیہ میں کیے گئے

وعدوں کو پورا کرنے سے وہ قاصر رہے۔

نئی حکومت کے لئے یہ ناممکن تھا کہ وہ پولیس اور عدلیہ کے نظام میں فوری طور پر تبدیلی لائیں اور نہ ہی نئی حکومت پرانے افسران اور ان کے دفتروں کو یک قلم مسترد کر سکتی تھی۔ اور ان افسران کے لئے اپنی پرانی عادتوں اور طریقوں کو بدلنا ناممکن تھا۔ رشوت اور بدعنوانی پرانے طریقوں پر ہی چلتی رہی لیکن اب اس کا سارا الزام نئے حکمرانوں کو ملنے لگا جنھوں نے بہت فخر سے یہ دعویٰ کیا تھا کہ اب ہر شخص کو انصاف ملے گا۔ نئے مالی بندوبست سے بھی لوگوں کو اطمینان نہیں ہوا۔ بندوبست کے افسران نے اس نظریے سے کام کرنا شروع کیا کہ کسان ہی اصل میں زمین کا مالک ہے۔ اور تعلقدار اور زمیندار ناجائز طریقوں سے ان زمینوں پر قابض ہیں۔ وہ اس بات کو نہیں سمجھ سکے کہ بہت سے معنوں میں یہ تعلقدار نہ صرف کسانوں کے مالک ہوتے ہیں بلکہ اس پورے علاقے کے سردار بھی۔ اس لئے کسانوں اور ان کے مالکان کے درمیان ایک ایسا اٹوٹ رشتہ تھا جسے آسانی سے ختم نہیں کیا جاسکتا۔ بہت سے زمیندار اپنی زمینوں کے مالک نہ صرف اپنی تلوار کی بدولت بلکہ اپنے علاقے میں رہنے والے لوگوں کی منظوری سے بنے تھے۔ وہ زمین کے اپنے پرانے دعووں کو دستاویزی شہادت سے بھی ثابت نہیں کر سکے۔ ان میں سے بہتوں کو اپنے آبائی گاؤں کو چھوڑنا پڑا اور ان قلعوں کو ڈھا دیا گیا اور ان کے مسلح محافظوں کو ختم کر دیا گیا۔ یہ ٹھیک ہے کہ کوئی بھی حکومت صرف پرانے نظام کی بدولت یا ان حکمرانوں کی بدولت جو قانون کو اپنے سے بالاتر سمجھتے 'ان کے مسلح محافظوں کو ختم کیے بغیر نیا نظام نہیں قائم کر سکتی لیکن ایسے تمام محرومین کی تعداد بڑھتی گئی اور ان میں سے کچھ کی یہ شکایت تو بالکل بجا تھی کہ انہیں غیر قانونی طور پر آبائی املاک سے محروم کر دیا گیا۔ کسان بھی اپنے آقاؤں سے ہمدردی رکھتے تھے۔ اور وہ اس نئی حکومت کو پسند نہیں کرتے تھے۔ گبنس قبول کرتا ہے کہ کچھ معاملوں میں تعلقداروں کے ساتھ انصاف سے کام نہیں لیا گیا۔ لیکن ایسے زیادہ تر معاملے فیض آباد ڈویژن تک محدود تھے۔ ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں کہ سیتاپور کے کمشنر کرچین زمینداروں اور تعلقداروں کے خاتمے کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اور نہ ہی کسانوں کی ملکیت کا اصول انہیں پسند تھا۔ ان سے لی جانے والی مالگزاری میں کمی کر دی گئی تھی لیکن اب بھی یہ بہت زیادہ تھی۔ گبنس ایک جگہ بہت رازدارانہ طریقے پر کہتا ہے "ہندوستان میں بد سے بدتر برٹش حکومت کو بھی لوگ مقامی حکومت کے مقابلے میں ترجیح دیتے ہیں۔" لیکن بغاوت نے یہ ثابت کر دیا کہ مقامی حکومت اتنی غیر مقبول نہیں تھی۔

فروری ۱۸۵۶ء میں اودھ پر قبضہ کیا گیا۔ اور مارچ ۱۸۵۷ء میں سر ہنری لارنس کو بلا کر چیف کمشنر کے عہدے پر مقرر کیا گیا تاکہ تمام پریشان حال لوگوں کی حقیقی شکایتوں کا ازالہ کیا جاسکے۔ سر ہنری 'لارڈ ڈلہوزی کو پسند نہیں تھے لیکن ہندوستانی رجواروں' جو برٹش قبضے کے بعد ہر چیز سے محروم کر دیے گئے' کے لئے اس کی ہمدردی کا شہرہ ہر طرف تھا۔ اس نے فوراً ہی ان کے

زخموں کو مندمل کرنا شروع کیا۔ ان کی ساری بقایا رقم کی فوری طور پر ادائیگی کی گئی اور چیف کمشنر ان کے مراتب کا خیال کر کے انہیں وہی مرتبہ دیا اور ان کی پنشن اور گریچویٹی وغیرہ کی ادائیگی کا فوری انتظام کیا گیا۔ لیکن سر ہنری بہت تاخیر سے آئے تھے۔ سپاہی پہلے ہی سے چربی کے معاملے کو لے کر احتجاج کر رہے تھے۔ اور ذرا سی غلطی بھی بڑا طوفان لا سکتی تھی۔ لیکن کچھ ایسے بھی لوگ تھے جو نوشتۂ دیوار کو پڑھ نہیں سکے۔ اپریل کے شروع میں ڈاکٹر ویلز' جو 48 ویں این آئی میں سرجن تھے' وہ ہندوستانی رواج سے لاعلم ہونے کی بدولت ایسی ہی غلطی کر بیٹھے۔ میڈیکل اسٹور کی جانچ کرتے ہوئے ان کی کچھ طبیعت خراب ہوئی اور اسپتال کے دواخانوں سے ایک ایسی بوتل جس میں چربی ملی ہوئی تھی' انہوں نے اپنے منھ میں لگالی۔ کوئی بھی ہندو اس ملاوٹی دوا کا استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ اور اسپتال کے مریضوں نے دوا لینے سے انکار کر دیا۔ ڈاکٹر ویلز کی کہاسنی ہوئی۔ اس ملاوٹی بوتل کو مقامی افسروں کے سامنے توڑ کر پھینک دیا گیا لیکن سپاہی نہ تو بھولنے اور نہ ہی معاف کرنے کے موڈ میں تھے۔ ان کے نزدیک یہ ان کے ذات پات کے اصول میں صریح مداخلت تھی اور ان کا یہ شبہ کسی صورت دور نہیں ہوا۔ ڈاکٹر کے بنگلہ کو آگ لگادی گئی۔ بہت مشکل سے وہ اپنی جان بچا سکا۔ 18/ اپریل کو چیف کمشنر کی گاڑی پر کسی نامعلوم شخص نے ایک گولہ پھینک دیا۔ یہ جرم کرنے والا اگر سپاہی نہ بھی رہا ہو تو بھی انتظامیہ کے سربراہ کی اتنی بڑی بے عزتی ہر طرف پھیلی ہوئی بے اطمینانی کا مظہر تھی۔ یہ فیصلہ کیا گیا کہ 48 ویں این آئی کو لکھنؤ سے ہٹادیا جائے۔ لیکن چیف کمشنر کو یقین تھا کہ حال کے یہ مجروح احساسات کسی خاص وجہ یا گولی کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ سرکار کے بہت سے اقدامات سے پیدا ہوئی غیر معمولی پریشانی تھی"' رجمنٹ کے ایک پرانے افسر کا خیال تھا کہ اگر سپاہی کی شکایت دور نہیں کی گئی تو اپنے آپ کو وہ اس سے دور کر لے گا۔ 2/ مئی کو ساتویں اودھ رجمنٹ نے گولی کو دانت سے کاٹنے سے انکار کر دیا' پہلے اپنے افسروں کے کہنے پر اور بعد میں بریگیڈیر کے کہنے کے باوجود۔ ان سپاہیوں سے گولی کو دانت سے کاٹنے کے لئے کیوں کہا گیا جبکہ یہ طریقہ پہلے ہی ختم کر دیا گیا تھا۔ اس کا کوئی جواز نہیں تھا۔ شاید کسی مقامی افسر نے اپنی وفاداری کے جوش میں یہ حکم دیا اور بعد میں نظم و نسق کے پیش نظر بریگیڈیر نے بھی اس کے حکم پر صاد کر دیا۔ اس کے تدارک کے لئے فوری طور پر تدبیر کی گئی۔ اور ہندوستانی رجمنٹ نے یورپین فوجیوں کے ساتھ مل کر اودھ کے سپاہیوں کو درست کر دیا۔ ان باغیوں نے پھر کوئی مزاحمت نہیں کی۔ وہ بالکل خاموش ہوگئے۔ ان میں سے زیادہ تر لوگ اس وقت بھاگ گئے جب انہوں نے دیکھا کہ ان کی طرف بندوقیں تانی گئی ہیں۔ ان غیر مسلح لوگوں کو لائن میں حاضر ہونے کا حکم دیا گیا۔ بعد میں اس رجمنٹ کو توڑ دیا گیا اور کچھ عرصہ کے لئے بے اطمینانی ختم ہوگئی۔

سر ہنری کو بہت زیادہ چوکنا ہو جانا پڑا۔ وہ مزید پیدا ہونے والی دشواریوں کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا اس لئے اسے شہر اور کنٹونمنٹ کے سفید نسل کے لوگوں کو حفاظت کے لئے پیش

بندی کرنی پڑی۔ اس کے ساتھ ہی اُسے یہ بھی نہیں دکھانا تھا کہ انگریز خوفزدہ ہوگئے۔ وہ فوج میں نرم دل لوگوں کو اپنے سے ملانے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن وہ کچھ ایسا بھی نہیں کرنا چاہتا تھا جس سے بے چین لوگ مزید بے چین ہو جائیں۔ ساتویں اودھ غیر مستقل نے ایک خط 48 ویں این آئی کو لکھا 48 ویں این آئی پر پہلے ہی سے شبہ تھا لیکن ایک سپاہی اور دو مقامی افسروں نے جن کے ہاتھوں میں یہ خط پڑا' بہت وفاداری کے ساتھ اسے اپنے اعلیٰ افسروں کے سپرد کر دیا۔ 13 ویں این آئی کے ایک سپاہی نے شہر کے ان تین آدمیوں کو پکڑ کر کیپٹن جرمن کے سپرد کر دیا جو اس کے پاس سازش کا منصوبہ لے کر آئے تھے۔ لارنس نے ان لوگوں کو دربار عام سے انعام دینے کا فیصلہ کیا۔ یہ دربار 12/ مئی کو منعقد کیا گیا۔ اس میں اس اسٹیشن کے سبھی خاص ملٹری اور سول افسران' کینٹ کے سبھی مقامی کمیشنڈ افسران اور دو بڑے کمیشن افسران اور ہر رجمنٹ سے چھ سپاہی شامل ہوئے۔ سر ہنری نے ان لوگوں کو انعام دینے سے پہلے' جنھوں نے کھل کر اپنی وفاداری دکھائی تھی' خطاب بھی کیا۔ اس نے اپنے سامعین کو یاد دلایا کہ برٹش حکومت ان کے لئے کتنی زیادہ مہربان تھی۔ اس نے اس کا مقابلہ اورنگ زیب کے ہندوؤں کے تئیں رویے اور رنجیت سنگھ کا مسلمانوں کے تئیں رویے کا ذکر کرتے ہوئے یہ بتایا کہ برٹش حکومت بغیر کسی تفریق مذہب و ملت سب کے ساتھ انصاف کا سلوک کرتی ہے۔ اس نے کہا کہ "سو سال کی تاریخ ان لوگوں کے جھوٹ کی نقاب کشائی کر دے گی جو آج انہیں یہ کہہ کر فریب دینے کی کوشش کر رہے ہیں کہ برٹش حکومت ان کی ذات اور مذہب کے خلاف ہے۔ اس نے بنگال آرمی کی شاندار روایت کا ذکر کرتے ہوئے لوگوں سے کہا کہ وہ ان کی نیک نامی پر بٹہ نہ لگائیں۔" اس طرح سے اس نے لوگوں کے جذبات سے کھیلتے ہوئے انہیں یاد دلایا کہ برٹش حکومت ان کی کتنی محسن ہے۔ اس نے اس موقعے پر انگلینڈ کے وسائل اور ذرائع کا بھی تفصیلی ذکر کیا۔

جلسۂ عام میں اس خطاب سے سپاہی کافی متاثر ہوئے' لیکن سر ہنری کی اپیل کا ہر شخص پر ایک ہی جیسا اثر نہیں ہوا۔ کچھ نے اس کی تقریر کی تعریف کی اور کچھ نے یہ سمجھا کہ خوف کے مارے وہ اس طرح کی تقریر کر رہا ہے۔ پھر بھی یہ افسوس کی بات ہے کہ سر ہنری لارنس کو اپنے اس خطاب کے رائگاں جانے کا احساس نہیں ہوا۔ اس کے علاوہ اور کوئی دوسرا شخص بہتر طور پر نہیں جانتا تھا کہ سپاہی کس قدر ناکامی کے شکار ہیں۔ اس نے خود ہی گورنر جنرل کو کچھ دنوں پہلے لکھا تھا۔ "سپاہی یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہمارا کام ان کے بغیر نہیں چل سکتا اور اس کے باوجود جوانہیں زیادہ سے زیادہ تنخواہ 50/60/70 سال کی عمر میں مل سکتی ہے' وہ ایک سال میں سو پونڈ نہیں کماپاتا اور نہ اس کے لڑکوں کے لئے بھی کوئی شاندار کیریر نہیں رہ جاتا۔ یقیناً ان فوجیوں کے لئے ان کی لمبی خدمات اور وفاداری کے لئے یہ کوئی مراعات نہیں ہیں اور نہ ہی انہیں کوئی لبھانے والی چیز۔" اس کا خیال تھا کہ "ہمارے فوج کے بے شمار کارندوں سے جوش و عزم کے ساتھ خدمت کی توقع کرنا فضول بات ہوگی۔ کیونکہ ہمارے اکثر آدمی ان کی خدمات کی گرد تک نہیں پہنچتے تاہم ہمیں اس بات پر فخر ہے

کہ ساری طاقت اور سارے بھتے صرف ہمارے لئے ہیں۔" اور اس لئے جب سر ہنری نے خطاب کرتے ہوئے ہندو اور مسلم حکمرانوں کے مذہبی کٹر پن کا ذکر کر رہا تھا تو انہیں برٹش حکومت کے خود اپنے اور مقامی افسران کے ساتھ کی جانے والی تفریق یاد آ گئی۔ اگر ان میں کچھ آزادانہ طور پر مذہبی عبادات کو سوائے اپنے پسند نہیں کرتے تھے، تو بھی وہ غیر مذہبی لوگوں کو تحسین کی نگاہ سے نہ دیکھتے۔ مسلم حکمرانوں کے دور میں بہت سے ہندو فوج کے اعلیٰ عہدوں پر پہنچے اور لاہور کے سکھ حکمراں کی حکومت میں بہت سے غیر ملکی بھی اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوئے۔ لیکن اس کرسچین حکومت کے دور میں کوئی بھی ہندوستانی بھروسہ کے اس مرتبہ پر نہیں پہنچ سکتا تھا جو لاہور کے دربار میں فقیر بھائیوں کو تھا۔ اودھ کی مسلم حکومت جو ابھی ختم کی گئی تھی، اس میں بھی بہت سے ہندو اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ اس لئے سر ہنری لارنس کے اس خطاب سے ہر شخص مطمئن نہیں ہو سکا۔ یہی وجہ تھی کہ جن وفادار لوگوں کو 12 / مئی کو انعام دیا گیا ان میں سے کچھ لوگ بعد میں باغیوں کے ساتھ ہو گئے۔ لیکن اس کی کوشش ان سارے وفادار لوگوں کو اپنے ساتھ ملا سکنے میں، ناکام نہیں ہوئی کیوں کہ لکھنؤ کی حفاظت میں ہندوستانی فوجوں نے یورپین فوجوں کا بھرپور ساتھ دیا۔ یہ بھی اس کا سیاسی تدبر تھا کہ اس نے سبھی فوجی پنشن یافتہ لوگوں کا لکھنؤ میں اجتماع کیا۔ وہ اب ان پرانے لوگوں پر بھروسہ کرنا چاہتا تھا اور انہوں نے بھی یہ ثابت کر دیا کہ اس کا یہ اعتماد بے جا نہیں تھا۔

14 / مئی کو میرٹھ کی بغاوت کی خبریں لکھنؤ پہنچیں۔ اس کے بعد دلی۔ ان خبروں کو سنتے ہی سر ہنری نے اودھ کے معاملات کے لئے اور زیادہ اختیارات کی مانگ کی جو انہیں مل گئی۔ انہیں ترقی دے کر ان کارینک بریگیڈیر کا کر دیا گیا۔ اس طرح وہ فوج اور سول انتظامیہ کے سربراہ بن گئے۔ فوجیں چاروں طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ انفنٹری کی تین رجمنٹ موریاؤں کینٹ جو لکھنؤ سے چند میل کے فاصلے پر تھا، اور کیویلری مدکی پور میں تعینات تھی، لیکن سر ہنری جانتے تھے کہ ان ساری پوسٹوں پر چند یورپین اور مقامی سپاہیوں کی مدد سے زیادہ دیر قبضہ میں نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ وہ اب بھی کینٹ میں ہی رہ رہے تھے اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ شہر میں دو جگہوں سے وہ اپنے فوجیوں کی تعداد بڑھا کر اپنی حفاظت کا سامان کریں گے۔ پہلا تو مچھی بھون جو ایک قلعہ نما محل تھا اور دوسرا اس کی اپنی رہائش گاہ ریزیڈنسی۔ ان دونوں جگہوں کو فوجیں تعینات کر کے مضبوط کیا گیا اور ضروری اشیاء جمع کی گئیں۔ اور عورتوں اور بچوں کو کینٹ سے ہٹانے کا حکم دیا گیا۔ ریزیڈنسی کا انتخاب جو ان کی آخری پناہ گاہ ہوتی، کی لارڈ کلائیڈ اور سر ہنری ہیولاک نے نکتہ چینی کی۔ ہیولاک کا خیال تھا کہ سر ہنری لکھنؤ کو اس کے مقدر پر چھوڑ کر اپنی افواج کے ساتھ کانپور منتقل ہو جانا چاہیے لیکن اتنی بڑی تعداد میں عورتوں اور بچوں کے ساتھ لکھنؤ سے منتقلی آسان کام نہیں تھا اور خود لارڈ کلائیڈ کا خیال ہے کہ رات کے وقت اتنی بڑی تعداد میں انخلا کے لئے بہت زیادہ فوج کی ضرورت ہوتی۔ سیاسی طور پر بھی اودھ کے دارالسلطنت کو خالی کرنا فاش غلطی ہوتی۔ اس سے مقامی لوگوں کا برٹش افواج میں اعتماد متزلزل ہو جاتا اور باغیوں کو اور زیادہ موقع مل جاتا۔ سر ہنری

نے ابھی تک ہندوستانیوں کے تعاون کی امید نہیں چھوڑی تھی۔ بلکہ وہ فوج میں نئے لوگوں کی بھرتی کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ برٹش عزم کی اس علامت کو چھوڑ نہیں سکتا تھا۔

جنرل میکلیڈ انس جو ریزیڈنسی کی پوسٹ کا انچارج تھا' وہ اسے موزوں ترین جگہ سمجھتا تھا۔ "صرف ایک کمی کہ خندق کی گولائی میں آس پاس کی مٹی کو پختہ کیا جانا باقی تھا' کے علاوہ' یہ جگہ ہر لحاظ سے موزوں ہے اور اس میں زیادہ مکانیت اور کھلی ہوئی جگہ بھی موجود تھی۔ صحت کے لئے بہت مفید اور پانی کی بھی فراہمی وافر تھی۔ اس کا آدھا حصہ ندی کے بالکل سامنے تھا اور اس کے آس پاس کی اونچی عمارتوں کو گرایا جاسکتا تھا۔ اس کی دیواریں بھی محافظت کے لئے مناسب تھیں اور جہاں بیٹری بھی قائم کی جاسکتی تھی۔ یہ پہلے ہی سے ان کی پوسٹنگ میں سے ایک تھا جو ایک دوسرے سے ملحق تھے اور گومتی کے شمال سے آنے والی افواج کے لئے یہ ریلیف کا بھی کام کرتی۔" جیسا جنرل انس نے بتایا ہے اس کے علاوہ کوئی اور متبادل جگہ نہیں تھی۔

سر ہنری صرف اپنے دفاع کی تیاری ہی نہیں کر رہے تھے' وہ جانتے تھے کہ خوف سے اور زیادہ خوف پیدا ہوگا۔ اور اعتماد سے اعتماد بحال ہوگا۔ یہ ان کی بڑی غلطی ہوتی اگر وہ نازک گھڑیوں کے لئے تیاری نہ کرتے۔ لیکن اس کے لئے بھی ضروری تھا کہ لوگوں کے اندر یہ احساس پیدا نہ ہو کہ وہ پریشان ہیں۔ اپنی طاقت کے مظاہرے سے وہ ہونے والے واقعات کو ٹال تو نہیں سکتا تھا لیکن انہیں کچھ دنوں کے لئے روک سکتا تھا۔ کانپور سے کچھ فوجی کمک اودھ پہنچی اور کیپٹن فلیدر ہیز کو اودھ کی کچھ فوج کے ساتھ کانپور بھیجا گیا۔ ہیز بحفاظت تمام کانپور پہنچا لیکن اس کا یہ خیال کہ آگے بڑھ کر دیہی علاقوں میں جانے سے راستہ صاف رہے گا' غلط ثابت ہوا کیونکہ اس کے آدمیوں نے بعد میں مین پوری کے نزدیک بغاوت کر دی۔ اور وہ خود مارا گیا۔ اس کا ایک ساتھی کانپور لوٹا۔ لیکن اس کا بھی وہاں کے محصور لوگوں جیسا حشر ہوا۔ کیپٹن ویسٹن کے تحت فوج کی ایک ٹکڑی ملیح آباد بھیجی گئی جہاں بے چینی کے کچھ اثرات پائے جارہے تھے۔ اور ایک دوسری ٹکڑی کیپٹن کے ماتحت کانپور بھیجی گئی۔

اس دوران موریاؤں کی یورپین افواج ہر وقت چوکنا رہتیں۔ کیونکہ بغاوت کی افواہیں تھوڑی تھوڑی دیر پر پھیلتی رہتیں۔ آخر کار ۳۰ مئی کو رات میں نو بجے سپاہیوں نے مسلح بغاوت کر دی۔ کچھ جانیں ضرور گئیں' لیکن کوئی خاص جنگ نہیں ہوئی۔ 13 ویں اور 71 ویں این آئی کے وفادار فوجیوں نے 32 ویں رجمنٹ کے یورپین افواج کا ساتھ دیا۔ 13 ویں گارڈ کی ایک ٹکڑی کینٹ میں سر ہنری کے مکان کی حفاظت کر رہی تھی۔ شہر کو جانے والی سڑکوں پر رکاوٹ ڈال دی گئی تھی۔ اس لئے باغی اس سمت میں نہیں جاسکتے تھے۔ دوسرے دن صبح لائن کے سامنے سپاہیوں پر حملہ کیا گیا' لیکن بغیر کسی مزاحمت کے وہ تتر بتر ہوگئے۔ غیر یقینی صورت حال کا خاتمہ ہو چکا تھا اور اب یہ اچھی طرح معلوم ہو گیا تھا کہ دوست کون ہے اور دشمن کون؟ شہر میں ہونے والی بغاوت کو پولیس کی مدد سے آسانی سے کچل دیا گیا کچھ مقامی رجمنٹ اب بھی خاموش تھے۔ قیدیوں کا کورٹ

مارشل کیا گیا اور ان میں سے بہتوں کو پھانسی لگادی گئی۔ مچھی بھون کے سامنے پھانسی گھر بنایا گیا اور 18 نمبر کا پاؤنڈر وہاں رکھا گیا تاکہ مستقبل میں پریشان کرنے والے لوگ خوفزدہ ہو جائیں۔ ان نازک حالات میں سخت اقدامات کی ضرورت تھی اور جو سپاہی بغاوت کرتے ہوئے پکڑے گئے انہیں سخت سزائیں بھی ملیں۔ پھر باغی دلی کی طرف کوچ کر گئے۔

لیکن اس باغی رجمنٹ کے باقی وفادار لوگوں کے ساتھ کیا کیا جائے؟ ان میں سے کچھ نے 30 مئی کی بغاوت میں حصہ لیا تھا اور اپنے پرانے ساتھیوں کے ساتھ اپنے کو جوڑ لیا تھا۔ جبکہ کچھ دوسرے اپنی اپنی تعینات جگہوں پر کھڑے رہے۔ مارٹن گوبنس جو فائنانشیل کمشنر تھے کا کہنا تھا کہ ان سب سے اسلحہ لے لیا جائے۔ اسی طرح کچھ ٹکڑیوں کے بارے میں ناموافق رپورٹوں سے بھی یورپین آبادی میں بے چینی پھیل گئی تھی اور ہندوستانی فوجیوں کی اعدادی فوقیت کی وجہ سے سفید فام لوگ اقلیت میں ان کے رحم وکرم پر منحصر تھے۔ اس لئے گوبنس انہیں اپنی طاقت کی جگہ اپنی کمزوری کی علامت سمجھ رہا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ سر ہنری لارنس اس سے متفق ہونے والے ہی تھے کہ دوسروں نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ ضروری اقدامات کو کچھ دیر کے لئے ملتوی کردیں۔ سر ہنری کمزور آدمی نہیں تھا۔ اس نے تمام پرانے پنشن یافتہ لوگوں کو بلا لیا۔ اس نازک گھڑی میں وفادار سپاہیوں کو اپنے سے جدا بھی نہیں کر سکتا تھا، جنھوں نے ہر قدم پر اپنی وفاداری کا ثبوت دیا۔ گوبنس لکھتا ہے۔ "اس یقین کے بہت سے جواز تھے۔ بلکہ یہ بات یقینی تھی کہ ہمارے پاس جو بارہ سو سبرے اور بیونٹ ہمیشہ موجود رہتے ہیں، ان کا استعمال ہماری مخالفت میں کیا جائے گا کہ اس وقت جو لوگ اسے استعمال کرتے ہیں جب ہمیں اپنے دشمن کے ساتھ لڑتے ہوئے دیکھیں گے۔ اس لئے اگر انہیں غیر مسلح کر دیا جائے تو یہ خطرہ ٹل جائے گا۔ ان میں سے جو بہت زیادہ وفادار پائے جائیں گے، انہیں بعد میں مسلح کر دیا جائے گا۔" یہ نہیں کہا جا سکتا کہ گوبنس کے اندیشے بے بنیاد تھے۔ چنہٹ کو چھوڑ کر بہت سے افراد بھاگ گئے۔ تاہم ریزیڈنسی کی حفاظت کے لئے پانچ سو ہندوستانی فوجی موجود تھے اور یہ بات بھی مشتبہ ہے جیسا کہ گوبنس نے مشورہ دیا تھا کہ اپنی بے عزتی کے بعد بھی ان کی وفاداری بنی رہتی۔ اگر اپنی وفاداری ترک کیے بغیر انہیں ہٹا دیا جاتا تو یورپین افواج کے لئے اور زیادہ باعث نقصان ہوتا۔ اگر گوبنس کی رائے پر عمل کیا گیا ہوتا تو لکھنؤ کا حشر بھی کانپور جیسا ہوتا۔ محاصرہ کی گئی ریزیڈنسی میں موجود ہندوستانی فوجیوں کو سر ہنری کی موت کے بعد شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔ لیکن کرنل انگلس جس نے ان کی جگہ سنبھالی، وہ ان لوگوں کی خدمات کو آسانی سے ختم نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ لکھنؤ کی حفاظت ان کے بغیر ممکن نہیں۔ طبی مشوروں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے سر ہنری نے اپنی رخصت ختم کر کے پھر سے چارج لیا جب انہیں معلوم ہوا کہ گوبنس ہندوستانی فوجیوں سے لکھنؤ کو خالی کرانے پر بضد ہے۔

یہ بغاوت صرف لکھنؤ تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ اودھ کے دیگر علاقوں میں بھی پھیل

گئی۔ لیکن ان کے منصوبوں میں نہ تو کوئی تنظیم تھی اور نہ ہی اس کے لئے کوئی خاص کوشش کی گئی۔ ہر رجمنٹ اپنا طریقہ اپناتی اور بعض معاملات میں افسروں کی ذرا بھی غلطی شبہ کو خوف میں بدل کر رجمنٹ کو کھلم کھلا بغاوت پر آمادہ کر دیتی۔

اودھ کا صوبہ انتظامی امور کے لئے چار ڈویژن اور بارہ ضلعوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ 3/ جون کو سیتاپور میں جو خیر آباد ڈویژن کا ہیڈ کوارٹر تھا' یہ بد نظمی پھیلی۔ یہاں کا کمشنر جے۔جی کرسچین پختہ ارادے کا آدمی تھا۔ اس لئے اسے احکام کا تابع بنانا مشکل تھا۔ وہ فائنانشیل کمشنر مارٹن گوبنس سے اختلافات رکھتا تھا۔ اس کی ایک زمانے سے چلی آرہی زمینداری کی روایت کو ختم کرنا پسند نہیں آیا تھا۔ ان کے اپنے ڈویژن کے بارے میں اقدامات بجا تھے لیکن اس نے محسوس کیا کہ وہ زمیندار جن کے ساتھ یہ نیا بندوبست لاگو کیا گیا تھا' وہ محروم کیے گئے تعلقداروں سے بہت قریب آگئے ہیں۔ سیتاپور میں 41 ویں این آئی اور اودھ کی ریگولر کی دو رجمنٹ تعینات تھیں۔ 30/ مئی تک کرسچین کو یقین تھا کہ وہ ارریگولرس پر اعتماد کر سکتا ہے اور اس لئے اس کے ڈویژن میں پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ دراصل 41 ویں این آئی نے لکھنؤ کے باغیوں کو کچلنے کے لئے جان کی بازی لگادی تھی اور جب وہ دلّی کے لئے آگے بڑھ رہے تھے تو ان کے عقب سے ان پر گولیاں چلائی تھیں۔ انہوں نے ان کے ساتھ دوستی یا بھائی چارے کے کسی ارادے کا اظہار نہیں کیا تھا۔ حفظ ماتقدم کے طور پر کرسچین نے سبھی یورپین خواتین اور بچوں کو جو اس کے اسٹیشن پر مقیم تھے انہیں اپنے بنگلے میں بلالیا۔ ویسے تو دفاعی اعتبار سے یہ محفوظ جگہ تھی لیکن ایمرجنسی کے حالات میں یہاں سے نکل بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ کمشنر کے بنگلے میں سفید فام لوگوں کے اجتماع کو ارریگولر کے لوگوں نے اپنے اندر اعتماد کی کمی سمجھا اور ایک مقامی افسر نے کمشنر آفس کے سپرنٹنڈنٹ سے کہا کہ وہ ان پر یقین رکھیں۔ 2/ جون کو اس اسٹیشن پر تھوڑی بد نظمی اس افواہ کے ساتھ پھیلی کہ کوتوالی نے فوج کے استعمال کے لئے جو آٹا بھیجا ہے' اس میں ملاوٹ ہے اور سپاہیوں نے ضد کی کہ یہ مشتبہ اجناس گلی میں پھینک دیا جائے۔ آٹے کو ندی میں پھینک دیا گیا' تب بھی سپاہی خاموش نہیں ہوئے۔ دوسرے دن بغاوت پھیل گئی۔ کرنل برچ جو 41 ویں این آئی کی کمانڈ کر رہے تھے' انہیں گولی مار دی گئی۔ اودھ ارریگولر نے بھی 41 ویں این آئی کے ساتھ دوستی کرلی۔ کرسچین نے اپنے خاندان اور بنگلے کے دوسرے لوگوں کے ساتھ بھاگنے کی کوشش کی۔ لیکن دو چار کو چھوڑ کر باقی سب مار دیئے گئے۔ مسلح پولیس نے نہ صرف اپنے کمانڈر کیپٹن ہیر سے کی جان بچائی بلکہ اس کی درخواست پر ان دو عورتوں کو بھی بچالائے جو پاس کے جنگل میں چھپی ہوئی تھیں۔ بعد میں انہیں سیتاپور سے کچھ دور بھیج دیا گیا۔

فیض آباد کی کہانی اس سے کچھ مختلف ہے۔ فروری کے مہینے میں ایک انجان شخص' جسے بعد میں فیض آباد کا مولوی کہا گیا' شہر میں وارد ہوا۔ یہ کوئی نہیں جانتا کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے۔ اسے کبھی احمد علی' اور سکندر شاہ کے نام سے مختلف ناموں سے پکارا جاتا۔ ایک بیان کے

مطابق مدراس وہ پریزیڈنسی کے رہنے والے تھے۔ وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ اپنے مسلح ساتھیوں کے ساتھ سفر کرتے۔ ان کے شاگرد پورے ملک میں پھیلے ہوئے تھے۔ وہ کھلم کھلا فرنگیوں کے خلاف جہاد کرنے کا نعرہ دیتے اور شعلہ انگیز تقریروں سے لوگوں کو جہاد کے لئے اکساتے۔ پولیس نے زور زبردستی کر کے انہیں اور ان کے ساتھیوں کو غیر مسلح کر دیا۔ جب انہوں نے اپنے اسلحے سپرد کرنے سے انکار کر دیا اور چونکہ ان کے لئے سول قید خانہ محفوظ نہیں سمجھا گیا اس لئے انہیں فوج کی قید میں رکھا گیا۔ جب بغاوت پھیلی تو وہ قیدی تھے۔

فیض آباد کی بغاوت الہ آباد کی بغاوت کی طرح بنارس میں فوجیوں کو غیر مسلح کیے جانے کی خبر سے پیدا ہوئی۔ یہ کہا گیا تھا کہ بنارس کے مقامی فوجیوں کو پہلے تو غیر مسلح کیا گیا بعد میں آرٹیلری اور یورپین انفینٹری نے ان سب کو شہید کر دیا۔ فیض آباد میں سپاہیوں نے خزانے پر قبضہ کر لیا اور یورپین افسروں سے کہا کہ وہ خاموشی کے ساتھ یہاں سے چلے جائیں۔ انہوں نے انہیں کشتیاں بھی فراہم کیں اور پیسہ بھی دیا اور اپنے ساتھ اسلحے اور دیگر املاک جو لے جانا چاہا لے جانے دیا گیا۔ کیویلری اس پُر امن انخلا کے حق میں نہیں تھی۔ لیکن انفینٹری اپنے ارادے میں سخت تھی۔ جانے والوں کی حفاظت کی مکمل گارنٹی دی گئی۔ ان میں سے دو ناؤ کو اعظم گڑھ کی 17 ویں این آئی نے بیرام گھاٹ پر روک دیا اور بہت سے مسافر بشمول کرنل گولڈ نے جو کمشنر تھے 'مار دیئے گئے۔ یہ کہا گیا کہ فیض آباد کی 22 ویں این آئی نے جان بوجھ کر 17 ویں کو یورپین کے جانے کی اطلاع دی تھی۔ اگر ان کا مقصد اس طرح کی سازش ہی ہوتی تو وہ پوری پارٹی کو قتل کر سکتے تھے۔ جب کشتیاں اجودھیا میں گھنٹوں پھنسی رہیں۔

مقامی امراء اب بھی انگریزوں کے دوست بنے ہوئے تھے اور فیض آباد کے بہت سی عورتوں اور بچوں کو شاہ گنج کے قلعے میں پناہ دی گئی جو راجہ مان سنگھ کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ جبکہ کرنل لیناکس اور اس کے خاندان والوں کو گورکھپور کے سابق ناظم محمد حسن نے پناہ دی۔ مان سنگھ کا تعلق نہ تو پرانے امراء سے تھا اور نہ ہی یہ راجپوت تھا۔ وہ ذات سے برہمن تھا اور اس کے باپ اور چچا نے موقع سے فائدہ اٹھا کر جائداد بنالی۔ لیکن اس جائداد پر قبضے کے بعد مان سنگھ پر بہت سی رقم کی ادائیگی رہ گئی۔ اب یہ شبہ کیا جا رہا تھا کہ واجد علی شاہ کے وزیر علی نقی خاں کے ساتھ اس کی دوستی ہے۔ اسے حفظ ماتقدم کے طور پر قید کر لیا گیا تھا۔ لیکن بغاوت شروع ہونے سے پہلے چھوڑ دیا گیا۔ اس نے اپنے قلعے میں بچوں اور عورتوں کو محفوظ رکھنے کی پیش کش کی لیکن مردوں کے داخلے پر پابندی لگا دی۔ کیونکہ ان کی وجہ سے باغیوں کو اس کی بھنک مل جاتی۔ لیکن وہ غیر معینہ مدت کے لئے ان لوگوں کو اپنے یہاں محفوظ رکھنے کی ہمت نہیں کر سکا۔ اور اس نے انہیں بذریعہ ندی دانا پور بھیج دیا۔ راستے میں بیر ہار کے بابو مادھو پرساد اور گوپال پور کے راجا نے ان سے دوستی کر لی۔ ناظم محمد حسن بھی اپنے مہمانوں کی حفاظت کو لے کر پریشان تھے۔ انہوں نے گورکھپور کے کلکٹر سے رابطہ قائم کیا اور گھوڑ سواروں کی پناہ میں کرنل لیناکس اور ان کے لوگ گورکھپور پہنچ

گئے۔ بعد میں مادھو پرساد اور محمد حسن بھی باغیوں سے مل گئے۔

فیض آباد کے دوسرے تعلقداروں نے بھی اپنی روایتی راجپوت بہادری کے سبب کافی نام کمایا۔ دیارا کے رستم شاہ نے سلطانپور کے بھگوڑوں کو اپنی پناہ میں رکھا۔ جب انگریزوں نے قبضہ کر لیا تو بندوبست افسروں کی بدولت اسے بہت زیادہ نقصان کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ ان زیادتیوں کو بھول نہیں سکا۔ لیکن اس کی پرانی بہادری کی روایت نے اسے بدلہ لینے سے باز رکھا۔ کیونکہ یہ اس کی عزت کا سوال تھا کہ وہ اپنے بد سے بدتر دشمن کو بھی پناہ دے۔ اسی طرح دھاروپور کے لالہ ہنومنت سنگھ جن کی زمینداری بھی ختم ہوگئی تھی' نے سلون کے ڈپٹی کمشنر کیپٹن برو کی اپیل کو قبول کر لیا۔ یہاں بھی باغی قتل و غارت گری نہیں کر سکے۔ انہوں نے برٹش افسروں کے حکم کو ماننے سے انکار کر دیا اور ان سے وہاں سے جانے کے لئے کہا۔ ہنومنت سنگھ اسٹیشن سے باہر ان بھگوڑوں سے ملا اور انہیں اپنے قلعے میں لے آیا۔ پندرہ دنوں کے بعد وہ اپنے مہمانوں کے ساتھ گنگا کے ساحل پر آیا جب بارو نے یہ خواہش ظاہر کی کہ بغاوت کچلنے میں راجا ان کی مدد کریں۔ اس نے جواب دیا "صاحب آپ کے ملک کے لوگ اس ملک میں گھس آئے اور ہمارے راجہ کو بھگا دیا۔ آپ نے اپنے افسروں کو ضلعوں میں بھیجا کہ وہ جائدادوں کا پتہ کریں۔ ایک قلم سے آپ نے مجھ سے وہ ساری زمینیں چھین لیں جو ایک زمانے سے میرے خاندان میں چلی آرہی تھیں۔ میں نے قبول کر لیا۔ اچانک آپ پر بدبختی آگئی۔ یہاں کے لوگ آپ کے خلاف کھڑے ہوگئے۔ آپ میرے پاس آئے جسے آپ نے برباد کر دیا تھا۔ میں نے آپ کو بچا لیا۔ لیکن اب میں اپنے سپاہیوں کے لیڈر کی حیثیت سے لکھنؤ جا رہا ہوں تاکہ آپ کو اپنے ملک سے بھگا سکوں۔" تاہم اس راجپوت نے اپنے نئے آقاؤں سے جنگ نہیں کی۔

بہرائچ کے کمشنر چارلس ونگ فیلڈ نے بدنظمی کی بو سونگھتے ہی اپنی جگہ چھوڑ دی۔ بعد میں وہ چیف کمشنر کے عہدے پر بھی پہنچے۔ مئی 1857ء میں وہ سرکاری ہیڈ کوارٹر پر موجود نہیں تھے بلکہ سکرورا کے فوجی اسٹیشن پر تھے۔ اس اسٹیشن پر کوئی یورپین فوجی نہیں تھا۔ صرف گھوڑسواروں کا اِرریگولر دستہ انفینٹری اور اِرریگولر ہارس آرٹیلری کے ایک ایک دستے سکرورا میں موجود تھے۔ خواتین اور بچوں کو بحفاظت لکھنؤ پہنچا دیا گیا تھا' اس لئے افسران کو ان کی طرف سے کوئی پریشانی لاحق نہیں تھی۔ دوسری جگہوں کی طرح فوجیوں پر بغاوت کے ارادے کا شبہ کیا جا رہا تھا۔ لیکن اِنفینٹری کے آرٹیلری کے ساتھ تعلقات خراب تھے۔ یورپین سرجنٹ سے کہا گیا کہ وہ سپاہیوں کی حرکات پر نگاہ رکھیں اور کوئی چیز مشتبہ نظر آتی ہے تو انہیں فوراً اطلاع دیں۔ 8/جون کی رات میں ایک سرجنٹ نے محسوس کیا کہ انفینٹری لائنس میں غیر معمولی حرکت نظر آرہی ہے' فوراً ہی بیٹری کو لایا گیا اور بیرکس کے بالمقابل کھڑا کر دیا گیا۔ جسے بعد میں ہٹا دیا گیا کیونکہ رپورٹ کی تصدیق کے لئے کوئی واقعہ نہیں ہوا۔ دوسرے دن صبح سپاہیوں نے شکایت کی کہ ان کے افسران انہیں سوتے ہوئے قتل کرنا چاہتے تھے۔ اور صرف آرٹیلری کے ان کے دوستوں نے انہیں بچا لیا۔ انفینٹری

اور آرٹیلری کے درمیان پرانی غلط فہمی کو بھلادیا گیا۔ اور انہوں نے مانگ کی کہ کیپٹن بوئیلیو فوراً پریڈ کا حکم دیں اور انہیں اسلحہ تقسیم کریں۔ بوئیلیو نے خاموشی سے یہ حکم مان لیا۔ اور ونگ فیلڈ برٹش افسروں کو اطلاع دیئے بغیر گونڈہ چلے گئے۔ بعد میں سپاہیوں نے ضد کی کہ ان کی ایک کمپنی بیرام گھاٹ بھیجی جائے تاکہ ان کے افسر ندی کو پار نہ کرسکیں۔ کیپٹن بوئیلیو نے ان کی بات پھر مان لی۔ لیکن چونکہ یہ سپاہی بڑھتے جارہے تھے اور ان پر شبہ ہوگیا تھا' سوائے ایک کے باقی سارے افسر سکروراسے گونڈا چلے گئے۔ لیفٹیننٹ بونہم جو آرٹلری کا انچارج تھا وہ پوسٹ پر اکیلا افسر بچا تھا۔ فوجیوں نے اس سے کہا کہ وہ کمان سنبھالے۔ اور وہ اس شرط پر راضی ہوگیا کہ اس کے ساتھ سبھی لکھنؤ کے لئے کوچ کریں گے۔ سپاہیوں نے پہلے تو اس کے ساتھ چلنے پر رضامندی ظاہر کی لیکن حالات بگڑتے گئے اور انہوں نے بونہم سے چلے جانے کے لئے کہا۔ اسے مشورہ دیا گیا کہ وہ خاص سڑک سے نہ جائے۔ وہ حفاظت کے ساتھ لکھنؤ پہنچ گیا۔

ونگ فیلڈ زیادہ عرصے تک گونڈہ میں نہیں رکے۔ انہوں نے اپنے رفیقوں کے ساتھ بلرام پور کے راجہ کے یہاں پناہ لی۔ ڈاکٹر برٹرم جوان کے رفیقوں میں سے ایک تھا' نے بعد میں اپنی بیوی کو لکھا" ایسا لگتا تھا جیسے فوجی اچانک ہمارے ہمدرد ہوگئے ہیں۔ بہتوں نے راستے میں ہمارا ساتھ دیا۔ کچھ نے آنسو بہائے۔ مقامی افسروں نے انہیں سلام کیا۔ لیکن ان میں سے کوئی یہ نہیں چاہتا تھا کہ ہم وہاں رکیں۔ بلکہ صبح کے وقت حولدار میجر نے ہمیں ایک خط دکھایا جو سکرورا سے موصول ہوا تھا۔ جس میں رجمنٹ کے لوگوں سے کہا گیا تھا کہ وہ افسروں اور خزانے کو روک لیں۔ اس لئے یہ ہمارا آخری چانس تھا۔" اب یہ تجزیہ کرنا بے کار ہوگا کہ اگر ونگ فیلڈ نے اپنے فوجی سپاہیوں پر بھروسہ کیا ہوتا تو بہرائچ کو بچایا جاسکتا تھا اور یہ بھی کہ نصف شب کے وقت اگر غلطی نہیں ہوتی تو وہ فوجی وفادار رہتے۔ ایک دوسرے پر شبہ اور اعتماد نہ کرنے کا جو ماحول بنا ہوا تھا اس میں سر ہنری لارنس کی اس تنبیہ پر غور کرنا یا عمل کرنا مشکل تھا کہ "جب تک ہم مقامی لوگوں کو اور مقامی فوجیوں کو یہ نہیں سمجھیں گے کہ ان کے اندر بھی یہی احساس' یہی خواہش اور اپنی صلاحیتوں کا اور اپنی بے خوفیوں کا مظاہرہ کرنے کا وہی جذبہ پایا جاتا ہے جو ہمارے اندر ہے ہم کبھی محفوظ نہیں رہیں گے۔" جون کے وسط تک پورے اودھ کے صوبے میں برٹش نظام ختم ہوگیا تھا۔ لیکن لکھنؤ شہر اب بھی بچا ہوا تھا۔ اور دور دراز کے آنے والے بھگوڑے اس شہر میں پناہ کے لئے جمع ہوتے رہے۔

بغاوت شروع ہوتے ہی سر ہنری نے اپنا ہیڈ کوارٹر کینٹ سے ریزیڈنسی تبدیل کرلیا تھا۔ اس کی صحت بھی اچھی نہیں تھی۔ صرف اچانک ذمہ داری کے احساس نے اسے اودھ آنے کے لئے مجبور کیا۔ ورنہ اسے طویل عرصہ تک آرام کی ضرورت تھی۔ ہر طرح کے خطرے سے نپٹنے اور سبھی انتظامی امور کو پورا کرنے کے لئے اس نے 4/جون کو گورنر جنرل کو تار دیا۔ "موجودہ حالات میں اگر مجھے کچھ ہوتا ہے تو میں سفارش کروں گا کہ میری جگہ پر میجر بنکس کو چیف کمشنر بنایا

جائے اور کرنل انگلس کو فوج کی کمان دی جائے، جب تک کہ حالات بہتر نہ ہو جائیں۔ اب اس وقت سینئر ٹی وغیرہ جیسی رسمیات کو دیکھنے کا وقت نہیں ہے۔ یہ دونوں بالکل مناسب شخص ہیں بلکہ ان عہدوں کے لئے یہی دونوں ہی موزوں ہیں۔ میرے سکریٹری بھی میرے خیال سے متفق ہیں۔" اس کے مشیران نے اسے آرام کرنے کے لئے مجبور کیا۔ اور اس کی جگہ پر پانچ ممبروں کی عبوری کونسل بنائی گئی۔ جس میں مارٹو گوبنس فائنانشل کمشنر، مسٹر اومانی جوڈیشل کمشنر، میجر بنکس، کرنل انگلس اور میجر اینڈرسن چیف انجینئر شامل کئے گئے۔ جس کا چیرمین گوبنس ہوا۔ اس نے فوراً ہی اپنا پسندیدہ منصوبہ پیش کیا کہ جو باقی رجمنٹ ہیں، انہیں فوری طور پر غیر مسلح کر دیا جائے۔ کسی طور پر غیر مسلح کئے جانے کی بے عزتی سے تو وہ بچ گئے لیکن ان سبھوں کو قلیل مدتی رخصت پر گھر بھیج دیا گیا۔ اس کی پالیسی کے خلاف عمل کئے جانے کی وجہ سے ہنری لارنس فوراً ہی اپنے دفتر میں واپس آ گیا۔ اس نے عبوری کونسل کو برخاست کیا۔ اپنی ڈیوٹی سنبھالی اور رجمنٹ کے جن سپاہیوں کو گھر بھیجا گیا تھا، انہیں واپس بلایا گیا۔ ان میں سے بہت سے واپس آئے اور گھیراؤ کے دوران اپنے آقاؤں کے ساتھ وفاداری سے جمے رہے۔

30 اور 31/ مئی کو اس شورش کو دبا دیا گیا۔ 31/ تاریخ کو پولیس نے مذہبی امور کو لے کر پیدا ہونے والی بغاوت کو کچل دیا۔ لیکن دس دنوں بعد انہوں نے پھر بغاوت کر دی۔ سر ہنری اس اس سے لاتعلق ہو کر اپنے حفاظتی انتظام میں لگے رہے۔ یہ فیصلہ کیا گیا کہ آخری تدبیر کے حساب سے مچھی بھون اور کینٹ کو چھوڑ دیا جائے۔ اور پوری فوج ریزیڈنسی پر جمع کر دی جائے۔ اس لئے اس کے شمال اور جنوب میں بیٹریاں تعمیر کی گئیں۔ لمبے صنوبر کے درخت بے رحمی کے ساتھ کاٹے گئے، خندقیں خالی کی گئیں، سینے تک انہیں اونچا کیا گیا۔ پرانی دیواروں کی مرمت کی گئی اور نئے منارے بنائے گئے۔ اور کوٹھریوں کو بارود رکھنے کے قابل بنایا گیا۔ فوجی اسٹور اور رسد وغیرہ کو خاموشی کے ساتھ مچھی بھون سے ریزیڈنسی منتقل کیا گیا۔ ہر طرح کی حفاظت کو درکنار کر سر ہنری نے ساری ذمہ داری اور ہر کام کی نگرانی اپنے ذمہ لے لی۔ "اکثر وہ بھیس بدل کر باہر نکل جاتا اور شہر کے بھیڑ والے علاقے میں چلا جاتا تاکہ خود یہ دیکھ سکے کہ اس کے احکامات کی تکمیل کس حد تک ہو رہی ہے۔ کئی بار وہ بیلی گارڈ کے گیٹ پر لگی ہوئی بندوقوں سے بچ کے نکل جاتا۔ اور آرٹلری میں چلا جاتا، سونے کے لئے نہیں بلکہ خاموشی کے ساتھ مزید منصوبہ بنانے کے لئے۔

لکھنؤ کے برٹش عوام کے لئے یہ خوش قسمتی کی بات رہی کہ سر ہنری کو جون کے مہینے میں ساری تیاریاں کرنے کا وافر موقع مل گیا۔ اودھ کے سول اور ملٹری اسٹیشن ایک کے بعد ایک گر رہے تھے۔ ان جگہوں پر بھی جہاں فساد برپا کرنے کے لئے فوجی نہیں تھے۔ اس لئے سول حکام کو اطلاع دی گئی کہ وہ وقت سے پہلے ان جگہوں کو خالی کر دیں۔ لیکن لکھنؤ اکیلے بچا ہوا تھا۔ سر ہنری جانتے تھے کہ یہاں بھی ایسا ہی معاملہ ہونے والا ہے لیکن جتنی دیر میں وہ ہو، اتنا ہی ان کو زیادہ موقع ملے گا کہ وہ اس سے کامیابی کے ساتھ نپٹ سکیں۔ اسے جنرل ویلر کی شکست کی خبر مل چکی

تھی۔ اور اس نے بجاطور پر یہ اندازہ لگایا تھا کہ باغیوں کا دوسرا نشانہ لکھنؤ ہی ہوگا۔ 28/ تاریخ کو وہ شہر سے بیس میل دور نواب گنج میں تھے۔ سرہنری نے فوراً ہی اپنی ساری فوجیں کینٹ سے ہٹا کر ریزیڈنسی مچھی بھون میں بلالیں۔

اب کیا کیا جائے؟ کیا خندق میں چھپ کر دشمن کے آنے کا انتظار کیا جائے یا شہر سے باہر کسی خاص جگہ پر ان پر حملہ کرنے سے اچھے نتائج نکلیں گے۔ ایک فیصلہ کن حملہ سے اسے دوہرا فائدہ ملے گا۔ ایک تو دشمن دل شکستہ ہو جائیں گے' دوسرے خود اس کے اپنے فوجیوں میں نیا اعتماد اور نئی امید جاگے گی۔ اس سے عوام کے بے چین ذہن کو بھی سکون ملے گا۔ اس لئے سرہنری نے فیصلہ کیا کہ بڑھ کر حملہ کرنا بہتر ہوگا لیکن چنہٹ میں اس کی فوجوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اس نے اس بات کو مد نظر نہیں رکھا تھا کہ اودھ کے بندوقچی اس سے الگ ہو جائیں گے اور مقامی کیویلری بزدلی کا شکار ہو جائے گی۔ سرہنری لارنس کو دشمن کی فوج کی طاقت کے بارے میں صحیح اطلاع نہیں دی گئی تھی۔ اس لئے اسے بھاری نقصان کا سامنا کرنا پڑا۔ پسپائی کے دوران' ایک عینی گواہ کا کہنا ہے "ہر قدم پر لوگ گر رہے تھے اور جون کی گرمی زیادہ لوگوں کو مار رہی تھی بہ نسبت دشمنوں کے۔ صرف ایک فیصلہ کن دن میں 32 ویں کے تین افسر اور ایک سو سولہ آدمی برٹش ناکامی کی کہانی سنانے کے لئے بچ گئے تھے۔"

اس شکست سے بڑے پیمانے پر انتشار پیدا ہو گیا۔ ریزیڈنسی میں بھی انتشار پھیل چکا تھا۔ عورتیں اور بچے ہر طرف سے ریزیڈینٹ کے مکان کی طرف بھاگ رہے تھے۔ اپنی جائیداد اور املاک کو چھوڑ کر ہر شخص صرف اپنی زندگی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ مرد اپنے ہاتھوں میں اسلحہ لے کر خندق میں بھاگ رہے تھے۔ فاتح لوگ بھی اس موقع سے فائدہ اٹھانے میں چوک گئے۔ اگر وہ پسپا ہوتے ہوئے دشمن کے ساتھ ہی آگے بڑھتے تو شاید انہیں خندق میں محصور پوزیشن میں جگہ بنانے میں آسانی ہوتی۔ لیکن جو وقت ملا وہ ایک طرح سے گیریسن کو خدائی عطیہ تھا اور اب کوئی راستہ نہیں رہ گیا تھا سوائے اس کے کہ ایک لمبی لڑائی لڑی جائے اور عرصے تک انہیں حصار میں رکھا جائے۔

کچھ بیٹریاں ابھی تک نامکمل تھیں اور مزدوروں کو رات دن کام کرنا پڑا۔ ان کی مزدوری بھی بہت زیادہ بڑھ گئی تھی اور چنہٹ کی شکست کے بعد ان کی کریڈٹ ختم ہو گئی تھی۔ جون کے پہلے ہفتے میں سرکاری سیکوریٹیز کو 40 فی صد رعایت پر بیچنا پڑا۔ اور دوسرے مہینے کے شروع میں اس میں 35 فی صد کی اور گراوٹ آگئی۔ ایک غیر تربیت یافتہ مزدور کی مزدوری دو آنہ یومیہ تھی۔ لیکن مارٹن گوبنس کو ہر رات کے لئے ہر اس شخص کو جوان کے لئے کام کرنے آتا دو روپے یومیہ دینا پڑا۔ پھر بھی عام مزدور اس سے زیادہ فائدہ نہیں اٹھاسکے۔ گھریلو نوکر' جھاڑو دینے والے' گھاس کاٹنے والے اور صفائی کرنے والے' مزدوری کی اونچی شرحوں پر کام کرنے آئے لیکن جیسے ہی محاصرہ شروع ہوا وہ بھاگنے لگے۔ یورپین کے لئے سائبان کافی نہیں تھا اس لئے وہ اور ان کے نوکر

بھی دھوپ میں جلنے لگے۔ اس ساری دشواریوں کے باوجود بہت سے نوکر محاصرے کے دوران اپنے آقاؤں کے ساتھ رہے۔ یہی وقت تھا جب مدراس سے آنے والے عیسائی نوکر کافی مقبول ہوگئے۔اس سے پہلے انہیں صرف وہی لوگ نوکر رکھتے جو انگلینڈ سے تازہ وارد ہوتے۔ کیونکہ وہ تھوڑی بہت انگریزی جانتے تھے۔ لیکن ان کی پینے کی عادت کی وجہ سے لوگ انہیں پسند نہیں کرتے'اس لئے جنوبی ہندوستانی عیسائیوں کے مقابلے میں شمالی ہند کے مسلم اور ہندوؤں کو اولیت دی جاتی۔ لیکن جنگ کے دوران جنوبی ہندوالوں نے اپنے مالکان کے ساتھ رکنے میں اپنے کو زیادہ محفوظ خیال کیا کیونکہ ان کے گھر بہت دور تھے جب کہ شمالی ہند کے نوکر اپنے گاؤں کو بھاگ گئے۔

ادھر ادھر پھرنے والے جانور بھی پریشانی کا باعث بن گئے۔ ان کو چرانے والا کوئی نہیں تھا۔ اس لئے وہ غذا کی تلاش میں ادھر ادھر گھومنے لگے۔ان میں سے کچھ تو کنویں میں گر گئے اور پانی کو زہریلا کردیا۔ کچھ دوسرے گولیوں سے مارے گئے اور انہوں نے فضا کو زہریلا بنادیا۔

ایسی پارٹیاں بنانی پڑیں جو سڑتی لاشوں کی بدبو سے بچانے کے لئے انہیں کہیں دور پھینک آئیں۔ سارے گھوڑوں کو بھگانا پڑا۔ سرہنری نے چارے کا کافی انتظام کر رکھا تھا۔ چونکہ توپ ڈھونے والے بیلوں کا گوشت لوگوں کو مل جاتا۔ کچھ گائے اور بکریاں بھی لوگوں نے پال رکھی تھیں تاکہ بچوں کو دودھ مل جائے'لیکن ان کی تعداد کم تھی۔ چنانچہ ایک بچہ دودھ کی کمی کی وجہ سے مرگیا۔ بعد کے مہینوں میں کھانے کی راشننگ کی گئی تو مسز انگلس کی ایک بکری کو بھوکے سپاہی مار کر کھاگئے۔

ہر خاندان کے لئے اپنا چولھا چوکا الگ قائم کرنا ناممکن ہوگیا تھا۔ سبھی مرد جنگ میں مصروف تھے اور کبھی کبھی ہی انہیں بیوی بچوں سے ملنے کا موقع ملتا۔ بچے اور عورتیں سبھی تہہ خانوں میں رکھے گئے تھے۔ کیونکہ یہی جگہ گولیوں سے بچنے کی سب سے محفوظ ترین تھی۔ ہر مکان میں کافی لوگ جمع تھے اور جب ہیضے اور چیچک کی بیماری پھیلی تو مریضوں کو الگ کرنا ناممکن ہوگیا۔ بہت سے خاندانوں نے ریزیڈنسی میں پناہ لی اور دوسرے ڈاکٹر فریز اور مارٹن گوبنس کی میزبانی میں چلے گئے۔ گوبنس نے اپنے یہاں ذاتی طور پر اناج اور دوسری اشیاء کا ذخیرہ کر رکھا تھا' محاصرہ شروع ہونے سے پہلے اُس کے ذخیرے میں پانچ سو من گیہوں' سو من چنا' 30 من دال اور بہت بڑی مقدار میں گھی اور چاول' 5 من چینی اور کم سے کم ایک من تمباکو جمع تھی۔ ان کے علاوہ اس میں بہت بڑی مقدار میں کوئلہ لکڑی بھی جمع کر رکھی تھی۔ غرض گوبنس کے مکان میں ضروری اشیا کی کمی نہیں تھی تاہم حفظ ماتقدم کے طور پر اس نے اپنے یہاں بھی راشننگ شروع کردی۔ اس کے پاس بیئر کی بھی بہت بڑی مقدار تھی جو صرف بیمار عورتوں کے کام آتی۔ اور شراب کا استعمال بہت کم ہوتا۔ اس کے باوجود گوبنس کا کہنا ہے کہ ہم نے تین وقت کے بجائے دو وقت کا کھانا کردیا تھا۔ محاصرہ شروع ہونے کے بعد بیلوں کا گوشت اور آٹا یا چاول اور نمک یورپین کو مقررہ مقدار میں دی جاتی تھی۔ یہ ہمارے خادم کو دی جاتی وہ انہیں پکاتا اور کھانوں میں ذخیرے کے حساب

سے مسالہ' دال اور چینی وغیرہ بھی مل جاتی۔ محاصرے کے دوران ہمارے گیریسن میں جو لنچ دیا جاتا وہ صرف چپاتیاں ہوتیں۔ اور رات کے کھانے پر ایک گلاس شیری یا شیمپین جنٹلمین کو دیئے جاتے اور اس سے کم خواتین کو۔ ڈبل روٹی وغیرہ اب تعیش کا سامان ہو گیا تھا کیوں کہ کوئی سینکنے والا موجود نہیں تھا۔ گوبنس کے پاس کچھ مرغیاں وغیرہ بھی تھیں اور اس کے ایک مہمان کے پاس دو گائیں تھیں' اس لئے اس کے مکان پر چائے دودھ اور چینی کے ساتھ اور چاول کی پڈنگ ڈنر کے وقت مل جاتی۔ جہاں نوکر بھاگ گئے تھے وہاں عورتوں کو بہت زیادہ گھریلو ذمہ داریاں نبھانی پڑتیں۔ جو خود سے اپنا کھانا بناتے' انہیں اور مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا۔ کیونکہ انہیں شروع میں صرف بارہ اونس گوشت ملتا۔ اگست میں ان کا راشن آدھا کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ انہیں اپنا ایندھن خود تلاش کرنا پڑتا' خود آگ جلانی پڑتی اور اپنا کھانا خود پکانا پڑتا۔

جو لوگ حصار بند ہوئے تھے ان میں ہر طرح کے لوگ تھے' کچھ سول سرونٹس' کلرک تاجر اور دوسرے پیشوں کے لوگ۔ ان میں سے ہر شخص کو اسلحہ اٹھانا پڑتا۔ جتنے یورپین تھے وہ سب کے سب جزیرۂ برطانیہ سے نہیں آئے تھے۔ کچھ فرانسیسی سیاح بھی تھے۔ ان میں سے ایک ڈپرت بھی تھا جو ہندوستان آنے سے پہلے ایک پیشہ ور فوجی تھا۔ وہ ایک اچھے خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور فرانسیسی فوج کے ساتھ الجزائر میں کام کر چکا تھا۔ ریس کا کہنا ہے نانا اور عظیم اللہ نے اپریل 1857ء میں لکھنؤ کی اپنی مختصر آمد کے دوران اس سے ملاقات کی تھی۔ ویلر کی شکست کے بعد نانا نے اس فرانسیسی سپاہی کو اپنی فوج کی کمان دینے کی پیش کش کی۔ وہ اس کے لئے خاصی رعایتیں بھی دے رہے تھے۔ لیکن ڈپرت نے ان باتوں کو نہیں سنا۔ اس کی تجارتی مہم سے اسے کچھ دولت حاصل ہوئی لیکن اس کے شراب کے ذخیرے کو محاصرے کے دوران تیس سپاہی لے کر بھاگ گئے۔ اس نے گوبنس کی بیٹری میں آرٹلری افسر کی حیثیت سے کام کیا تھا۔ ایک خوش مزاج شخص جو مذہب کا مذاق اڑاتا' اس لئے جب ایک گولی لگنے سے اس کی موت ہوئی تو رومن کیتھولک پادری نے عیسائی طریقے پر اسے دفنانے سے انکار کر دیا۔

ایک دوسرے فرانسیسی مسٹر جافری اور ایک اٹیلین باسوٹیلی بھی اس کمپنی میں تھے۔ وہ لکھنؤ کے رہنے والے نہیں تھے۔ لیکن بغاوت کے دوران پکڑے گئے تھے۔ باسوٹیلی کے اندر حسِ مزاح بہت زیادہ تھا اور وہ اپنے گیریسن میں بہت زیادہ مقبول بھی تھا۔ جب ایک نوجوان اداکار کو یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ رات کے وقت چوکی پر آئے افسر کو کیسے سلامی دے تو باسوٹیلی نے اسے مشورہ دیا "کوئی بات نہیں تم بس تھوڑا سا شور مچا دو۔ رات کے اندھیرے میں تمہیں کون دیکھ رہا ہے۔" ایک سپاہی کی حیثیت سے وہ ہمیشہ اپنی ڈیوٹی پر موجود رہتا۔ ایک بار گولی چلنے سے اس کا ٹرنک ہوا میں اڑ گیا۔ اور وہ خود اپنا مذاق اڑا کر ہنسنے لگا۔ جافری' اینڈرنس کی چوکی پر تعینات تھا اور اکثر محاصرہ کرنے والوں سے خوش گپیوں میں مشغول ہو جاتا۔ ان سے مختلف ایک دوسرا کردار شمط کا تھا جس کے دادا تو جرمن تھے لیکن یہ خود ہندوستان میں پیدا ہوا تھا۔ وہ بہت تیز مزاج اور غصہ ور شخص

تھااور اکثر ضابطہ شکنی کی وجہ سے اسے کوڑے لگائے جاتے۔

جو لوگ محصور کئے گئے تھے ان میں کچھ اعلیٰ حیثیت کے ہندوستانی بھی تھے جنہیں حفظ ماتقدم کے طور پر قید کرلیا گیا تھا۔ان میں سب سے بلند شخصیت مصطفےٰ علی خاں کی تھی جو واجد علی شاہ کے بڑے بھائی تھے۔ انہیں گدی سے ان کے والد نے صرف اس لئے محروم کردیا تھا کہ وہ کمزور دماغ کے آدمی سمجھے جاتے تھے۔ برٹش حکومت کو بھی ان کی کمزور دماغی کی وجہ سے قید کرنے کا بہانہ مل گیا۔ کیونکہ یہ شبہ کیا جارہا تھا کہ وہ بہت جلد ہی سازشیوں کے ہاتھ کا کھلونا بن جائیں گے۔ دلّی سلطنت کے دو شہزادے مرزا محمد ہمایوں اور مرزا محمد شکوہ بھی لکھنؤ دربار سے وابستہ تھے' انہیں بھی قید کرلیا گیا۔ کیونکہ باغی دلّی اور اودھ سے ان کے تعلقات کی بنا پر سیاسی فائدہ اٹھالیتے۔اس کے علاوہ اودھ کے تخت کے خاص دعویدار نواب رکن الدولہ بھی تھے جو اس صوبے کے سابق حکمران سعادت علی خاں کے بیٹے تھے ان مسلم قیدیوں کے ساتھ ایک بڑا ہندو تعلقدار تلسی پور کا راجا بھی قید تھا۔ ترائی کے علاقہ میں اس کی بہت بڑی تعداد تھی اور یہ شبہ کیا جارہا تھا کہ اس نے اپنے باپ کو مارا ہے۔ان سیاسی قیدیوں کو مچھی بھون میں رکھا گیا تھااور ان میں سے آخرالذکر دو قیدی لکھنؤ چھوڑنے تک زندہ نہیں رہے۔

محاصرہ شروع ہونے کے بعد خفیہ محکمے کی از سر نو تنظیم از حد ضروری ہو گئی تھی۔ کیونکہ باہر کی دنیا سے سارا ربط یکسر منقطع ہو گیا تھا۔ میجر گال نے بھیس بدل کر الہ آباد جانے کی پیش کش کی لیکن وہ پکڑ لیا گیااور مار دیا گیا۔ گوبنس خفیہ محکمہ کا انچارج تھااور اس کے پاس بہت زیادہ وفادار اور معتبر خبر رساں بھی موجود تھے۔ لیکن سپاہیوں کے درمیان سے ہو کر گزرنا آسان نہیں تھا۔ اور محاصرہ کی گئی چوکیوں میں داخل ہونا یا باہر نکلنا اور زیادہ مشکل ہو گیا تھا۔ جب سپاہی اپنی پوری وردی میں اپنی لوہے کی ٹوپی کے نیچے خط چھپا کر باہر نکلتا تو وہ یہی تاثر دیتا کہ وہ بھاگ کر آرہا ہے۔ لیکن اس کا حشر کیا ہوتا اس کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا۔اسی طرح سے ایک بوڑھی عورت کو باہر بھیجا گیا کہ وہ شہر میں موجود دوستوں سے رابطہ قائم کرے لیکن اس کے بارے بھی میں کچھ پتہ نہیں چلا۔اودھن سنگھ جو پہلے اودھ ارریگولر انفینٹری کا سپاہی تھا اسے ایک خبر باہر پہنچانے کی ذمہ داری دی گئی لیکن وہ کوئی جواب نہیں لاسکا۔ لکھنؤ کے اس زمانے کے سب سے جری مخبر انگد تیواری اور قنوجی لال تھے۔ (Angad) انگد ایک پنشن یافتہ فوجی تھااور قنوجی لال ایک عدالت کا معمولی سا ملازم تھا۔ان دونوں نے بڑی بہادری اور جوانمردی کا ثبوت دیااور محاصرہ شدہ گیریسن اور ان کی جگہ لینے والی فوج کے درمیان برابر رابطہ بنائے رکھا۔

ریزیڈنسی شمال کی طرف سے گومتی ندی سے گھرا ہوا تھا۔اس محاذ پر محاصرہ کرنے والوں کو کافی جگہ مل گئی کہ وہ عام حملے کے لئے اپنی فوجوں کو جمع کرسکیں۔ کچھ فاصلے سے وہ اس کی دیواروں پر بھی گولوں سے حملہ کرسکتے تھے۔ جنوب میں کانپور کا محاصرہ اور مغرب کی طرف شہر کا اور بے لی گارڈ ریزیڈنسی کا مشرق کی طرف سے بچاؤ کر رہا تھا۔ ان تین محاذوں سے درمیان میں

پڑنے والی نشیبی عمارتیں اور کھنڈرات بھی دفاع کر رہے تھے تاکہ ان پر آرٹیلری کی گولیاں نہ لگ سکیں اور ان کی وجہ سے کثیر افواج کی آمد و رفت دشوار ہو گئی تھی۔ شمالی مورچے کے وسط میں ریڈن بیٹری نصب کی گئی تھی جب کہ مغربی مورچے کی انس کی چوکی حفاظت کر رہی تھی اور مشرق کی طرف اسپتال کی چوکی تھی۔ اس کے بغل میں ہی بیلی گارڈ تھا۔ اس سے ذرا فاصلے پر جنوبی مشرقی کنارے پر کانپور بیٹری اور اینڈرسن کی چوکی تھی۔ ادھر مغربی کنارے کے جنوبی سرحد پر شہر نظر آرہا تھا جہاں مارٹن گوبنس کا مکان تھا۔ جسے اس نے مضبوط کرنے کے لئے ہر طرح کے حفاظتی انتظامات کر لئے تھے۔ کیونکہ چنہٹ میں اسے شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اور شمالی سرحد پر زیادہ فوجیں جمع نہیں کی جا سکتی تھیں۔ جب کہ جنوبی سرحد زیادہ محفوظ تھی کیونکہ اس کے دونوں کناروں پر اینڈرسن اور گوبنس کی چوکیاں اور کانپور بیٹری تھیں۔ ویرت کا مکان مارٹینیر کہلاتا تھا کیونکہ لا مارٹینیر کے اساتذہ اور طلبہ کو یہیں رکھا گیا تھا۔ بریگیڈ کا میس اور سکھ اسکوائر تھا۔ اس سرحد سے بہت قریب محاصرہ کرنے والے موجود تھے اور سکھ بھگوڑے اکثر ان سے بات چیت بھی کیا کرتے تھے وہ ایک دوسرے سے اتنے نزدیک تھے لیکن اس جگہ پر اور جنوبی محاذ پر پھیلے کھنڈرات کی وجہ سے فوجوں کی آمد و رفت میں دشواری آرہی تھی۔ مشرقی کنارے پر اسپتال اور اینڈرسن کی چوکی کے درمیان ڈاکٹر فریز کا مکان تھا' پوسٹ آفس اور جرمن کی چوکی تھی ساتھ ہی بیلی گارڈ بھی تھا۔ سانڈر اور ساگو کی چوکیاں سامنے کی طرف تھیں۔ شمالی مشرق سرحد بہت اچھی طرح محفوظ تھا۔ مغرب کی طرف گوبنس اور انس کی چوکی کے پاس ہی مذبح اور ریزیڈنسی کے ملازمین کے کوارٹرس' چرچ' قبرستان' اور ایوانس کی بیٹری تھی۔ اس طرح ریزیڈنسی کی ہر طرف سے حفاظت کر لی گئی تھی۔ چار چوکیاں وفادار سپاہیوں کی تھیں۔ اسپتال کی حفاظت 71 ویں اور 48 ویں این آئی کر رہے تھے۔ 13 ویں این آئی کے چارج میں بیلی گارڈ تھا۔ سکھ اسکوائر جو وہاں تعینات سکھ کیویلری اور سکھ انفینٹری کی وجہ سے مشہور تھا وہ جرمن کی چوکی کی حفاظت کر رہے تھے۔ تین چوکیاں یورپین فوجی کی حفاظت میں تھیں۔ باقی ساری اور چوکیوں پر یورپین اور ہندوستانی فوجیں برابر کی تعداد سے تعینات تھیں۔

محاصرہ کرنے والے فوجیوں کی تعداد صحیح طور پر نہیں معلوم۔ انس کا خیال ہے کہ اس میں دو ریگولر این آئی ریجمنٹ آٹھ اودھ مقامی ریجمنٹ' 15 ویں اررگولر اور دو بیٹری اور اودھ تعلقداروں کی تین ریجمنٹ شامل تھیں۔ سرہنری لارنس نے اودھ کے تعلقداروں سے مدد حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ ان میں سب سے طاقتور شاہ گنج کے راجہ مان سنگھ نے مدد کا وعدہ کیا لیکن رام نگر کے ہندو راجہ گربخش محمود آباد کے مسلم حکمراں راجہ نواب علی نے گول مول جواب دیا۔ اور افواج کی کمی کا بہانہ بنایا۔ ان کی فوجوں میں زیادہ تر پاسی تیر انداز تھے۔ ان کا نشانہ بہت اچھا تھا۔ لیکن کھلی لڑائی میں وہ بندوقچیوں اور مسکیٹیرس کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ انہیں زیادہ تر مائنس بچھانے کے کام میں لایا گیا۔ ہو سکتا ہے ان کی وجہ سے جن لوگوں کا محاصرہ کیا گیا تھا انہیں

پریشانی ہوتی۔ لیکن شروع میں دیواروں میں شگاف کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ ریزیڈنسی کے اندر موجود مکانات ہی سپاہیوں کی گولی کے اصل نشانہ تھے۔ ایسا کہا جاتا ہے کہ 15 ویں کیویلری کے ایک افسر برکات احمد سپاہیوں کی فوج کی کمان کر رہے تھے۔ جب کہ تعلقدار کی فوجوں کی کمان خان علی خاں، جو محمود آباد کے راجہ کے لیفٹننٹ تھے کر رہے تھے۔

سر ہنری لارنس نے محسوس کیا کہ اب کہ مچھی بھون کو خالی کر دیا جائے۔ اور گیریسن کو ریزیڈنسی لایا جائے۔ اس اکیلی چوکی کی کمان کرنل پامر کے پاس تھی۔ لیکن یہ یقینی نہیں تھا کہ خبر رساں ان تک پہنچ پائیں گے۔ اس لئے فیصلہ کیا گیا کہ یہ خبر انہیں سیمافور سے پہنچائی جائے۔ ریزیڈنسی کی چھت پر لگی یہ مشین صحیح طور پر کام نہیں کر رہی تھی۔ لیکن کیپٹن فالٹن اور دو افسر تین گھنٹے کی محنت کے بعد خبر بھیجنے میں کامیاب ہوئے۔ "بندوقوں کو اچھی طرح باندھ لو۔ قلعے کو اڑا دو اور آدھی رات کے قریب وہاں سے نکل جاؤ۔" اس حکم پر مکمل طور پر عمل کیا گیا اور اس میں کوئی جانی نقصان بھی نہیں ہوا۔ گرچہ بڑی تعداد میں گولے بارود چھوڑنا پڑا۔ رات میں ایک بجے کے قریب فوجیں اندر داخل ہو گئیں۔ اس سے کچھ ہی گھنٹوں بعد سر ہنری لارنس بری طرح زخمی ہو گئے۔

علی الصبح سر ہنری نے سبھی چوکیوں کا معائنہ کیا۔ اور ہر چیز کی ذاتی طور پر دیکھ بھال کرنے کے بعد وہ ریزیڈنسی میں اپنے کمرے میں لوٹے تاکہ راشن کی تقسیم کے بارے میں حکم نامہ لکھا سکیں۔ اس سے ایک دن پہلے ایک گولہ ان کے کمرے میں پھٹا تھا۔ لیکن اس سے کوئی نقصان نہیں ہوا تھا۔ ان کے اہلکاروں نے ان سے درخواست کی کہ وہ کمرے کو چھوڑ کر کسی اور پناہ گاہ میں چلے جائیں۔ اس نے وعدہ کیا کہ دوسرے دن وہ ایسا ہی کرے گا۔ لیکن اس نے یہ نہیں سوچا تھا کہ کوئی اتنا اچھا نشانے باز بھی ہو سکتا ہے۔ جو اسی جگہ پر دوبارہ گولہ ڈال دے۔ لیکن جو نہیں ہونا تھا وہی ہوا۔ اسی کمرے میں ایک دوسرا گولا پھٹا۔ کیپٹن ولسن زمین سے چپک گئے۔ سر ہنری کا بھتیجہ جو کمرے میں تھا بھاگ کر بچ نکلا۔ ولسن جو دھویں اور گرد کی وجہ سے کچھ دیکھ نہیں پا رہے تھے' نے پکارا "سر ہنری کیا آپ زخمی ہو گئے؟"، "میں مرا۔" کچھ وقفہ کے بعد ایک دھیمی آواز آئی۔ جب سرجن آیا تو سر ہنری نے اس سے پوچھا میں کتنی دیر اور زندہ رہوں گا؟ ڈاکٹر فیرر نے سوچ کر جواب دیا چالیس گھنٹے۔ پھر لارنس کو فیرر کے مکان میں منتقل کیا گیا۔ جہاں 4/ تاریخ کو اس کی موت ہو گئی لیکن اپنی زندگی کی باقی گھڑیوں کو اس نے ضائع نہیں کیا۔ اس دوران اس نے میجر بنکس کو اپنا جانشین مقرر کیا اور دفاع کے بارے میں تفصیلی حکم نامہ جاری کیا۔ اس طرح سر ہنری لارنس آخری لمحے تک اپنی ذمہ داری نبھاتے رہے۔ اس کی موت سے گیریسن پر غم کا بادل چھا گیا لیکن اس کی اپنی خواہش کے مطابق اسے خاموشی سے دفنا دیا گیا۔ لیکن اس کی موت کی خبر کافی دنوں تک پوشیدہ رہی۔

3/ جولائی کو جوڈیشیل کمشنر ایم سی اومانی کے سر میں گولی لگی اور وہ دو دن بعد ختم ہو گیا۔

23/ سالوں تک وہ سول سروس میں رہے اور ان کے بہت سے وہ آدمی بھی ختم ہوگئے جنھیں ایک لمبے عرصے تک چیف کمشنر کا اعتماد حاصل تھا۔ نئے چیف کمشنر میجر بنکس بھی زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہے۔ 21/ جولائی کو جب وہ گوبنس کی چوکی سے اپنے آدمیوں کو لڑتے ہوئے دیکھ رہے تھے تو ان کے سر میں گولی لگی۔ تین ہفتے کے دوران چیف کمشنر کا عہدہ دوبار خالی ہوا۔ سینئرٹی کے حساب سے مارٹن گوبنس کو اس خالی عہدے پر سرفراز ہونا چاہیے تھا۔ لیکن سر ہنری لارنس نے انہیں نامنظور کر دیا تھا۔ اور بریگیڈیر انگلس نے فیصلہ کیا کہ وہ دفاع کی پوری ذمہ داری فوج کے سربراہ کی حیثیت سے اختیار کرلے۔ سول عہدہ اپنے آپ ختم ہوگیا اور گوبنس خود بھی کہتا ہے "سول اختیارات کے استعمال کا یہ کوئی موقع نہیں تھا۔ پورے گیریسن میں مارشل لا لاگو تھا۔ اور محاصرے کے دوران باہر کے مقامی حکمرانوں سے رابطہ قائم کرنے کا کوئی موقع نہیں تھا۔

موت کو ہر طرف شکار مل رہے تھے۔ سیتاپور کی پناہ گزیں مسز ڈورین کو گوبنس کے مکان میں کھڑکی سے آنے والی ایک گولی نے مار گرایا۔ بعد میں اس کھڑکی کو کتابوں کی الماریوں سے بند کر دیا گیا۔ یہ الماریاں مسکٹ بال سے اچھی طرح حفاظت کر رہی تھی۔ لارڈنر کی انسائیکلوپیڈیا کی ایک جلد کے کنارے مسکٹ بال لگا اور اس نے اس جلد سے آدھے اوراق سے گزرنے کے بعد اسے روک دیا اس کی وجہ سے صرف سو یا ایک سو بیس صفحات برباد ہوئے۔ لیکن ہمیشہ دروازے اور ہر راستے کو ان موٹی جلدوں سے محفوظ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ہر طرف موت کا شکار جاری تھا۔ ریس لکھتا ہے: 7/ جولائی تک ہمارے بہت سے لوگ مارے جاچکے تھے اور اوسطاً پندرہ سے بیس آدمی یومیہ مسکٹ بال سے مارے جاتے۔ بہت سی اموات تو ایک باغی افریقن کی وجہ سے ہوئیں، جس کا نشانہ غضب کا تھا اور جو جانس کے مکان سے گولیاں چلاتا تھا۔ ہر روز ڈائرسٹ دوستوں کے نقصان کی تفصیل لکھتا۔ 8/ تاریخ کو میجر فرانسس کی اس وقت موت ہوگئی جب وہ بریگیڈ میس میں خاموشی سے بیٹھا ہوا تھا اور توپ کی گولی اسے لگ گئی۔ اس کے دوسرے دن برائسن کی موت ہوگئی جو یہ سمجھتا تھا کہ ایسی کوئی گولی نہیں بنی ہے جو اسے مار سکے۔ تاہم ایک گولی اس کے سر میں بھی لگ گئی۔ محصور لوگوں کی خوش قسمتی تھی کہ دشمنوں کے پاس اسلحہ بارود کی کمی ہوگئی۔ 10/ جولائی کو ریس نے لکھا: "دشمن کا بارود ختم ہو رہا ہے۔ گرچہ بندوقیں بہت تیزی سے چلائی جارہی ہیں لیکن اب وہ ہم پر گولیوں سے نہیں وار کر رہے ہیں۔ لکڑی کی گولیاں 'لوہے کے ٹکڑے' تانبے کے سکے' یا بیلوں کی سینگ سے مار رہے ہیں۔ تاہم یہ چیزیں بھی کبھی کبھار نشانے پر لگ پاتیں۔ جولائی کے ابتدائی دنوں میں قدرت مہربان ہوگئی اور 5/ '7/ اور 10/ جولائی کو بھاری بارش ہوئی۔ اس کی وجہ سے گندگی دھل گئی اور ماحول میں پھیلی بدبو ختم ہوگئی۔ 7/ جولائی کو بارش سے گیریسن کو بہت بڑا فائدہ ہوا۔ اسپتال کی بیٹری کے سامنے بہت بڑی مقدار میں بھوسا رکھا ہوا تھا۔ کسی بہادر سپاہی نے اس میں آگ لگادی اگر قدرت کی مہربانی نہ ہوتی تو شاید گیریسن کو اس آگ پر قابو پانا ناممکن ہو جاتا۔"

لوگوں پر بعد میں جو مقدمے چلے اور جو گواہیاں پیش ہوئیں اس سے ہمیں ان لوگوں کی تکالیف کا اندازہ ہوتا ہے۔ مسز کیس جس کے شوہر کا انتقال 30/ جون کو ہوا تھا' اپنے بیڈروم کا تذکرہ' جس میں پانچ اور آدمی شریک تھے اس طرح کرتی ہے "مسز انگلس اور اس کے تین بچے کیری اور میں' ہم سب بریگیڈ میس کے کمرے کے قریب بہت چھوٹے سے کمرے میں رہ رہے ہیں...... ہمارے پاس دو صوفے تھے جس میں ایک پر میں سوتی' مسز انگلس کیری اور دونوں چھوٹے بچے فرش پر نیچے چٹائی پر سوتے۔ ہم لوگ' میرا خیال ہے ریزیڈنسی میں دوسروں کے مقابلے زیادہ آرام سے ہیں۔ کیونکہ ہمارا نوکر اور مسز انگلس کا نوکر بھی ہمارے ساتھ ہیں۔ دن اور رات گولیاں چل رہی ہیں۔ جب پہلے دن ہمارا محاصرہ ہوا تو ہمارے کان جو اس طرح کی آوازوں سے نا آشنا تھے' انہیں بہت خوفناک آوازیں لگیں۔ ہم نہیں جان سکے کہ کیا ہو رہا ہے۔ کیونکہ ہر مرد جو مسکٹ اٹھا سکتا تھا' چوکیوں پر تعینات تھا۔ ہمیں کوئی اطلاع نہیں مل سکی۔ اور ہم سوچتے شاید کوئی طوفان آنے والا ہے جس میں ہم مر جائیں گے۔ اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اگر دشمن کمروں میں آگئے تو ہمارا بہت بُرا حشر ہوگا۔ مسز انگلس بیمار تھیں اور بستر پر تھیں۔ چیچک سے رو بصحت ہو رہی تھیں۔ ہم تینوں ہر وقت اس سے دعا مانگتے کیونکہ وہی اکیلے ہمیں بچا سکتا تھا۔"

مسز جرمن تہہ خانے میں ایک کمرے میں تھیں جو چوہوں سے بھرا ہوا تھا۔ 24/ جولائی کو وہ لکھتی ہیں: "کل شام جب میں اسٹور روم میں چائے بنا رہی تھی تو بلی کے قد کا ایک چوہا جسے میں نے پہلی بار دیکھا تھا' اسٹور روم میں دیکھا۔ رات کے وقت تہہ خانہ اتنا بھیانک ہو جاتا تھا کہ ہمیں کافور اور کاغذ اس میں جلانے پڑتے" 29/ تاریخ کو وہ اس لئے سو نہیں سکیں کہ ایک چوہا ان کی گردن پر رینگ گیا تھا۔

عبادت اور دعاؤں سے انہیں کچھ عرصے کے لئے ذہنی سکون ملا۔ لیکن ہر وقت گولیوں کی آتی ہوئی آواز انہیں آنے والی موت کی خبر دیتی۔ یورپین کی روز ہونے والی اموات کی شرح گھٹ کر دس پر آگئی تھی۔ لیکن اب بھی یہ تعداد بہت زیادہ تھی۔ جولائی کے وسط تک سبھی میسوں میں کھانے پینے کا سامان تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ ایندھن بھی ختم ہو چکا تھا۔ مسز انگلس کے خانساماں نے کھانا پکانے کے لئے ایندھن کی کمی کی شکایت کی۔ مسز کیس نے لکھا "اگر حالات اور بدتر ہوتے گئے تو ہمیں اپنی کرسی اور میز کو توڑ کر جلانا پڑے گا۔" مسٹر نیل (ایک شخص جس کی بیوی اور دو بچے جو سرور اسے یہاں آئے تھے اور ہمارے گیٹ کے قریب رہ رہے تھے) انہیں جانگھوں میں گولیاں اس وقت لگیں جب وہ جلانے کے لئے کچھ لکڑیاں اکٹھی کر رہے تھے۔ ایک بار کرنل انگلس کو مخبروں نے جگا کر بتایا کہ دشمن کے چار سو آدمی ہماری خندقوں میں آگئے ہیں۔" خندق میں رہنے والے مرد اور بچے اپنی زندگی سے تنگ آچکے تھے۔ اور اندیشہ پورا ہوتا دیکھ کر کوئی بھی قدم اٹھا سکتے تھے۔ شام کے وقت مسز انگلس مسز کوپر سے ملنے گئیں اور وہاں انہوں نے مسز مارٹن کو بیٹھے دیکھا۔ وہ سب آپس میں صلاح و مشورہ کر رہی تھیں کہ اگر دشمن اندر آگئے تو کیا قدم اٹھانا

بہتر ہو گا۔ اور کیا ان حالات میں جان دینا بہتر ہو گا۔ کیونکہ یہی واحد راستہ رہ جاتا ہے کہ وہ ہر قسم کی ذلت اور رسوائی سے خود کو بچا سکیں۔ کچھ عورتیں تو ہمیشہ اپنے ساتھ زہر کی خوراک اپنے ساتھ رکھتیں۔ کچھ عورتوں کے اندر اعتماد زیادہ تھا اور وہ موت کے لئے تیار ہوتے ہوئے بھی اپنا سب کچھ اس غیبی ہاتھ میں چھوڑنے کے لئے تیار تھیں کیونکہ وہی جانتا ہے کہ ان کے لئے بہتر کیا ہو گا۔ لیکن مردوں میں اعتماد کی کمی تھی۔ کرنل انگلس نے ایک بار آخری لمحے میں ساری عورتوں کو بم سے اڑا دینے کی بات کی۔

ریس کو فوری طور پر لکھنؤ کی شکست کا اندیشہ نہیں تھا۔ لیکن اسے بھی مدد کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی۔ روز اپنے دوستوں اور پڑوسیوں کو گولیوں اور ہیضے سے مرتے دیکھتا۔ اور ایک دن دل شکستہ ہو کر پوچھا ''آخر ہمیں نجات کب ملے گی لوگ کہتے ہیں کہ فوجی آرہے ہیں۔ لیکن کب اور کہاں سے؟ کانپور دشمنوں کے قبضے میں چلا گیا ہے اور ہندوستان کے دوسرے علاقے بھی اسی طرح پریشان ہیں۔ میرا خیال ہے کہ خفیہ طور پر ہمیں جو روز رپورٹیں ملتی ہیں وہ سچ نہیں ہیں کہ ہمیں جلدی ہی چھٹکارا مل جائے گا۔ وہ مزید کمک کی بات کرتے ہیں۔ لیکن کہاں سے؟ شاید تبت کے لاما اپنی بکریوں کی فوج ہی بھیج دیں۔ کانپور میں کوئی فوجی نہیں ہے اور وہ ان کے یہاں آنے کی بات کرتے ہیں۔''

روز شائع ہونے والا خبر نامہ اور ڈرانے والا ہوتا۔ 14/ جولائی کو ریس لکھتا ہے: ''ولٹ شٹرے نام کا ایک کلرک آج ہیضہ سے مر گیا۔ کنڈکٹر بکسٹر جسے 11/ تاریخ کو گولی لگی تھی وہ بھی مر گیا۔ لیفٹیننٹ لسٹر بھی مارا گیا اور بہت سے دوسرے لوگ اپنے آخری آرام گاہ کو چلے گئے۔''
17/ تاریخ کو وہ لکھتا ہے: ''براؤن کو گولی لگی۔ اس کا پیر کاٹ دیا گیا۔ اب وہ مر جائے گا۔ اسے مرنا ہی چاہیے۔ کیونکہ میڈیکل سائنس کا قانون ہے، جس پر گیریسن کے سرجن عمل کرتے ہیں کہ اعضا کاٹنے کے بعد اسی طرح موت آتی ہے جیسے رات کے بعد دن آتا ہے'' زخمی ہونے والوں میں ڈاکٹر برائڈن بھی تھے۔ جلال آباد کے ہیرو تھے۔ لیکن وہ کافی دنوں زندہ رہے۔ اپنے گھر جا کر ریٹائرمنٹ کے بعد ان کی فطری موت ہوئی۔

ریزیڈنسی کے طویل محاصرے کے دوران سپاہیوں کے لیڈروں نے عام حملہ کر کے اس پر قبضہ پانے کی چار بار کوششیں کیں۔ پہلی کوشش 30/ جولائی کو کی گئی۔ جب ریڈن کے نزدیک ایک سرنگ پھٹی لیکن اس سے نہ تو بیٹری کو کوئی نقصان ہوا اور نہ ہی کہیں کوئی شگاف پڑا۔ کیونکہ فاصلے کا غلط اندازہ کیا گیا تھا۔ لیکن سپاہیوں نے اس جگہ پر چوطرفہ حملہ کیا اور وہ صحیح نشانہ لگا کر گولیاں چلاتے۔ یہ بھی شبہ کیا جارہا تھا کہ ان کی آرٹلری کی کمان ایک یورپین افسر کر رہے تھے۔ لیکن دفاع کرنے والے بھی اسی طرح تیار تھے۔ آگے بڑھنے والے سپاہیوں کو گولیوں سے بھون دیا جاتا۔ لیکن ایسے لیڈروں کی کمی نہیں تھی جو ان کی جگہ لے کر تازہ حملہ شروع کر دیتے' یہ جنگ صبح 9/ بجے سے شروع ہو کر شام 4 بجے تک چلی۔ سخت جنگ کے باوجود محاصرہ کرنے والے دل

برداشتہ ہو گئے۔ ان کا نقصان دشمنوں کے مقابلے زیادہ ہوا۔ جب کہ انگریزوں کی طرف سے 25 آدمی مارے گئے یا زخمی ہوئے۔ ان میں سے 15 یورپین تھے۔

اگر اس دن جنگ کا نتیجہ خوش کن تھا تو 22/ کی رات میں اور زیادہ خوش کرنے والی خبر ملی۔ انگد 29/ جون کو کانپور کے لئے روانہ ہوا تھا۔ وہ 22/ جولائی کو لوٹا۔ وہ کوئی تحریری خبر تو نہیں لایا تھا لیکن وہ یہ خبر ضرور لایا کہ نانا پر ہیولاک نے فتح پالی ہے۔ اور امید ہے کہ یہاں بھی جلد ہی راحت مل جائے گی۔ یہ خبر اتنی خوش کن تھی کہ اس پر لوگوں کو یقین نہیں آیا۔ انگد کانپور کے لئے دوبارہ' روانہ ہوا۔ اور اس بار وہ کرنل فریزر ٹائٹلر جو جنرل ہیولاک کی فوج میں کوارٹر ماسٹر جنرل تھا' اس نے لکھا: "آپ کا 22/ کا خط ہمیں موصول ہوا۔ ہماری دو تہائی فوجیں ندی کے اس پار ہیں' اور آٹھ توپیں بھی نشانے پر نصب ہیں۔ باقی جلد ہی بھیجی جائیں گی۔ میں آپ کو آج یا کل میں کوئی خبر بھیجوں گا۔ ہمارے پاس یہاں اتنی فوجیں ہیں کہ جو ہم سے مقابلہ کرے اسے ہم کچل سکتے ہیں۔ آپ شہر میں جس جگہ' جس پوزیشن میں ہیں اس کا نقشہ بنا کر بھیجیں اور وہ راستہ بھی بتائیں جس طرف سے داخل ہوا جا سکتا ہے۔ پانچ چھ دنوں میں ہم آپ کے پاس آجائیں گے۔ آپ دشمن کے عقب میں نشانہ لگائیں اور اگر وہ باہر آتے ہیں تو ہم انہیں ان کا بھرتا بنا دیں گے۔"

اس کے آگے یہ پس نوشتہ "ہم نے نانا کو شکست دے دی ہے جو غائب ہو گیا ہے۔ بھٹور میں اس کے محل کو برباد کر دیا گیا ہے کوئی نہیں جانتا کہ اس کی فوج کہاں غائب ہوئی لیکن غائب ہو گئی۔"

اس خط سے انہیں کافی اطمینان ہوا کیونکہ اب راحت یا فوجی امداد کو ناممکن سمجھا جا رہا تھا اور موت اور بھگوڑوں نے دفاع کرنے والوں کی تعداد کم کر دی تھی' بہت سے سکھ اور 13 ویں این آئی کے 16 آدمی خندق سے بھاگ گئے۔ کرنل ٹائٹلر کے اس خط سے انہیں ایک نئی امید ملی اور ایک نیا ولولہ پیدا ہوا۔ کرنل انگلس نے انگد کو دوسری رات دوبارہ خط کے ساتھ روانہ کیا۔ اس نے لکھا: "اگر آپ کے پاس راکٹ ہوں تو رات آٹھ بجے کے قریب ان میں سے دو تین چھوڑ دیں تاکہ ہمیں اطلاع مل جائے۔ اشارہ ملتے ہی ہم سڑک کے دونوں طرف سے گھوڑوں پر گولیاں برسانا شروع کریں گے۔ مجھے آپ کی فوج کی تعداد کی صحیح اطلاع نہیں ہے۔ اور نہ آپ کو میں یہ مشورہ دے سکتا ہوں کیونکہ اب ہمارے پاس فوجیوں کی تعداد کم ہے کہ دشمن کی فوج کا رخ آپ کی طرف مڑ جائے۔ جب آپ کافی نزدیک آچکے ہوں۔"

بے چین آنکھیں کئی راتوں تک آسمان تکتی رہیں لیکن راکٹ نظر نہیں آئے۔ گیریسن میں پیدا ہوئی ناامیدی کا تذکرہ کرتے ہوئے ریز لکھتا ہے: 27 گزر گئی' کوئی فوج نہیں آئی۔ 28 بھی گزر گئی کوئی مدد نہیں آئی۔ 29/ '30/ ' اور 31/ بھی گزر گئی اور ہماری مدد کے لئے آنے والی کمک کا کوئی پتہ نہیں۔ بہت افسوسناک ہے۔ ہم نے بڑی مشکلوں سے اپنے اندر امید پیدا کی تھی اور ہماری توقعات بہت زیادہ بڑھ گئی تھیں اور ہمیں اتنا بھروسہ ہو گیا تھا کہ باہر سے ہمارے دوست جلد ہی آئیں گے اور دشمنوں کو شکست دیں گے۔ اسی طرح امید کے پورا نہ ہونے پر ناامیدی اور

ناکامی بھی اتنی ہی زیادہ تھی۔ ہمارے دل ٹوٹنے لگے۔ اور امید کی آخری کرن بھی ختم ہوگئی۔ اور ناامیدی نے ہمیں قسمت کے حوالے کر دیا۔ اس لئے زندگی سے ناامید ہو کر مارے جانے سے پہلے خود کو مارنے کی امید لے کر ہمارا وجود ہمارے لئے ایک بوجھ بن گیا۔ اور دوسروں نے ان لوگوں کو حسرت سے دیکھنا شروع کیا۔ جو ہر شام اپنی قبروں میں جا بستے تھے۔ یہ ناامیدی کبھی کبھی اپنے آپ امید کی کرن میں تبدیل ہو جاتی اور اس کے بعد مزید دل شکستگی ہوتی۔"

30/ جولائی کو مسز کیس نے لکھا: "کل چھ بجے کے قریب جب ہم رات کا کھانا کھا رہے تھے تو ہر طرف اچانک خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ دور سے بندوقیں چلنے کی آواز آ رہی تھی اور انگریزوں کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ ہر شخص پاگلوں کی طرح دوڑنے اور چلانے لگا کہ آخر مدد آ گئی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ ہمارے دروازے پر آ گئے ہیں اور اندر داخل ہونا چاہتے ہیں۔ ہم بھی اوروں کی طرح باہر نکلے یہ دیکھنے کے لئے کہ کیا ہے؟ کرنل پامر مسز انگلس کی طرف دوڑے 'اس سے ہاتھ ملایا اور انہیں کمک آنے پر مبارکباد دی۔ اور میں جیسے ہی اس کمرے سے باہر آئی سوچنے لگی جیسے دشمن اندر داخل ہو رہے ہوں۔ خوشی کی یہ لہر زبردست تھی۔ لیکن یہ صرف چند منٹوں تک رہی اور پھر ختم ہوگئی۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ معاملہ کیا تھا۔ صرف ایک بات صاف تھی کہ کمک نہیں آئی۔" لیکن اس کے باوجود گیریسن میں کچھ ایسے پُر امید لوگ بھی تھے جو معمولی سی بات کو بھی اچھا شگون سمجھتے۔ 30/ جولائی کو کیپٹن اینڈرسن اور اس کے دوستوں نے ایک خوبصورت مور دیکھا جو برجیوں پر بیٹھ گیا اور اپنے پر پھیلا دیئے۔ یہ ایک ختم ہوتے کھانے کے سامان میں مزید اضافہ تھا اور کچھ بھوکے لوگوں نے اسے فوراً پکڑنے کے لئے بھیجنا چاہا۔ لیکن اینڈرسن نے اسے اچھا شگون سمجھا اور خاموشی سے اڑنے دیا۔ یہ مور جو اچھی خبر اچھی کا پیامبر سمجھا جاتا ہے' اس کی آمد سے بھی کوئی راحت نہیں ملی۔ لیکن جس آسانی سے اس چڑیا کو چھوڑ دیا گیا اس طرح بہت سے چڑیوں کو آسانی سے نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ "کبھی کبھی چاند جب ریڑ (ارنڈی) کے پتوں پر چمکتا تو ایسا دکھائی دیتا جیسے کوئی پگڑی باندھے ہوئے آدمی ہے اور ہم ان پر فوراً گولیاں چلا دیتے۔"

جولائی کے ختم ہوتے ہوتے اسپتال بھر گیا تھا۔ "نظارہ بہت دلخراش ہوتا۔ ہر زخمی افسر اور سپاہی خون سے لت پت کوچ پر لیٹا نظر آتا۔ اسپتال کے ملازم اور مددگار بہت کم تھے۔ اور اپنی ساری ہمدردیوں کے باوجود وہ سب کو نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اور پھر چادریں کہاں سے آئیں؟ ہمارے پاس ایک دو دھوبی تھے جو بہت زیادہ پیسے لے کر ان کی دھلائی کرتے اور وہ بھی بغیر صابن کے۔" گیریسن کی عورتوں نے اپنی ساری تکلیفوں کے بعد اسپتال کی ذمہ داری اٹھائی اور بیمار اور زخمیوں کو مدد پہنچانے کی ہر کوشش کرنے لگیں۔ ادھر جب کہ محاصرہ کئے گئے لوگ امید و بیم کے دن گزار رہے تھے' ہیولاک بھی خاموش نہیں تھا۔ وہ 17/ جولائی کو کانپور پہنچا۔ 20/ تاریخ کو اس کی فوج کی ایک ٹکڑی ندی پار کر کے اودھ کی طرف اتر گئی تھی۔ 25/ تاریخ تک راستہ صاف ہو گیا تھا۔ اور جنرل خود بھی فوج کے ساتھ شامل ہو گیا تھا۔ 26/ تاریخ کو وہ لکھنؤ شاہراہ پر پانچ میل کے

فاصلے سے منگل وار میں مقیم تھا۔ تین دن بعد اس کے آگے کا راستہ اناؤ میں روک دیا گیا۔ سخت مزاحمت کے بعد اس نے دشمنوں کو ان کے ٹھکانے سے بے دخل کر دیا۔ انہوں نے فاتح فوج کے لئے راستہ تو خالی کر دیا لیکن کچھ ہی فاصلے پر بشیرت گنج میں پھر محاصرہ کر لیا۔ ہیولاک کو دوسری بار فتح ہوئی لیکن اس بار اس کے کافی آدمی مارے گئے۔ اس کا اندازہ دانا پور میں پہلی بغاوت کی وجہ سے پھر غلط ثابت ہوا۔ وہ کلکتہ سے فوری طور پر مزید کمک کی امید نہیں کر سکتا تھا۔ باغیوں نے ہر مناسب مقام پر اسے روکنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ نائٹلر نے باغی فوج کی طاقت اور ارادے کا غلط اندازہ لگایا تھا۔ اور ہیولاک کے پاس بھی اتنی فوج نہیں تھی کہ اپنے سبھی مخالفین کو کچل سکے۔ اسے مجبوراً ایک ایسا فیصلہ کرنا پڑا جس سے اس کی فوج میں ناامیدی پھیل گئی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ منگل وار واپس جائے گا اور وہاں مزید کمک کا انتظار کرے گا۔ جس کے بغیر آگے بڑھنا غلط ہوتا۔ کمانڈر انچیف سے اس نے کہا کہ "بیماری اور لگاتار ہونے والی جھڑپوں سے میری فوج کی تعداد گھٹ کر صرف 1364 آدمی رہ گئے ہیں اور 10 بیکار توپیں ہیں اس لئے بغیر کسی کامیابی کی امید کے میں لکھنؤ کے لئے آگے نہیں بڑھا۔ خاص طور پر جب سئی ندی کو پار کرنے کا کوئی ذریعہ بھی نہیں ہے۔ اس لئے میں نے کانپور کے نزدیک جانا مناسب سمجھا اگر مجھے فوری طور پر ایک ہزار اور برٹش سپاہی اور میجر الفرٹ کی مکمل بیٹری مل جائے تو میں لکھنؤ بڑھنا جاری رکھوں گا اور جلد ہی اودھ پہنچ جاؤں گا۔ کانپور سے گنگا کو کشتیوں اور دو اسٹیمر کے ذریعہ پار کر کے 'یا میں کانپور سے گرینڈ ٹرنک روڈ کے راستے لکھنؤ پہنچوں گا۔"

ہیولاک کی واپسی کے فیصلے کو جنرل نیل جس کی دوسری پوزیشن تھی، نے بدقسمتی سے تعبیر کیا۔ اس نے احتجاج کرتے ہوئے لکھا۔ "مجھے سخت افسوس ہے کہ آپ ایک قدم پیچھے ہٹ گئے اس سے ہماری عزت پر بدنما دھبہ لگا ہے۔...... شہر میں ہر طرح کی افواہیں گرم ہیں کہ آپ اور زیادہ اسلحہ اکٹھا کرنے کے لئے واپس ہوئے ہیں اور جو کچھ آپ کے پاس تھا 'ہار کر آئے ہیں۔ بلکہ ہم سب کو یہ یقین ہو گیا ہے کہ آپ کو شکست ہوئی ہے اور آپ پسپا ہوئے ہیں۔ اس سے بڑی بدبختی کی بات یہ کہ آپ دشمنوں سے جیتے گئے توپوں کو اپنے ساتھ واپس نہیں لائے۔ مقامی لوگوں کو یہ یقین ہی نہیں ہوگا کہ آپ کی ہر جگہ فتح ہوئی ہے۔ آپ کی واپسی کا اثر ہر جگہ ہم پر بہت برا پڑے گا...... آپ کو آگے بڑھنا ہے۔ اور اس وقت تک بڑھنا ہے جب تک آپ لکھنؤ گیریسن کو بچانہ لیں۔" ہیولاک وہ شخص نہیں تھا جو اپنے ماتحت سے 'چاہے وہ کتنا ہی جری کیوں نہ ہو' اس طرح کی باتیں سن کر برداشت کر لیتا۔ اس نے فوراً ہی اسے تنبیہ کرتے ہوئے جواب دیا کہ وہ نہیں چاہتا اور نہ کبھی کوئی مشورہ قبول کرے گا 'اس شخص سے جو اس کے ماتحت ہے۔ "اس بات کو اچھی طرح سمجھ لو" اس نے لکھا "اس لمحے میں پبلک سروس میں پیدا ہوئی دشواری کے خیال سے تمہارے خلاف قید کرنے جیسا سخت قدم نہیں اٹھا رہا ہوں۔"

3/ اگست کو ہیولاک کو ایک چھوٹی سی فوج بطور کمک حاصل ہوئی اور وہ دوسری بار لکھنؤ

بیگم حضرت محل

کے لئے روانہ ہوا۔ باغیوں نے بشیرت گنج پر اس کے واپس مڑتے ہی دوبارہ قبضہ کر لیا تھا اور یہاں اس کو دوبارہ فتح حاصل ہوئی۔ لیکن جلد ہی اس کو معلوم ہو گیا کہ اب بھی لکھنؤ کو چھڑانے کے لئے اس کے پاس اتنی فوج نہیں ہے۔ سوال یہ پیدا ہوا کہ وہ اپنی اس مختصر سی فوج کی قربانی کا خطرہ اٹھائے یا کرنل انگلس کو اس کے حال پر چھوڑ دے۔ اگر اس کی فوج ختم ہو جاتی ہے تو اس سے لکھنؤ کی شکست یقینی ہو جائے گی۔ لیکن اگر وہ انتظار کرے اور فوج کو بچائے رکھے تو باغیوں کی چھوٹی سی غلطی بھی اسے یہ موقع فراہم کر دے گی کہ وہ ان پر پیچھے سے حملہ کر کے فوج کو نکال لے جائے۔ بشیرت گنج میں ہوئی دوسری شکست کے باوجود باغی ابھی اتنے مایوس نہیں ہوئے تھے کہ وہ ہیولاک کو منگل وار آسانی سے واپس جانے دیں۔ اسے بڑھیا کی چوکی پر مزید جنگ کرنی پڑی۔ اس دوران نیل سے اسے اطلاع ملی کہ بھور اور کانپور میں طاقتور باغی فوجیوں سے مزید خطرہ پیدا ہو گیا ہے اور بغیر کسی مدد کے وہ سوائے خندق کو کنٹرول میں رکھنے کے کچھ نہیں کر سکتا۔ "یہاں کے بعد سے الٰہ آباد تک ملک کا ہر حصہ بغاوت پر آمادہ ہو جائے گا۔ اور ہمارے بارود اور اسلحے پر 'اگر اسٹیمر چالو نہیں ہوتے تو دشمنوں کا قبضہ ہو جائے گا اور ہم برے پھنس جائیں گے۔" نیل نے خطرہ ظاہر کیا۔ "اس لئے ہیولاک منگل وار میں انتظار نہیں کر سکتا تھا اور اسے فوراً ہی کانپور واپس ہونا پڑا۔ 13/ اگست کو اس نے گنگا کو پار کیا اور 16/ تاریخ کو بھور کی لڑائی ہوئی۔ ایک بار پھر قابل رہنما کی فتح ہوئی اور ہیولاک ان کی ہمت و شجاعت کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکا۔" اس نے لکھا: "میں انصاف نہیں کر سکتا اگر میں یہ نہ کہوں کہ باغیوں نے جان کی بازی لگا کر جنگ کی اور چاہے زمینی طور پر وہ کتنے بھی فائدے میں رہے ہوں وہ ہمارے گولوں کے سامنے ایک گھنٹہ بھی نہیں ٹک سکتے۔" ہر اس جنگ میں جس میں ہندوستانی اور برٹش فوج لڑی فاتح فوج کو ہمیشہ اچھے قسم کے اسلحوں سے فائدہ ہوا۔ اگر انگلینڈ نے لوگوں کو بغاوت پر آمادہ کیا تو انفیلڈ نے باغیوں کو شکست دینے میں مدد کی۔

اگست کا مہینہ لکھنؤ میں محاصرہ کئے گئے لوگوں کے لئے بہت سخت گزرا۔ ان کی ساری امیدیں ختم ہو گئی تھیں اور ناامیدی نے انہیں اس حد تک بزدل کر دیا تھا کہ وہ ہیولاک کی فتوحات کی خبروں پر یقین نہیں کر سکے۔ محاصرہ کرنے والے ہر جگہ بڑے فخر سے یہ بات کہتے کہ انہوں نے ہیولاک کو شکست دے دی ہے۔ 6/ اگست کو اودھن سنگھ جو مخبر تھا ریزیڈنسی واپس آیا لیکن وہ اپنے ساتھ کوئی خط نہیں لایا تھا۔ وہ دوبار جیت کی خبر تو لایا لیکن منگل وار میں فاتح فوج کی واپسی سے وہ اور دل شکستہ ہو گئے۔ ایک دوسرا سپاہی جو شہر گیا ہوا تھا اس نے اودھن سنگھ کی خبر کی تصدیق تو کی لیکن اس کی اس تصدیق سے ان پر خطرہ اور زیادہ بڑھ گیا۔ ہمارے پاس جو رسد ہے وہ اور کتنے دن چلے گا؟ توپ کی گولہ باری سے کمزور ہوئی دیواریں کب تک اور مقابلہ کر سکیں گی؟ روز بروز کم ہوتی فوج خندقوں میں دشمن کے مائنس پر کب تک مقابلہ کر سکتی ہے؟

روز بروز راشن کی مقدار کم ہوتی جاتی۔ ریس نے لکھا "ہمارا شاندار کھانا اب صرف بھوسی

ملی ہوئی روٹی، ماش کی دال اور ایک چٹکی نمک اور ہر دوسرے دن ادھ پکے گوشت کا ایک ٹکڑا جس میں ہڈیاں زیادہ ہوتیں، پر مشتمل تھا۔ اور یہ سب کچھ اس بڑے سیاہ فام خانساماں کے ہاتھوں جو تین چار اور آدمیوں کا کھانا پکاتا ہے اور جسے ہر مہینہ میں بیس روپے دینا پڑتا ہے۔ اس قدر بدبودار ہوتا کہ اسے اچھی نسل کا کتا بھی سونگھ کر چھوڑ دیتا۔ میرا آدھا شکار لوگوں نے قبضہ کرلیا ہے اور اب وہ ایک ایسا تعیش کا سامان رہ گیا ہے جسے میں بہت کم ہی استعمال کرتا تھا۔" 3/اگست کو مسز کیس نے لکھا: "یہ کہا جارہا ہے کہ ہمارا رسد بیس دن سے زیادہ نہیں چلے گا۔ آج کمشنر کا بوچر بھی اجازت لینے آیا تھا کہ کرنل انگلس کی جو تین بکریاں ہیں انہیں کھانے کے لئے ذبح کرنے کی اجازت دی جائے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمارے پاس گوشت بھی ختم ہو گیا ہے۔ چیزوں کی قیمتیں آسمان پر پہنچ گئی ہیں۔ اب چاکلیٹ کا چھوٹا سا ٹکڑا بھی دو پونڈ دس شلنگ کا بک رہا ہے۔

اس محاصرے کی اپنی پریشانیاں تھیں جن میں سے سب سے دردناک واقعہ کی تفصیل دونوں مسز کیس اور لیڈی انگلس نے بیان کی ہے۔ 14/اگست کو ایک باوقار خاتون بریگیڈیر کی اہل خانے سے ملنے آئیں۔ اس کے والد کنٹ (انگلینڈ) میں پادری تھے اور اس کے بہنوئی فوج میں افسر تھے۔ خود اس کے شوہر تعمیرات کے اوورسیئر تھے، انہیں پھیپھڑوں میں گولی لگی اور وہ فوراً ہی ختم ہو گئے۔ محاصرہ کے پہلے ہی دن اس کے یہاں ایک بچہ پیدا ہوا، لیکن رنج و غم کی وجہ سے وہ اس کی کوئی خوشی محسوس نہ کر سکی۔ وہ بچے کے لئے کچھ غذا حاصل کرنے آئی تھی۔ اس کے تین بچے پہلے ہی مر چکے تھے اور وہ اس کو ہر قیمت پر بچانا چاہتی تھی۔ مسز انگلس کے پاس دو دودھ دینے والی بکریاں تھیں۔ اس بیوہ نے ان سے درخواست کی کہ کیا وہ تھوڑا سا دودھ اس کے بچے کے لئے دے سکتی ہے۔ لیکن مسز انگلس کے بچوں کو بھی دودھ کی ضرورت تھی اور اتنا دودھ نہیں تھا کہ ان کو دیا جاسکتا۔ وہ بیوہ محاصرہ کے دوران سارے مصائب جھیل گئی اور سر کولن کیمبل کی مدد سے وہ اپنے گھر چلی گئی۔ لیکن اس کا یہ بچہ نہیں بچ سکا۔ بہت سے نوزائیدہ دودھ اور غذا کی قلت کی وجہ سے مر گئے۔ اور کچھ دوسرے ہیضے اور پیچش کی وجہ سے۔

افیم کی قلت کا اثر غذا کی قلت سے بڑھ کر تھا، اسمگل کی ہوئی افیم کی تجارت زوروں پر چل رہی تھی، اور سکھ اسکوائر میں جو لوگ محاصرے میں تھے، انہیں بہت زیادہ قیمت پر ذرا سی افیم مل جاتی کیونکہ وہ اسے بھگوڑوں سے چور بازاری کے ذریعہ حاصل کر لیتے۔ لیکن ہر نشے کے عادی شخص کے لیے اتنی زیادہ قیمت دینا ممکن نہیں تھا۔ افیم کا عادی ایک شخص جونس بھی تھا، جو بہت صاف رنگ کا انگریز تھا۔ برانڈی کا شوقین لیکن اس سے زیادہ اسے افیم کا چسکا تھا۔ اسے جلد ہی سرجنٹ بنایا گیا تھا۔ یورپین سپاہیوں کو اپنا روز کا راشن ملتا لیکن جونس اور اس کے ساتھیوں کو اس کی یومیہ خوراک کے بغیر گزارا کرنا پڑتا۔ آخر کار اس نے بھاگنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے ساتھ اودھ کی سلطنت کے بہت موسیقار، سارے مقامی عیسائی اور بہت سے نوکر بھی بھاگے۔ لیکن ان میں سے بہت سے خالی ہاتھ نہیں بھاگے۔ انہوں نے کئی جگہوں پر دیواروں پر یہ تحریر کیا "کیونکہ

ہمارے پاس افیم نہیں ہے۔" باہر ان کا کیا حشر ہوا؟ اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم۔ لیکن ریس نے بعد میں سنا۔ ان میں سے سب موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔

11/ اگست کو ریزیڈنسی کا ایک حصہ گر گیا اور 32 ویں کے تقریباً نصف درجن لوگ ملبے میں دب گئے۔ ان میں سے دو کو کسی صورت سے کھود کر نکالا گیا' جن میں سے صرف ایک بچ سکا۔ "وہ' اور جو انہیں کھود کر نکالنے کا کام کر رہے ہیں۔" مسز کیس نے لکھا: "وہ ہر وقت گولیوں کی بوچھار کی زد میں ہیں۔ محاصرہ شروع ہونے کے بعد سے یہ سب سے خطرناک واقعہ ہے جو ہم لوگوں کے ساتھ ہوا۔ اور اب چونکہ ہر شخص کی زندگی ہمارے لیے بہت زیادہ قیمتی ہو گئی ہے اس لیے اتنی جانوں کے نقصان پر مکمل اظہار افسوس بھی نہیں کیا جا سکتا۔" موت اور بھاگنے کی وجہ سے ہونے والے نقصان پر رنج کا اظہار تو کیا جاتا لیکن جو لوگ بچے ہوئے تھے ان کی وفاداری پر شک اور زیادہ باعث فکر تھا۔ مشتبہ لوگوں کو خندق سے بھگایا نہیں جا سکتا تھا۔ لیکن انہیں ان کی حرکات پر نظر رکھے بغیر چھوڑا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ 23/ تاریخ کو ریذیڈنسی کا پچھلا برآمدہ گرا۔ لیکن کوئی نقصان نہیں ہوا۔ 26/ اگست کو مسز انگلس نے اپنے شوہر کو ایک مقامی فوجی کی جانچ کرتے ہوئے پایا کہ اپنے بھائی سپاہیوں کے بارے میں ان کے کیا خیالات ہیں؟ "کیونکہ سکھوں پر شبہ کیا جا رہا تھا۔" وہ لکھتی ہے: "جان نے سبھی حفاظتی تدابیر کر لی تھیں اور انہیں اس طرح سے تعینات کیا تھا کہ وہ سب 32 ویں کمان کی نگاہ میں آ گئے تھے اور اپنی جان کا خطرہ لیے بغیر اپنی چوکیوں سے بھاگ نہیں سکتے تھے۔ پھر بھی یہ سوچ کر طبیعت لرز جاتی ہے کہ خود ہماری اپنی دیواروں کے اندر ہمارے خلاف سازش ہو رہی تھی۔" مسز کیس لکھتی ہے کہ "سکھوں پر صرف اس لیے شبہ کیا جا رہا تھا کہ کسی نے انہیں یہ کہتے ہوئے سن لیا تھا کہ وہ اپنی تنخواہ چاہتے ہیں۔"

6/ اگست کو محاصرہ کرنے والوں نے اپنے دشمنوں کو بہت خوشی کے ساتھ چلا کر یہ خبر سنائی کہ ان کے بادشاہ کی تاجپوشی ہو گئی ہے۔ "ہم نے اپنے بادشاہ کو تاج پہنا دیا ہے۔ فرنگیوں کی حکومت ختم ہو گئی ہے۔ اور ہم جلد ہی آپ کے بیلی گارڈ میں داخل ہو جائیں گے۔" باغی فوجیوں کو اس بات کی شدید ضرورت تھی کہ قانونی طور پر ان کا ایک بادشاہ ہوتا جو سارے اختیارات کا سرچشمہ ہوتا اور جس کے جھنڈے تلے وہ سب اکٹھا ہو سکتے۔ قانونی طور پر جو بادشاہ تھا وہ اب کلکتہ میں قید تھا' اس لیے اس کے ایک نابالغ لڑکے کا انتخاب کرنا پڑا۔ جسے 7/ جولائی کو بطور نواب منتخب کیا گیا اگر جنرل انس کا کہنا صحیح ہے۔ یہ بات اب بھی مشتبہ ہے کہ برجیس قدر نے اودھ کے بادشاہ کا خطاب اختیار کیا کیونکہ اس کے اکثر فرامین میں اس نے اپنے کو ولی ہی کہا ہے۔ ان کے مقید والد نے تو اپنے کو خود مختار اور دلّی سے علیحدہ سلطنت کا اعلان کیا تھا۔ لیکن اودھ کے اس نئے حکمراں کی تاجپوشی کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ وہ اور اس کے مشیر کار بھی دلّی کے احکامات پر عمل کریں گے۔ ذمہ دار سپاہی لیڈران نے آپس میں ملنے کی ضرورت کو محسوس کیا اور صوبے کے اہم محکموں کو ہندو اور مسلمانوں میں برابر سے تقسیم کیا۔ اور کچھ پرانے وزراء کی خدمات بھی حاصل کی

گئیں۔ شرف الدولہ کو وزیر اعظم مقرر کیا گیا لیکن خزانے کا عہدہ مہاراجہ بال کشن کو دیا گیا۔ ممو خاں کو قاضی القضاۃ کا عہدہ دیا گیا۔ اور راجہ جے لال سنگھ وزیر بنے۔ لیکن چنہٹ کے فاتح برکات احمد کے دعووں کو مسترد کر دیا گیا۔ اور ایسے درباریوں کو جنہیں فوج کا کوئی تجربہ نہیں تھا انہیں فوج کا سردار بنایا گیا۔ بیگم حضرت محل' جو اس نابالغ ولی عہد کی ماں تھیں' وہی اس کے عوض سارے اختیارات استعمال کرتیں۔

جنرل انس کا کہنا ہے کہ اس شاہی اختیار کے کچھ دوسرے لوگ بھی دعوے دار تھے۔ احمد اللہ شاہ فیض آباد کے مولوی' وہ اس زمانے میں لکھنؤ میں تھے' ان کی شخصیت اور ان کے پرانے کارناموں کی بدولت انہیں اس باغی حکومت میں ایک اہم عہدہ دیا گیا۔ یہ بات مشتبہ ہے کہ وہ خود لکھنؤ کی سلطنت چاہتے تھے۔ کیونکہ ان کی مہر پر جو عبارت ملتی ہے اس میں وہ اپنے کو خلیفۃ اللہ لکھتے تھے۔ وہ ایسے عہدے کا اپنے کو مالک سمجھتے جس میں دین و دنیا ہر طرح کے اختیارات حاصل تھے اور کسی دنیاوی عہدے کو لے کر وہ قطعی مطمئن نہیں ہوتے۔ برکات احمد اور کیویلری کے دوسرے لوگ شاہان اودھ کے شہزادے سلیمان قدر کے حمایتی تھے۔ اس تاجپوشی سے باغی سپاہیوں کی ہمت میں اور اضافہ ہوا ہوگا۔ اور ان کے اندر نئے سرے سے اعتماد بحال ہوا ہوگا۔

اگر تاجپوشی کی وجہ سے شہر والوں کی ہمت کافی بڑھ گئی تھی تو محاصرہ کیے گئے لوگوں کا یہ مقدر ہو گیا تھا کہ وہ اپنے دوسرے اہم سربراہ کی موت پر رنج کریں۔ وہ پہلے ہی سر ہنری لارنس' مسٹر اومانی اور میجر بنکس پر رو چکے تھے۔ اب چیف انجینئر میجر اینڈرسن کی باری تھی۔ وہ گولی سے تو نہیں لیکن پیچش کے مرض سے مر گئے۔ انہیں یہ مرض تو محاصرے سے پہلے ہی لگ گیا تھا۔ لیکن انہیں اتنی زیادہ محنت کرنی پڑی کہ انہیں ہیڈ کوارٹر چھوڑنے کا کوئی موقع نہیں مل سکا۔ جب وہ انجینئرنگ کے کاموں کی دیکھ بھال کرنے کے قابل نہیں رہے تب انہوں نے اپنی ذمہ داری کیپٹن فلٹون کے سپرد کی۔ میجر اینڈرسن' بہت زیادہ کام' پریشانیوں اور آرام نہ کرنے کے سبب فوت ہو گئے۔

ادھر ہیولاک نے جو دوسری بار پیچھے قدم ہٹایا' اس کی وجہ سے اودھ کے تعلقداروں پر برا اثر پڑا۔ اب وہ ولی عہد کو تعاون دینے پر مجبور ہوئے وہ اور بہت سے لوگوں نے اپنی مال گزاری لکھنؤ بھیج دی۔ یہ بات شبہ سے بالاتر نہیں کہ ان غیر تربیت یافتہ' غیر منظم اور کم ہتھیاروں سے مسلح کسانوں اور پاسی نشانہ بازوں کی ان ٹکڑیوں سے باغیوں کی فوجی قوت میں کوئی اضافہ ہوا یا نہیں' لیکن تعداد کی کثرت سے ان کی ہمت میں ضرور اضافہ ہوا اور یہ بھی کم فائدے کی بات نہیں تھی کیونکہ اب بھی ان کے پاس گولے بارود کی کمی تھی۔ 21/اگست کو ایک گیارہ سال کا بچہ گولیاں بٹورتے ہوئے پکڑا گیا۔ وہ خندق کے اندر لایا گیا اور اس سے جانچ پڑتال کی گئی۔ اس نے کہا: "دشمن ہمارے کچھ اسلحے ریڈن سے چرا کر لائے ہیں۔" اس نے کوئی خاص اطلاع نہیں دی لیکن اس نے یہ ضرور بتایا کہ دشمنوں کی تعداد زیادہ ہے۔ اور ان کا ارادہ ہماری مدد کو آنے والی کمک

سے کھلے میدان میں جنگ کرنے کا ہے' اگست کے مہینے میں محاصرہ کرنے والی فوج کا اندازہ 20 سے 40 ہزار لگایا گیا تھا۔ بعد میں کیپٹن اینڈرسن نے سنا کہ ان کی تعداد ایک لاکھ کے قریب تھی۔

اگست کا مہینہ خاص طور پر سرنگ بچھانے کے کام کا تھا۔ پاسی زمین کھودنے میں ماہر تھے۔ اور زمین بھی کھدائی کے لیے موزوں تھی۔ لیکن اس طرح کا حملہ جولائی سے ہی شروع ہو گیا۔ اس لیے کسی مشتبہ آواز پر خاص طور پر نگرانی رکھی گئی۔ اور سُرنگوں کو ناکارہ کرنے کا کام کیپٹن فلٹون کے سپرد کیا گیا' جو مشتبہ جگہوں پر گھنٹوں انتظار اور تفتیش کا کام کرتے۔ کبھی کبھار دونوں پارٹیوں کے درمیان صرف مٹی کے تودوں کا فاصلہ رہ جاتا۔ ریزیڈنسی کو 10/اگست کو دوبارہ پھر خطرہ لاحق ہوا۔ تقریباً 11 بجے ایک سرنگ مارٹینیر کے نزدیک پھٹی اور اس نے تقریباً پچاس فٹ گڑھا کر دیا۔ پھر ایک دوسری سرنگ، پھٹی۔ کرنل انگلس بڑی مشکل سے اپنی جان بچاسکے' ان کے ساتھ جو دوسرا آدمی تھا مارا گیا۔ ایک دوسری سرنگ مشرق کی طرف پھٹی اور دو یورپین فوجی ہوا میں اڑ گئے۔ لیکن ان کو کوئی چوٹ نہیں آئی۔ ان میں سے ایک تو کمپاؤنڈ کے اندر گرا اور دوسرا باہر جاگرا۔ لیکن وہ فوراً ہی کود کر دیوار پر چڑھ گیا اور محفوظ مقام کی طرف بھاگ گیا۔ باوجود ساری نگرانی کے ایک تیسری سرنگ سکھ اسکوائر کے پاس پھٹی۔ اس سے تقریباً 30 فٹ کا درّہ پھٹ گیا۔ اگر منظم طور پر فوراً ہی ہلّہ بول دیا جاتا تو فوجی اسکوائر کے اندر داخل ہو جاتے لیکن ان کی اس تساہلی کا دفاع کرنے والوں نے فوری طور پر فائدہ اٹھایا اور فوراً ہی ایک نو پونڈ کی توپ وہاں لائی گئی جس نے اس درار کو بھر دیا۔ رات کے وقت کرنل انگلس کی نگرانی میں اس درار پر مکمل طور پر روک لگادی گئی۔

لیکن اگست کا مہینہ محاصرہ کیے گئے لوگوں کے لیے غم کا مہینہ نہیں تھا۔ اگر ہر طرف سے موت ان پر حملہ آور ہو رہی تھی تو انہیں اپنے دوستوں کی طرف سے یہ یقین دہانی بھی ملی کہ انہیں اکیلا نہیں چھوڑا جائے گا۔ انگڈ کو لوٹنے میں کافی تاخیر ہوئی۔ لیکن 15/اگست کو وہ کرنل ٹائٹلر کی طرف سے دوسری اطلاع لایا۔ اس خط پر 4/اگست کی تاریخ پڑی ہوئی تھی۔ جس میں ہیولاک کے لکھنؤ کو نجات دلانے کی دوسری کوشش کا تذکرہ تھا۔ "ہم کل صبح لکھنؤ کے لیے روانہ ہو رہے ہیں۔ ہمیں مدد بھی آگئی ہے۔ ہم بہت تیز رفتاری سے فاصلہ طے کریں گے۔ امید ہے کہ ہم چار دنوں میں وہاں پہنچ جائیں گے۔ آپ کو ہماری ہر طرح سے مدد کرنی ہوگی۔ حتیٰ کہ باہر آکر راستے بنانے میں بھی' اگر ہمیں اندر داخل ہونے میں مزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہمارے پاس تھوڑی سی فوج ہے۔" انگڈ دشمنوں کے ہاتھوں پکڑا گیا تھا۔ جب وہ ان سے بچ کر نکلنے میں کامیاب ہوا' ہیولاک کانپور واپس ہو چکا تھا۔

اس دوسری بار کی واپسی کی خبر اطمینان بخش نہیں تھی اور کرنل انگلس کو اندیشہ ہوا کہ ٹائٹلر نے یہاں کے حالات کو نہیں سمجھا ہے۔ اس لیے اس نے یہ ضروری سمجھا کہ وہ مکمل تفصیلات کے ساتھ جنرل ہیولاک کو خط لکھے۔ "کرنل ٹائٹلر کی طرف سے مسٹر گوبنس کو بھیجی گئی

تحریر ہمیں کل رات ملی جس پر 4/ اگست کی تاریخ پڑی ہے۔ جس کی آخری سطروں میں کہا گیا ہے "آپ کو ہماری ہر طرح سے مدد کرنی ہے حتی کہ باہر آکر راستہ بنانے میں بھی اگر ہمیں اندر داخل ہونے میں مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے۔" یہاں اور زیادہ پریشانیاں بڑھ گئی ہیں کیونکہ اپنی فوج کی کم تعداد کی وجہ سے ہمارے لیے یہ بالکل ناممکن ہے کہ ہم اپنی دفاعی پوزیشن کو چھوڑیں۔ آپ کو یہ خیال رکھنا چاہیے کہ میرے ہاتھ کتنے بندھے ہوئے ہیں۔ ہمارے پاس تقریباً 120 مریض اور زخمی، کم از کم 220 عورتیں اور 230 بچے ہیں اور کسی بھی طرح کی کوئی سواری نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ہمیں 23 لاکھ کی مالیت اور 30 توپوں کی قربانی کرنی پڑے گی۔ جو آپ کے یہاں سے خبر موصول ہوئی ہے، اس کی وجہ سے ہمیں اپنی فوج کو آدھے راشن پر رکھنا پڑے گا، جب تک کہ ہمیں آپ کی طرف سے کچھ معلوم نہ ہو۔ ہمارے پاس جو رسد ہے وہ زیادہ سے زیادہ 10/ ستمبر تک چلے گی۔ اگر آپ اس فوج کو بچانا چاہتے ہیں تو آگے بڑھنے میں کوئی وقت نہ ضائع کریں۔ ہمیں ہر وقت دشمنوں کے حملے کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے جو ہماری دفاع سے صرف چند گز کے فاصلے پر ہیں۔ ان کی سرنگوں نے ہماری چوکیوں کو اور کمزور کر دیا ہے۔ اور مجھے پورا یقین ہے کہ وہ اس طرح کے دوسرے حملے کی تیاری کر رہے ہیں۔ ان کی 18 پاؤنڈ کی توپیں ہماری بیٹری سے صرف 150 گز کے فاصلے پر ہیں۔ اور ان کی پوزیشن سے، اور دفاعی پارٹیاں بنانے کی ناکامی کے سبب ہم ان کا جواب دینے سے قاصر ہیں۔ ہر گھنٹے ہمارا بہت زیادہ نقصان ہو رہا ہے۔ ہماری کل طاقت صرف 350 یورپین اور 300 مقامی لوگوں پر منحصر ہے۔ اور انہیں ہر وقت تنگ کیا جا رہا ہے۔ گولیوں کی وجہ سے ریزیڈنسی کا ایک حصہ نیچے گر گیا ہے۔ اور بہت سے لوگ بغیر کسی سائبان کے ہیں۔ ہماری مقامی فوج جنہیں کرنل ٹائٹلر نے 25 دنوں قبل یہ یقین دلایا کہ آپ لوگ ہماری مدد کو آرہے ہیں، اب ان کا اعتبار ختم ہو رہا ہے۔ اور اگر انہوں نے بھی ہمیں چھوڑ دیا تو میں نہیں سمجھتا کہ ہم کس طرح سے اپنی حفاظت کر سکیں گے۔ کیا آپ نے اس شخص انگڈ سے ہمارا خط اور منصوبہ موصول کیا تھا۔ اس سوال کا جواب دیجیے۔"

اس خط سے یہ پتہ چلتا ہے کہ گیریسن کی تعداد کتنی گھٹ گئی تھی لیکن کھانے کے بارے میں حالات اتنے خطرناک نہیں ہوئے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ راشن آدھے سے کم کر دیا گیا تھا لیکن سر ہنری لارنس نے محاصرے کے بہت دنوں تک اس کے چلنے کا اندازہ کر لیا تھا اور اسی لیے وافر مقدار میں ذخیرہ جمع کر لیا تھا۔ جب کبھی کوئی مالدار ہندوستانی انہیں خدمات پیش کرتا تو وہ اس سے غلہ بھیجنے کے لیے کہتے۔ وہاں سے آنے والے سارے غلے کو کھانے کے کمرے میں جمع کر دیا گیا تھا۔ کرنل انگلس اور اس کے مشیروں کو اس زائد سپلائی کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں تھی۔ گوبنس شکایت کرتا ہے کہ اس چیز کے بارے میں خط میں تذکرہ کیے جانے کو اس نے بدلنے کے لیے کہا تھا لیکن اس کا یہ مشورہ کرنل انگلس نے نامنظور کر دیا تھا۔ بریگیڈیر کو کمشنری نے جو تعداد بتائی تھی اسے قبول کرنا پڑا تھا۔ اور گوبنس سے یہ امید نہیں تھی کہ اسے اس سے زیادہ معلوم ہوگا۔

جب تک آوٹ رام اور ہیولاک ریزیڈنسی میں نہیں پہنچ گئے' اس وقت تک اس خفیہ ذخیرے کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں معلوم ہو سکا۔ اور یہ کہنا بھی صحیح نہ ہوگا کہ انگلس نے اپنی پریشانیوں کے بارے میں جان بوجھ کر مبالغہ آرائی کی تھی اور بلا وجہ ہیولاک کو خطرہ مول لینے پر مجبور کیا۔

مدد کے لیے یہ پکار بے کار نہیں گئی۔ 29/ اگست کو انگڈ جواب کے ساتھ واپس آیا۔ سیدھی سڑک خطرے سے خالی نہیں تھی اور اسے فتح پور چوری کے راستے سے جانا پڑا تھا۔ جہاں اس باغی تعلقدار کا مکان تھا جہاں نانا نے بٹھور کی شکست کے بعد پناہ لی تھی۔ اس نے نانا مئو گھاٹ سے گنگا کو پار کر ہیولاک سے رابطہ قائم کیا۔ ہیولاک نے فوری طور پر مدد کے لیے کوئی وعدہ نہیں کیا۔ لیکن خوش آئند خبر سنائی کہ سر کولن کیمپبل ہندوستان آگئے ہیں۔ "مجھے آپ کا 16/ تاریخ کا خط موصول ہو گیا ہے۔ میں آپ سے یہی کہہ سکتا ہوں کہ آپ کوئی صلح نہ کریں بلکہ اپنے ہاتھوں میں تلواریں لیے ہوئے ختم ہو جائیں۔ سر کولن کیمپبل جو ایک دن کی نوٹس پر کمان میں آئے تھے اور وہ جنرل اینسن کی موت کی اطلاع کے بعد یہاں آئے ہیں' انہوں نے مجھ سے تازہ کمک بھیجنے کا وعدہ کیا ہے۔ اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کی حفاظت میری پہلی ذمہ داری ہوگی۔ یہ تازہ کمک میرے پاس بیس پچیس دنوں میں پہنچے گی۔ اور میں ساری تیاریوں کے ساتھ لکھنؤ کی طرف بڑھوں گا۔" ہیولاک نے جواب دیا۔ اب کچھ کرنے کو نہیں رہ گیا تھا سوائے اس کے کہ صبر کے ساتھ مدد کا انتظار کیا جائے۔

گیریسن کے لوگ ہمیشہ صرف دفاع میں مشغول نہیں رہے۔ بہت سے جوانمرد یورپین اور ہندوستانیوں نے چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں بنا کر ان پر حملے بھی کیے اور اس میں نام بھی کمایا۔ لیکن اس طرح کے چھوٹے حملوں سے محصور لوگوں کی ہمت افزائی تو ہوتی' یہ بھی ثابت ہوتا کہ یہ پہل ہمیشہ دوسری طرف سے ہی نہیں ہوئی۔ اگست کے مہینے میں سب سے نمایاں کامیابی جانس کے مکان کا گرایا جانا تھا جو کانپور بیٹری کے ٹھیک سامنے تھا۔ یہاں ایک ایسا مشاق نشانے باز تعینات تھا جو اپنی دونالی رائفل سے جب گولی چلاتا ہمیشہ نشانے پر لگتی اور اس کے دشمنوں کی تعریف کی بدولت' اس کا نام ہی نشانے باز پڑ گیا تھا۔ اپنی محفوظ جگہ سے اس نے اتنے آدمیوں کی جانیں لیں جتنی دونوں طرف سے کسی فرد واحد نے نہیں لی ہوگی۔ یہ مکان ایسی ہی ایک چھوٹی پارٹی کے اچانک حملے سے گرا تھا اور اس میں رہنے والے لوگ بالکل ہی لاعلم تھے اور نشانے باز اپنی جگہ پر مارا گیا تھا۔ لیکن جلد ہی اس مکان پر پھر قبضہ کر لیا گیا۔ اور دوسرے ایسے لوگ بھی آئے یہ ثابت کرنے کے لیے کہ ان کے درمیان صرف وہ ہی واحد نشانے باز نہیں تھا۔ اس لیے کیپٹن فولٹن نے در پرت کے مکان سے ایک سرنگ بچھائی جس میں 20/ اگست کو دھماکہ کیا گیا۔ جانس کا مکان بالکل ہی ڈھے گیا۔ اس سرنگ کے پھٹنے کے فوراً ہی بعد حملہ کیا گیا اور پاس پڑوس کی دوسری عمارتوں کو بھی ڈھا دیا گیا۔

ستمبر کا مہینے انگریزوں کے لیے خوش بختی کا مہینہ تھا۔ اسی مہینے میں نہ صرف دلی سلطنت کا

زوال ہوا بلکہ لکھنؤ میں بھی مزید مدد پہنچی۔ لیکن اس مدد سے فوری طور پر کوئی راحت نہیں ملی۔ اس دوران قیمتیں آسمان کو پہنچ گئیں۔ ستمبر کی پہلی تاریخ کو ریس نے لکھا۔ ''استعمال میں آنے والی چیزیں کبھی کبھی حاصل کی جاسکتی ہیں۔ یہ کہاں سے اور کیسے آئیں یہ ہم نہیں پوچھتے۔ آٹا ایک روپے سیر 'گھی دس روپے سیر' چینی سولہ روپے سیر' کچی تمباکو کا ایک پتہ دو روپے کا' ایک درجن برانڈی 180 روپے' اچار کی ایک بوتل بیس روپے کی اور اسی طرح ہر چیز کی قیمتیں آسمان پر پہنچی ہوئی ہیں۔ میں نے تمباپینا چھوڑ دیا ہے اور چائے کی پتی' نیم کی پتی اور امرود کی پتی ملا کر استعمال کرنا شروع کیا ہے اور اسی کو ہمارے سپاہی بھی مستقل استعمال کرتے ہیں' سگار اسی وقت تین روپے کا ایک مل رہا ہے۔'' 7/ تاریخ کو مسز کیس لکھتی ہیں: ''صابن اگرچہ نایاب چیز ہو گئی ہے' اس کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا اس وقت سات روپے کا مل رہا ہے۔'' خندق میں موجود لوگوں کے لیے لباس تبدیل کرنا ناممکن ہو گیا تھا۔ اگر لباس حاصل بھی ہوتا تو اسے بدلنے کا وقت ان کے پاس نہیں تھا۔ کرنل انگلس 16/ مئی سے اب تک کپڑے پہن کر نہیں سویا تھا۔ صابن کی قلت نے ریزیڈنسی کے پریشان لوگوں کو اس معمولی صفائی سے بھی محروم کر دیا تھا جو ابھی تک حاصل تھی۔ اور وہ دھوبی کی خدمات بھی نہیں لے سکتے تھے۔ کیونکہ ایک تو خندق میں دھوبی کم تھے' دوسرے وہ ایک درجن کپڑوں کی دھلائی بغیر صابن اور ماڑھ کے دس روپے لے رہے تھے۔ بہت سے لوگ بغیر دودھ اور چینی کے گزارہ کرتے رہے۔ مسز انگلس نے کچھ کافی تین روپے پونڈ کے حساب سے خریدی اور ایک پونڈ چائے آٹھ روپے کی بک رہی تھی۔ 19/ ستمبر کو کیپٹن مینس فیلڈ کی چیزیں نیلام کی گئیں۔ ایک پرانی فلالین کی قمیص 55 روپے کی بکی۔ اور ایک بوتل برانڈی 21 روپے کی۔

5/ ستمبر کو مسز کیس رپورٹ کرتی ہیں۔ لیڈیز روم کا ایک بڑا حصہ ڈھا دیا گیا جب کہ وہ کھانا کھا رہی تھیں۔ اور انہیں اپنا کھانا چھوٹے سونے کے کمرے میں پورا کرنا پڑا۔ 24/ گھنٹے کے اندر ہمارے اندر صرف ایک۔ بدلاؤ آتا' جب ہم کھانے کے لیے دوسرے کمرے میں جاتے۔ اور اب ہم پہلے سے زیادہ قید ہو گئے ہیں۔

مہینے کے شروع میں راجہ مان سنگھ نے' جو شاہ گنج کا تعلقدار تھا' اپنی بڑی فوج کے ساتھ لکھنؤ کے پاس پڑاؤ ڈالا۔ اس خبر کا گیریسن پر ملا جلا اثر پڑا۔ کیونکہ راجہ کیا رخ اختیار کرے گا یہ غیر یقینی تھا۔ اس نے انگریزوں سے اپنی وابستگی کا اظہار نہیں کیا تھا بلکہ چند شرائط کے ساتھ بات چیت کر رہا تھا۔ اس کی موجودگی اس لیے باعث پریشانی اور باعث امید دونوں تھی۔ اگر وہ باغیوں کے ساتھ مل جاتا ہے تو ریزیڈنسی میں موجود تھوڑے سے انگریز اور ہندوستانی ان کی کثیر تعداد کے سامنے کچل جائیں گے۔ اس کے برخلاف اگر وہ گیریسن کی مدد کا وعدہ کرتا ہے تو مقابلہ آرائی دیر تک چل سکتی ہے اور دشمن کو شکست دی جا سکتی ہے۔

14/ ستمبر کو ناقابل تلافی نقصان ہوا۔ کیپٹن فولٹن کے سر میں گولی لگی اور وہ فوراً ہی ختم ہو گئے۔ ایک طرح سے کیپٹن فولٹن دفاعی فوج کی ریڑھ کی ہڈی تھا۔ گوبنس کا کہنا ہے کہ وہی پہلا

شخص تھا جس نے مچھی بھون میں دوسری چوکی قائم کرنے کی غلطی کو پکڑا تھا۔ اس نے اس خطرے کو نظر انداز بھی نہیں کیا تھا جو اس چوکی کو خالی کرنے سے پیدا ہوئی۔ لیکن اس کی وجہ سے کوئی پریشانی نہیں ہوئی اور اپنی پُر امید چالوں سے وہ دوسروں میں اعتماد بحال کرتا تھا۔ "ہر شخص یہ مانے گا کہ لکھنؤ کا محافظ کا خطاب فولٹن کو ہی ملنا چاہیے۔"

گرچہ فولٹن کی موت ان کے لیے بڑا نقصان تھی تاہم جلد ہی انہیں ایک خوشخبری مل گئی۔ 16/ستمبر انگڈ کو ایک خط کے ساتھ دوبارہ کانپور بھیجا گیا۔ انگلس نے ہیولاک کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ میرے آخری خط کے بعد سے دشمن لگاتار ہماری پوزیشنوں کے خلاف حملہ بنائے ہوئے ہیں اور رات اور دن میں کسی وقت بھی گولی باری نہیں رکتی ہے ......... اگلے آٹھ دنوں میں ہمارے پاس لڑنے کے لیے آدمی بھی نہیں رہ جائیں گے۔ ہم آدھے کھانے پر گزارہ کر رہے ہیں اور اس طرح سے ہماری رسد اندازاً 18 تک چلے گی۔ اگر آپ اس وقت تک ہمیں راحت نہیں پہنچاتے تو ہمارے پاس گوشت کا ایک ٹکڑا بھی نہیں رہ جائے گا۔ جو دو چار بیل میرے پاس ہیں، وہ توپوں کو ادھر سے ادھر لے جانے کے لیے ہیں۔ میں نے اب تک اس قسم کے تقریباً سبھی بیلوں کو کھانے میں استعمال کر لیا ہے۔ کیونکہ ہمارے آدمی بغیر جانور کے گوشت کے اتنی سخت محنت نہیں کر سکتے۔ میں آپ کی آمد کی اطلاع سننے کے لیے بے چین ہوں، تاکہ اپنے مقامی سپاہیوں کو کچھ یقین دلا سکوں۔

حقیقت یہ ہے کہ ہندستانی سپاہی اپنے آقاؤں کے لیے ایک مسئلہ بن گئے تھے۔ ان پر شبہ تھا کہ وہ خفیہ طریقے سے باغیوں کے ساتھ مراسلت بنائے ہوئے ہیں گرچہ اس کا کوئی تحریری ثبوت نہیں موجود تھا۔ لیکن انگڈ نے کئی بار اس بات کی رپورٹ کی تھی کہ باہر محاصرہ کرنے والے ہر اس چیز سے باخبر ہیں جو خندق میں واقع ہوتی ہے۔ کچھ سکھ اور مقامی آدمی انہیں چھوڑ کر بھاگ گئے تھے اور یہ شبہ کیا جارہا تھا کہ وہ اندر اپنے بھائیوں سے رابطہ بنائے ہوئے ہیں، اس لیے ہر طرح کی تدبیر کی گئی کہ اب وہ مزید چھوڑ کر نہ بھاگیں۔ جن پر شبہ تھا، انہیں خاموشی سے ایسی جگہوں پر تعینات کیا گیا تھا جہاں سے بھاگنا ناممکن ہو جائے۔ گوبنس نے ان سے کہا کہ وہ اپنی ساری رقم اس کے پاس جمع کرا دیں تاکہ اس رقم کو بچانے کے خیال سے بھاگنے کا ان کا خیال ترک ہو جائے گا لیکن شبہ اکثر نئے خطرات پیدا کر دیتا ہے۔ ہندوستانی محسوس کرتے کہ ان پر بھروسہ نہیں کیا جارہا ہے۔ اور ان کے افسروں کی مثال اس بات کے لیے ناکافی تھی کہ ان کے اندر امید یا وفاداری پیدا کرتی۔ لیفٹیننٹ جیمس گراہم نے خودکشی کر لی۔ اور اس سے پورے گیریسن پر بہت بُرا اثر پڑا۔ محاصرہ کرنے والے اکثر ان پر بے دین ہونے کا طنز کرتے۔ کیونکہ نہ صرف انہوں نے اپنے مذہب کو چھوڑ دیا تھا بلکہ اس کے خلاف جنگ کر رہے تھے۔ آخر کار کامیابی کی ان کی ساری امید ختم ہو گئی۔ انگڈ جو خبریں لاتا اسے بھی سنجیدگی سے نہیں لیا جاتا بلکہ یہ کہا جاتا کہ وہ ریزیڈنسی سے کبھی جاتا ہی نہیں ہے بلکہ کبھی کبھار اپنے پوشیدہ ٹھکانے سے نکل آتا ہے اور برٹش فتوحات کی

غلط خبریں سنا کر انہیں اور بھٹکا رہا ہے۔ ان میں سے کچھ نے تو یہ بھی محسوس کیا کہ وہ اس فوج کا ساتھ دے رہے ہیں جس کے مقدر میں شکست لکھی ہے۔ اس لیے یہ وقت آگیا تھا کہ انہیں مددیا راحت کا کوئی ثبوت ملتا۔ ان کی خوش قسمتی سے اس طرح کی خبر جلد ہی مل گئی۔ 22/ تاریخ کو انگڈ واپس آیا اور اور یہ خبر لایا کہ راحت دینے والی فوج اب پاس آگئی ہے۔ وہ ہیولاک کا کوئی خط نہیں لایا لیکن آوٹ رام کا خط 20/ ستمبر کا لایا جس میں یہ خبر دی گئی تھی کہ فوج نے کل ندی پار کر لی ہے اور سبھی سامان ندی کے پار اتار لئے گئے ہیں اور کل وہ آپ کی طرف آگے بڑھیں گے۔ اور خدا کی مہربانی سے آپ کو جلد ہی نجات دلائیں گے۔ ہم نے یہ بھی سنا ہے کہ ہم جیسے ہی شہر کے قریب پہنچیں گے' باغی فوج ایک بارجی توڑ حملہ کرے گی اور ہم آپ پر نگاہ رکھے رہیں گے اور اس سے ان کا دھیان ہم سے ہٹ کر آپ کی طرف ہو جائے گا اور ہم فوراً ہی شہر پر حملہ کر دیں گے۔ لیکن میں آپ کو متنبہ کرتا ہوں کہ آپ اپنے کام میں لگے رہیے گا۔ باہر نکلنے کی کوشش نہ کریئے گا۔ جب آپ ہمیں اپنے آس پاس لڑتے ہوئے دیکھیں تو اس وقت جو مناسب سمجھیں قدم اٹھائیں۔ 23/ تاریخ کو کانپور کی طرف سے آتی ہوئی توپوں کی آواز سنائی دی اور 25/ تاریخ کو ہیولاک اور آوٹ رام ریزیڈنسی میں داخل ہو گئے لیکن لکھنؤ کو نجات نہیں ملی۔ صرف مزید کمک وہاں پہنچ گئی۔

سر جیمس آوٹ رام اس وقت فارس میں تھے۔ جب بغاوت کی شروعات ہوئی انہیں فوری طور پر واپس ہندستان طلب کیا گیا اور وہ 31/ جولائی کو سمندر کے راستے بمبئی اور سیلون ہوتے ہوئے کلکتہ پہنچے۔ اس دوران گورنر جنرل نچلے صوبے کی حفاظت کو لے کر کافی پریشان تھے۔ سپاہیوں نے دانا پور میں بغاوت کر دی تھی اور آرہ میں بھی شکست نے حالات کو اور گمبھیر کر دیا تھا۔ پہلے یہ منصوبہ تھا کہ سارے وسطی ہندستان کی فوج کی کمان آوٹ رام کو دے دی جائے۔ لیکن حالات کا تقاضہ تھا کہ اسے فوری طور پر اوپری حصہ میں تعینات کیا جائے۔ اس لیے دانا پور اور کانپور ڈویژن کو ایک ساتھ ملا کر ان کی ماتحتی میں رکھا گیا اور ان کی ایک خاص ذمہ داری تھی کہ وہ برہام پور سے بنارس تک کے نچلے صوبوں میں امن وامان برقرار رکھیں۔ کانپور میں ہیولاک کی پوزیشن بہت اچھی نہیں تھی۔ جنگ اور وبائی بیماریوں نے اس کی فوج کو بہت کم کر دیا تھا۔ اس کے پاس صرف 706 نفر پر مشتمل فوج تھی۔ اگر گوالیار کے باغی اس کے سر پر آگئے تو وہ اتنی کم تعداد کے ساتھ کانپور پر قبضہ برقرار نہیں رکھ سکے گا۔ دو ہزار فوجیوں پر مشتمل فوج سے وہ ہر باغی فوج کو کچلنے کے لیے تیار تھا' لکھنؤ کو چھوڑ کر آگرہ اور دلی تک جانا بھی ممکن تھا۔ لیکن اگر وقت سے پیشتر مدد نہیں کی گئی اور اگر گوالیار کی فوج اس کے مقابل آگئی تو اس کے پاس کوئی راستہ نہیں رہ جائے گا' سوائے اس کے کہ وہ کانپور چھوڑ کر الہ آباد چلا جائے۔ گورنر جنرل کونسل کے ایک ممبر نے ان سے ایسا کرنے کا مشورہ بھی دیا لیکن ایسا کرنے سے لکھنؤ کے بہادر گیریسن کی قربانی نہیں دی جاسکتی تھی۔ کیونکہ اودھ میں انگریزوں کی آخری چھاؤنی لکھنؤ تھی۔ اور لکھنؤ کو ہر صورت میں بچانا تھا۔

آوٹ رام کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ بنارس سے جونپور ہوتا ہوا کانپور جائے تاکہ ان مختلف نالوں کو پار کرنے سے بچے جو بنارس اور کانپور سے سیدھی سڑک میں ملتے ہیں۔ لیکن جب اس نے ہیولاک کو درپیش خطرات کے بارے میں سنایا تو اس نے اپنی فوج کو کانپور کے لیے موڑ دیا۔

آوٹ رام اور ہیولاک دونوں پرانے دوست تھے اور ہیولاک نے آوٹ رام کی ماتحتی میں فارس میں کام بھی کیا تھا اس لیے مشترکہ کمان کی باگ ڈور آوٹ رام کے سپرد کیے جانے سے یہ نہ سمجھا جانا چاہیے کہ ہیولاک کی تنزلی ہو گئی تھی۔ تاہم اسے تھوڑی بددلی ہوئی۔ کیونکہ کانپور میں اُسے لگاتار جیت ہوئی تھی اور یہ اس کی غلطی بھی نہیں تھی کہ وہیلر یا بی بی گھر کے قیدیوں کو بچانے کے لیے دیر سے آیا۔ اس کی اس مدد کی تعریف کمانڈر انچیف نے اسے تعریفی خط لکھ کر کرنے کی کوشش کی لیکن اودھ کو بچانے کی طمانیت اب بھی اس سے دور تھی گرچہ یہ اس کی گرفت میں تھا۔

لیکن آوٹ رام نے ہیولاک کی ملٹری زندگی کی سنہری فتح کا انکار نہیں کیا۔ وہ کلکتہ سے بنارس کے لیے اسٹیمر سے بھاگلپور اور داناپور ہوتے ہوئے روانہ ہوا اور بنارس سے اس نے ہیولاک کو یہ مراسلہ بھیجا "میں مدد کے ساتھ تمہارے پاس پہنچوں گا لیکن لکھنؤ کو آزاد کرانے کی ساری تعریف آپ کے لیے مخصوص ہوگی؛ جس کے لیے آپ نے اتنی زیادہ جدوجہد کی ہے۔ میں آپ کے پاس بحیثیت کمشنر سول افسر آؤں گا اور میری ساری فوج آپ کے تحت ہوگی اور اگر آپ چاہیں گے تو میں بھی ایک رضاکار کی حیثیت سے آپ کے ماتحت کام کروں گا۔ لکھنؤ گیریسن کی حوصلہ افزائی کیجیے کہ وہ مقابلہ پر جمے رہیں اور فوری طور پر کرنل انگلس کو اس کی اطلاع دیں۔ بہادری اور شجاعت کی یہ بہترین روایت تھی گرچہ یہ مرتبے کے خلاف تھی۔ کیا آوٹ رام کے لیے یہ مناسب تھا کہ وہ اپنی وہ ساری ذمہ داریاں جو مرتبے کے لحاظ سے اس پر عائد ہوتی تھیں، دوسروں کے کندھے پر لاد دیں۔ اگر کوئی چیز غلط ہو گئی تو اس کی ذمہ داری کس پر عاید ہوگی۔ کیونکہ آوٹ رام کے سامنے صرف فتح تھی لیکن ناکامی کے اسباب کو اس نے فراموش کر دیا تھا۔ لیکن آوٹ رام کی طرف سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ہیولاک کو اچھی طرح سے جانتا تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ اس کے ساتھ رہتے ہوئے ضرورت پڑنے پر وہ فوج کی کمان بھی سنبھال سکتا ہے۔

آوٹ رام کے اس فیصلے کی بعد میں کمانڈر انچیف اور گورنر جنرل نے بھی منظوری دے دی۔

15/ ستمبر کو آوٹ رام کانپور پہنچے۔ ان کے ساتھ ان کا سکریٹری ایک ایسا سپاہی تھا جس کے اندر لیاقت کوٹ کوٹ کر بھری تھی اور جو مستقبل میں میک ڈالا کا لارڈ نیپیئر بننے والا تھا۔ 18/ تاریخ کو ایک تیرتا ہوا پل تیار کر لیا گیا اور دوسرے دن فوج نے لکھنؤ کے لیے اپنا سفر شروع کیا۔ اس بار انہیں اپنے مقام پر پہنچنا تھا۔ راحت دینے والی اس فوج میں 2779 یورپین '400 مقامی جن میں کم سے کم 341 سکھ شامل تھے' انہیں پہلی بار مزاحمت منگل وار میں کرنی پڑی۔ لیکن اناؤ یا بشیرت گنج میں کوئی جھڑپ نہیں ہوئی۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ سئی ندی کے اوپر بنی پل پر کسی

نے ان کا راستہ نہیں روکا۔ اور نہ ہی باغیوں نے اس پل کو اڑانے کی کوشش کی۔ برٹش فوجیوں کو قسمت کی اتنی یاوری کی امید نہیں تھی اور وہ لکھنؤ کے پوسٹ عالم باغ میں 23/ تاریخ کو پہنچ گئے۔ یہاں ان کا راستہ روکنے کے لیے باغیوں کی ایک بڑی فوج موجود تھی۔ جنہیں جنگ کر کے پسپا کر دیا گیا اور لکھنؤ کا راستہ صاف ہو گیا۔

کم دوری کا راستہ ہمیشہ محفوظ نہیں ہوتا۔ سیدھا راستہ تو چار باغ پل سے نہر ہوتے ہوئے جاتا تھا لیکن اس راستے پر چلنے کا مطلب ہر جگہ سڑک پر جنگ ہوتی اور جانوں کا نقصان ہوتا۔ اس لیے محفوظ ترین راستہ یہ تھا کہ مشرق کی طرف دلکشا تک بڑھا جائے اور وہاں سے گومتی کو پار کر کے بائیں طرف مڑیں لوہے کے پل پر قبضہ کریں اور شہر کی طرف داخل ہوں اور بادشاہ باغ پر قبضہ کریں اور ریزیڈنسی کو آزاد کرائیں۔ لیکن تیز بارش نے بھاری آرٹلری کے لیے سڑک کا ایک حصہ پار کرنا ناممکن کر دیا۔ اس لیے اس راستے کو بھی چھوڑ دیا گیا۔ یہ فوجی امداد اپنے خاص ٹھکانے پر انس کے مطابق نہر کے اندرونی راستے سے پہنچ سکتی تھی جو چار باغ پل سے اوپر گزرتی تھی۔ لیکن سیدھے ریزیڈنسی جانے کے بجائے فوج کو داہنے مڑ کر نہر کے اندرونی راستے سے شہر کا چکر لگا کر کھلے میدان میں پہنچنا اور بائیں مڑ کر ریزیڈنسی کی طرف بڑھنا مناسب تھا۔ اسی راستے کا آوٹ رام نے انتخاب کیا اور ہیولاک بھی 25/ ستمبر کو اسی راستے سے داخل ہوا۔ پل پر برٹش فوج کے داخلے کو ہر صورت سے روکنے کی کوشش کی گئی لیکن اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکا کہ برٹش فوج کا اگلا قدم کیا ہوگا؟ اودھ کے رہنماؤں نے پل سے ریزیڈنسی کو جانے والی سیدھی سڑک پر جگہ جگہ رکاوٹیں ڈال دی تھیں اور انہیں اس وقت اپنی غلطی کا احساس ہوا جب انگریز فوج بیگم کوٹھی پر قبضہ کرتے ہوئے سکندر باغ پہنچ گئی اور آگے موتی محل پر آکر رک گئی' جو ریزیڈنسی سے 11 سو گز کے فاصلے پر تھی۔ موتی محل اور ریزیڈنسی کے درمیانی حصہ میں چھتر منزل کی عمارتیں تھیں اور چھتر منزل میں داخلے کا کوئی راستہ نہیں تھا اس لیے خاص بازار کا چکر کاٹتے ہوئے چھتر منزل میں داخل ہوئے۔ ان دونوں جنرل کے تحت فوج سانڈرس کی چوکی سے ریزیڈنسی میں داخل ہوئی۔ پھر بھی یہ کام بہت زیادہ نقصان کے بعد انجام پایا۔ عالم باغ چھوڑنے کے وقت تک 207 افسران یا تو مارے جا چکے تھے یا زخمی ہو گئے تھے اور 25/ اور 26/ کو 31/ افسران اور 504 آدمیوں کا نقصان ہو چکا تھا۔ جو لوگ مارے گئے تھے ان میں بہادر نیل بھی تھا جو برٹش فوج کا آئیڈیل تھا۔

"گرچہ ہیولاک کی فوج کو جو زبردست نقصان ہوا اس کی کسی بھی صورت میں تعریف نہیں کی جا سکتی۔" لیفٹیننٹ جنرل میکلیڈ انس لکھتے ہیں "لیکن جو دشواریاں پیش آئیں اور جس کثیر تعداد میں مخالف فوج کا انہیں سامنا کرنا پڑا' اسے مد نظر رکھتے ہوئے یہ نقصان بہت زیادہ نہیں تھا کیونکہ کوئی بھی جان لیوا کام اور جان لیوا لڑائی بغیر نقصان کے نہیں لڑی جا سکتی۔ ۲۵/ ستمبر کی شام میں جب ان کی فوجیں وہاں پہنچیں تو دفاعی نقطہ نظر سے لکھنؤ ریزیڈنسی کو نجات نہیں ملی لیکن گیریسن کو ہر طرح کا فائدہ ہوا۔ درپیش خطرات کچھ حد تک کم ہو گئے اور ان پر قابو پا لیا گیا۔ کیونکہ

دشمنوں کی فوج کی تعداد بہت زیادہ تھی اور وہ ہر لمحے حملہ کر رہے تھے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہیولاک کی آمد سے لکھنؤ گیریسن اس انجام سے بچ گیا جو خرطوم میں پیش آیا تھا۔ ریزیڈنسی کے ایک اور آدمی کا خیال تھا کہ ہیولاک اور آوٹ رام کی فوجیں ٹھیک وقت پر پہنچیں۔ کیونکہ اگر یہ لوگ وقت پر نہ آتے تو مقامی فوجی، جنہوں نے ابھی تک اس سے ہر طرح کی وفاداری نبھائی تھی، یقیناً ہمیں چھوڑ کر بھاگ گئے ہوتے اور ہم ان کے اس قدم کو غلط بھی نہیں کہہ سکتے تھے کیونکہ ہر شخص کو اس کی زندگی پیاری ہوتی ہے اور ہمارے پاس امید کی کوئی کرن باقی نہیں تھی، اور اب زیادہ عرصے تک مقابلہ کی ہمت بھی ختم ہو گئی تھی۔ بہت ممکن ہے کہ کانپور کا سانحہ لکھنؤ میں بھی دوہرایا جاتا اور ہم اس کی بابت سوچ بھی رہے تھے کہ عورتوں اور بچوں، مریضوں کو توپوں سے اڑا دیں تاکہ وہ دشمنوں کے ہاتھوں میں نہ پڑیں اور پھر ان کھنڈرات میں لڑتے ہوئے خود اپنی جان دیدیں۔

لیکن اس راحت کے ساتھ بھی کچھ سانحے وابستہ تھے۔ ہیولاک کی یورپین فوج نے ہر سیاہ فام آدمی کو اپنا دشمن سمجھنا سیکھا تھا اور ان کے غصہ کے اولین شکار وہ مقامی وفادار سپاہی بنے جو ابھی تک اپنی جان کی بازی لگا کر ہر طرح کی دشواریاں جھیلتے ہوئے ہمارا دفاع کر رہے تھے لیکن سب سے بڑا سانحہ مسز برٹرم کے ساتھ ہوا۔ ان کے شوہر گونڈا میں فوج کے ڈاکٹر تھے۔ جب سے ہنری لارنس نے یہ حکم جاری کیا کہ آس پاس کے اضلاع میں جو عورتیں اور بچے ہیں انہیں فوراً لکھنؤ بھیجا جائے، وہ سب سے پہلے سکرورا آئیں اور بعد میں فوجیوں کی حفاظت میں رام نگر پہنچیں۔ وہاں اور بھی پناہ گزیں موجود تھے۔ وہ ان کے ساتھ لکھنؤ آئیں۔ ڈاکٹر برٹرم، جو گونڈہ میں رہ گئے تھے، نے بلرام پور کے راجہ کے یہاں پناہ لی۔ بعد میں وہ دوست فوجیوں کے ہمراہ لکھنؤ پہنچے۔ اور ہیولاک کی فوج سے مل گئے۔ اس فوج کے لکھنؤ میں داخل ہونے کے ایک دن قبل ان کی اہلیہ کو پتہ چلا کہ ان کے شوہر خیریت سے ہیں اور ٹھیک ہیں اور لکھنؤ پہنچ رہے ہیں۔ انہوں نے اپنا بہترین لباس زیب تن کیا اور اپنے بچے کو بھی اچھا کپڑا پہنایا اور ملاقات کے انتظار میں وہاں بیٹھ گئیں۔ کچھ افسروں نے بتایا کہ ڈاکٹر برٹرم دوسرے دن آنے والے ہیں۔ لیکن وہ دوسرا دن کبھی نہیں آیا۔ بعد میں انھیں اس حقیقت کا پتہ چلا کہ ان کے شوہر کو ریزیڈنسی کے دروازے کے باہر کسی نے ختم کر دیا۔ اس کا بچہ بھی بہت دبلا پتلا اور کمزور تھا کیونکہ محاصرہ کے دوران اسے خوراک نہیں مل پا رہی تھی۔ وہ بچہ بھی کلکتہ میں مر گیا اور مسز برٹرم نے اپنے گھر کے لیے تنہا سفر کیا، اپنے شوہر اور واحد بچے سے محروم ہو کر۔ جنگ، شکستہ دلوں اور ٹوٹے گھروں کا کوئی خیال نہیں کرتی بغاوت نے سفید اور سیاہ دونوں کو یکساں طور پر برباد کیا۔

ریزیڈنسی میں جو خوشی کی لہر پھیلی تھی، فوراً ہی وہ دل شکستگی میں تبدیل ہو گئی۔ 27/ستمبر کو مسز کیس لکھتی ہیں کہ "سب کچھ ہونے کے باوجود آج کا دن بہت تکلیف دہ تھا۔ ہر شخص دل شکستہ ہے اور سبھی یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہمیں کوئی راحت نہیں ملی۔ ہمارے پاس جو لڑنے والے لوگ ہیں، وہ اس نازک حالت کے لیے بہت کم ہیں اور اس رسد کے لیے بہت زیادہ جو اس وقت

گیریسن میں ہے۔'' یہ بات مشہور ہوگئی کہ محاصرہ کرنے والوں کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ ہے اور نانا صاحب بھی ان کے ساتھ شامل ہیں اور گیریسن اس بات سے بے خبر تھے کہ آوٹ رام سنجیدگی سے عالم باغ واپسی کی بات سوچ رہے ہیں تاکہ مزید مدد پہنچنے تک وہاں انتظار کرسکیں۔ بچوں' عورتوں اور زخمیوں کو یہاں سے ہٹانا ان کے لیے ناممکن تھا اور خندق میں زیادہ دنوں رکنے کا مطلب تھا رسد کا ختم ہونا۔ 2/ اکتوبر کو کرنل انگلس نے اپنی اہلیہ سے راز کی بات بتائی۔ ''آج صبح جان نے مجھے بلایا اور وہ ساری باتیں بتائیں جو صرف اسے معلوم تھیں۔ مسٹر کوپر اور ہماری امدادی فوج کے دو جنرل رسد کی قلت کی وجہ سے گھر چھوڑنے والے ہیں اور یہاں سے عالم باغ جاکر مزید کمک کا انتظار کرنے والے ہیں۔ لیکن جلد ہی یہ معلوم ہوگیا کہ وہ شہر سے باہر نہیں نکل پائیں گے اور رسد کی بھی اتنی کمی نہیں ہے جس کا اندیشہ کرنل انگلس کو تھا۔ سر ہنری لارنس نے خندق کا جو ذخیرہ پوشیدہ طور جمع کر رکھا تھا' وہ تلاش کرلیا گیا اور یہ پایا گیا کہ کم راشن پر آوٹ رام کی فوج بھی یہاں رہ سکتی ہے۔

فوری طور پر راشن کی مقدار میں کمی کردی گئی اور کمشنری سے آٹے کی سپلائی بھی بند ہوگئی۔ ہر شخص کو آٹے کی جگہ گیہوں دیا جاتا جسے وہ جیسے چاہیں پیسے۔ دال بالکل بند کردی گئی تھی۔ نمک کی مقدار بھی کم کردی گئی تھی اور صرف چھ اونس بیئر روزانہ دی جاتی۔ اس لیے اس میں کوئی شک کی گنجائش نہیں رہ گئی تھی کہ صحت مند جسم کے لوگ بھی بھوکے رہ جاتے۔ ریس اعتراف کرتا ہے کہ ایک بار اس نے ایک غیر حاضر دوست کی پلیٹ سے ادھ پکی ہڈی اٹھالی اور اسے بعد میں صاف کرکے کھالیا۔ کبھی کبھار اسے ایک چپاتی زائد مل جاتی لیکن وہ نہیں بتاتا کہ یہ زائد چپاتی کیسے ملتی۔ پھر بھی گیریسن میں ایسے آدمیوں کی کمی نہیں تھی جو اس مصیبت کی گھڑی میں بھی پیسہ بناتے۔ جب آوٹ رام کے آنے سے انگریزوں کی فوج کچھ مضبوط ہوئی تو آس پاس کے محلوں کو لوگوں نے لوٹنا شروع کیا جہاں سے جواہرات' شالیں' سلک اور خوبصورت تصاویر اور کھانے پینے کا سامان بڑی مقدار میں تجارت کے لیے دوررس نگاہ رکھنے والوں نے لوٹ لیا۔ ان میں سے ایک شخص کو چائے' تمباکو' صابن' موم بتیاں اور دیگر استعمال میں آنے والی چیزوں کے کئی بکس مل گئے جس سے اسے کئی ہزار پونڈ کا نقد فائدہ ہوا۔ 15/ دنوں کے اندر صابن ختم ہوگیا اور اس کے متبادل کی صورت میں بیسن کا استعمال کیا جانے لگا۔

24/ تاریخ کو راشن کی مقدار میں اور کمی کیے جانے کا فیصلہ کیا گیا تاکہ جو کچھ بھی رسد موجود ہے' پہلی دسمبر تک چل سکے۔ دو دن بعد مسز کیس نے لکھا ''اب ہم یومیہ آٹے کی دو چپاتیوں اور چنے کی دو چپاتیوں کے ساتھ گزارہ کررہے ہیں اور ان سب سے بڑھ کر مجھے صابن کے نہ ملنے کی زیادہ تکلیف ہے۔ سر جیمس آوٹ رام نے ایک شخص کو ایک ہزار روپے چینی لانے کے لیے دیئے لیکن وہ کبھی لوٹ کر نہیں آیا۔ ڈاکٹر فرائر نے اس خشک کھانے میں کچھ نئی باتیں پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مسز جرمن نے 18/ اکتوبر کو لکھا'' یہ سن کر خوشی ہوئی کہ رات کے کھانے

میں گوریا کی کری ملنے والی ہے۔ اس کے لیے ڈاکٹر ایف نے ڈیڑھ سو گوریاں ماری ہیں۔ کچھ لوگوں نے اسے بہت ذائقہ دار بتایا لیکن میں اسے نہیں چکھ سکی۔" جولائی میں ایک مور کو بغیر کسی نقصان کے واپس اڑ جانے دیا گیا تھا لیکن اکتوبر میں ڈیڑھ سو گوریوں کی جان لی گئی تاکہ کری تیار کی جاسکے۔ نومبر میں بھوکے سپاہی ایک چپاتی چھین لیتے اور اس کی جگہ ایک روپیہ رکھ دیتے۔ مسز کیس کی بہن کیرولین اپنی ایک بہن کو 6/ نومبر کو لکھتی ہے۔ "پچھلے چار مہینوں سے ہم صرف بیف اور چاول پر گزارہ کر رہے ہیں۔ کوئی سبزی نہیں۔ اب ہمیں کبھی کبھار کچھ ایسی ہری پتیاں مل جاتی ہیں جو پالک سے مشابہت رکھتی ہیں اور لوگ اسے بھی شوق سے کھاتے ہیں۔"

اس دوران مان سنگھ سے جو مصالحت کی بات چل رہی تھی اس سے کوئی خاص نتیجہ نہیں نکلا۔ اس نے کسی بھی پارٹی سے اپنی وابستگی کا اعلان نہیں کیا۔ گرچہ وہ انگریزوں سے اپنی وفاداری کا دم بھرتا رہا۔ شاید وہ دونوں لڑاکو پارٹیوں سے اچھے رشتے بنا کر رکھنا چاہتا تھا۔ جب تک کہ یہ جنگ فیصلہ کن موڑ نہ لے لے۔ جولائی میں اس نے دوسرے تعلقداروں کو ایک خط بھیجا جس میں ان سے کہا گیا تھا کہ وہ انگریزوں کا ساتھ دیں۔ لیکن اس خط کا بھی کوئی خاص اثر لوگوں پر نہیں پڑا۔ لیکن لکھنؤ کے پڑوس کو چھوڑنے سے پہلے اس نے سیتاپور کی مس میڈلین جیکسن اور مسز اُور کو بچ نکلنے میں مدد کی جو باغیوں کی حراست میں تھیں اور اس کام کے لیے اس کے کارندے کو بھاری انعام دیا گیا۔

آوٹ رام ایک خاص مقصد کے تحت لکھنؤ آیا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ یہاں مقامی امراء کی مدد سے عبوری حکومت قائم کر کے گیریسن کو لکھنؤ سے ہٹادے گا اور یہ حکومت اس جگہ پر اس وقت تک قائم رہے گی جب تک برٹش اس پر دوبارہ قبضہ نہ کرلیں۔ وہ اس حق میں نہیں تھا کہ لکھنؤ کو بالکل ہی چھوڑ دیا جائے۔ کیونکہ اسے اندیشہ تھا کہ اس طرح اودھ اور روہیل کھنڈ کے امراء یہ نتیجہ اخذ کرلیں گے کہ اودھ میں برٹش حکومت کا خاتمہ ہوگیا ہے۔ پھر اسے جلد ہی یہ احساس ہوگیا کہ بچوں، بیماروں اور عورتوں کو یہاں سے نکالنا ممکن نہیں اور نہ ہی عالم باغ سے کوئی رابطہ قائم کرنا ممکن ہے۔ اور یہ کہ اسے جب تک کہ مزید مدد نہ پہنچے صرف دفاعی پوزیشن کو سنبھالیں۔ لیکن اس نے یہ محسوس کیا کہ یہ دفاع اس وقت اور محفوظ ہوگی جب کچھ اور عمارتیں اس میں شامل کرلی جائیں۔ اس لیے آس پاس کی کچھ دوسری عمارتوں پر قبضہ کیا گیا تاکہ باغیوں کی گولی سے فوج محفوظ رہے۔ لیکن ایسا بھی نہیں کہ آوٹ رام باہر کی دنیا سے بالکل بے خبر رہا ہو۔ اس نے سنا کہ نانا کی فوجیں اور گوالیار کی فوجیں کالپی میں جمع ہو گئی ہیں۔ اس لیے اس نے کمانڈر انچیف کو مشورہ دیا کہ وہ پہلے کانپور کو محفوظ کریں۔ بعد میں لکھنؤ آئیں۔ اودھ کا محاصرہ کرنے والے رُک رُک کر حملہ کرتے لیکن ان کی کچھ سرنگوں سے پریشانی ہو رہی تھی۔ آوٹ رام کو سب سے بڑی پریشانی کھانے کی طرف سے تھی۔ 28/ اکتوبر کو اس نے لکھا کہ "ہم مزید آدھے کیے گئے راشن پر کسی بھی صورت نومبر تک گزارہ کر سکیں گے۔" لیکن اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا، مہینہ کے وسط

میں ہی امدادی فوج آ گئی جو اپنے ساتھ بہت زیادہ رسد بھی لائی تھی۔

7/ نومبر کو کانپور سے ایک مخبر میجر بروس کی طرف سے یہ خبر لایا کہ سر کولن کیمپبل خود ایک بہت بڑی فوج کو لے کر آ رہے ہیں اور تین دنوں کے اندر وہ عالم باغ پہنچ جائیں گے۔ انہیں 11/ جولائی 1857ء کو پوری ہندستانی فوج کا کمانڈر انچیف بنایا گیا تھا اور وہ 13/ اگست کو کلکتہ پہنچ گئے۔ اس وقت ان کی عمر 65 سال ہو گئی تھی۔ 27/ اکتوبر کو وہ لکھنؤ سے الٰہ آباد کے لیے روانہ ہوئے اور بنارس سے الٰہ آباد کے درمیان انہیں باغیوں نے تقریباً پکڑ لیا تھا لیکن وہ کسی صورت سے بچ نکلے۔ الٰہ آباد میں انہیں معلوم ہوا کہ آدھے راشن پر بھی آوٹ رام نومبر تک لڑنے کے لیے تیار ہیں۔ کمانڈر انچیف 3/ نومبر کو کانپور پہنچے۔ انہیں یہ فیصلہ کرنا تھا کہ وہ فوری طور پر لکھنؤ کو راحت پہنچائیں یا گوالیار کی فوج کی طرف بڑھیں جو کانپور کے لیے خطرہ بنا ہوا تھا۔ وہ سب کانپور میں جمع ہو چکے تھے اور یہ اطلاع تھی کہ نانا بھی ان میں شامل ہونے کے لیے چل چکے ہیں۔ وہ کانپور کے لیے کافی فوج نہیں چھوڑ سکتے تھے اگر ان کی غیر موجودگی میں ان پر حملہ ہوا۔ لیکن اسے محسوس ہوا کہ اگر لکھنؤ کو فوری طور پر مدد نہیں پہنچائی گئی تو وہاں کی بھوکی فوج زیادہ دنوں تک مزاحمت نہیں کر پائے گی۔ اس لیے اس نے ایک چھوٹی سی فوج کے ساتھ ونڈھم کو کانپور میں چھوڑا اور خود لکھنؤ کے لیے روانہ ہوا۔ روانہ ہونے سے پہلے اس نے ونڈھم کو حکم دیا کہ اگر باغی فوج کانپور آتی ہے تو وہ دلیری کے ساتھ ان کے ساتھ مقابلہ کریں لیکن حملہ کرنے کے لیے خود اس وقت تک آگے نہ بڑھیں جب تک کہ بمباری کا خطرہ نہ پیدا ہو جائے۔

کیمپبل کانپور سے 9/ نومبر کو لکھنؤ کے لیے روانہ ہوا۔ اس کے ساتھ کیولری اور گھوڑ سوار آرٹلری کے دستے تھے۔ دہلی کی شکست کی وجہ سے بریگیڈیر ولسن کو یہ موقع مل گیا کہ وہ اپنے دو کالم فوج روانہ کر سکیں۔ اس میں سے ایک کالم کرنل گریٹ ہیڈ کی کمان کے تحت بلند شہر اور علی گڑھ ہوتے ہوئے آگرہ کے لیے روانہ ہوا۔ آگرہ میں گریٹ ہیڈ نے اندور کے باغیوں کو جو اچانک شہر میں داخل ہو گئے تھے، کچل دیا اور پھر یہ کانپور کی طرف بڑھے۔ فیروز آباد میں کرنل ہوپ گرانٹ نے فوج کی کمان سنبھالی اور اکتوبر کے آخری ہفتے میں کانپور پہنچ گئے۔ ہوپ گرانٹ اس کے بعد عالم باغ کے لیے روانہ ہوا اور بنتیرا میں باغی فوجوں سے مڈ بھیڑ ہونے پر انہیں شکست دی۔ اس نے عالم باغ سے بیمار اور زخمیوں کو سواری کے ذریعہ کانپور روانہ کر دیا اور کمانڈر انچیف کے حکم پر بنتیرا میں رکا رہا۔ جہاں کمانڈر انچیف بعد میں خود آ گئے۔ کولن کیمپبل کے پاس وقت کم تھا۔ وہ باغیوں سے پہلے کانپور پہنچنا چاہتا تھا۔

کیمپبل یہ جانتا تھا کہ اسے کام میں زیادہ سہولت ہو جائے گی اگر اسے ایسا کوئی گائڈ مل جائے جو زمینی راستوں سے واقف ہو۔ ٹامس ہنری کاوناگھ جو لکھنؤ میں محصور تھے، انہوں نے ایک ہندوستانی مخبر کے ساتھ کمانڈر انچیف کے کیمپ میں جانے پر رضامندی ظاہر کی۔ وہ لکھنؤ میں ڈپٹی کمشنر کے آفس میں ایک کلرک تھے۔ لیکن اس محاصرے نے ہر سویلین کو فوجی بنا دیا تھا۔ اس

نے اس مخبر کو تلاش کیا جو آوٹ رام کا خط اور منصوبہ لے کے جانے والا تھا۔ لیکن اس آدمی نے کسی سفید فام کو اپنے ساتھ لے جانے سے انکار کر دیا۔ اس بار یہ خبر لے جانے والا انگڈ نہیں بلکہ قنوجی لال تھا۔ یہ فوجی نہیں تھا لیکن سیاحی میں اس کو کافی دلچسپی تھی۔ جب قنوجی لال نے کاونا گھ کو اپنے ساتھ لے جانے سے انکار کر دیا تو وہ نیپئر کے پاس گیا۔ نیپئر نے بھی اس کا جانا مناسب نہیں سمجھا لیکن اس نے اس کا تعارف جیمس آوٹ رام سے کرادیا۔ پہلے تو آوٹ رام بھی گھبرایا لیکن کاونا گھ کے مصمم ارادے کو دیکھ کر اسے باہر جانے کی اجازت دے دی۔ کاونا گھ نے پہلے تو اپنے چہرے اور ہاتھ کو سیاہ رنگ سے بالکل رنگ دیا اور بعد میں مقامی لوگوں کے رنگین لباس۔ سلک کا پیلا کرتا، گلابی پگڑی اور دیسی جوتا پہن کر وہ لکھنؤ کا پکا بدمعاش لگنے لگا۔ اس نے اس حد تک بھیس بدل لیا تھا کہ نیپئر بھی اسے نہ پہچان سکا۔ اس کا راستہ بہت زیادہ خطرات سے پُر تھا اور بیچ میں راستہ بھٹک جانے کی وجہ سے انہیں کافی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے پیر جو اتنا زیادہ چلنے کے عادی نہیں تھے اور قنوجی لال کی تاکید کے بعد بھی وہ ایک قدم آگے چلنے کو تیار نہیں ہوتا جب تک وہ پندرہ منٹ آرام نہ کر لے۔ جب چاند کی روشنی مدھم پڑنے لگی تو وہ ایک آموں کے جھنڈ میں پہنچے۔ یہاں سے بھی کاونا گھ ایک قدم آگے بڑھنے کے لیے تیار نہیں ہوا جب تک کہ اس نے ایک گھنٹہ سونہ لیا۔ قنوجی لال صبح سے پہلے ہی برٹش کیمپ میں پہنچنا چاہتا تھا لیکن اس کا ساتھی ایک قدم آگے بڑھانے پر راضی نہ ہوا۔ راستے میں انہیں برٹش کیولری کا ایک گھوڑ سوار ملا۔ خوش قسمتی سے یہ ان کا رہنما بن گیا، جس نے انہیں کمانڈر انچیف کے خیمے تک پہنچا دیا۔ جیسے ہی میں دروازے تک پہنچا ایک بوڑھا شخص جس کا چہرہ بہت سخت تھا باہر آیا۔ میں نے اس سے سر کولن کیمپبل کے بارے میں پوچھا۔ میں ہی کیمپبل ہوں 'اس بوڑھے نے کہا اور پھر کاونا گھ نے اپنی پگڑی سے وہ تعارفی نوٹ نکالا جو آوٹ رام نے دیا تھا۔ اس کی اس ہمت کی وجہ سے اسے وکٹوریہ کراس دیا گیا۔ گرچہ وہ فوجی نہیں تھا۔ اور اسے حکومت ہند نے بیس ہزار روپے بطور انعام نقد دیئے۔ اور اسے ترقی دے کر اسسٹنٹ کمشنر بنادیا۔ قنوجی لال جو کاونا گھ کا گائیڈ تھا بعد میں تحصیلدار بنادیا گیا۔ اسے بھی پانچ ہزار کا نقد انعام دیا گیا۔ انگڈ تیواری جسے ہر کامیاب سفر پر نقد انعام دیا گیا تھا' اسے بھی پانچ ہزار کا انعام دیا گیا۔ اس نے کوئی زمین کی مانگ نہیں کی لیکن اسے تین ہزار کا جامہ بھی دیا گیا۔

سر کولن لکھنؤ کی دشوار گزار سڑکوں کو چھوڑ کر ریزیڈنسی کی طرف بڑھنا چاہتے تھے۔ لیکن ان کے پاس فوج کی تعداد اتنی زیادہ تھی جتنی ہیولاک اور آوٹ رام کے پاس ستمبر میں نہیں تھی۔ وہ کسی قسم کا خطرہ اٹھانے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اس لیے وہ بہت چوکنا ہو کر دھیرے دھیرے آگے بڑھے۔ وہ عالم باغ سے 13/نومبر کو چلے اور دلکشا اور لامارٹینئر پر قبضہ کرنے کے بعد رات وہیں گزاری۔ ان کا مقصد موتی باغ پہنچنے کا تھا جہاں آوٹ رام ان کے ساتھ شامل ہونے والے تھے۔ لیکن دشمنوں کو دھوکا دینے کے لیے انہوں نے بیگم کوٹھی پر گولہ باری شروع کر دی۔ 16/ تاریخ کو سر کولن نے نہر کو اس جگہ سے پار کیا جہاں وہ گومتی سے ملتی ہے اور سکندر باغ پر حملہ

کر دیا۔ باغی فوجیوں کو اس طرف سے حملے کا کوئی اندیشہ نہیں تھا اور سارے دروازوں کو بند کر دیا گیا تھا۔ باغی فوجی جو سکندر باغ کی حفاظت کر رہے تھے' ان کے پاس کوئی توپ نہیں تھی۔ لیکن وہاں کی دیواریں بہت مضبوط تھیں اور وہ آخری آدمی تک بہت جوانمردی سے لڑے۔ لیکن مسکٹ خالی توپوں کا کوئی جواب نہیں تھی۔ اور اس جگہ پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا گیا۔ باغی فوجی اچانک پکڑ لیے گئے اور آخری آدمی تک کو قتل کر دیا گیا۔ اور باغ کے پاس تقریباً دو ہزار لاشیں گر گئیں لیکن اس میں بھی بہت سے لوگوں نے جوانمردی اور ہمت کا ثبوت دیا۔ لارڈ رابرٹس ایک پنجابی مسلم مکرم خاں کی ہمت کی گواہی دیتا ہے۔ اس راستے کے وہ بھاری دروازے جس سے باغی واپس ہو رہے تھے' حملہ آور فوج کے خلاف۔ بند کئے جانے والے تھے مکرم خاں نے اپنا بایاں بازو جس میں وہ ڈھال لیے ہوئے تھا دونوں دروازوں کے درمیان حائل کر دیا اور دروازوں کو بند ہونے سے روک دیا۔ اس کا ہاتھ تلوار سے بری طرح زخمی ہو گیا تھا اور اس نے اپنا داہنا ہاتھ تقریباً اندر کر دیا۔ جو کلائی سے کاٹ دیا گیا اس کی اس بہادری کے اعتراف کے طور پر اسے بعد میں آرڈر آف میرٹ کا تمغہ عطا کیا گیا' کیونکہ اس وقت تک ہندوستانی وکٹوریہ کراس پانے کے حقدار نہیں تھے۔

اس کے بعد قدم رسول اور شاہ نجف پر قبضہ کیا گیا۔ شاہ نجف میں اودھ کے ایک سابق حکمراں کی قبر تھی اور اس کی مضبوط دیواروں پر آسانی سے شگاف نہیں ڈالا جا سکتا تھا۔ اس دوران آوٹ رام نے موتی محل تک کی ساری عمارتوں کو گرا دیا۔ 17/ تاریخ کو وہ محاصرہ کرنے والوں کی مدد کے لیے پہنچ گیا۔ اس سارے عرصے میں صرف چار دنوں کے اندر 496 برٹش افسر یا تو مارے گئے تھے یا زخمی ہو گئے تھے۔ زخمی ہونے والوں میں خود کمانڈر انچیف بھی شامل تھا۔

"آخر کار لکھنو کو بچا لیا گیا۔ اور محصور لوگ اب آزادی اور زندگی کی مسرتوں کا ذائقہ اٹھانے والے تھے۔" "ایک سنترہ لایا گیا جو بہت ہی مزیدار تھا۔ ہمیں تازہ مکھن کے ساتھ بریڈ دی گئی۔ زندگی کی مسرتوں کے بڑے سے بڑے لطف لینے والے لوگوں نے بھی اپنا کھانا اتنے ذوق و شوق سے نہیں کھایا ہوگا جتنا اس سادے سے کھانے سے ہمیں حاصل ہوتا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ خوشی ملنے والی تھی۔ بہت سی بیل گاڑیاں خطوط اور اخباروں سے بھری ہوئی پہنچیں لیکن آزادی کی اس سانس کے ساتھ بہت سے غم بھی پنہاں تھے۔ ان سارے عزیز و اقارب اور دوستوں کے جو ختم ہو گئے تھے۔ کتنی ایسی عورتیں بچی تھیں جنہیں اپنے شوہروں کے مرنے پر رنج کرنا پڑا۔ اور کتنی ماؤں نے اپنے بچوں کو معمولی کپڑوں میں دفن کیا تھا۔ ان کی مشکلیں ختم ہو گئی تھیں' ان کی فکر غائب ہو گئی تھی۔ عورتوں اور ماؤں نے اپنے اس مسکن کو بھاری دلوں سے چھوڑا۔ اور گیریسن کے معمولی فوجی نے بھی ریزیڈنسی کو بھاری دل دلوں سے چھوڑا کیونکہ ہیولاک بہت ہی کشمکش میں مبتلا تھا۔ سر کولن کیمپبل ان سے 17/ تاریخ کو ملا۔ اور اسے معلوم ہوا کہ اپنی تین فتوحات کی وجہ سے اسے آرڈر آف باتھ کا نائٹ کمانڈر کا خطاب دیا گیا۔ اس نے اپنی بیوی کو لکھا:

"سر کولن کیمپبل کے ساتھ 26/ ستمبر کے اخبارات آئے جس میں مجھے باتھ کا کمانڈر انچیف

بنانے کا اعلان کیا گیا تھا۔ صرف تین فتوحات کی وجہ سے۔ جب کہ اس کے بعد بھی میں نے نو جنگیں لڑی ہیں۔'' لیکن ان جنگوں کی وجہ سے اس کی صحت بالکل برباد ہو گئی تھی اور سخت جدو جہد کی وجہ سے اسے پیچش کا مرض لاحق ہو گیا۔ اس لیے 20/ تاریخ کو اسے دلکشا لے جایا گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اب اس کی موت قریب آگئی ہے۔ اس نے صرف اپنے لڑکے کو دیکھ بھال کی اجازت دی۔ ہیولاک ایک بہت جری سپاہی تھا اور ساتھ ہی عقیدت مند عیسائی بھی۔ جنگ کے میدان میں فوجی موت سے خائف نہیں ہوتے اور اس کے اندر کا عیسائی کسی بھی حالت میں کہیں بھی موت کا سامنا کرنے کو تیار تھا۔ وہ 24/ نومبر کو ختم ہو گیا۔ اور اس کے جسد خاکی کو عالم باغ میں ایک آم کے درخت کے نیچے دفنا دیا گیا جو شہر سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا اور جس کی فتح اس کے ملک کے لوگ ہمیشہ اس کے نام کے ساتھ جوڑیں گے۔ اس کی موت کے دو دن بعد اسے بیرونٹ کا خطاب دیا گیا۔ اور ہاؤس آف کامنس نے ہر مجسٹی کے ایما پر اسے سالانہ ایک ہزار روپے کی پنشن منظور کی۔ اس وقت تک کے لیے جتنی کہ اس کی طبعی عمر ہوتی۔

کیمپبل نے اسے دانشمندی سے بعید سمجھا کہ وہ زیادہ عرصے تک ریزیڈنسی میں مقیم رہے۔ اس کا پہلا کام تو یہ تھا کہ وہ یہاں سے عورتوں بچوں اور بیماروں کو نکالے۔ لیکن اپنی ہر چال کو پوشیدہ رکھنے کے لیے اس نے قیصر باغ کے بالمقابل توپچیوں کا ایک دستہ چھوڑ دیا۔ اور جب یہاں کے ہر شخص نے ریزیڈنسی کو چھوڑ دیا اس وقت انہوں نے یہاں کی ساری بتیاں جلی چھوڑ دیں۔ تاکہ باغیوں کو یہ شبہ نہ ہونے پائے کہ ریزیڈنسی خالی کر دی گئی۔ اس جگہ کے ویران کئے جانے کے بعد بھی باغی یہاں گولی باری کرتے رہے۔ آوٹ رام سب سے آخر میں اس جگہ سے نکلنا چاہتا تھا لیکن انگلس نے زور دے کر یہ کہا کہ یہ اس کا حق ہے کہ وہ اپنے پرانے گیریسن کے دروازوں کو بند کرے۔ لیکن خندق کو چھوڑنے والا سب سے آخری آدمی کیپٹن واٹرمین ثابت ہوا۔ جب گیریسن وہاں سے نکل رہا تھا اس وقت وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ جب وہ اچانک اٹھا تو اسے یہ دیکھ کر سخت تعجب ہوا کہ چاروں طرف غیر معمولی خاموشی چھائی ہوئی ہے۔ اس نے باہر نکل کر چاروں طرف دیکھا لیکن کوئی شخص نظر نہیں آیا۔ وہ دوڑتا ہوا ہر چوکی پر گیا۔ لیکن سب کو ویران پایا۔ پھر وہ مارے خوف کے تیز تیز دوڑنے لگا۔ اور آخرکار واپس جاتی ہوئی ٹکڑی کے عقب میں پہنچ گیا۔ اس سے اسے اس قدر دھکا لگا تاکہ وہ کچھ دیر کے لیے اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا تھا۔ چار قیدیوں میں سے صرف دو قافلے کے ساتھ جا سکے۔ محاصرہ ختم ہونے سے بہت پہلے ہی رکن الدولہ کی موت ہو گئی تھی۔ اور عالم باغ پہنچنے سے پہلے ہی تلسی پور کا نوجوان راجہ بھی ختم ہو گیا۔ سر کولن کے پاس وقت بہت کم تھا کیونکہ کانپور کو پھر خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ اس نے سر جیمس آوٹ رام کو عالم باغ میں چھوڑا اس جگہ پر انگریزوں کو اپنا قبضہ اس لیے بنائے رکھنا پڑا کہ جس سے اس برٹش عزم کا مظاہرہ ہو سکے کہ وہ جلد ہی لکھنؤ لوٹنے والے ہیں۔ کانپور سے صحیح خبریں نہیں مل رہی تھیں۔ جب کیمبل بنّی پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ گوالیار کی ٹکڑی نے آخرکار حملہ کر دیا ہے۔

گوالیار کے باغی بہت دنوں سے خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ جون میں وہ بغاوت پر آمادہ ہوئے۔ اتنے دنوں تک انہوں نے اپنی ساری حرکتیں کیوں روک رکھی تھیں۔

یہ راز بنا ہوا ہے۔ جب اندور کے لوگوں نے آگرہ میں شورش برپا کی تو گوالیار کے ان کے دوستوں نے ان کا ساتھ نہیں دیا۔ اور جب ہیولاک کو مدد کی خاص ضرورت تھی کیونکہ اس کے پاس فوج بہت کم تھی تو بھی وہ کانپور کے لیے آگے نہیں بڑھے۔ اگر انہوں نے اس پر اسی وقت حملہ کرنے کا ارادہ کر لیا ہوتا تو کانپور کو بالکل خالی کرایا جا سکتا تھا۔ اور باغیوں کا کچھ نام بھی ہو جاتا۔ اس وقت انہوں نے اس قدر کاہلی اور عدم دلچسپی کا مظاہرہ کیا کہ جب اس اہم اسٹیشن کا بچاؤ کرنے والی فوج کی اکثریت اسے لوگوں سے خالی کرا چکی تھی اور ہیولاک اور آوٹ رام لکھنؤ کے لیے آگے بڑھ چکے تھے' تو کسی بھی دور اندیش رہنما نے ایسے نازک وقت پر ضرور حملہ کر دیا ہوتا۔ شاید گوالیار فوج میں اس وقت کوئی بھی ہندوستانی افسر اتنی بصیرت اور دور اندیشی کا حامل نہیں تھا جو حملے کا منصوبہ بناتا اور وہاں کے فوجی بھی سندھیا کے چاندی کے سکوں کی لالچ میں وہیں پڑے رہے۔ انگریزوں کے دوست اور اس کے چیف منسٹر سَر دِنکر راؤ راج واڈے کو اس بات کا کریڈٹ ضرور ملنا چاہیے کہ مختلف بہانوں سے انہوں نے باغیوں کو اتنے دنوں تک بے کار رکھا۔ اور یہ انگریزوں کے لیے کم خدمت نہیں تھی کہ اتنی مضبوط فوج کا تعاون باغیوں کو نہ مل سکا۔ اس وقت جب کہ کافی موقع تھا وہ آگرے کے قلعے پر بھی قبضہ کر سکتے تھے اور دلّی کے باغیوں کے ساتھ بھی شامل ہو سکتے تھے۔ آس پاس کے علاقوں میں وہ چھاپہ مار لڑائی بھی لڑ سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے ایسا کچھ بھی نہیں کیا۔ اکتوبر میں جا کر انہوں نے اپنی کاہلی کو دور کیا اور کالپی کی طرف بڑھے۔ میلیسن کا کہنا ہے کہ دلّی سلطنت کے زوال کے بعد سندھیا کو اتنی زیادہ راحت ملی کہ اپنی فوج پر نگاہ رکھنا اس نے چھوڑ دیا۔ اور اس طرح سے فوج پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ تانتیا ٹوپے جو میلیسن کے مطابق بہت لائق اور دور اندیش شخص تھا' اس نے فوراً ہی ان کے اس تذبذب کا فائدہ اٹھایا اور ان کی کمان سنبھال لی۔ اس کے بعد کیا ہوا ہم نہیں جانتے۔ اسی وقت کنور سنگھ بھی باندہ سے کالپی کے لیے روانہ ہو چکا تھا۔ تانتیا کے اپنے آدمیوں نے آخر کار گوالیار کے لوگوں کو فیصلہ لینے کے لیے مجبور کیا۔ تاہم وہ بہت دھیمے دھیمے اور بے دلی سے آگے بڑھتے رہے۔ ان کی تعداد پانچ ہزار تھی اور ان کے پاس بہت زیادہ آرٹلری بھی موجود تھی۔ 9 نومبر کو وہ کالپی پہنچے اور انہوں نے تانتیا کی کمان کو قبول کر لیا۔

رام چند پنڈ وانگا عرف تانتیا ٹوپے ان چند فوجی رہنماؤں میں سے ایک تھا جو بغاوت کے دوران پیدا ہوئے۔ وہ برہمن تھا' اس کے باپ' باجی راؤ پر منحصر ہونے والوں میں سے ایک تھے۔ تانتیا' نانا کا وفادار ساتھی تھی۔ جان لینڈ جس نے اسے بٹھور میں دیکھا تھا۔ اس کے بارے میں لکھتا ہے: "وہ تقریباً 5 فٹ 8 انچ کا تن کر کھڑا ہونے والا آدمی تھا۔ شکل و صورت سے اچھا نہیں تھا۔ اس کی پیشانی بہت چھوٹی تھی اور نتھنے پھیلے ہوئے تھے۔ دانت چھترے اور گندے تھے۔ لیکن

آنکھوں سے شاطرانہ چال ظاہر ہوتی تھی۔ مجھے وہ کسی طرح سے بھی متاثر نہیں کر سکا۔" اسے کوئی فوجی تجربہ بھی نہیں تھا۔ اور شاید اس کی فوجی تربیت بھی اتنی ہی تھی جتنی اس زمانے کے اودھ کے اوسط نوجوانوں کی۔ مگر اس کے اندر نشانہ بازی کا جوہر تھا۔ لیکن اس کی بدولت یہ امید نہیں کی جاتی تھی کہ وہ ایسا رول ادا کرے گا جو اَب کر رہا تھا۔ لیکن اپنی قوم کی طرح اس میں بھی گوریلا چال پائی جاتی تھی اور یہ بھی مشہور ہے کہ کس طرح وہ انگریزوں کو دھوکہ دے کر باہر نکل گیا' جب کہ وہ سمجھ رہے تھے کہ انہوں نے اس کو قید کر لیا۔ نومبر 1857ء میں تیز رفتاری نے اس کی کامیابی کو یقینی بنایا ہر تا اگر وہ 13 تاریخ سے پہلے کانپور میں ظاہر ہو جاتا جب کیمبل لکھنؤ میں موجود تھا اور اس وقت اس بات کا قوی امکان تھا کہ وہ ونڈھم کو شکست دے دیتا جو کانپور میں چھوٹی سی فوج کے ساتھ موجود تھا۔ لیکن 17/ تاریخ کو جب سر کولن ریزیڈنسی میں داخل ہوئے' تانتیا کی فوج کانپور سے 15 میل کے فاصلے پر تھی۔

شجاعت کے معاملے میں ونڈھم کا کوئی ہمسر نہیں تھا' لیکن اس کے چیف کا حکم تھا کہ وہ خندقوں سے باہر آکر اس وقت تک جنگ نہ کرے جب تک کہ یہ اشد ضروری نہ ہو جائے۔ 17/ تاریخ کو ونڈھم شہر سے باہر آگے بڑھ گیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ خاص چوکیوں پر تیزی سے آگے بڑھ کر وہ باغیوں کو شکست دے دے گا۔ اور شہر اور مضافات کو لوٹ پاٹ سے بچالے گا۔ اس دوران لکھنؤ سے اس کا سارا رابطہ ختم ہو گیا۔ 24/ تاریخ کو اس نے کالپی سڑک کے چوراہے کے پاس پڑاؤ ڈالا اور پہلے حملہ کرنے کا ارادہ کیا۔ 26/ تاریخ کو اس نے تانتیا کی فوجوں کو تتر بتر کر انہیں واپسی کے لیے مجبور کیا۔ لیکن اب بھی اسے اصل فوج کا مقابلہ کرنا تھا۔ دوسرے دن باغیوں کی بڑی تعداد نے اس کی فوج کو شکست دے دی۔ 28/ تاریخ کو ونڈھم کی پوزیشن اور نازک ہو گئی۔ اور وہ مجبور ہوا کہ شہر چھوڑ کر پھر خندق میں پناہ لے۔

28/ تاریخ کو توپوں کی گڑگڑاہٹ کی آواز سن کر سر کولن کانپور کی طرف آگے بڑھے۔ اسے ایک خط موصول ہوا جس میں فوری طور پر مدد کی اپیل کی گئی تھی۔ جلدی جلدی دو اور خبریں بھیجی گئیں اور آخر میں کہا گیا کہ ونڈھم خندق میں پناہ لینے کے لیے مجبور ہو گیا ہے۔ کمانڈر انچیف نے اپنی فوج اور سارے دستے کو پیچھے چھوڑا اور اپنے اسٹاف کے چند ساتھیوں کے ساتھ گھوڑے دوڑاتا ہوا آگے بڑھا۔ اس کی قسمت سے ناؤ کا پل اب بھی محفوظ تھا۔ جب وہ کانپور پہنچا' اس وقت برٹش فوج آخری سانس لے رہی تھی۔ لیکن مدد پہنچ گئی تھی اور تانتیا نے اپنی زندگی کا یہ آخری موقع بھی کھو دیا۔

کیمپبل فوری طور پر حملہ نہیں کر سکا۔ جب تک کہ پورا فوجی عملہ الہ آباد کی سڑک پر حفاظت کے ساتھ آگے نہ بڑھ گیا' وہ آگے نہ بڑھ سکا' کیونکہ عورتوں' بچوں اور بیماروں کو جنہیں بحفاظت تمام وہ یہاں تک لایا تھا' ان کی حفاظت اس کی پہلی فکر تھی۔ لیکن تانتیا نے اسے تنہا نہیں چھوڑا۔ برٹش پڑاؤ کی طرف تیز گولہ باری کی گئی اور 4/ دسمبر کو اس نے ایک فاش غلطی کو سدھار

کرناؤ کے پل کو اُڑا دینا چاہا۔ لیکن تب تک اس پل کی مسلح حفاظت شروع ہو چکی تھی۔ 6/دسمبر کو کیمبل نے تانتیا پر حملہ کیا۔ چونکہ منصوبہ کے مطابق بالکل سیدھا تانتیا کے مرکز پر حملہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ نہ بائیں طرف حملہ ممکن تھا۔ اس لیے کولن نے فیصلہ کیا کہ وہ داہنی طرف حملہ کرے گا۔ اور گوالیار کی فوج کو نانا کے فوجیوں سے الگ کر کے انہیں برباد کرے گا۔ تعداد کے لحاظ سے تانتیا کی فوج دشمنوں کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی۔ لیکن ان میں سے اکثریت کے اندر کوئی صلاحیت نہیں تھی۔ نانا کی فوج بھی دس ہزار افراد پر مشتمل تھی لیکن یہ سب ابھی نئے نئے بھرتی ہوئے تھے۔ باغی فوجیوں پر یہ حملہ بالکل اچانک ہوا۔ وہ صبح کا ناشتہ تیار کر رہے تھے۔ اور توے پر روٹیاں پڑی ہوئی تھیں۔ جب یہ حملہ ہوا۔ وہ گھبرا گئے اور بھاگنا شروع کر دیا۔ جنرل مینس فیلڈ کو حکم دیا گیا کہ وہ بائیں طرف سے گھراؤ کرے اور ان کی واپسی کے راستے کو بند کر دے۔ لیکن مینس فیلڈ اپنے آدمیوں کو پرانے کینٹونمنٹ کے مکانوں کے پیچھے مشغول نہیں کرنا چاہتا تھا۔ باغی بٹھور روڈ سے ہوتے ہوئے بھاگے۔ تانتیا کا وسطی دستہ اب بھی شہر پر قابض تھا۔ لیکن اس کے داہنے دستے کو شکست ہو گئی تھی اور اس کا اپنا خیمہ بھی ختم ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی پوزیشن کو بہت نازک سمجھا اور رات کے اندھیرے میں بھاگ گیا۔ 8/تاریخ کو ہوپ گرانٹ کو بٹھور بھیجا گیا لیکن اسے معلوم ہوا کہ سپاہی سرائے گھاٹ میں ہیں۔ دوسری صبح جب وہ وہاں پہنچا تو باغی فوجیں بندوقوں سے لیس ہو رہی تھیں' اس لیے ان پر فوری طور پر حملہ کیا گیا اور باغی فوراً وہاں سے بھاگ گئے۔ اس طرح تانتیا کا کانپور پر قبضہ کیے جانے کا منصوبہ خاک میں مل گیا۔ ویسے بھی اس کا منصوبہ کوئی راز نہیں تھا اور اس کی ہر حرکت پر مخبر نگاہ رکھے ہوئے تھے۔ گرچہ اس کی فوج منتشر ہو گئی تھی' اس کے اسلحوں پر قبضہ پا لیا گیا تھا' لیکن وہ خود برٹش فوج کے لیے ہمیشہ خطرہ بنا رہا۔ فاتح فوج کی اب پوری توجہ بٹھور پر لگی ہوئی تھی۔ بریگیڈیر ہوپ گرانٹ کو اسی مقصد کے تحت وہاں بھیجا گیا۔ یہ کہا گیا کہ جنگ سے ایک رات قبل نانا نے وہاں آرام کیا تھا۔ لیکن صرف اس کا محل ہی انگریزوں کے غصہ کا نشانہ نہیں بنا' بلکہ آس پاس کے مندروں کو بھی توڑ دیا گیا۔ ہوپ گرانٹ کو صرف تاراج کرنے کے مقصد سے نہیں بھیجا گیا تھا۔ نانا جب جولائی میں اودھ کی طرف بھاگے تو اپنے ساتھ خزانہ بھی لے گئے' جنہیں بعد میں محل کے کنویں میں پھینک دیا گیا۔ کنویں کا پانی نکالا جانا تھا لیکن ان لوگوں کے پاس کوئی مشین نہیں تھی۔ اس لیے بالٹی سے پانی نکالنے کا روایتی طریقہ اپنایا گیا۔ ہر شخص نے اس امید اور لگن کے ساتھ اس خیال سے کام کیا کہ ان میں سے جو کچھ ملے گا اسے قانونی طور پر اس کا انعام سمجھا جائے گا۔ جب کسی صورت سے پانی نکالا گیا تو تہہ میں لکڑی کے بڑے بڑے شہتیر ملے۔ ان شہتیروں کو ہٹانے کے بعد بڑی مقدار میں ٹھوس چاندی اور چاندی کے برتن ملے۔ لیکن پانی کے اثر سے یہ سب سیاہ ہو گئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی سابق پیشوا کا چاندی کا ہودہ اور کچھ سونے کی چھڑیں اور دوسری چیزیں بھی ملیں۔ سطح کے اور نیچے' جیسے جلدی میں انہیں پانی میں چھوڑ دیا گیا ہو ان سقہ لوگوں کو اسلحے کے کچھ صندوق ملے جو مقامی روپے اور سونے کی

مہروں سے لبالب بھرے ہوئے تھے۔ جن کی قیمت 27/ دسمبر کو تقریباً دو لاکھ پونڈ لگائی گئی۔ ان کے علاوہ سونے اور چاندی کی پلیٹیں اور جڑاؤ زیورات الگ تھے۔ لیکن ان سقّوں کو جلد ہی ناامیدی کا سامنا کرنا پڑا' کیونکہ سکوں پر سرکار نے اپنا قبضہ کرلیا' یہ سوچ کر کہ سب اسی خزانے سے نکلے ہیں۔ اسی طرح سے جواہرات اور سونے چاندی کی دوسری اشیا پر حکومت نے اپنا قبضہ کرلیا اور ان لوگوں کو کچھ بھی نہیں ملا۔

دلّی پر قبضہ کرلیا گیا تھا۔ کانپور کو بچالیا گیا تھا۔ اور لکھنؤ کو چھڑالیا گیا۔ اب صرف فتح گڑھ کو واپس لینا باقی تھا۔ فرخ آباد سے چند میل کے فاصلے پر پٹھان نوابوں کی حکومت تھی اور فتح گڑھ ایک ایسے درمیانی راستے میں تھا جو کانپور کی سڑک کو آگرہ سے ملاتا تھا۔ یہاں ایک توپ بنانے والا کارخانہ قائم کیا گیا تھا۔ اور جب بغاوت پھیلی تو قلعے کی کمان کرنل اسمتھ کے پاس تھی۔ یہاں تعینات 10 ویں این آئی سمندر پار کرکے برما بھی گئی تھی۔ اور انہوں نے جیل میں ایک شورش کو کچل بھی دیا تھا۔ کرنل اسمتھ نے اسے مناسب سمجھا کہ عورتوں بچوں اور بیماروں اور پھر دوسرے سویلین لوگوں کو جون میں کانپور بھیج دیں۔ ان میں سے کچھ تو واپس آگئے۔ باقی سب کانپور کے نزدیک باغیوں کے ہاتھوں میں پڑگئے۔ جون کے وسط میں 10 ویں این آئی کے مقامی افسروں نے کرنل اسمتھ کو خبردار کردیا کہ اب وہ اس کا حکم نہیں مانیں گے۔ اور جو بچے ہوئے یورپین تھے انہوں نے قلعے میں پناہ لی۔ جولائی کے شروع میں قلعے پر قبضہ بنائے رکھنے میں ناکام ہونے پر اسمتھ اور اس کے کچھ باقی ساتھیوں نے تین ناؤوں پر سوار ہوکر قلعہ کو چھوڑ دیا۔ ان ناؤوں پر گولیاں چلائی گئیں۔ لیکن کچھ بھگوڑے دھارا میں پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔ جنہیں بعد میں بٹھور کے نزدیک پکڑ لیا گیا۔ 18/ جون کو باغیوں نے اپنی خدمات فرخ آباد کے نواب کو پیش کردیں۔ 1801ء میں ہوئے معاہدے کے تحت اودھ کے نواب نے فرخ آباد ضلع انگریزوں کے سپرد کردیا۔ اس کے بعد بھی مقامی حکمراں اس کی اسی طرح تعظیم کرتے۔ پھر ایک سال بعد اس نے اپنی ساری زمینیں کمپنی سرکار کو دس ہزار آٹھ سو روپے سالانہ پنشن کے عوض دے دیں۔ گرچہ بعد میں اسے اپنی پرانی سلطنت کا نواب بنادیا گیا' لیکن عجیب بات ہے کہ اس نے ہندو پڑوسی مین پوری کے راجہ سے کوئی دوستی نہیں کی' جو خود بھی برٹش حکومت کے مظالم کا شکار تھا۔

سرکولن کیمپبل فتح گڑھ کے باغیوں کو چاروں طرف سے گھیر کر پکڑنا چاہتا تھا۔ اس لیے فوج کا ایک کالم کرنل سیٹن کی کمان میں دلّی سے بھیجا گیا۔ کمانڈر انچیف نے کرنل والپول کے تحت ایک دوسرا کالم بھیجا جو مین پوری کے نزدیک سیٹن سے ملنے والا تھا۔ سرکولن خود بھی گنگا کے راستے بعد میں جانے والے تھے۔ دوآبہ کو باغیوں سے خالی کراکر انہیں روہیل کھنڈ اور اودھ کے علاقے میں بھگانا تھا۔ مین پوری سے ہڈسن' سیٹن کے کالم کے ساتھ کمانڈر انچیف کے کیمپ کی طرف چلا۔ یہ بڑی شجاعت کا کام تھا لیکن یہ بھی تھا کہ مین پوری اور میراں کی سرائے' جہاں ہڈسن کی ملاقات کیمپبل سے ہوئی' کا علاقہ دشمنوں کا نہیں تھا' کیونکہ ہڈسن نے زیادہ تر سفر دن کی روشنی

میں کیا اور اسے کہیں بھی باغیوں کا کوئی نشان نہیں ملا۔ صرف واپسی کے سفر میں اسے یہ بتایا گیا کہ جن 24 سواروں کے دستے کو اس نے چھبر امئو میں چھوڑا تھا وہ بالکل الگ تھلگ پڑ گئے ہیں اور باغی آس پاس کے علاقے میں موجود ہیں۔ جب کمانڈر انچیف کالی ندی کے پاس پہنچا تو باغی فوجیوں نے پل کو کچھ نقصان پہنچا دیا لیکن ابھی اتنا نقصان نہیں ہوا تھا کہ مرمت کر کے اسے درست نہ کیا جاسکتا۔ یہ بھی حیرت کی بات ہے کہ جب تک مرمت کا یہ کام چلتا رہا' کہیں کوئی باغی دکھائی نہیں دیا۔ اور جب پل کی مکمل طور پر مرمت کر لی گئی تو انہوں نے گولی چلانی شروع کی۔ کیپٹن اولیور جانس جو اس وقت موجود تھا' اس نے طنزیہ کہا: "جو لوگ ان سپاہیوں اور باغیوں کی رہنمائی کر رہے ہیں وہ کتنے بڑے احمق ہیں۔ بجائے اس کے کہ پل کے تیار ہونے تک وہ انتظار کرتے' انہیں جب ہم یہاں داخل ہوئے یا جب اس کی مرمت کا کام شروع ہوا یا آدھا مکمل ہو گیا تھا اور یہ مرمت کرنے والوں سے ہم لوگ ذرا سے فاصلے پر تھے' وہ ہم پر حملہ کرتے...... انہوں نے اتنی زیادہ دیر کی اور خود اپنا نقصان کیا۔ کیونکہ آس پاس کوئی قلعہ بھی نہیں تھا...... کیونکہ بھاری گولہ باری کے دوران پل کی مرمت ناممکن ہوتی اور گولہ باری کا کیا کہنا۔ کسی نے مزاحمت یا مخالفت میں ایک گولی بھی نہیں چلائی۔" جب نواب نے قلعہ کو خالی کیا۔ لیفٹیننٹ کرنل گارڈن الگزنڈر کے مطابق "تقریباً ایک لاکھ پونڈ کی سرکاری املاک' جس میں گن فیکٹری میں استعمال ہونے والی پختہ لکڑی' ہر قسم کی بندوقیں' سپاہیوں کی وردیاں' خیمے اور ہر طرح کے اسلحے پائے گئے۔ انہوں نے قلعہ میں بارود بنانے کا کارخانہ بھی قائم کر رکھا تھا۔ یہ بھی حیرت ہے کہ انہیں چھوڑ کر بھاگتے وقت ان میں سے کسی چیز میں آگ نہیں لگائی گئی۔ اور جب 3/ تاریخ کی شام کو کمانڈر انچیف قلعہ میں داخل ہوئے تو انہوں نے کشتیوں میں باغیوں کو ندی پار کرتے ہوئے دیکھا اور ان باغیوں نے ناؤ کے پل کو بھی برباد کرنے کی ہمت نہیں کی۔

4/ جنوری کو بیٹن بیور کے نزدیک والپول کے ساتھ مل کر کمانڈر انچیف سے جا ملے۔ فتح گڑھ میں فوج کافی دنوں تک مقیم رہی۔ آس پاس کے مضافات میں ان مسلمانوں کے گھر تھے "جو خاص پارے جیسی صفت رکھتے تھے۔" اور اس لیے ان جگہوں پر امن وامان قائم رکھنے کے لیے ایک سزا دینے والے دستے کو بھیجا گیا۔ فوج کے ساتھ مسٹر پاور کمشنر بھی تھے' جنہیں کیمپ میں ان کے دوست اور ان کی تعریف کرنے والوں نے انہیں "پھانسی دینے والے پاور کا نام دے رکھا تھا۔" مسٹر پاور جہاں بھی رکتے۔ وہاں وہ عدالت قائم کرتے اور تھوڑی سی سنوائی کے بعد ان باغیوں کو جو جون میں فتح گڑھ میں ہوئے مظالم کے لیے ذمہ دار پائے گئے یا جن پر شبہ کیا گیا' انہیں فوراً موت کی سزا دے دیتے۔ اسی طرح مئو میں بھی ایسے سو باغی آس پاس کے گاؤں میں چھپے ہوئے تھے۔ انہیں تلاش کر کے ان پر فوراً مقدمہ قائم کر کے موت کی سزائیں دی گئیں اور شہر کے وسط میں ایک بڑے پیپل کی شاخوں میں انہیں پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔

گرینڈ ٹرنک شاہراہ بالکل صاف ہو گئی تھی اور ایک بار پھر سے بنگال' پنجاب' کلکتہ اور

لاہور کے درمیان مواصلات قائم ہوگئے تھے۔ لیکن اودھ اور روہیل کھنڈ پر اب بھی باغیوں کا قبضہ تھا۔ فتح گڑھ کی شکست کے بعد روہیل کھنڈ کا راستہ صاف ہوگیا تھا۔ سر کولن نے محسوس کیا کہ اس فتح کے بعد روہیل کھنڈ پر پیش قدمی کر کے اس پر قبضہ کرنا زیادہ مناسب ہوگا تاکہ باغیوں کی ایک بڑی تعداد جو وہاں جمع ہوگئی ہے' انہیں اکھاڑ پھینکا جائے' ان کے اسلحوں پر قبضہ کیا جائے اور اپنی حکومت پھر سے وہاں قائم کی جائے' جیسا کہ دوآبے میں کیا جارہا ہے۔ اس لیے اودھ کو خالی کرانے کے ارادے کو 1858ء کی سرما تک کے لیے ملتوی کر کے اپنی ساری فوج سہارنپور اور بریلی میں لگائی جائے جہاں بڑی تعداد میں باغی فوجی جمع ہوگئے ہیں۔ ان آس پاس کے علاقوں کو محکوم بنانے کے بعد جب باغی فوجی صرف اودھ میں رہ جائیں تو انہیں اکھاڑ پھینکنا زیادہ آسان ہوگا۔ کمانڈر انچیف اور اس کے صلاح کاروں کا یہ خیال تھا کہ اودھ کو خالی کرانے کا ارادہ فی الحال اس وقت تک ملتوی کیا جائے جب تک 30 ہزار فوجی نہ ہوجائیں۔ جب کہ دوسری طرف گورنر جنرل اور ان کے صلاح کاروں کا خیال تھا کہ ہند برٹش فوج کی فوری توجہ اودھ پر ہونی چاہیے۔ ہیولاک' ریزیڈنسی خالی کرنے کے خیال سے متفق نہیں تھا اور آوٹ رام کا بھی یہی خیال تھا۔ کیونکہ لکھنؤ سے برٹش جھنڈے کا اترنا باغی فوجیوں کے لیے فتح سمجھی جائے گی۔ اور اس کے سیاسی اثرات برٹش حکومت کے لیے برے ثابت ہوں گے۔ کیونکہ سیاسی طور پر لکھنؤ بھی دلّی جیسا ہی اہمیت کا حامل تھا۔ گورنر جنرل نے اسے لکھا: ''اب ہر شخص کی آنکھ اودھ پر لگی ہوئی ہے۔ جیسے یہ پہلے دلّی پر لگی ہوئی تھی۔ اودھ صرف باغی فوجیوں کے جمع ہونے کی جگہ نہیں ہے' جو فتح و شکست کے مقدر سے جڑی ہے۔ بلکہ یہ ایک حکمرانی کا تخت ہے جہاں کا اپنا ایک بادشاہ ہے۔ ہر مقامی ہندوستانی کی نگاہ پچھلے دو سال سے صرف اودھ پر لگی رہی ہے۔ ہم اس پر قبضہ پاتے ہیں یا نہیں؟'' اس لیے حملے کے دوسرے مرحلے میں اودھ کو ہی روہیل کھنڈ کے مقابلے میں ترجیح دی جانی چاہیے اور آوٹ رام جو عالم باغ میں اس بات کا انتظار کررہا ہے کہ اودھ پر کب قبضہ کیا جائے' اسے واپس ہونے کی اجازت نہیں دی جانی چاہیے۔ ان سیاسی امور کی بدولت کمانڈر انچیف کو گورنر جنرل کا مشورہ قبول کرنا پڑا۔

اودھ کی سلطنت پر شمال کی جانب سے پہلے ہی حملہ شروع ہوگیا تھا۔ جنگ بہادر' جو نیپال کے راجہ تھے وہ ضرورت کے وقت کارآمد بن کر انگریزوں سے اپنی دوستی ثابت کرنا چاہتے تھے۔ جب بغاوت پھیلی اور برٹش وقار داؤں پر لگ گیا تھا تب جنگ بہادر نے نیپالی فوج کی خدمات برٹش حکومت کو پیش کیں۔ گرچہ اس کی اس پیش کش کو فوری طور پر قبول نہیں کیا گیا' لیکن لارڈ کیننگ نے سیاسی طور پر یہ مناسب نہیں سمجھا کہ اس کی دوستی کو ٹھکرا دے۔ جولائی میں تین ہزار گورکھا فوج گورکھپور ضلع میں داخل ہوئی۔ جہاں محمد حسین بحیثیت ناظم باغیوں کی حکومت قائم کرچکے تھے۔ پرانے نظام کے تحت محمد حسن گورکھپور کے ناظم تھے۔ لیکن اس پر قبضہ کے بعد ان کا یہ عہدہ ختم ہوگیا۔ انہوں نے کرنل لینوکس اور فیض آباد کے بہت سے بھاگے ہوئے انگریزوں کو خطرہ مول لے کر پناہ دی تھی۔ اور اس وقت بھی جب اودھ کی حکومت کے ساتھ انہوں نے وفاداری کا

عہد کیا تو بھی انہوں نے ان پناہ گزینوں کا خون بہانے سے انکار کر دیا۔ اور جب برٹش حکومت نے اس کی جاں بخشی کا اعلان کیا' انہوں نے فوری طور پر جواب دیا کہ وہ اپنے لیے نہیں بلکہ اپنے آقا اور شاہ کے لیے لڑ رہے ہیں۔ ان کے خلاف گورکھا فوج نے جنگ کی اور گورکھپور سے جونپور اور اعظم گڑھ کے لیے آگے بڑھے' نہ صرف یہ کہ انھوں نے اپنی فوج بھیجی بلکہ جنگ بہادر نے اپنی خدمات بھی پیش کیں۔ یہی وجہ تھی کہ دوسرے علاقوں کے مقابلے میں اودھ کو اولیت دی گئی۔ 21/ دسمبر کو جنگ بہادر دس ہزار فوجیوں کو لے کر سرحد پر پہنچے جہاں ان کی ملاقات جنرل جی ایچ میک گریگر سے ہوئی جنہیں گورنر جنرل نے گورکھا فوج سے رابطے کے لیے اپنا ایجنٹ مقرر کیا تھا۔

جب یہ فیصلہ کرلیا گیا کہ دوسری جگہوں کے مقابلے میں اودھ پر دوبارہ حکمرانی قائم کرنے کو اولیت دی جائے گی تو کمانڈر انچیف فتح گڑھ سے کانپور کے لیے روانہ ہو گئے۔ لیکن حملہ کرنے میں اس وقت تک تاخیر کی گئی جب تک سردیوں کا موسم بالکل ختم نہیں ہو گیا۔ جنرل فرینک کو اودھ میں مشرق کی طرف سے داخل ہونا پڑا۔ اور سیاسی وجوہات کی بنا پر سرکولن کو جنگ بہادر کا انتظار کرنا تھا۔ وہ جنگ کا آغاز 18/ فروری سے کرنا چاہتے تھے۔ لیکن جنرل فرینکس اور جنگ بہادر دونوں کے 27/ فروری سے پہلے اودھ پہنچنے کی امید نہیں تھی۔ لارڈ کیننگ نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ جنگ بہادر کا انتظار کیا جائے۔ "یہ بات انہیں دل شکستہ کرنے کے لیے کافی ہو گی کہ اس عظیم فتح سے انہیں محروم کر دیا گیا...... مجھے یقین ہے کہ ایسی صورت میں وہ ہم سے سارے تعلقات ختم کرلیں گے۔ اور ایک ہفتے کے اندر اپنے ملک کو لوٹ جائیں گے۔ ان کی مدد سے محرومی ہمارے لیے تکلیف دہ ہو گی اس لیے میں تاخیر کرنے کے حق میں ہوں۔" اس لیے کمانڈر انچیف کو ایک طاقتور پڑوسی کو خوش کرنے کی ضرورت کا احترام کرنا پڑا۔

جنرل فرینکس پہلے ہی پیش قدمی کر چکے تھے۔ ان کے ساتھ ایک گورکھا افسر پہلوان سنگھ بھی تھا۔ انہیں 19/ فروری کو چاندہ کے نزدیک بندہ حسن اور مہدی حسن کی اودھ کی فوج سے مقابلہ کرنا پڑا۔ مہدی حسن نے پھر بدھایاں کے نزدیک ان کے مارچ میں رکاوٹ ڈالی اور اسے خود شکست ہوئی۔ اس کے بعد فرینکس سلطانپور کی طرف بڑھے جہاں لکھنؤ کے ایک جنرل غفور بیگ کی طاقتور فوج کا سامنا کرنا پڑا۔ ان سے بہت مشکلوں سے جیت حاصل کرنے کے بعد اپنی فوج کو آرام دینے کے خیال سے وہیں ٹھہر گیا۔ دوسرے دن جالندھر کی تیسری سکھ بٹالین ان سے آملی۔ 4/ مارچ کو فرینکس لکھنؤ سے 8 میل کے فاصلے پر تھے۔ جنگ بہادر 11/ مارچ تک لکھنؤ نہیں پہنچے تھے۔

اس دوران عالم باغ میں آوٹ رام کو بہت زیادہ دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کے پاس فوج کی تعداد اتنی کم تھی کہ کھلی جگہ پر مقابلہ آرائی کے لیے ڈٹے نہیں رہ سکتے تھے اور پھر یہ جگہ لکھنؤ کے اتنے قریب تھی کہ باغیوں کی نظر سے زیادہ دیر تک اوجھل نہیں رہ پاتی۔ اس کے علاوہ کانپور سے مواصلاتی رابطہ بھی اتنا طویل تھا کہ بغیر دشواری کے انہیں بنائے رکھنا مشکل تھا۔ اگر

اودھ میں مدد جلدی نہیں پہنچی تو وہ اسے چھوڑ کر کانپور کے نزدیک کسی اسٹیشن پر چلے جاتے۔ کیونکہ عالم باغ کی اپنے آپ میں کوئی سیاسی اہمیت نہیں تھی۔ اور اودھ کا کوئی بھی علاقہ برٹش عزم کی اس علامت کے طور پر استعمال کیا جاسکتا تھا کہ وہ اس صوبے میں بہر حال اپنا قبضہ بنائے رکھنا چاہتے تھے۔ لیکن اگر لکھنؤ دوسرا نشانہ تھا تو وہ عالم باغ پر ہر قیمت پر اپنا قبضہ بنائے رکھیں گے۔ اور اسے انہوں نے چھ حملوں کے باوجود بنائے رکھا۔ اور یہ حملے بھی بہت خاص موقعوں پر آہنی ارادے سے کیے گئے تھے۔ ایک بار یہ حملہ اس وقت ہوا جب گیریسن کے آدھے لوگ کنوائے ڈیوٹی پر گئے ہوئے تھے۔ ایک بار ان باغیوں کی کمان اس شخص نے کی جو ہنومان کا بھیس بنائے ہوئے تھا۔ ایک بار خود ملکہ کی فوج جس کے ساتھ ملکہ بھی تھیں، لڑائی کے میدان میں فوجیوں کی ہمت افزائی کے لیے آئیں۔ آوٹ رام ان حملوں کی وجہ سے کبھی اچنبھے میں نہیں پڑا۔ اس کے مخبر ہمیشہ اسے دشمن فوج کے ارادوں سے باخبر کرتے رہے۔ باغیوں کے حملے کا ارادہ بہت صحیح وقت پر ہوتا۔ لیکن کوئی ایسا ان کا رہبر نہ ہوتا جو جنگ کی شاطرانہ چالوں سے واقف ہو۔ فارسٹ نے بعد میں لکھا۔ ''سپاہیوں کو جو بھاری نقصان کا سامنا کرنا پڑا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کے اندر ہمت کی کمی نہیں تھی۔ لیکن جیسا دتی میں ہوا، لیڈر شپ کی کمی تھی، اگر ان کی رہنمائی ایسے شخص نے کی ہوتی جو جنگ کی چالوں سے واقف ہوتا تو انگریز کمانڈر کے لیے یہ ناممکن ہوتا کہ وہ یہاں ٹھہرا رہتا یا کانپور سے برابر رابطہ قائم رکھ پاتا۔'' تین مہینوں تک آوٹ رام نے باغیوں کو اپنے سے دور رکھا اور ساری دشواریوں کے باوجود عالم باغ میں ڈٹا رہا، جب سر کولن کیمبل نے لکھنؤ پر آخری حملہ کرنے کے لیے اپنی ساری تیاریاں مکمل کرلیں۔ اب کانپور میں اس کے لیے کوئی پریشانی کی بات نہیں تھی۔ کیونکہ اس کی حفاظت کے لیے اس نے ساری تیاریاں کرلی تھیں کہ اگر گوالیار کی فوج مزید حملہ کرنے کے بارے میں سوچے تو بھی کانپور کو کوئی پریشانی نہ ہو۔ اس نے ہوپ گرانٹ کو کانپور سے 25 میل کے فاصلے پر فتح پور چوراسی بھیجا جہاں سے یہ خبر ملی تھی کہ نانا وہاں چھپے ہوئے ہیں۔ ہوپ گرانٹ وہاں 17/ فروری کو پہنچے اور انہوں نے جسّا سنگھ باغی لیڈر کے قلعہ کو آگ لگادی۔ لیکن نانا وہاں نہیں تھے۔ پہلی مارچ کو ہوپ گرانٹ سے کہا گیا کہ وہ بنترا میں چیف سے آکر ملے۔ سر کولن نے ایک دن پہلے کانپور کو چھوڑ دیا تھا اور پچاس میل کا سفر گھوڑے پر طے کیا، اور عالم باغ پہنچے اور پھر وہاں سے واپس بنترا آئے، جوان کا نیا ہیڈ کوارٹر تھا۔ 2/ مارچ کو صبح سویرے لکھنؤ پر حملے کا آغاز ہوا۔

اس دوران لکھنؤ کی حفاظت کو ہر طرح سے مضبوط کرلیا گیا تھا۔ ہر جگہ مٹی کا کام کیا گیا۔ اور شہر میں تین طرفہ رکاوٹیں تیار کی گئیں۔ لیکن گومتی کے شمالی کنارے کی طرف کوئی فوج نہیں دی گئی اور حفاظت کرنے والوں کا اسی طرح نقصان ہوا جیسے کہانیوں میں ایک آنکھ کے جانور کا۔ سر کولن کے ساتھ اُنیس ہزار فوجی تھے اور فرینکس اور جنگ بہادر کے آنے کے بعد یہ تعداد بڑھ کر تیس ہزار ہوگئی۔ کمانڈر انچیف بہت مناسب طریقے سے اپنے شیڈول کے مطابق دھیرے

دھیرے آگے بڑھے۔ اور اگر اس شیڈول کے برخلاف کوئی جھڑپ پہلے ہو جاتی تو وہ خوش نہیں ہوتے۔ آوٹ رام ندی کے شمالی کنارے پر گیا۔ اس کا کام اس سمت کو باغی فوجیوں سے صاف کرنا تھا۔ اس نے پروگرام کے مطابق عمل کیا اور لوہے کے پل کے پاس کھڑا ہو گیا۔ لیکن اسے پار کرنے کی اجازت نہیں تھی کیونکہ سر کولن کسی قسم کا خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھے۔ بعد میں باغی فوجیوں کے ایک ساتھ اس طرف سے بھاگ نکلنے کی وجہ بریگیڈیر کیمپبل کی لاپروائی پائی گئی۔ گومتی کے اودھ کی طرف کے حصے پر فوج نے پہلے دلکشا' بعد میں مارٹینئر اور ایک ایک کر کے سارے محلوں' باغوں' مسجدوں' مقبروں پر قبضہ کیا گیا۔ اور جب باغیوں نے اپنے کو ہر طرف ناکام پایا تو شہر چھوڑ کر بھاگ گئے۔ انہوں نے بڑی جوانمردی سے مقابلہ کیا۔ اور جب بیگم کوٹھی میں انگریز داخل ہوئے تو آٹھ سو ساٹھ باغی فوجی صرف اس کے آنگن میں مرے پڑے تھے۔ ملکہ عالیہ نے کبھی ہمت نہیں ہاری اور اپنے آدمیوں کے درمیان بڑے جوش سے موجود رہیں اور ان کے اس عزم کی بدولت کامیابی ملنی چاہیے تھی۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اور 18/ مارچ کو شہر کا ہر اہم حصہ انگریزوں کے ہاتھ میں تھا۔ باغیوں کی ایک بڑی تعداد جنہیں بیگم خود بھی جوش دلا رہی تھیں' نے 19/ مارچ تک موسیٰ باغ پر قبضہ رکھا۔ مولوی' جو اوروں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہمت ور تھے' انہیں 22/ مارچ کو ہی شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اس طرح لکھنؤ کی شکست ہو گئی۔ لیکن اودھ پر اب بھی فتح حاصل کرنا باقی تھی اور جو قیدی عورتیں تھیں انہوں نے رسل کو بتایا کہ ان کے آدمیوں کی فتح آخر کار ہو گی۔

لیکن دوسرے مقبوضہ شہروں کی طرح لکھنؤ کا بھی حشر ہوا۔ بیگم کوٹھی پر قبضہ کیے جانے کے بعد تباہی بربادی اور لوٹ مار کا سلسلہ شروع ہوا' رسل نے خود بیان کیا۔ "لوٹ پاٹ کے اس منظر کو بیان کرنا ناممکن ہے۔ سپاہیوں نے بہت سے اسٹور روم توڑ دیئے اور ان میں جمع سارے سامان کو صحن میں لاکر جمع کر دیا۔ جہاں نقش و نگار بنے کپڑے' چاندی اور سونے کے بروکیٹ' چاندی کے برتن' بندوقیں' بینر' ڈرم' شال' اسکارف' آلات موسیقی آئینے' تصویریں' کتابیں' دواؤں کی بوتلیں' بڑی بڑی شیلڈیں' بھالے وغیرہ کا ڈھیر اوپر تک لگا ہوا تھا۔ جن کی تفصیل بتانے کے لیے ایک پورا کیٹلاگ تیار کرنا پڑتا۔ انہوں نے تمام بیکار چیزوں کو توڑنا پھوڑنا شروع کر دیا تاکہ سونے کے زیورات جن میں جواہرات جڑے ہوئے تھے' کے ڈھیر تک پہنچ سکیں۔ وہاں یہ سپاہی جس پاگل پن سے لوٹ رہے تھے' اس کے لیے یہ محاورہ کہ 'لوٹ سے پاگل ہو گئے' صادق آتا ہے۔ میں نے اس محاورے کو اکثر سنا تھا لیکن اپنے سامنے اسے عملاً پہلی بار دیکھا۔" گرچہ لوٹ میں حاصل کی گئی یہ ساری چیزیں بعد میں پوری فوج کے حق میں جمع کرالی گئیں تب بھی اس بات کا شبہ پایا جاتا ہے کہ افسروں کے ہاتھوں میں جو قیمتی چیزیں ہاتھ لگیں انہوں نے اسکاٹ لینڈ' انگلینڈ اور آئرلینڈ میں خفیہ طور پر بھیج دیا۔ میں نے خود لکھنؤ کی تاراجی کے دو سال بعد وہاں کے جواہرات سے مزین زیورات کو ایک لاکھ 80 ہزار پونڈ میں نیلام ہوتے دیکھا۔ لکھنؤ چھوڑنے سے پہلے

ایک اعلان نامہ موصول ہوا تھا۔ لیکن جب تک شہر پر انگریزوں کی حکومت قائم نہ ہو گئی اس کی اشاعت پر روک لگا دی گئی تھی۔ آوٹ رام نے اس اعلان کو بہت زیادہ سخت پایا۔ کیونکہ اس میں سارے اعلیٰ مرتبے کے زمینداروں کو 'سوائے چھ کے 'بُرے لفظوں میں یاد کیا گیا تھا۔ گورنر جنرل نے اودھ کے لوگوں کو یاد دلایا کہ اب ان کا وجود دارالسلطنت برٹش حکومت کے رحم و کرم پر ہے' جس کے خلاف انہوں نے بغاوت کی تھی۔ "انہوں نے بہت بڑا جرم کیا اور اب ان کے ساتھ مناسب فیصلہ ہونے والا ہے۔ گورنر جنرل کا پہلا فریضہ تو یہ ہوگا کہ وہ ان لوگوں کو انعام دیں جو اپنی وفاداری میں ثابت قدم رہے۔ گورنر جنرل نے اس اعلان میں لوگوں کو یاد دلایا کہ سوائے ان چیزوں کو جنہیں چھوڑا گیا ہے 'اودھ کی سرزمین پوری طرح سے برٹش حکومت کی ملکیت ہو گئی ہے' جو اسے جیسا مناسب سمجھے گی 'کرے گی۔ ان تعلقداروں 'سرداروں اور زمینداروں سے کہا گیا کہ وہ اپنے سارے عملے کے ساتھ اودھ کے چیف کمشنر کے سامنے خود سپردگی کر دیں۔ اپنے اسلحے جمع کرا دیں اور اس کے احکامات کی تعمیل کریں۔ ایسی صورت میں آنریبل گورنر جنرل یہ وعدہ کرتے ہیں کہ ان کی زندگی اور عزت برقرار رہے گی۔ بشرطیکہ ان کے ہاتھ انگریزوں کے خون سے آلودہ نہ ہوں۔ لیکن اس کے بعد کیا ہوگا' وہ برٹش حکومت کے رحم اور انصاف پر مبنی ہوگا۔

آوٹ رام نے اپنی ساری کوشش کی کہ وہ ان لوگوں کو ہر طرح کی تقویت بہم پہنچائے جن کی ساری املاک کو ضبط کئے جانے کی دھمکی دی گئی تھی۔ اس کے باوجود بھی برٹش انصاف کے تئیں ان کو یقین نہیں رہ گیا تھا۔ اور انگریزوں کے رحم و کرم کی بات ان کے لیے فسانہ سے زیادہ نہیں تھی۔ اپنی زمینوں اور اپنے وقار کو کھو دینے کے بعد ان کا زندہ رہنا بے کار تھا اور تعلقداروں نے اس کے لیے آخر دم تک لڑنے کا تہیہ کیا۔ جس طرح نواب کے زمانے میں ایک بار انہوں نے کیا تھا۔ "پھر سے ایک بار شورش بھڑک اٹھی' اتنے بڑے علاقے میں جتنی کبھی نہیں ہوئی تھی۔"

# باب ششم

# بہار

لکھنؤ کے مصائب پٹنہ کے نزدیک ہوئی شورش کی وجہ سے اور زیادہ بڑھ گئے۔ 1857ء میں پٹنہ میں ولیم ٹیلر حکومت کر رہے تھے، جو بہت سخت آدمی تھے۔ وہ کبھی اپنی ذمہ داریوں سے پیچھے نہیں ہٹے اور نہ ہی کوئی غلط بات برداشت کرتے۔ وہ ان کمیاب اشخاص میں سے ایک تھے جس نے کبھی کوئی غلطی نہیں کی، جو ہمیشہ صرف اپنے فیصلے پر اعتماد کرتے رہے اور کبھی کسی دوسرے کی رائے سے متاثر نہیں ہوئے۔ پانچ سالوں تک شاہ آباد کے ضلع جج رہے اور صدر عدالت میں جگہ پانے کی ان کی خواہش رہی لیکن جب فوری اقدام کی ضرورت تھی تو ان کی منصفانہ تربیت ان کی راہ میں نہیں حائل ہوئی۔ یورپین کاشتکاروں کو ان کی قوت سے سکون ملتا، کیونکہ ان کا بہت بڑا مفاد بہار سے وابستہ تھا اور شورش یا بدنظمی کا مطلب ہوتا، ان کا تجارتی نقصان۔ صرف سخت اقدام ہی امن قائم رکھ سکتے تھے اور بغاوت کو پھیلنے سے روک سکتے تھے۔ ٹیلر ایک ایسے شخص تھے جس کی اس وقت بہار کو ضرورت تھی۔ اسے یقین تھا کہ پٹنہ میں پوری طرح سازش چل رہی ہے کیونکہ پٹنہ وہابیوں کا مرکز تھا۔ اور ہر وہابی بنیادی طور پر باغی تھا۔ اس کے نزدیک ہر مسلمان مشتبہ باغی تھا۔ گرچہ اس کے دست راست اور وفادار پرانے افسر مولا بخش مسلمان تھے اور شاہ کبیر الدین جنہیں "پیلا ہتھوڑا" کہا جاتا، وہ بھی اسی قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ قاضی رمضان علی نے چھپرہ کی حفاظت انگریزوں کے لیے اس وقت کی جب سارے سویلین افسر اسے چھوڑ چکے تھے اور سید ولایت علی خاں "مقامی سے زیادہ یورپین تھے۔" لیکن یہ لوگ استثنا تھے۔

پٹنہ، ندی اور سڑک کے ذریعہ کلکتہ کو بنارس سے ملاتا اور شمالی مغربی صوبوں کے لیے مرکز کی حیثیت سے کام کرتا۔ پڑوسی کینٹونمنٹ شہر داناپور میں تین فوجی ٹکڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ ساتویں آٹھویں اور چالیسویں این آئی جو مقامی آرٹلری کی کمپنی تھی، اس کے ساتھ ہی ہر مجسٹی کے ٹینتھ فوٹ اور یورپین آرٹلری کی ایک کمپنی بھی تھی۔ میرٹھ کی بغاوت کے بعد سے ہندوستانی فوجی سویلین اور ملٹری افسروں کے لیے ہمیشہ پریشانی کا باعث رہے۔ میجر جنرل لائڈ جو داناپور ڈویژن کی کمان کر رہے تھے، انہوں نے 53 سالوں تک فوج کی خدمت کی تھی اور سنتھال بغاوت کو

جس طرح انہوں نے کچلا تھا' اس کے لیے لارڈ ڈلہوزی نے بھی ان کی تعریف کی تھی۔ داناپور کے فوجی زیادہ تر پڑوسی ضلع شاہ آباد کے تھے۔ 7/ جون کو انہوں نے بنارس کے واقعات کے بارے میں سنا۔ بعد میں اندیشہ ظاہر کیا گیا کہ وہ بھی کوئی شورش کر سکتے ہیں۔ جنرل لائڈ نے بہت سنجیدگی سے مقامی فوجیوں کو غیر مسلح کرنے کے بارے میں فیصلہ کیا اور مدراس سے اسی غرض سے 15 آدمی بھی بلائے گئے۔ لیکن یہ فوجی وفادار بنے رہے۔ "میں بخوبی واقف تھا کہ ان میں سے کچھ لوگ اپنے اسلحے کے ساتھ فرار ہوئے ہوں گے' باوجود میری ساری پیش بندیوں کے۔ لیکن اپنے اس فیصلے کو ملتوی کر کے مجھے کافی خوشی ہوئی' کیونکہ اس وقت زیادہ اہمیت اس بات کی تھی کہ یورپین افسر اور فوجیوں کو فوراً شمال جنوب کے علاقے میں بھیجا جائے کیونکہ یہی ایک راستہ تھا کہ ہم اپنے افسروں اور فوجیوں کو جو ان علاقوں کی اتنے دنوں سے حفاظت کر رہے تھے' بچایا جائے۔" انہوں نے لکھا۔ کمانڈنگ افسر سبھی اس بات پر متفق تھے کہ کلکتہ اور کانپور کی درمیانی شاہراہ کو ہر صورت میں محفوظ رکھا جائے۔ لیکن اس کے لیے انہوں نے جو مشورے دیئے وہ مختلف تھے۔ لارڈ کیننگ اس بات کے لیے تیار نہیں تھے کہ "غصہ میں حکومت کی جائے۔" سر فریڈرک ہالی ڈے نے مزید اطلاعات فراہم کرنے کے لیے کہا۔ جنرل لائڈ کو کوئی بھی راستہ نہیں سوجھ رہا تھا کہ اگر سپاہی بھاگنے پر تیار ہوں تو انہیں کیسے روکا جائے۔ لیکن ٹیلر اس بات کے لیے مضطرب تھے کہ انجانے دشمن پہ فوری طور پر ہلہ بولا جائے۔

میرٹھ میں بغاوت کی خبر سے بہار کے آس پاس کے علاقوں میں بے چینی پھیل گئی تھی اور بنارس کی رپورٹ سے بھگدڑ مچ گئی۔ اور بہت سے یورپین نے مضافات میں اپنی جگہوں کو چھوڑ کر پٹنہ میں پناہ لینی شروع کر دی جہاں پہلے ہی سے اس افواہ سے خوف پیدا ہو چکا تھا کہ داناپور میں بغاوت کے امکان ہیں اور 7/ تاریخ کو ٹیلر نے شہر کی یورپین آبادی کی حفاظت کے لیے ساری ذمہ داری اپنے اوپر لے لی۔ اور اس نے اپنے بنگلے کو چھاؤنی میں بدل کر سب کو پناہ دینی شروع کی' تاہم اسے چھاؤنی کی حفاظت کے لیے مقامی فوجیوں پر منحصر ہونا پڑا جن کی وفاداری اس کی اطلاع کے مطابق شبہ سے بالاتر نہیں تھی۔ اس لیے اس نے ریٹرے کے سکھوں کو پٹنہ بلایا۔ یہ بھی خبر دی گئی کہ جب وہ پٹنہ کی طرف آ رہے تھے تو دیہی آبادی نے انہیں بے دین کہہ کر گالیاں دینی شروع کیں اور سکھ گرنتھی نے انہیں گوردوارے میں داخل ہونے سے منع کر دیا۔

جون کے مہینے میں داناپور میں خاموشی رہی۔ ٹیلر اپنے کو دل شکستہ محسوس کرنے لگا۔ کیونکہ حکومت نے اس کے اس مشورہ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا کہ مقامی فوجیوں کو فوری طور پر غیر مسلح کر دیا جائے۔ اس کے دلائل سے جنرل لائڈ بھی متاثر نہیں ہوئے۔ لیکن مقامی مخبروں کی اطلاعات سے اس کی بے چینیاں بڑھتی گئیں۔ صوبے کے سبھی بڑے زمینداروں کے بارے میں اطلاع دی گئی کہ وہ سب انگریزوں کی دشمنی پر آمادہ ہیں۔ وہابیوں کے بارے میں کہا گیا کہ وہ سرکار کے خلاف بڑے پیمانے پر سازش کر رہے ہیں۔ 12/ جون کو نجیب نام کا ایک شخص

سکھوں کو بغاوت پر اکساتے ہوئے پایا گیا۔ اس پر مقدمہ چلایا گیا۔ جرم ثابت ہوا اور اسے پھانسی دے دی گئی۔ لیکن وہابی لیڈروں کو عدالت میں نہیں بلا سکتا تھا کیونکہ ''اس بات کی وافر شہادت کہ وہ براہِ راست ان سازشوں میں شریک رہے ہیں' جو ادھر برپا ہوئی ہیں' اتنی نہیں ہیں کہ ان کے خلاف کوئی قانونی کارروائی کی جاسکے۔'' اور ٹیلر نے یہ بھی قبول کیا کہ ان لیڈروں کی طرف سے لوگوں کو اکسائے جانے والے ان خطوط کو ان کے جاسوسوں نے پیش کیا ہے۔ ان میں سوائے ایک کے سبھی جعلی ہیں۔ میلیے سن لکھتا ہے: ''ان وہابی مولویوں میں سے تین شخص خاص طور پر اہم ہیں۔ شاہ محمد حسین' احمد اللہ اور واعظ الحق۔ ان لوگوں کو کھلے عام پکڑنے کا مطلب ہو تا کہ بغاوت کو بڑھاوا دیا جائے۔ جسے ٹیلر ہر قیمت پر ٹالنا چاہتا تھا۔ لیکن امن عامہ کی خاطر یہ ضروری تھا کہ انہیں کسی صورت سے حراست میں لیا جائے۔ اس لیے مسٹر ٹیلر نے ان کے ساتھ کچھ اور لوگوں کو حکومت کے معاملات میں غور و فکر کے لیے جمع ہونے کی دعوت دی۔ اور جب کانفرنس ختم ہو گئی تو اوروں کو تو جانے دیا گیا لیکن ان تینوں اشخاص کو یہ کہہ کر روک دیا کہ موجودہ حالات کے تحت یہ ضروری ہے کہ ان کی سخت نگرانی کی جائے۔'' میلیسن کو اس میں کوئی غلطی نظر نہیں آتی۔ اس کا خیال تھا کہ ٹیلر ملک میں حکومت کا نمائندہ تھا اور یہ مولوی بھی اس حکومت کی رعایا تھے وہ ٹیلر کے مہمان نہیں ۔تھے۔ اور وہ اس کے مکان پر اس حکومت کی آواز سننے آئے تھے جو ان کی خدمت کر رہی تھی اور اس آواز میں انہیں اس وقت تک حراست میں رکھنے کا حکم دے کر کوئی غلطی نہیں کی۔ ٹیلر اپنے اس اقدام کا جواز دیتا ہے۔ میں نے ان لوگوں کو اس مقصد سے خاص طور پر بطور ضمانت حراست میں لیا تھا کہ ان کی وجہ سے ان کے سارے لوگ اچھا رویہ رکھیں گے۔ انہیں کسی اور وجہ سے اس لیے نہیں حراست میں لیا گیا تھا کہ وافر شہادت ہونے کی وجہ سے انہیں سزا دی جائے۔ اس نے اسے ایک جرأت مند لیکن خطرناک قوم بھی کہا اور کچھ کمزور لوگوں نے محسوس کیا کہ اس سے بغاوت اور پھیلے گی۔ میں نے نفع نقصان کا حساب کرتے ہوئے یہ قدم اٹھایا اور مجھے خوشی ہے کہ میری امیدوں کے مطابق ہی اس کا نتیجہ نکلا۔ یقیناً یہ ایک خطرناک قدم تھا۔ لیکن بہادری کا قدم نہیں تھا۔ اس کے لیے کسی ہمت کی ضرورت نہیں کہ آپ غیر مشتبہ لوگوں کو اپنے گھر بلائیں اور انہیں اس وقت قید کرلیں جب وہ کسی طرح کی مزاحمت کی پوزیشن میں نہ ہوں۔ اور یہ بھی غیر یقینی ہے کہ ایسا کرتے وقت ٹیلر نے نفع نقصان کا اندازہ کیا تھا۔ کیونکہ اس قوم سے براہِ راست سیدھا معاملہ کرنے کی برٹش شہرت کو کافی نقصان ہوا۔ خاص طور پر اس وقت اپنی شہرت کو داغ دار بنانے کا کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتی۔ جو لوگ ٹیلر کی حمایت کرتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ اس کے آٹھ سال بعد وہابی سازش ہوئی اور مولوی احمد اللہ ان تین میں سے ایک تھے جنہیں ٹیلر نے 20 رجون کو حراست میں لیا تھا۔ اس موقع پر انہیں بغاوت کا مجرم بھی پایا گیا تھا۔ یہ بھی نوٹ کرنے کی بات ہے کہ تمام دوسرے معاملات میں ٹیلر کو یہ خبریں موصول ہوئیں' وہ سب بے بنیاد تھیں۔ ڈمراؤں کے مہاراجہ اور ٹکاری کی رانی پر بھی ایسے ہی شبہ کیا گیا تھا کیونکہ

بڑے زمیندار بھی اسی طرح پریشان تھے، جیسے برٹش حکمراں۔ اپنی زندگی اور املاک کی حفاظت کے لیے فکر مند تھے۔ لیکن جب انہوں نے تہ خانوں سے زنگ آلود بندوقیں نکالیں، یا کچھ مسلح لوگوں کو اپنی حفاظت پر مامور کیا تو ان پر بھی سازش کا الزام لگایا گیا تھا۔

وہابیوں نے بحیثیت قوم اس بغاوت میں شرکت نہیں کی۔ ملک کے دوسرے لوگوں کی طرح سے انفرادی طور پر کوئی وہابی شاید ہی 1857ء کی بغاوت میں شامل ہوا ہو۔ لیکن قوم نے اپنا مقدر سپاہیوں کے لیڈروں کے ساتھ وابستہ کر دیا۔ اور سر جان لارنس نے اس کو مناسب نہیں سمجھا کہ پنجاب سے سارے یورپین فوجیوں کو بھیج دیا جائے۔ اور بڑے پیمانے پر پنجابی مسلمانوں کو بھرتی کر برطانیہ کی حمایت میں لڑنے کے لیے کہا جائے۔ فروجٹ، جس نے بمبئی میں فوجیوں کی سازش کو بے نقاب کیا، وہ بھی یہ ثبوت فراہم کرتا ہے کہ اعلیٰ مرتبہ کے وہابیوں سے اسے کتنا زیادہ تعاون ملا۔ مجھے یہ لکھتے ہوئے افسوس ہو رہا ہے کہ بمبئی بھی وہابیوں کے اثر سے آزاد نہیں تھی۔ لیکن مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی ہو رہی ہے کہ مجھے وہابیوں سے ہر طرح کا تعاون ملا۔ بمبئی کا قاضی جو یہاں کے مسلمانوں کا سب سے بڑا نمائندہ تھا، وہ خود بھی کٹر وہابی تھا۔ لیکن اس نے دن رات کے کسی حصے میں بھی ضرورت ہونے پر اپنی خدمات بلا تکلف پیش کر دیں۔ اسی طرح پولیس کا صوبیدار محمد بودن خود بھی وہابی تھا۔ لیکن اسی نے مجھے سوناپور میں فوجیوں کی سازش کو بے نقاب کرنے میں بھرپور مدد دی۔ اگر ان کے لیڈروں نے بہار میں کسی اور طرح کا فیصلہ کیا ہوتا تو بمبئی کے باغیوں کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ پولیس کے کمشنر کو اتنا زیادہ تعاون دیتے۔ بنگال کے لیفٹیننٹ گورنر نے 30/ ستمبر 1858ء کو اپنے روزنامچے میں لکھا: "اس وقت کوئی بھی نہ تو ایسا ثبوت سامنے آیا اور نہ وہابیوں کے خلاف کسی طرح کا کوئی الزام۔ بلکہ ایک بوڑھے وہابی لیڈر کی فراہم کردہ اطلاع کو بھی نظر انداز کر دیا گیا۔"

پٹنہ کے اس "کلچرڈ کمشنر" کے اس شیطانی حرکت کی نتائج نے بھی تصدیق نہیں کی۔ کیونکہ اگلے مہینے کی ابتدا میں پٹنہ میں ایک فساد ہوا جو بغاوت سے یکسر مختلف تھا۔ کیونکہ اس میں فوجیوں میں کوئی شورش برپا نہیں ہوئی۔

ٹیلر نے صرف اتنے ہی پر اکتفا نہیں کیا۔ وہابی لیڈروں کی گرفتاری کے بعد اس نے فوراً ہی اعلان کیا کہ پٹنہ کے جن شہریوں کے پاس اسلحے ہیں، انہیں 24 گھنٹے کے اندر جمع کرا دیں۔ اور کوئی بھی شخص بغیر اجازت کے رات میں نو بجے کے بعد اپنے گھر سے نہیں نکلے گا۔ ان دو حکم ناموں پر عملدرآمد نہیں ہو سکا۔ کیونکہ دونوں ہی غیر قانونی تھے اور ایک نازک وقت میں وہ لوگوں کو بھڑکا سکتے تھے۔ کمشنر نے یہ ضروری نہیں سمجھا کہ اس کے لیے پہلے سے سرکار سے اجازت لے لیتا۔ لیفٹیننٹ گورنر نے محسوس کیا کہ بغیر کسی خاص اطلاع کے اس نے جلد بازی میں یہ قدم اٹھا کر سمجھا کہ فتنے کا سدباب کر دیا گیا ہے۔ لیفٹیننٹ گورنر کے ان خیالات کو اسسٹنٹ سکریٹری نے صاف صاف اس تک پہنچا دیا اور ٹیلر کے علاوہ اگر کوئی دوسرا شخص ہوتا تو خبردار ہو جاتا۔ "لیفٹیننٹ گورنر

آپ کو تنبیہ کرتے ہیں کہ آپ بہت زیادہ سخت یا غیر قانونی قدم نہ اٹھائیں۔ اور چونکہ آپ نے اس کے اسباب نہیں بتائے اس لیے لیفٹیننٹ گورنر محسوس کرتے ہیں کہ آپ جلد بازی میں غلط قدم اٹھا رہے ہیں۔ لیفٹیننٹ گورنر کی بے اطمینانی آپ سے پہلے ہی بتائی جا چکی ہے۔" اس کے جواب میں ٹیلر نے لیفٹیننٹ گورنر سے درخواست کی کہ وہ بہت جلدی کسی فیصلے پر اس وقت تک نہ پہنچیں جب تک یہ نہ معلوم کر لیا جائے کہ اس سے ہر طرف کتنی زیادہ حفاظت اور اعتماد پیدا ہو گیا ہے۔ اور پورا شہر ہم سے خائف ہو گیا ہے۔ اور جہاں تک خوف پیدا کرنے کا سوال ہے' میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ وہ کمپنی کی حکومت سے خوفزدہ ہو کر ہی عام شہریوں کی زندگی گزار رہے ہیں۔ اس نے یہ بھی کہا کہ جو آدمی موقع پر موجود ہو وہی صورت حال دیکھ کر فیصلہ کر سکتا ہے۔ اس نے یہ بھی لکھا کہ ایسے نازک موقع پر اگر وہ فیصلہ کن قدم نہ اٹھاتا تو وہ اپنی ان ذمہ داریوں سے لاپروائی برتتا جو اس عہدہ کے شایان شان ہے۔" مختصر اً ٹیلر نے اس بات کی وکالت کی کہ صرف نتائج ہی وسائل کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے وہ مقصد نہیں حاصل ہو سکا اور خوف کی پالیسی ناکام ہو گئی۔

3/جولائی کی شام کو مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد نے سڑکوں پر اپنا جھنڈا ابھارتے ہوئے جلوس نکالا۔ ڈاکٹر لائل جو اوپیم ایجنٹ کا اسسٹنٹ تھا۔ اس نے پچاس نجیب اور آٹھ سکھوں کو حکم دیا کہ وہ ان کے پیچھے پیچھے چلیں۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ اس جگہ پہنچتے' اسے گولی سے مار کر اس کا سر کاٹ لیا گیا۔ بعد میں فسادی سب بھاگ نکلے۔ ان میں سے صرف ایک مارا گیا۔ اور ایک زخمی ہوا۔ ایک مقامی کتب فروش پیر علی جو وہابی بھی تھے' انہیں ان کے لیڈر کی حیثیت سے گرفتار کیا گیا۔ جن لوگوں پر مقدمہ قائم کیا گیا ان کی تعداد 43 تھی۔ انہیں کسی عام عدالت میں نہیں بھیجا گیا بلکہ ایک کمیشن کے سامنے پیش کیا گیا جس میں ٹیلر اور پٹنہ کے مجسٹریٹ مسٹر لوئس شامل تھے۔ ان کا فوری طور پر فیصلہ کیا گیا۔ ان 43 میں سے 19 کو پھانسی دی گئی۔ پانچ کو جلاوطنی کی سزا اور ایک کو کوڑے لگائے گئے اور صرف تین کو بے قصور پا کر چھوڑا گیا۔ اس سزا پر صرف ٹیلر نے اکیلے دستخط کیا۔ اور جن انیس آدمیوں کو موت کی سزا دی گئی تھی' انہیں فوراً پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ ٹیلر کے جانشین سیموئل کو شبہ تھا کہ بغیر وافر شہادت کے یہ ساری سزائیں دی گئی ہیں۔ اور سارے دستاویز بعد میں نظامت عدالت کو بھیج دیئے گئے۔ عدالت نے صرف جن لوگوں کو قید یا کوڑے کی سزا دی گئی تھی انہیں سے تفتیش کی اور انہوں نے جو نتیجہ اخذ کیا وہ ٹیلر کے خلاف تھا۔ "عدالت نے بہت باریکی سے ان مقدموں کے سارے دستاویزوں کو دیکھا اور ان کا خیال ہے کہ قیدی نمبر 15 سے 23'25 سے 28'30'31'38'39' اور 40 کے خلاف سزائیں بغیر وافر شہادت کے دی گئی ہیں۔ انہوں نے قیدی نمبر 24 سعادت علی کو بھی اسی بنیاد پر رہا کر دیا۔ جو 21 مجرم بچے ہوئے تھے اور جنہیں بھی ٹیلر نے سزائیں دی تھیں' ان میں سے نظامت عدالت کے ججوں نے 19 آدمیوں کو بری کر دیا۔ لوس نے تحریری طور پر ان سزاؤں کی ذمہ داری سے اپنے آپ کو بچا لیا۔

اس نے لکھا: اس فساد کے بعد جس میں ڈاکٹر لائل کی جان گئی' کچھ لوگ جنہیں اس سے متعلق سمجھا گیا' مقدمہ کے لیے مسٹر ٹیکر جو کمشنر تھے اور میرے سامنے لایا گیا۔ ان میں سے کچھ لوگ جن کے بارے میں یقین تھا' انہیں سزا سنائی گئی اور فوراً پھانسی دے دی گئی۔ باقی قیدیوں کے اس میں ملوث ہونے کے بارے میں مجھے شبہ ہے۔ اور میری رائے ہے کہ بغیر وافر شہادت کے انہیں سزا دینا میرے لیے مناسب ہے۔ اس لیے میں نے مزید جانچ پڑتال کے لیے انہیں پولیس حراست میں رکھنے کا بجھاؤ دیا۔ مسٹر ٹیلر نے اس پر اعتراض کیا اور کہا کہ ان سب کے خلاف موجودہ شہادت کافی ہے اور یہ سب کے سب مجرم ہیں' وہ مجھے متاثر نہ کر سکے اور میں اب بھی اپنی رائے پر قائم ہوں۔ مسٹر ٹیلر نے تب بجھاؤ دیا کہ ان سب بندیوں کو دس سال کی قید کی سزا دی جائے اور جب ہر طرف امن وامان قائم ہو جائے' اس وقت سرکار اگر مناسب سمجھے تو اس معاملے میں بھی تفتیش کر سکتی ہے۔" مسٹر سیموئل کا یہ تبصرہ اس ظلم کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔ علی پور جیل میں انہوں نے کہا کہ مولا بخش نے ان سے غلط گواہی دینے کے لیے کہا تھا۔ مولا بخش نے اس معاملے کی پوری مسل تیار کی تھی اور اس کا دفتر ٹیلر کے کمپاؤنڈ میں تھا اور یہ اس کا کام تھا کہ وہ گواہوں کو رضامند کرے۔ سیموئل مزید لکھتا ہے' جب اس مقدمہ کی سماعت ہو رہی تھی تو صوبے کے دوسرے ضلعوں میں اس کا کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔ ان سزاؤں کا جو اثر پڑے گا اور جسے عوام غلط سمجھتے ہیں' اس سے ہر جگہ بے اطمینانی پھیلے گی۔ گورنر جنرل نے 4/مارچ 1859ء کی روداد میں لکھا: "میرا یقین ہے کہ جب ٹیلر مقدمہ کی سنوائی کر رہے تھے تو انہوں نے بغیر وافر شہادت کے لوگوں کو سزائیں دیں۔ لیکن چونکہ ٹیلر نے استعفیٰ دینے کی دھمکی دے دی تھی' اس لیے انہوں نے اس معاملے کی عوامی سنوائی کیے جانے کا حکم نہیں جاری کیا۔

ٹیلر نے بہ نفس نفیس خود ہی قید کیے گئے لوگوں سے ان کی رہائی کے عوض مول بھاؤ شروع کیا اور انہیں اس بات کے لیے آمادہ کیا کہ وہ اس معاملے میں اگر دوسروں کو پھنسا دیں تو ان کی رہائی ممکن ہے۔ جلد ہی ایک مقامی پولیس افسران کے سامنے سازش کے سلسلہ میں خط و کتابت کرنے کے الزام میں پیش کیا گیا تو ٹیلر نے اس سے کہا: "میں تم سے سودا کروں گا۔ تم مجھے تین زندگیاں دو' میں تمہیں تمہاری زندگی واپس کر دوں گا۔" پیر علی امیر آدمی نہیں تھا۔ یہ شبہ کیا گیا کہ اس کے پیچھے ایک بہت بڑا فائنانسر ہے۔ ایک شخص جس کا نام شیخ گھسیٹا تھا اسے بھی مقدمہ چلا کر پیر علی کے ساتھ سزا دی گئی' وہ پٹنہ کے سب سے دولت مند بینکر لطف علی کی ملازمت میں تھا۔ اور یہ شبہ کیا گیا کہ یہی وہ غیر معروف شخص ہے جس نے پیر علی کی تنظیم کو پیسہ فراہم کیا تھا۔ اس کے خلاف خاص جرم یہ عائد کیا گیا کہ وہ اس تنظیم کے خاص لیڈر کو بھڑکا رہا تھا۔ لطف علی اس معاملے میں خوش قسمت تھا کہ مسٹر ٹیلر کی عدالت میں نہیں بلکہ پٹنہ کے سینئر جج کی عدالت میں مقدمہ چلا جہاں سے وہ بری ہو گیا۔ اگر کوئی بھی ہندوستانی پٹنہ میں اپنے کو محفوظ نہیں محسوس کر رہا تھا تو مسٹر ٹیلر کو کلکتہ کے تاجروں کی حمایت حاصل تھی اور اس نے ایک منٹ کے لیے بھی یہ سوچنے کی

زحمت نہیں کی کہ اس کے اس عمل کا داناپور کے سپاہیوں پر کیا اثر پڑے گا۔

جنرل لائڈ جو داناپور ڈویژن کی کمان کر رہے تھے' انہیں بغاوت کے کوئی آثار نظر نہیں آئے جب تک کہ کچھ ایسے اسباب نہ ہو جائیں جس سے سپاہی اشتعال میں آ جائیں۔ حکومت ہند نے ہندوستانی فوجیوں کو غیر مسلح کیے جانے کا مشکل فیصلہ خود اس پر چھوڑ دیا۔ اس وقت یورپین فوج پٹنہ ہوتی ہوئی بنارس جا رہی تھی۔ اور جنرل لائڈ سے کہا گیا کہ جب یہ فوج داناپور پہنچے اور آپ کے پاس مقامی فوجیوں پر اعتبار نہ کرنے کے خاص اسباب ہوں اور آپ اس خیال پر پختہ ہو جائیں کہ اب انہیں غیر مسلح کرنا مناسب ہے تو آپ کو اس بات کی چھوٹ ہے کہ آپ اس فوج کو اپنے پاس روک لیں۔ لیکن اس کو ضروری سمجھیں کہ انہیں کم سے کم وقت کے لیے ہی روکیں۔ اس کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ تینوں مقامی ریجمنٹ کو غیر مسلح کر دیا جائے اور انہیں سمجھایا گیا کہ ایسا خود ان کے مفاد میں کیا جا رہا ہے۔ کیونکہ آس پاس ہر جگہ اشتعال دینے والے لوگ موجود ہوتے ہیں۔ یہی دلیل بنارس میں بھی دی گئی تھی لیکن وہاں لوگوں کو اطمینان نہیں ہوا اور یوں بھی سپاہی کم ہی بچے تھے۔ ان میں بہتوں نے غیر مسلح کیے جانے کو اپنی بے عزتی سمجھا۔

نیل کے کاشتکار بہت دور اندیش تھے اور جنرل لائیڈ کو جو حکم دیا گیا تھا' اس سے وہ پوری طرح باخبر تھے۔ لائیڈ کو یہ خط 15/ جولائی کو لکھا گیا تھا اور 20/ تاریخ کو یہ سبھی کاشتکار گورنر جنرل سے ملے اور ان سے داناپور کے سپاہیوں کو فوراً ہی، غیر مسلح کیے جانے کا حکم صادر کرنے کو کہا۔ وہ جانتے تھے کہ لائیڈ ابھی اس قدم کے حق میں نہیں ہیں۔ اور وہ اسے مجبور کرنا چاہتے تھے کہ ان کے منافعوں میں کوئی تخفیف نہ ہونے پائے۔ اس طرح سے ایک فوجی راز کو عام کر دیا گیا۔ فوجیوں کے اپنے بھی طریقے خفیہ راز کو جاننے کے لیے تھے۔ اور جو ترکیب وہ استعمال کرتے' وہ آفیشیل راز پہنچنے سے پہلے انہیں معلوم ہو جاتا۔

لائیڈ ابھی فیصلہ کن قدم اٹھانے سے جھجک رہا تھا۔ اس نے یہ فیصلہ 24/ جولائی کو کیا۔ لیکن اب بھی خاص ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے اس نے ایک درمیانی راستہ نکالا۔ اگر ان تینوں مقامی ریجمنٹس کی پیریڈ کرائی جاتی اور برٹش بندوقوں کے سامنے انہیں ہتھیار ڈالے کا یہ حکم دیا جاتا تو عام طور پر لوگوں نے اسے مان لیا ہوتا اور کسی بھی طرح کی مزاحمت کو کچل دیا جاتا۔ اگر سپاہیوں کو ان کی حالت پر چھوڑ دیا جاتا کیونکہ ابھی تک انہوں نے شورش کا کوئی مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ اور چیزیں ویسی ہی چلتی رہتیں جیسی چل رہی تھیں' جب تک کہ کوئی انہونی بات نہ ہوتی۔ لیکن لائیڈ نے فیصلہ کیا کہ وہ ان کی لوہے کی ٹوپیاں اتروا لے اور اس طرح سے ان کے اسلحے کو بغیر ان کی بے عزتی کے بے کار کر دیا جاتا۔ دوسری صبح سبھی یورپین فوجی بیر کس میں بلائے گئے اور دو بیل گاڑیاں جمع کرنے کے لیے بھیجی گئیں۔ واپسی میں انہیں ساتویں اور آٹھویں ریجمنٹ کے لوگوں نے پکڑ لیا اور انہیں روکنے کی کوشش کی لیکن ان کے افسروں نے انہیں سمجھا بجھا امن وامان قائم کیا۔ پھر ان گاڑیوں کو جانے دیا گیا۔

لائیڈ کا کام ابھی آدھا ہی ہوا تھا۔ ہر سپاہی کے پاس ایسی 15/ ٹوپیاں تھیں لیکن اسے امید تھی جب ان سے کہا جائے گا تو وہ اسے بھی واپس کر دیں گے۔ اور واپسی کا یہ کام مقامی افسران بخیر و خوبی انجام دے دیں گے۔ لیکن سپاہیوں نے اپنی ٹوپی واپس کرنے سے انکار کر دیا۔ اور اس بار یورپین افسر کے سمجھانے بجھانے کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا۔ افسروں سے کہا گیا کہ وہ چلے جائیں۔ ایسا بھی کہا جاتا ہے کہ ان پر گولیاں بھی چلائی گئیں۔ یورپین اسپتال کے محافظوں نے افسروں کو بھاگتے ہوئے دیکھا اور اس نے گولی چلا کر اشارہ کیا' اس کی وجہ سے ہر مجسٹی کی دسویں' جو ہر وقت چوکنا رہتی تھی' فوراً سامنے آگئی۔ جو مریض بھی بھرتی تھے وہ اسپتال کی چھتوں پر پہنچ گئے اور گولیاں چلانی شروع کیں۔ "تقریباً ایک درجن بد معاش مارے گئے۔" چالیسویں مقامی انفینٹری والے پہلے شامل نہیں ہوئے لیکن جب یورپین اسپتال کی چھت سے دسویں بٹالین کے لوگوں نے گولیاں چلانی شروع کیں تو وہ باغیوں سے مل گئے۔ ٹیلر نے اپنی پیشین گوئی کو سچ ہوتے ہوئے دیکھا کیونکہ لائیڈ نے بھاری غلطی کی تھی۔ اسے یہ اہم کام مقامی افسروں کے سپرد نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اور اپنی نگرانی میں ان ٹوپیوں کو جمع کرانا چاہیے تھا۔ جب بغاوت پھیلی اس وقت وہ ندی میں ایک اسٹیمر پر بیٹھا تھا۔ ملٹری افسران اس وقت اس کی رہنمائی سے محروم ہو گئے جب اس کی اشد ضرورت تھی۔ لیکن جیسا کہ لائیڈ کو اندازہ تھا' باغیوں کی واپسی کا راستہ روکا نہیں جا سکا۔ وہ فوراً ہی آرہ کی طرف مڑے جو ان کے ضلع شاہ آباد کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ ان میں کچھ نے اپنے بیوی بچوں کو پیچھے چھوڑ دیا۔ ظاہر ہے کہ یہ بغاوت کی لہر سوچی سمجھی اسکیم سے نہیں پیدا ہوئی تھی۔

لائیڈ نے ندی کے ذریعہ ان کے بھاگنے کے راستے کو روکنا چاہا۔ اور اس کے اسٹیمر سے کچھ باغیوں سے بھری ناویں ڈوب بھی گئیں۔ سوائے کچھ ناؤوں کو ڈبانے کے وہ اور کچھ نہ کر سکا۔ اسے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ یہ کہاں جا رہے ہیں۔ وہ آرہ بھی جا سکتے تھے۔ اور بڑا قدم اٹھا کر پٹنہ کے لیے خطرہ پیدا کر سکتے تھے۔ یا ہو سکتا ہے کہ گیا کی طرف آگے بڑھ جاتے۔ تاہم پٹنہ کو بچانا اس کی پہلی ذمہ داری تھی۔ اس لیے ایک ٹکڑی دو توپوں کے ساتھ فوری طور پر پٹنہ بھیج دی گئی۔ کیونکہ باغیوں کی حرکت کے بارے میں کوئی ٹھوس اطلاع نہیں ملی تھی۔ 26/ تاریخ کو ایک اسٹیمر' جس میں بہت سے رائفل مین تھے' سون تک بھیجا گیا۔ لیکن اسٹیمر آگے نہیں بڑھ سکا۔ کیونکہ یہاں پانی بہت اتھلا تھا۔ ایک دوسرا اسٹیمر آرہ کے لیے روانہ کیا گیا تاکہ وہ سویلین کو لے کر واپس آئے۔ لیکن یہ بھی ریت کے ساحل میں پھنس گیا۔ ایک تیسرا اسٹیمر جو الہ آباد سے چلا تھا اور جس میں کلکتہ کے مسافر بیٹھے تھے' وہ شام کو یہاں آیا۔ اس اسٹیمر کو فوری طور پر طلب کیا گیا۔ لیکن اسٹیمر کے کیپٹن نے سوتے ہوئے مسافروں کو جگانا مناسب نہیں سمجھا۔ 29 کی شام کو یہ اسٹیمر جس پر تھوڑی سی فوج تھی' کیپٹن ڈن بار کی قیادت میں روانہ ہوا۔

یہ مہم بھی کافی نقصان دہ ثابت ہوئی۔ باغی فوجی جن کی قیادت جگدیش پور کے کنور سنگھ کر رہے تھے' نے اس پارٹی کو گھیر لیا۔ جو شخص سب سے پہلے گرا وہ کیپٹن ڈنبار تھا۔ "ہمارے چاروں

طرف سے رات کے اندھیرے میں مسکٹ کی گولیاں برستی رہیں۔ پوری فوج میں افراتفری مچ گئی۔ دوسری صبح صرف واپس مڑنا ہی ان کے لیے واحد راستہ رہ گیا تھا۔ ان چار سو آدمیوں میں سے جو ایک دن پہلے بھیجے گئے تھے تقریباً آدھے گدھوں اور سیاروں کی خوراک بن گئے اور جو واپس آئے ان میں سے صرف پچاس ایسے تھے جن پر کوئی زخم نہیں لگا تھا۔" اس ناکامی سے اتنا بڑا دھکا لگا کہ ٹیلر جیسا پُراعتماد افسر بھی پریشان ہو گیا۔ اور اس نے سبھی ضلع کے افسروں کو فوراً پٹنہ پہنچنے کے لیے کہا۔ اس کے نتیجہ میں ٹیلر کو پٹنہ کے کمشنر کے عہدے سے ہٹا دیا گیا۔ اور اسے مشرقی بنگال کے دور دراز کے ضلع میمن سنگھ میں ضلع جج بنا کر تعینات کیا گیا۔ اس نے اس کے خلاف شکایت بھی کی اور جب اسے لگا کہ ان شکایتوں پر کچھ نہیں ہونے والا تو اس نے استعفیٰ دے دیا۔ لیکن اس نے اپنی لڑائی بند نہیں کی۔ اس نے پمفلٹ کے ذریعہ یہ لڑائی جاری رکھی جس کی وجہ سے اس کے بہت سے ہمدرد پیدا ہو گئے۔

آرہ میں اچانک بغاوت نہیں پھیلی۔ ٹیلر نے وہاں کے مجسٹریٹ ویک کو پہلے ہی اشارہ کر دیا تھا کہ وہاں کسی بھی لمحے بغاوت پھیلنے کے اس کے پاس وافر اسباب ہیں۔ فوراً ہی کونسل کی میٹنگ طلب کی گئی بچوں اور عورتوں کو دانا پور بھیج دیا گیا۔ اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ ریلوے انجینیر مسٹر بوائیل کے مکان کو بطور دفاع استعمال کیا جائے، جہاں مرد بعد میں پناہ لے سکیں۔ وہاں پر کچھ بارود اور اسلحے مہیا کرائے گئے، لیکن غیر یورپین افسروں نے وہاں رکنا مناسب نہیں سمجھا اور دو کو چھوڑ کر باقی سب دانا پور چلے گئے۔ یہ ساری تیاریاں بے معنی ہو جاتیں اگر ٹیلر نے پہلے ہی پچاس سکھوں کو ویک کی مدد کے لیے نہ بھیج دیا ہوتا۔ 26/ جولائی کو ایک سوار یہ خبر لایا کہ باغی فوجیوں نے سون ندی کو پار کر لیا ہے۔ جلد ہی اس خبر کی تصدیق ہو گئی اور 15/ یورپین اور یوریشین اور پچاس سکھوں نے اس چھوٹی سی عمارت میں پناہ لی جو بوائیل نے پہلے ہی اپنے قبضے میں لے لی تھی۔ اور ان کے ساتھ ایک واحد مسلمان سید عظیم الدین حسین ڈپٹی کلکٹر نے بھی پناہ لی۔ 27/ جولائی کو باغی فوجی آرہ پہنچے اور انہوں نے کنور سنگھ کی کمان میں اپنے کو دے دیا۔

کنور سنگھ کی عمر کافی ہو گئی تھی۔ وہ اس وقت 70 سال کے ہو چکے تھے۔ ان کی صحت بھی خراب رہنے لگی تھی۔ نومبر 1854ء میں پٹنہ کے کمشنر ڈیمپیئر نے کہا کہ اب کنور سنگھ کی زندگی کے چند سال ہی باقی ہیں۔ اس کے پاس کاشت کی بہت بڑی زمین تھی۔ جس کی آمدنی تقریباً 3 لاکھ روپے تھی وہ ہر سال ایک لاکھ 48 ہزار کی مالگزاری ادا کرتے تھے۔ لیکن وہ پڑھے لکھے نہیں تھے اور نہ ہی ان کی کوئی ایسی تربیت ہوئی تھی جو اپنی اتنی وسیع املاک کی نگہبانی کر سکیں۔ ڈیمپیئر اور ٹیلر کو یہ یقین تھا کہ اس کے لالچی ایجنٹس نے اسے بہت زیادہ دھوکا دیا ہے۔ ڈیمپیئر نے لکھا کہ اس کی ناتجربہ کاری کا فائدہ اس کے خادموں نے خوب اٹھایا اور بڑی بڑی رقموں کا بانڈ سود کی بڑی شرحوں پر خرید لیا۔ "میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ اسے صرف ہزار روپے ملے جب کہ اس نے دس ہزار کا بانڈ خریدا تھا۔" ٹیلر نے لکھا: "بابو کنور سنگھ شاہ آباد ضلع میں بہت بڑی اور بہت قیمتی املاک کے

مالک ہیں جو قدیم شرفا کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ بہت رحم دل اور مقبول زمین دار ہیں جنہیں ان کے کاشتکار محبت اور عزت سے دیکھتے ہیں اور ضلع کے سبھی مقامی اور یورپین باشندے ان کی عزت کرتے ہیں۔ لیکن راجپوت اشراف کے زیادہ تر اشخاص کی طرح بابو بھی بالکل پڑھے لکھے نہیں ہیں۔ اور اسی لیے وہ اپنے لالچی اور چالاک ایجنٹس کے ہاتھوں میں کھلونا بنے ہوئے ہیں اور چونکہ آبائی طور پر ان کے اندر بھی بہت زیادہ فضول خرچی کی عادت ہے' اس لیے انہوں نے بہت زیادہ رقم بانڈ کے ذریعہ حاصل کرلی ہے۔ اس وقت وہ 13/ لاکھ روپے کے مقروض ہیں۔ اور کنور سنگھ اور اس کے کچھ قرض خواہوں نے سرکار سے یہ اپیل کی ہے کہ اس کی املاک کا انتظام سرکار اپنے ہاتھوں میں لے لے اور اس طرح ان کے قرضوں کی معافی ہو۔ ٹیلر اور ڈیمپیئر دونوں اس کے اس مشورے کی حمایت میں تھے لیکن یہ حیرت کی بات تھی کہ وہ تمام لوگ جو ابھی تک اس کا خون پی پی کے موٹے ہورہے تھے' وہ اتنی آسانی سے اسے ہاتھ سے نکل جانے دیں گے۔

ٹیلر کو شبہ تھا کہ اس کے مہاجنوں اور دوسرے لوگوں کی ہمت کنلف شاہ آباد کے مجسٹریٹ بڑھا رہے ہیں۔ بورڈ آف ریونیو نے مشورہ دیا کہ کنور سنگھ دس لاکھ روپے کا قرض حاصل کریں اور اس کے لیے نرگیا راؤ' مادھو راؤ' جو ونایک راؤ کے بیٹے تھے اور کروی کے رہنے والے تھے' ان سے بات چیت بھی شروع ہوئی لیکن انہوں نے جو شرائط رکھیں وہ مناسب نہیں تھیں اور بات چیت ختم ہوگئی۔ ٹیلر ہر صورت میں کنور سنگھ کو بچانا چاہتا تھا۔ اور اس نے مشورہ دیا کہ اشد ضرورتوں کے لیے تھوڑا سا قرض حاصل کرلیا جائے۔ سید عظیم الدین حسین خاں جو شاہ آباد کے ڈپٹی کلکٹر ہیں انہیں ان کی املاک کا کسٹوڈین مقرر کیا جائے۔ لیکن ٹیلر کی ساری ہمدردی کے باوجود وہ غریب آدمی بربادی سے بچایا نہیں جاسکا۔ اور 1857ء میں کنور سنگھ تقریباً دیوالیہ ہوگیا۔ تاہم اسے اپنی املاک سے اتنا زیادہ لگاؤ تھا جیسا کہ ٹیلر کا کہنا ہے: "حقیقت یہ ہے کہ کنور سنگھ ان قدیمی پرانے زمینداروں کی نسل سے تعلق رکھتا ہے جو پہلے کے زمانے میں ہوا کرتے تھے اور وہ اپنی ان مصیبتوں کو ہمیشہ اپنے سے دور کرنا چاہتا تھا جو اسے آگھیر تیں اور ہر صورت میں اسے اپنی زمین سے بے حد لگاؤ تھا۔ شاید اس کی اس موروثی املاک کو پیدا خطرہ کے پیش نظر اسے بچانے کے لیے آخری کوشش کرنے پر مجبور کیا۔ انگریزوں سے اُسے نفرت نہیں تھی بلکہ اپنے رویے اور طور طریقوں اور کھیلوں سے رغبت کی بنا پر اس کے انگریز دوستوں کی تعداد بہت زیادہ تھی اور اس کا کٹر سے کٹر دشمن بھی اس پر یہ الزام نہیں لگا سکتا تھا کہ اس نے کبھی کسی بے قصور کا خون بہایا ہو۔

کرنل میلیسن کا کہنا ہے کہ وہ سپاہیوں کے ساتھ خفیہ تعلقات بنائے ہوئے تھا اور اس کے اپنے آدمیوں نے وہ کشتیاں فراہم کی تھیں جن سے باغیوں نے سون ندی کو پار کیا تھا۔ شاہ آباد کے مجسٹریٹ ویک نے لکھا کہ اسے یقین ہے کہ کنور سنگھ نے بہت سوچی سمجھی سازش کے تحت یہ بغاوت کی "مجھے معلوم ہے کہ اب بھی بہت سے لوگوں کا یہ کہنا ہے کنور سنگھ نے کسی سوچی سمجھی سازش کے تحت بغاوت نہیں کی لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ پچھلے تین مہینے سے صرف وقت کا انتظار

کر رہا تھا۔'' جب کہ ٹیلر کو اب بھی یہ یقین تھا کہ اس کا کوئی ارادہ ایسا کرنے کا نہیں تھا۔ 14/ جون 1857ء کو اس نے حکومت بنگال کے سکریٹری کو لکھا: ''بہت سے لوگوں نے مجھے اس طرح کے خطوط بھیجے ہیں جس میں بہت سے زمینداروں خصوصاً بابو کنور سنگھ کی بے وفائی کا تذکرہ کیا ہے۔ مجھ سے ذاتی دوستی کے سبب انہوں نے مجھ سے جس طرح کی وفاداری کے تعلقات بنائے رکھے' اس سے میں پورے اعتماد کے ساتھ ان خبروں کی تردید کرتا ہوں۔ اسی طرح کی غلط بیانیاں ڈمراؤں اور ہتھوا کے راجا کے خلاف کی گئی ہیں۔ میں ان سب پر یقین نہیں کرتا۔'' ان کے ساتھ اس نے ان راجاؤں اور شرفا کی فہرست بھی منسلک کر دی جن پر بھی، غلط طریقے سے سازش کا شبہ کیا جا رہا تھا۔

کنور سنگھ کے ایک خاص دوست اور رفیق نے گواہی دیتے ہوئے بتایا کہ وہ تشدد کے خوف سے باغیوں کے ساتھ شریک ہوا تھا۔ کنور سنگھ کی موت کے بعد نشان سنگھ کو قید کیا گیا تھا' اس لیے اس بات کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ جھوٹی گواہی دے کر اپنے لیڈر کو بدنام کرتا۔ گرچہ وہ خود اپنی جان بچانے کے لیے بہت پریشان تھا اور باغی فوجوں کے ساتھ تعاون کے بارے میں وہ جو صفائی دیتا ہے' اس پر قطعی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ جب اس پر مقدمہ چل رہا تھا تو اس نے بیان دیا ''پچھلے سال جیٹھ' اساڑھ اور ساون کے مہینوں میں آرہ میں رُکا ہوا تھا۔ اس دوران داناپور کے باغی فوجی آرہ پہنچے اور انہوں نے شہر کو لوٹ لیا۔ انہوں نے کنور سنگھ کے نوکروں کو دھمکی دی کہ وہ اسے فوراً یہاں لائیں ورنہ وہ جگدیش پور کو لوٹ لیں گے۔ یہ دھمکی میرے سامنے نہیں دی گئی تھی اور میں صرف سنی سنائی باتوں پر یہ بیان دے رہا ہوں۔ اس کے مطابق کنور سنگھ اسی دن جگدیش پور سے آرہ آئے اور اسی دن باغی بھی آرہ پہنچے تھے اور یہ تاریخ 18/ ساون کی تھی۔'' یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کنور سنگھ اتنی کم مہلت ملنے کے بعد بھی سپاہیوں کے ساتھ شامل کیسے ہو گئے' جب کہ ان کے ساتھ کرائے کے بہت سے سپاہی بھی تھے۔ اس نازک وقت میں بہت سے زمینداروں نے کرائے کے سپاہیوں کی بھرتی کر کے کسی بھی خطرے سے نمٹنے کے لیے اپنے کو تیار کر لیا تھا۔ کنور سنگھ کے پاس اس بات کے بھی بہت سے جواز تھے کہ انہیں قید کر لیا جائے گا۔ ویک نے اس پر سازش کا الزام لگایا تھا اور یہ بات اس نے اپنے تک محدود نہیں رکھی تھی۔ سیمیوئل نے کنور سنگھ کی بغاوت کی وجہ اس کی مالی پریشانیوں کو بتایا۔ لیکن آگے کہتا ہے: ''مجسٹریٹ ہمیشہ سے اس پر شبہ کرتا رہا ہے اور اپنے اس شبہ کو اپنے تک ہی محدود نہیں رکھا۔ ایک ڈپٹی کلکٹر کو اسے سمجھا بجھا کر بلانے کے لیے بھیجا گیا۔ لیکن اس کے مجرم ضمیر نے خطرہ کی بو سونگھ لی اور اس نے اپنے سبھی گاؤوں میں یہ خبر بھیجی کہ اس بات کا اعلان کر دیا جائے کہ حکام اسے پھانسی پر لٹکانا چاہتے ہیں اور اس نے اپنے لوگوں سے کہا کہ وہ ایک ڈوم کے ہاتھوں مرنے سے بچائیں۔'' فارسٹ کا کہنا ہے کہ جب ٹیلر نے اس کے پاس اپنا ایک ایجنٹ بھیجا کہ وہ پٹنہ آجائیں تو اس نے اپنی پیرانہ سالی اور خراب صحت کا عذر پیش کیا۔ اس بات پر شبہ کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ اس

کی بیماری بناوٹی تھی کیونکہ بہت پہلے 19/ دسمبر 1856ء میں ٹیلر نے بورڈ آف ریونیو کو لکھا تھا "اس خط کو ختم کرتے ہوئے میں یہ بات ضرور لکھنا چاہوں گا کہ بابو بہت ضعیف ہو گئے ہیں اور مجھے یہ کہتے ہوئے افسوس ہو رہا ہے کہ وہ اس قدر بیمار بھی ہیں کہ شاید زیادہ دنوں تک زندہ بھی نہ رہیں" اس لیے اس نے خطرے کی جو بو محسوس کی تھی وہ کسی مجرم ضمیر کی وجہ سے نہیں تھی۔

ہمیں یہ حتمی طور پر نہیں معلوم کہ کنور سنگھ کو پٹنہ کب بلایا گیا تھا۔ لیکن اس بات کے وافر ثبوت ہیں کہ شاید یہ جولائی کا دوسرا ہفتہ تھا۔ کیونکہ 19/ تاریخ کو ویک نے حکومت بنگال کے سکریٹری کو پھر لکھا "میں اس کی حرکات کا بغائر مشاہدہ کر رہا ہوں۔ کمشنر نے اسے پٹنہ بلایا تھا تاکہ اس کے متعلق پھیلی افواہوں کے بارے میں ان سے بات کر سکے۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے بیماری کا عذر کر دیا لیکن میں نے یہ بھی سنا ہے کہ اس نے کہا تھا کہ وہ پٹنہ نہیں جائے گا اور اگر اسے بلایا جاتا ہے تو وہ اس کے خلاف مزاحمت کرے گا۔" وہابی لیڈروں نے مسٹر ٹیلر کی دعوت پر ان سے 2/ جون کو ملاقات کی تھی اور ان سبھی کو نظر بند کر دیا گیا۔ اور جن لوگوں پر فساد کا ذرا بھی شبہ ہوا انہیں جولائی میں بڑے پیمانے پر پھانسی دی گئی۔ اور ایسا ممکن نہیں ہے کہ پٹنہ میں جو کچھ ہو رہا تھا کنور سنگھ اس سے بے خبر رہے ہوں۔ اور یہ بھی غیر فطری بات نہیں تھی کہ جب کمشنر نے اسے بلایا تو وہ بہت زیادہ پریشان ہو گیا اور اسے اندیشہ ہوا کہ کمشنر کے خیالات کو بدلنے کی مجسٹریٹ کی کوشش آخر کار کامیاب ہو گئی۔ ڈپٹی مجسٹریٹ سے کہا گیا تھا کہ کنور سنگھ سے متعلق سبھی باتوں کی جانچ کر کے ایک خفیہ رپورٹ کمشنر کو بھیجیں۔ جو کچھ وہ معلوم کر سکا تھا وہ صرف اتنی بات تھی کہ کنور سنگھ کے لوگ اپنے زمیندار کا ساتھ دیں گے اگر وہ بغاوت پر آمادہ ہو جائے۔ اس کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں معلوم ہو سکا۔ "ویک کے کھلے ہوئے الزامات اور ٹیلر کے دعوت نامے نے اس ضعیف آدمی کو بہت زیادہ محتاط کر دیا تھا۔ اسے تشدد کا شبہ ہوا تھا اور اس کے وفادار کاشتکاروں نے ہر صورت میں اپنے زمیندار کی حفاظت کا تہیہ کر لیا تھا۔ ایسے ہی حالات میں باغی فوجی آرہ پہنچے اور جو کچھ نشان سنگھ نے سنا تھا' اگر وہ صحیح تھا کہ سپاہیوں نے اس سے تعاون کی درخواست کی کیونکہ وہ ان کا فطری لیڈر تھا کیونکہ ان میں سے بہت سے لوگ راجپوت خاندان کے تھے گرچہ اسے کوئی فوجی مشق نہیں تھی تاہم اسے پختہ یقین تھا کہ اگر اس کی تربیت ایک فوجی کی طرح سے ہوئی ہوتی تو وہ بہترین کمانڈر ثابت ہوتا۔

کنور سنگھ کے خاص لیفٹیننٹ میں اس کا بھائی امر سنگھ 'اس کا بھتیجہ رت بھنجن سنگھ 'اس کا تحصیلدار ہرکشن سنگھ اور اس کا ساٹھ سالہ دوست نشان سنگھ بھی تھے۔ دلاور خان اور سرنام سنگھ کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ شاہ آباد کے راجپوت یہ ثابت کرنے پر تلے ہوئے تھے کہ راجپوتوں کی شجاعت قصہ پارینہ نہیں ہو گئی ہے۔

باغی فوجیوں نے خزانے کو لوٹ لیا۔ اور قیدیوں کو قید خانوں سے آزاد کر دیا۔ پھر اس کے بعد محاصرہ شروع کیا۔ کنور سنگھ کے پاس دو پرانی بندوقیں تھیں لیکن ان کے لیے گولیاں نہیں

تھیں۔ ان کی جگہ پر لوہے کے گولے اور پیتل کے دروازے کی ہینڈلیں استعمال میں لائی گئیں۔ سکھ دفاعی کام میں لگے تھے۔ ڈاکٹر ہابس جو محصور لوگوں میں سے ایک تھا، کہتا ہے: "اگر سکھوں نے بغاوت کی ہوتی تو انہوں نے ہمیں بطور ناشتہ کھالیا ہوتا۔ انہیں اکسانے کی بھی کوششیں کی گئیں۔ پہلے تو ان کی ذات اور مذہبی جذبات کو ابھارنے کی کوشش کی گئی اور پھر انہیں لالچ دی گئی۔ ہر شخص کو فوج سے علاحدہ ہونے پر '500 روپے کی پیشکش کی گئی۔ حکم سنگھ 'ان کا جمعدار محصور لوگوں کے لیے طاقت کا منارہ تھا۔ جب پانی کی سپلائی روک دی گئی تو سکھوں نے 18 فٹ گہرا کنواں کھود لیا۔ اور جب جانوروں کے گوشت کی قلت ہوتی تو حکم سنگھ اور اس کے ساتھیوں نے بہت سی بھیڑیں آس پاس کے علاقے سے چرالائے۔ جب باغی سرنگ بچھانے لگے تو یہ حکم سنگھ ہی تھا جس نے ان سب کو برباد کر دیا۔ وہ ہر جگہ موجود رہتا۔ 'کچھ پروا نہیں' وہ ہر جگہ ہنستے ہوئے کہتا، خاص طور پر اس وقت جب توپوں کے گولے نشانے پر نہ لگ پاتے۔ اس نے ایک چھت کے اوپر سے محاصرہ کرنے والوں پر پتھر بھی پھینکے۔ 31/ جولائی کو محصور لوگوں کو امدادی فوج کے آنے کی خبر دی گئی۔ لیکن جب تک یہ امدادی فوج اور میجر ونسنٹ آئر' ان کے بچاؤ کے لیے نہ آیا' سکھوں نے محاصرہ جاری رکھا۔

ونسنٹ آئر آلہ آباد کے راستے میں تھا۔ اس وقت اس کی تقرری گوالیار دستوں کے ساتھ تھی۔ جب بغاوت پھیلی اس وقت وہ برما میں تھا۔ جس روز بغاوت پھیلی وہ داناپور سے ہوتا ہوا جارہا تھا۔ اس نے کنٹونمنٹ سے شعلے نکلتے ہوئے دیکھے۔ 28/ کو وہ بکسر پہنچا اور اس نے باغیوں کی آمد کے بارے میں سنا۔ اس کے بعد وہ غازی پور گیا' جو اس وقت افیم کی تجارت کا بڑا مرکز تھا۔ غازی پور سے وہ پھر اپنے 25 ساتھیوں کے ساتھ بکسر لوٹا۔ اور اپنے کیپٹن ایل اسٹرینج اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ شریک ہو گیا۔ بکسر سے وہ آگے کی طرف بڑھا۔ راستے میں اسے ڈنبر کی شکست کے بارے میں معلوم ہوا۔ ڈنبر کی طرح آئر کو بھی باغیوں نے روک لیا۔ لیکن ان کے مسکٹ آئر کی آرٹلری اور رائفلز کا جواب نہیں تھے۔ کنور سنگھ نے بی بی گنج میں پھر اس کا راستہ روکا۔ لیکن اس نے جان توڑ حملہ کیا۔ جس کی وجہ سے اس کا داہنی طرف کا راستہ صاف ہو گیا اور باغی بھاگ گئے۔ یہ جنگ 2/ اگست کو ہوئی۔ دوسرے دن صبح آرہ کو بھی آزاد کرالیا گیا۔ "اُس وقت آرہ کے کبھی یورپین کو قید کر لیا گیا تھا۔ کنور سنگھ کے سامنے بہت عیسائی یوریشین خاندان کے لوگ پڑے تھے' اور جب وہ وہاں سے رخصت ہوا تو اس وقت تک وہ سب محفوظ تھے۔ اور ہمیں اس بات کی بھی خبر نہیں کہ اس نے خود کبھی کوئی قتل کیا ہو' جو عام طور پر باغی فوجی کرتے ہیں۔"

آرہ سے کنور سنگھ جگدیش پور کے اپنے پرانے قلعے میں محصور ہو گیا۔ لیکن آئر نے یہاں بھی اس کا پیچھا کیا۔ زبردست مزاحمت ہوئی۔ لیکن مسکٹ جدید رائفلوں کا جواب نہیں تھے۔ کوئی بھی شخص زندہ نہیں چھوڑا گیا۔ زخمی سپاہیوں کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ کیونکہ ایسا کہا جاتا ہے کہ انہوں

نے بھی آرہ میں ایسا ہی کیا تھا۔ کنور سنگھ نے بہت زیادہ خرچ کر کے جو نیا مندر بنوایا تھا اسے مسمار کر دیا گیا۔ "کیونکہ کہا جاتا ہے کہ برہمنوں نے اسے بغاوت کے لیے آمادہ کیا تھا۔" جگدیش پور کا محل اور دوسری عمارتوں کو بھی تاراج کر دیا گیا۔ لیکن یہ بات کمانڈر انچیف کے حق میں جاتی ہے کہ اس نے اپنے اختلاف کو کھلے عام درج کیا "جگدیش پور میں میجر آئر نے کسی ہندو مندر کو تباہ کیا' وہ کوئی اچھا کام نہیں کیا۔" اس نے یہ بات گورنر جنرل کو اپنے بہادر فوجیوں کی سفارش کرتے ہوئے کہی۔

کنور سنگھ کی فوج شکست کھا چکی تھی۔ اس کی پناہ گاہ برباد کر دی گئی تھی۔ لیکن اب بھی یہ بوڑھا شیر قابو میں نہیں آیا۔ وہ جگدیش پور کے جنگلوں سے ہوتا ہوا رہتاس کی پہاڑیوں پر پہنچا۔ وہاں اس کی موجودگی سے گرینڈ ٹرنک روڈ کو خطرہ پیدا ہو گیا جو برٹش مواصلات ایک اہم ذریعہ تھی۔ لیکن اس کے خیالات کچھ اور تھے۔ وہ بجا طور پر سوچتا تھا کہ جنگ صرف نچلے صوبوں میں نہیں بلکہ شمالی ہندوستان میں جیتی یا ہاری جا سکتی ہے۔ 20/ اگست کو الکٹرک ٹیلی گراف کے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ نے بیڈون کو اطلاع دی کہ کنور سنگھ رہتاس کے نزدیک اکبر پور میں ہے اور امر سنگھ سہسرام کے نزدیک جی ٹی روڈ سے ملحق پہاڑیوں میں چھپا ہوا ہے۔ اور وہ سرکاری ملازمین کو دھمکا رہا ہے۔ ستمبر کے شروع میں شاہ کبیر الدین نے سنا کہ کنور سنگھ ریوا میں ہے۔ وہ مرزا پور کے جنگلوں سے ہوتا ہوا ریوا کے ہندو راج میں داخل ہو گیا ہے۔ یہاں کا راجا شاید اس کا رشتہ دار تھا۔ اس کی آخری منزل شاید دلی تھی۔ لیکن ریوا کے راجا کو اس کے پولیٹکل ایجنٹ آس بارن نے اس کا ساتھ نہ دینے کے لیے دباؤ ڈالا اور کنور سنگھ کو آخر کار اس کی حدود سے نکلنا پڑا۔ اور اگر شاہ کبیر الدین کی اطلاع صحیح تھی تو اس بوڑھے شیر کا ساتھ زیادہ تر فوجیوں نے چھوڑ دیا تھا اور اب اس کے ساتھ صرف پانچ سو آدمی تھے۔ ستمبر کے مہینے میں وہ مرزا پور اور ریوا کی سرحدوں کے درمیانی علاقے میں تھا اور دونوں کے لیے خطرہ بنا ہوا تھا۔ اکتوبر میں وہ باندا چلا گیا۔

اس وقت تک دلی کی شکست ہو چکی تھی اور بدلے ہوئے حالات کے تحت کنور سنگھ کو نیا منصوبہ ترتیب دینا پڑا۔ 25/ اکتوبر کو شیر ر نے میور کو لکھا: "کہا جاتا ہے کہ کنور سنگھ باندا سے چل چکا ہے اور کالپی میں وہ گوالیار دستے کے ساتھ شامل ہونا چاہتا ہے۔ لیکن اس خبر کی تصدیق نہیں ہو پائی ہے۔" لیکن مہینے کے آخر میں شیرر کو صحیح اطلاع ملی۔ "کنور سنگھ باندہ کے تقریباً بارہ یا پندرہ سو باغیوں اور تین چار سو اپنے آدمیوں کے ساتھ کالپی پہنچ گیا۔" خبروں کے مطابق نانا نے اسے دعوت نامہ بھیجا تھا کہ وہ کانپور کے حملے میں اس کا ساتھ دے۔ نشان سنگھ کا کہنا ہے کہ گوالیار کے دستہ نے کنور سنگھ کے ساتھ مراسلت بنائے رکھی اور ان سے کہا تھا کہ جب تک وہ آنہ جائیں وہ جمنا کو پار نہ کریں۔ اور اگر نشان سنگھ کی رپورٹ صحیح ہے تو کنور سنگھ کانپور کی جنگ میں شامل تھا۔ لیکن تانتیا کی شکست کے بعد وہ سیدھے لکھنؤ چلا گیا' جہاں لکھنؤ کے والی نے گرمجوشی کے ساتھ اس کا استقبال کیا اور اسے شاہی خلعت عطا کر اعظم گڑھ کے لیے فرمان جاری کر دیا۔

فروری 1858ء میں وہ لکھنؤ اور دریا آباد کے بیچ میں کہیں تھا۔ مارچ میں وہ اور زیادہ حرکت میں آگیا۔ گورکھا' اعظم گڑھ کو باغیوں سے خالی کرا رہے تھے۔ لیکن جب وہ سر کولن کیمبل سے تعاون کے لیے لکھنؤ پہنچے تو یہ شہر اپنے دفاع کرنے والوں سے بھرا پڑا تھا۔ یہ بات پرانے راجپوت کی عقابی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رہ سکی۔ اور وہ فوراً ہی اعظم گڑھ سے 20 میل کے فاصلے پر اترولی گاؤں پر قابض ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے اعظم گڑھ پر قبضہ کر لیا۔ کرنل جیمس فوراً ہی غازی پور سے اعظم گڑھ پہنچا اور جب اس نے شہر پر حملہ کیا تو اسے شکست ہو گئی۔ اعظم گڑھ کی شکست اور برٹش افواج کی دو لگاتار شکست ان کے لیے بری خبر تھی۔ گرچہ لکھنؤ پر ان کے دوبارہ قبضے نے ان کے وقار کو بحال کیا۔ لارڈ مارک کو فوری طور پر الٰہ آباد سے اعظم گڑھ کو آزاد کرانے کے لیے بھیجا گیا۔ کیر نے شہر پر قبضہ کر لیا۔ اتنی طاقتور فوج کے سامنے ٹکنے کی کنور سنگھ کی ہمت نہیں تھی۔ اس نے فوراً ہی بہار لوٹنے کا فیصلہ کیا۔ وہ مزاحمت کرتا ہوا شیوپور گھاٹ پر پہنچا۔ یہاں اس نے پہلے سے ہی بہت سی کشتیاں جمع کر رکھی تھیں۔ وہاں اس نے یہ افواہ پھیلائی کہ چونکہ اس کے پاس ناویں نہیں ہیں' اس لیے وہ ہاتھیوں پر ندی پار کرے گا۔ اور اس کے تقریباً دو سو ساتھیوں نے ندی کو پار کر لیا۔ جب جنرل ڈوگلس اس کا تعاقب کرتے ہوئے وہاں پہنچا۔

کنور سنگھ اب جگدیش پور میں اپنے تاراج ہوئے مکان کی طرف آگے بڑھ رہے تھے۔ یہ بوڑھا شیر اپنی گپھا میں مرنے کے لیے ہی گیا تھا۔ گنگا پار کرتے ہوئے توپ کے ایک گولے سے ان کا ایک ہاتھ بیکار ہو گیا۔ اور جیسی کہ کہانی مشہور ہے' انہوں نے اپنی تیز تلوار نکال کر فوراً ہی ایک بار میں اپنے زخمی بازو کو کاٹ ڈالا اور اسے گنگا کی پوتر دھارا میں بہا دیا۔ لیکن ان کا یہ آخری سفر بھی مخالفت سے بھرپور رہا۔ ان کے ساتھ بہ مشکل دو ہزار آدمی رہے ہوں گے۔ جنگ سے چور بغیر کسی اسلحے کے۔ آرہ کے کیپٹن لی گرانڈ اسی جنگل میں آئر کے واقعے کو دوہرانا چاہتے تھے۔ لیکن یہ بوڑھا شیر اب بھی بھرپور حملہ کر سکتا تھا۔ لی گرانڈ کی فوج میں سے صرف سکھوں نے کچھ نظم و ضبط برقرار رکھا لیکن جو یوروپین تھے وہ دل شکستہ ہو گئے اور ان کا بُری طرح نقصان ہوا۔ 35 ویں ریجمنٹ کے ڈیڑھ سو آدمیوں میں سے ایک سو ختم ہو گئے۔ لی گرانڈ اور دو افسروں کی بھی موت ہو گئی۔ بندوقچیوں کو اپنی ہی بندوق کا نشانہ بننا پڑا۔ لی گرانڈ کی فوج کو 23ر اپریل کو شکست ہوئی۔ 24ر تاریخ کو آخر کار ایک فاتح کی حیثیت سے کنور سنگھ کی موت ہو گئی۔

کنور سنگھ کی موت کے بعد اس کی فوج کی کمان اس کے بھائی امر سنگھ کو ملی۔ اسے بھی کوئی فوجی تربیت نہیں تھی۔ لیکن اپنے راجپوت مورثوں کی طرح وہ بھی شجاعت سے بھرپور تھے۔ اپنے وفادار کاشتکاروں کے درمیان جنہیں انعام کا لالچ بھی کچھ کر نہ سکا' امر سنگھ شاہ آباد ضلع میں متوازی حکومت چلاتے رہے۔ انہوں نے اپنا مجسٹریٹ اور جج تعینات کیا۔ اور اپنا قید خانہ بھی بنایا۔ جس طرح سے برٹش حکومت نے اس کے سر کی قیمت لگا رکھی تھی' اس نے بھی برٹش حکام کے سروں کی قیمت لگا رکھی تھی۔ وہ مالگزاری کی ادائیگی نہ کئے جانے پر جائیداد فروخت کر دیتا اور ہر

جگہ انصاف سے کام لیتا۔ سیمویل کا کہنا ہے: "شاہ آباد کی یہ تحریک ایک طرح سے قومی بغاوت کی نشاندہی کرتی تھی اور اسے سبھی چھوٹے موٹے زمینداروں اور ضلع کے راجپوت عوام کا تعاون حاصل تھا۔ کنور سنگھ کے راجپوت گاؤں میں ایک طرح سے عدم تعاون کی تحریک چل رہی تھی۔ انہوں نے وہاں دوبارہ پولیس چوکیوں کے قیام کی مخالفت نہیں کی۔ لیکن انہوں نے نہ صرف یہ کہ پولیس کی کوئی مدد نہیں کی بلکہ اگر پولیس والے کسی باغی کو پکڑنے آتے تو انہیں مار کر بھگادیتے۔ ان کا یقین تھا کہ ان کے رشتے دار اور عزیز برادری کی حفاظت کے لیے لڑ رہے ہیں۔

امر سنگھ کو بہت دشواریوں کا سامنا تھا۔ ساری برٹش فوج آرہ میں جمع ہو گئی تھی۔ ڈوگلس نے سون ندی کو داناپور سے پار کیا۔ سر ایڈورڈ لوگرڈ اعظم گڑھ سے آئے' اور کرنل کارفیلڈ سہسرام کے علاقے سے۔ کارفیلڈ نے 2 رمئی کو رپورٹ دی "امر سنگھ خطرہ محسوس کر رہا ہے۔ اور وہ لڑائی کے لیے تیار نہیں ہے۔ جب کہ سپاہی اس پر زور دے رہے ہیں۔ اس کے پاس سپاہیوں کی تعداد دو ہزار سے ڈھائی ہزار اور تین سو سے 4 سو تک کیویلری ہے۔ بہت سے بدمعاش اور راجپوت زمیندار جگدیش پور میں جمع ہو گئے ہیں۔" کھلی جنگ میں اس راجپوت کمانڈر کو برٹش دشمنوں کے سامنے مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اس لیے اس نے جنگل کی اپنی پناہ گاہ سے باہر آنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس نے گوریلا ترکیب اپنائی کہ دشمن کی فوج کو رات میں تنگ کریں اور ان کی سپلائی لائن کو تباہ کر دیں۔ جگدیش پور پر انگریزوں کی فتح ہوئی۔ لیکن امر سنگھ نے لتوار پور میں پناہ لی۔ لوگارڈ نے جنگل میں سڑکیں بنانا شروع کیں تاکہ باغیوں تک پہنچ سکیں۔ لیکن انہوں نے اپنے کو چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بانٹ لیا اور اس کی پکڑ سے باہر نکل گئے۔ لوگارڈ اس جنگلی حملے کی تاب نہیں لا سکا۔ اور اپنی گرتی صحت کا بہانہ بنا کر کمانڈ کی ڈیوٹی چھوڑ دی۔ اس دوران یہ باغی دیہاتوں میں حملہ کرتے اور انگریزوں کے وفادار زمینداروں کو سزا دیتے۔ جون میں امر سنگھ گنگا کے داہنے کنارے چنار میں نظر آیا۔ اطلاع ملی کہ وہ اودھ میں داخل ہونا چاہتا ہے۔ غازی پور کے مجسٹریٹ کو خطرہ ہوا کہ راجپوت چیف کا نشانہ کہیں اس کا اپنا اسٹیشن نہ ہو۔ گوبنس کو ڈر ہوا کہ امر سنگھ بنارس پر حملہ کر سکتا ہے۔ جولائی 1858ء میں انہوں نے آرہ پر حملہ کیا' اور شہر کے کنارے مسٹر وکٹر کے بنگلے میں آگ لگا دی' جب ان باغیوں کا پیچھا کیا گیا تو وہ امر سنگھ کے گاؤں میں لوٹ گئے۔ دوسرے مہینے میں انہوں نے پھر آرہ پر حملہ کیا۔ کرنل والٹر جو آرہ میں فوج کی کمان کر رہے تھے' انہیں رپورٹ ملی کہ حملہ آور شہر سے بارہ میل کے فاصلے پر مغرب میں ہیں۔ ان کا باغیوں سے سامنا ہوا لیکن باغی رات کے اندھیرے میں بھاگ گئے۔ اس طرح سے آرہ محفوظ رہا۔ والٹر کو دوسرے دن اسسٹنٹ مجسٹریٹ کی طرف سے خط ملا کہ باغی شہر کے نزدیک ہیں۔ اس سے پہلے کہ فوجی وہاں پہنچ سکتے باغیوں نے کچھ دکانوں کو لوٹا' قیدیوں کو چھڑایا اور بیس پچیس مکانوں کو لوٹ لیا۔ واپسی میں انہوں نے جمیرا میں ایک وفادار زمین دار چودھری پرتاپ نرائن سنگھ کے مکان میں آگ لگا دی۔ دوسرے دن پچاس سواروں کے ایک دستے نے آرہ کے لیے پھر خطرہ پیدا کیا۔

ایک دوسری پارٹی نے گیا پر حملہ کیا۔ جیل کو توڑ کر کھول دیا اور قیدیوں کو چھڑا لیا۔ اپنی ناکامی کی بدولت ڈگلس نے پورے جنگل کو گھیرنے اور باغیوں کو نکالنے کا فیصلہ کیا۔ 7 کالم ایک ساتھ جنگل میں داخل ہوئے لیکن ان میں سے ایک اچانک دلدل میں پھنس گیا اور ساری ترکیب بیکار ہو گئی۔ برٹش انفینٹری جنگل میں اتنا تیز چلنے کی عادی نہیں تھی جتنی کہ باغی نوجوان ہیولاک نے ڈگلس کو مشورہ دیا کہ وہ گھوڑ سوار انفینٹری کا استعمال کرے۔ یہ گھوڑ سوار دستہ امر سنگھ کے تعاقب میں کامیاب ہوا۔ اور 20 / اکتوبر کو ہیولاک ان کے ساتھ اس دلدلی گاؤں میں پہنچ گیا۔ باغیوں کو برباد کر دیا گیا لیکن ان کا لیڈر بچ نکلا اور اس نے کیمور پہاڑیوں میں پناہ لی۔ نومبر 1858ء میں ڈگلس نے اس پر حملہ کیا اور اس طرح مغربی بہار کی یہ لڑائی خاتمہ پر پہنچی۔ لیکن امر سنگھ اب بھی آزاد تھا۔ نشان سنگھ کو گرفتار کر کے پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ ہرکشن سنگھ کو بھی پھانسی دے دی گئی۔ امر سنگھ کی فوج شکست کھا چکی تھی۔ لیکن یہ سب اسے اپنی شکست قبول نہیں کرا سکی۔ اکتوبر 1859ء میں کرنل رامسے نے جنگ بہادر سے سنا کہ جگدیش پور کا امر سنگھ ترائی میں باغیوں کی فوج میں پہنچ گیا ہے۔ اور جلد ہی وہ بالا اور نانا راؤ کی فوج کی کمان سنبھالنے والا ہے۔

بہار کے تمام زمینداروں نے برٹش حکومت کا ساتھ دیا۔ ایسا بھی وقت آیا جب دربھنگہ، ڈمراؤں اور ہتھوا کے مہاراجاؤں پر شک کیا گیا' لیکن انہوں نے اور ان کے ساتھ دوسرے زمینداروں نے سرکار کا' آدمی اور پیسے سے ساتھ دیا۔ تھوڑی بہت شورش گیا' چمپارن' چھوٹا ناگپور اور دیوگھر میں ہوئی' لیکن یہ سب شاہ آباد کی شورش کی طرح طاقتور نہیں تھی۔

## باب ھفتم

# جھانسی

بندیل کھنڈ کے وسط میں جھانسی ایک چھوٹی سی مراٹھا ریاست تھی۔ پیشوا کے زمانے میں یہاں ان کا صوبیدار یا گورنر رہا کرتا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی سرکار نے اسے خود مختار ریاست کا درجہ دے دیا۔ مشہور بندیل راجا چھتر سال نے اپنے علاقے کا ایک تہائی حصہ پیشوا باجی راؤ اول کو اس مدد کے لیے دے دیا تھا جو مسلم حملوں کے دوران انہوں نے کی تھی۔ پیشوا نے بندیل کھنڈ کے اپنے اس حصہ کو تین ریاستوں میں بانٹ رکھا تھا۔ اس میں سے پہلا گوبند پنت کھیر کو سونپا گیا جس کا دار الخلافہ ساگر تھا۔ دوسرا جو بندیل کھنڈ اور کالپی پر مشتمل تھا' وہ اس کے اپنے لڑکے شمشیر بہادر کو دیا گیا۔ تیسرا جھانسی کی گورنری موروثی ہوگئی جو رگھوناتھ ہری نولکر کے خاندان میں چلتی رہی۔ اس نے یہ عہدہ اپنے بھائی شیورام بھاؤ کے حق میں چھوڑ دیا جس سے برٹش سرکار نے 1804ء میں ایک معاہدہ کیا تھا۔ 1817ء میں ایک نیا معاہدہ شیورام بھاؤ کے جانشین اور پوتے رام چندر راؤ کے ساتھ کیا گیا جس سے یہ علاقہ اس کے جانشینوں کو مل گیا۔ 1835ء میں رام چندر راؤ جسے برٹش سرکار نے مہاراج دھیراج فدوی بادشاہ جم جاہ انگلستان کا خطاب دیا گیا۔ اور اسی سال اس کی موت ہوگئی۔ اسے کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس کی موت کے بعد اس کی بیوہ نے اپنی بہن کے لڑکے کرشنا راؤ کو گود لے لیا۔ چونکہ کسی دوسرے خاندان کے لڑکے کو گود لینے سے مقامی رواج کے مطابق جانشینی نہیں بنتی اس لیے اس کی جانشینی کو لے کر مقدمہ چلا اور حکومت ہند نے رگھوناتھ راؤ کے حق میں فیصلہ دیا جو فوت شدہ حکمراں کا چچا اور شیوارام بھاؤ کا بیٹا تھا۔ رگھوناتھ راؤ اچھے کردار کا آدمی نہیں تھا۔ اس کے اندر کوئی انتظامی صلاحیت بھی نہیں تھی۔ اور اس کی بدانتظامی کی وجہ سے یہ صوبہ بربادی کے نزدیک پہنچ گیا۔ برٹش حکومت نے مداخلت کی اور اس صوبے کی حکومت اپنے ہاتھوں میں لے لی۔ رگھوناتھ راؤ کی بھی بغیر کسی قانونی وارث کے موت ہوگئی۔ اور پھر اس کی جانشینی کے بارے میں اس کے حقیقی لڑکے کرشنا راؤ' جو رام چندر راؤ اور گنگادھر راؤ کا لے پالک بیٹا تھا اور جو آخری مہاراجا کے بھائی تھے' نے مقدمہ دائر کر دیا۔ برٹش حکومت نے گنگادھر راؤ کے حق میں اپنا فیصلہ دیا لیکن اسے حکمرانی کا حق 1843ء تک نہیں دیا۔ اس نے سنسکرت مخطوطوں کا

ایک بڑا ذخیرہ لائبریری میں جمع کیا اور جھانسی شہر کو کافی ترقی ہوئی۔
نومبر 1853ء میں گنگادھر کی بھی موت ہوگئی اور اس کا بھی اپنا کوئی وارث نہیں تھا۔
لیکن موت سے ایک دن پہلے اس نے نوکر خاندان کے ایک لڑکے کو سلطنت کے معززین' جھانسی کے پولیٹکل ایجنٹ میجر ایلس اور جھانسی فوج کے آفیسر کمانڈنگ کیپٹن مارٹن کی موجودگی میں گود لے لیا۔ اس نے شخصی طور پر میجر ایلس کو ایک خریطہ دیا جس میں اس نے اپنی بیوہ اور بچے کو سرکار کی نگہداشت میں چھوڑ دیا۔ ''اپنی وفاداری کے سبب' میں سرکار سے یہ گزارش کرتا ہوں کہ وہ اس بچے پر رحم کریں گے اور اس ریاست کی حکمرانی میری بیوہ' اپنی زندگی میں بحیثیت خود مختار حکمراں اور گود لئے بچے کی ماں کے طور پر کرتی رہے گی۔'' بعد میں گورنر جنرل کو دی گئی ایک عرض داشت میں بیوہ رانی نے داتیہ اور اورچھا بندیلہ راجاؤں کی مثالیں دیں جہاں گود لیے بچے کے دعوے کو قبول کر لیا گیا تھا۔ میجر ایلس نے بھی اس کی سفارش کی۔ لیکن گورنر جنرل کے ایجنٹ میجر میلکم کا خیال الگ تھا۔ گنگادھر راؤ کی موت کے وقت لارڈ ڈلہوزی کلکتہ سے کہیں اور گئے ہوئے تھے اور اس لیے اس ریاست کے بارے میں فوری طور پر فیصلہ ناممکن تھا۔ بعد میں لارڈ ڈلہوزی نے کہا کہ جھانسی کا معاملہ داتیہ اور اورچھا سے مختلف ہے کیونکہ ان ریاستوں کے مقابلے جھانسی کبھی بھی خود مختار حکمراں ریاست نہیں تھی۔ یہ پہلے پیشوا حکومت کے ماتحت تھی اور بعد میں برٹش حکومت کے۔ اس کا یہ بھی خیال تھا کہ برٹش حکومت اس ریاست کی رعایا کے لیے مفید ہوگی۔
مارچ 1854ء میں جھانسی کو برٹش انڈیا حکومت کا ایک حصہ بنا دیا گیا اور رانی کو وافر پنشن دیئے جانے کا وعدہ کیا گیا۔ اس سے 60 ہزار روپے تاحیات پنشن دیئے جانے اور شہر کے محل میں رہنے کی اجازت کا بھی وعدہ کیا گیا۔ اسے برٹش عدلیہ سے بھی معافی دی گئی اور اس کی حیات تک اس کے ذاتی خادموں کو بھی وہی مراعات ملتی رہیں گی۔ جہاں تک گود لینے کا سوال ہے' اس سے انکار نہیں کیا گیا۔ دامودر راؤ کو خاندانی خزانے اور اپنے گود لینے والے باپ کی ذاتی املاک کا وارث قبول کر لیا گیا۔ بعد میں یہ پتہ چلا کہ گنگا راؤ کی موت کے وقت خزانے میں 6/لاکھ روپے نقد موجود تھے۔ اس رقم کو سرکار نے نابالغ شہزادے کی طرف سے اپنے حق میں بحیثیت وقف لے لیا۔ لیکن جیسا ہمیشہ ہوتا آیا ہے سرکار نے عوامی جذبات کی اندیکھی کر کے انہیں کافی تکلیف پہنچائی۔ انہوں نے مہالکشمی مندر کے لیے وقف گاؤں کو بھی اپنے قبضے میں لے لیا جو نوکر خاندان کی وراثت تھی۔
رانی نے پہلے تو پنشن لینے سے انکار کیا لیکن بعد میں جب اس نے اپنی تقدیر سے سمجھوتہ کر لیا تو اس نے پایا کہ جو پنشن اسے دی جا رہی ہے اس میں بھی طرح طرح کی مختلف ناموں سے کٹوتی کی جا رہی ہے۔ خاص طور پر گنگادھر راؤ نے جو قرض لیا تھا اس کی پوری ادائیگی جسے وہ سمجھتی تھی کہ یہ ریاست کی ذمہ داری ہے۔ جس بات سے اسے اور وہاں کے ہندوؤں کو خاص طور پر دھکا لگا وہ گئو کشی کی اجازت تھی جو جھانسی میں برہمن حکمرانوں کے ذریعہ ممنوع تھی۔ جب رانی نے چھ لاکھ میں سے ایک لاکھ روپے کی مانگ کی جو دامودر راؤ کے لیے محفوظ تھی تاکہ وہ اس سے جنیؤ تقریب کے

اخراجات اٹھا سکے' تو سرکار نے اس وقت تک اسے دینے سے انکار کر دیا جب تک کہ وہ اس رقم کی ادائیگی کے لیے چار اشخاص کی ضمانت نہیں دے دی۔ کیونکہ اگر اس لڑکے نے بالغ ہونے کے بعد پوری رقم کی مانگ کی تو کیا ہوگا۔ رانی کو پھر بھی امید تھی کہ کورٹ آف ڈائریکٹرس سے اسے انصاف ملے گا۔ اس لیے اس نے اپنے ایجنٹ کو لندن بھیجا۔ اس کام پر اس کے 60 ہزار روپے خرچ ہوئے۔ لیکن ڈائریکٹرس کو ایسی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آئی کہ وہ گورنر جنرل کے فیصلے پر نظر ثانی کریں۔

رانی، جیسا کہ میجر میلکم نے شہادت دی 'نہایت اعلیٰ کردار کی مالک تھی اور جھانسی میں ہر شخص اس کی بہت زیادہ عزت کرتا تھا۔ یہ بھی کہا گیا کہ رانی نے حکومت ہند سے اپنی وفاداری کے بارے میں کبھی بڑھ چڑھ کر بہت زیادہ باتیں نہیں کیں۔ اس لیے جھانسی پر ہمارا قبضہ عوام کی نظروں میں مشتبہ رہا۔

رانی لکشمی بائی بہت غریب خاندان کی فرد تھیں۔ ان کے والد مورو پنت تامبے 'چمن جی اپا کے نجی خدمتگاروں میں سے تھے اور ان کے ساتھ بنارس میں رہ رہے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ یہیں ان کی پہلی بیوی بھگیرتی بائی سے ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ والدین نے اس کا نام منی کرنیکا رکھا۔ لیکن اسے شہرت اس نام سے ملی جو شادی کے وقت اس کے شوہر نے رکھا تھا۔ اس کے بچپن کے بارے میں ہمیں کچھ بھی نہیں معلوم۔ نہ ہی اس کی صحیح تاریخ پیدائش ہی معلوم ہے۔ پرانس کا خیال ہے کہ وہ 19/ نومبر 1835ء کو پیدا ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی وہ ہمیں یہ بھی اطلاع دیتا ہے کہ مورو پنت تامبے چمن جی کے دوسرے وارثین کی طرح' بٹھور میں باجی راؤ دوم کی حکومت میں شامل ہوگئے۔ اس لیے مورو پنت 1835ء میں بنارس میں نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ چمن جی کی موت 1832ء میں ہوگئی تھی۔ دوسری طرف اس کے بچپن کا نام منی کرنیکا اس نظریے کو تقویت دیتا ہے کہ وہ بنارس میں پیدا ہوئی تھی۔ یہ باتیں جو کہی جاتی ہیں کہ وہ بچپن میں نانا صاحب اور تانتیا ٹوپے کے ساتھ کھیلا کرتی تھی بالکل غلط بات ہے کیونکہ نانا صاحب اور تانتیا کسی بھی صورت میں اس کے ہم عمر نہیں ہو سکتے۔ غدر کے بعد اس کی شخصیت کو لے کر بہت ہی روایتیں مشہور ہو گئیں اور کچھ پرانی روایتیں جھانسی کے حکمراں سے شادی کے بعد پھر سے زندہ ہو گئیں۔ وہ اپنے شوہر سے بہت زیادہ چھوٹی تھی۔ کیونکہ پہلی رانی کی موت کے بعد اس کی شادی ہوئی تھی۔ جون لینگ مشہور وکیل، جو اس کی ریاست پر قبضہ کے بعد اس سے صلاح مشورہ کرتی رہتی' نے رانی کے بارے میں یہ قلمی تصویر چھوڑی ہے۔ "وہ اوسط قد کی عورت تھی۔ بدن گٹھا ہوا تھا لیکن بہت زیادہ۔ جب وہ اس سے کچھ کم عمر کی رہی ہوگی تو اس کا چہرہ بہت خوبصورت رہا ہوگا اور آج بھی اس میں بہت کشش باقی ہے۔ گرچہ حسن کے بارے میں میرا جو خیال ہے اس کے مطابق اس کا چہرہ بہت زیادہ گول تھا۔ دیکھنے میں وہ اب بھی بہت اچھی اور ذہین نظر آتی۔ اس کی آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی اور ناک ستواں تھی۔ وہ بہت زیادہ گوری نہیں تھی گرچہ کالے رنگ سے بھی بہت دور تھی۔

رانی لکشمی بائی

وہ کوئی زیور نہیں پہنے تھی سوائے کانوں میں سونے کے بندے کے۔اس کا لباس بھی سادہ تھا' سفید سوتی۔ اور اسے ایسے باندھے ہوئی تھی کہ اس کے جسم کے سبھی خط و خال نمایاں تھے۔اس کا جسم کتنا خوبصورت اور متناسب تھا۔اور اس کی آواز کس قدر جادو بھری تھی۔" جب میجر ایلس نے اس سے جھانسی کو اپنی ملکیت میں لینے کے سرکار کے فیصلے سے مطلع کیا تو ایسا کہا جاتا ہے کہ اس نے بہت صاف اور واضح الفاظ میں کہا تھا' میری جھانسی نہیں دوں گی۔' ممکن ہے یہ ایک غلط فیصلے کے تحت اس کا احتجاجی جملہ ہو یا اچانک اس کے منہ سے نکل گیا ہو۔ کیونکہ بعد میں قبضہ کیے جانے پر اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ لکشمی بائی نے قلعہ میں اپنے شوہر کے مکان کو خاموشی سے چھوڑ دیا۔ شہر میں اسے جو محل دیا گیا تھا وہاں چلی گئی اور ہندو بیوہ کی سی زندگی گزارنے لگی۔اس کی فوج اور 12ویں این آئی کو ختم کر دیا گیا اور بنگال آرمی نے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ ہر چیز بالکل خاموشی سے ہوتی رہی اور نئے حکمرانوں کو پریشانی کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ کیپٹن الکزینڈر اسکین کو اس حکومت کا پولیٹکل افسر مقرر کیا گیا اور کیپٹن ڈنلپ نے گیریسن کی کمان سنبھال لی۔

چربی لگی گولیاں جھانسی اور آس پاس کے دوسرے علاقوں میں گفتگو کا عام موضوع رہی ہوں گی۔ مئی میں میرٹھ اور دلی کی خبریں پہنچیں۔ لیکن کیپٹن ڈنلپ اور اس کے رفقاء نے اپنے آدمیوں میں بے چینی کے کوئی آثار نہیں دیکھے۔ امان خان کی گواہی کے مطابق جون میں ایک سپاہی کو موت کی سزا ملی تھی' جسے سر رابرٹ ہیملٹن وفادار سمجھتے تھے۔ "ایک خادم یا میری رجمنٹ میں (21ویں این آئی) کسی کا رشتہ دار دلی سے آیا تھا' کاغذ کا ایک پرزہ لایا جس میں کہا گیا تھا کہ بنگال پریزیڈنسی کی ساری فوج نے بغاوت کر دی ہے۔اور جھانسی میں جو رجمنٹ تعینات ہے وہ بھی ایسا ہی کرنے والی ہے۔ کیونکہ اس میں جو لوگ شامل ہیں وہ ذات باہر کر دیئے گئے ہیں۔یا شاید اپنے عقیدے کو بھول بیٹھے ہیں۔" اس طنز کا خاطر خواہ اثر ہوا اور 5/جون کو یہاں بھی شورش شروع ہو گئی۔ پہلے دن کے واقعات کے بارے میں مستند اطلاعات حاصل ہیں۔6/جون کو کیپٹن گورڈن جو جھانسی کے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ تھے' نے میجر اسکن اور ویسٹرن کو خط لکھا: "اس اسکن کی درخواست پر میں یہ چند سطریں آپ کی اطلاع کے لیے لکھ رہا ہوں کہ 12ویں کا ایک ونگ یا ایک حصہ کینٹ میں کھلی بغاوت پر آمادہ ہو گیا ہے۔ انہوں نے اسٹار قلعہ پر قبضہ کر لیا ہے جہاں میگزینیں اور ساڑھے چار لاکھ روپے خزانے میں جمع ہیں۔ان کے ساتھ آرٹلری بھی شامل ہو گئی ہے اور ہمارے پاس یہاں صرف دو توپیں ہیں۔ جس طرح سے انہوں نے ایسا کیا ہے' اس کی تفصیل اس طرح ہے۔ کل تین بجے کے قریب بہت سے سپاہیوں نے یہ آواز اٹھائی کہ میگزین پر ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا ہے۔اور وہ سب اس جگہ پر دوڑ گئے۔ بہت سے لوگ جو اس میں براہ راست شامل نہیں تھے' باغیوں کے ساتھ اندر داخل ہو گئے۔اور فوراً ہی انہوں نے توپوں میں گولے بھر کر ان کی پوزیشن سنبھال لی۔اس میں سے جو کچھ اچھے لوگ یا ڈھلمل یقین لوگ تھے' وہ شام کو باہر آ گئے۔ لیکن میگزین اور دونوں توپوں پر اب بھی پچاس آدمیوں کا قبضہ ہے۔ ہم اس شش و پنج

میں پڑے ہیں کہ اس ونگ کے کسی بھی آدمی یا کیویلری کے کسی بھی آدمی پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ میں ٹھاکروں کی مدد سے ان باغیوں کو باہر نکال سکتا ہوں لیکن جیسے ہی میں پہلی گولی چلاؤں گا' سب کھلم کھلا بغاوت پر آمادہ ہو جائیں گے۔ ''ہمیں یہ بھی بتایا گیا کہ بندیلہ ٹھاکر اپنی خدمات پیش کرنے میں پیش پیش ہیں اور ان میں سے بہتوں کو خدمت میں لے لیا گیا۔ ''گوالیار اور کانپور میں مدد کے لیے تار بھیج دیا گیا۔ میں نے سمتھر اور اور چھا کو مدد کے لیے لکھا ہے لیکن دتیہ سے کسی مدد کی امید نہیں۔ جہان کے راجا کی ابھی موت ہوئی ہے اور بدامنی پھیلی ہوئی ہے۔ ''اسکن اور گورڈن نے فوراً قلعہ میں سبھی یورپین اور عیسائی خاندان کے ساتھ اپنے کو محصور کر لیا۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اس موقع پر کہیں سے مدد نہیں ملنے والی۔ اور انہیں اپنی قوت بازو پر بھروسہ کرنا پڑے گا۔ ملازموں کی گواہی سے پتہ چلتا ہے کہ پہلے دن قلعہ میں اپنے مالکوں اور مالکاؤں کے پاس وہ کھلے عام جاسکتے تھے۔ اور انہیں کھانا بھی باہر سے پہنچایا گیا تھا۔

کیپٹن ڈنلپ اور دوسرے فوجی افسران کا اب بھی یہی خیال تھا کہ وہ اپنی نوجوں کو منظم رکھیں گے۔ اور اسی لیے وہ لائن میں سوئے بھی۔ 6ر تاریخ کو بخشش علی 'جو جیل کے داروغہ تھے' وہ اپنے محافظوں اور سپاہیوں کے ساتھ باغیوں کے ساتھ مل گئے۔ اور سپاہیوں نے نہ صرف کیپٹن ڈنلپ بلکہ لیفٹیننٹ ٹرنبل' انسائن ٹیلر اور دو حولدار اور ایک سپاہی جو اپنے افسروں کو بچانا چاہتے تھے' کو گولی سے مار کر ختم کر دیا۔ 14ویں کیویلری کے لیفٹیننٹ کیمبل زخمی ہوئے۔ لیکن ایک بیان کے مطابق وہ کسی صورت سے قلعہ تک پہنچ گئے۔ قلعہ کا چاروں طرف سے محاصرہ کر لیا گیا تھا۔ اور یہ صرف اب وقت کی بات تھی کہ یہ بھگوڑے بھوک کے سامنے کب تک ہتھیار ڈال دیں گے۔ تین آدمی بھیس بدل کر قلعہ سے باہر نکلے۔ لیکن انہیں پکڑ کر جان سے مار دیا گیا۔ 8ر تاریخ کو کیپٹن گورڈن کو سر میں گولی ماری گئی اور شاید انہوں نے درد کی شدت سے خودکشی کر لی۔ لیفٹیننٹ پاوی کو ایک مقامی ملازم نے قلعہ کے اندر مار دیا۔ شام کے وقت اسکن نے باہر نکلنے کا فیصلہ کیا یا تو اس یقین دہانی پر کہ انہیں بحفاظت تمام جانے دیا جائے گا یا بغیر کسی شرط کے۔ پوری پارٹی کو مرد' عورت اور بچوں کو تہ تیغ کر دیا گیا۔ سبھی لاشیں جو کھن باغ میں تین دنوں تک پڑی رہیں۔ بعد میں ایک گڈھا کھود کر ان سب کو اس میں دفن کر دیا گیا۔ بخشش علی جو جیل داروغہ تھے' انہوں نے اس قتل و غارت گری میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ صرف ایک عورت اور اس کے دو بچے قلعہ سے بحفاظت نکل سکے۔ مسز مٹلو کے 'مٹ میلے رنگ کی وجہ سے ان کی شناخت نہیں ہو سکی۔

سر رابرٹ ہیملٹن جنہوں نے ایک سال بعد اس دکھ بھرے واقعے کی تفتیش کی' لکھتے ہیں: ''یہ کہیں نہیں بیان کیا گیا ہے کہ مارنے سے پہلے کسی بھی واحد شخص کی بے عزتی کی گئی ہو اور نہ ہی اس کی کوئی شہادت کہیں سے مل سکی ہے۔ بلکہ اس کے برخلاف یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ کسی بھی ایک لاش کی کوئی بے حرمتی نہیں کی گئی۔ بلکہ انہیں وہیں پر چھوڑ دیا گیا ان میں سے کچھ کے کپڑے یقیناً چرا لیے گئے۔ کچھ لاشیں ننگی تھیں لیکن اس کے سوا کچھ نہیں ہوا۔

مبالغہ آمیز کہانیاں جواخباروں میں شائع ہوئیں' انہیں پورے یقین کے ساتھ غلط ثابت کیا جا سکتا ہے۔ جو کچھ بھی ہوا وہ مرنے والے شخص کے عزیزوں اور دوستوں کے لیے یقیناً افسوسناک رہا ہوگا۔ لیکن اس قتل کے بارے میں جو بہیمانہ داستانیں پھیلائی گئیں' وہ یقیناً قابل نفرین ہیں۔''

یہ بغاوت اور اس کے بعد پورے قتل عام کی ساری ذمہ داری جھانسی کی رانی پر عاید کی گئی۔ ان پر الزام لگایا گیا کہ انہوں نے اس تشدد کو بڑھاوا دیا۔ لیکن انہوں نے اپنے دفاع میں یہ کہا کہ وہ اس اچانک ہونے والے واقعات کی مجبور تماشائی بنی رہیں۔ برٹش حکومت کے خلاف یقیناً انھیں شکایتیں تھیں اور تمام مشتبہ ذہن رکھنے والوں نے جوکھن باغ میں ہوئے قتل عام کے پیچھے ان کا ہاتھ دیکھا اور ان پر یہ الزام ثابت کرنے کے لیے جو گواہیاں پیش کی گئیں ان میں سے زیادہ تر افواہوں پر مبنی تھیں اور اکثر گواہی دینے والوں نے ایک دوسرے سے متضاد بیانات دیئے۔ شہاب الدین جو میجر اسکن کا خانساماں تھا' شیخ ہنگن' وہ کیپٹن گورڈن کا حکم بردار تھا' مدار بخش' جوار دلیوں کا جمعدار تھا سب نے اپنے آقاؤں کی لڑائی کے بارے میں ذاتی واقفیت کا حوالہ دیا۔ شہاب الدین نے اپنے بیان کہا: ''میجر اسکن' کچہری سے اپنے گھر آئے اور اپنی بیوی بچوں اور مس براؤن کو کیپٹن برگس کی بگھی میں بٹھایا۔ اس کے بعد وہ خود اپنی بگھی میں بیٹھے اور جوکھن باغ گئے جہاں مسٹر گورڈن نے ان سے ملاقات کی۔ شیخ ہنگن نے گواہی دیتے ہوئے کہا کہ کیپٹن گارڈن اپنے بنگلہ میں کچھ لکھ رہے تھے' جبھی خطرے اور گولی کی آواز سنائی دی۔ کیپٹن اسکن کی خالی بگھی' سائیس ان کے گھر پر لے آیا۔ کیپٹن گارڈن نے پوچھا کہ معاملہ کیا ہے؟ سائیس نے جواب دیا کہ ڈنلپ اور ٹیلر کو گولی مار دی گئی اور اسکن' جب وہ کچہری میں کام کر رہے تھے' ان پر گولی چلائی گئی۔ پھر کیپٹن اسکن اپنے گھر گئے اور اپنی بگھی منگائی۔ لیکن بگھی کو تیار ہونے میں وقت لگا۔ کیپٹن اسکن نے تب اپنی بیوی اور بچوں کو ساتھ لیا اور قلعہ تک گئے۔ اور بگھی کیپٹن گورڈن کے لیے بھیجی ہے۔ کیپٹن گارڈن اس میں بیٹھ کر قلعہ تک گئے۔ میں بھی ان کے ساتھ گیا۔ جب ہم شہر کے سیر دروازے پر پہنچے وہاں کیپٹن اسکن اور اس کے خاندان والوں سے ملاقات ہوئی اور وہ سب بگھی میں بیٹھ گئے۔ مدار بخش نے بھی گارڈن کے ساتھ جانے کا دعویٰ کیا۔ اس نے بیان دیا: ''تین بجے کے قریب اسکارٹ اور دو پرسیل ضلع کچہری سے کیپٹن گارڈن کے بنگلہ کی طرف دوڑ کر آئے اور انہوں نے بتایا کہ لائنس میں جنگ ہو رہی ہے۔ کیپٹن گارڈن نے اوپر دیکھا اور اپنی بندوق منگائی اور پھر کیپٹن اسکن کے یہاں گئے۔ میں بھی ان کے ساتھ گیا۔ وہ قلعہ تک گئے جہاں شہر کے دروازے پر ان کی ملاقات کیپٹن اسکن سے ہوئی اور وہ دونوں قلعہ کے اندر چلے گئے۔'' مدار بخش آگے کہتا ہے کہ کیپٹن گارڈن نے اسے دتیہ کے وکیل سندر لال کے پاس دو بندوقیں لانے کے لیے بھیجا۔ کیپٹن گارڈنے اپنے خط میں ارسکین کو اطلاع دی کہ انہوں نے سمپتھر اور اور چھا کو مدد کے لیے لکھا ہے اور اسے دتیہ سے کسی مدد کی امید نہیں ہے۔ شہاب الدین کا یہ بیان کسی افسانہ سے کم نہیں ہے۔ وہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ دو بار باغیوں کے ہاتھوں پڑا اور دونوں بار اسے موت کی سزا دی گئی۔ لیکن ہر

بار خوش قسمتی سے وہ بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوا اور اپنے آقا کے پاس لوٹ آیا۔ فارسٹ نے کسٹم کلکٹر کے دفتر میں ملازم ایک بنگالی کے بیان کو من وعن نقل کیا ہے۔ لیکن اس نے کہا کہ 8/جون کو ''بنگالی ملازم میری اور کیپٹن کے دو اور لوگوں کی تلاشی لی گئی اور بد معاشوں نے ہمارے ساتھ رسالدار کی موجودگی میں بد تمیزیاں کیں، جس نے ہم سب کو قید میں اس وقت تک رکھے جانے کا حکم دیا جب تک کہ قلعہ کی شکست نہ ہو جائے۔'' اسے ذاتی طور پر اس بات کی کوئی اطلاع نہیں رہی ہوگی کہ جن دنوں وہ بند تھا، باہر کیا ہوا اور رانی کے محل میں کیا ہوا، اس کی بھی واقفیت ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ اس نے ایک سیدھا سا بیان دیا کہ اس نے سنا کہ رانی نے کہا کہ ان کا ان برٹش سوروں سے کچھ لینا دینا نہیں۔ اس نے یہ بھی سنا کہ رانی کو فوری طور پر قتل کیے جانے کی دھمکی دی گئی اگر وہ باغیوں کا ساتھ نہیں دیتیں۔ وہ فوراً راضی ہو گئیں اور انہیں ایک ہزار آدمیوں کی مدد اور دو بھاری توپیں جنہیں کھود کر زمین سے نکالا گیا تھا، انہیں دینا منظور کر لیا۔ اس بے نام آدمی کے بیان کی ایک عینی شاہد نے ایک بات غلط ثابت کی۔ بنگالی کا کہنا ہے کہ کیمبل پر پہلے حملہ کیا گیا۔ اور گرچہ وہ زخمی ہوئے لیکن اپنی سیٹ پر بیٹھے رہے اور دروازے سے چھلانگ لگا کر مزید کسی زخم کے بغیر قلعہ میں پہنچ گئے۔ فرانس ریلے کا کہنا ہے کہ لیفٹیننٹ کیمبل اور اس کی گھوڑی پر پانچ چھ بار گولیاں چلائی گئیں اور وہ زخمی ہو گئی۔ اس وقت لیفٹیننٹ کیمبل میری طرف دیکھ کر چلائے اور ہاتھ کا اشارہ کر کے مجھے بھاگنے کے لیے کہا۔ میں نے دیکھا کہ لیفٹیننٹ کیمبل گر گئے اور پھر چھلانگ لگا کر آگے بڑھ گئے۔ کسٹم کلکٹر کے دفتر کے اس آدمی نے جو باتیں سنیں وہ سب صحیح نہیں تھیں۔ رابرٹ ہیملٹن نے جس گواہ شہاب الدین کا حوالہ دیا ہے، وہ سارا الزام رانی کے والد مورو پنت تامبے عرف ماما صاحب کو دیتا ہے کہ ان کے تعلقات باغیوں کے ساتھ رہے ہیں۔ رانی کے آدمیوں کو انگریزوں سے اس پریشانی کے عالم میں ہمدردی ہونے کا کوئی جواز بھی نہیں اور اس لیے وہ دشمنوں کے ساتھ مل گئے۔ وہ مزید کہتا ہے کہ رانی کے آدمی اور ان کی توپوں نے قلعے پر حملہ کیا اور اس سے انکار بھی نہیں کیا گیا۔ بغاوت کے بیان میں کہا گیا کہ رانی نے ارسکائن کو بلایا اور بتایا کہ ان کے بھی آدمی 8/تاریخ کو بغاوت میں شامل ہو گئے۔ ان پر سب سے بڑا الزام ان گواہوں نے یہ لگایا کہ وہ قتل عام کے بعد پلٹن میں رسالدار کے پاس گئی اور بخشش علی سے ملی۔ اس گواہی کی تائید کسی اور شخص نے نہیں کی۔ اور گرچہ شہاب الدین پلٹن میں تھا، اس کا خود کہنا ہے کہ وہ وہاں قید تھا۔ بھگوان دین برہمن نے رانی کے خلاف کچھ نہیں کہا۔ اس نے کہا کہ لال بہادر صوبیدار اور بخشش علی جیل داروغہ نے قسم کھائی اور افسروں کو قلعے سے باہر لے آئے۔ شیخ ہنگن کا کہنا ہے کہ یہ سن کر کہ رانی کے اپنے آدمی حملہ کر رہے ہیں گارڈن نے رانی کو لکھا اور رانی نے اسے یہ جواب دیا: ''میں کیا کر سکتی ہوں۔ باغیوں نے مجھے بھی گھیر رکھا ہے۔ اور مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ میں نے انگریزوں کو قلعے میں پناہ دے رکھی ہے اور یہ کہ میں انہیں قلعے سے باہر نکالوں۔ اور ان کی مدد کروں۔ اور اپنی جان بچانے کی غرض سے انہیں اپنے فوجی اور توپیں بھی دے دوں۔ اگر تم اپنے کو

بچانا چاہتے ہو تو قلعے کو چھوڑ کر باہر آ جاؤ، تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔" شیخ ہنگن نے دعویٰ کیا کہ انہوں نے خود بھی یہ خط پڑھا ہے۔ وہ مزید کہتا ہے کہ گارڈن نے اسے پھر خبر بھجوائی لیکن اس بار اسے کوئی جواب نہیں ملا۔ اس کے مطابق باغی ہندو اور مسلمان دونوں نے انہیں بحفاظت راستہ دینے کا وعدہ کیا تھا اور محصور لوگ باہر آ گئے۔ مدار بخش نے یہ دعویٰ کیا کہ گارڈن کے خط کو وہ خود رانی کے پاس لے گیا۔ اور رانی کا جواب بھی وہ خود لایا۔ لیکن اس کا یہ کہنا ہے کہ اس نے جواب کو پڑھا نہیں۔ مسز مٹلو نے جوکھن باغ کی قبروں کے درمیان اور جھانسی شہر میں کئی دن گزارے اور اسے کوئی پہچان نہیں پایا۔ اس کا کہنا ہے "مسٹر اے اسکن اور مسٹر گارڈن، رانی کے پاس گئے اور اس نے انہیں پچاس ساٹھ بندوقیں اور کچھ گولے بارود اور اپنے تقریباً پچاس سپاہیوں کو ان کے ساتھ روانہ کیا کہ وہ قلعہ میں ہماری مدد کریں۔ اس کی گواہی کی بھی کوئی تائید نہیں ہوئی۔ ہو سکتا ہے کہ رانی نے اپنے آدمیوں کو قلعہ میں یورپین کی مدد کے لیے بھیجا ہو۔ لیکن یہ بات حد سے زیادہ مشتبہ ہے کہ اسکن اور گارڈن نے خود رانی سے ملاقات کی ہو۔ اور نہ گارڈن نے ہی ارسکین اور ویسٹن کو لکھے گئے اپنے خطوط میں رانی سے ملاقات کا کوئی تذکرہ کیا۔ جب کہ ابھی محاصرہ شروع نہیں ہوا تھا۔ محاصرے کے بعد صرف اینڈریوز پرسل اور اسکاٹ نے رانی سے ملاقات کی کوشش کی جنہیں باغیوں نے پکڑ کر جان سے مار دیا۔ مسز مٹلو آگے کہتی ہے کہ جب رانی کو 6ر تاریخ کو بغاوت کی خبر ملی تو اس نے اپنے سارے آدمیوں کو قلعہ سے اتار دیا۔ رانی اور اس کے سپاہی رجمنٹ میں شامل ہو گئے اس لیے ہم نے اپنے سارے کپڑے بدلے اور قلعہ سے باہر جانا چاہا۔ لیکن ایسا کر نہیں سکے کیونکہ سوار قلعہ کے چاروں طرف گھوم رہے تھے۔ اس لیے ہم لوگ جمعہ کی رات سنیچر، اتوار اور دوسرے دن صبح آٹھ بجے تک وہیں رکے رہے۔ مسٹر گارڈن کو گولی مار دی گئی تھی۔ رجمنٹ کے صوبیدار نے کیپٹن اسکن کو لکھا کہ وہ قلعہ سے باہر آجائیں اور یہ کہا 'ہم آپ میں سے کسی آدمی کو نہیں ماریں گے۔ ہم لوگ آپ سب کو آپ کے ملک واپس بھیج دیں گے' اس لیے کیپٹن اسکن نے رانی کو لکھا کہ وہ سپاہیوں سے کہیں کہ وہ اس بات کا عہد کریں اور خط پر نیچے آپ کے دستخط ہوں۔ سبھی ہندوؤں نے یہ قسم لی 'اگر ہم میں سے کوئی بھی آپ کو چھوتا ہے تو یہ گائے کا گوشت کھانے کے برابر ہوگا۔ اور مسلمانوں نے بھی اسی طرح کا عہد کرتے ہوئے کہا اگر ہم میں سے کوئی آپ کو چھوئے تو وہ سور کے گوشت کھانے کے برابر ہوگا۔ اور رانی نے اس خط کے اوپر اپنے دستخط کیے اور یہ خط کیپٹن اسکن کو دیا گیا۔ مسز مٹلو کے مطابق یہ خط پڑھا گیا اور ہر شخص قلعہ چھوڑنے کے لیے راضی ہو گیا۔ محصور لوگوں میں سے کچھ تو ہندوستانی لباس میں تھے اور جیسے ہی وہ قلعے سے باہر آئے باغیوں نے ان لوگوں کے پیچھے محافظ لگا دیے۔ مسز مٹلو اور ان کی آیا کو نہیں دیکھا گیا۔ اور وہ اس پارٹی سے الگ نکل آئے۔ آیا نے اپنی مالکن کو اپنے گھر لے جانے سے سے انکار کر دیا اور انہیں وہ جوکھن باغ لے گئی جہاں تقریباً ایک ماہ تک وہ رہی۔ اس بیان کو قبول کرنے میں کئی دشواریاں ہیں کیونکہ اس زمانے میں ہندوستانی حکمرانوں میں یہ رواج نہیں

تھا کہ وہ اس طرح کے خطوط پر دستخط کریں اور یا واحد متکلم کے صیغے میں خط لکھیں۔ رانی بھی استثناء نہیں تھی۔ اپنے سارے سرکاری خطوط میں وہ اپنی مہر استعمال کرتی۔ مسز مٹلو جیسی حیثیت کی عورت کے لیے اس رواج سے واقف ہونا ناممکن تھا۔ اور اسکن کا یہ کہنا کہ رانی خود دستخط کریں' بعید از قیاس ہے۔ یقیناً وہ دستخط کی جگہ پر مہر سے زیادہ واقف رہا ہو گا۔ مسز مٹلو کے شوہر اور اس کے بہنوئی خطرے کی پہلی گھنٹی پر ہی قلعے میں چلے گئے تھے اور مسٹر اسکن اسے بعد میں قلعے میں لائے۔ کیا یہ ممکن تھا کہ جب خود اس کے اپنے لوگ قلعہ کو خالی کر رہے تھے تو وہ اپنی آیا کے ساتھ کنارے کھڑی رہتی۔ کیونکہ یہیں سے یورپین کو لے جاکر مارا گیا تھا۔ اس لیے یہ جگہ ایسی تھی جہاں سے ہر امن پسند آدمی بھاگنا چاہتا تھا۔ مسز مٹلو اور ان کی آیا نے ایک عورت اور دو بچوں کے لیے محفوظ جگہ کیسے تصور کر لیا۔ مسز مٹلو کا یہ بھی الزام تھا کہ رانی اسے اور دولت رام کو تلاش کروا رہی ہیں۔ کیا رانی کے آدمیوں کے لیے یہ ناممکن تھا کہ وہ ہندو شمشان گھاٹ کی کھلی جگہ میں ایک عورت اور اس کے دو بچوں کو تلاش نہ کر لیں؟

سر رابرٹ ہیملٹن نے بظاہر رانی پر باغیوں کے ساتھ ساز باز کرنے کا الزام نہیں رکھا۔ وہ صرف 12 ویں این آئی' کے اس سپاہی کا حوالہ دیتا ہے جسے موت کی سزا سنائی گئی تھی جب وہ اپنا بیان دے رہا تھا۔ ''ہیملٹن کا کہنا ہے کہ اس نے جو کچھ بیان دیا' اس کی تصدیق دوسرے گواہوں نے بھی کی اور جہاں تک ان کے درست ہونے کا سوال ہے انہیں اس کا کریڈٹ ملنا چاہیے۔ سپاہی امان خاں کو پکا یقین تھا کہ بغاوت سے پہلے باغیوں نے رانی سے کوئی مشورہ نہیں کیا تھا۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ باغیوں نے اپنی بندوقیں تان لی تھیں اور ہر شخص کو دھمکایا تھا کہ اگر ان کا ساتھ نہیں دیں گے تو وہ انہیں گولی سے اڑا دیں گے۔ اس لیے سوار اور سپاہی مجبور ہو گئے۔ پھر وہ سب رانی کے محل میں بھری ہوئی بندوقیں لے کر گئے اور ان سے فوری طور پر امداد کے لیے کہا۔ وہ مجبور ہو گئیں کہ انہیں بندوق' اسلحے اور بارود فراہم کریں۔''

ہم ان بیانات کا موازنہ' خود رانی کے غدر کے بارے میں میجر ڈبلو سی ارسکائن کمشنر اور ایجنٹ لیفٹیننٹ گورنر ساگر ڈویژن کو لکھے گئے خط سے کر سکتے ہیں۔ باغیوں نے 12/ جون کو جھانسی سے دلی کے لیے رانی سے بہت زیادہ رقم اینٹھنے کے بعد کوچ کیا۔ اسی دن ایک ہرکارہ خط کے ساتھ ارسکین کے پاس بھیجا گیا۔ دو دن بعد ایک دوسرا ہرکارہ دوسرے خط کے ساتھ جس میں جھانسی کے واقعات کی تفصیل دی گئی تھی' ارسکین کی طرف روانہ ہوا۔ یہ کاغذات ایک چھڑی کے اندر پوشیدہ رکھے گئے تھے۔ اور یہ ہرکارے اپنی زندگی کا جوکھم اٹھاتے ہوئے ساگر اور جھانسی کے بیچ پڑنے والے گھنے جنگلوں سے ہوتے ہوئے گئے۔ راستے میں انہیں لوٹ لیا گیا۔ کیونکہ ہر طرف بدامنی پھیلی ہوئی تھی اور کمزور لوگ مضبوط اور قوی لوگوں کے رحم و کرم پر تھے۔ رانی نے لکھا: ''سرکاری فوجیں جو جھانسی میں مقیم تھیں' انہوں نے غداری کی اور تشدد پر اُتر آئے اور بہت بے رحمی سے سبھی یورپین سول اور ملٹری افسروں' کلرکوں اور ان کے خاندان والوں کو مار ڈالا۔ چونکہ

رانی کے پاس نہ اسلحے تھے اور نہ فوجی' اس لیے وہ ان کی مدد نہیں کر سکیں۔ ان کے محل کی حفاظت پچاس یا سو آدمی کر رہے تھے اور ان واقعات پر اسے بہت افسوس ہے۔ اس کے بعد یہ باغی خود رانی اور اس کے نوکروں کے ساتھ تشدد پر اتر آئے اور ان سے سارا اثاثہ چھین لیا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ چونکہ رانی خود اس ریاست پر حکمرانی کرنے کا اختیار رکھتی ہیں' وہ اس کا انتظام کریں۔ جب فوجی دلی کی طرف بادشاہ کی مدد کے لیے بڑھنے لگے۔ وہ ان برٹش حکمرانوں پر پوری طرح منحصر تھیں' جنہیں قتل کر دیا گیا۔ اور باغی فوجی چونکہ انھیں بالکل بے یار و مددگار سمجھتے تھے انھوں نے جھانسی کے تحصیلدار اور منصفی کے سر رشتہ داروں کے ذریعہ یہ اطلاع بھجوائی کہ اگر وہ ان کی مانگوں کو ماننے سے ذرا بھی ہچکچائیں تو توپوں سے ان کے محل کو برباد کر دیں گے۔ اپنی حالت کو دیکھتے ہوئے وہ مجبور ہو گئیں کہ ان کی مانگوں کو مان لیں اور بدقت تمام انھیں ایک بڑی رقم اپنی عزت اور زندگی بچانے کے لیے دینی پڑی۔ یہ جانتے ہوئے کہ اب کوئی برٹش افسر پورے ضلع میں نہیں بچا ہے۔ رعایا کی بہبود اور حفاظت کے خیال سے انھوں نے سبھی سرکاری اہلکاروں کو یہ پروانہ بھیجا اور ان سے کہا کہ وہ اپنی جگہوں پر بنے رہیں' اور ہمیشہ کی طرح کام کرتے رہیں۔ وہ اس وقت بھی اپنی زندگی اور یہاں کی عوام کے لیے خطرہ محسوس کر رہی ہیں' اس لیے یہ مناسب تھا کہ وہ ان باتوں کی فوری طور پر اطلاع دیتیں۔ لیکن باغیوں نے انھیں ایسا کرنے کا کوئی موقع نہیں دیا۔ چونکہ آج وہ دلی کی طرف کوچ کر رہے ہیں اس لیے وہ فوری طور پر یہ اطلاع دے رہی ہیں۔"

14/ جون کو بھیجے گئے اپنے خط میں انھوں نے لکھا کہ پورے ضلع میں بدنظمی اور انتشار پھیلا ہوا ہے۔ سرکش زمینداروں نے دیہی علاقوں میں اپنی حکومت قائم کر لی ہے اور پڑوس کے علاقوں کو لوٹ رہے ہیں۔ "ضلع کی حفاظت کے لیے تدبیر کرنا ان کے لیے اب ناممکن ہو گیا ہے۔ کیونکہ اس کے لیے پیسے کی ضرورت ہو گی جو ان کے پاس بالکل نہیں ہے اور نہ ہی اس شورش کے دور میں مہاجن انھیں قرض ہی دیں گے۔ اس لمحے تک اپنی ذاتی املاک کو بیچ کر اور بہت زیادہ دشواریوں کا سامنا کر کے وہ شہر کو لوٹ پاٹ سے بچانے میں کامیاب رہی ہیں۔ اور کسی طرح پچھلی سرکار کا بھرم بنائے ہوئے ہیں۔ ابھی تک ان نے قصبوں اور مفصل چوکیوں کی حفاظت کی ہے۔ لیکن بغیر سرکاری فوج اور دولت کے وہ ان جگہوں پر قبضہ زیادہ دنوں تک نہیں بنائے رکھ سکتیں۔ اس لیے میں نے شہر اور ضلع کی حالت کے بارے میں ساری تفصیل آپ کو بھیجنا مناسب سمجھا۔ اور امید کرتی ہوں کہ بہت جلد آپ اس طرح کا حکم صادر کریں گے جس پر فوری طور پر عمل کیا جا سکے۔"

ان سیدھی سادی تفصیلات کے اندر کوئی بات راز نہیں رکھی گئی کیونکہ رانی کھلے عام یہ قبول کرتی ہیں کہ انھیں باغیوں کو دولت فراہم کرنا پڑی کیونکہ خود ان کو جان کی دھمکی دی گئی تھی اور یہ کہ انھوں نے عوام کی حفاظت کے لیے انتظام کی ذمہ داری لے لی تھی۔ انھوں نے خود حکومت سے درخواست کی کہ وہ فوری طور پر فوج کو بھیجے تاکہ نظم و نسق بنائے رکھا جا سکے۔ اگر وہ باغیوں سے ملی ہوتیں تو ان کے لیے یہ زیادہ بہتر ہوتا کہ وہ باغیوں سے یہیں رہنے کو کہتیں کیونکہ

ان کے جانے کے بعد وہ بہت زیادہ مجبور اور بے بس ہو جاتیں۔ نہ صرف برٹش انتظام کے لیے بلکہ پاس پڑوس کے حملوں سے اور خود ان کے اپنے رشتہ داروں کی سازش کی وجہ سے۔ ارسکین نے رانی کے اس خلوص پر کوئی شبہ ظاہر نہیں کیا اور اس نے رانی کے اس خط کو بیدون بھیجتے ہوئے اس میں اپنا خط بھی منسلک کیا اور یہ کہا کہ رانی نے جو تفصیلات بیان کی ہیں وہ من وعن وہی ہیں جو مجھے دوسرے ذرائع سے معلوم ہوئیں۔ ارسکین نے رانی سے کہا: ''وہ مالگزاری وصول کریں' اپنی پولیس قائم کریں اور جو کچھ بھی ان کی طاقت میں ہو' اس کا استعمال نظم وضبط بنائے رکھنے کے لیے کریں اور ان کے اخراجات کی تلافی جب ہمارے افسران جھانسی پہنچیں گے' کر دی جائے گی اور ان کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا جائے گا۔ اور ہم اس کے ساتھ ہی ان کے لیے ایک اعلان نامہ بھیج رہے ہیں جسے وہ ضلع کے عوام میں مشتہر کریں کہ وہ رانی کا حکم مانیں جو برٹش گورنمنٹ کے اصولوں کے مطابق ہو اور یہ کہ وہ موجودہ حالات میں اپنا انتظام خود کریں۔ یہ اقدام استثنائی صورت کے نہیں تھے کیونکہ اسی طرح کے احکام پنّا کے راجا کو دیتے ہوئے اسے داموضلع کا انچارج بنایا گیا تھا۔ ان نازک حالات میں ہندوستان کی دوسری جگہوں پر بھی عارضی طور پر انتقال اقتدار کیا گیا تھا۔

گورنر جنرل نے ارسکین کے اس قدم کی ایک شرط کے ساتھ منظوری دے دی۔ جی ایف ایڈمنڈاسٹون' جو حکومت ہند کے سکریٹری تھے' انہوں نے ارسکین کو لکھا ''جہاں تک رانی کا سوال ہے' مجھے یہ کہنے کا حکم ہوا ہے کہ گرچہ گورنر جنرل ان حالات کو قبول کرنے پر آپ کو کوئی الزام نہیں دیتے جس سے آپ گزر رہے تھے اور آپ نے اس کے خط اور اس کے جذبات کا حوالہ دیتے ہوئے اسے جھانسی کے علاقے کے انتظام کی ذمہ داری برٹش حکومت کی طرف سے سونپ دی ہے۔ لیکن یہ حالات اسے بچا نہیں سکیں گے' اگر اس نے جو بیان دیا ہے وہ غلط ثابت ہوئے۔ میجر ایلس نے سرکار کو جو تفصیلات بھیجی ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رانی نے باغیوں کی ہر طرح سے مدد کی' انہیں فوج اور اپنے اسلحے بھی دیئے۔'' یہ اطلاع میجر ایلس کی اطلاع کے مطابق تھی کہ رانی کو مجبور کیا گیا کہ وہ اسلحوں اور ہاتھیوں سے ان کی مدد کریں۔ کچھ بھی ہو' رانی نے فوری طور پر اپنے شوہر کی ریاست کا انتظام برٹش سرکار کی مرضی کے مطابق سنبھال لیا اور اپنے حکام تعینات کئے جس کی پوری واقفیت گورنر جنرل کو تھی۔ لیکن جولائی 1857ء میں حکومت ہند جھانسی میں ہوئے قتل عام' جس میں ساٹھ مردوں' عورتوں اور بچوں کی جانیں گئیں' کو فراموش نہیں کر سکی۔ انہوں نے سزا دینے کا معاملہ کچھ دنوں کے لیے ملتوی رکھا۔ کیونکہ اس وقت وہ کوئی کارروائی کرنے کی حالت میں نہیں تھے۔ جھانسی انتقام چاہتا تھا اور مجرم بھی ایسا شخص تھا جس کی وہاں کافی اہمیت تھی۔ لیکن رانی کی معصومیت کی تصدیق ایک غیر متعلقہ شہر سے 1889ء میں موصول ہوئی جب ایک انگریز جس کا نام مارٹن تھا وہ رانی لکشمی بائی کی یاد کو تازہ کرنے کے لیے آگے آیا۔ اس نے 20/اگست کو رانی کے گود لیے لڑکے دامودر راؤ کو آگرہ سے لکھا: ''آپ کی ماں

کے ساتھ بہت زیادہ ناانصافی اور بہت سخت برتاؤ کیا گیا اور کوئی بھی شخص صحیح معاملے سے اس حد تک آگاہ نہیں جتنا میں ہوں۔ اس غریب عورت نے جھانسی میں 1857ء میں یورپین کے قتل میں کسی بھی طرح کا کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ اس کے برخلاف اس نے انہیں جب وہ قلعہ میں محصور ہوئے تو دو دنوں کا رسد فراہم کیا۔ اس نے کرہ سے سو آدمیوں کو بلا کر ہماری مدد کے لیے بھیجا۔ جہاں وہ قلعہ میں ایک دن رہے اور شام کو انہیں واپس کر دیا گیا۔ اس کے بعد اس نے میجر اسکن اور کیپٹن گارڈن کو مشورہ دیا کہ وہ فوری طور پر دتیہ کے لیے روانہ ہو جائے اور اپنے کو راجا کی حفاظت میں دے دے۔ لیکن وہ اتنا کرنے کو بھی تیار نہیں تھے اور آخر کار ہمارے اپنے آدمیوں کو پولیس جیل اور دوسری جگہوں کے محافظوں نے قتل کر دیا۔ یہ سارے سو آدمی جو اس نے بلائے تھے' سبھی ٹھاکر تھے جس کا حوالہ گارڈن نے بھی دیا ہے اور شیخ ہنگن کی گواہی میں بھی ملتا ہے۔ اور جب انہیں قلعہ سے واپس کیا گیا تو باہر کے لوگوں نے سمجھا کہ شاید رانی نے انہیں واپس بلا لیا۔

رانی نے اس کے بعد بھی برٹش سے اپنے دوستانہ تعلقات بحال رکھے۔ سر رابرٹ ہملٹن' جن کا وسطی ہندوستان سے گہرا تعلق تھا' وہ اس خطے کی سیاست سے بخوبی واقف تھا۔ جب وہ لمبی رخصت کے بعد اندور واپس آیا تو رانی نے اس سے فوراً اپیل کی۔ اس نے اپنے خط میں لکھا کہ اب بھی اس مصیبت کی گھڑی میں جبل پور کے کمشنر' گورنر جنرل کے مقامی ایجنٹ' آگرہ کے لیفٹیننٹ گورنر' جالون کے ڈپٹی کمشنر' گوالیار کے پولیٹکل ایجنٹ اور میجر ایلس سب کو مدد کے لیے خطوط بھیجے ہیں لیکن اسے اندیشہ ہے کہ ہو سکتا ہے کہ ان میں سے بعض خطوط مکتوب الیہ کو نہ پہنچے ہوں۔ اس نے جو خط آگرہ بھیجا تھا اس کے بارے میں اسے شبہ تھا کہ یہ پہنچا نہیں۔ کیونکہ اس کا ہرکارہ قلعہ میں داخل نہیں ہو سکا تھا۔ اور یہ ایک بھشتی کو دے دیا گیا تھا۔ وہ لکھتا ہے: "اس نے کرنل ارسکین کو جبل پور میں آگرہ کے چیف کمشنر کرنل فریزر کو خریطہ بھیجا جو میں نے خود اپنے ہاتھوں سے انہیں دیا' تاکہ رانی کی باتیں سن لی جائیں۔ لیکن نہیں۔ جھانسی ایک بھولا ہوا شہر تھا اور بغیر سنوائی کئے اسے مجرم قرار دے دیا گیا۔"

اس دوران اس کے دشمن خالی نہیں بیٹھے۔ گنگا دھر راؤ کی موت کے بعد جانشینی کا دعویٰ پرولہ کے سداشیو راؤ نے پیش کیا۔ جو بہت دور کے رشتے سے اس کا بھتیجہ تھا۔ اس نے سوچا کہ برٹش حکومت کے ختم ہونے اور باغیوں کے وہاں سے چلے جانے کی وجہ سے اس کا موقع آگیا ہے۔ اس نے کچھ فوج جمع کی اور جھانسی سے 30 میل دور کریرا کے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ اور برٹش حکومت کی پولیس اور مالگزاری افسروں کو مار بھگایا۔ وہاں سے وہ آس پاس کے گاؤں میں چھاپہ مارتا رہا اور خود مہاراجہ جھانسی کا لقب اختیار کر لیا۔ رانی کے آدمیوں نے اسے کریرا سے بھگا دیا خود ساختہ مہاراجہ نے سندھیا کے علاقے ناروار میں پناہ لے لی۔ یہاں بھی اس نے اپنی فوج تیار کی اور تخریبی کاموں میں لگ گیا۔ اس بار اسے قید کر لیا گیا اور جھانسی قلعہ میں رکھا گیا۔

لیکن ابھی رانی کی دشواریاں ختم نہیں ہوئی تھیں۔ اسے اب اور سخت دشمنوں کا سامنا کرنا

پڑا۔ یہ بندیلہ جنگجو تھے۔ انھوں نے مغل حکمرانی کے دور میں بہت پس و پیش کے ساتھ مرکزی حکومت کی اطاعت قبول کی تھی لیکن اس کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔ بندیلہ اس خطے میں مراٹھوں کو زبردستی قبضہ کرنے والا سمجھتے اور وہ جھانسی' جالون اور دوسرے ضلعوں کو' جو کبھی ان کے تھے' واپس لینا چاہتے تھے۔ جب بغاوت شروع ہوئی تو برٹش کے لیے کوئی خاص خیال نہیں رکھتے تھے۔ ہم پہلے پڑھ چکے ہیں کہ کس طرح گارڈن نے سمتھر' اور چھا کے بندیلہ راجاؤں کو مدد کے لیے لکھا تھا۔ ریلے کہتا ہے 6/جون کو دوپہر کے وقت اورچھا اور دتیہ کے راجاؤں سے انکار موصول ہوا۔ جس میں انہوں نے کہا کہ وہ کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ انہوں نے دیکھا کہ برٹش حکومت کو انکار کرنے سے ان کا کچھ نہیں بگڑا تو ایک برہمن بیوہ سے جنگ کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

پراسنس کا کہنا ہے کہ جھانسی پر حملہ کرنے سے پہلے ناتھے خاں جو اورچھا کے دیوان تھے' نے رانی کو وہی پنشن دینے کی پیشکش کی جو اسے برٹش حکومت سے ملا کرتی تھی۔ بشرطیکہ وہ اپنی ریاست انہیں سپرد کر دے۔ ہمیں یہ یقینی طور پر نہیں معلوم کہ اس خبر کی کوئی حقیقی بنیاد بھی تھی یا یہ ان کہانیوں میں سے ایک ہے جو بہت سے لوک گیتوں میں رانی کی شجاعت کے بارے میں گائے جاتے ہیں۔ ہمیں یہ بھی نہیں معلوم کہ کب اورچھا کی فوجوں نے جھانسی پر حملہ کیا۔ لیکن اس حملے سے رانی کا نقصان ہوا۔ اس کے پاس فوج بھی بہت کم تھی اور جنگی ذخیرہ بھی۔ اپنی اس پریشانی کی وجہ سے اس نے اپنے علاقے کے زمینداروں سے اپیل کی اور ریاستی تعلقات خونی رشتہ سے زیادہ مؤثر ثابت ہوئے۔ سبھی بندیلہ ٹھاکر جھانسی کی رانی کے ساتھ ہو گئے۔ رانی کے داماد اور اورچھا بھی ان کی مدد کو پہنچ گئے۔ لیکن جنگ کے ابتدائی مراحل میں ناتھے خاں قلعہ کی دیواروں تک پہنچ گیا۔ شاید یہی وہ نازک موقع تھا جب پہلی بار رانی اپنی فوج کی کمان کرتی نظر آئی۔ اورچھا کی فوجیں پسپا ہو گئیں۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ ایک وقت میں دتیہ نے بھی انہیں پریشان کیا تھا اور کہا جاتا ہے کہ اورچھا اور دتیہ میں یہ معاہدہ ہو گیا تھا کہ وہ اس ریاست کو آدھا آدھا تقسیم کر لیں گے۔ اپنی حکومت کو انگریزوں کے واپس آنے پر ان کے سپرد کر دینے میں کوئی بے عزتی نہیں ہوتی۔ لیکن خاندان کے پرانے رفیقوں کو دے دینے سے یقیناً بے عزتی ہوتی۔ سر رابرٹ ہیملٹن کو پہلی جنوری 1858ء میں لکھے گئے اپنے خط میں رانی نے شکایت کی "ملک جس پریشانی سے گزر رہا ہے اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے دتیہ اور اورچھا کے حکمرانوں نے ان کی ریاست کی سرحدوں سے ملے جھانسی کے ان علاقوں پر مشرق سے مغرب تک قبضہ کر لیا۔ 3/ کو (دونوں حکمرانوں نے متفقہ طور پر) اورچھا کی فوجوں' جو زیادہ تر ریاست کے ٹھاکروں پر مشتمل تھیں اور جن کی تعداد چالیس ہزار فوجی اور 28/ توپیں تھیں' نے جھانسی پر حملہ کیا اور دوسرے حکمرانوں نے ان کا تعاون کیا۔ گرچہ کمشنر سے موصول ہوئے دونوں خط میں نے پڑھنے کے لیے ناتھے خاں کو بھیجا' لیکن اس نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی۔ میں نے پھر کمشنر کو خط لکھا جس نے 19/ اکتوبر کے اپنے

جواب میں مجھ سے کہا کہ انگریزی فوجیں جبل پور میں جمع ہو رہی ہیں اور وہ خود جھانسی آئے گا اور سبھی لوگوں کے دلوں ٹٹول کران سے مناسب طریقے سے نمٹے گا۔ اس دوران میں نے اپنی املاک بیچ کر اور سود پر پیسہ حاصل کر کے تھوڑی سی فوج اکٹھا کی اور شہر کی حفاظت کا انتظام کیا اور حملہ آوروں سے مقابلہ کیا۔ ان حالات میں میں اپنے دشمنوں سے کبھی نجات نہیں پاسکوں گی اور نہ ہی اپنے بھاری قرض کو اتار سکوں گی' برٹش حکومت کی مدد کے بغیر۔ کمشنر اس وقت مجھے کوئی مدد فراہم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں کیونکہ جیسا کہ انہوں نے اپنے 9/ نومبر کے خط میں اطلاع دی کہ اس وقت انگریزی فوجوں کی ضرورت ان کے اپنے علاقے میں ہے۔ کیونکہ یہ حقیر خود غرض لوگ برٹش حکومت کی طاقت کا اندازہ نہیں کرپائے ہیں اس لیے وہ مجھے اور میری ریاست کو برباد کرنے کے لیے ہر طرح کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس لیے میں آپ سے گزارش کرتی ہوں کہ جہاں تک ممکن ہو آپ میری مدد کریں۔ مجھے امید ہے کہ اس طرح آپ مجھے اور میرے لوگوں کو بچالیں گے۔ ''سر رابرٹ ہیملٹن نے اس خط کے موصول ہونے کی کوئی رسید نہیں دی۔ کیونکہ وہ اپنا ذہن بنا چکا تھا۔

جبل پور کے کمشنر نے رانی سے کہا تھا کہ وہ انگریزوں کی طرف سے اس وقت تک اس ریاست کی دیکھ بھال کریں جب تک کہ انگریز واپس نہیں آجاتے۔ اس نے یہ بھاری ذمہ داری قبول کرلی تھی۔ لیکن اسے جلد ہی احساس ہو گیا کہ اس کے ضلع پر مشرق اور مغرب سے لگاتار حملہ ہو رہا ہے۔ باغیوں کے ذریعہ نہیں بلکہ ان بندیلہ حکمرانوں کی طرف سے جو خود کو برٹش حکومت کا وفادار کہتے ہیں۔ حفاظت کی ان کی ساری اپیل بے کار گئی۔ اپنی ریاست کے لیے جوش میں بھری یہ وفادار عورت اور چھا اور دتیہ سے خوفزدہ ہونے والی نہیں تھی۔ اس نے اپنی فوج بنائی۔ توپیں اور بارود بنانا شروع کیا اور لوگوں کو ساتھ دینے پر آمادہ کیا۔ اس کی اپنی فوجوں نے دشمن کو مئورانی پور اور برواساگر میں شکست دی۔ نا تھے خاں کی بے عزتی ہوئی۔ لیکن اس دوران وہ باغیوں سے الجھ گئی۔ اس کی نئی فوج میں بہت سے باغی بھی بھرتی ہوگئے اور اس کے حمایتوں میں بان پور اور ساگر کے باغی راجا بھی تھے۔ اس کے اپنے امراء جنہوں نے فتح کا مزہ چکھ لیا تھا' اب جنگ کے لیے اور آمادہ نظر آرہے تھے۔ لیکن جنوری فروری 1858ء میں برٹش مخبروں نے جو خبریں جمع کی تھیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ جس علاقے کا انتظام اس کے سپرد کیا گیا تھا' اسے وہ واپس دینے کے لیے تیار تھی بشرطیکہ انگریز اس سے باعزت اور رحم کا معاملہ کرے۔

8/ جنوری کو جو رپورٹ جمع کی گئی اس کے مطابق ''کہا جاتا ہے کہ بخشش علی نے' جو جھانسی جیل کے داروغہ تھے' رانی سے پوچھا کہ وہ انگریز فوجوں کے ساتھ جنگ کرے گی یا نہیں؟ اور رانی نے اسے جواب دیا کہ وہ جنگ نہیں کرے گی۔ اور انگریز حکمرانوں کے واپس آنے پر وہ جھانسی انہیں لوٹا دے گی۔ اس جواب پر داروغہ نے رانی کی ملازمت ترک کردی۔'' 26/ جنوری کی خبر یہ تھی کہ رانی نے اپنی فوجیں مئورانی پور میں اور چھا کی فوجوں سے لڑنے کے لیے بھیجی

ہیں۔ اس نے اپنا ایک وکیل بھی کمشنر کے پاس بھیجا ہے۔ اگر وکیل سے ڈھنگ سے بات چیت کی گئی تو وہ انگریزوں سے جنگ نہیں کرے گی بلکہ سارا ضلع انہیں واپس کر دے گی۔ لیکن اگر اس کے برخلاف معاملہ ہوا اور انگریز افسروں نے ناراضگی ظاہر کی تو پھر آخر دم تک ان سے لڑے گی۔ اس دوران بندوقیں اور بارود وغیرہ بڑے پیمانے پر تیار کیے جارہے تھے۔ فروری میں بھی یہ اطلاع دی گئی کہ رانی انگریزوں سے جنگ کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ گرچہ جنگی تیاریاں زور و شور سے چل رہی ہیں۔ مارچ میں اس کی کونسل میں تفرقہ پڑ گیا۔ 15/ مارچ کو مخبروں نے خبر دی۔ ''خاص مشورے کے لیے رانی کے مجلس عاملہ کی بیٹھک ہوئی۔ کاشی ناتھ ہری اور للو بخش نے انگریزوں سے صلح کرنے کو کہا۔ ماما صاحب اور گنگادھر کا یہ خیال ہے کہ اب اس حکومت کو انگریزوں کے سپرد کرنا مناسب نہیں ہوگا کیونکہ بہت دشواریوں کے بعد اس پر قبضہ کیا گیا ہے۔ بخشی اور کاشی ناتھ نے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ اس حکومت کو آنجہانی بادشاہ نے خود انگریزوں کے سپرد کردیا تھا۔'' یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ یہ رپورٹیں اکثر قابل اعتماد نہیں تھیں۔ ایک رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا کہ شہزادہ فیروز شاہ جھانسی آئے جس کی تصدیق کسی اور رپورٹ سے نہیں ہو سکی۔ گرچہ ایسا ناممکن بھی نہیں تھا۔ جب کہ ایک دوسری رپورٹ میں کہا گیا کہ تانتیاٹوپے نے رانی کو مشورہ دیا کہ وہ انگریزوں سے صلح کرلے جب کہ اس طرح کا مشورہ تانتیاٹوپے کی طرف سے آنا ناممکن تھا۔ لیکن رانی نے اپنا ایک ایجنٹ ساگر اور اپنا ایک خط جو سر رابرٹ ہیملٹن کو بھیجا تھا وہ ان رپورٹوں سے مطابقت رکھتا ہے۔ جنوری میں اس کی اپیلوں پر برٹش حکومت کے سرد رویے سے وہ پریشان ہوگئی۔ فروری میں وہ حالات کے مطابق اپنی قسمت کا فیصلہ خود کرنے کی سوچ رہی تھی۔ مارچ میں اس کے کچھ مشیروں نے صلاح دی کہ وہ جارحانہ پالیسی اختیار کرے۔ اس نے ان پرانے فوجیوں کو پھر سے بھرتی کرلیا جنہیں قبضے کے بعد جانے دیا گیا تھا۔ وہ سب جنگ کے حامی تھے۔ ان کے نزدیک امن سے ان کی روزی روٹی ختم ہوتی۔ کچھ بندیلہ امرا کو بھی اقتدار کا مزہ مل گیا تھا۔ وہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ رانی انگریزوں کو جھانسی واپس کردے جب کہ وہ برٹش رویوں کا گہرائی سے مشاہدہ کرتی رہی۔ جنوری میں وہ بہت پُر امید تھی۔ مارچ میں ساری امیدیں ختم ہوگئیں۔ سر ہیوروز جھانسی کے لیے روانہ ہو چکے تھے۔ ان کا رویہ بھی دوستانہ نہیں نظر آرہا تھا۔ ایسے میں ان کے سامنے خود سپردگی' بے عزتی کی بات ہوتی۔ اور جنگ کرنے میں عزت تو بچ جاتی' لیکن سب کچھ ختم ہو جاتا۔

سر ہیوروز کا تجربہ صرف فوج تک ہی محدود نہیں تھا وہ بہت اچھے سفارت کار بھی تھے۔ فوج میں ان کی ترقی بہت جلد ہوگئی۔ 1857ء میں سر ہیو بمبئی آئے اور انہوں نے پونا ڈویژن کی کمان سنبھال لی۔ دسمبر میں انہیں وسطی ہندوستانی زمینی فوج کا کمانڈر بنایا گیا۔ جسے مالوہ بندیل کھنڈ' راجپوتانہ اور وسطی ہندوستان میں راجپوتانہ زمینی فوج اور ساگر اور نرمدا زمینی فوج کے ساتھ مل کر کام کرنا تھا۔ جب کہ کمانڈر انچیف اودھ اور شمالی مغربی صوبے میں مشغول تھے۔ مہو پہنچنے کے فوراً

ہی بعد سر ہیو کو ساگر سے پریشان کن خبریں ملیں۔ سر ہیو نے ساگر سے جنگ کے آغاز کا فیصلہ کیا۔ اسے راستے میں راحت گڑھ کے باغی فوجیوں سے مقابلہ کرنا پڑا۔ جب کہ وہ قلعہ کے باہر توپوں سے حملہ کر رہے تھے' ان پر بان پور کے راجہ نے حملہ کر دیا۔

بان پور کے بندیلہ راجا مردان سنگھ کو باغیوں سے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ وہ اپنے آبائی علاقوں کے لیے جنگ کر رہے تھے۔ ان کے مورثوں کے پاس چندیری کا قلعہ تھا۔ ان کے باپ مجبور ہوئے کہ وہ اپنی حکومت کا دو تہائی حصہ سندھیا حکمرانوں کے سپرد کر دیں۔ اگر سندھیا کے برٹش حکمراں اسے چندیری کا وارث مان لیتے تو مردان سنگھ ان کی طرف سے جنگ کرنے کے لیے تیار تھا۔ اس نے بہت سے برٹش پناہ گزینوں کو اپنے یہاں مہمان بنایا اور للت پور کے باغیوں سے جنگ بھی کی۔ لیکن جب اسے یہ پتہ چلا کہ اس کے اس تعاون کا انعام اسے نہیں ملنے والا تو پس و پیش کے ساتھ وہ باغیوں سے مل گیا اور مقامی ٹھاکروں کی مدد سے اس تاریخی قلعہ پر دوبارہ قابض ہو گیا۔ گرچہ اس نے اپنے حملے کا پورا منصوبہ اچھی طرح تیار کیا تھا لیکن راجا راحت گڑھ کا محاصرہ کرنے میں ناکام رہا اور یہ قلعہ برباد ہو گیا۔ اس کے بعد باغیوں نے بینا شاہراہ پر بارودیہ میں اپنا دفاعی ٹھکانہ بنایا۔ اس چھوٹے سے قلعے کا بہت جانفشانی کے ساتھ افغانوں اور پٹھانوں نے دفاع کیا۔ لیکن ان کا لیڈر مارا گیا اور بان پور کے راجا زخمی ہو گئے۔ اس لیے اس جگہ کو خالی کرنا پڑا۔ 3/ فروری کو سر ہیو ساگر پہنچ گئے۔ گرچہ کوٹہ کو شکست دینے کے بعد سر ہیو جھانسی کی طرف بڑھنے کے لیے آزاد ہو گئے لیکن انہیں اپنا یہ مارچ کچھ دنوں کے لیے ملتوی کرنا پڑا۔ کیونکہ ان کے پاس رسد اور وسائل کی کمی ہو گئی تھی۔ فروری کی آخری تاریخ کو اس نے بمبئی کے گورنر کو لکھا:

"بد قسمتی سے رسد اور وسائل کی کمی کی وجہ سے مجھے یہاں رکنا پڑا ہے اور میں نے اپنے نو قیمتی دن گنوا دیئے۔ یہ قیمتی اس لیے بھی تھے کیونکہ یہاں پر بہت زیادہ گرمی پڑ رہی تھی جس کی وجہ سے یورپین فوجیوں کی صحت پر برا اثر پڑا تھا۔ بلکہ اس کی وجہ سے باغیوں کو اپنی ہمت مجتمع کرنے کا بھی موقع مل گیا تھا جو اس کی جنگی مہارت کی وجہ سے ختم ہو گئے تھے۔ اس دوران سر ہیو نے اپنی فوج کے ہر شعبے میں سدھار پر توجہ دی تاکہ اس کا دوسرا قدم بہت تیز اور ایک ہی حملہ میں شکست دینے والا ہو۔

سر ہیو روز کے پاس یہ انتخاب کرنے کا موقع تھا کہ وہ جھانسی کو چھوڑ کر چرکھاری سے ہوتے ہوئے کالپی جائیں جہاں کا راجا انگریزوں کا گہرا دوست تھا۔ کیونکہ اپنی فوج کے لیے جھانسی کا قلعہ اسے بہت مضبوط نظر آ رہا تھا لیکن اسے اس بات میں دانشمندی نہیں نظر آئی کہ مضبوط دشمنوں کو چھوڑ کر وہ کہیں اور جائے۔ اس لیے پہلے اس نے جھانسی پر قبضہ کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ اس شہر کے حملہ کو دوسروں کے لیے سبق آموز بنا دیا جائے۔ سر رابرٹ ہیملٹن جو فوج کے ساتھ آئے تھے' ان کا بھی یہی خیال تھا کہ پہلے جھانسی پر فتح پا لیں پھر تانتیا کے دارالحکومت کانپور پر حملہ کیا جائے۔ یہ بھی ضروری تھا کہ ساگر سے مواصلاتی ذرائع کو مستقل بنائے رکھا جائے اور اس کے

لیے لیفٹیننٹ پنڈر اگاسٹ کو برودیہ میں کچھ قبائلی کھونڈ کے ساتھ چھوڑ دیا جائے۔ 21/ مارچ کو برٹش فوج جھانسی پہنچ گئی۔ سر ہیوروز کی فوج کے ساتھ بریگیڈیر اسٹوورٹ بھی آکر شامل ہوگئے۔ اس دوران گونا کے خطے کو صاف کر کے چندیری کے مضبوط قلعے پر قبضہ پالیا گیا۔

جھانسی سے کچھ میل پہلے ہی سر ہیو کو ایک اہم فیصلہ کرنا پڑا۔ کانپور کی شکست سے تانتیا ٹوپے کا جوش ٹھنڈا نہیں پڑا۔ وہ اچانک چرکھاری پہنچ گئے جو ایک چھوٹے سے بندیلہ راج کا دارالخلافہ تھا اور یہاں کے راجا نے فوری طور پر اپنے انگریز دوستوں سے مدد کے لیے کہا۔ سر ہیوروز کو حکم دیا گیا کہ وہ فوراً اس کی حفاظت کے لیے پہنچیں کیونکہ یہ ضروری سمجھا گیا کہ بندیل کھنڈ کے وفادار راجاؤں کی حفاظت کی جائے۔ لیکن سر ہیو نے کہا کہ ان کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی چرکھاری کے قلعہ پر قبضہ ہو چکا ہوگا۔ جب کہ اس کی جگہ پر جھانسی کے حملے سے راجا کو کافی اطمینان نصیب ہوگا۔ کیونکہ تانتیا چرکھاری چھوڑ کر فوراً رانی کی مدد کے لیے جھانسی پہنچے گا۔ سر رابرٹ ہیملٹن نے بھی اس سے اتفاق کیا۔

جھانسی کا محاصرہ 22/ مارچ کو شروع ہوا۔ 25/ تاریخ کو داہنی طرف کی بیٹریوں نے گولہ باری شروع کی۔ 26/ تاریخ کو بائیں طرف بیٹریوں کو نصب کر دیا گیا۔ اور انہوں نے بھی قلعہ پر حملہ شروع کر دیا۔ دفاع کرنے والوں نے پورے جوش کے ساتھ گولیاں برسائیں اور عورتوں کو مرمت کے کام میں مشغول پایا گیا۔ اسی دن شام کو رانی نے خود بھی دفاعی افواج کا معائنہ کیا تاکہ اپنے آدمیوں کو نئے جوش اور ولولے سے بھر سکے۔ قلعہ بہت مضبوط تھا اور اس کے سارے آدمی وفادار تھے۔ اسے یہ بھی امید تھی کہ باہر سے بھی اسے مدد مل جائے گی۔ اور یہ مدد فوراً ہی آگئی۔ 31 تاریخ کو تانتیا ٹوپے 20/ ہزار آدمیوں کے ساتھ ان کی مدد کے لیے پہنچ گئے۔ سر ہیو کو فیصلہ کرنا تھا کہ وہ اپنی فوجوں کو واپس بلا کر باہری حصے میں مقابلہ کریں یا ان کا مقابلہ ایک چھوٹی سے فوج کے ساتھ کریں اور محاصرہ لگاتار جاری رہے۔ اس نے دوسرا راستہ اختیار کیا اور گھمسان کی جنگ کے بعد تانتیا کی فوج کو شکست دے دی۔

تانتیا کی شکست کے بعد سر ہیو نے اپنی ساری توجہ جھانسی پر مرکوز کر دی۔ رانی نے بہت عقلمندی کے ساتھ دیہی علاقوں کو تاراج کرا دیا تھا۔ لیکن سر ہیو کو رسد کے معاملہ میں کوئی پریشانی نہیں ہوئی کیونکہ سندھیا اور چھاکی رانی نے انہیں بہت زیادہ رسد فراہم کر دی تھی۔ جو لوگ محاصرہ کے اندر تھے انہیں تانتیا کی شکست کی اطلاع یقیناً ملی ہوگی۔ لیکن ان کی ہمت پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ اور جب 3/ اپریل کو حملہ شروع ہوا تو انہوں نے اپنے دشمنوں کے چھکے چھڑا دینے والی گولی باری کی۔ انہوں نے دشمنوں پر میزائلی بارود سے بھرے گھڑے اور لکڑی کے گٹھر اور جو کچھ بھی ان کے ہاتھ آیا ان سے حملہ کیا اور آخر کار.......... دروازہ ٹکڑے ٹکڑے بکھر گیا اور برٹش افواج تیزی سے آگے بڑھی لیکن اندر جانے کا راستہ بڑی بڑی چٹانوں کے ٹکڑوں سے مسدود کر دیا گیا تھا۔ اور داہنی طرف سے کئے گئے حملے کو پسپا کر دیا گیا جس میں اس کا کافی نقصان ہوا۔ لیکن ایک

دوسری فوجی ٹکڑی اس معاملہ میں خوش قسمت تھی کہ اسے ایک چھوٹے سے شگاف سے اندر جانے کا راستہ مل گیا۔ بائیں طرف کی ٹکڑی کو اس سے کنگوروں پر چڑھنے میں سہولت ہو گئی اور وہ محل کو جانے والے راستے پر آ گئے۔ اب جنگ ہر گلی کوچے اور سڑک پر ایک گھر سے دوسرے گھر' ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں ہونے لگی اور دفاع کرنے والوں نے شیر کی طرح جی توڑ لڑائی کی۔ نہ تو کوئی حصہ خالی کرایا جا سکا اور نہ ہی کچھ دیا گیا۔ اور جب وہ کسی صورت سے محل کے صحن میں پہنچے تو ایسا لگا جیسے مزاحمت کی ابھی شروعات ہوئی ہے۔ ہر کمرے کے لیے بالکل جنگلیوں کے انداز میں جنگ کی گئی۔ اور وہاں سے سنگینوں کی نوک پر دشمنوں کو بھگایا گیا۔ آخر کار محل پر قبضہ پا لیا گیا۔ پھر بھی ان کی مخالفت ختم نہیں ہوئی۔ دو گھنٹے بعد یہ معلوم ہوا کہ رانی کے پچاس محافظ دستے عمارت سے ملحق اصطبل پر اب بھی قبضہ کئے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک پارٹی اصطبل کے کمروں میں رہ گئی۔ جس میں آگ لگا دی گئی اور جب وہ آدھا جل چکا اور ان کے کپڑوں میں آگ لگ گئی تو آدھا جلنے کے بعد وہ باہر نکلے اور اپنے حملہ آوروں پر حملہ کرتے ہوئے اور ڈھال سے اپنا سر بچائے ہوئے دوسرے دن بھی گلی کوچوں میں جنگ جاری رکھی جب تک کہ شہر بالکل برباد نہ ہو گیا۔ ہر سیاہ چہرے والا دشمن تھا اور جنگ نہ کرنے والوں کے ساتھ بھی وہی سلوک ہوا جو جنگ کرنے والوں کے ساتھ۔ جو لوگ نہیں بھاگ سکے' انہوں نے اپنی عورتوں بچوں کو کنوئیں میں دھکیل دیا اور خود بھی اس میں کود گئے۔

برٹش فوجی انتقام کے جذبے سے گھوم رہے تھے۔ ان کا یقین تھا کہ اپنی ریاست کے لوگوں اور بچوں کے قتل عام کے لیے رانی ذاتی طور پر ذمہ دار ہے۔ ان کے اس خیال کا بہترین اظہار ڈاکٹر لو کے بیان سے ہوتا ہے۔ ''اس شہر کی شکست کے بعد کسی قسم کے رحم و کرم کا یا معافی کا کوئی سوال نہیں اٹھتا۔ کیونکہ ہندوستان کی روح —— نوجوان پُر جوش' پُر غرور' ذرا بھی جھکنے والے نہیں۔ اور ذرا بھی مصالحت نہ کرنے والی رانی ابھی زندہ تھی جس کے سر پر تمام مقتول لوگوں کے خون کی ذمہ داری تھی اور وہ سخت سزا کی مستحق تھی۔'' لیکن رانی کو یہ منظور نہیں تھا کہ کسی کمزور پرندے کی طرح خاموشی سے مر جائے۔ رات کے اندھیرے میں مرد کا بھیس بدل کر اپنے گود لیے بچے کے ساتھ وہ نکل گئی۔ ان کے ساتھ وفادار افغان محافظوں کی ایک ٹولی تھی۔ یہ پارٹی اور چھ محافظوں کی نظر سے اوجھل ہو کر آگے بڑھی۔ جلد ہی ان کا مقابلہ ایک دوسرے دستے سے ہو گیا۔ وہ منتشر ہو گئے اور پھر یکجا نہیں ہو پائے۔ رانی اور اس کے وفادار محافظ کالپی کی سڑک پر آگے بڑھے۔ لیکن اس کے باپ ماما صاحب راستہ بھول گئے اور علی الصبح وہ دتیہ کے دروازے پر پہنچ گئے۔ خون نکلنے سے وہ بے ہوش ہو چکے تھے۔ اور گھوڑ سواری کی وجہ سے وہ بالکل شکستہ ہو چکے تھے۔ انہیں فوری طور پر گرفتار کر کے جھانسی بھیج دیا گیا۔ جہاں جوکھن باغ میں ان کو پھانسی دے دی گئی۔ رانی گھوڑ سواری کرتے ہوئے رات میں اکیس میل کا سفر طے کر کے آگے بڑھی۔ لیکن اس کے فرار ہونے کی بات دوسرے دن صبح برٹش کیمپ میں مشہور ہو گئی۔ فوراً ہی اس کے

تعاقب کا حکم دیا گیا۔ کیپٹن فوربس اور لیفٹیننٹ ڈاؤکر تھرڈ لائٹ کیویلری اور 14 ویں لائٹ ڈریگن کے ساتھ اس کے تعاقب میں نکلے۔ رانی کے چالیس وفادار محافظوں نے ان سے جی توڑ لڑائی کی اور آخر کار ان کا ایک ایک آدمی قتل ہو گیا۔ پھر انہوں نے رانی کو دیکھا۔ لیکن رانی مشاق گھوڑ سوار تھی۔ بندوق کی ایک گولی نے گھوڑے کا کام تمام کر دیا اور پھر تلاش ختم ہو گئی۔

جھانسی کی شکست ہو گئی لیکن کالپی اب بھی پیشوا فوج کا دارالخلافہ تھا۔ اس پر قبضہ باقی رہ گیا۔ یہ سبھی باغیوں کے اجتماع کی جگہ ہو گئی۔ راؤ صاحب جو پیشوا خاندان کا سب سے پُرجوش شخص تھے' وہاں موجود تھے۔ باندہ کے نواب' جن کا خاندانی تعلق پیشوا سے تھا کالپی پہنچنے والے تھے اور اب ان کے ساتھ جھانسی کی رانی بھی موجود تھیں۔ بتوا کی جنگ میں تانتیا نے اپنے بہت زیادہ اسلحے کھو دیئے تھے۔ لیکن وسائل حاصل کرنے کی ان کے اندر جو خاصیت تھی اس سے اپنے نقصان کی تلافی کر لی۔ باغی فوج نے کالپی میں انتظار نہیں کیا۔ بلکہ جنگ کے نقطہ نظر سے اہم قصبہ 'کونچ' جو جھانسی روڈ پر تھا' کوچ کیا۔ جنگل' باغ اور مندر جو اس شہر میں پھیلے ہوئے تھے' ان کے لیے اچھی پناہ گاہ بن گئے۔ لیکن وہ اس جگہ پر زیادہ دنوں قابض نہیں رہ سکے۔ اور آخر کار انہیں کالپی واپس ہونا پڑا۔ 23 / مئی کو انہیں اپنی اس آخری پناہ گاہ کو سخت جنگ کے بعد خالی کرنا پڑا۔ دوسرے دن فاتح جنرل کو گورنر جنرل کی طرف سے مبارک باد کا تار ملا۔ "کالپی پر تمہاری فتح سے تمہیں لگاتار ملنے والی کامیابیوں میں ایک اور کلغی کا اضافہ کر دیا ہے۔ میں تہہ دل سے تمہارا اور تمہارے بہادر سپاہیوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔"

کالپی کی شکست کے بعد باغی لیڈروں نے اپنی ایک بیٹھک کی جس میں سپاہیوں کے نمائندے بھی موجود تھے۔ جمنا کے جنوب میں ان کی آخری پناہ گاہ چھن چکی تھی اور وہ نئے مستقر کی تلاش میں تھے جہاں سے وہ اپنی سرگرمیاں جاری رکھ سکیں۔ سپاہی اودھ جانا چاہتے تھے جب کہ رانی نے جھانسی میں کریرا یا بندیل کھنڈ میں کسی اور جگہ کو ترجیح دی۔ لیکن تانتیا نے کہا کہ چونکہ بندیلہ ہمارے دشمن ہیں اس لیے وہاں سے رسد حاصل کرنا بہت مشکل ہو گا۔ راؤ صاحب نے دکن کا مشورہ دیا۔ اپنے عروج کے زمانے میں پیشواؤں نے دکن میں حکومت کی تھی۔ اور مہاراشٹر کے وسطی علاقے میں اب بھی پیشوا طاقت کا سرچشمہ سمجھا جاتا تھا۔ امید تھی کہ اگر پیشوا چاہیں گے تو بہت سے حکمراں ان کی آواز پر لبیک کہیں گے اور دیہی علاقوں میں بھی بغاوت پھیل جائے گی' اگر پیشوا کی فوج ان کی سربراہی کے لیے آگے آئے۔ لیکن فوج کے پاس نہ تو دولت تھی نہ اسلحے۔ اس لیے وہ گوالیار جا کر سندھیا کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کریں گے' کیونکہ ان کے مورثوں نے نانا صاحب کی خدمت کی تھی۔ اگر پرانی یادوں کو زندہ کیا جا سکے اور سندھیا کو اپنے ساتھ لایا جا سکے تو ان کی دیکھا دیکھی شمال کے بہت سے راجا ان کا ساتھ دینے کو آگے آ جائیں گے۔

سندھیا اپنے برٹش دوستوں کا وفادار تھا' اس لیے نہیں کہ اسے ان سے ہمدردی تھی بلکہ وقت کی مجبوری تھی۔ تیرہ سال پہلے اس کی فوج نے انگریزوں سے مقابلہ کیا تھا اور شکست کا سامنا

کرنا پڑا تھا۔ 1857ء میں جب وہ کلکتہ گیا تو برٹش طاقت کو دیکھ کر وہ بہت زیادہ مرعوب ہو گیا۔ میجر میکفرسن جو پولیٹکل ایجنٹ تھے' انہوں نے یہ بھی بتایا تھا کہ اپنی رعایا سے وہ نسلی فرق کی وجہ سے کافی دور ہو گیا ہے۔ جیسے ہی برٹش اقتدار کا یہاں سے خاتمہ ہو گا تو جاٹ' بندیلہ اور راجپوت سب ایک ساتھ اس کے خلاف کھڑے ہو جائیں گے۔ اس لیے اس کا فائدہ اسی میں ہے کہ وہ برٹش حکومت کا وفادار بنا رہے۔ مہاراجا کے ذاتی محافظ کی ایک ٹکڑی فوراً آگرہ بھیجی گئی۔ کیونکہ گوالیار کی فوج پر سندھیا کو اعتبار نہیں تھا۔ اس کا اندیشہ تھا کہ اس کے فوجی باغیوں کے ساتھ جنگ نہیں کریں گے۔ گرچہ وہ کھلے عام بغاوت بھی نہیں کریں گے۔ اس لیے واحد فوجی جن پر وہ اعتماد کر سکتا تھا' وہ اس کے مراٹھا محافظ تھے جن کی ابھی اس نے حال میں بھرتی کی تھی۔ اور یہ پوری امید تھی کہ پوربیوں کے حملے کے خلاف وہ ایک ساتھ کھڑے ہو جائیں گے۔

دوسری طرف گرچہ گوالیار فوج کی تربیت انگریزوں نے کی تھی اور بہت سے انگریز اس میں شامل بھی تھے جو سندھیا کی حمایت کے لیے بنائی گئی تھی اور جس کا سارا خرچ سندھیا خود اٹھا رہے تھے' تاہم یہ ان کے کنٹرول میں نہیں تھی۔ اس فوج میں تقریباً وہی عناصر شامل تھے جو بنگال آرمی میں تھے اور ان کے جذبات کو اسی طرح بھڑکایا جا سکتا تھا جیسے برٹش سرکار کے دیسی فوجی کو۔ ان کے اندر بھی وہی خوف اور اندیشہ جاگزیں تھا کیونکہ انہیں اودھ اور شمالی مغربی صوبوں میں چربی ملے کارتوس اور آلودہ کھانوں کے بارے میں معلوم ہو چکا تھا۔ اس لیے جون 1857ء میں جب بہت سے حصوں میں بغاوت پھیلی تو گوالیار کے فوجی بھی ساتھ دینے کو تیار ہو گئے۔ ان کے پاس یہ سمجھنے کے لیے وافر اسباب تھے کہ اب ان پر بھروسہ نہیں کیا جا رہا ہے۔ میجر میکفرسن کینٹ سے ریزیڈنسی آ گئے تھے جس کی حفاظت سندھیا کے فوجی کر رہے تھے۔ خواتین کو سندھیا کے محل میں بھیج دیا گیا تھا۔ لیکن بریگیڈیر ریمسے کے اصرار پر انہیں دوبارہ کینٹ میں واپس بھیج دیا گیا۔ 7/جون کو چوتھے انفنٹری کے ایک دستہ کو کیپٹن مرے کی سربراہی میں جھانسی کی بغاوت کو کچلنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ لیکن وہ اس خبر کے ساتھ واپس آ گئے کہ وہاں کے ہر یورپین اور عیسائی خاندان کو قتل کر دیا گیا ہے اور خزانے کو لوٹ لیا گیا ہے۔ یورپین باشندے بغاوت کے اندیشے میں ہمہ وقت مبتلا تھے اور ان کا یہ اندیشہ 14/جون کی شب صحیح ثابت ہوا جب بغاوت پھیل گئی۔ سپاہیوں نے عیسائیوں کے قتل میں کوئی تفریق نہیں کی۔ عورتوں کو بغیر کسی ضرر کے چھوڑ دیا گیا۔ لیکن مردوں کو بالکل بخشا نہیں گیا۔ حالانکہ کچھ استثناء بھی تھے۔ لیفٹیننٹ پیرسن کو اس کے آدمیوں نے بچا لیا۔ پولیٹکل ایجنٹ' اس کے کچھ ساتھیوں اور عورتوں نے پھول باغ محل میں پناہ لی جہاں سے انہیں بعد میں آگرہ بھیج دیا گیا۔

سندھیا ان باغیوں کے ساتھ کیا کرے۔ وہ ان کو تنخواہ دے کر رخصت کرنا چاہتا تھا لیکن میجر میکفرسن نے اسے صلاح دی کہ یہ انگریزوں کے مفاد میں ہے کہ ان باغیوں کو جہاں تک ممکن ہو سکے گوالیار میں روکا جائے۔ اس لیے سندھیا نے یہ بہانہ کیا کہ وہ انہیں ملازمت میں دوبارہ بحال

کردے گا۔ وہ ان کو تنخواہ پابندی سے دیتا رہا اور جب وہ برٹش حکومت کے خلاف احتجاج کرنا چاہتے تو اجازت نہ دیتا۔ مختلف بہانوں سے اس نے انہیں ستمبر 1857ء تک روکے رکھا جب تانتیا نے ان سے بات کر کے انہیں کالپی کی طرف بڑھنے پر راضی کر لیا۔ سندھیا نے اپنے دوستوں کی بڑی خدمت کی تھی۔ اس کے بہت زیادہ تربیت یافتہ اور مسلح باغی جن کی مداخلت سے آگرہ' دلی اور کانپور کی قسمت بدل سکتی تھی' لائنس میں نکمے بیٹھے رہے۔ اس دوران برٹش حکومت نے شمالی ہند میں اپنی طاقت کو دوبارہ منظم کر لیا۔ گرچہ گوالیار کے والی نے غیر ملکیوں کے ساتھ اپنے کو وابستہ کر رکھا تھا تو بھی ان کے بہت سے افسر' زمیندار اور دیہی علاقوں کے عوام کی ہمدردی اپنے ملک کے ان باشندوں کے ساتھ تھی جو اپنے مذہب کی حفاظت کے لیے جنگ کر رہے تھے۔ ان میں سے بہتوں کو پختہ یقین تھا کہ انگریز ہندوستانیوں کا مذہب تبدیل کرانے کے درپے ہیں اس لیے شہر میں اور گوالیار کے آس پاس تانتیا کے بہت سے حمایتی ہو گئے' جن پر وہ بھروسہ کر سکتا تھا۔ گوالیار کا نائب کوتوال بھور کا رہنے والا تھا گرچہ سندھیا اور اس کے دیوان کو خبر نہیں تھی۔ خود تانتیا کا داماد بھی اسی شہر کا باشندہ تھا۔

ایسا کہا جاتا ہے کہ کونچ میں شکست کے بعد تانتیا خفیہ طور پر دوبارہ گوالیار آیا۔ سندھیا کے فوجیوں کو اپنے آقاؤں سے کچھ شکایتیں تھیں۔ ان میں سے اکثریت مراٹھا نسل کی نہیں تھی اور باغیوں کے چھوڑنے کے بعد مہاراجہ نے اپنی فوج سے پوربیوں کو نکالنا شروع کر دیا۔ افسران اور دوسرے فوجی یہ سمجھتے رہے کہ انہیں صرف کچھ وقتوں کے لیے نکالا گیا ہے۔ جب کہ بہت زیادہ بھروسے مند مراٹھا مذہب اور ذات کے جذبات سے بھڑک اٹھے تھے۔ جہاں تک ان کی یاد جاتی تھی' ان کے اپنے لوگوں نے شمال ہند پر حکومت کی تھی اور دلی کا بادشاہ صرف نام کا بادشاہ تھا جس کی بادشاہت پر سوالیہ نشان نہیں اٹھایا گیا۔ کیونکہ وہ بھی ان کے ہاتھوں مجبور تھا۔ ان کی نظر میں سندھیا دوہرا کردار ادا کر رہا تھا۔ اسے یہ حکمرانی پیشوا کی بدولت ملی تھی اور یہ اس کی ذمہ داری تھی کہ وہ نانا کے جھنڈے کے نیچے آجائے بجائے اس کے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو اپنا تعاون دے۔ چند دن تانتیا نے گوالیار میں گزارے۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ بغاوت کے لیے زمین ہموار ہو چکی ہے۔ وہ یہ جانتا تھا کہ اگر وہ شہر میں کھلے عام داخل ہو جائے تو وہ آسانی سے اسے فتح کر سکتا ہے لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اگر وہ سندھیا کو اپنے آقا کی حمایت کے لیے تیار کر لے تو یہ اس کی بہت بڑی کامیابی ہو گی۔ باغیوں کے نزدیک سندھیا اور اس کا دیوان دنکر راؤ کچھ اور نہیں بلکہ عیسائی تھے لیکن اس خطہ کا سب سے طاقتور راجا اگر پیشوا کی حمایت میں آجائے تو انگریزوں کے لیے بڑا چیلنج ہو گا اور ہندوستان کے دوسرے راجا بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔

راؤ صاحب کے ہاتھوں بغیر جنگ کے گوالیار ہاتھ آگیا۔ سرحدوں پر سندھیا کے جو افسر تھے انہوں نے مزاحمت کی دھمکی دی لیکن جب باغی نے شہر کو پار کیا تو انہیں کسی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ سندھیا کی پالیسی یہ تھی کہ بات چیت کے ذریعہ وقت نکالا جائے۔ وہ جانتا تھا کہ جلد

ہی برٹش فوجی دشمنوں کا پیچھا کرتے یہاں آجائیں گے۔ پھر اسے کوئی پریشانی لاحق نہیں ہوگی۔ دنکر راؤ بھی فوری طور پر کوئی قدم اٹھانے کا مخالف تھا۔ راؤ صاحب بھی بظاہر سندھیا کے انتظام میں مداخلت نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ صرف نقد اور وسائل اور گوالیار کے علاقے سے صاف رہ گزر چاہتے تھے۔ تاکہ وہ اپنے وعدہ کی زمین میں پہنچ سکیں۔ لیکن اس کے ایک بھروسے مند آدمی نے سندھیا کو بتایا کہ باغی فوج اب اپنا دم توڑ رہے ہیں۔ اور صرف ایک بار کی گولی کی بوچھار انہیں منتشر کرنے کے لیے کافی ہوگی۔ دنکر راؤ کے مشورے کے برخلاف سندھیا نے باغیوں سے لڑنے کے لیے کوچ کیا۔ لیکن اس کے اندر اپنے مورثوں جیسی کوئی جنگی مہارت نہیں تھی۔ اور نہ ہی اس کے فوجیوں اور رعایا کو اس سے کوئی ہمدردی تھی۔ باغیوں نے دین کا نعرہ بلند کیا اور مخالف فوج نے بھی اسی طرح کا نعرہ لگایا اور ان کے بھائی بن گئے اور بغیر کسی مزاحمت کے گوالیار کی شکست ہوگئی۔ مہاراجہ نے اپنے لوگوں کی حفاظت کا نہ انتظام کیا نہ انتظار۔ بلکہ فوراً گھوڑسواری کرتے ہوئے آگرہ کے لیے نکل بھاگے اور دھولپور پہنچ گئے۔ اس کے وزراء نے راستے میں اس سے ملاقات کی اور دوسرے امراء بھی اس کے پیچھے پیچھے آگئے۔ بائزہ بائی کی قیادت میں دوسری رانیوں نے ناروار کے قلعہ میں پناہ لی۔ باغیوں نے کسی طرح کا تشدد مناسب نہیں سمجھا۔

شہر کو لوٹا نہیں گیا۔ سبھی خاص سول اور ملٹری افسروں کو ان کی جگہ پر رہنے دیا گیا۔ انتظامیہ میں کسی طرح کا دخل نہیں دیا گیا۔ لیکن سندھیا نے جو خزانہ اکٹھا کیا تھا اسے فوج کی تنخواہ کے لیے لوٹ لیا گیا۔ میجر میکفرسن رپورٹ کرتا ہے "راؤ نے صرف موہن گڑھ کے دیوان اور بلونت راؤ کے مکانوں کو لوٹا۔ انہوں نے سندھیا کی فوج کو تین ماہ کی تنخواہ اور دو ماہ کی تنخواہ بطور گریجویٹی تقریباً نو لاکھ ادا کردی۔ اس نے اپنی فوج کو ساڑھے سات لاکھ روپے دیئے۔ جھانسی کی رانی کو بیس ہزار اور باندہ کے نواب کو ساٹھ ہزار روپے اور راؤ نے خود اپنے لیے پندرہ ہزار سونے کی مہریں رکھیں۔ یہ سب مجموعی طور پر 19 لاکھ ہوتے ہیں۔ جس میں سے صرف ڈیڑھ لاکھ کا کوئی حساب نہیں دیا گیا۔" راؤ صاحب نے اپنی طرف سے حکمراں گھرانہ کے نمائندوں سے مصالحت کی کافی کوشش کی۔ بدقسمتی سے سندھیا وہاں سے جاچکا تھا لیکن بائزہ بائی جو اس ریاست کی اصل حکمراں تھیں، ان تک اب بھی پہنچا جاسکتا تھا۔ انہیں دو خط لکھے گئے۔ ان میں سے ایک اس طرح سے ہے: "ہم یہاں آج ہی پہنچے ہیں اور ہم نے فوراً جیاجی راؤ اور آپ کو تلاش کیا لیکن ہماری آمد سے پہلے آپ جاچکی تھیں۔ آپ نے اچھا نہیں کیا۔ اب آپ یہاں چمنا راجا کو لے کر فوراً یہاں آجائیے۔" اس خط کی کوئی رسید نہیں ملی۔ فوراً ہی مصالحت کا دوسرا خط بھیجا گیا۔ "یہاں سب خیریت ہے۔ میرے خیال سے آپ کا یہاں سے جانا مناسب نہیں تھا، میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں لیکن آپ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے ساتھ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ میں یہ خط رام جی چوبے جمعدار کے ہاتھ بھیج رہا ہوں۔ آپ یہاں آیئے اور اپنی حکومت سنبھالیے۔ میرا ارادہ گوالیار پر حکمرانی کا نہیں ہے۔ بلکہ میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔ اور میرے آنے کا یہی مقصد ہے۔ اس لیے

آپ فوراً یہاں آ جائیے۔ کوئی پس و پیش نہ کیجیے۔" بائزہ بائی خود اتنی معمر اور بالغ ہو چکی تھیں کہ وہ آسانی سے اس جال میں پھنسنے والی نہیں تھیں اور اس نے یہ دونوں خط بعد میں رابرٹ ہیملٹن کو بھیج دیئے۔

باغیوں کے اس جرأت مندانہ قدم سے برٹش حکام حیرت میں پڑ گئے۔ پہلے تو رابرٹ ہیملٹن اس بات پر یقین ہی نہیں کر سکا کہ وہ گوالیار آ رہے ہیں۔ ہومز کا کہنا ہے کہ "ان کا یہ قدم اس قدر جرأتمندانہ تھا جس نے آرکاٹ پر قبضے کی یاد کو تازہ کر دیا۔" لیکن اس تازہ حملہ کی منصوبہ بندی کس نے کی۔ میلیسن کا کہنا ہے کہ یہ سب اکیلے رانی کا منصوبہ تھا لیکن ہومز اسے تانتیا سے منسوب کرتا ہے جو بہت زیادہ جرأتمند اور دوراندیش شخص تھا۔ لیکن اگر میکفرسن صحیح تھا تو اس کی تائید رابرٹ ہیملٹن سے بھی ہوتی ہے۔ کیونکہ گوالیار آنے کے بعد تانتیا کو کالپی کی بے دخلی کا اندازہ ہو گیا تھا۔ وہی تھا جس نے گوالیار آ کر سندھیا کے فوجیوں اور افسران سے ملاقات کی تھی۔ اور راؤ صاحب کو یقین دلا دیا تھا کہ گوالیار پر ان کا آسانی سے قبضہ ہو جائے گا۔ لیکن راؤ صاحب نے اتنا انتظار کیوں کیا اگر ان کا منزل مقصود دکن تھا' یہ قیاس سے باہر ہے۔ سندھیا کے خزانچی امر چند بھائیہ کے تعاون سے اسے وہ خزانہ حاصل ہو گیا تھا جو گوالیار سے مل سکتا تھا۔ اس کی یہ بھی ذمہ داری ہو گئی تھی کہ وہ حکومت کا انتظام سنبھالتا۔ اسے یہ امید نہیں تھی کہ مہینوں کے انتظار کے بعد بھی وہ سندھیا یا بائزہ بائی کو اپنی طرف ملا سکے گا۔ لیکن اس طویل انتظار کی وجہ سے اسے ایک بار پھر سر ہیو روز کا سامنا کرنا پڑا۔ اگر وہ وہاں سے فوراً روانہ ہو جاتا تو وہ دکن پہنچ جاتا کیونکہ سر ہیو کے آنے میں کچھ تاخیر تھی اور مراٹھا کے دیہی علاقوں میں جو شورش پھوٹ پڑی تھی' اس سے اس علاقہ کا دوراندیش لیڈر بہت بڑی فوج بنا سکتا تھا۔

لیکن سر ہیو روز نے ان کے تعاقب میں ایک منٹ بھی ضائع نہیں کیا۔ گوالیار پر باغیوں کا پہلی جون کو قبضہ ہو گیا تھا۔ 6ر جون کو اس نے کالپی چھوڑ دیا۔ اور تیزی سے اپنی فوج کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے 16ر تاریخ کو مرار پہنچ گیا۔ اس نے فوری طور پر باغیوں سے جنگ کی۔ اور آگرہ گوالیار شاہراہ کو خالی کرا لیا۔ 19ر تاریخ کو گوالیار پر اس کی فتح ہو گئی۔ 20ر تاریخ کو قلعہ پر قبضہ ہو گیا اور فوراً ہی مہاراجا کو بلا کر تخت پر بٹھا دیا گیا۔

گوالیار کی شکست نے اسے شجاعت جرأت اور موت سے آنکھیں چار کر کے شکست دینے کے عزم کی وہ داستان دہرائی جو عہد وسطیٰ کی بہادری سے منسوب ہے۔ "تیرہ آدمی جن میں سے چار فوجی تھے اور نو ولایتی تھے جن میں دو عورتیں اور ایک بچہ تھا۔ خالی کئے گئے قلعے سے آگرہ کی طرف چند میل کی مسافت طے کر کے جان بوجھ کر واپس آنے اور مرنے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے قلعہ کی برجیوں پر چڑھ کر بندوقوں سے سندھیا کے استقبال کے لیے جو فوج جمع ہوئی پر چار پانچ گولیاں چلائیں اور جیسے ہی اس کی سواری سامنے آئی۔ انہوں نے اس کے سامنے گولی چلا دی............ روز 25 ویں بمبئی این آئی شہر کوتوال اور بیس پٹھان پولیس کو لے کر ان بدقسمت

لوگوں کی تلاش میں نکل پڑا۔ جیسے ہی روزان کی طرف بڑھا' انہوں نے اپنی عورتوں اور بچوں کو مار دیا۔ پھر روز کے آدمیوں نے ان میں سے سات آدمیوں کو مار دیا۔ لیکن ایک آدمی نے اسے گولی سے زخمی کر دیا اور باقی سب مار دیئے گئے۔"

17/ جون کو جب بریگیڈیر اسمتھ گوالیار کے مخالف کوٹہ کی سرائے کی طرف بڑھا' رانی جھانسی کی موت ہو گئی۔ ان کی موت کے بارے میں دو طرح کے بیانات ملتے ہیں۔ میکفرسن کا کہنا ہے: "پھول باغ بیٹری کے نزدیک' جیسا میں نے دیکھا جھانسی کی رانی مر گئی۔" اس کے خادم کا کہنا ہے کہ "وہ اس کے پاس بیٹھی شربت پی رہی تھی اور اس کے پاس پانچویں اِرریگولر کے تقریباً چار سو آدمی تھے۔ جیسے ہی حصار کے پاس پہنچنے پر خطرے کی گھنٹی بجی تو 15/ آدمی کو چھوڑ کر باقی سارے باغی بھاگ نکلے۔ رانی کے گھوڑے نے نہر پار کرنے میں ہچکچاہٹ دکھائی۔ جبھی ایک گولی اس کے کنارے کی طرف لگی اور کسی نے اس کا سر کاٹ دیا اور بھاگ نکلا۔ وہ فوراً ہی گر کر مر گئی اور پاس کے ایک باغ میں اسے جلا دیا گیا۔" سر رابرٹ ہیملٹن' جس نے موقع کا معائنہ کیا ایک مختلف روایت بیان کرتا ہے۔ اس کا کہنا ہے "جس طرح سے رانی جھانسی کی موت ہوئی اور اس کے بارے میں جو بیان دیا گیا ہے وہ موقع پر میرے جانچ کے نتیجہ کے برخلاف ہے۔ بریگیڈیر اسمتھ کے کیمپ میں رانی کے مارے جانے کی اس وقت تک کوئی اطلاع نہیں تھی جب تک اس سلسلہ میں میرا بھیجا گیا نوٹ نہیں پہنچا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہو سکا ہے' رانی کے ساتھ راؤ صاحب اور تانتیا اور کچھ دوسرے لوگ تھے جو صبح سویرے اونچائیوں پر چڑھ کر فوج کی پیش قدمی کو دیکھ رہے تھے۔ رانی گھوڑے پر سوار تھی اور اس کے ساتھ اس کی خادمہ (ایک مسلمان خاتون جو ایک زمانے سے اس خاندان کے ساتھ رہی) جس نے رانی کو کبھی بھی کسی لمحے بھی اکیلے نہیں چھوڑا' ان دونوں کو گولیاں لگیں اور وہ فوراً گر گئیں۔ اس کے بعد رانی بیس منٹ تک زندہ رہی۔ پھر انہیں پھول باغ لے جایا گیا۔ راؤ صاحب ہمہ وقت اس کے ساتھ تھے۔ اس واقعہ سے سارے رہنما حواس باختہ ہو گئے اور فوراً ہی لاش کو لانے کا انتظام کیا گیا اور ایک پالکی میں رکھ کر پھول باغ اور قلعہ کے درمیانی ندی کے کنارے لے جایا گیا۔ یہاں پالکی سے اس کا جسد اتارا گیا اور اس کے خادم اسے چند بڑے درختوں کے جھنڈ کے پاس لے گئے اور لاش کو جلا دیا۔ ابھی یہ رسم پوری بھی نہیں ہوئی تھی جب 8 واں دستہ حصار باغ کے پاس پہنچ گیا' چھ سات آدمی جو انہیں دیکھتے ہی بھاگے' ان سب کو مار دیا گیا۔ اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابھی لاش کو جلانے کی مذہبی رسم پوری نہیں ہوئی تھی کیونکہ جب میں اس جگہ پہنچا ڈاکٹر کرسچن نے اس کی چند جلی ہوئی ہڈیاں اٹھائیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ابھی پھول جمع کرنے کی رسم پوری نہیں ہوئی تھی۔"

چاہے جو کچھ ہو' رانی نے میدان جنگ میں ایک سپاہی کی موت پائی۔ نانا کے بعد شاید وہ دوسری ایسی شخصیت تھی جس سے اس کے دشمن سب سے زیادہ نفرت کرتے تھے۔ جھانسی میں بغاوت کے لیے وہ ذمہ دار تھی کیوں کہ انگریزوں کے خلاف اس کی شکایتیں بجا تھیں۔ لیکن غدر

سے پہلے سبھی اس کی عزت کرتے تھے۔اور بغاوت پھوٹ پڑنے کے بعد اس نے جو بیانات دیئے، اسے میجر ارسکائین قبول کرلیا تھا۔ اور اتنے ذمہ دار بھروسہ مند افسروں کے بیان کو چھوڑ کر ایک بے نام بنگالی اور کم ذات کی عورت کے بیان کو مصدقہ تسلیم کرلینا بالکل ناجائز بات لگتی ہے۔اور جن لوگوں کو بھروسہ مند سمجھا گیا ان کی گواہیوں کو بھی پورے طور پر قبول نہیں کیا گیا۔ بنگالی نے جو بیان دیا اس سے بھی باغیوں کے ساتھ پہلے سے ساز باز کی سازش کی تصدیق نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ اس کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی اور مسٹر مٹلو نے بیان دیا تھا کہ محاصرہ کے ابتدائی دنوں میں قلعہ پر قبضہ کرنے والوں کو کھانا بھجوایا تھا۔ یہ بات کہ قلعہ میں کھانے پینے کی قلت تھی، کسی سے پوشیدہ نہیں تھی کیونکہ پہلے دن خادم قلعہ سے اندر باہر جا ہر جا رہے تھے اور رانی جیسی کسی بھی ذہین شخصیت کے لیے یہ سمجھنا بعید از قیاس نہیں تھا کہ جو لوگ محصور ہیں، بھوک انہیں باہر نکلنے پر مجبور کردے گی۔ لیکن جھانسی کے قتل عام کا انتقام تو لینا ہی تھا۔ اس کے لیے کوئی بہانہ تلاش کر کے کسی کو ذمہ دار بھی ٹھہرانا تھا۔ حالانکہ اس نے ہر طرح کی کوشش کر رکھی تھی کہ وہ انگریزوں سے دوستی بنائے رکھے۔ اس کے لیے اس نے رانی کے بارے میں پھیلائی گئی ساری باتوں کو غلط اور جھوٹ کہا لیکن اس کی موت کے پندرہ سال بعد آئرلینڈ کے ایک شخص فارسٹ نے بغیر کسی وجہ کے اس کے کردار کو بدنام کرنے کی ذمہ داری اٹھائی۔ لیکن اس کے لوگوں کی نگاہ میں اس کی جو وقعت تھی اس کے سامنے دشمنوں کی بے بنیاد باتیں ٹھہر نہیں سکیں۔ آج بھی ہزاروں گاؤں میں اس کی نیکیوں اور شجاعت کے گانے گائے جاتے ہیں کہ وہ ایک ایسی عورت تھی جو اپنے بندیلہ دشمنوں کا ہمہ وقت مقابلہ کرتی رہی اور آخر کار انگریزوں کی گولی سے ختم ہوئی۔

فاتح فوج نے اپنی اس فتح کا جشن دھوم دھام سے منایا اور ہندستان کے ہر بڑے شہر میں رائل سیلوٹ دیا لیکن جو شکست خوردہ لوگ تھے ان کے لیے کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ جنرل نیپئر نے ان کا تعاقب کیا اور ۲۸/ جون کو جاورا علی پور میں انہیں شکست دے دی اور ۲۹ تاریخ کو صحت کی بنیاد پر سر ہیوروز نے اپنی کمان جنرل نیپئر کے سپرد کردی۔ تانتیا اور راؤ صاحب چمبل پار کر کے راجپوتانہ بھاگ گئے۔ ان کے اسلحے ختم ہوگئے تھے۔ ان کے ساتھ بہت کم لوگ رہ گئے تھے لیکن انہوں نے شکست قبول نہیں کی۔ اور ان کے جوش میں کوئی کمی نہیں آئی۔

# ضمیمہ

غیر ملکی صلاح و مشورہ نمبر 353' 31/ جولائی 1857ء

نمبر: 1857 کا اے

از: میجر ڈبلو سی ارسکائن۔ کمشنر ساگر ڈویژن

بخدمت: سی بیڈن اسکوائر' سکریٹری حکومت ہند

محکمہ' داخلہ' فورٹ ولیم' جبل پور 2/ جولائی 1857ء

محکمہ داخلہ!

جناب کل رات دو ہرکارے میرے پاس جھانسی کی رانی کے دو خطوط لائے جو ان کی چھڑی میں پوشیدہ تھے۔

۱۔ رانی کا خط بتاریخ 12 جون اے
بتاریخ 14/ جون بی
واقعات کا بیان نمبر سی
چوکیوں سے موصولہ اطلاعات نمبر ڈی

۲۔ میں ان کا آزاد ترجمہ حاشیے میں لکھ کر بھیج رہا ہوں جو مجھے رانی کی طرف سے موصول ہوئے اور میرا اُن کو بھیجا گیا جواب

۳۔ ان سے یہ اندازہ ہو جائے گا اور جیسا کہ رانی نے خود بیان کیا ہے' اس نے اپنے باغیوں کو کوئی مدد نہیں دی۔ اس کے برخلاف خود اسے لوٹا گیا اور مجبور کیا گیا کہ وہ ضلعے کا نظم و نسق خود سنبھال لے۔ اور جیسا کہ مجھے دوسرے ذرائع سے معلوم ہوا۔ ان سے یہ مطابقت رکھتا ہے۔

۴۔ رانی نے فنڈ اور سپاہیوں کی کمی کی وجہ سے اپنی ناکامی کا اظہار کیا ہے اور ہم سے امداد چاہتی ہے۔

۵۔ اب اس وقت موجودہ حالات میں سول افسران اور فوجیوں کو وہاں بھیجنے کا کوئی ذریعہ نہیں حاصل ہے تاکہ نظم و نسق برقرار رکھا جاسکے۔ اور وہاں جو بدنظمی پھیلی ہوئی ہے' میں نے رانی سے کہا ہے کہ وہ مالگزاری جمع کرائیں اور خود اپنی پولیس قائم کریں اور جو کچھ ان کے امکان میں ہو نظم و نسق برقرار رکھنے کے لیے کریں اور حساب کتاب' جب ہمارے افسران وہاں پہنچیں گے' اس وقت کرلیا جائے گا اور ان کے ساتھ بہت اچھا رویہ رکھا جائے گا۔ اور میں نے اس کے ساتھ ہی انہیں جاری کرنے کے لئے ایک اعلان نامہ بھی بھیج دیا ہے (اس کا ترجمہ بھی منسلک

کر رہا ہوں) جس میں ضلع کے باشندوں سے کیا گیا ہے کہ وہ رانی کا حکم مانیں جو برٹش رواج کے مطابق ہو، جو وقت آنے پر صحیح انتظام کریں گے۔

۶۔ ان کاغذات سے جن پر نمبر ڈی ڈالا گیا ہے، یہ معلوم کر کے کافی دکھ ہوا کہ رانی کو اورئی اور جالون ضلعوں میں ہوئے قتل عام اور لوٹ پاٹ کے بارے میں معلوم ہو گیا تھا لیکن اس کی کوئی تفصیل نہیں دی گئی ہے۔

۷۔ جب سرکار کے پاس فوجیں جالون اور جھانسی ضلعوں کے لیے بچ جائیں تو ان پر کانپور سے قبضہ کر لیا جائے اور یورپین فوجیوں کو یہاں اور ساگر میں براہ مرزا پور بھیجا جائے۔

۸۔ جہاں تک جالون کے واقعات کا معاملہ ہے، میں ان کی تفصیل چند دنوں بعد بھیج دوں گا۔

۹۔ جو ہر کارے رانی کا خط لائے، انہوں نے اپنی جان کو جوکھم میں ڈال کر یہ کام کیا کیونکہ جھانسی اور ساگر کے درمیان ایک بیہڑ علاقہ ہے اور وہاں بھی ہر طرح کا انتشار پھیلا ہوا ہے۔ ہر شخص اپنے پڑوسی کا گلا کاٹ رہا ہے۔ ان کے کپڑے اتار لیے گئے۔ ان کا سارا سامان لوٹ لیا گیا۔ میں نے ان دونوں کو تیس روپے دیئے ہیں جن میں زیادہ تر جھانسی کے لیے ہنڈی کی شکل میں ہیں اور انہیں مزید بیس روپے دینے کا وعدہ کیا ہے اگر وہ میرا خط بحفاظت رانی کو پہنچا دیں۔

۱۰۔ 28/ تاریخ کی دوپہر کے وقت ناگوڈہ میں تقریباً ساٹھ قیدی جیل کا دروازہ توڑ کر باہر نکل گئے اور افسر کے بنگلے کی طرف دوڑے تاکہ اس میں آگ لگا دیں۔ شاید یہ جان کر کہ پچاس سپاہی ان کی مدد کریں گے۔ لیکن یہاں انہیں غلط فہمی ہو گئی۔ سبھی پولیس کے سپاہی باہر آ گئے۔ اور چودہ قیدیوں کو مار دیا اور باقی سب کو پکڑ لیا۔ ان میں سے صرف 8 بچ نکلنے میں کامیاب ہوئے، ان میں سے صرف ایک کچھ اہمیت رکھتا ہے۔ اس بات کی جانچ کی جا رہی ہے کہ سپاہی جیل سے کیسے باہر آئے۔

۱۱۔ میں نے ان لوگوں کو پانچ سو روپے کا انعام دینے کا اعلان کیا ہے جنہوں نے ان قیدیوں کو مارا یا پکڑا ہے۔

۱۲۔ مجھے للت پور کے افسروں کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ہے۔

آپ کا وفادار

جبل پور 2/ جولائی 1857ء　　　دستخط۔ ڈبلو سی ارسکائن کمشنر

## صلاح و مشورہ نمبر 354
## A

رانی جھانسی کے خریطے کا ترجمہ جو کمشنر اور لیفٹیننٹ گورنر ساگر ڈویژن کے ایجنٹ کو غالباً

12/ جون 1857ء کو بھیجا گیا۔

القاب کے بعد وہ لکھتی ہیں کہ جھانسی میں مقیم سرکاری فوجوں نے بے وفائی' بدعہدی' بے رحمانہ سلوک اور تشدد کے بعد سبھی یورپین سول اور ملٹری افسروں' کلرکوں اور ان کے خاندان والوں کو قتل کر دیا اور رانی ان کی مدد نہیں کر سکی۔ کیونکہ اس کے پاس فوجیوں اور بندقوں کی کمی تھی۔ صرف سو پچاس آدمی اس کے گھر کی حفاظت پر مامور تھے۔ اور وہ ان کی کوئی مدد نہیں کر سکی۔ جس کے لیے اسے بہت زیادہ افسوس ہے۔ اور یہ کہ اس کے بعد باغیوں نے اس کے ساتھ اور اس کے ملازمین کے ساتھ بھی متشددانہ برتاؤ کیا اور اس سے بہت بڑی رقم چھین لی اور کہا کہ ریاست کی حکمرانی کے لیے وہ حق دار ہے اور یہ کہ وہ ضلع کا نظم و نسق چلائے کیونکہ وہ سب دلی کے بادشاہ کی مدد کے لیے جا رہے ہیں۔

چونکہ وہ ابھی تک برٹش حکام پر پوری طرح منحصر تھی' جن کے ساتھ یہ حادثہ ہو گیا اور سپاہیوں کو یہ معلوم ہونے کے بعد کہ وہ بالکل مجبور اور بے بس ہے' اس کے پاس جھانسی کے تحصیلدار ڈپٹی کمشنر اور سپرنٹنڈنٹ کی عدالت کے مالگزاری اور عدالتی سر رشتہ داروں کے ذریعہ یہ اطلاع بھیجی کہ اگر اس نے ان کی مانگوں کو پوری کرنے میں ذرا بھی جھجک دکھائی تو وہ توپوں سے اس کا محل اڑا دیں گے۔ اپنی حیثیت کا اندازہ کرنے کے بعد وہ ان کی مانگوں کو ماننے کے لیے مجبور ہو گئی۔ اور اپنی جان اور عزت بچانے کے لیے اپنی جائیداد اور بہت بڑی رقم ادا کرنی پڑی۔

یہ جاننے کے بعد کہ پورے ضلع میں اب کوئی برٹش افسر نہیں بچا ہے' رعایا کی جان و مال کی حفاظت کے خیال سے اس نے سبھی سرکاری ماتحت ایجنسی بشمول پولیس کو پروانے روانہ کیے کہ وہ اپنی جگہوں پر تعینات ہو کر اپنی ڈیوٹی انجام دیتے رہیں۔ اسے آج بھی اپنی جان اور رعایا کی زندگی کا خطرہ لاحق ہے۔

مناسب تو یہ تھا کہ اس طرح کی رپورٹ فوراً کی جاتی لیکن باغیوں نے اسے ایسا کرنے کی مہلت نہیں دی۔ اور چونکہ آج کے دن وہ دلی کی طرف روانہ ہو رہے ہیں' اس لیے وہ وقت گنوائے بغیر اسے لکھ رہی ہے۔

## B

اس خریطے کا ترجمہ جو جھانسی کی رانی نے کمشنر اور لیفٹیننٹ گورنر کے ایجنٹ ساگر ڈویژن کو بتاریخ 14/ جون 1857ء کو بھیجا۔

القاب و آداب کے بعد وہ لکھتی ہیں کہ 12/ جون کو اس نے اپنے خط میں جھانسی میں ہوئے واقعات کی تفصیلات بھیجی ہیں اور یہ خط وہ گنگا دھر دوگی اور بھوانی ہرکارہ کے ذریعہ بھیج رہی ہے اور یہ کہ جھانسی میں مقیم یورپین حکام کے ساتھ جو دردناک سانحات پیش آئے' اس پر اسے بہت زیادہ دکھ اور افسوس ہے۔ اور یہ کہ اس سے زیادہ ظلم اور بربریت کے واقعات کسی اور جگہ پر

ممکن نہیں، جس کا پورا بیان خریطے کے ساتھ منسلک ہے۔

اس کے بعد کی مزید خبر یہ ہے کہ جھانسی کے ماتحت سبھی علاقوں کے سرداروں نے گڑھی پر قبضہ کرلیا ہے۔ جب کہ دوسرے دیہی علاقوں کو لوٹ رہے ہیں۔ اور یہ کہ ضلع کی حفاظت کے لیے بندوبست کرنا اس کے بس سے باہر ہے۔ کیونکہ اس کے لیے بڑی رقم کی ضرورت ہوگی جو اس کے پاس نہیں ہے اور نہ ہی ایسے نازک حالات میں مہاجن اسے قرض دیں گے۔ اب تک اپنی نجی جائیداد کو فروخت کر کے اور بہت زیادہ مصائب کا سامنا کر کے وہ شہر کو لوٹ پاٹ سے بچانے میں کامیاب ہوئی ہے۔ اور کسی طرح سے گزری ہوئی سرکار کے بھرم کو قائم رکھا ہے۔ اور یہ کہ اس نے شہر اور مفصل چوکیوں کی حفاظت کے لیے کافی لوگوں کو بھرتی کیا ہے لیکن بااختیار سرکاری فوج اور رقم کے موجود نہ ہونے سے وہ زیادہ دنوں تک ان پر قابو رکھنا ناممکن سمجھتی ہے۔ اس نے شہر اور ضلع کی حالت پر جو حاشیہ آرائی کی ہے' وہ بھی بھیج رہی ہے اور امید ظاہر کی ہے کہ اسے ایسے احکامات صادر کیے جائیں گے جن پر وہ عملدرآمد کرسکے۔

## C

ان واقعات کا ترجمہ جو جھانسی میں 5/جون 1857ء کو وقوع پذیر ہوئے۔ تقریباً ایک بجے دن میں اچانک پچاس یا ساٹھ سپاہی بغاوت پر آمادہ ہوئے اور انہوں نے میگزین اور سرکاری خزانے پر قبضہ کرلیا اور اپنی مسکٹ سے کیپٹن اسکن کے بنگلے کی طرف گولیاں چلانی شروع کیں۔ معاملے کا پتہ چلانے کے بعد کیپٹن اسکن' اس کی بیوی اور بچے کیپٹن گارڈن کی حفاظت میں شہر کو چلے اور اس کی حفاظت کا انتظام کر کے قلعہ میں پہنچ گئے' اس کے بعد کچھ دوسرے لوگ بھی قلعہ میں پناہ گزیں ہوگئے اور اس کی حفاظت پر انہوں نے چھوٹی سی فوج کو مامور کر دیا۔ اور رانی نے بھی ان کی مدد کے لیے اپنے کچھ ذاتی محافظ کو قلعہ میں بھیج دیا۔

6/جون کو پہلے دن کی طرح دوپہر تک ہر چیز ویسی ہی رہی۔ اور جو لوگ بدظن ہوگئے تھے وہ بھی یونہی رہے۔ باقی فوج اور سوار بھی خاموش رہے۔ لیکن 12/بجے کے بعد وہ سب بھی شورش پر آمادہ ہوگئے اور باغیوں کے ساتھ مل کر اپنے سارے افسروں کو مار دیا۔ ان کے بنگلوں کو آگ لگادی اور عوامی دفتروں اور ریکارڈس کو لوٹ لیا اور برباد کر دیا گیا۔ پھر وہ جیل کی طرف بڑھے اور تمام قیدیوں کو آزاد کر دیا۔ جیل کا داروغہ بھی باغیوں سے مل گیا اور شہر کی طرف آکر انہوں نے قلعہ کا محاصرہ کرلیا۔ لیکن چونکہ اس میں محصور لوگوں نے قلعہ کے دروازوں کو بند کر دیا تھا اور اس کی دیواروں کے اندر سے بڑی بہادری کے ساتھ گولیاں چلا رہے تھے باغی دروازہ کھولنے میں ناکام رہے۔

7/جون کو باغیوں نے قلعہ کی دیواروں پر گولیاں چلانی شروع کیں اور اس سے شہر کے لوگ خائف ہوگئے۔ خاص طور پر اس وقت جب توپوں کے چارپانچ گولے شہر میں گرے۔ لیکن

اس کے باوجود خاموشی طاری رہی۔

8/ جون کو باغیوں نے پھر قلعہ پر حملہ بول دیا اور رانی کے 150 آدمیوں کو مجبور کیا کہ وہ ان کے ساتھ شامل ہو جائے اور ان سبھوں نے تین بجے شام تک حملہ جاری رکھا۔ اس دوران جو لوگ محصور تھے' انہوں نے بھرپور شجاعت کے ساتھ جوابی حملہ جاری رکھا۔ اور انہوں نے بہت سے باغیوں کو اپنی بندوقوں سے یا تو مار دیا یا انہیں زخمی کر دیا۔ اس کے بعد کیپٹن گارڈن کو مسکٹ کی ایک گولی لگی جس سے وہ مر گئے۔ پھر کیپٹن اسکن' اس کی بیوی بچے اور دوسرے لوگ قلعہ سے نیچے آئے۔ ان کا ارادہ شہر سے باہر نکلنے کا تھا۔ لیکن ان بے رحم باغیوں نے انہیں ایسا کرنے سے باز رکھا اور ان سب کو اتنی بے رحمی سے قتل کیا کہ یقیناً ان پر خدا کا عتاب نازل ہوگا۔ انہوں نے شہر میں بھی کچھ لوگوں کو لوٹا اور جس چیز سے بھی انہیں خوشی حاصل ہوئی' وہ سب کیا۔ رانی نے بہت مشکلوں سے اپنی جان بچائی۔ لیکن اس کی ساری دولت اور جائیداد لوٹ لی گئی۔ وہ اس بات کی رپورٹ کمشنر یا ایجنٹ کو فوری طور پر نہیں کر سکی۔ کیونکہ باغیوں نے سارے ڈاک تار مواصلات کو روک رکھا تھا اور جھانسی کے آس پاس کی ساری سڑکوں کی حفاظت کر رہے تھے تاکہ کوئی بھی شخص باہر نہ جا سکے۔

11/ جون کی رات میں ان سبھوں نے وہ جگہ چھوڑ دی اور امید کی جاتی ہے کہ اپنی اس درندگی کے لیے وہ سب واصل جہنم ہو گئے ہوں گے۔

## D

اس خریطے کا ترجمہ جو ساگر ڈویژن کے کمشنر نے جھانسی کی رانی کو 20/ جولائی 1857ء کو بھیجا۔

القاب و آداب کے بعد! آپ کے وہ دونوں خطوط مجھے مل گئے ہیں جو 12 اور 14/ جولائی کو اپنے ہرکاروں بھوانی اور گنگادھر کے ہمراہ بھیجے اور میں ساری باتیں سمجھ گیا ہوں۔

مجھے امید ہے کہ میں بہت جلد جھانسی میں نظم و نسق بحال کرنے کے لیے اپنے افسروں اور فوجیوں کو بھیج دوں گا۔ اور یورپین افواج ملک کے دیگر شورش زدہ ضلعوں میں بھیجی جا رہی ہیں اور جب تک کوئی سپرنٹنڈنٹ جھانسی نہ پہنچ جائے' میں آپ سے استدعا کرتا ہوں کہ آپ برٹش سرکار کے لیے ضلع کا انتظام چلائیں گی۔ لوگوں سے مالگزاری جمع کرائیں گی۔ اور جتنی ضرورت ہو اتنی پولیس کی بھرتی کریں گی۔ اور سارے وہ انتظامات کریں گی جن کے بارے میں آپ کو معلوم ہے کہ سرکار ان کی منظوری دے دے گی اور جب سپرنٹنڈنٹ آپ سے چارج لے گا' وہ آپ کو نہ صرف یہ کہ کوئی تکلیف نہیں پہنچائے گا بلکہ سارے نقصانات اور اخراجات کی ادائیگی کر دے گا اور آپ کے ساتھ بہت اچھا سلوک کرے گا۔

میں اس کے ساتھ ہی اپنی دستخط اور مہر کے ساتھ اپنا فرمان بھیج رہا ہوں۔ جو فارسی اور

ہندی دونوں زبانوں میں ہے جس میں اعلان کیا گیا ہے کہ نیا آرڈر پہنچنے تک آپ برٹش حکومت کے نام پر ضلع کا انتظام چلائیں گی اور لوگوں سے کہا گیا ہے کہ وہ آپ کو مالگزاری ادا کریں گے اور آپ کے احکامات مانیں گے۔

آپ میرے الفاظ پر بھروسہ کریں گی کہ پورے ملک میں بہت جلد نظم و نسق قائم کر دیا جائے گا۔ اور اب چونکہ سارے باغی اور بدکار جو دلی میں جمع ہوئے تھے' جنگ میں مار دیئے گئے ہیں' یا گاؤں والوں نے انہیں لوٹ کر مار دیا ہے' یا پھر سرکاری افسروں نے مختلف جگہوں پر انہیں پھانسی دے دی ہے۔

میں اس کے ساتھ ہی اس فرمان کی نقل بھیج رہا ہوں جو دلی پر قبضہ کے بعد میں نے جاری کیا تھا۔

بادشاہ اور وہ دوسرے امراء جنھوں نے یہ ساری بغاوت کی کارروائیاں کیں' انہیں امید تھی کہ اس سے وہ اپنا فائدہ حاصل کر لیں گے۔ ان کا مقصد نہ تو آپ کو اور نہ ملک کے دوسرے لوگوں کو فائدہ پہنچانا تھا۔ اب وہ سب قید خانے میں پڑے سڑ رہے ہیں' اور وہ بدمعاش جنہیں زندہ رہنے کے لیے کچھ دنوں کی مہلت دی گئی' اب اپنی بے وقوفی اور بدمعاشیوں پر ندامت کے آنسو بہا رہے ہیں۔

اس کے ساتھ ہی میں اپنے خط کی وہ نقل بھی بھیج رہا ہوں جو میں نے آپ کو 23/ تاریخ کو لکھا تھا اور شاید آپ نے موصول نہ کیا ہو۔

## جھانسی کے لیے فرمان

ہر شخص کو جو جھانسی ضلع میں رہ رہا ہو یا جس کا تعلق جھانسی سے ہو' یہ معلوم ہونا چاہیے کہ کچھ سپاہیوں کے برے چال چلن کی بدولت کچھ بہت قیمتی زندگیوں اور املاک کا نقصان ہو گیا۔ لیکن مضبوط اور طاقتور برٹش گورنمنٹ ہزاروں یورپین فوجیوں کو ان جگہوں پر بھیج رہی ہے جہاں بغاوت پھیلی ہے اور بہت جلد جھانسی میں نظم و نسق قائم کر دیا جائے گا۔

جب تک ہماری فوجیں اور افسران جھانسی پہنچیں' رانی برٹش حکومت کے نام پر برٹش سرکار کے طور طریقوں کے مطابق حکومت کرے گی اور میں ہر چھوٹے بڑے شخص کو یہ حکم دیتا ہوں کہ وہ رانی کے احکامات مانیں اور سرکاری مالگزاری اس کے پاس جمع کرائیں' اس کے لیے برٹش سرکار ان کی تعریف کرے گی۔

برٹش فوج نے دہلی کے شہر پر دوبارہ قبضہ کر لیا ہے اور ہزاروں باغیوں کو مار دیا ہے اور جو باغی جہاں نہیں بھی پایا جائے گا' اسے گولی سے اڑا دیا جائے گا یا پھانسی دے دی جائے گی۔

صلاح ومشورہ نمبر 355
فائل نمبر 3032/1857

از طرف: جی ایف ایڈ منڈ اسٹون سکریٹری حکومت ہند
بنام: میجر ڈبلو سی ارسکائن کمشنر ساگراور نربداعلاقے
محکمہ کے لیے: ڈی/فورٹ ولیم 23/جولائی 1857ء

سر!
2/ تاریخ کے آپ کے خط کے جواب میں جس کے ہمراہ آپ نے جھانسی کی رانی کے دو خطوط کا ترجمہ بھی بھیجا تھا، مجھے یہ کہنے اور بتانے کا حکم ہوا ہے کہ گورنر جنرل ان کاؤنسل آپ کے مشوروں کو منظور کرتے ہیں اور پانچ سو روپے کی رقم بطور انعام دینے کی بھی منظوری دیتے ہیں جس کا اختیار آپ کو دیا گیا ہے کہ آپ ان میں سے ان لوگوں کو یہ انعام دیں جنھوں نے مجرموں کو 'جونا گور جیل سے بھاگ رہے تھے' گولی ماردی۔

۲۔ جہاں تک رانی کا معاملہ ہے، مجھے یہ کہنے کا حکم ہوا ہے کہ گورنر جنرل آپ کو اس بات کا کوئی الزام نہیں دیتے اور ان حالات کو قبول کر لیا جو اس کی کارروائیوں کی بدولت پیدا ہوئے تھے اور اسے برٹش سرکار کی طرف سے جھانسی کے انتظام کی ذمہ داری سونپی، لیکن یہ حالات اسے بچا نہیں سکیں گے اگر اس نے جو بیان کیا ہے غلط ثابت ہوا۔ کیونکہ سرکار کو میجر ایلس نے واقعات کی جو تفصیل بھیجی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رانی نے باغیوں اور غداروں کی مدد کی اور یہ کہ اس نے انہیں اسلحے اور اپنے آدمی بھی دیے۔

آپ کا
دستخط
جی ایف ایڈ منڈ اسٹون
سکریٹری حکومت ہند

فورٹ ولیم
23/جولائی 1857ء

مشورہ نمبر 179
نمبر 317

اس اطلاع کی نقل جو برقی تار کے ذریعہ موصول ہوئی۔
از طرف: میجر آر۔ آر۔ ڈبلو۔ میجر ایلس پولیٹکل اسسٹنٹ بندیل کھنڈ اور ریوا
ناگوڈ، جون 26/ براستہ مرزاپور جون 29 سوموار 8 بجکر 25 منٹ شب

بخدمت سکریٹری حکومت ہند۔ کلکتہ
(649 الفاظ کے ساتھ)

جھانسی میں قتل عام کے سلسلہ میں ایک مسلمان سوار اور دو خلاصی بھگوان داس جو مقامی سروے محکمے میں لگا ہوا ہے اور ایک دوسرا اخلاصی محمد اسمٰعیل' وہ بھی سروے محکمہ میں تعینات ہے۔ یہ چاروں کے چاروں انگریزوں کے ساتھ قلعہ میں محصور تھے 10/ تاریخ کو رہائی کے بعد وہاں سے سیدھے میرے پاس مہوبہ آئے اور واقعات کی تفصیل بتائی۔ میں نے ان لوگوں کو مسٹر کین کلکٹر کے پاس بھیج دیا۔ جس نے ان لوگوں کی جانچ کی۔ کچھ دنوں سے ان انگریزوں کی عادت ہو گئی تھی کہ وہ اپنی رات قلعہ میں گزارتے اور دن اپنے بنگلوں میں۔ کیپٹن برگس اور اس کے محکمہ کے لوگوں نے قلعہ کے اندر اپنا خیمہ لگالیا تھا اور ہر چیز کی تیاری کر لی گئی تھی کہ اگر انہیں قلعہ میں واپس آنا پڑے' اور ایسا کوئی واقعہ ہو جائے اور جو 4/ تاریخ کی شام کو ہوا بھی تو پریشانی نہ ہو۔ ان میں سے بہت کم لوگ اس جگہ سے بچ کر بھاگ سکے۔ ایک شخص جس کا نام نہیں معلوم ہے' وہ برواساگر پہنچا جہاں محکمہ نہر کے ایک مقامی سرویئر صاحب رائے سے ملاقات کی اور اس نے انہیں اپنی گھڑی اور گھوڑا دیا اور ان کے لیے ایک ہندوستانی لباس مہیا کیا۔ وہ پیدل ہی وہاں سے بھاگا اور ابھی وہ نظروں سے او جھل نہیں ہوا تھا کہ گھوڑ سوار جو اس کے تعاقب میں گئے تھے' وہاں پہنچ گئے اور اس کے گھوڑے کو پہچان لیا۔ صاحب رائے اور تھانیدار کو قیدی بنا کر جھانسی لے گئے۔ جہاں وہ آخری خبریں ملنے تک موجود تھے۔ لیفٹیننٹ ٹرن بل اتنا خوش قسمت نہیں تھا وہ قلعہ میں نہیں پہنچ سکا وہ ایک لمبے درخت پر چڑھ گیا لیکن وہاں دیکھ لیا گیا اور درخت پر ہی اسے گولی مار دی گئی۔
4/ تاریخ کی شام سے 8/ تاریخ کی صبح تک قلعہ میں محصور لوگوں نے اپنا دفاع کیا۔ عورتوں نے ان کا کھانا پکانے میں ان کی مدد کی۔ اور انہیں ناشتہ بھیجتی رہیں۔ ان کی کل تعداد 55 تھی جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے اور پھر خوراک کی کمی کے سبب ان کی حالت بُری ہونے لگی کیونکہ سبھی دروازوں کے پیچھے انہوں نے ان کی مضبوطی کے خیال سے بڑے بڑے پتھر لگا دیئے تھے تاکہ ان کا دفاع کیا جاسکے۔ ایک توپ جو دروازے کے بالکل پاس لائی گئی تھی اسے چھوڑ دیا گیا۔ رات میں ان پر رسیاں باندھ کر باغی ان پر دوبارہ قبضہ پانے میں کامیاب ہوئے۔ لیفٹیننٹ پاوی پہلا آدمی تھا جو قلعہ میں مارا گیا۔ جس طرح سے وہ مارا گیا' اس کا بیان ہے کہ دو آدمی بھائی بھائی تھے' اور کیپٹن برگس کی ملازمت میں تھے جن میں سے ایک جو اس کا جمعدار تھا' نے کہا کہ وہ باہر جائیں گے۔ انہیں بتایا گیا کہ اگر انہوں نے اس کی کوشش کی تو وہ مار دیئے جائیں گے۔ لیکن انہوں نے کہا کہ گولی کھانا زیادہ پسند کریں گے بجائے اس کے کہ یہاں بھوکوں مریں۔ ایک آدمی کو فوراً گولی مار دی گئی۔ دوسرا آدمی لیفٹیننٹ پاوی کی طرف مڑا جو اس کے پاس کھڑا تھا اور اس نے اُسے اپنی تلوار سے مار ڈالا۔ اور پھر کیپٹن برگس پر گولی چلائی اور قلعہ کے اندر جو دوسرا شخص مارا گیا وہ کیپٹن برگس تھا جس کے سر میں گولی لگی اور مجھے بتایا گیا کہ اس کے بعد اس نے 25 آدمیوں کو اور مارا۔ باغیوں نے رانی کو مجبور کیا کہ وہ ہاتھیوں اور بندوقوں سے ان کی مدد کریں۔ وہ دروازے کے اندر داخل ہونے میں کامیاب ہوئے جس کے بارے میں انہوں نے انگریزوں سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ اپنے

ہتھیار ڈال دیں‘ اور خاموشی سے خود سپردگی کر دیں تو ان کی جانیں بچالی جائیں گی۔ انگریزوں نے ان پر بھروسہ کیا اور باہر نکل آئے۔ پھر کچھ درختوں کے درمیان انہیں باندھا گیا اور کچھ مشورہ کرنے کے بعد ان سب کے سر قلم کر دیئے گئے۔ اور وہ عورتیں جن کے بچے تھے‘ انہوں نے اپنی آنکھوں سے اپنے بچوں کے کاٹے جانے کا منظر دیکھا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس قتل عام میں سواروں نے خاص رول ادا کیا۔ یہ واقعہ 8/ کی سہ پہر کو ہوا۔

دستخط

ڈی کرشوف سارجنٹ

اسسٹنٹ اوورسیئر بندیل کھنڈ شعبۂ زراعت

بجلی مواصلات آفس

13/ جون 1857ء

بوقت 3 بج کر 50 سہ پہر

مشورہ نمبر 266

فارن، پولیٹکل کنسلٹیشن نمبر 266‘ 30/ دسمبر 1859 (تتمہ)

اس خریطے کا ترجمہ جو جھانسی کی رانی نے وسطی ہندوستان کے گورنر جنرل کے ایجنٹ کو 14/ جمادی الاول 1274 ہجری مطابق پہلی جنوری 1858ء کو بھیجا تھا۔

کمشنر جبل پور
قائم مقام ایجنٹ گورنر جنرل
برائے سی آئی۔ گورنر جنرل آف انڈیا۔ لیفٹیننٹ گورنر آف آگرہ۔ ڈپٹی کمشنر آف جالون
پولیٹکل ایجنٹ گوالیار میجر ایلس

بعد تسلیمات! اس غیر معمولی اچانک ہوئے واقعہ کو بیان کرنا‘ جو ہندوستان سے آپ کی عدم موجودگی کے درمیان ہوئے‘ بہت دکھ بھرا کام ہے۔ میں ان پریشانیوں کا ذکر نہیں کر سکتی جو اس دوران مجھ پر گزرے۔ ہندوستان میں آپ کی واپسی میرے لیے ایک نئی زندگی پانے کے برابر ہے اور اس موقعے کا استعمال کرتے ہوئے میں اپنی سرگزشت کے کچھ واقعات مختصراً بیان کر رہی ہوں۔ اس وقت جب انگریزوں کے ملازم فوجیوں نے اس جگہ پر بغاوت کر دی اور میری جائیداد کو لوٹ لیا اور جب دتیہ اور اورچھا کے حاکموں نے لوٹ مار اور غارت گری کا اپنا کام شروع کیا‘ میں نے فوراً ہی حاشیہ میں دیئے گئے برٹش افسران کو خط لکھا اور یہاں کے حالات کے بارے میں مکمل جانکاری ہرکاروں سے بھجوائی۔ ان میں سے کچھ ہرکارے تو آج بھی غائب ہیں اور کچھ دوسروں کو جنہیں راستے میں لوٹ لیا گیا‘ جھانسی واپس آ گئے۔ اور جنہیں آگرہ بھیجا گیا تھا انہوں نے واپس آ کر بتایا کہ ایک بھشتی کی معرفت انہوں نے آگرہ کے قلعہ میں میرے خطوط بھجوا دیئے اور چونکہ ان کی زندگیاں خود محفوظ نہیں تھیں‘ اس لیے انہوں نے جواب کا انتظار نہیں کیا۔ میجر ایلس نے مجھے بتایا کہ میرے خطوط اس افسر کو سپرد کر دیئے گئے جو کیپٹن اسکن کی

قائم مقامی کر رہا تھا۔ میں نے گر سرائے کے حکمراں کے ذریعہ کمشنر کا ایک خط جو 23/ جون کو لکھا گیا تھا' موصول کیا۔ جس میں کہا گیا تھا کہ میں ضلع کی باگ ڈور سنبھال لوں۔ اسی افسر کی طرف سے ایک دوسرا مراسلہ جو 10/ جولائی کو لکھا گیا تھا اور جو میرے ان تین خطوط کے جواب میں تھے' موصول ہوئے' جس میں میرے پہلے خط کا حوالہ دیا گیا تھا۔ جس میں ضلع کے نظم و نسق چلانے کے لیے فرمان بھی منسلک تھا۔ 29/ جولائی کو میں نے پھر جواب دیا کہ مجھے فرمان موصول نہیں ہوا۔

2۔ ملک کی پریشان کیفیت کو دیکھتے ہوئے دتیہ اور اورچھا کے حکمرانوں نے جھانسی ضلع کے ان علاقوں پر قبضہ کر لیا جو ان کی ریاست سے ملحق تھے مغرب سے مشرق تک۔

3۔ 3/ ستمبر کو (دونوں حکمراں آپس میں مل کر) اورچھا کی فوجوں نے جو زیادہ تر ٹھاکروں پر مشتمل تھیں' جن کی تعداد تقریباً چالیس ہزار نفر اور 28 توپیں تھیں' جھانسی پر حملہ کیا اور دوسرے امراء کو تعاون کے لیے مجبور کیا۔ گرچہ وہ دونوں خطوط جو کمشنر کی طرف سے موصول ہوئے تھے' ناتھے خاں کو مطالعے کے لیے بھیجے گئے لیکن اس پر اس نے کوئی توجہ نہیں دی۔ اس پر میں نے کمشنر کو پھر لکھا جس نے (19/ اکتوبر کے خط میں) مجھے جواب دیا کہ برٹش افواج جبل پور میں جمع ہو رہی ہیں کہ وہ خود جھانسی آئے گا اور ہر بڑے چھوٹے کے عمل کی جانچ کر کے ان کے مطابق کارروائی کرے گا۔ اس دوران میں نے اپنی جائیداد بیچ کر سود پر روپیہ لے کر کچھ لوگوں کی فوج بنائی اور شہر کی حفاظت کے لیے قدم اٹھایا تاکہ حملہ آوروں سے مقابلہ کیا جاسکے۔ دشمنوں نے توپوں و راکٹ وغیرہ سے بہت تباہی مچائی اور ہزاروں آدمیوں کو مار دیا۔ چونکہ میرے وسائل کم ہو رہے تھے میں نے 20/ ستمبر اور 19/ اکتوبر کو فوج کی مدد کے لیے لکھا۔ دو مہینے بعد محاصرہ کرنے والی فوج کو ماگاؤں کو لوٹ گئی جو اورچھا سے 3 میل کے فاصلے پر تھا۔ اور ضلع کے وہ سارے حصے جس پر اورچھا کے حاکم نے قبضہ کر لیا تھا' آج بھی اس کے قبضے میں ہے۔ اسی طرح دتیہ کی رانی بھی ان علاقوں پر قابض ہے جو اس کے ہاتھ میں آگئے۔ اور جو فوج ان پر دوبارہ قبضے کے لیے بھیجی گئی' اسے پسپا ہونا پڑا۔

4۔ جیسا کہ پہلے پوار اور مواسا کے دنوں میں ہوتا تھا' انہیں کہا جا رہا ہے کہ وہ بیہڑوں سے ہوتے ہوئے باقی ماندہ ضلعوں کو بھی لوٹ لیں۔

5۔ ان حالات کے تحت مجھے دشمنوں سے نجات پانے اور قرضوں سے گلو خلاصی حاصل کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی جب تک کہ برٹش سرکار میری مدد نہ کرے۔

6۔ کمشنر میری مدد کے لیے آمادہ نہیں دکھائی دیتے جیسا کہ انہوں نے 9/ نومبر کے خط میں لکھا ہے کہ برٹش فوجوں کی ضرورت ان کے اپنے مفاد میں ہے۔ چونکہ یہ خود غرض افراد برٹش طاقت کی ان دیکھی کر کے مجھے اور پورے ملک کو برباد کرنے کے درپے ہیں۔ میں آپ سے گذارش کرتی ہوں کہ جس طرح سے ممکن ہو میری مدد کریں اور میری زندگی کی حفاظت کریں اور ان لوگوں کی مدد کریں جو دشمن سے مقابلہ کرنے میں اس وقت ناکام ہیں۔

## باب ہشتم

# راجپوتانہ اور وسطی ہندوستان

راجپوتانہ عام طور پر شمالی مغربی صوبوں کے لیفٹیننٹ گورنر کے زیر انتظام تھا۔ کیونکہ گورنر جنرل کا ایجنٹ ہی وہ شخص تھا جو اس علاقہ میں امن عامہ کا ذمہ دار تھا۔ گرچہ یہ براہ راست برٹش حکومت کے زیر انتظام بہت چھوٹا سا علاقہ تھا لیکن اس میں تین اہم ملٹری مراکز اجمیر 'نصیر آباد اور نیمچ شامل تھے۔ راجپوتانہ میں اجمیر کی خاص اہمیت تھی۔ اور مسلم حکمرانی کے دور میں بھی اسے راجپوتانہ دروازہ سمجھا جاتا تھا اور شہر کے کنارے جو قلعہ تھا' وہاں برٹش فوجیں بڑی تعداد میں موجود تھیں۔ برٹش زمانے میں اجمیر کے نقشے پر خاص طور پر لال نشان لگایا جاتا جب کہ دیگر ہندوستانی ریاستوں پر پیلا نشان لگتا۔ سوائے ایک کو چھوڑ کر باقی ساری ریاستوں پر ہندو راجاؤں کی حکمرانی تھی جو اپنا سلسلۂ نسب چاند اور سورج سے ملاتے۔ ان میں سب سے بڑا رتبہ' طاقت کے اعتبار سے نہیں' میواڑ کے مہارانا سروپ سنگھ کو تھی جو سسودیا ذات کے ہیڈ تھے۔ جے پور کے مہاراجہ رام سنگھ نے مغل حکمرانی کے دنوں میں اپنی حکمرانی میں بہت سے علاقوں کو شامل کر لیا تھا۔ انہیں کچھوا راجپوتوں کا سردار سمجھا جاتا تھا۔ اس خاندان کی ایک نوجوان شاخ نے الور میں اپنے کو مضبوط بنالیا تھا اور یہاں کا حکمران بنی سنگھ تھا۔ ان کے ساتھ غیر اطاعت گزاری کی روایت جڑی ہوئی تھی کیونکہ ان کے پیش رو' مان سنگھ نے اپنی سبھی جنگجو رعایا کی ستائش حاصل کر لی تھی جسونت راؤ گولکر اور ناگپور کے راجا سے دوستی کر کے۔ ان کے علاوہ کچھ چھوٹے چھوٹے حکمران بھی اس کے زیر نگیں آگئے تھے' جن کے اندر برٹش طاقت کی مخالفت کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ جودھپور کی ایک دوسری نوجوان شاخ بیکانیر میں حکمرانی کر رہی تھی' جب کہ بوندی اور کوٹہ میں ہادا راجپوتوں کی حکمرانی تھی جو پنڈاری لیڈر امیر خاں کا جانشین تھا۔ اس زمانے میں امیر خاں نے ہولکر سے مل کر پورے راجپوتانہ میں دہشت پھیلا رکھی تھی۔ دراصل راجپوتانہ ہی قبائلی شجاعت اور ہندو حب الوطنی کا مرکز بن گیا تھا۔ اور ہر حکمران کے پاس ایسا خاندانی شاعر (بھانڈ) ہوتا جو ان کے بہادر پیش رووں کی شجاعت بھرے کارناموں کی ان کو یاد دلاتا رہتا۔ بچپن سے ہی اسلحوں کے استعمال میں مشاق یہ راجپوت اپنے روایتی حقوق پر ذرا بھی آنچ برداشت نہ کرتے اور اپنی عزت کی حفاظت جان پر کھیل کر کرتے۔ اگر یہ راجپوت حکمران مذہب کی پکار پر ایک جٹ ہو کر کھڑے

ہو گئے ہوتے تو برٹش طاقت کا دلی سے گجرات تک بالکل خاتمہ ہو گیا ہوتا۔

سر ہنری لارنس راجپوتانہ میں کبھی گورنر جنرل کے ایجنٹ ہوا کرتے تھے۔ جب انہیں اودھ میں امن قائم کرنے کے لیے بلایا گیا' تو ان کے بڑے بھائی سر پیٹرک لارنس کو ان کی جگہ لینے کے لیے بلایا گیا۔ پیٹرک لارنس فوجی امور میں ماہر تھا اس نے افغانستان اور پنجاب میں کیویلری افسر کی حیثیت سے کام کیا تھا۔ راجپوتانہ کے لیے وہ نئے بھی نہیں تھے۔ کیونکہ اس سے پہلے وہ میواڑ کے پولیٹیکل ایجنٹ بھی رہ چکے تھے۔ ان کی جگہ میجر شاور نے لی جو نوجوان پُر جوش اور تجربہ کار افسر تھا۔ اس کے علاوہ دو اور تجربہ کار اور باصلاحیت افسروں کو راجپوتانہ میں تعینات کیا گیا تھا۔ ان میں سے جے پور میں ایڈن اور جودھپور میں مانک میسن تھے۔ عام دنوں میں بھی ان کا کام آسان نہیں تھا کیونکہ ان ریاستوں کے حکمرانوں اور دیگر بڑے سرداروں کے درمیان ہمیشہ سے کچھ نہ کچھ تنازعہ بنا رہتا اور یہ سردار اکثر اپنی رعایا کو مہاراجہ سے جنگ کرنے کے لیے اکسایا کرتے۔ چونکہ مہاراجہ ہی اصل میں طاقت کا نمائندہ سمجھا جاتا' اس لیے مہاراجہ کے خلاف کسی قسم کی مزاحمت برٹش حکومت کے خلاف بغاوت سمجھی جاتی۔ 1857ء میں میواڑ کے سالم بار کے سردار کیسری سنگھ کو اودے پور کے مہارانا اور آوا کے ٹھاکر کسل سنگھ سے کچھ شکایتیں تھیں اور یہ مہاراجہ جودھپور کے خلاف کھڑے ہو گئے تھے۔

جب بغاوت پھیلی اس وقت جارج لارنس اپنی گرمیوں کی آرام گاہ' آبو میں مقیم تھے۔ اس لیے اجمیر کی حفاظت پر ان کی فوری توجہ گئی۔ اجمیر کو راجپوتانہ کا اسلحہ خانہ سمجھا جاتا اور اس کی حفاظت پر پندرہویں این آئی کی دو کمپنیاں تعینات تھیں اور سوائے دیسہ کے یورپین فوجی کہیں اور نہیں تھے۔ میرٹھ میں بغاوت پھیلنے کے بعد ہر مقامی رجمنٹ کی وفاداری مشتبہ ہو گئی تھی اور لارنس نے محسوس کیا کہ خزانہ اور اسلحہ خانے کو صرف مقامی فوجیوں کی ہی حفاظت میں چھوڑا جاسکتا ہے۔ اس لیے اس نے فوری طور پر ضروری کمک کے لیے دیسہ کو لکھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ ہر میجسٹی کی 83 ویں رجمنٹ وہاں پہنچ سکے 'اجمیر کے کمشنر کرنل ڈکسن نے میواڑ سے رجمنٹ کو بلا لیا تاکہ اس کے اسٹیشن کے 15 ویں این آئی کی جگہ لے سکے۔ یہ میرَ آدی واسی لوگ تھے جن کو کھانے میں کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں تھی۔ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کی طرح انہیں گریس سے بھی کوئی شکایت نہیں تھی اور اس لیے سرکار سے بھی انہیں کوئی شکایت نہیں تھی۔ لیفٹیننٹ کارنل نے اس میرَ بٹالین کو زبردستی 39 میل پیدل چلایا اور فوراً اس نے اسلحہ خانے کا چارج لے لیا اور 15 ویں این آئی کے سپاہیوں کو نصیر آباد بھیج دیا گیا۔ جہاں باقی رجمنٹ تعینات تھی۔

نصیر آباد اجمیر کے نزدیک ہی تھا۔ 15 ویں اور 30 ویں این آئی کے علاوہ مقامی لوگوں کی آرٹیلری کی ایک بیٹری اور پہلے بامبے لانسرس وہاں موجود تھے۔ مئی 1857ء میں آٹے میں ہڈیوں کے چورے کی ملاوٹ کی داستان بازاروں میں پھیل گئی اور فوجی اس سے پریشان ہو گئے۔ پھر اس کے بعد انہیں اجمیر سے ہٹانے کا کام شروع ہوا جہاں وہ کافی دنوں سے تعینات تھے۔ اس سے

فوجیوں میں یہ شبہ پیدا ہوا کہ غالباً اب ان پر بھروسہ نہیں کیا جارہا ہے۔ انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ اب کینٹ کے علاقہ میں بامبے لانسرس ڈیوٹی دے رہے ہیں اور ان کی بندوقیں بھی بھری ہوئی سامنے کی طرف تنی رہتی ہیں۔ 27/ مئی کو 15ویں این آئی کا ایک آدمی لیفٹیننٹ پری چارٹ کے پاس گیا اور ان سے پوچھا کہ کیا یہ صحیح ہے کہ یورپین فوجیں نصیر آباد آرہی ہیں۔ دراصل یورپین فوجیوں کو کچھ اسلحے کے ساتھ یہاں آنے کا حکم نامہ پہلے بھیجا جاچکا تھا۔ اور حکام نے اسے بہت رازدارانہ طور پر خفیہ رکھا تھا۔ لیکن کسی صورت سے یہ خبر پھیل گئی۔ اسے خفیہ رکھنے کی وجہ سے سپاہی اور بھڑک گئے۔ اس لیے نصیر آباد میں جیسے ہی انہوں نے سنا کہ یورپین فوجی دیسا سے آرہے ہیں۔ 28/ تاریخ کو بغاوت پھوٹ پڑی۔

دو انفینٹری رجمنٹ کی اکثریت پہلے تو بالکل خاموش رہی۔ پھر 15ویں لائٹ کمپنی کے آدمی اور 30ویں گرینیڈیر کمپنی کے کچھ نفر جن کی مجموعی تعداد 27 تھی' انہوں نے دوڑ کر بندوقوں پر قبضہ کرلیا۔ بامبے لانسرس جن کی وفاداری مشتبہ نہیں تھی' ان کو باغیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے کہا گیا۔ انہوں نے ادھر اُدھر گولیاں چلائیں لیکن حملہ نہیں کیا۔ شام ہوتے ہوتے 15ویں این آئی کے بہت سے لوگ باغیوں کے ساتھ مل گئے اور رات تک 30ویں کمپنی کے لوگ بھی شامل ہوگئے۔ گرچہ آخرالذکر کمپنی کے بہت زیادہ لوگ اپنے افسروں کے تئیں وفادار بنے رہے لیکن وہ باغیوں کے خلاف حملہ کرنے کو تیار نہیں ہوئے۔ اب افسروں کے پاس سوائے اس اسٹیشن سے ہٹنے کے کوئی راستہ نہیں رہ گیا۔ 30ویں این آئی کے 120 آدمیوں نے ان کا پیچھا کیا' لیکن انہیں اپنے اسلحے چھوڑنے پڑے اور ان کو حکم دیا گیا کہ وہ نصیر آباد لوٹ جائیں۔ ان میں سے آدھے آدمی واپسی میں چھوڑ کر بھاگ گئے۔ گمبھیر سنگھ جو ایک وفادار مقامی افسر تھا' اس نے یورپین کمانڈر کا بیاور بھاگنے میں ساتھ دیا لیکن وہ بھی دل شکستہ ہو کر مر گیا' جب عوام کے سامنے کمانڈر انچیف کے حکم پر پیریڈ گراؤنڈ میں اسے غیر مسلح کیا گیا۔

نیمچ نصیر آباد کے جنوب میں 120 میل کے فاصلے پر میواڑ ریاست کی سرحد سے ملا ہوا علاقہ ہے۔ وہاں فوجیوں (72ویں این آئی' گوالیار فوج کی 7ویں رجمنٹ اور فرسٹ بنگال کیویلری کا ایک شعبہ) کو جلد ہی نصیر آباد میں جو کچھ ہوا تھا' اس کی اطلاع مل گئی۔ 2/ جون کو کرنل ایبٹ نے فوجیوں کو وفاداری کا حلف دلایا۔ فوجیوں نے قرآن اور گنگا جل ہاتھ میں لے کر عہد کیا کہ وہ ایک دوسرے پر بھروسہ کرتے ہیں اور نمک کا حق ادا کریں گے۔ کرنل ایبٹ نے بھی انجیل مقدس ہاتھ میں لے کر کہا کہ اسے فوجیوں کی وفاداری پر کوئی شبہ نہیں ہے اور پھر ہر طرف سکون طاری ہوگیا۔ 3/ تاریخ کی شام کو فوجیوں کی آمد کے بارے میں افواہ پھیلی جو بے بنیاد نہیں تھی۔ فوجیوں نے اسلحے اٹھالیے اور سارے افسران اودے پور بھاگ گئے۔ باغی دلّی کے لیے روانہ ہوگئے اور نیمچ پر جلد ہی میواڑ' کوٹہ اور بوندی کے فوجیوں کا قبضہ ہوگیا۔ 12/ جون کو دیسہ سے فوجی' جس میں ہر مجسٹی کی 83ویں' بامبے انفینٹری کی 12ویں اور یورپین گھوڑسوار آرٹلری کی ایک ٹکڑی شامل

تھی، نصیر آباد پہنچ گئی۔ نیمچ کے باغیوں کی طرح سے نصیر آباد کے باغی بھی اپنی جگہ خالی کر گئے تھے اور یہاں بھی بغیر کسی جنگ کے قبضہ ہو گیا۔

تاہم نیمچ پر ایک باصلاحیت شاہی بہادر کی آمد کی وجہ سے دوبارہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ شہزادہ فیروز شاہ، نظام بخت کی اولاد تھا جو بہادر شاہ اوّل کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ 1855ء میں دلی سے حج اور دوسرے مقامات مقدسہ کی زیارت کے لیے نکلا تھا اور واپس مئی 1857ء میں بمبئی آیا۔ ابھی اس کی عمر بمشکل 20 سال تھی۔ سو سال پہلے اس جیسا باصلاحیت شخص اپنے لیے ایک حکومت قائم کر سکتا تھا۔ ایک صدی بعد وہ ایک مقبول ترین لیڈر کی شکل میں عوام کا لیڈر بن سکتا تھا، لیکن وہ اپنے عہد کے بعد اور دوسرے عہد سے پہلے پیدا ہو گیا تھا۔ اس لیے اس کی مہم جوئی ناکام ہوئی اور اس نے خود کو جلاوطن کر لیا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ بمبئی سے دلی کے لیے روانہ ہوا۔ لیکن اس بات کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ جون میں وہ سیتامئو کے نزدیک نظر آیا۔ پھر ہم اسے مندسور میں پاتے ہیں۔ جہاں اس نے اپنے مذہب کا سبز پرچم لہرا کر انگریزوں کے خلاف جہاد کا نعرہ بلند کیا۔ مندسور کے گورنر نے اسے شہر بدر کر دیا اور وہ کسی گمنام مسجد میں روپوش ہو گیا۔ فقیر کے بھیس میں یہ شہزادہ ایک خطرناک سیاسی قوت بن گیا بہ نسبت اس شہزادے کے جو کسی فوج کی قیادت کر رہا ہو اور جلد ہی فیروز شاہ کے عقیدت مندوں کی تعداد بڑھ گئی جن کی اکثریت افغان اور مکرانی مسلمانوں کی تھی۔ انہوں نے شہر پر قبضہ کر لیا اور گورنر اور پولیس کے چیف کو قیدی بنا لیا۔ فیروز شاہ کو بادشاہ کی حیثیت سے تخت پر بٹھایا گیا اور ایک شخص مرزاجی، جس کے مورث مندسور کے عزہ دار تھے، وہاں کا وزیر اعلیٰ بنایا گیا۔ پھر اس نے آس پاس کی ریاستوں پر تابگڈھ، جاورا، سیتامئو، رتلام کے شہزادوں اور سالم بار کے چیف کو خطوط بھیجے کہ وہ اس کی شہنشاہی کو تسلیم کریں۔ لیکن کسی نے جواب نہیں دیا سوائے عبدالستار خاں کے، جو جاورا کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ ستمبر میں اس کے ماننے والوں کی تعداد سترہ سے اٹھارہ ہزار ہو گئی۔ نومبر میں شہزادے نے اپنے کو کافی مضبوط سمجھتے ہوئے اپنی سلطنت کی حدود میں توسیع کی اور نیمچ کے خلاف فوج کشی کر دی۔ وہاں انہوں نے جیران میں موجود فوجی ٹکڑی کو شکست دی، قلعہ پر قبضہ کر لیا اور پورے علاقے پر قبضہ کر لیا ہوتا لیکن سر ہنری ڈورنڈ وقت پر پہنچ گیا۔

سر میریں ڈورنڈ اس زمانے میں گورنر جنرل کے وسطی ہند کے ایجنٹ کی قائم مقامی کر رہا تھا جس کا مرکز اندور تھا۔ مستقل ایجنٹ سر رابرٹ ہیملٹن چھٹی پر گھر گئے ہوئے تھے۔ اس زمانے میں وہ بھوپال کے پولیٹکل ایجنٹ تھے۔ جب ان سے اندور میں رابرٹ ہیملٹن کی قائم مقامی کرنے کے لیے کہا گیا۔

وسطی ہندوستانی ایجنسی کی زیر نگرانی 6 ہندوستانی حکومتیں گوالیار، اندور، دھار اور دیواس تھیں جن پر مراٹھا حکمرانوں کی حکمرانی تھی اور جو کبھی پیشوا کی سلطنت میں داخل تھیں۔ دھار اور دیواس سب سے چھوٹی حکومتیں تھیں اور ان کی کوئی سیاسی اہمیت ایسی نہیں تھی جیسی ان کے بڑے پڑوسی گوالیار اور اندور کی تھی۔ بھوپال اور جاورا مسلم حکومتیں تھیں، جس میں سے بھوپال

نے برٹش حکومت قائم ہونے سے پہلے مراٹھا کی برتری کو قبول کر لیا تھااور دوسری حکومت ایک طرح سے مراٹھا جاگیرداری تھی جو ایک مسلم بہادر کو سونپ دی گئی تھی۔

تکوجی راؤ دوم اکیس سال کے نوجوان تھے جب اندور میں بغاوت پھیلی۔ گوالیار کی فوج نے جون کے دوسرے ہفتہ میں بغاوت کی۔ لیکن اندور میں پہلی جولائی تک بالکل خاموشی رہی۔ جب کہ میکفرسن اور جیاجی راؤ سندھیا کے درمیان پوری مفاہمت تھی۔ڈورنڈ اور تکوجی راؤ کے تعلقات کشیدہ تھے۔ سر رابرٹ ہیملٹن جن کی وجہ سے نوجوان ہولکر تخت نشین ہوا تھا' نہ صرف برداشت کرتے بلکہ کھلے طور پر آزادانہ اظہار کو پسند کرتے۔ سر ہنری ڈورنڈ کا کورٹ کے آداب کے بارے میں دوسرا خیال تھااور برٹش حکومت کے خلاف کھلے دربار میں بادشاہان کے مشیروں کی تنقید اس کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ اس لیے گورنر جنرل اندور اور ہندوستانی راجا کے درمیان مفاہمت کی کوئی گنجائش نہیں تھی اور حالات خراب ہوتے چلے گئے۔ برٹش فوجیں اندور سے 13 میل دور مہو میں تعینات تھیں۔ گرچہ گیریسن میں مقامی لوگوں کی اکثریت تھی لیکن آرٹلری کی ایک یورپین کمیٹی تھی جو ہندوستانی فوجیوں کو ہمیشہ کنٹرول میں رکھتی تھی۔ ہولکر کے پاس بھی سبھی طرح کی ملی جلی 7500 فوج تھی لیکن یہ دارالحکومت میں مرکوز نہیں تھیں اور ان کی وفاداری پر بھی شک تھا۔ جب کہ ڈورنڈ کوئی ایسی چیز نہیں کرنا چاہتا تھا جس سے شہر میں بدنظمی پھیل جائے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ مہو میں موجود ہندوستانی فوجیوں پر مکمل بھروسہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ کرنل اڈبرن کی قیادت میں فوج کی ایک ٹکڑی وسط ہندوستان آ رہی ہے اور ہندوستانی فوجی بھی یورپین فوجیوں سے نہ صرف خائف رہتے بلکہ شبہے کی نگاہ سے بھی دیکھتے۔ اپنے بہت سے ساتھیوں کی طرح ڈورنڈ اس نفسیاتی مسئلہ سے بے خبر نہیں تھا۔ اس نے 13 جون کو لکھا "23 ویں مقامی انفینٹری میرے خیال سے کافی خاموشی پسند ہے بہ نسبت فرسٹ کیویلری کے ایک شعبہ کے۔ اس کیویلری کے کچھ لوگ انفینٹری ڈویژن کے لوگوں پر مستقل طنز کر رہے ہیں اور انہیں بغاوت کے لیے اکسا رہے ہیں۔ تاہم دونوں' یورپین بیٹری کی طاقت اور ان کے اسلحوں سے خوفزدہ ہیں۔ وہ اس خبر سے اور زیادہ خوفزدہ ہو گئے ہیں کہ بمبئی سے بھی فوج آ رہی ہے جن کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ انہیں سزا دینے کے لیے آ رہی ہے۔ افسران انہیں مستقل یہ یقین دلا رہے ہیں کہ انہیں اگر وہ نظم و نسق بنائے رکھیں گے تو خوفزدہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ اگر مہو کی فوجیں بغاوت کرتی ہیں تو وہ اندیشوں کی وجہ سے زیادہ بغاوت پر آمادہ ہو گی۔ بہ نسبت اور باتوں کے ہماری خواہش ہے کہ دلی پر ہمارے قبضہ کی وجہ سے ان کے یہ سمجھ میں آ جائے کہ بغاوت کے نتائج اچھے نہیں ہوتے۔" لیکن اس وقت تک نہ تو دلی سلطنت پر قبضہ ہو سکا تھا اور نہ ہی اڈبرن آ سکا۔ اسے نظام کی حکومت میں اورنگ آباد میں قید کر لیا گیا تھا۔

پہلی جولائی کو ریزیڈنسی پر حملہ کیا گیا۔ یہ حملہ مہو کی مشتبہ فوجوں نے نہیں بلکہ ہولکر کی فوجوں نے کیا۔ سعادت خاں جو ہولکر کی کیویلری میں ایک افسر تھا' بہت تیز رفتاری سے ان

فوجیوں کے پاس پہنچا جو ریزیڈنسی کی حفاظت پر مامور تھے اور اعلان کیا کہ مہاراجا کا حکم ہے کہ سبھی صاحبوں کو مار دیا جائے۔ انہوں نے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے فوراً ریزیڈنسی پر گولی چلانا شروع کر دی۔ ڈورنڈ نے اس دوران 'مالوہ بھیل ٹکڑی کے 300 آدمیوں اور بھوپال فوج کی دو کمپنیوں کو بلا لیا تھا۔ بھوپال کی فوج نے اپنے مسکٹس حکمرانوں کی طرف پھیر دیئے۔ جب کہ بھیلوں کا کوئی مذہبی یا خونی رشتہ اعلیٰ ذات کے فوجیوں سے نہیں تھا اور ان سے امید کی جاتی تھی کہ وہ اپنے افسروں سے وفاداری برتیں گے لیکن اس نازک موقعے پر ان کے اندر بھی وفاداری کا فقدان پایا گیا۔ اس دوران مہو میں موجود یورپین آرٹلری کو بلانے کے لیے خبر بھیج دی گئی تھی۔ لیکن ہولکر کی کیولری بندوقچیوں کی مدد کے لیے آ گئی۔ اس وقت فوری طور پر فیصلے کی ضرورت تھی 'ریزیڈنسی کو خالی کر دیا گیا۔ کیپٹن ہنگر فورڈ مہو سے روانہ ہو چکا تھا لیکن ابھی وہ اندور کے بیچ راستے میں ہی تھا کہ اسے ریزیڈنسی کے خالی ہونے کی اطلاع ملی اور وہ واپس مڑ گیا۔ ڈورنڈ کو امید تھی کہ وہ دوپہر تک پہنچ جائے گا اور مقابلہ کر سکے گا لیکن اسے عورتوں اور بچوں کی پہلے حفاظت کرنی تھی۔ ٹریورس لکھتا ہے کہ گرچہ وہ کچھ گھنٹے اور ریزیڈنسی کی حفاظت کر سکتا تھا لیکن تب تک وہ عورتوں اور بچوں کو بحفاظت نہیں نکال سکتا تھا۔ ڈورنڈ مہو بھی جا سکتا تھا اور ہنگر فورڈ کے ساتھ واپس بھی آ سکتا تھا لیکن اسے ہولکر کی وفاداری پر شک تھا اور اسی کی فوجوں نے شاید اسی کے حکم پر ریزیڈنسی پر حملہ کیا تھا۔ سفر کا نصف حصہ خطرے سے پُر تھا اور اسی لیے اس نے یہ جوکھم اٹھانا مناسب نہیں سمجھا۔ سکھ اور بھوپال کے فوجیوں نے مشورہ دیا کہ سیہور میں پناہ لی جائے 'اس لیے ہولکر کی حدود سے باہر ڈورنڈ سیہور میں پناہ گزیں ہو گیا۔

تاہم ہولکر کو الزام نہیں دیا جا سکتا۔ اس نے ڈورنڈ کو پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا کہ اس کے اپنے فوجی بھی اتنے ہی بھروسے مند نہیں ہیں جتنے کہ دوسرے فوجی۔ وہ ایک ایسا راجہ تھا جس کا اپنی فوج پر کوئی اختیار نہیں تھا اور جن کے سامنے وہ اتنا ہی مجبور تھا جتنا کہ وہاں موجود دوسرے فوجیوں کے سامنے گورنر جنرل کا ایجنٹ۔ مالوہ کے مراٹھا حکمراں اس علاقے میں باہر سے آئے تھے اور یہاں وہ صرف اپنی فتح کے سبب حکمرانی کر رہے تھے اور اس لیے وہ مقامی لوگوں کی وفاداری پر بھروسہ نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن اس کے بعد بھی ہولکر پر شبہ کیا گیا۔ کیونکہ سادات خاں ریزیڈنسی پر حملہ کے بعد اپنے خون آلود کپڑوں کے ساتھ دربار میں گیا۔ اور صبح کے واقعات کے بارے میں اس نے ساری ذمہ داری خود لے لی۔ لیکن ہولکر اپنی جان کو جوکھم میں ڈالنے کی وجہ سے اسے قید نہیں کر سکا کیونکہ اسے محل کی خواتین کے بارے میں بھی سوچنا تھا۔ وہ معاونت کا مجرم تو ہوا لیکن کیا سندھیا جو وقت کا انتظار کر رہا تھا 'وہ خود اپنے باغی فوجیوں کو دوبارہ ملازمت میں لینے کے لیے مجرم نہیں تھا 'لیکن ایک معاملہ میں سندھیا اور اس کا سیاسی افسر راجہ پر بھروسہ نہیں کر رہا تھا۔ دونوں معاملوں میں باغیوں نے انگریزوں کا خون بہایا تھا۔

اندور میں ہوئے واقعات کا فوری اثر مہو پر بھی پڑا۔ کیونکہ صبح کے وقت انفنٹری اور

کیویلری' دونوں ٹکڑیوں کے فوجی اپنے افسروں کا حکم مانتے ہوئے اندور شاہراہ پر اپنی اپنی تعیناتی کی جگہ پر چلے گئے تھے۔ اس اندیشے کے تحت کہ کہیں ادھر سے حملہ نہ ہو جائے' انہوں نے ہولکر کی دونوں توپوں پر بھی قبضہ کر لیا تھا اور پھر کچھ بندوقچیوں کو مارنے کے بعد وہ شہر کی طرف واپس آرہے تھے۔ شاید اسی کو مہو میں بغاوت کا بہانہ بنایا گیا۔ کرنل پلٹس کمانڈنگ افسر نے اپنے آدمیوں سے بحث کرنی چاہی اور اسے فوری طور پر مار دیا گیا۔ دو اور افسروں کا بھی یہی حشر ہوا۔ لیکن کیپٹن ہنگر فورڈ نے اپنی آرٹلری کے ساتھ قلعہ پر قبضہ بنائے رکھا۔ دوسرے دن یہ سارے باغی مہو سے اندور کے لیے روانہ ہوئے۔ اور وہاں سے سیدھے گوالیار چلے گئے۔ گوالیار سے وہ دھولپور گئے۔ اگر سادات خاں پر یقین کیا جائے تو گوالیار میں اس سے کمانڈ کی ذمہ داری شہزادہ فیروز شاہ نے لے لی جو سیدھے دھولپور سے آئے تھے۔ اندور کے باغی گوالیار فوج کو اس بات کے لیے تیار نہیں کر پائے کہ وہ آگرہ پر ان کے حملے میں ساتھ دے۔ انہوں نے دیہاتی طریقے سے چمبل کو پار کیا۔ مٹی کے گھڑوں کو اُلٹ کر پل بنایا اور دھولپور میں کافی دنوں تک رکے رہے۔ جب وہ آگرہ پہنچے تو ان کی پیش قدمی دلی سے آئے گریٹ ہیڈ کی فوج نے روک دی۔

اس دوران ہنگر فورڈ پر اتنی زیادہ ذمہ داریاں آپڑی تھیں جو اس کے عہدے سے کافی اونچی تھیں۔ گورنر جنرل کا ایجنٹ وہاں سے رخصت ہو چکا تھا۔ ہولکر کی وفاداری مشتبہ ہو چکی تھی۔ اس نے تمام سیاسی اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے ایک طرف تو ہولکر سے مراسلت جاری رکھی اور دوسری طرف بمبئی کی حکومت سے وہ ہولکر کے رُخ کے بارے میں یقین کرنا چاہتا تھا کہ وہ حالات کے مطابق قدم اٹھا سکے۔ بمبئی کی حکومت ان اختیارات کے لیے منظوری دے سکتی تھی بغیر مرکزی حکومت کے حوالے کے۔ اس نے ہولکر کے خلاف سیدھی جانچ کا حکم دے دیا۔ کیونکہ اس نے سنا تھا کہ راجا نے باغیوں کی اسلحے بارود اور رسد سے مدد کی ہے۔ اس نے لکھا کہ اس طرح کی رپورٹیں بہت بڑھا چڑھا کر پیش کی گئی ہیں۔ اور اس کا ان پر یقین بھی نہیں ہے۔ اس نے لکھا "برٹش حکومت کے آپ پر اتنے احسانات ہیں کہ ان سے دشمنی مول لے کر آپ اپنی بربادی کا سامان کریں گے اور مجھے اس پر یقین نہیں ہے کہ آپ اپنے مفاد کی طرف سے اتنے اندھے ہو جائیں گے کہ ہمارے دشمنوں کی مدد کریں۔ اس لیے ضروری ہے کہ آپ کی طرف سے مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ آپ کی خواہش کیا ہے؟" ہولکر نے فوراً ہی اپنے وزیراعظم اور خزانچی کو جواب کے ساتھ بھیجا۔ اس نے اندور کے بارے میں اپنی جو مجبوری ظاہر کی اس کی تفصیل دیکھنے والی ہے۔

"اس دنیا میں شاید مجھ سے زیادہ مجبور دوسرا شخص نہیں ہوگا جس نے اندور اور مہو کا سانحہ جھیلا۔ میرے فوجیوں نے شاید مہو کے باغیوں سے متاثر ہو کر صبح کے وقت کھلے عام بغاوت کر دی۔ وہ فوج جو ریزیڈنسی کی حفاظت کے لیے بھیجی گئی تھی' وہاں انہوں نے کسی سے جھگڑا کر لیا اور ریزیڈنسی پر کھلے عام گولی چلانے لگے۔ وہ بہت زیادہ شرارت پر آمادہ ہو گئے۔ بہت سی جانیں اس میں تلف ہو گئیں۔ لیکن یہ جان کر خوشی ہوئی کہ کرنل ڈورنڈ مسٹر شیکسپیئر اور ان کے خاندان اور

دوسرے لوگ بحفاظت رہے۔ پوری ریزیڈنسی میں افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ میری فوج کی اکثریت نے کھلے عام بغاوت کردی اور جنہوں نے بغاوت نہیں کی ان پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ مسلمانوں نے دین کا نعرہ بلند کیا۔ اور ہر طرف افراتفری پھیل گئی۔ انہوں نے نہ صرف ان یورپین کے سروں کی مانگ کی جنہیں میں نے اپنے محل میں چھپا رکھا تھا بلکہ ان افسروں کو بھی طلب کیا جوان کی سمجھ سے برٹش مفاد کے لیے کام کر رہے تھے۔ وہ ہر طرف لوٹ مار اور تاراجی کے لیے تیار ہو گئے تھے بشرطیکہ میں خود باہر نہ نکلوں۔ میرے پاس کوئی راستہ نہیں تھا سوائے اس کہ میں اپنے آپ کو پیش کر دیتا۔ لیکن میں نے اس بات کی اجازت نہیں دی کہ محل میں پناہ گزیں یورپین پر کوئی انگلی اٹھائے۔ ایسا وہ صرف میری جان لے کر کر سکتے تھے۔ برٹش خزانے کو لوٹنے کے بعد اور ان سارے اسلحوں کو جن پر انہوں نے قبضہ کر لیا تھا' اس جگہ اور مہو کے سارے باغی ایک جٹ ہو کر دیواس کے لیے روانہ ہو گئے۔ یہ واقعہ بہت افسوس ناک ہے۔ اور اس کی پوری تفصیل راؤ رام چندر اور بخشی خومن سنگھ آپ کو بتلائیں گے جو میرا یہ خط لے کر جا رہے ہیں۔ میں نے خواب میں بھی کبھی وفاداری اور برٹش حکومت سے دوستی کا راستہ نہیں چھوڑا۔ میں ان کی انصاف پسندی سے واقف ہوں اور مجھے امید ہے کہ ایک دوست حکمراں پر ایک لمحہ کے لیے بھی شبہ کرنے سے پیشتر وہ انصاف سے کام لیں گے۔ کیونکہ برٹش حکومت کا یہ دوست ان کی وفاداری میں سب کچھ کرنے کو تیار ہے لیکن دنیا میں کچھ ایسے بھی سانحے ہوتے ہیں جن پر کسی کا کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ اور جو کچھ ہوا' یہ اسی طرح کا ایک سانحہ تھا۔"

ہنگر فورڈ اس بات سے مطمئن ہو گیا کہ ہولکر ہر طرح سے اپنی وفاداری کا امتحان دینے کو تیار ہے۔ اس نے حکومت کو اس طرح کی رپورٹ بھیجی "یہاں ہر طرف امن وامان ہے۔ اندور کا مہاراجا حکومت سے اپنی دوستی اور وفاداری ثابت کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار ہے۔

...... مہاراجا کے دوسرے وفادار عہدیدار کو جب اپنی غلطی کا احساس ہوا' جیسا کہ انہوں نے سوچا تھا کہ ہولکر برٹش حکومت سے دشمنی لینے کو تیار ہے' اب اپنے ضلع سے انہوں نے ساری بدامنی کو دور کر دیا ہے اور ہر طرح سے نظم ونسق قائم رکھنے میں تعاون دے رہے ہیں۔ صرف مہاراجا کی اپنی فوج اب بھی اس بات کے لیے تیار نہیں ہے تاہم میرا خیال ہے کہ اب وہ زیادتی نہیں کریں گے اور یورپین فوجیوں کے آنے کے بعد مہاراجا ان سب کو غیر مسلح کر کے سزا دیں گے۔" ہنگر فورڈ کی بغیر کسی منظوری کے سیاسی اختیارات کے استعمال کو ڈورنڈ نے پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا۔ لیکن چونکہ اسے بمبئی کے گورنر لارڈ الفنسٹن کا تعاون حاصل تھا اور جو اس بات سے مطمئن تھا کہ ہنگر فورڈ نے عام دنوں کے آداب اور اصول کی پابندی نہ کر کے وقت کو بالکل ضائع نہیں کیا۔

اس افواہ سے کہ ہولکر باغیوں کے ساتھ ہو گیا ہے' اندور کے باہر بدامنی پھیل گئی۔ امجھیرا کے راجا نے بھوپاوار قصبہ پر حملہ کر دیا۔ اس جگہ موجود تھوڑے سے انگریزوں کو بھیلوں کی

ایک چھوٹی ٹکڑی پر انحصار کرنا پڑا۔ لیکن اندور میں بھیل لڑنے کے موڈ میں نہیں تھے۔ اور ان میں سے تقریباً 20 آدمی رات کے اندھیرے میں بھاگ گئے۔ ان سارے بھگوڑوں نے جھبوا کے چھوٹے راجا کے یہاں پناہ لی۔ لیکن اس کی عرب فوجوں نے ان کی موت کی سزا کی مانگ کی۔ تاہم راجا نے یہ احتیاط برتی کہ ان کی حفاظت پر اپنے وفادار راجپوتوں کو لگادیا۔ اس کے بعد ہولکر کے بھیجے گھوڑسواروں نے انہیں وہاں سے نکالا۔

اس دوران ڈورنڈ فوری طور پر اقدامات کئے جانے کے لیے زور ڈال رہا تھا۔ اس نے اُڈبرن سے کہا کہ وہ مالوہ کی طرف فوراً کوچ کرے۔ اس نے حکومت ہند کو یہ بھی بتایا کہ اس وقت نرمدا کے کنارے فوج کو تعینات کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ ایسا نہ ہو کہ یہ باغی جنوب کی طرف کوچ کر جائیں۔ کمشنر ناگپور کے واضح احکامات کے برخلاف اس نے ملٹری افسروں سے کہا کہ وہ اپنی اپنی جگہوں پر برقرار رہیں۔ جنرل اڈبرن نے آخر کار اپنی گرتی ہوئی صحت کا حوالہ دے کر استعفیٰ دے دیا۔ اور بریگیڈیر اسٹورٹ کی قیادت میں بمبئی کی فوج اسیر گڑھ ہوتے ہوئے مہو کے لیے روانہ ہوئی۔ یہ روانگی 12/ جولائی کو ہوئی اور 22/ تاریخ کو یہ فوج اسیر گڑھ کے نزدیک مقیم ہوئی۔ جہاں ڈورنڈ بھی بریگیڈیر اسٹورٹ کے ساتھ جاکر مل گیا۔ 12/ اگست کو مہو پر قبضہ ہو گیا۔ ڈورنڈ کو بارش کی وجہ سے فوری طور پر آگے کی کارروائی روکنی پڑی۔ ہولکر کے ساتھ وہ تعلقات بحال کرنے کے حق میں نہیں تھا' جب تک کہ اس کی بے گناہی اچھی طرح ثابت نہ ہو جائے۔

جیسے ہی موسم نے اجازت دی' ڈورنڈ اپنی فوجیں دھار سے لے کر چلا گیا۔ یہ قدیم شہر تھا اور اسی نام کے مراٹھا حکومت کی راجدھانی تھی۔ اس کی خدمت میں لگے عرب اور افغان لٹیروں نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کر دی' جب انہیں اندور ریزیڈنسی میں حملے کی اطلاع ملی۔ مالوہ میں ان غیر ملکی لٹیروں نے بغاوت میں خاص کردار ادا کیا۔ لوبے کا کہنا ہے کہ بندیل کھنڈ کے باغیوں میں سر رابرٹ ہیملٹن کو ایک آرمینین بھی ملا تھا۔ دھار کے نوجوان راجا کی ماں اور چچا پر بغاوت پھیلانے کا شبہ کیا گیا۔ دھار' اندور سے 32 میل کے فاصلے پر ہے۔ اور ڈورنڈ 22/ اکتوبر کو قلعہ کے سامنے پہنچ گیا۔ گیریسن نے اپنے کو حوالے کرنے سے انکار کر دیا اور اس جگہ کا محاصرہ کرلیا۔ اس سے پہلے کہ وہ حملہ کرتا دفاع کرنے والے لوگ خاموشی سے باہر نکلے اور جوان راجا گورنر جنرل کے ایجنٹ کے استقبال کے لیے باہر نکلا۔ قلعہ کو بالکل مسمار کر دیا گیا اور وہاں انگریزوں نے قبضہ کرلیا' جسے بعد میں نابالغ شہزادے کو سونپ دیا گیا۔

دھار سے یہ فوج مندسور کے لیے روانہ ہوئی جو فیروز شاہ کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ راستے میں ڈورنڈ کا جاورا کے نواب نے گرمجوشی سے استقبال کیا جو ادھر اپنی حکومت میں بھی کافی پریشان ہو گیا تھا۔ فیروز شاہ کی فوجوں نے نیچ کا محاصرہ کرلیا' تاکہ اپنے دشمنوں کے خلاف محاذ آرائی کر سکے۔ لیکن گروریا میں ان کی شکست ہو گئی۔ گروریا پر قبضہ کے بعد مندسور میں ان کی پوزیشن کمزور ہو گئی۔ اس سے پہلے راجکمار نے گوالیار میں اندور کے باغیوں کی کمان سنبھال لی تھی۔ 15/

دسمبر کو ڈورنڈا ندور واپس آیا۔ دوسرے دن اس نے اپنا چارج رابرٹ ہیملٹن کے سپرد کر دیا۔ جب کہ سر ہیوروز نے اب نئی تشکیل شدہ وسطی ہندوستانی فیلڈ فورس کی کمان سنبھال لی۔

اس دوران راجپوتانہ میں بھی خاموشی نہیں رہی۔ گرچہ وہاں کے حکمراں انگریزوں کے وفادار تھے' لیکن فوجی' مذہب کے سوال کو لے کر زیادہ پریشان تھے۔ اگست میں اجمیر جیل میں کچھ شورش پھیلی لیکن انہیں فوری طور پر دبا دیا گیا۔ اس کے بعد نصیر آباد میں تعینات بمبئی آرمی کے لانسرس میں تھوڑی سی شدت پیدا ہوگئی۔ بمبئی کی فوجوں کو بنگال فوج کے مقابلے میں بہت زیادہ وفادار سمجھا گیا تھا۔ اور کبھی بھی ان میں کوئی بد نظمی نہیں پھیلی' یہاں مسئلہ ایک اکیلے فوجی کو لے کر پیدا ہوا۔ اور جب اس کا تعاقب کیا گیا تو اس نے 12 ویں بمبئی انفینٹری میں پناہ حاصل کر لی۔ اس ماہ کے تیسرے ہفتہ میں جودھپور فوج کے کچھ لوگ گھنٹے کہرے میں ایک دن صبح ماؤنٹ آبو پہنچ گئے اور کھڑکیوں سے سوتے ہوئے یورپین پر گولیاں چلانی شروع کر دیں۔ وہاں کوئی گولی کا شکار نہیں ہوا۔ سوائے جنرل لارنس کے لڑکے کے جو کیپٹن ہال کے کمرے میں جارہا تھا کہ اس کی جانگھوں میں گولی لگی' جو جلد ہی صحت یاب بھی ہو گیا۔ ان باغیوں کی آبو حملے میں شکست ہوئی اور پھر وہ وہاں سے ایرن پورا چلے گئے جہاں خاص فوجی رہ رہے تھے۔ اس جگہ پر صرف لیفٹیننٹ کانولی دو سرجنٹ اور ان کے خاندان کے لوگوں کے علاوہ کوئی اور یورپین نہیں تھا۔ کانولی نے فوجیوں کو سمجھانے کی کوشش لیکن ناکام رہا۔ پھر اس نے بھیلوں کو ہندوؤں اور مسلمانوں کے خلاف بھڑکانا شروع کیا۔ لیکن بھیل جو ہمیشہ وفادار رہے' وہ اتنی بڑی فوج سے لڑنے کو تیار نہیں ہوئے۔ کانولی اور دوسرے یورپین یقیناً جان سے مار دیئے گئے ہوتے' اگر رسالدار عباس علی نے ہمت کے ساتھ مداخلت نہ کی ہوتی۔ عباس علی نے یہ پیش کش بھی کی کہ وہ باغیوں اور دوسرے فوجیوں کا ساتھ چھوڑ دے گا اگر انہیں معافی کی یقین دہانی اور ملازمت برقرار رکھنے کی یقینی دہانی کرا دی جائے۔ لیکن مانک میسن نے کہا کہ ان باغیوں سے مصالحت کرنے کا اسے کوئی اختیار نہیں ہے۔ پھر عباس علی کے پاس کوئی اور راستہ نہیں تھا سوائے اس کے کہ وہ بھی باغیوں کے ساتھ ہو جائے۔ اس کے بعد وہ سب جودھپور کی سرحدوں سے ہوتے ہوئے اجمیر کی طرف روانہ ہوئے۔ ادھر آوا کا ٹھاکر مہاراجہ جودھپور سے کسی معاملے کو لے کر نبرد آزما تھا۔ کیونکہ مہاراجہ نے اپنے بھروسے مند افسر آنند سنگھ کے ساتھ ایک چھوٹی سی فوج اس سے لڑنے کے لیے بھیج دی تھی۔ ٹھاکر نے کہا کہ وہ ہتھیار ڈال دے گا بشرطیکہ پولیٹکل ایجنٹ مانک میسن اس کی شرائط کو منظور کر لے۔ اور یہ بھی کہا کہ اس نے جو شرائط رکھی ہیں وہ کسی سیاسی نوعیت کی نہیں بلکہ جذباتی نوعیت کی ہیں اور ان کو منظور کرنے میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن مانک میسن انہیں ماننے کے لیے تیار نہیں ہوا۔ ٹھاکر کا جھگڑا مہاراجہ کے ساتھ تھا نہ کہ برٹش حکومت کے ساتھ۔ مہاراجہ اس بات کے لیے تیار نہیں تھا کہ جب تک ٹھاکر اپنی غلطیوں کا احساس نہ کر لے' وہ اسے معاف کرنے کو تیار نہیں۔ اور سیاسی ایجنٹ نے اس معاملے میں مداخلت کرنا دانشمندی کے خلاف سمجھا۔ آوا کے ٹھاکر نے اس لیے باغی

فوجیوں سے جو اس کے پڑوس میں پہنچ گئے تھے' بات چیت شروع کی اور پھر انہیں اپنے قلعہ میں داخلہ دے دیا۔ 8/ ستمبر کو وہ سب پالی میں جودھپور کے فوجیوں پر ٹوٹ پڑے اور مہاراجہ کی فوج کو شکست دے دی۔ آنند سنگھ مارا گیا۔ اس کی توپ اور فوجی اسلحہ خانہ باغیوں کے ہاتھ میں آگیا۔
جنرل لارنس نے محسوس کیا کہ ٹھاکر اور اس کے نئے دوستوں کو یونہی نہیں چھوڑا جا سکتا کیونکہ اس سے ان کی کافی بے عزتی ہو گی۔ جودھپور کو برٹش حکمراں کا ساتھی سمجھا گیا تھا۔ لیکن وہ اتنی زیادہ فوج نہیں جمع کر سکا کہ وہ آوا کے قلعہ کو آزاد کرا سکے۔ جو کچھ وہ کر سکا یہ تھا کہ قلعہ کے سامنے آکر گولیاں چلائیں۔ پھر اس نے جان بوجھ کر پسپائی کا راستہ اختیار کیا تاکہ باغیوں کو باہر آکر لڑنے کا لالچ دیا جا سکے۔ لیکن وہ اس لالچ میں نہیں آئے۔ اب اس کے پاس کوئی راستہ نہیں بچا سوائے اس کے کہ وہ پیچھے مڑے۔ اور پیچھے مڑنے کا مطلب عام طور پر شکست سے لیا جاتا ہے۔ لارنس کے اس جوکھم بھرے کام سے ایک قیمتی زندگی ضائع ہو گئی۔ مانک میسن جودھپور سے اس لیے آیا تھا کہ وہ گورنر جنرل کے ایجنٹ سے مل سکے۔ لیکن بگل کی آواز سے وہ دھوکہ کھا گیا۔ آوا کے ٹھاکر کو دوسرے دن صبح جب اس کی لاش ملی تو اس نے شایان شان طریقے سے اس کو دفن کر دیا۔ فوجیوں نے ٹھاکر کا ساتھ چھوڑ دیا اور اسے اکیلے لڑنے پر مجبور کیا اور خود وہ سب دلی کے لیے روانہ ہو گئے۔ جہاں نومبر میں نارنول میں جیرالڈ نے انہیں شکست دے دی۔ آوا کے ٹھاکر کو بھی جنوری 1858ء میں اپنا قلعہ چھوڑنا پڑا۔ اپنے میواڑ کے دوستوں کے ساتھ وہ پناہ گزیں ہوا۔ لیکن بعد میں برٹش حکمرانوں کے سامنے خود سپردگی کر دی۔ اس پر مقدمہ چلایا گیا۔ لیکن جو گواہیاں پیش ہوئیں وہ پھانسی کے لیے کافی نہیں تھیں' اس لیے اسے بری کر دیا گیا۔
آوا کے ٹھاکر سے زیادہ عالی مرتبت والے راجپوت چیف پر اس سے زیادہ سنگین الزامات لگائے گئے۔ صرف مانک میسن ہی راجپوتانہ میں ہوئے بغاوت کا شکار نہیں ہوا۔ میجر برٹن جو کوٹہ کا پولیٹیکل ایجنٹ تھا' اس کی بھی جان 15/ اکتوبر کو باغیوں نے لے لی۔ اس کے ساتھ اس کے دو بچے بھی مارے گئے۔ مہاراؤ پر شبہ کیا گیا کہ وہ باغیوں سے مل گیا ہے۔ میجر برٹن وہاں کوٹہ کے فوجیوں کے ساتھ نیچ کو آزاد کرانے جون میں گیا تھا۔ اور جنرل لارنس نے یہ مناسب نہیں سمجھا کہ اسے واپس اس کے عہدے پر آنے کی اجازت دے۔ اس لیے وہ اپنے خاندان والوں کے ساتھ نیچ میں ہی رکا رہا۔ اور مانک میسن کی موت اور آوا سے لارنس کی پسپائی کے بعد وہ کوٹہ واپس آنا چاہتا تھا کیونکہ اس نے سوچا کہ اس کی موجودگی سے مہاراؤ کو طاقت ملے گی۔ لیکن نند کشور جو مہاراؤ کا ایجنٹ تھا' اس نے اس وقت کو مناسب نہیں سمجھا کیونکہ اس نے فوجیوں میں انگریزوں کے خلاف ناراضگی کی بات سن رکھی تھی۔ اس لیے برٹن نے اپنا سفر تو ملتوی کر دیا لیکن کوٹہ کی واپسی کا ارادہ ترک نہیں کیا۔ بعد میں نند کشور اچھی خبریں بھی لایا۔ مہاراؤ نے اپنے یہاں سے کچھ باغی جوانوں کو دیہی علاقے میں بھیجنے کی کوشش کی اور اس نے باغیوں کے لیڈروں سے یہ یقین دہانی بھی حاصل کر لی کہ پولیٹیکل ایجنٹ بغیر کسی خوف کے واپس آ سکتے ہیں۔ میجر برٹن اپنے دونوں لڑکوں کے

ساتھ نیچ سے رخصت ہوا۔ ان میں سے ایک لڑکا 21 سال کا اور دوسرا 16 سال کا تھا۔ چمبل کو پار کرنے کے بعد نند کشور نے اسے پھر مشورہ دیا کہ وہ وہاں کچھ دنوں کے لیے رک جائے۔ برٹن کے لڑکوں نے اس اعتراض کو نہیں سنا۔ میجر نے کہا کہ اگر اس کی ضرورت کوٹہ میں نہیں ہے تو وہ بوندی چلا جائے گا۔ یہ دیکھ کر نند کشور خاموش ہو گیا۔ اور پھر اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ وہاں پہنچنے کے بعد برٹن کو پریشانی کی کوئی بات اب نظر نہیں آئی۔ مہاراؤ انہیں خوش آمدید کہنے ان کے پاس گیا۔ اور اس نے بھی اس کے ہاں جاکر خوشدلی کا اظہار کیا۔ دوران ملاقات برٹن کو مہاراؤ کے غیر وفادار سپاہیوں کو سزا دینے کی ضرورت پڑی۔ میلیس کا الزام ہے کہ مہاراؤ نے اس راز کو اس سے چھپائے رکھا جس کی وجہ سے یہ سانحہ ہوا۔ شہر کے لوگوں کو پھیلنے والی بغاوت کی کوئی سن گن نہیں تھی اور تاجر اپنے نوادرات کے ساتھ حملے سے کچھ دیر پہلے ریزیڈنسی بھی گئے۔ باغی جن کی قیادت محراب خاں اور لالہ جے لال کر رہے تھے' انہوں نے سیلڈر اور سیویل کو قتل کر دیا۔ اور ریزیڈنسی پر حملہ کر دیا۔ لیکن اس وقت جو حفاظت پر مامور ایڈجوٹنٹ تھا اس نے مہاراجا کو محل نہیں چھوڑنے دیا اور پھر ایک شخص جس کا نام دیوی لال تھا' فوجیوں کو یہ سمجھانے کے لیے بھیجا کہ وہ پولیٹکل ایجنٹ کو کوئی نقصان نہ پہنچائے۔ دیوی لال کا مشن ناکام رہا اور غصہ میں بھرے باغیوں نے اس کی جان لے لی۔ برٹن اور اس کے دونوں لڑکے جن کی حفاظت کے لیے کوئی اور نہیں تھا' وہ آخری دم تک لڑتے رہے۔ جے لال نے فوراً ہی کوٹہ کے سارے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے اور مہاراؤ کو مجبور کیا کہ وہ اس کاغذ پر دستخط کرے جس پر اس واقعہ کی ساری ذمہ داری اس پر ڈالی گئی تھی۔ لارنس اس وقت تک مجبور تھا اور مارچ 1858ء میں اس وقت کوٹہ کے لیے روانہ ہوا جب بمبئی سے میجر جنرل ایچ جی رابرٹس کی فوجیں پہنچ گئیں۔ اس دوران مہاراؤ نے کسی صورت کرولی کے راجا کی بھیجی فوجوں کی مدد سے اپنا محل خالی کرالیا۔ جب کہ باقی شہر پر باغیوں کا قبضہ رہا اور آخر کار 30/ مارچ کو قلعہ پر فتح کے بعد باغیوں کا صفایا ہو گیا۔ برٹش فوجیں نیچ اس وقت تک روانہ نہیں ہوئیں جب تک مہاراؤ کے اختیارات پورے طور پر اسے نہ مل گئے۔

نیچ کے واقعات ہمیں 3/ جون کی بغاوت کی یاد دلاتے ہیں۔ اپنے افسروں کے روانہ ہونے کے بعد باغیوں نے زیادہ انتظار نہیں کیا۔ ان کا بلاوا دلی سے آگیا تھا۔ لیکن دلی پہنچنے سے قبل انہوں نے کچھ دیر آگرہ میں قیام کرنا پسند کیا۔ اس زمانے میں آگرہ شمال مشرقی صوبوں کا ہیڈ کوارٹر تھا اور یہاں لیفٹیننٹ گورنر رہتا تھا۔ یہاں کا لیفٹیننٹ گورنر مسٹر کالون ایک تجربہ کار سول سرونٹ رہ چکا تھا۔ وہ لارڈ آکلینڈ کا خاص مشیر بھی رہا۔ میرٹھ میں ہوئی بغاوت سے اسے حیرت ہوئی اور اس نے فوراً ہی اپنی جنگی کونسل کو طلب کر لیا۔ اس کونسل میں لیفٹیننٹ گورنر نے خود مشورہ دیا کہ ساری عیسائی آبادی کو قلعہ میں بھیج دیا جائے۔ لیکن بہت سے لوگوں نے آگرہ میں اس سے اختلاف کیا اور جلد ہی ظاہر ہو گیا کہ اب لیفٹیننٹ گورنر کا اپنے ماتحتوں میں کوئی رعب نہیں ہے۔ اس کے اس مشورے پر مسٹر ڈرمنڈ اثر انداز ہوئے اور انہوں نے کہا کہ نظم و نسق کا مسئلہ پولیس پر چھوڑ دیا

جائے۔ اس لیے فوری طور پر نئے لوگوں کی بھرتی کر پولیس کی قوت میں اضافہ کیا گیا۔ لیکن بہت سے لوگوں کو ان کی وفاداری پر شک رہا۔ یہ بغاوت عام طور ایک مسلم تحریک سمجھی گئی تھی چنانچہ کالون نے ہندو مسلم اختلافات کو بڑھاوا دے کر فائدہ اٹھانا چاہا۔ اس لیے اس نے اپنی گوالیار کے مراٹھا حکومت کے فوجیوں اور بھرت پور کے جاٹ لوگوں کو بھرتی کرنا شروع کیا' جو دلی کے مسلم حکمراں کے دشمن سمجھے جاتے تھے۔ دونوں راجاؤں نے لیفٹیننٹ گورنر کے ذریعہ ان کی فوج کو بلائے جانے پر خوشی کا اظہار کیا لیکن بھرت پور کے فوجی مکمل طور پر مسلح نہیں تھے اور پھر وہ کسی نظم و نسق کے پابند بھی نہیں تھے۔ جب کہ سندھیا کے آدمیوں پر بھی شک تھا۔ اس کے بعد لیفٹیننٹ گورنر نے یورپین اور ہندوستانی فوجیوں کی شاندار پیریڈ کرائی۔ حیرت اس پر ہے کہ ایک طرف یورپین فوجیوں کو اس نے یہ مشورہ دیا کہ وہ ہندوستانی فوجیوں پر شک نہ کریں۔ لیکن اس نے فوراً ہی دلی میں مس جیننگ کے قتل کا واقعہ سنا دیا۔ اس نے ہندوستانی میں تقریر کرتے ہوئے سپاہیوں کو یہ یقین دلایا کہ ان کی وفاداری پر اسے پورا اعتبار ہے۔ لیکن جب اس نے پوچھا کہ اگر کسی کو کوئی شکایت ہو یا وہ فوج سے علاحدہ ہونا چاہتا ہو تو سامنے آجائے۔ سپاہیوں نے شور تو مچایا لیکن کوئی آگے نہیں آیا۔ کچھ دنوں تک کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ عدالتوں میں ویسی ہی بھیڑ بھاڑ رہی۔ اسکولوں میں بھی حاضری کی پابندی ہوتی رہی اور سارے کام کاج اپنے طریقے پر چلتے رہے۔

خطرے کی سب سے پہلی گھنٹی علی گڑھ سے سنائی دی۔ میرٹھ میں ہوئے واقعات کی خبر یہاں پہنچ چکی تھی۔ لیکن فوجیوں نے کسی بے چینی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ ایک برہمن نے سازش کا منصوبہ دو سپاہیوں کو بتا دیا۔ اسے قید کر لیا گیا اور پھر کورٹ مارشل کے ذریعہ اسے موت کی سزا دی گئی۔ موت کی سزا کی خبر سے انگریزوں کے خلاف جذبات بھڑک اٹھے۔ ایک سپاہی چلایا۔ مذہب کے لیے شہید ہونے والے شخص کو دیکھو اور پھر بارود پھٹ پڑا۔ کسی عیسائی کی جان نہیں لی گئی لیکن فوراً ہی برٹش اطاعت گزاری کا خاتمہ ہو گیا۔ بہت سے مردوں عورتوں اور بچوں نے جان بچانے کی خاطر بھاگنا شروع کر دیا۔ اور بہت سے بھگوڑے آگرہ بھی پہنچ گئے جن میں لیڈی آؤٹ رام بھی شامل تھیں۔ علی گڑھ کی بغاوت کے بعد ہی مین پوری اور اٹاوہ میں بھی بغاوت پھوٹ پڑی۔ مین پوری کے راجا تیج سنگھ کے ساتھ بندوبست اہلکاروں نے بہت ناانصافی کی تھی۔ لیکن اس کی گدی کے لیے کوشاں اس کے چچا راؤ بھوانی سنگھ انگریزوں کے وفادار بنے رہے۔

بغاوت کی ان خبروں سے آگرہ میں بھی انتشار پھیل گیا۔ جس میں سب سے زیادہ معاون لیفٹیننٹ گورنر کی کونسل میں آپسی اختلافات ہوئے۔ اس نازک وقت میں بریلی کے کرنل ٹروپ نے کالون سے خصوصی اپیل کی کہ وہ ان خوف و شبہات کا فوری طور پر ازالہ کرے جس کی وجہ سے مقامی فوج میں خوف و ہراس اور بد نظمی پھیلی ہوئی ہے۔ اس نے یہ بھی مشورہ دیا کہ ایسے وقت میں مقامی فوجیوں سے جو کچھ بھی کہا جائے یا کیا جائے اس میں اس بات کا کوئی حوالہ نہ دیا جائے کہ ان لوگوں نے فوج کے نام پر جو دھبہ لگایا ہے' ان کی سزا میں تخفیف کر دی جائے گی یا معاف کر دیا

جائے گا۔ اس نے مزید زور دے کر کہا کہ جب تک یہ بات آپ خود نہ کہیں یا گورنمنٹ کی طرف سے انہیں یقین دہانی نہ کرائی جائے کسی اور کی کہی بات کا کوئی اثر نہیں ہو گا۔ 25/ مئی کو کالون نے ٹروپ کے مشورے کے مطابق ایک اعلانیہ جاری کیا" ادھر حال کے ہنگاموں میں جو سپاہی شریک رہے ہیں' وہ اگر اپنے گھر جانا چاہیں اپنے نزدیک کے سول یا ملٹری چوکی پر اپنے اسلحے جمع کرا دیں اور ملازمت سے خاموشی کے ساتھ سبکدوش ہونا چاہیں تو انہیں اس بات کی اجازت ہو گی اور ان سے کوئی باز پرس نہیں کی جائے گی۔ بہت سے وفادار سپاہی جنہوں نے حکومت کے خلاف مزاحمت کی انہوں نے ایسا صرف اس دباؤ کی وجہ سے کیا کہ وہ اس ٹکڑی میں موجود تھے جنہوں نے بغاوت کی اور چونکہ وہ بھی ایسا سوچ رہے تھے کہ سرکار نے جو اقدامات کئے ہیں اس سے ان کے مذہب یا ان کی اپنی عزت پر بٹہ لگتا ہے۔ یہ خیال صرف غلط فہمی کی بنیاد پر پیدا ہوا لیکن اس سے یقیناً جذبات بھڑک گئے ہوں گے۔ گورنر جنرل نے ابھی حال ہی میں جو اعلانیہ جاری کیا ہے' وہ اپنے آپ میں بالکل واضح ہے اور اس معاملے پر سپاہیوں کے سارے شبہات دور کرنے کے لیے کافی ہے۔ صرف وہ شخص جو لوگوں کو اکسانے میں ملوث پایا گیا یا ایسے لوگ جنہوں نے لوگوں کی جان پر حملہ کیا' انہیں سزا دی جائے گی۔" اس اعلانیہ کے بعد اب اگر کوئی شخص حکومت کے خلاف اسلحہ اٹھاتا ہے' اسے کھلا دشمن سمجھا جائے گا۔" اس اعلانیہ سے ہر طرف احتجاج ہونے لگا اور اس کی بری طرح نکتہ چینی بھی کی گئی اور پھر آخر کار خود گورنر جنرل کو اس کی تردید کرنی پڑی۔ اس کی جگہ ایک نیا اعلانیہ جاری کرنا پڑا جس میں واضح طور پر کہا گیا "بغیر شرط کے معافی ہر اس رجمنٹ کو نہیں دی جا سکتی جس نے اپنے افسروں کو جان سے مارا یا زخمی کیا ہے یا جنہوں نے زیادتی کے کام کئے ہیں۔" متھرا اور ہوڈل سے مزید بغاوت کی خبریں آنے لگیں۔ کالون نے اپنے مشیروں کو بٹا ہوا دیکھا اور تناؤ کی وجہ سے اس کی صحت خراب ہونے لگی۔ 31/ مئی کو آگرہ کے دو مقامی رجمنٹ کو غیر مسلح کر دیا گیا۔ ان میں سے بیشتر لوگ چھٹی پر اپنے گھر چلے گئے۔

لیفٹیننٹ گورنر جس کی صحت بہت زیادہ خراب ہو چکی تھی' اس میں اور اضافہ روہیل کھنڈ مالوہ اور بندیل کھنڈ میں پھیلنے والی بغاوت کے سبب ہوا۔ اور اس کی سبھی سرکاری ذمہ داریاں انتظامیہ کی کونسل کو سپرد کر دی گئیں۔ اس دوران نیمچ سے آنے والی فوج کی خبر پہنچی۔ ان کی طاقت میں مزید اضافہ کوٹہ فوج سے کچھ لوگوں کے شامل ہونے سے ہوا۔ یہ فوج آگرہ گیریسن کو مزید کمک پہنچانے کے لیے آ رہی تھی۔ لیکن اب بھی ان کی وفاداری پر شک تھا۔ اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ ان کا امتحان لیا جائے۔ ان کی انفنٹری اور گھوڑسوار دستے کو حکم دیا گیا کہ وہ فوج کے ساتھ باغیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے جائیں۔ لیکن ان کے اسلحے یورپین ریزرو کے پاس جمع رہیں گے' تاکہ کینٹ کی حفاظت ہو سکے۔ انہوں نے اپنے اسلحوں سے جدا ہونا مناسب نہیں سمجھا اور وہ سب کے سب باغی فوج میں چلے گئے۔ بریگیڈیر کول وہیل نے پہلے تو یہ فیصلہ کیا کہ وہ نیمچ کے باغیوں کا آگرہ میں انتظار کرے لیکن اس نے بعد میں اپنا ارادہ بدل دیا اور ان سے لڑنے کے لیے آگے بڑھا۔ شاہ گنج

میں جو جنگ ہوئی اس میں انگریزوں کی شکست ہو گئی۔ لیکن ان کی خوش قسمتی تھی کہ فاتح فوج نے اس سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ نیچ کے لوگ آگرہ میں داخل نہیں ہوئے۔ لیکن شہر میں رہنے والے لوگ اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور وہاں کی عیسائی آبادی جو تقریباً چھ ہزار تھی سب نے قلعہ میں پناہ لی۔ ایک پناہ گزیں کے مطابق ''پناہ دینے والوں کی ایک بھیڑ تھی جس میں ہر قسم کے لوگ شامل تھے۔'' پہلے تو ہندوستانیوں کو قلعہ کے پناہ گزینوں سے الگ کیا گیا۔ لیکن جلد ہی یہ پایا گیا کہ یورپین اور دوسرے لوگ اپنی روزمرہ کی ضرورتوں کو پورا نہیں کر سکتے۔ وہاں عیسائی ملازمین کی تعداد بھی زیادہ نہیں تھی۔ دو تین دن بعد سبھی ملازموں کو واپس لایا گیا اور ان کے ساتھ بہت بڑی تعداد میں دھوبی' سقہ' درزی' جاروب کش' باورچی اور گڈریے آ گئے۔ آگرہ قلعہ کی زندگی لکھنؤ کے ریزیڈنسی کے بالکل برخلاف تھی۔

آگرے کا محاصرہ نہیں کیا گیا تھا لیکن اس حقیقت سے گیریسن کو کوئی واقفیت نہیں تھی۔ صرف ایک بار گولی چلنے کی آواز سے خطرے کی گھنٹی بجی۔ جب کچھ محصور لوگ اپنی بندوقیں لے کر اس جگہ پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ بہت سے انگریز سپاہی اور دوسرے لوگ جو یونیفارم نہیں پہنے ہوئے تھے' جھروکوں سے گولیاں چلا رہے تھے۔ ان گولیوں کے جواب میں کوئی گولی نہیں چل رہی تھی کیونکہ آس پاس کوئی دشمن نہیں تھا۔ اور بعد میں یہ پایا گیا کہ فوجی صرف اپنی تفریح کی غرض سے ایک گدھے اور گدھوں کے جھنڈ پر گولیاں چلا رہے تھے۔ گولیوں کی آواز سے گھبرائے بغیر گدھا گھاس چر تا رہا۔ اور پاس پڑی ایک بھیڑ کے گوشت گدھ بڑے مزے سے کھا رہے تھے۔ وہاں پر صفائی کا کوئی انتظام نہیں تھا اور قلعہ ہر طرح کی گندگی سے بھر گیا تھا۔ کالون لکھتا ہے:

''پہلے دو دنوں تک تو کچھ سمجھ میں ہی نہیں آیا۔ تیسرے دن کہیں صورتِ حال کا احساس ہوا۔ فوراً ہی حکام کے خلاف آوازیں اٹھنے لگیں۔ پہلے تو افواہ ہوئی' پھر سرگوشیاں ہوئیں' پھر کھلے عام کہا جانے لگا کہ وہاں تو کوئی حاکم ہے ہی نہیں۔ یہ بھی کہا گیا کہ کالون پاگل ہو گیا ہے۔ گرچہ یہ دونوں باتیں غلط تھیں لیکن وہاں جو ماحول تھا' اس لیے اس افواہ پر یقین کرنا پڑا۔ ملازموں کے آنے سے یہ انتشار کچھ کم ہوا اور جلد ہی قلعہ میں محصور فوجی اور سویلین کو یہ معلوم ہو گیا کہ یہاں تو کوئی دشمن ہے ہی نہیں اور وہ باہر نکلنے کے لیے آزاد ہیں۔

شاہ گنج کی شکست سے بریگیڈیر کول وہیل کو اپنی کمان سے ہاتھ دھونا پڑا۔ ان کی جگہ کرنل کاٹن نے لی۔ کچھ پناہ گزینوں نے قلعہ کے اندر مغلوں کے پوشیدہ خزانے کے بارے میں سن رکھا تھا۔ اور پھر ان کی سب سے بڑی تفریح خزانے کی تلاش ہو گئی۔ بہت سی جگہوں کو کھودا گیا۔ تہہ خانوں کو کھنگالا گیا' راستوں کو تلاشا گیا۔ لیکن خزانے کی جگہ انہیں انسانی ہڈیاں ہاتھ آئیں۔ محل میں یقیناً بھوت رہے ہوں گے۔ لیکن ان بھوتوں کی تلاش اتنی دلچسپ نہیں ہو تیں جتنی کہ اس کی کہانیاں۔ تاہم قلعہ کے محصور لوگوں کو اچھا مشغلہ ہاتھ آ گیا۔ پھر بھی سویلین اور ملٹری کے درمیان کوئی ایکتا نہیں تھی۔ فوج کو پھر بھی اس بات کی بالادستی حاصل ہو گئی کہ وہ عام لوگوں کی

مخالفت کے باوجود ایک مسجد کو ڈھادیں۔ انہیں اس بات سے تسلی ہوئی کہ اگر مسجد برباد ہوئی تو اس کے ساتھ ہی فوج کے چہیتے جوتی پرشاد کنٹریکٹر کا خوبصورت نیا عالیشان مکان بھی ڈھایا جارہا تھا۔ لیکن اس ارادے میں بھی انہیں ناکامی ہوئی۔ اس طرح سے ملٹری اور سویلین حکام کے درمیان تنازعہ بڑھتا گیا۔ اور وہ سب آپس میں لڑنے لگے۔ اتنے ہی پر انہوں نے بس نہیں کیا بلکہ کچھ سول حکام نے بغیر کسی بات کے رومن کیتھولک بشپ اور پادری پر حملہ کر دیا۔

آخر کار آگرہ کے حکام نے طے کیا کہ وہ اپنی فوجی قوت کا مظاہرہ کریں۔ لیکن اس مظاہرہ سے بھی کچھ حاصل نہیں ہوا۔ فوج ہاتھرس تک گئی۔ کچھ کٹر غازیوں سے مڈ بھیڑ ہوئی اور پھر وہ واپس آگئے۔ تب تک باغیوں کا شہر پر مکمل قبضہ ہو چکا تھا۔

9/ستمبر کو کالون کا انتقال ہو گیا۔ عام دنوں میں اپنے لمبے تجربوں 'انصاف پسندی اور فرد کے حقوق کے تئیں اس کی ذمہ داری کی وجہ سے اسے اپنی رعایا کا بھر پور پیار ملتا۔ لیکن غدر کی وجہ سے ایک سخت گیر آدمی کی ضرورت تھی جو وہ نہیں تھا۔ گرتی ہوئی صحت کی وجہ سے وہ فیصلہ لینے سے قاصر رہا۔ گرچہ آگرہ میں اس کے ساتھ بہت باصلاحیت لوگ تھے 'لیکن وہ ان کے ساتھ اتفاق رائے سے کام نہیں کر سکا۔ اس کی موت کے ساتھ ہی دلی کی شکست بھی ہو گئی۔ گرچہ یہ خبر خوش کن تھی۔ لیکن اس کا ایک تاریک پہلو بھی تھا۔ وہ سارے باغی جو دلی سے نکالے گئے 'متھرا آگئے۔ اور یہ طے نہیں تھا کہ وہ یہاں سے کہاں جائیں گے۔ اندور کے باغی بھی دھولپور پہنچ چکے تھے۔ اگر وہ دونوں مل کر آگرہ پر یکطرفہ حملہ کر دیتے تو قلعہ پر کب تک قبضہ رہتا۔ تاہم دلی کے باغیوں نے جمنا کو پار کر لیا۔ اندور کے باغی آگے بڑھنے کی عجلت میں نہیں تھے۔ لیکن باغیوں کے اتنے قریب آجانے کی وجہ سے آگرہ میں ہر طرف انتشار پھیل چکا تھا۔ ایسا بھی سنا گیا کہ فوج کی ایک ٹکڑی کرنل گریٹ ہیڈ کی قیادت میں دوآبہ کو خالی کرانے کے لیے دلی سے بھیج دی گئی ہے اور یہ صرف آگرہ سے 40 کلومیٹر کی دوری پر رہ گئی ہے۔ گریٹ ہیڈ سے فوری طور پر مدد کی اپیل کی گئی۔ اور 10/اکتوبر کو اس نے جمنا کو پار کر لیا۔ اس کے ساتھ کچھ وحشی نما پھٹی ہوئی وردیوں میں ملبوس انسان تھے جو آگرہ مدد کے لیے آئے تھے۔ ان کے اندر خوف و ہراس پیدا کرنے والی کوئی بات نہیں تھی۔ گریٹ ہیڈ کو بتایا گیا کہ اندور کے باغیوں سے فوری طور پر کوئی خطرہ نہیں ہے 'کیونکہ مخبروں کی اطلاعات کے مطابق وہ ابھی کھاراندی کے اس پار ہیں۔ لیکن ابھی انہوں نے اپنے خیمے گاڑے ہی تھے کہ ایک گولے کی آواز نے دشمنوں کی آمد کی خبر دی۔ باغیوں نے گریٹ ہیڈ کو چکرا دیا۔ اور گریٹ ہیڈ کی وجہ سے وہ خود بھی چکرا گئے۔ کیونکہ دونوں پارٹیوں کو ایک دوسرے کی موجودگی کی اطلاع نہیں تھی۔ تاہم اس جنگ میں بھی انگریزوں کی فتح ہوتی 'لیکن باغیوں کے تعاقب میں تاخیر ہوئی کیونکہ کرنل کاٹن جو سینئر افسر تھا 'اس نے اپنے حقوق کے استعمال کا فیصلہ کیا اور کمان سنبھال لی۔ اس کے بعد سے آگرہ محفوظ ہو گیا۔ اور گریٹ ہیڈ کانپور جانے کے لیے آزاد ہو گیا 'اور شہر میں روزمرہ کے معمولات بحال ہو گئے۔

# باب نہم

# پنجاب

پنجاب کو مشکلات کا صوبہ کہا جاتا تھا۔ 1849ء میں برٹش حکومت نے اس پر قبضہ کیا تھا اور یہ جنگجوؤں کا مسکن تھا۔ لیکن یہاں کے لوگ بہت زیادہ آپس میں بٹے ہوئے تھے۔ اور ان کی 'حسد بھری رقابت' کی وجہ سے ہی نئے حکمراں اپنے کو محفوظ سمجھتے۔ برٹش حکومت لوگوں کو ایک دوسرے کے خلاف اس طرح برسرِپیکار رکھنا چاہتی تھی کہ وہ روک بھی بن سکیں اور ہر قبیلہ دوسرے قبیلے اور ہر ذات دوسری ذات لیے رکاوٹ بن سکے۔ انتظامیہ کا کام بہت باصلاحیت لوگوں کے سپرد تھا اور زیادہ تر انتظامیہ کے لوگ مشرق کے پرانے صوبوں سے تعینات کیے گئے تھے۔ پنجاب میں پوربیہ فوجوں کی اکثریت نہیں تھی۔ انبالہ سے لے کر مردان تک مختلف چھاؤنیوں میں تقریباً ساٹھ ہزار فوجی تعینات تھے، جن میں سے ہندوستانیوں کی تعداد 36 ہزار اور تقریباً 34 ہزار یورپین اور پنجابی تھے۔ سکھوں اور پوربیوں میں آپس میں کوئی محبت نہیں تھی اور کیو براؤن کا کہنا ہے کہ لفظ پوربیہ خاص طور پر استعمال کیا جانے لگا' تاکہ وہ نفرت اور حقارت دوبارہ زندہ کی جاسکے' جس سے پنجابیوں اور ہندوستان کے درمیان تفریق کی خلیج اور بڑھ جائے' اور آپسی تعاون مشکل ہو جائے۔ پنجاب میں تعینات پوربیہ فوجی سوائے سرحدی ضلعوں گڑگاؤں' حصار' اور ریواڑی کے باقی پورے صوبے کو دشمن اور اپنے کو اجنبی سمجھتے۔ گرو کے ماننے والوں کی جو روایت رہی ہے کہ وہ دلی کو ہمیشہ لوٹیں' وہ پھر سے تازہ کی گئی اور سکھوں کو یہ یقین دہانی کرائی گئی کہ اس سلسلہ میں گرو کی پیشین گوئی کہ 'دلی میں خالصہ راج ہوگا' برٹش حکومت کے تحت پوری ہو جائے گی۔

میرٹھ اور دلی کی خبریں 12/ مئی کو لاہور پہنچیں۔ وہاں کے چیف کمشنر سر جان لارنس اس وقت مری کے راستے میں راولپنڈی میں موجود تھے۔ ان کی عدم موجودگی میں جوڈیشیل کمشنر رابرٹ منٹگمری پر ذمہ داری آگئی۔ اس نے فوراً ہی وہاں کے سبھی خاص سول اور ملٹری افسران کو اپنے اعتماد میں لے کر یہ فیصلہ کیا کہ بریگیڈیر کاربٹ کی رضامندی سے میاں میر میں موجود سبھی مقامی فوجیوں کو غیر مسلح کر دیا جائے۔ منصوبہ یہ تھا کہ ان سے تمام گولی بارود اور ان کی کیپس لے لی جائیں۔ لیکن پولیس کا ایک نان کمیشنڈ سکھ افسران ساری سازشوں کی رپورٹ لے آیا۔ اب اس رپورٹ کے ذرائع کا پتہ لگانے کا موقع نہیں تھا۔ یہ فیصلہ کیا گیا کہ ہر طرح کے جوکھم سے بچنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ سبھی ہندوستانی رجمنٹ کو ایک ساتھ غیر مسلح کر دیا جائے۔ منٹگمری اور اس

کے دوستوں نے اس فیصلے کو بالکل خفیہ رکھا۔ میاں میر میں 12 کی شب میں رکھا گیا رقص کا پروگرام ملتوی نہیں کیا گیا۔ لیکن صبح ہی صبح پریڈ کرائی گئی، جس میں عام حکم نامہ پڑھ کر سنایا گیا اور کہا گیا تھا کہ بیرک پور کی 34 ویں این آئی کو بند کیا جارہا ہے۔ پریڈ کے آخر میں 16 ویں، اور 49 ویں این آئی اور آٹھویں مقامی کیویلری نے اپنے کو چاروں طرف سے بندوقوں سے گھرا ہوا پایا۔ انہیں بتایا گیا کہ انہیں صرف اس لیے غیر مسلح کیا جارہا ہے کہ کہیں ان کی نیک نامی کو بٹہ نہ لگ جائے۔ گرچہ شروع میں تھوڑی جھجھک تھی۔ لیکن ہندوستانی فوجیوں نے بہت فرمانبرداری کے ساتھ اپنے اسلحے جمع کرادیئے۔ اور بغیر کسی واقعے کے یہ کام پورا ہو گیا۔ کیو براؤن کا کہنا ہے کہ ''مشکل سے 6 سو یورپین کے سامنے ڈھائی ہزار مقامی فوجی غیر مسلح کر دیئے گئے۔ اور وہ بے ضرر ہو کر اپنے لائن میں چلے گئے۔'' رائس ہومس کا کہنا ہے کہ ''آج تک اس سے زیادہ فیصلہ کن فتح نہیں نصیب ہوئی تھی۔''

یہی حکمت عملی گووند گڑھ میں بھی دوہرائی گئی جو سکھوں کے مقدس مقام امرتسر کی نگہداشت کے لیے تعینات تھی، اور یہاں بھی آسانی سے فیصلہ کن فتح ہوئی۔ ہر میجسٹی کی 81 ویں رجمنٹ کی ایک کمپنی کیپٹن چیسٹر کی قیادت میں 12/ تاریخ کی شب میں لاہور سے یکوں میں روانہ ہوئی اور دوسرے دن علی الصبح گوبند گڑھ پہنچ گئی۔ اور سورج نکلنے سے پہلے خاموشی سے وہ قلعہ میں داخل ہو گئے۔ حکام کو اب سکھوں کے متبرک مقام کو لے کر کوئی پریشانی نہیں تھی۔

لیکن فیروزپور میں یہ معاملہ اتنی آسانی سے طے نہیں ہوا۔ یہاں دو مقامی انفینٹری رجمنٹ 45 ویں اور 57 ویں تعینات تھی۔ اس کے علاوہ 10 ویں مقامی کیویلری بھی تھی۔ کیویلری کی وفاداری پر کوئی شک نہیں تھا اور اسی طرح 57 ویں کے بارے میں یہ یقین تھا کہ اس پر بھی کوئی اثر نہیں ہے۔ یہاں کی بریگیڈ نے پیدل آرٹلری کی دو کمپنی، لائٹ فیلڈ بیٹری اور ہر میجسٹی کی 61 ویں رجمنٹ انگریزوں پر مشتمل تھی۔ منٹگمری نے فیروز پور کے حکام کو میرٹھ اور دلی کے واقعات کی اطلاع دیتے ہوئے انہیں اس بات کی تنبیہ کردی تھی کہ پنجاب کے ہندوستانی بھی بغاوت کر سکتے ہیں۔ بریگیڈیر انس، جس نے اس اسٹیشن کا چارج دو دن پہلے ہی لیا تھا، وہ بھی اس خطرے کی بابت یقین رکھتا تھا۔ لیکن اسٹیشن کے دوسرے کمانڈنگ افسروں کو اس بات کا یقین نہیں تھا۔ انس نے فیصلہ کیا کہ وہ دونوں این آئی رجمنٹس کو علاحدہ کر کے انہیں الگ الگ غیر مسلح کرے گا۔ 57 ویں نے تو بہت وفاداری کے ساتھ اپنے کیمپنگ گراؤنڈ تک مارچ کیا۔ لیکن 45 ویں نے مختصر راستہ اپنایا اور گراؤنڈ کے اس حصہ پر پہنچی جو انہیں الاٹ کیا گیا تھا۔ وہاں انہیں یورپین فوجی اور آرٹلری تعینات نظر آئی جس کے بارے میں انہیں کچھ بھی پتہ نہیں تھا۔ ''دھوکہ ہے (دھوکا ہوا ہے)'' آواز فوراً ہی اٹھی اور تقریباً دو سو فوجی برجیوں کی طرف دوڑ گئے۔ اور جو باقی تھے وہ بھی مارچ کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ سکھ نان کمیشنڈ افسروں نے منٹگمری کو یہ رپورٹ دے دی تھی کہ فیروزپور، گووند گڑھ، لاہور، جالندھر اور کانگڑہ میں ایک ساتھ بغاوت پھیلے گی۔ لیکن فیروز پور میں جب فوجیوں کو بریگیڈیر کے منصوبوں کا پتہ چلا تو ان میں سے صرف دو سو آدمیوں نے

بغاوت کی۔ 57 ویں رات پھر بالکل خاموش رہی۔ دوسرے دن صبح لائٹ کمپنی نے بغیر کسی مخالفت کے اپنے اسلحے جمع کرادیئے اور اپنی لائن میں واپس آگئے۔ اس کے بعد یورپین فوجیوں کی ایک کمپنی کو حکم دیا گیا کہ وہ لائنس کو صاف کرادیں اور 57 ویں کے باقی آدمیوں نے سوچا کہ لائٹ کمپنی کو غیر مسلح کر کے انہیں قیدی بنالیا گیا ہے اور وہ سب میدان کی طرف بھاگ گئے۔ شام تک اپنے کمانڈنگ افسروں کے کہنے پر وہ سب یورپین لائنس کی طرف گئے تاکہ اپنے اسلحے جمع کرادیں۔ جب کہ 45 ویں کے 130 آدمیوں کو چھوڑ باقی سب اسٹیشن سے بھاگ گئے۔ ان کا پیچھا کیا گیا۔ وہ تتر بتر ہوگئے۔ ان میں سے کچھ تو پٹیالہ کے سکھ راجا کے علاقے میں پہنچ گئے' اور وہاں ان کو قید کرلیا گیا اور کچھ دوسروں کو گاؤں والوں نے قید کرلیا۔ انہیں واپس لایا گیا۔ جب کہ کچھ دوسرے دلّی کی طرف بھاگ نکلے۔ وہاں انہوں نے بغاوت میں اور اضافہ کردیا۔ دسویں مقامی کیویلری وفادار رہی۔

جالندھر میں 36 ویں اور 61 ویں این آئی پر شبہ تھا' کیونکہ ماضی میں میرٹھ اور لکھنؤ سے ان کا تعلق تھا۔ جب 61 ویں ایک سال پہلے لکھنؤ سے روانہ ہوئی تو وہ اسٹیشن ہر طرح کی شورش سے پاک تھا۔ لیکن یہ اندیشہ تھا کہ ان میں سے کچھ لوگ اپنے پرانے دوستوں خصوصاً 19 ویں اور 34 ویں برہام پور اور بیرک پور دوستوں سے تعلق بنائے ہوئے ہیں۔ لیکن ان کے خلاف فوری طور پر کوئی کارروائی مناسب نہیں سمجھی گئی۔ کیونکہ بہت سے اسٹیشن ایسے تھے جہاں یورپین فوجی موجود نہیں تھے۔ اور وہ سب مقامی لوگوں کے رحم وکرم پر تھے۔ لیکن پھلور کے جنگی اسلحہ خانے میں کچھ یورپین فوجیوں کو بھیجا گیا۔ جب کہ کپورتھلہ کے راجا نے اپنی فوجوں کو جالندھر کی حفاظت کے لیے تعینات کردیا۔ بریگیڈیر اور کمشنر دونوں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ ان فوجیوں کے رجمنٹ کو غیر مسلح کریں گے۔ لیکن وہ موقع کی تلاش میں تھے۔ اس لیے اس تاریخ کو دوبار ملتوی کرنا پڑا۔ کیونکہ یہ ناممکن سمجھا گیا کہ فوجی اپنے افسروں کے ارادے سے باخبر نہ ہوں۔ 7/ جون کو انہوں نے اپنے افسروں کو بغیر کوئی موقع دیئے مسلح بغاوت کردی۔ اور پھلور گیریسن کے ہندوستانی فوجیوں کے ساتھ وہ سب لدھیانہ کی طرف نکل گئے' جہاں انہیں مسلح مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ انہوں نے وہاں انتظار نہیں کیا اور دلّی کی طرف بڑھ گئے۔ لیکن اس شہر میں ان کی مختصر آمد سے ہی یہ ثابت ہوگیا کہ برٹش حکومت پنجاب کے دیہی علاقوں کی وفاداری پر منحصر نہیں رہ سکتی۔ ''آتش زنی' قتل' قزاقی' ڈکیتی اور جانوروں کی چوری عام بات ہوگئی اور جب ایسے کچھ لوگوں کو پکڑا گیا تو انہوں نے اس بات کا اعتراف کرلیا کہ انہیں برٹش حکومت کے خاتمہ کا یقین ہوگیا تھا۔'' مجسٹریٹ نے قانون شکنی کرنے والوں کے خلاف سخت قدم اٹھائے اور شہر کے ہر آدمی پر جرمانہ عاید کردیا اور سبھی لوگوں سے اسلحے جمع کرالیے' کیونکہ انہوں نے اپنے اسلحوں کا استعمال قانون کی حفاظت کے لیے نہیں کیا تھا۔

کانگڑہ میں تعینات 41 ویں این آئی نے حکم ملتے ہی اپنے اسلحے جمع کرادیے۔ ان کا چال

چلن ہمیشہ سے نظم وضبط کا پابند تھا اور وہ ہمیشہ وفادار رہے۔ اگر سپاہیوں نے آپس میں 15/ تاریخ کو بغاوت کرنے کی سازش کر رکھی تھی تو بھی ان میں قیادت کی کمی تھی اور جو اکاؤ کا باغیانہ خیال رکھتے تھے' انہوں نے بھی اپنے آپ کو خاموشی کے ساتھ غیر مسلح ہونے دیا۔ البتہ بغاوت کی تاریخ کے دو دن پہلے بغیر کسی مزاحمت کے ملتان کو لے کر بے چینی بنی ہوئی تھی۔ کیونکہ ملتان سے سندھ اور بمبئی کو شاہراہیں جاتی تھیں۔ اور یہاں تعینات دو ہزار پوربیوں اور ایک ہزار ارریگولر' جن کی وفاداری پر شبہ تھا' کو ساٹھ یورپین فوجیوں کی مدد سے غیر مسلح کرنا ناممکن سمجھا گیا۔ میجر کرافورڈ چیمبرلین نے اس لیے مقامی افسروں کے ساتھ کھل کر بات چیت کی اور کچھ وقت کے لیے خطرہ ٹل گیا۔ لیکن 7/ جون کو جالندھر میں ہوئی بغاوت سے یہ شبہ اور پختہ ہو گیا۔ اس دوران بھروسے مند پنجابی فوجیوں کے آنے سے وفادار فوجیوں کی طاقت میں اضافہ ہو گیا۔ 9/ تاریخ کو انہیں غیر مسلح کئے جانے کا حکم دیا گیا۔ دو مشتبہ رجمنٹ کو جب ان کے پریڈ گراؤنڈ سے ہٹایا گیا تو انہوں نے اپنے کو دو طرف سے وفادار گھوڑ سوار اور یورپین آرٹلری کے درمیان گھرا ہوا پایا۔ "وہاں سے بھاگنا صرف پاگل پن ہوتا اور ذرا سی پس و پیش موت کا سبب ہوتی۔" اس لیے اسلحہ جمع کرانے کے حکم پر عمل کیا گیا اور ملتان کو بچا لیا گیا۔

پشاور' ہندوستان اور افغان کی سرحدوں سے ملا ہوا تھا۔ یہ ڈویژن پہلے افغان حکومت کا حصہ تھا۔ افغانستان کے حکمراں دوست محمد اسے رنجیت سنگھ کے ہاتھوں ہار چکے تھے۔ بعد میں دوسری سکھ حکومتوں کے ساتھ لارڈ ڈلہوزی نے اس پر قبضہ کر لیا تھا۔ مارچیز کے وارڈن اس وقت کرنل ہربرٹ ایڈورڈ تھے جو بہت باصلاحیت تھے۔ لیکن ان کا کام بہت مشکل تھا۔ گرچہ دوست محمد برٹش سفارت کاروں اور انگریزوں کے گولڈ کی وجہ سے جیت لیے گئے تھے' لیکن اس بات پر یقین مشکل تھا کہ وہ اپنے نقصان کو برداشت کر سکے ہیں یا نہیں؟ اس اندیشے کے وافر اسباب تھے کہ وہ اس مشکل کے وقت میں اپنے نئے رفقا کے ساتھ مل کر اپنے پرانے دعوے کو پھر سے زندہ کر دیں۔ آس پاس کی پہاڑیوں اور گھاٹیوں میں افغانوں سے ملتی جلتی جنگجو قوم رہتی تھی' جن کی زبان اور ثقافت بھی افغانوں سے ملتی تھی۔ لیکن ان کے قبیلوں کے اختلافات قومیت یا مذہبیت سے زیادہ پُراثر تھے۔ اور ہر خیل یا قبیلہ صرف اپنے آپ جنگ کے لیے کھڑا ہوتا یا مر جاتا۔ قانون ان کی نگاہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا' زندگی اور املاک کے تقدس کا تصور ان کے لیے لایعنی لفظ تھا۔ بنجر پہاڑیوں سے انہیں اپنی محنت کا معاوضہ بہت کم ملتا اور ہزاروں سال سے وہ اپنی کفالت کے لیے صرف تلواروں کے سہارے جی رہے تھے۔ لوٹ پاٹ میں وہ آسانی سے شامل ہو جاتے اور شاید وہ فوجیوں کی بغاوت کو خدا کا عطیہ سمجھتے۔ ان کے آباواجداد نے سکندر اعظم کی فوج کو بھی پریشان کیا تھا۔ مغل سلطنت کے لیے وہ ہمیشہ سر درد بنے رہے۔ اس لیے برٹش اسلحوں سے وہ خوف زدہ ہونے والے نہیں تھے۔ خاص طور پر اس وقت جب کہ شورش برپا ہو۔

ایڈورڈ کے پاس اس وقت 13 ہزار فوجی تھے جن میں سے تین ہزار یورپین تھے' باقی

فوجیوں میں سے اکثریت پوربیوں کی تھی۔ لیکن خلعتِ غلزئی میں جو پوربیہ رجمنٹ تھی، مکمل طور پر بھروسہ مند لوگ تھے۔ اور ان کے ساتھ ہی گارڈ کور اور پنجابی فوج بھی بھروسہ مند تھے۔ لیکن حالات خطرات سے پُر تھے۔ اور ایڈورڈ کو بہت عقلمندی سے قدم اٹھانا تھا۔ وہ کسی قسم کی بے چینی کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن کسی قسم کے غیر متوقع اشارے کو نظرانداز بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ایک طرف اسے اپنے فوجیوں پر نگاہ رکھنی تھی' تو دوسری طرف ہمہ وقت شرارت پر آمادہ قبائلوں پر بھی۔ ان کی غیر جانبداری کی یقین دہانی کافی نہیں تھی اور جہاں تک ممکن ہو' ان کی انگریزوں کے لیے فوجی تعاون کی یقین دہانی ضروری تھی۔ اس کی پہلی ضرورت تو اس گھاٹی کی حفاظت کا تیقن تھا۔ اس لیے ایڈورڈ نے اپنے ساتھیوں کی میٹنگ بلائی جس میں پشاور کے ڈپٹی کمشنر کرنل نکلسن' اس اسٹیٹ کے افسر کمانڈر بریگیڈیر سڈنی کاٹن اور پنجاب کے سب سے سینیئر ملٹری افسر جنرل ریڈ شامل تھے۔ کرنل نیول چمبر لین کو کوہاٹ بلایا گیا۔ یہ فیصلہ کیا گیا کہ پنجابی فوج کی کمان جنرل ریڈ سنبھالیں اور راولپنڈی کے چیف کمشنر سے جا ملیں۔ اور کرنل چیمبرلین کے ماتحت ایک چلتا پھرتا کالم بنایا جائے اور جن دور رجمنٹ پر ذرّہ بھی شبہ نہیں ہے ان کو مختلف جگہوں پر تعینات کر دیا جائے تاکہ وہ آپس میں مل کر کوئی مشترکہ کارروائی نہ کر سکیں۔ اس لیے 64ویں این آئی کو تین ٹکڑیوں میں بانٹ کر انہیں تین مختلف قلعوں میں تعینات کر دیا گیا۔ 55ویں کی دو کمپنیوں کو نوشیرہ میں چھوڑ کر باقی سب کو ہوتی مردان لے جایا گیا۔ تاکہ وہاں سے گائڈ کور کو چھٹی دی جا سکے۔ جنہیں حکم دیا گیا تھا کہ چلتے پھرتے کالم میں شامل ہو جائیں۔ 16ر مئی کو چیف کمشنر کے بلانے پر ایڈورڈ راولپنڈی کے لیے روانہ ہوا۔ 21ر تاریخ کو وہ واپس آیا جہاں اسے معلوم ہوا کہ پشاور کے ہندوستانی فوجی بھی قابلِ اعتماد نہیں رہ گئے ہیں۔ اس لیے اس نے فوری طور پر حکم دیا کہ 24ویں' 27ویں' 31ویں این آئی اور پانچویں لائٹ کیویلری کو غیر مسلح کر دیا جائے۔ ان کے خلاف کیا شبہ تھا' یہ تو نہیں جانا جا سکا لیکن یہ طے ہے کہ بہت سے افسروں کو اپنی رجمنٹ پر مکمل اعتماد تھا۔ اور جب 22ر مئی کو فوجی پریڈ گراؤنڈ پر جمع ہوئے تو انہیں یہ اندازہ نہیں ہو سکا کہ ان کا کیا حشر ہونے والا ہے۔ یہاں انہوں نے اپنے کو دو کالموں کے درمیان گھرا ہوا پایا۔ جوان کی طرف بندوق تانے ہوئے تھے۔ اور اس لیے انہوں نے بغیر کسی مزاحمت کے اپنے اسلحے جمع کرا دیئے۔ ان کے کچھ افسروں نے بھی احتجاج کے طور پر اپنے فوجیوں کی اس بے عزتی کے لیے اپنی تلواریں پھینک دیں۔ لیکن 51ویں کی ایک کمپنی رات کے اندھیرے میں بھاگ نکلی۔ بغاوت پر آمادہ یہ فرار قانونی طور پر ایک جرم تھا اور اس پر سزا ملنی تھی۔ اس لیے سبھی بھگوڑوں کے سروں کی قیمت طے کی گئی اور قبائلیوں کو آمدنی کی اچھی خاصی تفریح ہاتھ آ گئی۔ انہوں نے ان کا شکار کرنا شروع کر دیا۔ بعد میں قیدیوں کو سخت سزائیں دی گئیں۔ "یہ رحم دلی یا انصاف کا موقع نہیں تھا۔" کیو نے کہا:

55ویں این آئی کی کہانی اس سے تھوڑی مختلف ہے۔ اس رجمنٹ کے کچھ لوگ سندھ ندی کے داہنے کنارے خیر آباد میں حفاظتی ڈیوٹی پر تعینات تھے۔ فتح خاں خٹک' جو ایک وفادار

قبائلی تھا' وہ بھی اس وقت وہاں اپنی نئی وردی میں ڈیوٹی پر تھا۔ 21/مئی کو ختک لیڈر نے باغان' جو ندی کے مخالف سمت میں اٹک کا انچارج تھا' کو اطلاع دی کہ 55ویں این آئی کے ایک سپاہی نے اپنے ساتھیوں کو بھڑکایا ہے۔ لیفٹیننٹ لنڈ کو ندی کے اس پار سازشی کو سزا دینے کے لیے بھیجا گیا۔ اس کے بعد کیا ہوا ہمیں نہیں معلوم۔ لیکن صوبیدار اور اس کے کچھ آدمیوں نے اس کا حکم ماننے سے انکار کر دیا اور نوشیرہ کی طرف نکل گئے۔ راستے میں انہیں 24ویں این آئی کے کچھ لوگ ملے' جو کچھ سامان پشاور لے جا رہے تھے۔ شاید یہ لوگ اس وقت اپنے اسٹیشن پر نہیں تھے۔ جب کہ ان کے رجمنٹ کو غیر مسلح کیا گیا۔ اور یہ لوگ بھی 55ویں کے آدمیوں سے ساتھ ہو گئے۔ اس پارٹی کو نوشیرہ پہنچنے پر گرفتار کر کے 10ویں ارریگولر کے لوگوں نے غیر مسلح کر دیا۔ جب انہیں یورپین محافظوں کے سامنے لے جایا جا رہا تھا تو 55ویں کے کچھ لوگوں نے انہیں چھڑا لیا۔ اس کے بعد انہوں نے ندی پار کر کے ہوتی مردان جانے کی کوشش کی' جہاں اس رجمنٹ کے لوگ مقیم تھے۔ لیکن ناؤ کے پل کو توڑ دیا گیا اور صرف ایک یا دو سپاہی ہی دوسری طرف پہنچ سکے اور مردان میں اپنے ساتھیوں کو سارے واقعہ کی تفصیل بتائی۔ کرنل اسپارکس اڈ' جوان کا کمانڈر تھا' اس نے رجمنٹ سے نوشیرہ چھوڑنے کے لیے کہا۔ پھر وہ سب کیپٹن کیمران کی قیادت میں 22/ تاریخ کی رات میں وہاں سے روانہ ہوئے اور دوسرے دن صبح ہیڈ کوارٹر پہنچ گئے۔ ''اپنے افسروں کی وہ اسی طرح عزت کرتے رہے جس کی وجہ سے 58ویں کے افسروں نے یہ کہا کہ انہیں اپنے آدمیوں سے زیادہ 10ویں ارریگولر کیویلری کے سواروں سے زیادہ خطرہ ہے۔ ابھی تک ہوتی مردان میں 55ویں این آئی کے لوگوں میں بغاوت کا کوئی آثار نہیں دکھائی دیئے۔ 24/ کی رات میں 55ویں کے مقامی افسر اپنے کرنل کے پاس گئے اور جو کچھ ہو رہا تھا اس کی جانکاری حاصل کرنی چاہی۔ اس کے پاس کوئی جانکاری نہیں تھی اور اس کے رخصت ہونے کے بعد اس نے خودکشی کر لی۔ اس کے بعد 55ویں کے لوگ مردان سے نکل کر سوات کی طرف بھاگے۔ جب انہوں نے بھاگنا شروع کیا تو ان کے ساتھ بہت سے لوگ تھے۔ لیکن ان کے تعاقب میں نکلسن گیا اور اس نے سیکڑوں آدمیوں کو مار ڈالا اور 120 کو پکڑ لیا جنہیں عبرتناک سزائیں دی جانی تھیں۔ نکلسن نے فوراً ہی سکھوں اور نئے بھرتی ہوئے لوگوں کی مانگ کی۔ ایسا کہا جاتا ہے کہ سکھوں نے اپنے افسروں کو وقت سے پیشتر آگاہ کر دیا تھا کہ پوربیہ لوگ بغاوت کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ لیکن وہ دوسروں کے ساتھ کب شامل ہوئے اور کب 55ویں کے لوگ ہوتی مردان سے بھاگے' یہ کہیں نہیں بتایا گیا۔ سر جان لارنس بھی سبھی قیدیوں کو پھانسی دینے کے حق میں نہیں تھا۔ ''120 آدمیوں کو مارنا ٹھیک نہیں ہے۔ ہمارا مقصد تو انہیں سزائیں دے کر دوسروں میں خوف پیدا کرنا ہے۔ اور شاید ہمارا یہ مقصد ان میں سے ایک تہائی آدمیوں کو ختم کر کے پورا ہو جائے۔''

اس طرح پوربیوں کے 6 رجمنٹ کو ختم کر دیا گیا' اور پنجاب حکومت نے اپنی ساری قوت کمانڈر انچیف کو مزید کمک پہنچانے کے لیے وقف کر دی۔ لیکن سر جان لارنس کو اس بات میں شبہ

تھا کہ سبھی مقامی فوجیوں کے خلاف جنگ کرنے کی پالیسی، چاہے انہوں نے کوئی غلط کام کیا ہو یا نہ کیا ہو، مناسب نہیں لگی۔ ایڈورڈ کو لکھے خط میں وہ کہتا ہے: ''موجودہ حالات کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ ہر قدم جو ہم اپنی حفاظت کے لیے اٹھاتے ہیں، وہ ہمارے خلاف ہی جاتا ہے۔ اور پھر مزید اقدامات کیے جاتے ہیں اور یہ سلسلہ چلتا رہنا چاہیے جب تک کہ ہم اس رجمنٹ کو ختم نہ کر دیں یا برباد نہ کر دیں، یا وہ بغاوت کر کے اپنے افسروں کو مار ڈالیں۔''

64ویں کی تین کمپنیوں کو اس کے بعد ختم کیا جانا تھا۔ انہیں ابوزئی شہاب قادر اور مچھنی کے قلعوں میں تعینات کیا گیا تھا۔ چیوٹ اور نکلسن ان سب جگہ گئے اور کمپنی کو بغیر کسی مزاحمت کے غیر مسلح کر دیا گیا۔ اب ایڈورڈ اس بات کے لیے آزاد تھا کہ وہ پرانے فوجیوں سے لڑنے کے لیے نئے لوگوں کی بھرتی کرے۔ اس نے بڑی ہمت کے ساتھ ان قبائلیوں کو بلایا کہ وہ برٹش جھنڈے کے تلے جمع ہو جائیں۔ یہ ایک جوکھم بھرا تجربہ تھا جو آخر میں کامیاب ہوا۔ ان قبائلیوں کے دل میں انگریزوں کی کوئی عزت نہیں تھی جو اس کی پہاڑیوں کو روندر ہے تھے۔ لیکن لوٹ پاٹ کرنے کی ان کی فطرت غیر ملکیوں سے نفرت پر غالب آگئی تھی۔ ان قبائلیوں نے ہندوستان کی دولت کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا اور دلی اور لکھنؤ سے بڑے پیمانے پر لوٹ کا سامان پانے کی امید قوی ہو گئی تھی۔ صرف یہی سفید فام عیسائی تھے جو اسے اس خزانے تک پہنچا سکتے تھے۔ ایک بار جب وہ اپنے پہاڑوں سے اتر آئے تو ان آفریدی، خٹک اور مومند نے یہ محسوس کیا کہ اب ان کی خیریت اسی میں ہے کہ وہ اپنے نئے آقاؤں کے وفادار بنے رہیں۔ پرانے قبائلی جھگڑوں اور رقابت کی وجہ سے وہ اپنے پہاڑوں پر ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہے اور یہ امید نہیں تھی کہ وہ ہندوستان کے میدانی علاقوں میں آکر اپنے ان جھگڑوں کو بھول جائیں گے۔ یہ اس پالیسی کی بہت بڑی کامیابی تھی کہ ان شورش زدہ لوگوں کو ان کے اپنے ضلعوں سے ہٹا کر جہاں وہ اپنے آقاؤں کے لیے مستقل پریشانی کا باعث بنتے، پانچ ندیوں کے پار بھیجا جائے، جہاں ان کی جنگجو فطرت اور لوٹ مار کی عادت کو کھل کھیلنے کا موقع ملے۔ فوجی، لاہور، پشاور اور بنو تک برٹش اقتدار کا آلۂ کار بنتے گئے۔ جہاں پنجابی مسلم اور سکھ، کوہٹ اور یوسف زئی کے قبائلی ہندوستانی مسلمانوں اور غیر مسلموں کے خلاف متحد ہو گئے۔ سکھوں کے آس پاس کوئی لیڈر نہیں تھا، جس کے گرد وہ جمع ہو سکیں۔ رنجیت سنگھ کا جانشین اپنے مورثوں کی سرزمین میں موجود نہیں تھا اور بہت سے سکھ سردار اپنے فاتحوں کے اس بات کے لیے مشکور تھے کہ حکمراں گھرانے کو برباد کر دیا گیا۔ برٹش پالیسی نے ان منفرد سرداروں کے مفاد کی حفاظت کی پالیسی اپنائی تھی۔ جو لوگ حکمراں گھرانے سے بیزار ہو چکے تھے انہیں ایک اچھا موقع ہاتھ آگیا کہ وہ انگریزوں کا اس وقت ساتھ دیں۔ لیکن یہ سوچنا مناسب نہیں ہوگا کہ پنجاب میں برٹش حکام کو جن مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا وہ غیر مطمئن سپاہیوں کی وجہ سے تھا۔ رانگڑ اور دوسرے قبائلی جو دلّی کے آس پاس رہتے تھے، انہوں نے لوٹ پاٹ کی غرض سے اپنے اسلحے اٹھا لیے۔ لیکن حصار ریواری اور گڑگاؤں کی پنجابی آبادی نے بھی

باغیوں کی طاقت میں اضافہ کیا اور ان کے ساتھ کچھ سکھ سردار بھی شامل ہوئے۔

پہلی جون کو سر جان لارنس نے بنگال فوج کے ہندوستانی سپاہیوں کے نام ایک اعلانیہ جاری کیا۔ ''وہ سبھی رجمنٹ جو وفادار بنی رہیں گی انہیں ان کی مستقل مزاجی کی وجہ سے انعام دیا جائے گا۔ جو الگ ہو گئے یا بھاگ گئے' ان کی ملازمت ہمیشہ کے لیے ختم کر دی جائے گی۔ معینہ وقت گزرنے کے بعد پچھتاوا کسی کام کا نہیں رہے گا۔ اب بھی وقت ہے کہ آپ اپنی وفاداری کا اظہار کریں۔ برٹش حکومت کو کبھی مقامی فوجیوں کی کمی نہیں ہوگی۔ اپنے پنجاب سے ہی پچاس ہزار فوجیوں کی بھرتی کی جاسکتی ہے۔ اگر پوربیا فوجی موجودہ موقعے کو گنوا دیتے ہیں' تو پھر انہیں یہ موقع کبھی نہیں ملنے والا۔ پنجاب میں سبھی باغیوں کو کچلنے کے لیے وافر فوج موجود ہے۔ وہاں کے سردار اور عوام بھی بہت وفادار ہیں۔ اور وہ فوج میں آپ کی جگہ لینے کے متمنی ہیں۔ سبھی مل کر آپ کو برباد کر دیں گے۔ اس کے علاوہ فوجیوں کو ابھی انگلینڈ کی طاقت کا اندازہ نہیں ہے۔ ہر طرف سے انگریز فوجی ہندوستان آرہے ہیں...... '' لیکن بعد کے واقعات بتاتے ہیں کہ انتخاب کا یہ معاملہ سپاہیوں کے ہاتھ میں نہیں رہ گیا تھا۔ وہ کس طرف جائیں' اس کا فیصلہ بھی وہ خود نہیں کر سکتے تھے' بلکہ یہ راولپنڈی' لاہور اور پشاور کے حکمراں تھے' جنہیں اس بات کا اختیار تھا کہ انہیں فوج میں لیں یا نہیں؟ اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ اسلحے کے ساتھ ہندوستانی سپاہیوں پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ اور اس لیے انہیں اپنی پالیسی کو اس کے انجام تک پہنچانا تھا۔

پشاور ڈویژن میں جس مزید رجمنٹ کو ختم کیا جانا تھا وہ پشاور اور نوشیرا کی 10 ویں ارریگولر تھی۔ انہوں نے کوئی ایسا کام نہیں کیا تھا جس کی وجہ سے انہیں مجرم سمجھا جائے۔ لیکن انہوں نے 55 ویں کے باغیوں کو چھڑا لیا تھا اور ہوتی مردان سے بھگوڑوں کا تعاقب بھی پورے جوش کے ساتھ نہیں کیا تھا' اس لیے ان کی قسمت کا ہو چکا تھا۔ لیکن انہیں اس کی خبر نہیں تھی۔ یہ کام بہت کامیابی کے ساتھ 29/ جون کو دونوں جگہوں پر انجام پا گیا۔ اور 10 ویں ارریگولر کو بغیر کسی مزاحمت کے غیر مسلح کر دیا گیا۔ لیکن صرف تنخواہ اور پنشن کے نقصان کے علاوہ ان کی کردار کشی ہی سزا نہیں تھی۔ ان کے ساری املاک بھی چھین لی گئی۔ لائن کی تلاشی لی گئی اور ان کے سارے سامان کو سوائے ان کپڑوں کے' جو وہ پہنے تھے' سب کچھ چھین لیا گیا۔ حد تو یہ ہے کہ عورتوں اور بچوں کے زیورات اور کھلونوں کو بھی ضبط کر لیا گیا اور انہیں ناؤ میں بٹھا کر سندھ کے پار بھیج دیا گیا۔ انہیں زادِ راہ کے طور پر 400 روپے دیئے گئے تاکہ کسی طرح وہ اپنے گھروں کو چلے جائیں۔ ساتھ ہی انہیں اس بات کی تنبیہ بھی کی گئی کہ ان کے حرکت و عمل کی نگرانی کی جائے گی۔ اور اگر انہوں نے ذرا بھی مزاحمت کی تو ان کی جانیں لے لی جائیں گے۔

اس دوران چلتا پھرتا کالم آگے بڑھتا گیا۔ 21/ جون کو وہ جالندھر پہنچا۔ اس کے پہلے کمانڈر بریگیڈیر چیمبرلین کو ایڈجوٹنٹ جنرل بنا دیا گیا تھا اور ان کی جگہ پر بریگیڈیر کے رینک کے ساتھ نکلسن کی تعیناتی کی گئی' جس نے 35 ویں لائٹ انفنٹری اور 33 ویں این آئی کی کمان سے

انکار کر دیا۔ یہ دونوں رجمنٹ اب تک بالکل خاموش تھیں۔ لیکن 35 ویں پر کڑی نگرانی رکھی جا رہی تھی' اور 33 ویں کو ابھی تک کالم میں شریک نہیں کیا گیا تھا۔ یہ دونوں مل کر خطرہ پیدا کر سکتے تھے۔ اس لیے نکلسن نے فوراً فیصلہ کر لیا۔ یہ کالم پھلور میں پہنچی اور جب وہ قلعہ کی توپوں کے سامنے آگئے تو 35 ویں لائٹ انفنٹری کو غیر مسلح کر دیا گیا۔ اور جب 33 ویں وہاں پہنچی' تو انہوں نے بھی خاموشی سے اپنے ہتھیار ڈال دیئے۔ اس چالاکی سے تقریباً 15 سو مشتبہ باغی سپاہیوں کو 8 سو یورپین اور ایک درجن توپوں کے سامنے آسانی سے غیر مسلح کر دیا گیا۔ ایک قطرہ خون بھی نہیں بہا۔

لیکن ابھی اطمینان کی ساعت نہیں آئی تھی کیونکہ پنجاب ابھی پوربیوں سے خالی نہیں ہوا تھا۔ اب بھی وہاں پوربیوں کی 6 مسلح رجمنٹ تھیں۔ راولپنڈی میں 58 ویں این آئی تھی۔ جہلم میں 14 ویں این آئی' سیالکوٹ میں 46 ویں این آئی جس کے ساتھ نویں لائٹ کیویلری کی ایک ونگ تھی۔ جب کہ دوسری ونگ چلتے پھرتے کالم میں تھی۔ امرتسر میں 59 ویں این آئی تھی۔ کانگڑہ اور نور پور میں چوتھی این آئی اور گرداس پور میں دوسری ارریگولر کیولیری تھی اور سبھی مسلح تھے۔ جہلم' سیالکوٹ' کانگڑہ اور گرداسپور میں کوئی یورپین فوج نہیں تھی اس لیے یہ فیصلہ کیا گیا کہ پوربیہ رجمنٹ سے اسلحے لے کر بے ضرر کر دیا جائے۔ راولپنڈی اور جہلم کے فوجیوں کو ایک ساتھ غیر مسلح کیا جانا تھا۔ اس کام کو سہولت سے کرنے کے لیے 14 ویں این آئی کی دو کمپنیوں کا جہلم سے راولپنڈی تبادلہ کر دیا گیا تھا۔ اس دوران نکلسن سے کہا گیا تھا کہ وہ اپنے قدم پیچھے ہٹا کر اوپر کی طرف جائے۔ جالندھر سے وہ پھلور اور پھلور سے امرتسر گیا۔ 7/ جولائی کو ایسے موقعوں پر ہونے والی پریڈ راولپنڈی میں کرنے کا حکم دیا گیا۔ لیکن یورپین فوجیوں کی آمد اور آرٹلری کی موجودگی سے فوجی خوف زدہ ہو گئے اور انہوں نے اپنے آپ کو لائن میں بند کر دیا۔ وہاں پر 58 ویں کے لوگوں نے خاموشی سے اپنے اسلحے جمع کرا دیئے لیکن 14 ویں این آئی کے لوگ شہر کی طرف بھاگ نکلے۔ جن کا تعاقب گھوڑ سوار پولیس نے کیا' اور جو ان سے بچ کر بھاگ نکلے ان کے سر گاؤں والوں نے کاٹ لیے' کیونکہ ہر باغی کے سر کی قیمت مقرر کر دی گئی تھی۔

لیکن جہلم میں معاملہ اتنا آسان نہیں رہا۔ کبھی کبھار ہر طرح سے سوچا سمجھا منصوبہ بھی غلط ہو جاتا ہے۔ کرنل ایلس وہاں اپنی یورپین فوج کے ساتھ سورج نکلنے کے بعد پہنچا نہ کہ اس سے پہلے۔ اس کے آنے کے مقصد کو اس کے رفقاء سے بھی پوشیدہ رکھا گیا تھا۔ اور ان سب کو لفافہ بند آرڈر دیا گیا کہ وہ اسے اس وقت کھولیں جب وہ جہلم کے قریب پہنچ جائیں۔ لیکن اس طرح کا ڈرامہ اس سے پہلے بہت سی جگہوں پر کھیلا جا چکا تھا' اس لیے جب یورپین اور ملتانی فوجیں پریڈ گراؤنڈ پر دور سے نظر آئیں تو فوجی ان کے آنے کا مقصد سمجھ گئے۔ سبھی فوجیوں نے اپنے اسلحے اٹھا لیے اور لڑائی شروع ہو گئی۔ بندوقوں اور رائفلوں کے سامنے مسکٹ کا کوئی رول نہیں تھا۔ لیکن سارے دن سپاہی ناکام لڑائی لڑتے رہے۔ ان کے بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں رہ گیا تھا۔ ناؤ کے پل کو

ختم کر دیا گیا تھا اور جہلم کو پار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کچھ لوگوں نے ادھر ادھر کی ناؤوں کو پکڑا لیکن دوسری طرف وہ بھی دشمنوں کے ہاتھ میں پڑ گئے۔ ان پانچ سو فوجیوں میں سے جنہوں نے 7/ تاریخ کی صبح کرنل ایلیس سے لڑائی کی، مشکل سے پچاس بھی نہیں بچ سکے۔ 150 آدمی مقابلے میں مارے گئے اور 180 آدمیوں کو بعد میں پکڑ لیا گیا۔ 120 آدمی کشمیر کی طرف بھاگے لیکن وہ سب پکڑ لیے گئے۔ اور برٹش حکام کے سپرد کر دیئے گئے۔ اس طرح 14ویں این آئی کا خاتمہ ہو گیا۔

سیالکوٹ میں موجود نویں لائٹ کیویلری کے فوجیوں کو اس بات کی اطلاع مل چکی تھی۔ انہوں نے جہلم کی لڑائی کے بارے میں سنا تھا۔ لیکن یہ نہیں جانتے تھے کہ وہ ختم کیسے ہوئے۔ انہیں اس بات کی بھی اطلاع تھی کہ نکلسن پھلور گیا ہوا ہے۔ جہلم کی خبر سیالکوٹ کے ڈپٹی کمشنر کو 8/ تاریخ کو مل گئی۔ اس نے فوراً ہی یہ اطلاع بریگیڈیر برنڈ، جو اس اسٹیشن کے کمانڈنگ افسر تھے، کو دی۔ یہ کیویلری کے ہی لوگ تھے جنہوں نے بغاوت شروع کی۔ ڈاکٹر بٹلہ کا کہنا ہے کہ تقریباً 4 بجے رات میں اس سے کہا گیا کہ میں سواروں کو دیکھوں جو کھلی بغاوت پر آمادہ تھے۔ اور کینٹ کے علاقے میں جو بھی یوربین نظر آیا اسے مار رہے تھے۔ وہ لوگ بھی اس میں مارے گئے جنہیں انگریزوں کا دوست سمجھا جاتا تھا۔ لیکن 46ویں این آئی کے لوگ اپنے افسروں کے تئیں وفادار رہے۔ انہوں نے اپنے افسروں کو رجمنٹل کوارٹر گارڈ میں پناہ دی اور رات کے وقت انہیں اور ان کے خاندان والوں کو نہ صرف بحفاظت قلعے کے اندر پہنچایا بلکہ سیالکوٹ روانہ ہونے سے پہلے انہوں نے انہیں پیسے بھی دیئے۔ شام کے تقریباً چار بجے باغی ہشیار پور کے لیے روانہ ہو گئے اور اپنے ساتھ ایک پرانی سنگل بندوق بھی لے گئے جو نکلسن سے مڈبھیڑ کے وقت ان کے لیے بہت مددگار ثابت ہوئی۔

سیالکوٹ میں بغاوت پھیلنے سے ایک دن قبل نکلس نے امرتسر میں 59ویں این آئی کی پریڈ کرائی اور ان کے نیک چال چلن کے لیے ان کی بہت تعریف بھی کی۔ اور انہیں یقین دلایا کہ انہیں غیر مسلح کیے جانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ لیکن جہلم کی خبر نے ان کا بھی فیصلہ کر دیا۔ دوسرے دن صبح 9/ جولائی کو ان کی پھر پریڈ کرائی گئی اور یہ کہا گیا کہ کچھ لوگوں کو پھانسی دیئے جانے کا منظر انہیں دکھایا جائے گا۔ جب ان لوگوں کو پھانسی لگ گئی تو 59ویں کے لوگوں کو اچانک حکم دیا گیا کہ وہ اپنے اسلحے جمع کرا دیں۔ "ان کے سامنے اور چاروں طرف سے یوربین فوجی اور بندوقیں لگی ہوئی تھیں چنانچہ انہوں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اپنے ہتھیار جمع کرا دیئے۔ اگر وفاداری کے کسی ثبوت کی ضرورت ہوئی تو وہ ہر طرح سے وفادار رہے کیونکہ لائنس واپس آنے کے بعد انہوں نے سات سو مزید مسکٹیں اپنے افسروں کو واپس کر دیں۔ دوسرے دن صبح نویں کیویلری کی باری تھی جو ابھی تک چلتے پھرتے کالم کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ انہیں حکم دیا گیا کہ وہ بغیر وردی اور اسلحے کے جمع ہو جائیں اور انہیں بتایا گیا کہ سیالکوٹ کے لوگوں نے کیا کیا ہے۔ پھر ان کے بھی اسلحے جمع کرا لیے گئے۔

اس کے بعد نکلسن سیالکوٹ کے لوگوں کے تعاقب میں نکلا۔ اپنے لوگوں کو زبردستی مارچ کراتے ہوئے وہ 11ر تاریخ کو گرداسپور پہنچا۔ دوسرے دن صبح اسے معلوم ہوا کہ یہاں سے دس میل کے فاصلے پر باغی سب تریمو گھاٹ پر جمع ہو گئے ہیں۔ تھوڑی سی جھڑپ کے بعد سارے باغی ندی کی طرف پیچھے ہٹ گئے لیکن نکلسن کے آدمی اتنے تھکے ہوئے تھے کہ ان کے تعاقب میں نہیں جاسکے۔ لیکن قدرت بھی جنرل کا ساتھ دے رہی تھی۔ اچانک ندی میں طغیانی آگئی اور سارے بھگوڑے ایک چھوٹی سی خشکی میں گھر گئے۔ جس نے رات بھر میں جزیرے کی شکل اختیار کرلی۔ یہاں ان سب کو ختم کر دیا گیا۔ جب آرٹلری کے لوگ ساحل پر مشغول تھے، نکلسن نے اس جزیرے کو خاموشی سے پار کرلیا۔ اس طرح سیالکوٹ بریگیڈیر ختم ہو گئی۔

دسویں لائٹ کیویلری ابھی تک وفادار رہی۔ انہوں نے نابھا کے راجا کی سرحد میں ہوئی بغاوت کو کچلنے میں بہت مؤثر رول ادا کیا تھا۔ لیکن جہلم اور سیالکوٹ کے واقعے کے بعد کسی مسلح ہندوستانی پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا تھا چاہے وہ کتنا ہی وفادار رہا ہو۔ اور یوربیوں کے لیے اب اپنی وفاداری ثابت کرنا ناممکن ہو گیا تھا۔۔10ویں کو غیر مسلح کیا گیا لیکن کچھ وقتوں کے لیے ختم نہیں کیا گیا۔

کانگڑہ اور نور پور میں موجود چوتھی این آئی کا اپنا فلسفیانہ نظریہ تھا۔ جب کانگڑہ میں ان سے اسلحہ جمع کرانے کو کہا گیا تو انہوں نے فوراً اپنے اسلحے دے دیئے۔ سپاہیوں کو یہ یقین دہانی کرائی گئی کہ ان کے چال چلن پہ کوئی شبہ نہیں ہے لیکن ہتھیاروں کو جمع کرانے کے بعد دوسرے باغی فوجیوں کا ان پر کوئی اثر نہیں ہو پائے گا۔ انہوں نے جواب دیا "ان کے اسلحے جو سرکار کی املاک ہیں' وہ اپنے افسروں کے کہنے پر اسے جمع کرانے کے لیے راضی ہیں۔ لیکن انہیں صرف اس بات کا افسوس ہے کہ اس کے لیے طاقت کا مظاہرہ کرنا پڑا۔" نور پور کی فوج ان سے بھی زیادہ تیار تھی وہ اپنے ہتھیار اپنے کمانڈر میجر ولکی کے بنگلہ میں لے گئے جو قلعے سے ایک میل کے فاصلے پر تھا۔ اس طرح سے یہ دور پورا ہو گیا۔ سوائے "خلعت غلزئی" کے پورے پنجاب میں موجود پوربیہ رجمنٹ کو غیر مسلح کر دیا گیا۔ چاہے ماضی میں ان کا ریکارڈ کتنا ہی شاندار کیوں نہ رہا ہو۔ لیکن انسان صرف اعداد و شمار نہیں ہیں۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ایک طرح کے ماحول میں دو شخص کس طرح سے عمل کریں گے۔ چوتھی این آئی نے اس میں اپنی کوئی بے عزتی نہیں سمجھی کہ ان سے اسلحہ جمع کرایا جا رہا ہے جبکہ 14ویں اور 46ویں نے صرف اسی خیال سے بغاوت کر دی۔

ہندوستانی فوجی اسلحوں کے ساتھ خطرہ تھے جب کہ غیر مسلح ہونے کے بعد وہ ایک مسئلہ بن گئے۔ انہیں نہ تو چھوڑا جاسکتا تھا اور نہ اس بات کی اجازت دی جاسکتی تھی کہ وہ اپنے گھروں کو جائیں۔ لیکن پنجرے میں قید ایک چڑیا بھی اپنی آزادی چاہتی ہے۔ 30ر جولائی کو غیر مسلح کیے گئے 26ویں این آئی نے اپنے کیمپ میاں میر میں اپنے کو بند کرلیا۔ ان کے پاس سوائے چاقوؤں کے اور کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ لیکن ان کی تعداد ازیادہ تھی۔ وہ میجر اسپنسر پر جھپٹ پڑے اور جو مداخلت

کرنا چاہتا تھا۔ اسے جان سے مار ڈالا۔ جو سر جن میجر اس کی مدد کو آیا اسے بھی مار دیا گیا۔ اگر اب بھی کچھ لوگوں میں ہچکچاہٹ تھی تو سکھوں کے بغیر کسی تفریق کے گولی چلانے سے قتل کا یہ سلسلہ اور زیادہ بڑھ گیا۔ بعد میں اچانک آئی آندھی سے انہیں ایک پناہ مل گئی اور یہ جاننا مشکل ہو گیا کہ وہ کدھر بھاگیں۔ دوسرے دن ایک گاؤں میں ان کی موجودگی کی اطلاع انبالہ کے تحصیلدار کو ملی' جس نے پولیس فورس کے ساتھ ان پر فوری طور پر حملہ کر دیا۔ غیر مسلح اور بھوک سے تنگ یہ بے چارے بھگوڑے اپنا دفاع نہیں کر پائے اور تقریباً ڈیڑھ سو آدمیوں کو مار دیا گیا۔ اس سے پہلے کہ فریڈرک کوپر امرتسر کا ڈپٹی کمشنر موقع پر کچھ گھوڑ سواروں کے ساتھ پہنچے۔ اس نے انہیں ''جنگلی پرندوں کی طرح بھاگتے ہوئے ایک جزیرے میں اپنی موت کا انتظار کرتے ہوئے پایا۔'' فوراً ناؤ کا انتظام کیا گیا اور گاؤں والے ان کے ہاتھ پیچھے باندھ کر انہیں کنارے لے آئے۔ کچھ لوگ پھانسی کے پھندے سے تو بچ گئے لیکن ندی میں کود کر اپنی جانیں دے دیں۔ جو باقی 280 بچے تھے انہیں انبالہ لے جایا گیا۔ ڈپٹی کمشنر نے ان مجرموں کو پھانسی پر لٹکانے کے لیے رسے منگائے۔ کوپر کی نگاہ میں یہ سارے قیدی قاتل تھے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ ان سب کو مار دینا چاہیے۔ لیکن جب رسے آئے تو وہ ان سب کو پھانسی میں لٹکانے کے لیے کافی نہیں تھے۔ اس لیے باقیوں کو گولیوں سے بھون دیا گیا۔ باقی کی کہانی انبالہ ہیرو کی زبانی ''جب 150 آدمیوں کو پھانسی دے دی گئی تو پھانسی دینے والا ایک شخص بے ہوش ہو گیا۔ اس لیے کچھ وقفہ دیا گیا۔ اب بھی 230 آدمی بچ گئے تھے۔ اور ضلع کے افسر کو اطلاع دی گئی کہ باقی لوگ اپنے کوٹھریوں سے جہاں وہ چند گھنٹوں کے لیے انہیں قید کیا گیا تھا' نکلنے سے انکار کر رہے ہیں۔ یہ امید کی جا رہی تھی کہ یہ سب مزاحمت کریں گے اور بھاگ نکلیں گے۔ چنانچہ ان کے بھاگنے کے سارے راستے مسدود کر دیئے گئے اور پھر جب دروازہ کھولا گیا تو نظر آیا کہ تقریباً سبھی مر چکے تھے۔ لاشعوری طور پر ہو دیل کے بلیک ہول کی کہانی دوبارہ دوہرا دی گئی تھی۔ رات میں کسی کی کوئی چیخ پکار نہیں سنائی دی تھی۔ 45 ایسی لاشوں کو جو گرمی' تکان' خوف اور دم گھٹنے سے مر چکے تھے' انہیں باہر گھسیٹا گیا اور دوسری لاشوں کے ساتھ گاؤں کے جاروب کشوں کے ذریعے ایک گڈھے میں دفنا دیا گیا۔''

کوپر کا کہنا ہے کہ اس کا انصاف پر مبنی یہ کام گاؤں والوں کی نظر میں ادھورا رہتا' اس لیے اس نے اتنے آدمیوں کو مارنے کی وجہ انہیں سمجھائی۔ اور آخر میں گاؤں والے برٹش حکومت کی انصاف پسندی کی داد دینے لگے۔

صرف پنجاب کے عوام کی تائید سے مطمئن نہ ہو کر کوپر نے اپنے ملک کے ان انسان پرستوں کو بھی جو اس کی اس بربریت کی مذمت کرتے تھے' انہیں بھی مختلف دلائل سے سمجھانے کی کوشش کی۔ اس کے اس عمل کی فوری طور پر سرکاری منظوری بھی مل گئی۔ ''میں تمہیں 26 ویں این آئی کے خلاف کامیابی پر مبارکباد دیتا ہوں۔ تم نے اور تمہاری پولیس نے جو پُر جوش کام کیا ہے' اس کی حکومت تعریف کرتی ہے۔'' سر جان لارنس نے لکھا۔ ان سے بھی زیادہ

بڑھ کو کوپر کی کامیابی کی تعریف کرنے والے رابرٹ منٹگمری نے کہا "ہر طرح کی ستائش تمھیں اور تمھارے اس کام کے لیے ہے اور تاعمر تمھاری یہ کامیابی سنہرے حرفوں سے لکھی جائے گی۔"
اس نے آگے لکھا۔ "یہاں موجود تین اور رجمنٹ تذبذب میں ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ وہ بغاوت نہیں کریں گے۔ جبکہ میں چاہتا ہوں کہ وہ کریں۔ کیونکہ وہ ہمارے لیے سر درد بن گئے ہیں۔ اگر وہ بغاوت کرتے ہیں تو ان میں سے ایک آدمی بھی زندہ نہیں بچے گا۔"

لیکن وہ ساری رجمنٹس جو یہ سمجھتی تھیں کہ ان کے ساتھ زیادتی کی گئی ہے وہ 26ویں این آئی کے اس سانحے سے خوفزدہ نہیں ہوئی۔ 10ویں کیویلری کو کمانڈر انچیف نے ان کی وفاداری اور نیک چال چلن کے لیے مبارکباد دی تھی۔ تاہم انہیں بھی غیر مسلح کر دیا گیا تھا کیونکہ کچھ لوگ وفادار نہیں سمجھے گئے تھے۔ جب انہیں غیر مسلح کیا جا رہا تھا تو بریگیڈیر نے انہیں یہ یقین دلایا تھا کہ وقت آنے پر ان کے رجمنٹ کو سب سے پہلے اسلحے واپس کر دیے جائیں گے۔ ان کے گھوڑے جو فوجیوں کی ذاتی ملکیت تھے سرکار نے نہیں دیئے تھے۔ سرکار کو نئے بھرتی کیے جانے والے فوجیوں کے لیے گھوڑوں کی ضرورت تھی اس لیے اس نے ان گھوڑوں کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ پہلے تو صرف 100 'بعد میں 50 اور گھوڑے جو 10ویں کیویلری کے فوجیوں کی ملکیت تھے' سرکار نے اپنی تحویل میں لے لیے۔ اور پھر اگست میں حکم آیا کہ باقی سارے گھوڑوں کو بھی لے لیا جائے۔ بریگیڈیر انس نے لاہور کے حکام کو اس فیصلہ پر نظر ثانی کرنے کو کہا کیونکہ ان سے گھوڑوں کا چھینا جانا ان کی دوہری بے عزتی تھی۔ 18/ تاریخ کو سرکار کا آخری حکم فیروز پور میں پہنچا اور 19 تاریخ کو غیر مسلح 10ویں کیویلری نے بغاوت کر دی۔ اسلحوں کو چھیننے کی ان کی کوشش تو ناکام ہوئی لیکن سوائے 150 فوجیوں کے باقی سارے اپنے گھوڑوں پر لاپتہ ہو گئے۔ اور بحفاظت وہاں سے نکل گئے۔

فیروز پور کے واقعہ کے بعد سے یہ کہانی 51ویں کے غیر مسلح فوجیوں نے پشاور میں دوہرائی۔ یہاں حکام نے چھپے ہوئے اسلحوں کے لیے لائنس کی تلاشی لی۔ 27ویں این آئی نے کوئی مزاحمت نہیں کی لیکن 51ویں کے لوگ اٹھ کھڑے ہوئے۔ فوراً ہی خطرے کی گھنٹی بجائی گئی۔ اور افغانی 'فوجیوں پر ٹوٹ پڑے۔ سپاہیوں نے کچھ تلواروں اور مسکٹس کی بدولت شدت سے جنگ کی۔ لیکن قاتلوں کی بندوقوں اور رائفلوں کے سامنے وہ نہیں ٹک سکے۔ یہ رجمنٹ پوری طرح برباد ہو گئی۔ "ان 870 آدمیوں میں سے جو 28/ تاریخ کو 51ویں این آئی میں شامل ہوئے تھے' 48 گھنٹوں میں صرف 70 بچ سکے اور کچھ دنوں بعد حکام نے یہ اطلاع دی کہ ان 70 میں سے بھی 19 بھوکے بھگوڑے آس پاس کی پہاڑیوں میں دکھائی دیئے۔"

پنجاب میں اب مقامی سپاہی خطرے کا سبب نہیں رہ گئے تھے۔ ایڈورڈ نے پشاور کو شانت کر دیا تھا۔ لیکن حکام اپنی بے چینی کو دور نہیں کر سکے۔ وہ اپنے نئے دوستوں پر زیادہ بھروسہ نہیں کر سکتے تھے۔ اور یہ جانتے تھے کہ ان کی وفاداری اور غیر وفاداری میں تھوڑا سا ہی فرق ہے۔ انہیں

خطرہ تھا کہ پنجابی مسلمان، سکھ، ملتانی اور قبائلی کبھی بھی ذرا سی غلطی پر بھی اپنے عیسائی حکام کے بالمقابل متحد ہو کر کھڑے ہو جائیں گے۔ حد تو یہ ہے کہ تجارت پیشہ لوگ جو برٹش حکومت کی سختی کی بنا پر کافی منافع کما چکے تھے، وہ سرکار کو قرض دینے سے ہچکچا رہے تھے۔ پشاور کے بینکرس نے صرف 15 ہزار روپے بطور قرض سرکار کو دیئے جب کہ ایڈورڈ انہیں مجبور کر رہا تھا کہ وہ 5 لاکھ جمع کرائیں۔ لیکن حکام کے سخت اقدام، جو انہوں نے پہلے دن سے کیا تھا، کے باوجود اب بھی پنجاب میں شورش نہیں ختم ہوئی تھی۔ پہلی ستمبر کو کچھ قبائلیوں نے مری پر حملہ کیا لیکن ان سے پہلے پولس کو ان کے ارادے سے باخبر کر دیا گیا تھا۔ اس لیے انہیں واپس جانا پڑا۔ اس نئی بغاوت کا سردار احمد خاں تھا جو کُھرل قبیلہ کا سردار تھا۔ ان کے ساتھ کچھ اور جنگجو قبائلی مل گئے اور کچھ دنوں کے لئے انہوں نے ملتان اور لاہور کے بیچ مواصلاتی ذرائع کو ٹھپ کر دیا تھا۔ ملتان میں فوجیں کم تھیں اور وہ اچانک پیدا ہوئے اس خطرے سے مقابلے کے لیے نہیں بھیجی جاسکتی تھی۔ باغیوں نے گوگیرہ کے جنگلوں پر قبضہ کر لیا تھا، انگریزوں کے خلاف انہیں کچھ کامیابی بھی ملی۔ میجر چیمبرلین نے اپنے کو ایک چھوٹی سی سرائے میں محصور کر لیا۔ ملتان سے فوری مدد کی امید نہیں تھی۔ سر جان لارنس نے فوراً ہی پنجاب کیویلری کو بھیجا۔ 28 ستمبر کو ملتان سے آئی ایک اور چھوٹی سی ٹکڑی بھی ان سے مل گئی۔ اور چیمبرلین کو چچاوتنی سرائے سے آزاد کرالیا گیا۔ اب انگریزوں کے حملے کی باری تھی۔ لیکن جنگجو قبائلی جنگلوں میں محفوظ جگہوں سے ان پر حملہ کرتے رہے۔ احمد خاں کی موت سے بھی یہ لڑائی ختم نہیں ہوئی۔ باغیوں کو ایک نیا رہنما میر بہاول فتوانا کی شکل میں مل گیا۔ لیکن چاروں طرف سے گھر جانے کی وجہ سے یہ باغی اپنے مقامی جنگل کے وسط میں پناہ گزیں ہو گئے۔ لیکن برٹش فوجیوں نے ان کا ٹھکانہ ڈھونڈ لیا اور ان سب کو ختم کر دیا۔

لارنس اور اس کے ساتھیوں نے پنجاب میں امن کے قیام کے لیے جان کی بازی لگادی تھی اور انہوں نے پنجاب کو یورپین فوجیوں سے بھر دیا۔ تاکہ دلّی کی رج تک یورپین فوجی موجود رہیں۔ وہ جانتے تھے کہ ہندوستانی فوجی برٹش مفاد کے لیے زیادہ کار آمد نہیں ہوں گے۔ تاہم انہوں نے فوج میں صرف ان کی تعداد بڑھائی جب ان کے پاس فوجی ختم ہو رہے تھے۔ اور پھر انہوں نے قبائلی سرداروں میں پھوٹ ڈال دی۔ تاکہ وہ ایک ساتھ کبھی فرنگیوں کے خلاف نہ کھڑے ہو سکیں۔ لیکن ہندوستان کو بچانا تھا اس لیے اس نے خزانے کو پنجاب اور پشاور سے بھرنے کے لیے ہر ممکن تدبیر کی۔ جب ان کی شہنشاہیت تقریباً ختم ہو رہی تھی تو لارنس اسے بچانے کے لیے ہر قیمت دینے کو تیار تھا۔ اس نے یہ بھی مشورہ دیا تھا کہ پشاور کو چھوڑ دیا جائے اور سرحدی صوبوں میں جو فوجی ہیں انہیں ہندوستان میں تعینات کر دیا جائے اور دوست محمد سے کہا جائے کہ جو علاقہ اس کا پہلے تھا، اس کو آکر دوبارہ قبضہ کر لے۔ لیکن ایڈورڈ نے اس کی سخت مخالفت کی اور لارنس یہ عظیم قربانی دینے سے بچ گیا۔ جو آدمی اس نے بھیجے اور جو رسد اس نے بہم پہنچائی اس کی وجہ سے پلڑا اس کی طرف جھک گیا۔

## باب دهم

# آخری مرحلہ

لکھنؤ پر قبضہ کرنے اور شمالی مغربی صوبوں سے شورش کو دور کرنے کے بعد سر کولن کیمپبل اب اس حالت میں آگئے تھے کہ وہ اپنے فوجیوں کو روہیلکھنڈ کی طرف لگائیں جہاں ایک باغی حکومت جون 1857ء سے قائم تھی۔ شروع سے ہی روہیلکھنڈ کا علاقہ جنگجو قوموں کے لیے ابتدائی مشق کا اسکول رہا تھا۔ یہاں سے مشرق سے اپنے آبائی وطن سے مہاجرت کر کے کیتھریا راجپوت آگئے تھے جن کی وجہ سے اس علاقہ کا نام کیتھر پڑ گیا تھا۔ اور روہیلہ جو اس علاقہ میں نووارد تھے' انہوں نے بھی کیتھر کو سترہویں صدی کے خاتمے پر اپنا وطن بنالیا تھا۔ البتہ انیسویں صدی کے آغاز میں ان بہادر پٹھانوں کا یہ علاقہ برٹش صوبہ ہو گیا۔ 1774ء میں وارن ہسٹنگز نے اودھ کے نواب کو فوجی مدد پہنچائی تھی جس کے عوض میں اودھ کے نواب کو انگریزوں کو چالیس ہزار روپے دینا پڑے تھے اور انگریزی فوج نے نواب کے لیے روہیلکھنڈ کا علاقہ فتح کیا۔ لیکن 1801ء ہی میں نواب نے روہیلکھنڈ کا علاقہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو دے دیا۔ اور وقت گزرنے کے ساتھ ہی یہ ایک کمشنری کا ڈویژن ہو گیا' جس کا صدر مقام بریلی تھا۔ اس کمشنری میں پانچ ضلع شامل تھے۔ بریلی' مراد آباد' شاہجہاں پور' بدایوں اور بجنور۔

مئی 1857ء میں تین مقامی رجمنٹ' 8ویں ارریگولر کیولری' 18ویں اور 68ویں این آئی اور آرٹلری کی ایک ہندوستانی بیٹری بریلی کینٹ میں موجود تھی۔ بریگیڈیر سبالڈ اس اسٹیشن کا کمانڈر تھا اور دوسرا نمبر کرنل کولن ٹروپ کا تھا جس کی وجہ سے لیفٹیننٹ گورنر کالون نے اپنا بدنام زمانہ اعلانیہ جاری کیا تھا۔ مئی کے آخری ہفتہ تک بریلی میں کسی قسم کا کوئی فتنہ نہیں پیدا ہوا۔ شہر کے سرکردہ شہریوں نے شہر میں امن وامان قائم رکھنے کے لیے اپنی خدمات پیش کیں اور ان کے رہنما خاں بہادر خاں روز کمشنر الگزنڈر سے ملاقات بھی کرتے۔ یہ بھی سمجھا گیا تھا کہ راجپوت ٹھاکروں اور روہیلہ سرداروں کی آپسی رقابت کی وجہ سے شہر میں ہر صورت میں امن وامان میں مدد ملے گی۔ مئی کے شروع میں کیولری کے رسالدار میجر محمد شفیع نے بریگیڈیر کو یہ یقین دلایا تھا کہ کیولری ہر صورت میں وفادار بنی رہے گی۔ اور اگر انفینٹری میں کوئی شورش پیدا ہوتی ہے تو اسے سختی سے کچل دیں گے۔ سبھی خواتین کو اپریل میں ہی نینی تال بھیج دیا گیا تھا۔

دوربیں نگاہوں نے مارچ کے شروع میں ہی سپاہیوں کے رویے میں تبدیلی محسوس کرلی

تھی۔ دُرگا داس بندو پادھیائے کیویلری کے ایک کلرک 'نے اپریل میں سپاہیوں کی بات چیت اور رویے میں سختی محسوس کی تھی۔ اس کا کہنا ہے کہ اپریل میں ہی چربی سے بنے کارتوس کی خبر کینٹ میں پھیل گئی تھی اور اس نے اس کے بارے میں حکام کو اطلاع کر دی۔

بے چینی کی پہلی علامت مراد آباد میں 19 مئی کو ظاہر ہوئی جب 29ویں انفینٹری کے کچھ لوگوں نے جیل کو توڑ دیا۔ 21 / مئی کو بریگیڈیر سبالڈ اور کمشنر الگزنڈر نے فوجیوں اور ان کے افسروں سے بریلی میں بات کرتے ہوئے ان سے کہا کہ وہ اپنے مذہب کے بارے میں سارے خوف و شبہات کو دور کر دیں۔ اور انہیں یہ یقین بھی دلایا کہ ان کی طرف سے سرکار کے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ اس بات چیت سے بظاہر وہ مطمئن ہو گئے۔ اور بریگیڈیر سبالڈ نے اس کے بعد شمالی مغربی صوبوں کی سرکار کو خط لکھا۔ بات چیت کے دوران فوجیوں نے جس طرح سے وفاداری کا اظہار کیا اس سے میں بہت خوش ہوں اور مجھے یقین ہے کہ جب بھی ان کی ضرورت پڑے گی، وہ ہمیشہ وفاداری کے ساتھ خدمت کریں گے۔ 29 / تاریخ کو کرنل ٹروپ کو بتایا گیا کہ انفینٹری رجمنٹ دوسرے دن دو بجے بغاوت کر دے گی۔ اور اپنے سارے یورپین افسروں کو مار دے گی۔ اُسے اب بھی 8ویں اِرریگولر کیویلری کی وفاداری پر کوئی شک نہیں ہے۔ 30 / تاریخ کو کچھ بھی نہیں ہوا۔ اور 31 / کی صبح بھی ہر طرف امن و امان قائم تھا۔ لیکن جب رجمنٹ کے گھڑیال نے گیارہ بجائے، بندوقیں چلنے لگیں، مسکٹس چلنے لگیں اور لائن اور افسروں کے مکانوں میں آگ لگ گئی۔ بریگیڈیر فوراً کیویلری لائن کی طرف لپکا۔ اسے سینے میں گولی لگی۔ لیکن وہ وہیں نہیں مرا بلکہ وہ اپنی جگہ پر پہنچ کر مرا۔ کرنل ٹروپ کو کیویلری پر کوئی یقین نہیں تھا۔ اس لیے وہ نینی تال کی طرف نکل گیا۔ ان کے کمانڈنگ افسر کیپٹن میکنزی کو اب بھی ان کی وفاداری پر یقین تھا۔ اس نے اپنی رجمنٹ کی ایک ونگ کو انفینٹری کے ساتھ دیکھا اور جب سبز پرچم لہرایا گیا تو اس نے ان سے بات چیت کرنی چاہی۔ لیکن کسی بات پر اسے غصہ آگیا اور وہ بھی دوسرے افسروں کی طرح نینی تال کی طرف بھاگ نکلا۔

درگا داس بندو پادھیائے نے ان واقعات کی جو تفصیل پیش کی ہے، وہ اس سے کچھ مختلف ہے۔ لیکن وہ ان واقعات کی عینی شہادت کے بارے میں کوئی دعویٰ نہیں کرتا۔ بغاوت کے بارے میں اسے کچھ بھی نہیں پتہ تھا۔ گرچہ یہ اتوار کا دن تھا، وہ ماہانہ اکاؤنٹ لے کر ایڈجوٹنٹ کے بنگلہ پر صبح ساڑھے دس بجے پہنچا۔ لیکن وہاں لیفٹیننٹ باشر نہیں ملے۔ اس کے بعد ہی گولی کی آواز سنائی دی۔ اور اسے یقین ہو گیا کہ جس خطرناک وقت کا انتظار تھا وہ آگیا۔ اس نے سن رکھا تھا کہ یورپین افسروں کو آنے والے واقعات کے بارے میں پہلے سے خبر کر دی گئی تھی اور وہ سب کیویلری لائن کے پاس 20 بھروسے مند مقامی افسروں کے ساتھ آموں کے باغ میں ساڑھے دس بجے ملنے والے تھے۔ کیویلری کے لوگ آموں کے باغ کی طرف یورپین فوجیوں کے ساتھ ملنے کے لیے روانہ ہوئے۔ لیکن جیسے ہی وہ وہاں پہنچے یورپین ڈر گئے اور انہوں نے اپنے گھوڑوں کو نینی تال کی

طرف موڑ دیا۔ جب رسالدار میجر محمد شفیع وہاں پہنچا تو یورپین آدھا میل دور نکل چکے تھے۔ اور جب اس نے اپنی رفتار تیز کر ان تک پہنچنے کی کوشش کی تو انہوں نے بھی اپنی رفتار تیز کر دی۔ شفیع کو احساس ہوا کہ اس کے ارادوں کو غلط سمجھا گیا ہے۔ اس لیے اس نے لال رومال لہرا کر انہیں اشارہ کرنا چاہا لیکن افسروں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ اس لیے وہ اس کے دوستانہ اشارے کو نہیں سمجھ سکے۔ اس نے اب سوچا کہ کیا کریں۔ اگر وہ آگے بڑھتا ہے تو وہ گولی بھی چلا سکتے ہیں۔ اور وفادار فوجی پھر ان کو نہیں بخشیں گے۔ اس لیے وہ واپس مڑا اور باغیوں کے ساتھ مل گیا۔ کیونکہ اس کے پاس اپنی فوج کو تنخواہ یا رسد دینے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ ڈرگا داس نے یہ بات خود محمد شفیع کی زبانی سنی تھی۔ بہر حال کچھ بھی ہو، لیکن کیویلری کے لوگوں نے بھاگنے والوں کا تعاقب نہیں کیا۔

باغی فوج کی کمان بخت خاں نے سنبھال لی جو آرٹلری میں صوبیدار تھا۔ لیکن اس نے بریگیڈیر کا عہدہ اختیار کر لیا۔ خان بہار خاں انتظامیہ کے سربراہ بن گئے۔ آزاد اور خود مختار سربراہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ شہنشاہ دہلی کی طرف سے کیتھر کا وائسرائے بن کر۔ وہ روہیلہ کے فطری نمائندہ تھے۔ گرچہ ان کی عمر ستر سال کی ہو چکی تھی تاہم وہ حافظ رحمت خاں کے پوتے تھے جو روہیلکھنڈ علاقے کے آخری بادشاہ تھے۔ اور اس لیے وہ قانونی طور پر اس گدی کے وارث بھی ہوئے۔ خاندان کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے انہیں انگریز حکومت کی طرف سے سو روپے ماہانہ کا وظیفہ بھی ملتا رہا۔ انہیں برٹش انتظامیہ میں جوڈیشیل افسر کی خدمات کے عوض پنشن بھی ملتی تھی۔ اس عمر کو پہنچنے کے بعد اب ان میں نہ وہ جسمانی طاقت رہ گئی تھی نہ دماغی طور پر وہ اتنے چست رہ گئے تھے، جن کی ضرورت موجودہ حالات کے تحت تھی۔ شاید وہ غدر سے پہلے ایک اچھے وکیل بھی تھے۔ 30/ تاریخ کو انہوں نے کمشنر کو تنبیہ کر دی تھی۔ ''پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے اور ریجمنٹ یقیناً بغاوت کرے گی۔'' الگزنڈر کا کہنا ہے کہ ''یہ میری ان سے آخری ملاقات تھی اور رخصت ہوتے ہوئے مجھ سے ہاتھ ملا کر انہوں نے جو الفاظ ادا کیے وہ قابل توجہ ہیں۔ اپنی جان بچاؤ۔'' ایک دن پہلے یہ اطلاع موصول ہوئی تھی کہ خان بہادر خاں ریجمنٹس میں گئے تھے۔

کیا اس بوڑھے آدمی اور باغیوں کے درمیان پہلے سے کوئی مفاہمت ہو گئی تھی؟ کیا وہ کمشنر کے ساتھ دوہرا کردار ادا کر رہے تھے؟ الگزنڈر کا ایسا خیال نہیں تھا۔ لیکن جو چپاتیاں لوگوں کے درمیان تقسیم کی گئیں، اگر ان کا کوئی مطلب نکلتا تبھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ لوگ بغاوت کے لیے تیار تھے۔ ''لیکن اگر دوسرے قسم کی قیاس آرائی کی جائے تو دستاویزوں یا واقعات کا تجزیہ اور زبانی گواہی کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ 31/ مئی کے بٹوارے سے پہلے ریجمنٹس کی لائن میں کسی قسم کی کوئی سازش موجودہ حکومت کو اکھاڑ پھینکنے کی نہیں پائی جاتی۔ کیونکہ بغاوت کے فوراً ہی بعد جو حکومت قائم ہوئی وہ سازش کے سارے تصور کو جھٹلا دیتی ہے۔ واقعات کے تسلسل کے بعد یہ بوڑھا آدمی قیادت کو مجبور ہوا کیونکہ اگر وہ انکار کر دیتا تو اس عہدے کے لیے دوسرے لوگ بھی

تاک میں لگے ہوئے تھے۔ اور اس کے رقیب نظامت کے ساتھ اور اختیارات کو حاصل کرنے کے لیے منہ کھولے ہوئے تھے۔ روہیلکھنڈ کی حکومت ان کے خاندان میں موروثی طور پر چلی آرہی تھی اور ان حقوق کے عوض برٹش حکومت انہیں سو روپے ماہانہ وظیفہ بھی دے رہی تھی۔ وہ حکومت ایک بار اکھاڑ پھینکی گئی تھی اور پھر دلی میں ایک دوسرا مسلم بادشاہ بن بیٹھا تھا۔ کیا وہ بغاوت سے حاصل شدہ موقع کو کھو کر اپنے اور اپنے بیٹوں کے لیے حکومت کے اختیارات سے دستبردار ہو جاتا۔ بوڑھے آدمی نے ارادہ کر لیا لیکن وہ اس شہر میں امن وامان قائم کرنے کے لائق نہیں رہ گیا تھا۔ فوجیوں نے بریلی کے سبھی امراء کو لوٹ لیا۔ اور اس کے نام پر چار انگریز افسروں کو قتل کر دیا۔ گرچہ اس کے۔لیے اس کا کوئی براہ راست حکم نہیں تھا۔ تاہم اس کی موجودگی میں ایک انگریز کو مار دیا گیا۔ اور اس نے ایک اعلانیہ جاری کیا کہ جو کوئی بھی انگریزوں کو پناہ دے گا اسے موت کی سزا دی جائے گی۔ ہر جگہ کی طرح یہاں بھی باغی فوجیوں نے تجارتی علاقوں اور دکانوں کو لوٹا۔ جن لوگوں کو شبہ کے تحت گرفتار کیا گیا اس میں وہ بنگالی کلرک بھی تھا' جو برٹش حکومت کے فوجی اور سول محکموں سے وابستہ تھا۔

خان بہادر خاں' جس نے اب روہیلکھنڈ کے نواب ناظم کا لقب اختیار کر لیا تھا' نے ہندوؤں اور خاص طور پر راجپوت ٹھاکروں سے مفاہمت کرنے کے لیے قدم اٹھایا اور دلی حکومت سے اپنے اس خود اختیاری عہدے کے لیے منظوری حاصل کرنے کی کوشش کی' اس لیے اس نے بادشاہ کو نذر اور بھاری تحائف بھیجے اور اپنے عہدے کے لیے فرمان حاصل کر لیا۔ جے مل سنگھ جو بڑا ٹھاکر تھا' اس نے سب سے پہلے خان بہادر خاں کو اپنا آقا تسلیم کر لیا اور پھر اس کی دیکھا دیکھی دوسروں نے بھی ایسا ہی کیا' شو بھا رام جو ایک بنیا تھا' اسے دیوان مقرر کیا گیا۔ اور اس کی دیوانی میں ایک کو چھوڑ کر باقی سارے اہلکار ہندو تھے۔ بخت خاں کے دلی روانہ ہونے کے بعد خان بہادر خاں نے نظم ونسق بحال کرنے کی کوشش میں آٹھ آدمیوں کی ایک کمیٹی بنائی جس میں سے دو ہندو اور چھ مسلمان تھے۔ ٹھاکر جے مل سنگھ بھی اس کمیٹی کے ممبر تھے اور جب تک خان بہادر خاں اپنے عہدے پر بنے رہے' یہ کمیٹی کام کرتی رہی۔ اس نے ہندوؤں کے جذبات کا خیال رکھتے ہوئے شہر میں گئو کشی پر پابندی عاید کر دی۔ لیکن وہ ناؤ محلے کے سیدوں پر قابو نہیں پا سکا۔ جو اکثر ذرا سی بھی بات کو فرقہ وارانہ رنگ دے دیتے تھے۔ شو بھا رام مسلمانوں کی نگاہ میں پسندیدہ نہیں تھا۔ اور جیسا کہ ہوتا ہے ٹیکس وصول کرنے والا اکثر دشمن سمجھا جاتا ہے' نئی حکومت کے مالی شعبہ کے سربراہ کی حیثیت سے اسے اس حکومت کی سرمائے کی مانگ کو پورا کرنا تھا اور اس وجہ سے بہت سے بااثر لوگ شو بھا رام کے دشمن ہو گئے۔ ایک دن جب وہ اپنے دفتر میں تھا' مسلمانوں کی ایک بھیڑ اس کے مکان میں داخل ہو گئی اور یہ بہانہ بنا کر کہ یہاں کوئی انگریز چھپا ہوا ہے' انہوں نے اس کے مکان کو لوٹ لیا۔ اس سے بھی خراب معاملہ بلدیو گیر گسائیں کے ساتھ۔ میر عالم خاں' جو خان بہادر خاں کا رشتہ دار تھا' نے گسائیں کے گھر میں گھس کر اس پر حملہ کیا اور اس کی بیوی کی جان لینے

کی دھمکی دی۔ گسائیں نے اپنی حفاظت کرتے ہوئے میر کو مار ڈالا۔ ان پر مفتی کی عدالت میں مقدمہ چلا اور انہیں آزاد کر دیا گیا۔ لیکن میر عالم کے بھائی نے اپنے ہاتھ میں قانون لیتے ہوئے گسائیں کو قتل کر دیا۔ خان بہار خاں مجرم کو سزا نہیں دے سکے۔ اور اس سے ہندو رعایا میں بے چینی پھیل گئی۔ مغل انتظامیہ، تاجر پیشہ لوگوں میں نامقبول رہی۔ کیونکہ اکثر اس سے خزانے میں پیسہ دینے کے لیے کہا جاتا۔ ٹیکس وصولی کی سارے عہدے دار ہندو تھے۔ اور خان بہادر خاں نے مسلم علماء سے اپنی حکومت کے لیے فتویٰ اور برہمن عالموں سے 'ویوستھا' حاصل کر لی تھی۔ لیکن جن لوگوں پر یہ بوجھ پڑتا وہ اس کی مزاحمت کرتے۔ تاجر پیشہ لوگوں کے بارے میں خیال تھا کہ یہ انگریزوں سے ہمدردی رکھتے ہیں، اور ان میں سے جو موجودہ حکومت کے تئیں وفادار نہیں سمجھا جاتا، اس سے شو بھارام اور زیادہ وصولی کرتے۔ مصر بیج ناتھ اور کنجے لال جو سرکاری خزانچی تھے، انہیں ایک بار 54 ہزار ادا کرنا پڑا۔ لیکن یہی واحد موقع نہیں تھا جب بیج ناتھ کو اپنی دولت دینی پڑی۔ ایک طرح سے اس کے لیے یہ ایک ہلکی سزا تھی۔ کیونکہ اس نے نہ صرف اپنے مخبروں کے ذریعہ بھگوڑے افسروں سے نینی تال میں رابطہ بنائے رکھا بلکہ اس کے ایک مخبر نے ہردیو بخش کے گاؤں میں پناہ گزیں بدایوں کے ایڈورڈ کو بھی تلاش کر لیا تھا۔ اور اس نے اسے فوری طور پر روپے بھی فراہم کیے۔ لیکن باغی حکومت بیج ناتھ کی سرگرمیوں سے واقف نہیں تھی اسی لیے اسے اپنی کچھ دولت سے ہاتھ دھونا پڑا۔ لیکن برٹش حکومت کے قائم ہونے کے بعد نہ صرف اس کے نقصانات کی تلافی کی گئی بلکہ اسے راجا کا لقب بھی دیا گیا اور املاک بھی۔

بدایوں اور بجنور کے واقعات کو مختصراً بیان کیا جاسکتا ہے۔ بدایوں ملٹری اسٹیشن نہیں تھا اور ولیم ایڈورڈ جو وہاں کا مجسٹریٹ تھا وہ وہاں اکیلا یورپین افسر تھا۔ جب کچھ فوجیوں نے جو وہاں تعینات تھے، بغاوت کی تو وہ اس جگہ کو چھوڑ کر فتح گڑھ بھاگ گیا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ ان لوگوں میں شامل نہیں تھا جنہوں نے وہاں رہنے کا فیصلہ کیا۔ وہ دھرم پور میں پروبن سے ملا اور ایک دوست زمیندار ہردیو بخش کے مکان میں مقیم ہوا۔ اور ایک دور دراز گاؤں سے چھپتا ہوا دوسرے دور دراز گاؤں میں جا پہنچا اور پھر وہ کانپور کے لیے روانہ ہو گیا۔

بجنور کی کہانی دلچسپ ہے۔ مئی کے آخر میں پڑوس کے کچھ بدمعاشوں نے جیل پر حملہ کیا۔ جیل کے محافظوں نے گولی چلائی اور وہ بھاگ نکلے۔ اس کے بعد کوئی واقعہ نہیں ہوا۔ گرچہ بعد میں کچھ مجرم بھاگ نکلے۔ بعد میں رڑکی کے باغی بجنور پہنچ گئے۔ تبھی ایک مسلم افسر جس کی بعد میں سیاست داں اور ماہر تعلیم کی حیثیت سے شہرت ہوئی، اسے اپنی اس سفارتی صلاحیت کو بروئے کار لانے کا موقع ملا۔ سید احمد، جو بجنور کے صدر امین تھے، نے باغیوں سے بات چیت کی اور انہیں آمادہ کر لیا کہ وہ انگریزوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ لیکن باغی فوجیوں کے وہاں سے روانہ ہونے کے بعد بجنور کے یورپین افسروں کو کچھ دیر کے لیے راحت ملی۔ نواب محمود خاں جو بدمعاشوں کے سرغنہ غلام قادر کا بھتیجا تھا، نے اس مکان پر حملہ کیا جہاں یورپین پناہ گزیں تھے۔

سید احمد ان کے بچاؤ کے لیے آگے آئے۔ اور ان سے مصالحت کی' جس کے تحت یورپین کو میرٹھ جانے کی اجازت مل گئی۔ اور ضلع کا انتظام نواب کو اس وقت تک سپرد کردیا گیا جب تک انگریز دوبارہ واپس آکر اسے نہ لے لیں۔ اس کے بعد تین ہندو زمیندار' تج پور کے چودھری پرتاپ سنگھ جن کے سرغنہ تھے' نے پٹھان نواب کے خلاف مل کر حملہ کیا اور اسے بھاگنے کے لیے مجبور کردیا۔ اس کے بعد انہوں نے یورپین افسروں کو بلایا کہ وہ واپس آکر ضلع کا انتظام سنبھالیں۔ لیکن کراک رافٹ ولسن جو اسٹیشن کمشنر تھے' نے سید احمد سے کہا کہ وہ محمد رحمت خاں ڈپٹی مجسٹریٹ اور میر تراب علی خاں تحصیلدار کے ساتھ مل کر ضلع کا انتظام چلائیں۔ سید احمد شاید بجنور کا نظام اس وقت تک سنبھالے رکھتے جب تک انگریز واپس نہ آجائیں' لیکن چودھری پرتاپ سنگھ نے ایک مسلم گاؤں پر حملہ کردیا۔ لیکن مسلمانوں نے مل کر اس کے خلاف محاذ آرائی کی اور باغی نواب کو پھر سے اس کے اختیارات واپس دلا دیے۔

مراد آباد میں 3/جون کو امید کے خلاف ایک واقعہ ہوا۔ 29 ویں این آئی جس کے بارے میں مسٹر کراک رافٹ ولسن نے دعویٰ کیا تھا کہ اس کے لوگ بہت وفادار ہیں' وہ نہ صرف وفادار بنی رہی بلکہ شورش کو کچلنے میں بھی اس نے اہم حصہ لیا۔ گوجر' میواتی اور کچھ معاملوں میں جاٹ انگریزوں کے اختیارات کو متزلزل ہوتا ہوا دیکھ کر' اپنی پرانی لوٹ پاٹ کی فطرت پر لوٹ آئے تھے۔ مجسٹریٹ نے رپورٹ کی۔ "ان لٹیروں کے خلاف امروہہ' چگلٹ' حسن پور اور آس پاس کے علاقوں میں سول حکام نے 29 ویں مقامی انفینٹری اور ارریگولر کیویلری کی مدد سے بہت کامیاب مہم چلائی اور ضلع میں مئی کے آخر تک مکمل امن وامان قائم کرلیا گیا ہے۔ ہم اس بات کے لیے تیاری کررہے تھے کہ اپنے عہدوں پر بنے رہ کر بحفاظت تمام طوفان کا مقابلہ کرلیں۔ میرٹھ سے بھاگنے والی بہت سی مائنرس کی فوج کے لوگ جو اس ضلع سے ہوتے ہوئے اپنے گھروں کو بھاگ رہے تھے' ان کو پکڑ کر ان کے اسلحے رکھوالئے گئے' جن کی تعداد تقریباً 60 ہے۔ اسی طرح 20 ویں مقامی انفینٹری کے 20 سپاہی مظفر نگر کے سرکاری خزانے کو لوٹ کر اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ ان پر بھی حملہ کیا گیا اور ان کی ساری لوٹ کی کمائی کو ان سے رکھوالیا گیا۔ ان میں سے دو آدمیوں کو مار دیا گیا اور بارہ یا تیرہ کو حراست میں لے لیا گیا۔" جس فوج کے لوگوں کا ڈسپلن اور وفاداری میں اتنا اچھا ریکارڈ ہو ان کے بارے میں یہ سمجھنا مشکل ہے کہ آخر 29 ویں کے لوگوں نے حکم عدولی کیوں کی؟ مجسٹریٹ کا جواز یہ ہے کہ بریلی میں پھیلی بغاوت سے ان پر برا اثر پڑا۔ اور ان کے جذبات بھی اس سے بھڑک اٹھے۔ لیکن افسروں کو کوئی ضرر نہیں پہنچایا گیا۔ جب کچھ سپاہیوں نے اپنی مسکٹ کا رخ مجسٹریٹ اور جج کی طرف کیا تو ان کے افسروں نے ان کی قسمیں انہیں یاد دلائیں۔ چنانچہ پھر ان کی جان کا کوئی نشانہ نہیں بنایا گیا۔ ارریگولر کیویلری کے کچھ ہندوستانی افسر اس وقت مراد آباد میں چھٹی پر تھے۔ انہیں سول حکام کے تحت کردیا گیا۔ انہوں نے بھگوڑوں کو بحفاظت تمام میرٹھ پہنچا دیا۔ برٹش حکومت کو رامپور کے نواب کی دوستی پر پورا بھروسہ تھا۔ اور

انہوں نے یورپین افسروں کی عدم موجودگی میں ضلع کو اچھی طرح سنبھالے رکھا۔ ایسا نہیں ہے کہ ان کے اختیارات کو ان کی رعایا میں سے جو کٹر مذہبی لوگ تھے' انہوں نے چیلنج نہیں کیا۔ کیونکہ انہیں مذہب کے دشمنوں کا ساتھ دینا پسند نہیں تھا۔

شاہجہانپور کے سفید فام لوگ اتنے خوش قسمت نہیں تھے۔ یہاں کی شورش سے بریلی کے واقعات کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ کیونکہ یہاں بھی اسی دن یہ واقعات ہوئے جس دن بریلی میں ہوئے۔ لیکن یہاں مرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ کیونکہ سپاہیوں نے تلواروں اور لاٹھیوں سے لیس ہو کر چرچ پر اس وقت حملہ کیا جب وہاں عبادت ہو رہی تھی۔ جو لوگ بچ گئے تھے وہ پوائیں کی طرف بھاگے جو اودھ کی سرحد پر واقع تھا۔ اور وہاں ایک طاقتور زمیندار رہتا تھا۔ لیکن اس نے بھی اپنی جگہ کو ان لوگوں کے لیے محفوظ پناہ گاہ نہیں سمجھا۔ پوائیں سے ایک نوٹ اودھ میں واقع محمدی میں بھیجا گیا۔ جہاں ایک دوسری پارٹی محفوظ راستے کے انتظار میں تھی۔ محمدی سے یہ بدقسمت لوگ اورنگ آباد کی طرف چلے۔ لیکن ابھی یہ اپنی منزل سے ایک میل کے فاصلے پر تھے جبھی فوجیوں کی ایک ٹکڑی نے سب کو قتل کر دیا۔ لیکن کیپٹن 'جو اس پارٹی کے ساتھ محمدی سے چلا تھا' کی جان چھمن جمعدار نے بچائی تھی۔ وہ کیپٹن کو بحفاظت تمام اپنے گاؤں متھولی لے گیا' جہاں اس کی بیوی اس سے پہلے پہنچ چکی تھی۔ شاید محمدی میں بغاوت شاہجہانپور کے بھگوڑوں کے پہنچنے کی وجہ سے ہوئی تھی۔

تقریباً گیارہ مہینے تک روہیلکھنڈ میں برٹش حکومت بالکل نہیں رہی اور خان بہادر خاں بغیر کسی پریشانی کے بریلی سے اس پر حکومت کر رہے تھے۔ 1857ء کے آخری مہینوں میں اس بات کی کوشش کی گئی کہ روہیلکھنڈ کے علاقے میں ہندو بغاوت کر دیں۔ اس کے لیے کیپٹن گوون کو پچاس ہزار روپے خرچ کرنے کے اختیارات دیئے گئے۔ لیکن اس کی کوششوں کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ اور 14/ نومبر 1857ء کو اس نے لکھا: "میں ٹھاکروں کو طرح طرح کی ترغیب دے کر اپنے کچھ آدمی جمع کرنے کی کوشش میں ناکام ہو چکا ہوں۔ میرا خیال تھا کہ ٹھاکر لوگ سرکار کی مدد کرنے کو تیار ہیں۔ لیکن مجھے یہ دیکھ کر بہت مایوسی ہوئی کہ وہ صرف بات چیت میں ہی ہمدردی جتاتے ہیں اور بڑی بڑی ڈینگیں ہانکتے ہیں کہ وہ کیا کیا کر کے دکھائیں گے۔ بشرطیکہ ان کو بڑی تعداد میں یورپین فوج کی مدد مل جائے۔" لیکن خان بہادر خاں کی یہ کوشش کہ نینی تال سے بھاگے ہوئے یورپین افسروں کو وہاں سے کھدیڑ دیں' بھی ناکام ہو گئی۔ کیونکہ اس کی فوج میں تربیت یافتہ فوجی نہیں تھے۔ گرچہ اس کے فوجیوں کی تعداد 30 سے 40 ہزار کے درمیان تھی لیکن وہ سبھی ناتجربے کار تھے۔ اور کوئی ماہر افسر بھی ان کی رہنمائی کے لیے نہیں تھا۔

سر کولن نے پھر ترجیح کا سوال اٹھایا کہ پہلے اودھ کو کچلا جائے یا اپنے دوسری مہم میں بریلی کو اولیت دی جائے۔ اس کے خیال میں مستقبل کی مہم کے لیے روہیلکھنڈ کو چھوڑا جا سکتا تھا اور اودھ کو اوّلیت دی جا سکتی تھی۔ اس نے 24/ مارچ 1858ء کو اپنے دلائل کے ساتھ لارڈ کیننگ کو

خط لکھا: "موجودہ فوج کو استعمال کرنے کے لیے اس وقت دو راستے ہیں۔ ایک تو یہ کہ انہیں اودھ کے صوبے میں لگا دیا جائے تا کہ لکھنؤ میں ہمیں مرکزیت حاصل ہو جائے۔ اور دوسرے یہ کہ اُنہیں روہیلکھنڈ میں تعینات کر دیا جائے۔ اپنے دلائل دیتے ہوئے اس نے لکھا کہ میں روہیلکھنڈ کو چار پانچ مہینے اسی طرح چھوڑنا مناسب سمجھتا ہوں۔ تب تک اودھ میں ہم پورا انتظام کر لیں گے۔" اس کا جواب دیتے ہوئے گورنر جنرل لارڈ کیننگ نے لکھا۔ "شاید تم کو یاد ہو جب اودھ کو اولیت دینے کے بارے میں میں نے اپنی رائے ظاہر کی تھی' وہ سیاسی ضرورتوں کے تحت تھی کہ نہ صرف صوبے کو حاصل کیا جائے بلکہ اس کے دارالسلطنت کو بھی باغیوں سے چھڑایا جائے۔ یہ حملہ کیسے ہو' اس کے بارے میں کمانڈر انچیف کو سوچنا تھا۔ گورنر جنرل کو صرف پالیسی وضع کرنا تھی۔"

روہیلکھنڈ میں مختلف راستوں سے داخل ہونا تھا۔ بریگیڈیر جنرل والپول کو گنگا کے بائیں طرف کے ساحل کا راستہ صاف کرنا تھا۔ کمانڈر اِنچیف خود فتح گڑھ سے آگے بڑھیں گے اور روہیلکھنڈ کی سرحد پر والپول سے ملیں گے۔ میجر جنرل پینی میرٹھ سے آگے بڑھیں گے اور کمانڈر انچیف سے شاہجہانپور اور بریلی کے درمیان میرن پور کٹرہ میں ملیں گے۔ بریگیڈیر جنرل جانس کے تحت چوتھا کالم اپنے اڈہ رڑکی سے روہیلکھنڈ میں داخل ہوں گے۔ ان سبھی کالموں کو بریلی میں ایک ساتھ ملنا تھا تا کہ خاص باغی فوجیوں کو شکست دی جا سکے۔ اور میجر جنرل سیٹن فتح گڑھ سے بھگوڑوں کا گنگا میں تعاقب کریں گے۔ یہ اسکیم اپنے منصوبے کے حساب سے کامیابی کے ساتھ پوری کی گئی لیکن کچھ نقصانات بھی ہوئے۔ والپول کو روئیا پر حملہ میں کافی نقصان کا سامنا کرنا پڑا جو نرپت سنگھ کا خاص اڈہ تھا۔ یہاں کا قلعہ دو طرف سے گھنیرے بانس کے جنگلوں سے گھرا ہوا تھا۔ جب کہ دو طرف سے وہاں پہنچنا آسان تھا۔ مقبول ترین افسر کرنل ایڈریان ہوپ کی موت سے جو دھکا لگا وہ شکست میں تبدیل ہو گیا۔ لیکن دوسرے دن یہ قلعہ خالی پایا گیا۔ سر کولن اپنی فوج سے آگے فتح گڑھ میں جنرل پینی سے ملنے سے روانہ ہوئے۔ والپول کی فوج نے منصوبے کا اپنا حصہ پورا کر کمانڈر اِنچیف سے رام گنگا ندی پر ملی۔ پینی' ککرولی قصبہ کے نزدیک تماشہ دیکھنے میں محو ہو گیا اور گرچہ پروگرام میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوئی تاہم اس لاپروائی کی وجہ سے اسے اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔ بریگیڈیر جنرل جانس نے ہردوار کے نزدیک گنگا کو پار کیا اور باغی فوجوں سے اس کی مڈبھیڑ بھگنی والا جنگل میں ہوئی۔ ایک ہندوستانی افسر امام بخش نے اپنی شجاعت سے چھوٹے قلعہ پر قبضہ پا لیا جہاں ایک نواب پناہ گزیں تھے۔ پھر یہ کالم مراد آباد کی طرف چلی جہاں وہ ٹھہر گئی۔ کیونکہ انہیں کمانڈر انچیف کے چلنے کی کوئی خبر نہیں تھی۔ اسے خاص فوج سے بریلی میں ملنا تھا تا کہ وہ حملے میں شریک ہو سکیں۔ جانس نے 3/ مئی کو آگے بڑھنا شروع کیا اور 5/ تاریخ کو میر گنج پہنچا جو بریلی سے 14/ میل کے فاصلے پر ہے۔ میر گنج میں منڈی سور شہرت کے شہزادہ 'فیروز شاہ تعینات تھے۔ جو بغیر کسی مزاحمت کے پیچھے ہٹ گئے۔ لیکن سر کولن کی کوئی خبر نہیں تھی۔

سر کولن 30/ اپریل کو شاہجہانپور میں رکے ہوئے تھے۔ انہوں نے ایک چھوٹی سی فوج

جیل کی عمارت کی حفاظت کے لیے وہاں چھوڑی۔ 3/ مئی کو وہ روہیلکھنڈ کے فتح گڑھ میں پہنچے۔ اسے فتح گڑھ اس لیے کہتے تھے کہ اودھ کے نواب اور ان کے انگریز حمایتیوں نے یہاں پر حافظ رحمت خاں کی روہیلہ فوجوں پر 80 سال قبل فتح پائی تھی۔ کرنل جانس خاص فوج میں میرن پور کٹرہ میں پہلے سے طے شدہ' پینی کی فوج کے ساتھ شامل ہوئے۔ 5/ مئی کو علی الصبح یہ ساری مشترکہ فوج فرید پور میں جمع ہوئی۔ مخبروں نے روہیلہ کیویلری کی آمد کی خبر دی۔ فوراً ہی جنگ کی تیاری شروع کر دی گئی۔ توپوں کے دغتے ہی جنگ شروع ہو گئی۔ اور پھر غازیوں نے جی توڑ حملہ کیا۔ دشمنوں نے بھی مقابلہ کیا اور غازی گھوڑ سوار آرٹلری کے گولوں سے گر گئے۔ ان سارے غازیوں نے مذہب کے لیے جان دے دی۔ انہیں کسی بھی طرف سے کسی انعام کی توقع نہیں تھی۔ بریلی کی جنگ دوسرے دن روہیلہ ہار گئے۔ اور بریگیڈیر جانس کے تحت رڑکی کی فوج شہر کے کنارے پہنچی۔ باغیوں کی اس فوج کو شکست دینے کے بعد جو پتھر کے پل پر قبضہ کیے ہوئے تھے' خان بہادر خاں پیلی بھیت کی طرف روانہ ہو گئے اور ان کے دارالسلطنت پر مکمل طور پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔

بریلی کی فتح کے بعد بھی سر کولن کو چین نہیں نصیب ہوا۔ فیض آباد کے مولوی کی اگرچہ کوئی فوجی تربیت نہیں تھی' لیکن ان کے اندر ایک پیدائشی رہنما ہونے کی ساری خوبیاں موجود تھیں۔ دشمن کی فوج کی کسی بھی کمزوری سے واقف ہو کر وہ ان پر فوراً حملہ کر دیتے۔ لکھنؤ کے نزدیک سر ہوپ گرانٹ سے شکست کھانے کے بعد انہوں نے روہیلکھنڈ کی طرف توجہ کی۔ شاید وہ بریلی کے محافظوں کے لیے ایک نئے راستے کی تلاش کر رہے تھے۔ اور اس میں کامیابی نہ ہونے پر وہ حملہ کر رہی فوج کی رسد اور کمزور چوکیوں پر حملہ کر کے ان کی پیش قدمی روکنا چاہتے تھے۔ شاہجہانپور میں جو چھوٹی سی فوج تھی' اس کے بارے میں انہیں پتہ چل گیا اور مولوی اپنے آدمیوں کو لے کر اس کمزور جگہ پر فتح کے لیے چل پڑے۔ جب کہ سر کولن دوسری طرف مشغول تھے۔ لیکن وہ اچانک یہاں حملہ نہیں کر سکے۔ ایک مخبر نے انگریزوں کو مولوی کے آمد کی اطلاع دے دی۔ انگریز فوجوں نے اپنے خیمے جیل کے نزدیک درختوں کے ایک جھنڈ میں قائم کر لیے اور فوراً ہی وہاں خندق کھود کر اس میں چھپ گئے۔ مولوی نے پرانے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ شہر اور مضافات پر قبضہ کرنے کے بعد انہوں نے اپنی بندوقوں کا رُخ جیل کی طرف موڑ دیا۔ لیکن وہ انگریزوں کے حمایتیوں کو سزا دینے سے نہیں چوکے' کیونکہ ان کے نزدیک یہ سب غدار تھے۔ آٹھ دن لگاتار یہ چھوٹی فوج اپنی چوکی پر بنی رہی۔ اور تبھی بریگیڈیر جانس رڑکی فیلڈ فورس کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔ اب اس فیلڈ فورس کا نیا نام شاہجہانپور فیلڈ فورس پڑ گیا۔ تاہم مولوی بغیر لڑے پیچھے نہیں ہٹے۔ اس دوران انہیں بھی شہزادہ فیروز شاہ اور بیگم حضرت محل کی مدد پہنچ گئی تھی' لیکن جانس نے ان کے حملوں کو ناکام کر دیا اور شاہجہانپور کو بچا لیا۔ سر کولن' والپول کو روہیلکھنڈ کا انتظام سپرد کر کے فتح گڑھ لوٹ آئے اور انہوں نے جانس کی فوج کو بھی مدد پہنچائی۔ اودھ پر حملہ ٹھنڈے موسم کی

وجہ سے ملتوی کر دیا گیا۔ لیکن مولوی، سر کولن سے پھر لڑنے کے لیے زندہ نہیں بچے۔ شاہجہانپور سے پسپا ہونے کے بعد وہ محمدی کی سڑک پر جم گئے جہاں سے جانس انہیں ہٹا نہیں سکا۔ محمدی چھوڑنے سے پہلے وہاں انہوں نے سارے دفاعی نشانات مٹا دیئے۔ 5/ جون کو وہ پوائیں میں نظر آئے جو اودھ روہیلکھنڈ سرحد پر چھوٹا قلعہ تھا اور شاہجہانپور سے کچھ میل کے فاصلے پر تھا۔ لیکن راجا نے قلعہ کے دروازے مولوی کے لیے بند کر دیئے۔ لیکن مولوی نے ہاتھی سے دروازہ توڑنے کی کوشش کی۔ اسی دوران دفاعی فوج کی ایک گولی سے ان کا وہیں انتقال ہو گیا۔ کیونکہ اس نے ان کے ہودہ کو بآسانی نشانہ بنالیا تھا۔ ان کا سر کاٹ کر شاہجہانپور کے مجسٹریٹ کو بھیجا گیا جو کوتوالی پر لٹکا دیا گیا۔ باقی ساری لاشیں جلادی گئیں اور راکھ کو ندی میں بہادیا گیا۔ راجا کو مولوی کے سر کی قیمت پچاس ہزار مل گئی۔

اس مولوی کو اپنا خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے سر ٹامس سیٹن نے لکھا کہ مولوی بہت باصلاحیت، بہت بہادر، پُرعزم اور باغیوں میں سے سب سے بہتر سپاہی تھے۔ میلیسن نے مولوی کو بحیثیت فرد اور بحیثیت محبِّ وطن اپنا خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا "اگر محبِّ وطن ایک ایسا شخص ہے جو منصوبے بناتا ہے اور آزادی کے لیے جنگ کرتا ہے جسے اس کے اپنے ملک میں غلط طریقے سے ختم کر دیا گیا ہے تو یقیناً مولوی ایک سچے محبِّ وطن تھے۔ انہوں نے اپنی تلوار کو قتل اور غارت گری سے ناپاک نہیں کیا۔ کسی کے بھی قتل کے لیے انہوں نے کوئی سازش نہیں کی۔ انہوں نے بہت بہادری سے باعزت اور پُرجوش شجاعت کے ساتھ ان اجنبیوں سے میدان میں جنگ کی جنہوں نے اس کے ملک پر قبضہ کر لیا تھا اور ان کی یاد اس تکریم اور عزت کے لائق ہے جو ہر بہادر اور ہر قوم کے سچے محبِّ وطن کو دی جاتی ہے۔"

سخت گرمی کے دنوں میں بھی یہ فوجی کارروائی روکی نہیں گئی۔ سر ہوپ گرانٹ نے اودھ میں مہم چلائی اور سلطانپور پر قبضہ کر لیا۔ گورنر جنرل اور کمانڈر انچیف دونوں کو یہ احساس ہوا کہ صرف فوجی سختی ہر طرف پھیلی ہوئی بغاوت کو روک نہیں سکتی۔ اور بغیر کسی تفریق کے گاؤں کو جلانا اور اجاڑنا آخرکار قانونی طور پر قائم سرکار کے لیے غلط ثابت ہو رہا ہے۔ کیونکہ اس سے ملنے والی مالگزاری ختم ہوتی جارہی ہے۔ انہوں نے سوچا کہ سختی اور مصالحت، مار پیٹ اور دوستی ان سب کا ایک ساتھ استعمال کیا جائے اور اس بات کی کوشش کی جائے کہ باغیوں کی اکثریت کو اس بات کے لیے راضی کر لیا جائے کہ وہ اپنے اسلحے جمع کرادیں اور اپنے گھروں کو سکون کے ساتھ لوٹ جائیں۔ لیکن جو باغیوں کے اہم لیڈران تھے، انہیں جیتنا آسان نہیں تھا اور اسی لیے ان لیڈروں میں سے نانا، تانتیا توپے، خان بہادر خاں اور فرخ آباد کے نواب تفضل حسین کو سخت اور بدترین سزا کا مستحق سمجھا گیا۔ لیکن اب وقت آگیا تھا کہ بغاوت اور اس کے بعد کی کارروائیوں میں جن غیر اہم لوگوں نے حصہ لیا تھا انہیں نظر انداز کر دیا جائے۔ اور اس تجربے کے لیے ایک موقع اس وقت آیا جب کمپنی نے حکومت ہند کا تاج بادشاہ کو سونپ دیا۔ اگست 1858ء میں پارلیمنٹ کے

محمد حسن کا خط

دونوں ایوانوں نے بل پاس کر کے ایسٹ انڈیا کمپنی کی ہندوستان کی حکمرانی کو ختم کر دیا' اور پہلی نومبر ہندوستان پر ملکہ کا قبضہ ہو گیا۔ اور اس سلسلہ میں ملکہ کا اعلانیہ الہٰ آباد میں بہت شاندار دربار منعقد کر کے پڑھا گیا۔ فرمان میں کہا گیا تھا کہ سبھی ہندوستانی راجاؤں کے حقوق' وقار اور عزت کو بحال رکھا جائے گا۔ اور یہ کہ کسی بھی شخص کے ساتھ مذہب کی بنیاد پر کوئی تفریق نہیں کی جائے گی۔ اور سبھی کو قانون کے تحت برابر کا تحفظ ملے گا۔ فرمان میں ملکہ کے زیر حکومت کام کرنے والے سبھی عمال کی یہ ذمہ داری ہو گی کہ وہ رعایا کے کسی مذہبی عقیدے یا طریقۂ عبادت میں کسی طرح کی مداخلت نہیں کریں گے۔ فرمان میں یہ بھی کہا گیا کہ ہمارا منشا یہ ہے کہ ہماری رعایا چاہے کسی نسل یا ذات کی ہو سبھی بغیر کسی تعصب کے آزادانہ طور پر ان دفتروں میں ملازمت کے حقدار ہوں گے جو ذمہ داری پوری کرنے کے لیے اپنے پاس وافر تعلیم' لیاقت اور بے داغ کردار رکھتے ہوں۔

یہ اعلان پورے طور پر کامیاب نہیں ہوا۔ کیونکہ اس کو چیلنج کرتے ہوئے ایک دوسرا ہی اعلان اودھ کی ملکہ بیگم حضرت محل نے اپنے بیٹے کے نام سے جاری کیا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ فرمان میں جس معافی کا اعلان کیا گیا ہے اس پر وہ زیادہ بھروسہ نہ کریں۔ کیونکہ یہ انگریزوں کی عادت رہی ہے کہ کسی بھی چھوٹی یا بڑی غلطی کو کبھی معاف نہیں کرتے۔ جب کہ ہندوستانی حکمرانوں کی رحم دلی سے سب لوگ واقف ہیں۔ بیگم نے اپنے فرمان میں ملکہ کے فرمان کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ہندوستان جس کی حکومت کی باگ ڈور ابھی تک کمپنی کے پاس تھی' اسے ملکہ نے سنبھال لیا ہے۔ لیکن بیگم نے پوچھا کہ اس سے فرق کیا پڑا؟ کیونکہ کمپنی کے ذریعہ قائم نظام اور بندوبست آج بھی اسی طرح جاری ہے اور کمپنی کے خادم گورنر جنرل اور عدلیہ کا انتظام بغیر کسی تبدیلی کے اسی طرح چل رہا ہے۔ انگلینڈ کی ملکہ نے کہا ہے کہ کمپنی نے جو کچھ بھی معاہدہ یا سمجھوتہ کیا ہے وہ اس کو بنائے رکھیں گی۔ اودھ کی ملکہ نے بہت سے ایسے معاملات کا حوالہ دیا جس میں ہندوستانی راجاؤں کے ساتھ کئے گئے معاہدے کی خلاف ورزی کی گئی ہے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ کس طرح ان کے پیش روؤں سے شاہجہاںپور' بریلی' اعظم گڑھ' جونپور' گورکھپور' اناوہ اور الہٰ آباد ضلعوں کو چھینا گیا۔ "یہ سب پرانے معاملات ہیں۔ لیکن ابھی حال ہی میں معاہدوں اور کئے گئے عہد کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اور یہ بھی کہ ابھی کئی کروڑ روپے ان پر واجب الادا ہیں' بغیر کسی وجہ کے اور صرف حکومت کی بدعنوانیوں کو بہانہ بنا کر اور رعایا کی بے چینی کو نظر انداز کرتے ہوئے انہوں نے کس طرح ہم سے ہمارا ملک چھین لیا اور نہ جانے کتنے کروڑ کی املاک کو بھی ضبط کر لیا۔ اگر ہمارے لوگ واجد علی شاہ کی حکومت سے ناراض تھے تو کیسے ہمارا ساتھ دے رہے ہیں اور آج تک کسی بھی بادشاہ کو اس قدر وفاداری نہیں ملی جتنی کہ ہمیں ملی ہے۔ اب کس چیز کی کمی ہے اور وہ کیوں ہمارا ملک ہمیں واپس نہیں کر رہے ہیں۔" ملکہ نے جو یقین دہانی کرائی تھی کہ وہ اپنی سلطنت کی حدود کو نہیں بڑھائیں گی' پر سوالیہ نشان لگاتے ہوئے کہا گیا "اگر یہی بات ہے تو پھر ملکہ

عالیہ ہمارا ملک ہمیں کیوں نہیں واپس کرتیں جب کہ ہمارے لوگوں کی یہی خواہش ہے۔ ولی عہد نے مزید کہا کہ ''فرمان میں یہ بھی لکھا ہے کہ عیسائیت سچا مذہب ہے۔ انہوں نے پوچھا عدلیہ کو کسی مذہب کی سچائی یا برائی سے کیا لینا دینا۔ یہ بغاوت مذہب کے نام پر شروع ہوئی تھی اور لاکھوں لوگ مذہب کے لیے اپنی جانیں قربان کر چکے ہیں۔ اب ہماری رعایا کو مزید دھوکا نہ دیں۔'' فرمان میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ ''جن لوگوں نے بغاوت کو بڑھاوا دیا' یا باغیوں کو اکسایا انہیں جانوں سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ لیکن یہ سزا گواہیوں اور شہادتوں کے بعد دی جائے گی۔ اور قاتلوں اور قتل میں معاونت کرنے والوں پر کوئی رحم نہیں کیا جائے گا۔'' ولی عہد نے رعایا کو تنبیہ کرتے ہوئے کہا کہ اس یقین دہانی کا کوئی مطلب نہیں ہے۔ ہر چیز لکھی ہوئی ہے۔ لیکن کچھ بھی نہیں لکھا ہوا ہے۔ ہر گاؤں اور ہر علاقہ جہاں سے باغی فوجیں گزری ہیں' وہ سب جرائم میں ملوث کر لیے جائیں گے۔ وہ گاؤں کے مکھیا جنہوں نے انگریزوں سے اپنی وفاداری دکھائی ہے' انہیں کہا گیا کہ وہ ولی عہد کے کیمپ میں پہلی جنوری تک آجائیں۔ کوئی بھی شخص خواب میں بھی یہ نہ سوچے کہ انگریز کسی جرم کو معاف کر دیں گے۔ اودھ کا فرمان اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ختم ہوا کہ ''انگریزوں نے ہندوستانیوں کو ملازمت کی پیش کش کی ہے۔ لیکن سڑکیں بنانے یا نہر کھودنے جیسی مزدوری کے علاوہ کسی بہتر ملازمت کا وعدہ نہیں کیا گیا ہے۔ اگر اب بھی لوگ فرمان میں پوشیدہ باتوں کو نہیں سمجھ پا رہے ہیں تو پھر کوئی چارہ نہیں۔ ہماری رعایا ملکہ کے اس فرمان سے دھوکے میں نہ آجائیں۔'' اتنا وقت گزرنے کے بعد اب یہ قیاس کرنا مشکل ہے کہ بیگم حضرت محل کے اس فرمان پر لوگوں کے کیا تاثرات ہیں۔ لیکن گورنر جنرل کو اس بات کی امید نہیں تھی کہ ملکہ حکومت کی باگ ڈور اتنی نرم شرطوں پر سنبھال لیں گی اور یہ کہ اس فرمان سے جنگ ختم ہو جائے گی۔ 7/ جولائی 1858ء کو ولیم میور جو شمالی مغربی صوبوں کے سکریٹری تھے' نے روہیلکھنڈ کے کمشنر کو لکھا کہ سزا دیتے وقت ''اگر کسی افسر کو کوئی شبہ ہو اور وہ اپنے سینیئر کو فیصلے کے لیے یہ معاملہ سپرد نہ کرنا چاہتا ہو تو گورنر کا خیال ہے کہ وہ رحم دلی سے کام لے۔'' لیکن اودھ پر قبضہ کرنے کی ذمہ داری فوج کی تھی اور کمانڈر انچیف اپنے دوسری مہم کی تیاری کر رہا تھا جب یہ فرمان پڑھا گیا۔

2/ نومبر کو سر کولن کیمپبل الہ آباد سے اودھ کے لیے روانہ ہوئے۔ وہ اب لارڈ کلائیڈ کہلاتے تھے۔ ان کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ باغی فوجیوں کو گھیر کر نیپال کی سرحد میں داخل ہونے کے لیے مجبور کریں جہاں انہیں کچل دیں۔ یا ان کے حال پر چھوڑ دیں کہ وہ بھوک اور بیماری سے مر جائیں۔ باغی فوج کے لیڈروں کا خیال تھا کہ نیپال کی حکومت کا جھکاؤ ان کی طرف ہے۔ جب کہ نیپال کے راجا جنگ بہادر کھلے عام برٹش حکومت کی حمایت کر رہے تھے۔ اور کمانڈر انچیف کے ساتھ مل کر لکھنؤ پر قبضہ پانے میں مدد کی تھی۔ جب کہ اودھ کے ولی اور نانا صاحب نے اس سے حمایت کے لیے ربط بنائے رکھا تھا۔ لارڈ کلائیڈ کی دفاعی چال کو باغیوں کی اس نفسیات سے کافی فائدہ پہنچا۔

اس کا منصوبہ بالکل سیدھا سادہ تھا۔ فوج کی ایک ٹکڑی اودھ میں فتح گڑھ سے، دوسری شاہجہانپور سے، تیسری اعظم گڑھ سے اور چوتھی وہ خود لے کر الٰہ آباد سے آگے بڑھے گا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ نومبر میں یہ حملہ کرے گا۔ لیکن باغیوں نے اس کی آمد کو بھانپ لیا اور ایک مہینے پہلے سندیلہ کی ایک چھوٹی چوکی پر حملہ بول دیا۔ لارڈ کلائیڈ اودھ میں راجپوت سرداروں کے مضبوط قلعوں کو ایک ایک کر کے ختم کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے سب سے پہلے حملہ رامپور کسیا، جو طاقتور خانپوریہ طبقہ کی راجدھانی تھی، پر حملہ کیا۔ اس کے بعد کلائیڈ نے امیٹھی کے راجا کی طرف رخ کیا۔ یہاں کے راجا لال مادھو سنگھ نے برٹش بھگوڑوں کو شروع میں پناہ دی تھی اور انہیں الٰہ آباد تک پہنچایا تھا۔ بعد میں وہ خود باغیوں کا ساتھ دینے لگا۔ لارڈ کلائیڈ نے اس سے کہا کہ وہ اپنا قلعہ، اپنی فوج، اپنے اسلحے اور خود کو ان کے سپرد کر دے۔ لیکن راجا کا مضبوط باغی فوج پر، جو قلعہ میں پناہ گزیں تھی، کوئی کنٹرول نہیں رہ گیا تھا۔ اس لیے اس نے خاموشی کے ساتھ اپنے آپ کو کمانڈر انچیف کے خیمے میں پیش کر دیا۔ دوسرے دن صبح باغیوں نے بھی یہی عمل دوہرایا اور امیٹھی کا قلعہ بالکل خالی ہو گیا۔ صرف راجا کے چند ذاتی محافظ وہاں رہ گئے تھے۔

ان کی دوسری منزل شنکر پور تھی جو سب سے بہادر بائیس واڑا راجپوت بینی مادھو کی قیام گاہ تھا۔ گاؤں کے بنوں نے اپنی رزمیہ نظموں میں اس کی شجاعت کو امر کر دیا ہے۔ اور یہ گیت اب بھی ہولی کے وقت عام لوگ سنتے ہیں۔ لارڈ کلائیڈ نے انہیں یقین دلایا کہ ان کی ملکیت پر ان کے قبضے کو بحال رکھنے کے بارے میں غور کیا جائے گا، بشرطیکہ وہ بغیر کسی مزاحمت کے اپنے کو سپرد کر دیں۔ بینی مادھو نے جواب دیا کہ وہ خود کو تو نہیں پیش کر سکتے کیونکہ وہ اس قوم سے تعلق رکھتے ہیں جو اپنی آزادی کے لیے جنگ کرنے پر مجبور ہے۔ لیکن وہ اپنا قلعہ ضرور چھوڑ دیں گے۔ کیونکہ یہ ان کی اپنی ملکیت ہے۔ رات کے اندھیرے میں انہوں نے شنکر پور کو چھوڑ دیا۔ اور بجائے شمال یا مشرق کے وہ ڈنڈیا کھیرا کی طرف نکل گئے۔ جہاں رام بخش سنگھ، جس کے آدمیوں نے ماؤبرے تھامسن کی پارٹی پر گولی چلائی تھی، رہ رہا تھا۔ بریگیڈیر ایولے کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ اس کا تعاقب کرے۔ لیکن اس کی جائے پناہ کا پتہ نہیں لگ رہا تھا اور ہر طرف سے اس کی موجودگی کی خبر آ رہی تھی۔ آخرکار یہ اطلاع ملی کہ وہ رام بخش کے گاؤں میں موجود ہے۔ وہاں کے قلعہ کو سرہوپ گرانٹ نے جزوی طور پر برباد کر دیا تھا۔ 24/ نومبر کو پھر حملہ کیا گیا۔ باغیوں کو شکست ہوئی۔ لیکن بینی مادھو بچ کر وہاں سے نکل بھاگے۔ ان کا تعاقب بھی کیا گیا لیکن پہلے تو انہوں نے گومتی پار کی اور پھر آگرہ کو پار کر اودھ میں داخل ہو گئے، اور کبھی لوٹ کر بیس واڑا نہیں گئے۔ 4/ دسمبر کی لکھنؤ سے بھیجی ایک رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ بینی مادھو کی فوج شکست کھا کر تتر بتر ہو گئی۔ اور ان کے فوجی خاموشی کے ساتھ اپنے گاؤں لوٹ گئے۔ ان میں سے پانچ ہزار آدمی چھوٹی چھوٹی پارٹیاں بنا کر اپنے سربراہ کے ساتھ بہرائچ ڈویژن میں داخل ہو گئے۔ کچھ دنوں بعد انہیں بہرام گھاٹ کے نزدیک متھولی میں دیکھا گیا۔ لیکن کمانڈر انچیف شمال کی طرف اسے بڑھنے سے نہیں روک

سکے۔ یہ حملہ لارڈ کلائیڈ کے منصوبوں کے مطابق پورا کیا گیا۔ بنی مادھو، دیوی بخش، محمد حسن، مہدی حسن، امر سنگھ، خان بہادر خاں، بیگم حضرت محل، ممو خان، نانا صاحب، بالا صاحب، جوالا پرشاد اور دوسرے اہم باغی رہنماؤں کو ان کے اپنے ضلعوں سے نکال دیا گیا تھا اور وہ سب نیپال کی سرحد کے پاس ایک چھوٹے سے خطے میں دھکیل دیئے گئے تھے۔ اب انہیں صرف شمالی کی طرف بڑھنے کے لیے مجبور کرنا تھا تاکہ وہ جنگ بہادر کے ملک میں غیر مقیم کے طور پر ملک میں داخل ہو جائیں۔

صرف ایک باغی ان کی جال میں آنے سے رہ گیا۔ فیروز شاہ اپنے دو ہزار سپاہیوں کے ساتھ گنگا کو پار کر اٹاوہ کے نزدیک نظر آئے۔ بریگیڈیر ٹروپ اور بارکر ان کا راستہ نہیں روک سکے۔ فیروز شاہ بعد میں راؤ صاحب اور تانتیا ٹوپے کے ساتھ مل گئے۔ انہوں نے مہمات میں اُن کا ساتھ دیا لیکن قسمت میں نہیں۔

اس دوران لارڈ کلائیڈ اپنا جال تنگ کرتے رہے۔ اطلاع ملی کہ بالا صاحب ترائی کے علاقہ میں تلسی پور کے پاس دیکھے گئے ہیں۔ ایسا کہا جاتا ہے کہ بیوہ رانی باغیوں کا ساتھ دے رہی ہیں، اس لیے ہوپ گرانٹ کو وہاں بھیجا گیا تاکہ وہ اسے وہاں سے نکال دیں۔ وہ بلرام پور میں 16/ تاریخ کو پہنچا۔ جہاں کے حمایتی راجانے اس کا ساتھ دیا۔ 23/ تاریخ کو کلائیڈ 17/ تاریخ کو بہرائچ پہنچا۔ اس کے مخبروں نے خبر دی تھی کہ نانا اور بیگم حضرت محل دونوں ہی اس پرانے شہر میں موجود ہیں۔ لیکن جیسے ہی کمانڈر انچیف وہاں پہنچے وہ دونوں وہاں سے رخصت ہو گئے۔ لیکن لارڈ کلائیڈ وہاں پانچ دنوں تک رکے رہے۔ رسل کا کہنا ہے کہ "بہرائچ میں ہم نے سیاسی حکمت عملی کے تحت قیام کیا۔ ایک تو یہ کہ دو بیگمات اپنے کو سپرد کرنا چاہتی ہیں۔ دوسرے ممو خاں نے بھی اس طرح کے اشارے کئے ہیں۔ بلکہ خود بیگم اور برجیس قدر نے سول کمشنر میجر بارو کے پاس اس طرح کے خطوط بھیجے ہیں۔ معمر ہنونت سنگھ اپنے ضدی لیکن بہادر عزیز بنی مادھو کو اس بات کے لیے آمادہ کر رہا ہے اور اسے امید ہے کہ اسے وہ خود سپردگی کے لیے تیار کرلے گا۔ میجر بارو کا یقین ہے کہ اگر ان سرداروں پر زیادہ دباؤنہ ڈالا جائے اور کمانڈر انچیف اس وقت تک وہاں رُکے رہیں جب تک یہاں کے نازک معاملات طے کئے جا رہے ہیں تو اس بات کا امکان ہے کہ وہ اپنے اسلحے رکھ دیں۔ لیکن اگر انہیں کافی وقت نہیں دیا گیا کہ وہ سمجھوتوں کی شق پر غور کر سکیں تو وہ ایسی جگہوں پر روپوش ہو جائیں گے جہاں ان کا تعاقب کرنا ہمارے لیے آسان نہیں ہوگا۔ اس میں پریشانی بھی ہوگی اور اخراجات بھی ہوں گے۔ لیکن میجر بارو کی یہ ساری سفارتی کوششیں اپنا مقصد پورا کرنے میں ناکام ہو گئیں۔ بیگم کو انگریزوں کے وعدوں پر کوئی یقین نہیں تھا۔ بنی مادھو اس وقت تک خود سپردگی نہیں کرتا جب تک بیگم اسلحہ اٹھائے ہوئے ہے۔ نہ ہی ممو خاں اپنے لیے آزادانہ کوئی فیصلہ لے سکتے ہیں نانا اس وقت تک خود کو سپرد نہیں کریں گے جب تک خود ملکہ عالیہ اور وائسرائے دونوں ان کی زندگی کی ضمانت نہیں دیتے اور اس ضمانت کی تائید دوسری بڑی طاقت

بھی کرے۔ اس لیے لارڈ کلائیڈ نان پاڑہ کی طرف آگے بڑھے جہاں ان باغی سربراہوں کی موجودگی کی اطلاع ملی تھی۔ لیکن 26/ تاریخ کواس کے مخبر یہ خبر لائے کہ سارے سربراہوں نے اس جگہ کو چھوڑ دیا ہے۔ ناناپاڑہ کا قلعہ گھنے جنگلوں سے گھرا ہوا تھااور باغی فوجیوں نے اسے اور مضبوط کردیا تھا۔ اور بنی مادھو کاارادہ دشمنوں کو وہاں روک کران سے جنگ کرنے کا تھا۔ لیکن بڑودیہ میں ہوئی جنگ میں ان کی شکست ہوگئی اوروہ ضدی راجپوت پھر روپوش ہوگیا۔اس کے بعد چوردہ کے راجا کا قلعہ جہاں نانا کو دیکھا گیا تھا' پر قبضہ کر کے اسے مسمار کردیا گیا۔29/ تاریخ کو لارڈ کلائیڈ ناناپاڑہ واپس آگئے اور یہاں انہیں معلوم ہوا کہ نانااور بنی مادھوراپتی ندی کے ساحل پر بنکی میں ہیں جو یہاں سے بیس میل کے فاصلے پر تھا۔لارڈ کلائیڈ نے انہیں راتوں رات اچانک پکڑنے کے لیے کوچ کیا۔ لیکن ہر جگہ چوکسی برتی جارہی تھی اور یہ راز راز نہیں رہ سکا۔ نانا نے جو عقب میں دو میل کے فاصلے پر تھے' ندی کو پار کرلیا۔ لیکن باغی فوج ان کے ساتھ نہیں گئی جب تک کہ انہوں نے جنگ نہیں کرلی۔ سارے باغی اب نیپال کی سرحدوں میں داخل ہوگئے تھے۔اور لارڈ کلائیڈ کا کام پورا ہوگیا تھا۔اس لیے 18/ جنوری 1859ء کووہ لکھنؤلوٹ گئے۔"

بنکی میں جو جنگ ہوئی اس میں شکست کھانے کے بعد کچھ سرکردہ باغی لیڈروں نے اپنے آپ کو پیش کردیا۔ رسل کا کہنا ہے "7/ تاریخ کی صبح ہمارے روانہ ہونے سے پہلے فرخ آباد کے نواب اپنے وفاداروں کے ساتھ راپتی پار کرکے آئے اور میجر بارو کے سامنے خود کو سپرد کردیا۔ ایک دوسرے مشہور باغی لیڈر مہدی حسن نے بھی خود سپردگی کردی۔ یہ منظر بڑا دلچسپ تھا۔ بہت خاموشی اور خوداعتمادی کے ساتھ یہ لوگ جوابھی چند گھنٹے قبل ہم سے جنگ کررہے تھے اب بہت آرام کے ساتھ اسپیشل کمشنر کے خیمے میں بیٹھے تھے "گرچہ فرخ آباد کے نواب تفضل حسین اور مہدی حسن نے ایک ہی دن خود سپردگی کی تھی لیکن ان کے ساتھ مختلف قسم کے معاملات کئے گئے۔ لکھنؤ پر قبضہ سے پہلے مہدی حسن اودھ کے بادشاہ کی خدمت میں ایک چکلہ دار تھے۔انہوں نے اپنے بادشاہ اور اپنے ملک کے لیے آخری وقت تک جنگ کی۔اور جب انہوں نے دیکھ لیا کہ مکمل طور پر شکست ہوگئی ہے توانہوں نے اپنے اسلحے رکھ دیئے۔ کمانڈر انچیف کی سفارش پر انہیں ہر ماہ دوسوروپے کی پنشن دے دی گئی۔ لیکن انہیں اس بات کی اجازت نہیں دی گئی کہ وہ اپنے وطن فیض آباد کوواپس لوٹ سکیں۔ لیکن فرخ آباد کے نواب پر مقدمہ چلااور کچھ یورپین کو مارنے کے سبب انہیں موت کی سزادی گئی۔ لیکن چونکہ میجر بارو نے جاں بخشی کا وعدہ کیا تھا' اس لیے انہیں زندہ چھوڑدیا گیا۔انہیں عرب بھیج دیا گیا جہاں وہ خود اپنا انتظام کریں۔

مین پوری کے راجا تیج سنگھ نے 11/ جون 1858ء کو ہی بہت پہلے اپنے آپ کو پیش کردیا تھا۔جب سر ہوپ گرانٹ کی فوجوں نے کانپور جاتے ہوئے اکتوبر 1857ء میں انہیں مجبور کیا کہ وہ اپنے آبائی قلعہ کو چھوڑدیں اور انگریز جنرل نے اس کا انتظام راؤ بھوانی سنگھ جو چوہان راجا کے چچا ہوتے تھے اور گدی کے دعویدار تھے' کے سپرد کردیا تو جیسے ہی ہوپ گرانٹ وہاں سے رخصت ہوا

تیج سنگھ واپس آیا اور بھوانی سنگھ کو مجبور کیا کہ آگرہ میں پناہ گزیں ہو جائیں۔ اپریل 1858ء میں تیج سنگھ ایٹہ پر حملہ کرنے کی غرض سے مین پوری سے چلے۔ لیکن ان کی فوج نے راستے میں ہی ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اور 11/ تاریخ کو اس کے پاس صرف سو فوجی رہ گئے تھے۔ انہوں نے پرتاب نیر کے کنور زوٹ سنگھ کے یہاں قیام کیا جنہوں نے انہیں خود سپردگی کے لیے آمادہ کر لیا۔ تیج سنگھ سے وعدہ کیا گیا کہ ان کی جان بخشی کی جائے گی اور یہ بھی وعدہ کیا گیا کہ ان کی بے عزتی نہیں کی جائے گی اور اگر انہیں حراست میں رکھنا ضروری سمجھا گیا تو بھی عام مجرموں کے ساتھ نہیں رکھا جائے گا۔ راجا کو بنارس بھیج دیا گیا جہاں انہوں نے ماہانہ 250 روپے کے ساتھ اپنی زندگی گزاری اور ان کی سلطنت راؤ بھوانی سنگھ کو دے دی گئی۔

جب لارڈ کلائیڈ نے اودھ میں اپنی آخری مہم شروع کی۔ تو چھوٹی چھوٹی جھڑپیں گورکھپور کے ڈپٹی مجسٹریٹ شیخ خیر الدین اور سید محمد حسن خاں، جو اس وقت قبضہ سے پہلے اس ضلع کے ناظم تھے، کے درمیان چلتی رہیں۔ شیخ خیر الدین نے 13/ نومبر 1858ء کو لکھے سابق ناظم کو اپنے پہلے خط میں کہا کہ باغی اپنی موجودہ تنگ نظری کو چھوڑ دیں جس کا نتیجہ صرف ان کی بربادی ہی ہو گی۔ انہوں نے انہیں ملکہ کے اس فرمان، جو اسی مہینے جاری کیا گیا تھا کا حوالہ دیتے ہوئے بتایا کہ ملکہ نے سبھی کو معافی دیئے جانے کا اعلان کر دیا ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ فرمان کے ذریعے صرف ان لوگوں کو سزا دی جائے گی جو برٹش حکام یا ان کی رعایا کے قتل کے ملزم قرار دیئے جائیں گے۔ ان حالات کے تحت آپ خود غور کریں کہ باغیوں میں شامل رہنا آپ کے لیے کتنا سودمند ہو گا۔ اور اگر آپ کسی طرح بغاوت پر آمادہ رہے تو یا تو آپ کو قید کر لیا جائے گا یا قتل کر دیا جائے گا۔ انہیں یہ بھی مشورہ دیا گیا کہ وہ نہ صرف اس معافی نامے سے خود فائدہ اٹھائیں بلکہ دوسرے سرداروں جیسے گونڈہ کے راجا اور لوگوں کو بھی اس طرح کا مشورہ دیں اور سپاہیوں کو بھی اس بات کی اطلاع دے دیں کہ اعلان نامے کے تحت اگر وہ اپنے اسلحے سپرد کر دیں تو انہیں اپنے گھر جانے کی اجازت مل جائے گی۔ بغاوت کے ابتدائی دنوں میں محمد حسین نے نہ صرف انگریز بھگوڑوں کو اپنے یہاں پناہ دی تھی بلکہ گورکھپور آنے کے لیے راستے میں بھی مدد کی تھی۔ اور وہ کسی عیسائی کے قتل کے ذمہ دار بھی نہیں تھے اور اس لیے وہ اس اعلان نامے سے فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ لیکن ظاہری طور پر وہ ان شرائط کے تحت معاہدہ کرنے سے ہچکچا رہے تھے کیونکہ ان کے آقا کے ساتھ جو غلطی کی گئی تھی، اس کا ازالہ نہیں کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ بیگم ہی کی طرح انہیں بھی اس اعلان نامے کے مقصد کے بارے میں شک تھا۔ انہوں نے جو اس کا طویل جواب دیا وہ دراصل شاہی خاندان کے افراد اور بغاوت کے اسباب کی وکالت تھی تاکہ اپنے لیے پنشن یا معافی کی طلب کر سکے، جو سرکار انہیں دینے کے لیے راضی تھی۔ محمد حسن نے اپنا بیان یورپین خون سے برأت کے اظہار کے ساتھ کیا۔ ''میں نے کبھی کسی سرکاری اہلکار یا رعایا کے خون سے اپنا ہاتھ نہیں رنگا ہے گرچہ یورپین افسران اور ان کے سپاہیوں نے ہزاروں بے گناہوں اور معصوم لوگوں کو بشمول عورتوں، اندھوں،

سادھوؤں کو جان سے مار دیا ہے' اور ان کی جھگیوں کو آگ لگا کر ان کی املاک کو لوٹ لیا ہے۔"
انہیں اس بات کا اعتراف تھا کہ انہیں ڈرانے کی غرض سے خیر الدین نے جس انگریزی طاقت کا حوالہ دیا ہے' وہ صحیح ہے۔ اور انہیں اب باغیوں کے ساتھ رہنے میں کوئی فائدہ بھی نظر نہیں آتا۔ "وہ قدیر جس کا نام قوی اور نگہبان ہے' وہ ہر جگہ موجود ہے۔ اگر کوئی دشمن قوی ہے تو وہ قوی تر ہے۔ وہ جب چاہے قوی کو کمزور اور کمزور کر قوی کر سکتا ہے اور جسے چاہے اعلیٰ عہدے پر بٹھا سکتا ہے اور چاہے تو اعلیٰ عہدے سے گرا سکتا ہے۔" "نہ ہی مجھے اس بات کا خوف ہے کہ میں پکڑ لیا جاؤں گا یا مار دیا جاؤں گا۔" انہوں نے مزید کہا کہ اگر اتفاقاً انہیں پکڑ لیا جاتا ہے تو بھی انہیں خوف کھانے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ اعلان نامے کے تحت انہیں کوئی سزا نہیں دی جا سکتی۔ اور اپنے مذہب اور اپنی اس زمینی حکومت کے لیے لڑتے ہوئے میں شہید ہو جاتا ہوں' تو میرے لیے دونوں جہان کی نعمتیں ہیں۔ اس کے بعد وہ اعلان نامے کے متن پر غور کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ جن الفاظ کے ذریعے معافی دیئے جانے کا اعلان کیا گیا ہے' وہ بہت مبہم اور غیر واضح ہے' اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں۔ "ہندوستان کے انگریز حکمراں اپنے ان معاہدوں سے مکر گئے جو انہوں نے مقامی راجاؤں سے کیے تھے اور معاہدوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے انہوں نے وہ عمل کئے جو انہیں نہیں کرنا چاہیے تھے۔ پھر آپ ایسی یقین دہانی پر کس طرح اعتماد کر سکتے ہیں؟ جس کی مختلف طریقے سے وضاحت کی جا سکتی ہے۔ اور اودھ کے بادشاہ کے ساتھ جو سلوک کیا گیا وہ سب پر واضح ہے۔ مختلف بہانے کر کے ان کا تخت و تاج ایسے خاندان سے چھینا گیا جس نے کبھی انگریز حکومت کی کسی بھی صورت میں مخالفت نہیں کی۔ ہندوستان کے راجا اور یہاں کے عوام ...... نے فوجیوں کی بغاوت سے فائدہ اٹھایا...... اور پھر یہ بغاوت پھیل گئی جس میں ہزاروں مذہبی لوگوں کی جانیں لے لی گئیں۔ انہوں نے کہا یہ موجودہ بغاوت اودھ پر غیر قانونی طریقے سے قبضہ کرنے کے خلاف ہے اور اگر یہ ناانصافی نہ کی گئی ہوتی تو کوئی خون نہ بہتا۔ کیونکہ سبھی سردار باغیوں کے خلاف لڑتے۔ اس لیے محمد حسن امید کرتا ہے کہ ملکہ عالیہ اودھ کو اس کے قانونی حکمرانوں کو واپس کر دے گی۔ کیونکہ انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے جو معاہدے کئے تھے وہ ان کا احترام کرے گی۔ اور راجاؤں کو یقین دلایا ہے کہ وہ اپنی سرحدوں کو مزید وسعت نہیں دے گی۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ اعلان نامے میں "اس وقت جن پر قبضہ ہے" کے الفاظ ان سب جگہوں پر منطبق ہونا چاہئیں' جب اعلان نامہ لکھا گیا تھا اور اس وقت تک اودھ کا بڑا حصہ برٹش قبضے سے باہر تھا۔ "ہم اودھ کے بادشاہ کے خادم اپنی دونوں جہاں کی خیر و برکت کے لیے یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ اس حکومت کی حفاظت کے لیے لگ جائیں اور حملہ آوروں کی ان کوششوں کو ناکام کر دیں جس سے وہ یہاں قدم جمانا چاہتے ہیں اور اگر ہم اپنی اس ذمہ داری کو پوری کرنے میں ناکام رہتے ہیں تو ہم باغی کہلائیں گے اور دونوں جہان میں ہم رسوا ہوں گے۔"
خیر الدین جو برٹش حکومت کا وفادار ملازم تھا وہ عورتوں بچوں اور اندھوں کے قتل کے

الزام کو یونہی نہیں جانے دیتا' اس نے ان سب کی تردید کی۔ اس نے اس بات کی بھی پُر زور تردید کی کہ برٹش فوجی عورتوں' بچوں کے قتل کے ملزم تھے۔ اور ناظم پر یہ الزام لگایا کہ ناظم نے بالا راؤ کے ساتھ مل کر اور اس کے بھائیوں کے ساتھ مل کر اس طرح کے جرم کیے ہیں۔ "جو کچھ بھی آپ نے اودھ کی حکومت کو واپس کرنے اور اپنی بغاوت کے اسباب اس سے جوڑنے کی کوشش کی ہے وہ سب سراسر بکواس ہے۔ سرکار نے جس زمین پر قبضہ کر لیا ہے اس کا ایک بیگہ اب دینے سے رہی۔ اب اس بیکار کی بحث سے آپ کو کیا فائدہ ہوگا؟ جو کچھ آپ سے متعلق ہو' اس کے بارے میں آپ جو چاہیں لکھ سکتے ہیں' حکومت کے تعلق سے کچھ نہیں۔ مختصراً میں اب بھی یہ موقع دیتا ہوں کہ اگر آپ کو اپنی جان بچانی ہو تو فوراً ہی اپنے کو سپرد کر دیں۔" خیر الدین نے محمد حسن کو یہ بھی یاد دلایا کہ رحم دلی کا یہ موقع چالیس دنوں کے بعد ختم ہو جائے گا اور اس کے بعد یورپین افسروں سے منت و سماجت کرنا بھی چاہیں گے تو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

ان دھمکیوں کا فوری طور پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ ناظم اپنی دُھن میں پکا تھا اور انہوں نے بہت ٹھنڈے دماغ سے اس خط کا جواب دیا۔ انہوں نے اس بات کا اعادہ کیا کہ اپنی زندگی کے لیے وہ باغی فوجیوں پر منحصر نہیں ہیں۔ میرا مکمل اعتماد اس عظیم قادر مطلق پر ہے جو ہر جگہ موجود ہے۔ اگر وہ میری حفاظت کرتا ہے تو دشمن کی فوج بھی میرا کچھ نہیں کر سکے گی۔ اور اگر اس کی مرضی نہ ہو تو بہت بڑی فوج بھی میرے کسی کام کی نہیں۔" "سرکار نے ہر طرح کے مظالم روا رکھے ہیں۔ اور یہ میری حماقت ہوگی اگر میں یہ امید کروں کہ کرنل لیک (لیناکس) اور اس کی دو خواتین کو بچا کر انہیں کوئی معافی نامہ مل جائے گا۔" "اگر میں اپنی جان اور دنیاوی دولت کو اپنے مذہب سے برتر سمجھوں تو میں یقیناً آپ کے پاس آجاؤں گا۔" "میں نہ ہی بالا راؤ' نہ ہی نانا راؤ کا خادم ہوں' نہ ہی میں ان کے کیمپ کانپور میں گیا۔ اس لیے ان لوگوں نے انگریز عورتوں اور بچوں کے ساتھ جو جرم کیا' وہ مجھ پر عائد نہیں ہو سکتا۔" "میں نہیں سمجھتا کہ میری خود سپردگی قانون کے مطابق ہوگی بلکہ یہ مجرمانہ فعل ہوگا۔ جہاں تک دوسری باتیں جو آپ نے لکھی ہیں' ان کا جواب دینا تضیع اوقات ہوگا' اس لیے اسی کو کافی سمجھیں۔"

اودھ کے حکمرانوں کے ساتھ لوگوں کی محبت کی اس سے بہتر مثال اور نہیں مل سکتی جو ناظم محمد حسن کے خطوط سے ظاہر ہیں۔ وہ اپنے مذہب اور اپنے بادشاہ کے لیے لڑ رہے تھے۔ اور ان کا مذہب ان پر یہ ذمہ داری عائد کرتا ہے کہ وہ اپنے بادشاہ کے ساتھ وفادار رہیں۔ بعد میں بہت سے دوسرے مقامی سرداروں نے بھی محمد حسن کو آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ اپنے کو سپرد کر دیں۔ خاص طور پر شنکر پور کے بینی مادھو' گونڈہ کے دیوی بخش' بسوا کے گلاب سنگھ' جو نیپال کے جنگلوں میں ملیریا سے مر گیا۔ لیکن جنہوں نے نہ تو اپنی زمینی حکومت چھوڑی اور نہ ہی آسمانی طاقت میں اپنا یقین۔

باغی ناظم کی مراسلت کے لہجے سے گورنر جنرل کافی متاثر نظر آئے۔ جیسا کہ انہوں نے

اپنے نوٹ میں لکھا "ان خطوط کی نقل کمانڈر انچیف کو بھیجیں اور ان سے بتائیں کہ محمد حسن کو معاف کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ انہوں نے کرنل لیناکس اور ان کے خاندان والوں کو پناہ دی اور حفاظت کی تھی۔ اور اگر محمد حسن کو کمانڈر انچیف پکڑلیں یا ان سے شرائط رکھیں تو نہ صرف ان کی زندگی اور آزادی کی یقین دہانی کرائی جائے بلکہ اچھی طرح سے گزارے کے لیے بھتہ دینے کی بھی پیش کش کی جائے۔ گرچہ موجودہ منظرنامے سے انہیں ہٹانا ضروری ہے۔" لیکن گورکھپور کے کمشنر ونگ فیلڈ اتنے رحم دل نہیں تھے۔ انہیں کے کہنے پر خیر الدین احمد نے محمد حسن سے مراسلت شروع کی تھی اور انہیں اس کا جو ٹکا سا جواب ملا، شاید اسی سے کمشنر زیادہ بدظن ہو گیا۔ اس لیے اس نے جی ایف ایڈ منڈ اسٹون خارجہ سکریٹری کو 26ر دسمبر 1857ء کو یہ خط لکھا۔ "گرچہ یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس میں ہماری حکومت کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ تاہم صرف اس وجہ سے کہ اس کے ایک واحد انسانیت بھرے کام کے لیے اس سے غیر ضروری طور پر متاثر نہ ہوا جائے۔ میں آپ کی توجہ اس بات کی طرف لے جانا چاہتا ہوں کہ اس نے کھلی عدالت میں بینکر رام دت کا غلط طریقے سے قتل کیا۔ اس کی تفصیل اودھ پر قبضہ کے سرکاری دستاویز میں موجود ہے۔ اگر وہ اودھ حکومت کی ذریعہ اس وقت پکڑا جاتا تو کرنل سلیمن اس وقت اسے موت کے گھاٹ اتار دیتے۔" اور جب اس نے ملٹری حکام کے سامنے اپنے کو سپرد کیا تو ونگ فیلڈ نے شکایت کی کہ سرہوپ گرانٹ نے باغی سردار کو بہت زیادہ مراعات دیں اور تکریم کی اور محمد حسن پر الزام تھا کہ اس نے ایک یورپین مسٹر پیپ (Peppe) کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ ہوپ گرانٹ نے فوراً ہی اس بات کی تردید کی کہ محمد حسن کے ساتھ اس کے کیمپ میں خاص طرح کا برتاؤ کیا گیا۔ اور یہ ناظم کی خوش قسمتی تھی کہ مسٹر پیپ اس وقت زندہ تھے۔ ناظم اودھ کے تعلقدار خاندان سے تعلق نہیں رکھتا تھا۔ اور اس کی کوئی زیادہ آمدنی بھی نہیں تھی اور اسے حکومت کے خادم کے بطور صرف تنخواہ ملتی تھی۔ اس لیے دوسو روپے کا ماہانہ وظیفہ اس کے لیے کافی سمجھا گیا۔ اور حکم دیا گیا کہ وہ سیتاپور ضلع میں رہے۔

سارے باغی سردار نیپال کی طرف نکل گئے۔ ان کے رسالداروں کی تعداد کا اندازہ چار سے 25 ہزار تک لگایا گیا ہے۔ ان کی مراسلت سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان بھگوڑوں کو اپنی پناہ کے علاقے کے حکمراں سے ہمدردی کی امید تھی اور یہ کوشش کی گئی کہ جنگ بہادر کی حمایت کسی طرح حاصل کرلی جائے۔ لیکن جنگ بہادر نے جنوری ۱۸۵۹ء میں ہی یہ واضح کر دیا کہ اپنے برٹش حلیف کے دشمنوں سے اسے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ 15ر جنوری کو اس نے اودھ کی بیگم کو لکھا "سب کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ برٹش حکومت اور نیپال حکومت کے درمیان گہری دوستی بنی ہوئی ہے اور معاہدے کے تحت دونوں کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ ان میں سے کسی کے بھی دشمن کو پکڑیں تو ایک دوسرے کے حوالے کر دیں۔ اس لیے میں آپ کو لکھتا ہوں کہ اگر آپ میری حکومت یا میری سرحدوں میں پناہ لینا چاہیں تو گورکھا فوج معاہدے کے تحت آپ پر حملہ کر دے گی...... اور یہ بھی جاننا چاہیے کہ نیپال حکومت نہ تو آپ کی مدد کرے گی نہ آپ کے ساتھ کوئی

رحم کرے گی اور نہ ہی اس بات کی اجازت دے گی کہ آپ اس کی حکومت یا سرحدوں میں رہیں' آپ سب لوگ اتنے زیادہ بے وفا اور ناشکرے ہیں کہ اپنے ان آقاؤں کے خلاف بغاوت کرتے ہیں جن کا نمک آپ نے کھایا ہے۔'' جنگ بہادر اپنی سرحدوں میں باغیوں کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ اس کی اپنی حکمرانی ظالم فوج پر منحصر تھی' نہ کہ لوگوں کی حمایت کی وجہ سے۔ وہ شہزادوں کے مرتبے کے بھگوڑوں کو اپنے ہاں پناہ دینے سے بھی اپنے ملک کی روایت کے خلاف انکار کر سکتا تھا۔ لیکن وہ کچھ نرم پڑ گیا۔ جیسا کہ برجیس قدر کے پہلی فروری کے خط سے ظاہر ہے کہ اسے جنگ بہادر کی طرف سے ایک خط موصول ہوا ہے جس پر 8/ ماگھ 1915 سمت (26/ جنوری 1859ء) کی تاریخ پڑی ہے جس میں خواہش ظاہر کی گئی ہے کہ وہ اپنی فوج' راجاؤں اور تعلقداروں کے ساتھ چتون چلے جائیں۔ 18/ فروری کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ممو خان نے جنگ بہادر کے بھائی بدری نرسنگھ کو پندرہ ہزار روپے دینے کی پیش کش کی تھی اور باغیوں میں سے دوسرے راجاؤں نے بھی اسے جواہرات دینے کی پیش کش کی' اگر جنگ بہادر کے ساتھ ایک ملاقات ہو جائے۔ لیکن ان ساری پیش کش سے انکار کر دیا گیا۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے نیپال حکومت نے طے کر لیا تھا کہ اگر ممکن ہو تو بات چیت کے ذریعہ باغی سرداروں کو خود سپردگی کے لیے تیار کیا جائے۔ نہیں' تو پھر طاقت کے ذریعے۔

سارے بھگوڑے چتون' بھٹول اور نیا کوٹ کے درمیان ادھر سے ادھر بھاگتے رہے۔ اور اس درمیان انہیں کافی نفسیاتی دباؤ کا سامنا کرنا پڑا۔ کچھ باغیوں کو تو اپنی مسکٹ بیچ کر کھانے کا سامان لینا پڑا۔ گورکھا انہیں چاول بیچنے کو تو تیار تھے لیکن اس کی اتنی زیادہ قیمت مانگتے جو سب کے بس کی بات نہیں تھی۔ اور بھوک کی وجہ سے بخار اور پیچش نے مل جل کر کافی لوگوں کی جانیں لے لیں۔ نیپال سرکار نے اپنے فوجیوں کو ان بن بلائے مہمانوں کو پکڑنے اور اپنی سرحدوں سے نکالنے کا کام سپرد کر دیا تھا۔ اسی طرح کی ایک مڈ بھیڑ میں بینی مادھو اور دبیر جنگ بہادر جو شنکر پور کا جری ہیرو تھا' کی موت ہو گئی۔ وہ اپنے کو پکڑوانا نہیں چاہتے تھے۔ اس لیے انہوں نے دانگ گھاٹی میں گورکھا فوج کے ساتھ جنگ کی اور اپنے بہت سے فوجیوں کے ساتھ مارے گئے۔ اس کا بھائی جوگ راج سنگھ بھی اس موقع پر مارا گیا۔ اس کا دوسرا بھائی اس کی بیوہ اور لڑکا نیپال میں دسمبر 1859ء تک رہے۔ لڑکے کی عمر تیرہ یا چودہ سال تھی جب اس کے باپ کی موت ہوئی۔ اسے 6/ ہزار روپے سالانہ آمدنی کی ایک جاگیر دے کر سیتاپور تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیج دیا گیا۔ نواب ممو خاں' خان بہادر خاں' بریگیڈیر جوالا پرشاد اور کچھ دوسرے غیر اہم لوگوں کو پکڑ کر برٹش حکام کے سپرد کر دیا گیا۔ گونڈہ کے راجا دیوی بخش' خیر آباد کے چکلہ دار ہر پرشاد اور بسوا کے گلاب سنگھ کی نیپال میں موت ہو گئی۔ لیکن وہ کیسے مرے اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ بوندی کے ہردت سنگھ بھی مارے گئے۔ نانا کے دوست عظیم اللہ کی موت بھٹول میں اکتوبر میں ہو گئی۔ ترائی کے ملیریا نے بالا صاحب اور شاید اس کے بھائی نانا صاحب کو بھی اپنا شکار بنا لیا۔

اپریل 1859ء میں نانا اور بالا نے برٹش حکام کے ساتھ خود سپردگی کی شرائط کے بارے میں مراسلت شروع کی۔ لیکن لہجے اور مقصد میں دونوں کے خط الگ الگ تھے۔ بالا صاحب نے انگریزوں کو عرضداشت بھیجی۔ نانا نے انگلینڈ کی ملکہ کے نام ایک اشتہار جاری کیا۔ بالا نے اس بغاوت کی ساری ذمہ داری اپنے بھائی پر ڈال دی۔ "فوجی مجھے وہاں سے الگ نہیں ہونے دے رہے تھے۔ اور نہ ہی میرا بھائی مجھے اس بات کی اجازت دے رہا تھا کہ میں اس کو چھوڑ کر کہیں جاؤں' میں مجبور تھا کہ اپنے بھائی کے تابع رہوں۔ میں نے ایک نو دس سال کی بچی کی جان بچائی ہے جو فتح پور کے جج کی بیٹی تھی۔ اور اسے اپنی بیوی کے پاس چھپا دیا تھا۔ جسے میں نے بعد میں جنرل بدری نرسنگھ کو بھی دکھایا۔ اب یہ آپ کے اختیار میں ہے کہ آپ جیسا چاہیں میرے ساتھ سلوک کریں۔ آپ مجھے قید کر سکتے ہیں۔ مار سکتے ہیں یا پھانسی لگا سکتے ہیں۔" لیکن نانا اب بھی اُسی موڈ میں تھے۔ اس کے سر کی قیمت ایک لاکھ روپے لگائی گئی تھی۔ اور جو شخص بھی اسے پکڑتا اسے بغیر شرط کے معافی دینے کا اعلان کیا گیا تھا' چاہے اس نے کتنے ہی انگریزوں کا قتل کیا ہو۔ لیکن انہوں نے سختی سے اس بات سے انکار کیا کہ انگریز مرد اور عورتوں کے مارنے میں اس کا کوئی ہاتھ تھا اور نہ ہی انہوں نے معافی یا رحم کی کوئی اپیل کی۔ "آپ نے سبھی کے جرائم معاف کر دیے ہیں۔ اور نیپال کا راجا آپ کا دوست ہے۔ ان ساری باتوں کے باوجود آپ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے۔ آپ نے سبھی لوگوں کو اپنا حمایتی بنالیا ہے اور میں اکیلا پڑ گیا ہوں۔ لیکن آپ دیکھیں گے کہ جن فوجیوں کو میں نے پچھلے دو سال سے بچا کر رکھا ہے' وہ کیا کر سکتے ہیں۔ ہم پھر ملیں گے اور تب میں آپ لوگوں کا خون بہاؤں گا۔ اور خون گھٹنوں تک بہے گا۔ میں مرنے کے لیے تیار ہوں۔" یہ ناامیدی کا آخری داؤں تھا یا کبھی نہ جھکنے والی روح کی للکار تھی' یہ طے کرنا مشکل ہے۔

میجر رچرڈسن' جسے ایک برہمن نے یہ اشتہار نامہ دیا تھا' نے جواب میں لکھا "ہر میجسٹی ملکہ عالیہ انگلینڈ نے جو فرمان جاری کیا وہ کسی ایک شخص یا کسی ایک پارٹی کیے لیے نہیں بلکہ' سب کے لیے ہے۔ اور جن شرائط کے تحت فرخ آباد کے نواب' باندہ کے نواب اور اودھ کے دوسرے سرداروں اور راجاؤں نے اپنے اسلحے رکھے رہیں اور خود کو سپرد کیا ہے' وہ ساری شرائط آپ کے لیے بھی ہیں اگر آپ خود کو سپرد کرنا چاہیں۔ چونکہ آپ نے خود ہی لکھا ہے کہ آپ نے میموں اور بچوں کا قتل نہیں کیا ہے۔ تو پھر آپ کو کیا چیز روکتی ہے۔ آپ بے خوف و خطر آجائیں۔" اس جواب پر گورنر جنرل اِن کونسل کی منظوری نہیں تھی اور اس لیے یہ فیصلہ کیا گیا کہ مستقبل میں "ایسے باغی سردار جنہیں سرکار نے مجرم قرار دیا ہے' یا جنہوں نے انگریزوں کے قتل میں حصہ لیا ہے' کی طرف سے ملنے والے خود سپردگی کے تمام اشاروں کا جواب ملکہ کے فرمان کا حوالہ دے کر بغیر تبصرہ کے دینا ہے۔" لیکن نانا صاحب نے ان شرائط پر اپنے کو پیش کرنے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے جواب دیا "میں اس طرح اپنے کو سپرد نہیں کر سکتا۔ اگر ہر میجسٹی ملکہ عالیہ خود کوئی خط لکھیں اور اس پر ان کے دستخط اور مہر ہوں اور جو فرانسیسی کمانڈنگ افسر یا نائب کمانڈر لے کر مجھ

تک آئے تو میں ان افسروں پر بھروسہ کرنے کے بعد آپ کی شرائط کو بغیر کسی جھجک کے تسلیم کرلوں گا۔ میں آپ کے پاس کیوں آؤں؟ میں ہندوستان میں آپ کے ذریعہ کی گئی دغابازی سے اچھی طرح واقف ہوں۔ زندگی تو آخر ایک نہ ایک دن ختم ہونا ہے۔ پھر میں بے عزتی کی موت کیوں مروں؟ میرے اور آپ کے درمیان جنگ چلتی رہے گی۔ اور چاہے میں مارا جاؤں' قید کیا جاؤں یا پھانسی پر لٹکایا جاؤں۔ جو کچھ بھی میں کروں گا اپنی تلوار کی مدد سے کروں گا۔'' بہت دنوں تک نانا بھی پکڑ میں نہ آنے والے چھلاوا بنے رہے۔ کانپور کے ابتدائی فرمانوں میں بھی وہ پس منظر میں رہے۔ پھر وہ خاموشی کے ساتھ بٹھور سے فرخ آباد' فرخ آباد سے بریلی' بریلی سے بہرائچ اور وہاں سے ترائی کے جنگلوں میں فرار ہوگئے۔ انہوں نے اپنی تلوار کے سہارے آخر کار اسٹیج کو خیر باد کہا۔ ان کے اندر بہت زیادہ تاریخی شعور تھا۔ پھر ان کے ساتھ کیا ہوا۔ ہم نہیں جانتے۔ نیپال حکومت مطمئن تھی کہ وہ اب مر چکے ہیں۔ حکومت ہند کو اب بھی اس کا یقین نہیں تھا۔ نانا ایک ایسی علامت بن گئے تھے جس سے آسانی سے پیچھا نہیں چھڑایا جاسکتا تھا۔

پیشوا گھرانے کی عورتیں' باجی راؤ دوم کی دو بیوائیں' نانا کی بیوہ اور بالا کی بیوہ کو نیپال میں اپنے آخری ایام گزارنے کی اجازت دی گئی۔ ان کے ساتھ بھٹ خاندان کی آخری نشانی باجی راؤ کی نوجوان لڑکی تھی' جو اپنی سوتیلی ماں اور بھابھیوں کو چھوڑ کر اپنے شوہر کے پاس گوالیار چلی گئی جب وہاں امن قائم ہوگیا۔

اودھ کی بیگم حضرت محل نے اپنے لڑکے اور چند محافظوں کے ساتھ گورکھاؤں کے ملک میں رہنا پسند کیا۔ جب کہ ان سے انہیں اچھی خاصی پنشن دینے کا وعدہ کیا گیا تھا' جو ان کے شوہر اودھ کے سابق بادشاہ کو دیئے جانے والے بھتہ سے الگ ہوتا۔ ان کے رتبے کے مطابق انہیں سارا احترام بھی دیئے جانے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ لیکن انہیں ہندوستان واپس لوٹنے کے لیے تیار نہیں کیا جاسکا۔ وہ بڑی باہمت اور باصلاحیت خاتون تھیں۔ ان کے بارے میں رسل کا کہنا ہے ''انہوں نے سارے اودھ کے علاقے میں لوگوں کو اکسایا کہ وہ ان کے لڑکے کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوں۔ اور سبھی سرداروں نے ان سے وفاداری کا عہد لیا''...... ''بیگم نے ہم لوگوں کے خلاف تاحیات جنگ چھیڑ رکھی ہے' اور ان کی مملکت پر قبضہ کرنے اور ان کے ساتھ ہوئے معاہدے کو ترک کرنے اور ان کے خاندان سے جو قرض لیا گیا تھا اس کے لیے ناشکری کرنے اور نازک حالات میں انہوں نے ہمیں جو مدد پہنچائی ان سب کی اندیکھی کرنے اور فراموش کردینے کی وجہ سے ان کے اندر یہ احتجاجی اور استہزائیہ لہجہ پیدا ہوگیا ہے۔'' جنگ ہارنے کے بعد بھی برٹش پنشن کو نامنظور کرکے انہوں نے اپنے بیٹے کی جانشینی کے اختیار کو بحال رکھا ہے۔ وہ اپنے شوہر اور بادشاہ کے مقابلے میں بہت جری اور باعزت 'مرد' تھیں۔

خان بہادر خاں کو اپنی خواہشات کے لیے اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔ ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ مجرم قرار دیا گیا۔ اور پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ انہوں نے فضول میں یہ جواز رکھا کہ وہ اگر مجرم

ہوتے تو اپنے کو پیش نہ کرتے۔ ان کے خلاف بہت زیادہ اور مضبوط شہادتیں موجود تھیں۔ دلّی کے بادشاہ، جھانسی کی رانی اور اودھ کی بیگم کی طرح وہ آزاد نہیں، بلکہ ایک برٹش رعایا تھے۔ اور گرچہ ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے ملک کی سیاسی آزادی کے لیے لڑائی کرے، لیکن اس لڑائی میں ناکامی کی سزا موت ہی ہوتی ہے۔ شوبھارام، جوان کا وزیر خزانہ تھا، اسے پھانسی نہیں لگائی گئی۔ لیکن تاحیات قید کی سزا دی گئی جو موت سے بھی بدتر تھی۔ بعد میں انہیں مول مین بھیج دیا گیا۔

بخت خاں جو دلّی کی شکست کے بعد لکھنؤ آگئے تھے، انہوں نے لکھنؤ کی حفاظت اور بعد کی جنگوں میں کیا رول ادا کیا، اس کے بارے میں قطعی کچھ معلوم نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ 13/ مئی 1859ء کو میدانِ جنگ میں لڑتے ہوئے ان کی موت ہوگئی۔

جوالا پرشاد کو کانپور کے ستی چوراگھاٹ پر 3/ مئی 1860ء کو پھانسی دے دی گئی۔

اپنے سارے رہنماؤں کے منظر نامے سے غائب ہونے کے بعد عام فوجیوں نے اپنے بچے کھچے اسلحے بھی سپرد کردیے۔ وہ موت کے اس جال سے بچ گئے، جہاں موت کا خطرہ انہیں لے گیا تھا اور اپنے گاؤوں اور گھروں کو لوٹ گئے۔ یہ فیصلہ کیا گیا کہ بہار کے لیڈروں کو ویسے ہی چھوڑ دیا جائے۔ نیپال حکومت نے تقریباً دو ہزار مسلح باغیوں کو اپنے برٹش حلیفوں کے سپرد کردیا تھا۔

ہم نے تانتیا اور راؤ صاحب کو جاوراعلی پور میں شکست کے بعد انہیں راجپوتانہ کے راستے میں چھوڑ دیا تھا۔ تانتیا کو یہ احساس ہوگیا کہ عوامی تعاون کی بدولت ہی وہ محفوظ رہ سکے گا۔ عوام سے وہ فعال تعاون کی امید نہیں کرتا تھا۔ لیکن وہ اس بنا پر ان کو اپنے سے الگ بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اس لیے راؤ صاحب نے اعلان کیا کہ ان کی فوج کو جس چیز کی بھی ضرورت ہوگی وہ قیمتاً خریدی جائے گی۔ تاکہ گاؤں والے انہیں آتا دیکھ کر بھاگ نہ جائیں۔ ان کے ساتھ کسی قسم کی زبردستی نہیں کی جائے گی۔ اس کے برخلاف وہ ہر چیز کو مارکیٹ ریٹ سے زیادہ قیمت دے کر خریدیں گے۔ اس طرح کسانوں اور تاجروں کو اپنا بنا کر تانتیا نے ہندوستانی راجاؤں کی فوج پر اپنی توجہ مبذول کی۔ انہی افواج سے اس کی امیدیں وابستہ تھیں اور اس میں اسے کبھی ناامیدی بھی نہیں ہوئی تھی، وہ چمبل پار کرکے جے پور کی طرف بڑھا لیکن اس طرف اس کی پیش رفت کی اطلاع جنرل رابرٹس کو مل گئی۔ اس لیے تانتیا نے اپنا رخ ٹونک کی طرف کردیا۔ نواب نے چند وفاداروں کے ساتھ قلعے میں اپنے کو بند کرلیا، لیکن اس کی ساری فوج باغیوں کے ساتھ مل گئی۔

کرنل ہومس کی وجہ سے آنے والی دشواریوں کے سبب تانتیا بوندی کی دشوار گزار پہاڑیوں سے ہوتے ہوئے میواڑ میں داخل ہوا۔ اگست میں رابرٹس نے بھیلواڑہ کے قریب تانتیا کو شکست دی اور وہ کنکرولی کی طرف بھاگ نکلا۔ رابرٹس نے اس کا تعاقب کیا۔ اور اسے باناندی کے ساحل پر دوبارہ شکست دی۔ لیکن ان ساری شکستوں کے باوجود تانتیا نے ہمت نہیں ہاری۔ جب ہر شخص یہ سوچ رہا تھا کہ اس ندی کو پار کرنا ممکن نہیں ہے، وہ چمبل کو پار کرکے جھالراپٹن میں نظر آیا۔ جو جھالاواڑ ریاست کی دارالسلطنت تھا۔ راجا کی فوج نے فوراً باغیوں کی حمایت کی اور تانتیا نے

بطورِ تاوان بہت بڑی رقم طلب کی۔ راجا اسے پانچ لاکھ روپے دے کر خود فرار ہو گیا۔ تانتیا اور راؤ صاحب اب اندور سے پچاس میل کے فاصلے پر تھے۔ اور اگر وہ گوالیار کے اپنے پہلے حملے کو دوہرا کر گوالیار کے راجا کے خلاف فوج تیار کر لیتا تو بہت نازک حالت ہو جاتی۔ لیکن جنرل مائیکل نے احتیاطی تدابیر کرتے ہوئے اندور کی حفاظت میں ایک چھوٹی فوج اجین بھیجی۔ 15/ستمبر کو اس نے بیوڑہ کے نزدیک تانتیا کو شکست دی۔

مائیکل سے شکست کھانے کے بعد تانتیا نے اپنی فوج کو تقسیم کیا اور لڑائی کے لیے بندیلکھنڈ کے علاقے کا انتخاب کیا۔ اسے خود چندیری کے قلعہ کی طرف بڑھنا تھا اور راؤ صاحب کو اپنی فوج کے ساتھ جھانسی کی طرف جانا تھا۔ اس اہم قلعہ پر قبضہ پانے میں ناکام ہونے پر تانتیا بیتوا ندی کے مغربی علاقے کی طرف نکل گیا۔ یہاں مائیکل نے اس کا تعاقب کیا اور 10/اکتوبر کو منگرولی میں اسے پھر شکست دی۔ لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری۔ اس نے نرمدا کو پار کیا اور آج کے مدھیہ پردیش کے علاقے میں داخل ہو گیا۔ گرچہ وہ سابق مراٹھا حکومت میں کوئی عوامی تعاون نہیں حاصل کر سکا، پھر بھی نا امید نہیں ہوا۔ اس نے اپنے دشمنوں کو ہر جگہ مستعدی سے تعینات دیکھا۔ اور وہ اسیر گڑھ کی طرف بڑھ گیا۔ یہ علاقہ بھی پوری طرح محفوظ تھا۔ اس لیے وہ کورگاؤں کی طرف بڑھا جہاں ہولکر کی کچھ باغی فوجیں اس کی مدد کے لیے آ گئیں۔ اس کے دشمنوں کی ساری کوششوں کے باوجود تانتیا نے پھر نرمدا ندی کو پار کیا اور بڑودہ کی طرف نکل گیا۔ جہاں مراٹھا حکومت قائم تھی اور اسے امید تھی کہ اسے پیشوا سے مدد ملے گی۔ لیکن بڑودہ پہنچنا اس کی قسمت میں نہیں تھا۔ کیونکہ پارک، بڑودہ سے پچاس میل دور چھوٹا اودے پور میں اس کے مقابل آ گیا۔

گجرات کی طرف بڑھتے ہوئے راؤ صاحب اور تانتیا دونوں ایک چھوٹی راجپوت ریاست بانسواڑہ میں داخل ہوئے۔ بانسواڑہ سے یہ دونوں باغی لیڈر دوسری بار پھر میواڑ میں داخل ہوئے۔ کیسری سنگھ جو سلم باڑ کا سردار تھا۔ اس کی راجا سے نہیں بنتی تھی اور تانتیا کے اندر کے ڈپلومیٹ کو امید تھی کہ وہ ان کے اختلافات کا فائدہ اٹھا لے گا۔ اس سردار نے اسے کچھ رسد بہم پہنچائی اور وہ بھیل واڑہ سے ہوتے ہوئے پرتاب گڑھ نکلا جو دوسری چھوٹی راجپوت ریاست تھی۔ لیکن اس کے دشمنوں نے اسے کہیں بھی راحت کی سانس نہیں لینے دی۔ وہ جدھر نکلتا ادھر دشمن موجود ہوتے۔ پرتاب گڑھ میں بھی دشمنوں کی فوج موجود تھی اس لیے وہ پرتاپ گڑھ سے بھاگ کر مانڈی سور گیا اور مانڈی سور سے زیراپور۔

1859ء میں وہ کوٹہ کی سرحدوں میں داخل ہوا۔ ناہر گڑھ میں اس کا نیا دوست اور حلیف مان سنگھ اس سے مل گیا۔ شاید یہ پریشانیاں ہی تھیں جس سے یہ دو مختلف لوگ ایک ساتھ ہو گئے۔ مان سنگھ کو انگریزوں سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ وہ نارواڑ کا راجپوت سردار تھا اور وہ گوالیار کے مراٹھا حکمراں کے خلاف اپنے حقوق کی حفاظت میں کھڑا ہوا تھا۔ جیسے ہی اس نے پاوڑی کے قلعہ پر قبضہ کیا، انگریزوں سے اس کی جنگ شروع ہو گئی۔ جنرل نیپر نے اسے اس قلعہ سے بے دخل

کر دیا۔ اور پھر مان سنگھ اپنے علاقہ کے جنگلوں میں چلا گیا۔ اس کا ساتھ چھوڑ کر تانتیا اندر گڑھ میں شہزادہ فیروز شاہ سے ملنے چلا گیا۔

فیروز شاہ کی فوجیں بہت کم رہ گئی تھیں۔ کیونکہ اس کو بھی نیپئر کے ہاتھوں شکست ہوئی تھی۔ گنگا کو پار کر کے فیروز شاہ کونچ اور کالپی کی طرف بڑھا۔ یہ ایسا علاقہ تھا جس سے اس کے فوجی بہت زیادہ واقف تھے۔ نیپئر نے پھر اس کا راستہ روکنے کا فیصلہ کیا۔ دونوں فوجیں اچانک رانوڈ میں آمنے سامنے آگئیں۔ لیکن دونوں ایک دوسرے کی چال سے بے خبر تھے۔ فیروز شاہ نے فوراً ہی اپنی منتشر فوج کے ساتھ ارونی کے جنگلوں میں پناہ لی جہاں گونا سے کیپٹن رائس نے اسے بے دخل کر دیا۔ اور جب وہ اندر گڑھ میں تانتیا کے ساتھ شامل ہوا تو دونوں کی فوج کی تعداد دو ہزار سے زیادہ نہیں تھی۔ تانتیا اور فیروز شاہ نے بریگیڈیر ہونر کے وہاں پہنچنے سے ایک دن پہلے اندر گڑھ کو چھوڑ دیا۔ لیکن بریگیڈیر شوورس جے پور اور بھرت پور کے درمیان دوسہ میں 14/ جنوری 1859ء کو ان کے سامنے آنکلا۔ ان کی مشترکہ فوج کا دسواں حصہ اسی دن قتل ہو گیا۔ لیکن تانتیا اور فیروز شاہ دونوں دشمنوں کے نرغے سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے اور سیکر میں خیمہ زن ہوئے۔ یہ محکوم سردار کی جگہ تھی۔ لیکن کرنل ہومس نصیر آباد سے ان کے تعاقب میں لگا ہوا تھا۔ اس نے پچاس میل کا فاصلہ 24 گھنٹے کے اندر طے کیا۔ اور باغیوں کے خیمے میں 21/ جولائی کو پہنچ گیا۔ تانتیا کی فوج کو ایک بار پھر شکست ہوئی، لیکن ہمیشہ کی طرح لیڈران بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوئے۔ ایک لمبے عرصے سے برٹش جنرلس کو تانتیا نے تھکا مارا تھا۔ ان میں سے ہر شخص اس کٹر باغی کو خود پکڑنے کا سہرا لینا چاہتا تھا۔ اور اس لیے ان میں آپس میں اطلاعات کی لین دین کا کوئی سلسلہ نہیں تھا لیکن تانتیا نے محسوس کیا کہ وہ اب زیادہ دنوں تک فرار نہیں رہ سکتا۔ وسط ہندوستان سے وہ جولائی 1858ء میں راجپوتانہ کی طرف نکلا تھا جہاں سے وہ بندیلکھنڈ کی طرف بھاگا۔ بندیلکھنڈ سے وہ مدھیہ پردیش گیا۔ اور وہاں سے وہ بڑودہ کی طرف نکلا۔ جہاں سے پھر وہ دھکیل کر راجپوتانہ کی ندیوں چمبل، بیتوا اور نرمدا کے درمیان بھاگتا پھرا۔ کیونکہ یہ ندیاں دشمنوں کے آگے بڑھنے میں رکاوٹ تھیں لیکن اس کے لیے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ وہ مختصر سے راستوں سے پہاڑوں سے آگے نکلتا رہا۔ ان علاقوں میں صرف کسان ہی اس کے حمایتی نہیں ہوئے بلکہ آدیباسی قبائلی بھی اس کے دوست بن گئے۔ پھر آخر وہ دکن کی طرف کیوں نہیں گیا؟ کیا وہ نانا کا منتظر تھا؟ اس سوال کا کبھی جواب نہیں دیا جاسکے گا۔ کیونکہ اس مسئلہ پر وہ بالکل خاموش تھا۔

سیکر میں شکست کے بعد ان تینوں قائدین، تانتیا ٹوپے، راؤ صاحب اور فیروز شاہ نے الگ الگ ہونے کا فیصلہ کیا۔ اپنی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں کے ساتھ انہیں امید تھی کہ وہ دشمنوں کے چنگل سے نکل بھاگیں گے۔ اور کسی ویران پہاڑی یا دور دراز کے جنگلوں میں پناہ لے لیں گے۔ جبکہ ایک ساتھ رہنے میں انہیں اندیشہ تھا کہ وہ سب پھنس جائیں گے۔ کہا جاتا ہے کہ تانتیا نے اپنے

فوجیوں سے کہا کہ اب وہ اس سے الگ ہو کر اپنے لیے جائے پناہ ڈھونڈیں کیونکہ اب وہ غیر مساوی جنگ کو زیادہ دنوں تک نہیں لڑ سکتا۔ اپنے تین ملازمین' تین گھوڑوں اور ایک ٹٹو کے ساتھ وہ راؤ صاحب کے کیمپ سے رخصت ہوا تاکہ پاروں کے جنگلوں میں 'جومان سنگھ کی حکومت کے ساتھ تھا' پناہ لے سکیں۔ راؤ صاحب اور فیروز شاہ نے اپنا راستہ روکنے کی ساری کوششوں کو ناکام کرتے ہوئے چتر بھج درّے کو پار کر سرونج کے جنگلوں میں پناہ لی۔ لیکن یہاں بھی وہ سکون سے نہیں رہ پائے۔ اپنے بہتر وسائل کے سبب انگریز جنرلوں نے اس جنگل کو گھیرنے اور اس کے ایک ایک انچ کی تلاشی لینے کا فیصلہ کیا۔ 4 ٹکڑیوں نے مل کر جنگل کی صفائی کی اور باغیوں کی پناہ گاہ میں پہنچ گئے۔ لیکن برٹش افسروں کو یہاں بھی ناکام ہونا پڑا۔ راؤ صاحب اور فیروز شاہ ہوا میں تحلیل ہوگئے۔

لیکن آخر کار سیکر میں شکست کے بعد وہ سب دل شکستہ ہوگئے۔ اور پھر شرائط کے بارے میں نہ صرف ان دو ر ہنماؤں' بلکہ چھوٹے سرداروں کی طرف بھی بات چیت شروع ہوئی۔ باندہ کے نواب نے ملکہ عالیہ کے فرمان کا فائدہ اٹھاتے ہوئے نومبر 1858ء میں اس کی اشاعت کے فوراً ہی بعد اپنے کو سپرد کر دیا تھا۔ انہیں چار سو روپے ماہانہ کی پنشن دی گئی تھی۔ 19/ فروری کو نیچ کے نزدیک دو آدمیوں کو پکڑا گیا' جنہوں نے اپنے کو باغی کیمپ کا سفارتکار بتایا۔ ان کے پاس سے دو خطوط ملے۔ ایک انگریزی میں جو وزیر خاں کی طرف سے تھا جو پہلے آگرہ میں سب اسسٹنٹ سرجن تھے۔ اور یہ خط نیچ کے افسر کمانڈنگ کو لکھا گیا تھا۔ اور دوسرا خط فارسی میں تھا جس پر نہ تو جگہ کا نام اور نہ ہی تاریخ تھی۔ اس پر سید ظہور علی کے دستخط تھے' جنہوں نے اپنے اور اپنے بھائیوں کی طرف سے یہ خط لکھا تھا۔ وزیر خاں نے اپنے خط کی شروعات اس طرح سے کی۔ ''وہ نہ تو باغی تھے اور نہ ہی غدار'' اور کچھ عجیب و غریب حالات میں انہیں آگرہ کی اپنی گدی چھوڑنی پڑی تھی۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ انہوں نے باغی سرداروں کو خود کو پیش کرنے کے لیے تیار کیا تھا۔ اور اس کے لیے انہوں نے ایک خط بیکانیر کے کمانڈنگ افسر کو لکھا تھا۔ لیکن وہاں سے انہیں کوئی جواب نہیں ملا۔ اب انہوں نے فرمان کی بہت سی شرائط کی وضاحت چاہی تھی اور اس بات کی درخواست کی تھی کہ فیروز شاہ اور راؤ صاحب کو معاف کیا جائے۔ انہوں نے لکھا' مجھے یقین ہے کہ اگر شہزادہ فیروز شاہ اور راؤ صاحب دونوں کو اپنی زندگی کی حفاظت کا یقین ہو جائے تو پھر حکومت کے خلاف ایک شخص بھی اسلحہ نہیں اٹھائے گا۔ اور اگر حکومت راؤ صاحب کو معافی کے لائق نہیں سمجھتی تو بھی مجھے یقین ہے کہ اکیلے شہزادہ ہی سبھی باغیوں کو اسلحہ رکھنے اور خود سپردگی کے لیے آمادہ کرلیں گے ''بشرطیکہ انہیں باغیوں سے ملنے کے لیے معاف کیا جائے۔'' ظہور علی نے لکھا ''ملکہ عالیہ کے فرمان کی نقل سیکر میں موصول ہوئی۔ اس میں خود سپردگی کی آخری میعاد پہلی جنوری 1859ء دی گئی ہے۔ لیکن حاشیہ میں چھ مہینے کی اور مدت دی گئی ہے۔ تاکہ بعض معاملات میں وضاحت ہو سکے۔ ہم نے اپنے وکیل سرمست خاں کو آپ کے پاس بھیجا ہے۔ اگر وہ بتاتے ہیں کہ ہمیں جان کی حفاظت کی یقین دہانی کرائی گئی ہے تو آپ جہاں کہیں' ہم اپنی خود سپردگی

کے لیے تیار ہیں۔" کیپٹن ڈینس، جو نیچ کے سپرنٹنڈنٹ تھے' انہوں نے فوراً ہی جواب دیا کہ ملکہ عالیہ کے فرمان کے تحت ہر شخص جو خود کو سپرد کر دے گا' فرمان میں کیئے گئے وعدے اس کے ساتھ پورے کیئے جائیں گے۔ اس کا انطباق راؤ صاحب' فیروز شاہ اور عام قیدیوں کے ساتھ بھی ہو گا۔ سر رابرٹ ہیملٹن کو 14 ر مارچ کو بھیجی گئی تار کی خبر سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ راؤ صاحب کا ایک ایجنٹ سر رابرٹ نیپر کے پاس امن کا سندیش لے کر گیا تھا۔ وکیل نے راؤ صاحب کی بہت سی لغزشوں کی طرف اشارہ کیا۔ لیکن اسے اطلاع دی گئی کہ یہ لغزشیں فرمان کے تحت نہیں آتیں اور میں نے جو اُن کی زندگی کا ان سے وعدہ کیا تھا یہ کہ ان کی بے حرمتی نہیں کی جائے گی' کل اسے جواب میں لکھ دیا گیا۔ وکیل کا کہنا تھا کہ فیروز شاہ بھی آنا چاہتا ہے لیکن خوفزدہ ہے۔ راؤ صاحب کو ایک بہت اچھا وکیل بابا صاحب آپٹے باجی راؤ کا داماد کی شکل میں مل گیا۔ بابا صاحب آپٹے کی بزرگوں کی نگاہ میں بھی وقعت تھی۔ گرچہ اس کے دو برادر نسبتی نے انگریزوں کے خلاف جنگ کی' تاہم وہ خود سندھیا کا وفادار رہا۔ سر رابرٹ ہملٹن نے انہیں جو خط لکھا تھا' اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے نہ صرف راؤ صاحب بلکہ بالا صاحب اور نانا صاحب کی بھی وکالت کی تھی۔ کیونکہ سر رابرٹ اپنے جواب میں کہتا ہے کہ بالا صاحب اور نانا صاحب سے اسے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ لیکن وہ راؤ صاحب سے معاملہ کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ اس کی حدود میں رہیں۔ "اگر راؤ صاحب اپنے کو خود پیش کر دیتے ہیں تو ان کی جاں بخشی کر دی جائے گی۔ نہ تو انہیں قید کیا جائے گا اور نہ بیڑیاں پہنائی جائیں گی۔ بلکہ انہیں گزارے کے لیے خاصا بھتہ بھی دیا جائے گا' بشرطیکہ وہ اس جگہ پر رہیں جو حکومت ہند ان کے لیے مقرر کرتی ہے۔ یہ وعدہ ان شرائط کے ساتھ کیا جارہا ہے کہ وہ اپنے ہاتھوں سے یا زبان سے کسی کو انگریزوں کے قتل کی تحریک نہ دیں۔ پھر بھی راؤ صاحب نے ان شرائط سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ کیا ان کی خواہش تھی ان کے چچا لوگ بھی اس معافی نامے میں شامل کیئے جائیں؟ لیکن جب تین سال کے بعد انہیں جموں کے علاقے میں گرفتار کیا گیا تو انہوں نے ان دونوں کو ملوث کرتے ہوئے بیان جاری کیا۔ لیکن 1862ء میں بالا صاحب اور نانا صاحب دونوں زمینی طاقت سے پوری طرح نکل چکے تھے۔ اور راؤ صاحب اپنے کو بچانا چاہتے تھے۔

فیروز شاہ نے اپنے لیے بہتر شرائط کا مطالبہ کیا۔ وہ اپنے آمدورفت پر کسی پابندی کو ماننے کو تیار نہیں تھے۔ اور نہ اس بات کے لیے رضامند تھے کہ ان کے چند بچے ہوئے وفادار ساتھیوں کو غیر مسلح کر دیا جائے۔ جس انداز اور لہجے میں انہوں نے خط لکھا تھا اس سے رچرڈ شیکسپئر' جس نے وسط ہندوستان میں سر رابرٹ ہیملٹن کی جگہ لی تھی' ناراض ہو گئے۔ اگر انہوں نے انکساری کے ساتھ خط لکھا ہوتا تو شاید شیکسپئر ایک ایسے آدمی کے لیے "جو اب اپنی روزی کمانے سے معذور تھا" کچھ بھتہ کا بندوبست کرتا۔ لیکن سخت ترین مصائب کے باوجود یہ پُر غرور شہزادہ یہ نہیں بھول سکا کہ وہ تیمور اور بابر کا جانشین ہے اور نہ ہی وہ اپنے شاہی القاب کو اپنے سے الگ کر سکا۔ اور وزیر خاں جیسے مرتبے کے آدمی کو بھی وہ پروانہ بھیجتا نہ کہ خط۔ سر رچرڈ شیکسپئر نے یہ بھی دیکھا کہ یہ

پروانہ اس نے اپنے ایک ماتحت فیروز شاہ کے نام لکھا تھا۔ نہ کہ ہندوستان کے وائسرائے کے نمائندے کے نام۔ شاہ وقت کو خطاب کرنے سے اس کے جذبات مجروح ہوتے۔ پروانہ کے القاب اس طرح شروع ہوتے ''ہندوستان کے سردار اور شہنشاہ عالم کے فرزند جانشین مرزا محمد فیروز شاہ بہادر کی طرف سے اس کے پُر اعتماد خادم مولوی محمد وزیر خاں کے نام۔ بتاریخ 3/ ذیقعدہ 1275ھ (4/ جون 1859ء)۔ آپ کی عرضداشت موصول ہوئی اور اس میں تحریر معلومات کو دیکھ کر میں کچھ شرائط لکھ رہا ہوں۔ اگر ان پر وہ راضی ہو جائیں اور اس کی مکمل طور پر یقین دہانی کرائیں تو مجھے شرائط ماننے میں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ شرط اوّل: میرے گزارے کے لیے کیا انتظام کیا جا رہا ہے؟ شرط دوم: مجھے اس بات کی پوری آزادی ملنی چاہیے کہ میں جہاں چاہوں رہوں اور جہاں چاہوں جاؤں۔ اور میرے ماتحت جن کی تعداد بیس کے آس پاس ہے وہ ہمیشہ مسلح رہیں گے۔ ان باتوں کا جواب حاصل کر کے مجھے اطلاع دیں۔ اس سے پہلے بھی میں ایک شخص کو اندور بھیج چکا ہوں۔ لیکن اس کے بارے میں تاوقت تحریر کوئی اطلاع نہیں ملی۔ اس کے بارے میں بھی معلوم کریں اور اپنی معلومات سے آگاہ کرائیں۔'' لیکن برٹش حکومت کسی بھی حال میں ان کو آنے جانے کی آزادی دینے کے حق میں نہیں تھی اور اس جیسا مہم جو نوجوان کہیں ایک جگہ جم کر نہیں رہ سکتا تھا' راؤ صاحب کی طرح۔ لیکن مختلف اسباب کے تحت فیروز شاہ معافی نامے کی شرائط کو کبھی نہیں مان سکا۔

اپریل میں مان سنگھ نے تانتیا ٹوپے کو دھوکا دیا۔ 8/ تاریخ کو یہ اطلاع ملی کہ اسے کیپٹن میڈ نے پکڑ لیا ہے۔ کیپٹن میڈ کو جنرل نیپئر نے پیرون کے جنگل صاف کرنے اور سڑک بنانے پر مامور کیا تھا۔ مان سنگھ کے اندر مراٹھا برہمن جیسا جوش نہیں تھا۔ اور ایک زمانے تک جنگلوں میں بھٹکنے کے بعد اس کے اندر سے ساری فوجی شجاعت ختم ہو گئی تھی۔ 2/ اپریل کو وہ خاموشی کے ساتھ میڈ کے کیمپ میں داخل ہوا اور اپنے آپ کو سپرد کر دیا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ اپنے نئے دوستوں کا لحاظ نہ کرے چنانچہ اس نے اشارہ کیا کہ وہ اپنے مہمانوں کی قربانی دینے کو تیار رہے۔ میڈ لکھتا ہے ''مان سنگھ نے اپنے کو پیش کرنے کے بعد وقتاً فوقتاً جو اشارے کئے اس سے مجھے اطمینان ہو گیا کہ اپنے پاس وہ ایسی شے رکھتا ہے جس کی بدولت ہم تانتیا ٹوپے کو حیرت میں ڈال سکتے ہیں۔ میں نے جو کچھ بھی ممکن تھا اس سے وعدہ کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔'' مان سنگھ کو اس دباؤ کی ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ وہ اس بات کے لیے خود کو تیار کر چکا تھا۔ اسے صرف اس بات کا اندیشہ تھا کہ تانتیا کہیں آخری وقتوں میں اس کے ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ تانتیا بھی یہ جانتا تھا کہ مان سنگھ میڈ کے خیمے میں گیا ہے۔ لیکن وہ یہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ وہ وہاں رہے یا بھاگ جائے۔ وہ جنگل کے بیچ میں اپنے دو خادموں کے ساتھ رہ رہا تھا اور پوری دنیا سے ایک طرح سے بالکل الگ تھلگ پڑ چکا تھا۔ وہ چاہتا تو جنگل کے ایک خفیہ کنارے سے دوسرے کنارے تک جا سکتا تھا۔ اور مان سنگھ اسے اس مقررہ دن کو تلاش نہ کر پاتا۔ اس لیے مان سنگھ نے بہانہ کر کے تانتیا سے ملاقات

کا انتظام کیا۔ میڈ چاہتا تھا کہ وہ بھی اس مہم میں شریک ہو۔ لیکن مان سنگھ نے خواہش ظاہر کی کہ سارا انتظام اس پر چھوڑ دیا جائے۔ اور مقامی انفینٹری کی چھوٹی سی ٹکڑی اس کے ماتحت کر دی گئی۔
مان سنگھ کا منصوبہ یہ تھا کہ کوئی بھی گھوڑ سوار ان کے ساتھ نہ جائے۔ کیونکہ ذرا سا بھی شور ان کے منصوبے کو ناکام کر دیتا۔ پیدل دستے کو بھی یہ پتہ نہیں تھا کہ وہ کس قسم کی ڈیوٹی پر وہاں جا رہے ہیں۔ اس کو کسی بھی قسم کی مزاحمت کا اندیشہ نہیں تھا کیونکہ مان سنگھ اپنے دوست کو نیند کی حالت میں پکڑنا چاہتا تھا۔ ''مان سنگھ کے کہنے پر سپاہی گھات لگا کر ایک گہری زمین کے پاس چھپ گئے۔ یہ جگہ وہ تھی جہاں وہ خود اور تانتیا ٹوپے اکثر جایا کرتے تھے۔ اور اس نے اپنے دوست کو شبہ کی کوئی گنجائش دیئے بغیر وہاں لے گیا اور اس سے بات چیت میں لگ گیا۔ تقریباً آدھی رات کے بعد وہ وہیں سو گئے۔ پھر مان سنگھ نے سپاہیوں کو اشارہ کیا اور تانتیا ٹوپے کو مغلوب کر کے اسے باندھ دیا۔ خود مان سنگھ نے اس کے بازوؤں کو جکڑ رکھا تھا۔ اس دوران تانتیا کے دو باورچی جو وہاں موجود تھے' بھاگ نکلے۔ تانتیا کے پاس اس وقت صرف ایک تلوار اور کھکھری تھی۔ ان کے پاس سونے کے تین سکے اور ۱۱۸ سونے کی مہریں تھیں۔ دوسرے دن صبح ایک عرصے سے جس برہمن کی تلاش تھی وہ میڈ کے کیمپ میں لایا گیا جہاں سے اسے سپری بھیج دیا گیا۔ 15/اپریل کو ان پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ ایک زمانے سے بغاوت کر رہے تھے اور جنوری 1857ء سے دسمبر 1858ء کے درمیان جھانسی اور گوالیار میں خاص طور پر برٹش حکومت کے خلاف جنگ کر رہے تھے۔ ان کا کورٹ مارشل کیا گیا' جس کا نتیجہ پہلے سے ہی معلوم تھا۔ انہیں بہت بربریت کا مجرم پایا گیا اور قانون کے مطابق انہیں موت کی سزا دی گئی۔ کسی غیر ملکی حکومت کے خلاف جنگ کرنا کوئی جرم نہیں ہے۔ البتہ کسی ملک میں قائم سرکار کے خلاف یہ جنگ قانون کی نگاہ میں جرم ہو سکتی ہے۔ یہ بھی غور طلب بات ہے کہ ان پر قتل کا کوئی الزام نہیں عائد کیا گیا۔ تانتیا برٹش رعایا کی حیثیت سے پیدا نہیں ہوا تھا۔ اور باجی راؤ دوم کی موت تک کسی سے یہ امید نہیں کی جاتی تھی کہ وہ ہندوستان میں برٹش حکومت کا وفادار ہے۔ اور تانتیا نے بھی ہمیشہ اپنے آقا سے وفاداری نبھائی۔
راؤ صاحب کا پردہ کسی راجپوت نے نہیں بلکہ مہاراشٹر کے ایک آدمی نے فاش کیا۔ معلوم ہوا کہ راؤ صاحب جموں کے علاقے میں چنانی میں اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ چھپے ہوئے ہیں۔ مسٹر میکناب جو سیالکوٹ کے ڈپٹی کمشنر تھے' فوراً انہیں گرفتار کرنے کے لیے جموں گئے۔ جہاں بغیر کسی مزاحمت کے انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ اپنے بیان میں انہوں نے اس بات سے انکار کیا کہ انگریزوں کے قتل سے ان کا کچھ لینا دینا ہے۔ کرنل ولیمس نے کانپور کے واقعات کی جانچ کی' اس میں جو 61 گواہ گزرے ان میں سے کسی نے بھی راؤ صاحب پر یہ الزام نہیں لگایا کہ انہوں نے کسی کو قتل کرنے کے لیے اکسایا ہو۔ اور نہ ہی اس بات کی کوئی گواہی مل سکی کہ وسط ہندوستان میں انہوں نے کوئی جرم کیا ہو۔ لیکن بی بی گھر کے واقعات کا بدلہ لینا تھا اور راؤ صاحب کو دوسروں کے گناہ کی سزا بھگتنی تھی۔ اس لیے مزید نئی گواہیاں دلوائی گئیں جو ان کے جرم کی شہادت دے

سکیں۔اور پھر پانڈورنگا سداشو عرف راؤ صاحب کو مجرم قرار دے کر پھانسی کی سزا دے دی گئی۔
سرونج کا جنگل چھوڑنے کے بعد راؤ صاحب شمالی ہندوستان میں سفر کرتے رہے۔وہ ایک متبرک مقام سے دوسرے متبرک مقام ہوتے ہوئے چنانی پہنچے۔جہاں آخر کار انہیں گرفتار کر لیا گیا۔سرونج سے وہ اجین گئے۔اجین سے اودے پور گئے اور یہاں پر ان کی بیوی اور بچے ان کے ساتھ ہوگئے۔پھر انہیں لے کر وہ دلی گئے۔کیونکہ شاید یہ بھیڑ بھرا شہر ان کے لیے مخصوص شہر ہو سکتا تھا۔بعد میں وہ تھانیشور' جوالا مکھی اور کانگڑہ کے علاقوں میں گئے جہاں ان کے پہنچنے کی کوئی امید نہیں تھی اور پھر وہاں سے وہ چنانی گئے جہاں انھیں گرفتار کر لیا گیا۔
فیروز شاہ نے ہندوستان میں قیام کرنا محفوظ نہیں سمجھا۔ان کی مہم جو فطرت انہیں سمندر پار کے علاقوں میں لے گئی۔وہ ابھی نوجوان تھے۔جوش اور امنگ سے بھرپور۔1860ء میں معلوم ہوا کہ وہ قندھار میں ہیں۔شاید وہ وہاں جانے کے لیے سندھ سے گزرے تھے۔اس کے بعد سے پھر ان کی پیش رفت برٹش خفیہ ایجنسی کے لیے راز نہیں رہ گئی اور وہ جہاں بھی جاتے مخبر ان کی نگرانی کرتے رہتے۔1861ء میں وہ بخارا میں دیکھے گئے۔انہیں بہت زیادہ مالی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔مقامی شہزادوں کے عطیہ پر گزارہ کرتے رہے۔1862ء میں انہوں نے اپنا راستہ بدلا اور تہران کی طرف چلے۔1863ء میں اس بات کی جانچ کی گئی کہ کیا ان کو گرفتار کرنے کے لیے کوئی انعام کا اعلان کیا گیا ہے؟ حکومت ہند اس بات کو مناسب نہیں سمجھتی تھی کہ غیر ممالک کی خود مختار سلطنتوں میں مداخلت کر کے انہیں گرفتار کرے۔اگلے کچھ سالوں میں وہ ہرات سے بخارا آمد و رفت کرتے رہے اور 1868ء میں وہ ہندوستان کی سرحد میں سوات گھاٹی کے خطرناک علاقوں میں دیکھے گئے۔سوات سے وہ کابل گئے۔کابل کے امیر نے انہیں بن بلایا مہمان سمجھا۔دارالسلطنت میں ان کی موجودگی خود ان کے انگریز دوستوں کے لیے خطرہ کا باعث ہو سکتی تھی۔اس لیے امیر نے ان سے کہا کہ بدخشاں کی طرف چلے جائیں۔لیکن وہ وہاں زیادہ دیر نہیں ٹکے اور سمرقند میں دیکھے گئے۔ایک مسلم سلطنت سے دوسری مسلم سلطنت میں جانے کا ان کا مقصد کیا تھا؟اس کے بارے میں صرف قیاس آرائی کی جا سکتی ہے۔لیکن اگر ان کا یہ خیال تھا کہ وہ ہندوستان کے لیے کوئی فوج اکٹھا کر سکیں گے تو انہیں افغانستان' فارس یا وسط ایشیا میں ایسا کوئی ہمدرد نہیں ملا۔1872ء میں ملکہ عالیہ کے سفیر نے قسطنطنیہ سے خبر دی کہ فیروز شاہ وہاں رہ رہا ہے۔فیروز شاہ ترکی کے دارالسلطنت میں اکیلے ہندوستانی سیاسی پناہ گزیں نہیں تھے' قسطنطنیہ میں بہت سے انگریز مخالف ہندوستانی مسلمان رہ رہے تھے۔فیروز شاہ ان کا رہنما نہیں تھا۔تنہائی' پریشانی اور مصیبتوں نے ان کی صحت پر برا اثر ڈالا۔اور وقت سے پہلے ہی وہ بوڑھے ہو گئے۔1875ء میں کیپٹن ہنٹر نے لکھا''استنبول میں یہ بات عام طور پر کہی جا رہی ہے کہ فیروز شاہ' مرزا محمد بیگ کے ساتھ چند ماہ پہلے مکہ کے لیے روانہ ہو گئے ہیں۔جب کہ اس حقیقت کا پتہ کہ وہ اب بھی وہیں مقیم ہیں صرف چند ہندوستانیوں کو معلوم ہے یا ایسے ترک لوگوں کو جو انہیں ذاتی طور پر جانتے ہیں...... میرے مخبر کو

فیروز شاہ کو دیکھنے کے لیے سلطان ابراہیم لے گئے تھے جو ان کے ساتھ تھوڑی دیر بیٹھے۔ میرے مخبر نے انہیں ایک ضعیف شکستہ حالت میں دیکھا جو تقریباً اندھے ہو چکے تھے اور کم از کم ان کی ایک آنکھ چلی گئی تھی اور وہ لنگڑے بھی ہو چکے تھے۔" اس وقت ان کی عمر 45 سال سے زیادہ نہیں رہی ہو گی۔ جون 1875ء میں وہ مکہ گئے اور وہاں انہیں 7ر دسمبر 1877ء کو آخری آرام گاہ نصیب ہوئی۔ "ایسا لگتا ہے کہ وہ بہت زیادہ غربت کی زندگی گزار رہے تھے اور شریف مکہ کچھ شیخوں اور ہندوستانی لوگوں کے ذریعہ دی گئی مالی معاونت پر زندگی گزر رہی تھی۔ مکہ میں ان کی اکیلی رشتہ دار ان کی بیوی رہ گئی تھی۔"

اس طرح فیروز شاہ مر گیا' پریشانی' بھکمری' مصائب میں گھرا ہوا یہ نوجوان بوڑھا' اجنبیوں میں اجنبی' اپنے ملک سے' جس کے لیے اس نے اپنا خون بہایا' اپنے ان وطن والوں' جن کے لیے اس نے اتنی تکلیف اٹھائیں' سے بہت دور اس کی موت ہوئی۔ اگر رابرٹ بروس محب وطن تھا تو فیروز شاہ یقیناً اس سے بڑا محب وطن تھا۔ وہ اکیلا سفر کرتے ہوئے مکہ سے بمبئی آیا۔ اور بمبئی سے وسط ہندوستان پہنچا جہاں وہ علم بغاوت بلند کر سکے۔ ایک نوجوان جس کا کوئی ساتھی نہیں تھا اور نہ ہی جس کے پاس کوئی مالی وسائل تھے' اس نے اپنی فوج بنائی اور ساری رکاوٹوں کے باوجود دو سال تک مسلسل جنگ کرتا رہا۔ اس کے ہاتھ کسی معصوم کے خون سے رنگین نہیں ہوئے تھے۔ اسے یقین تھا کہ اسے اپنے مقصد میں کامیابی ہو گی۔ لیکن یہ بھی اندیشہ تھا کہ مظلوم عورتوں اور بچوں کے قتل سے اس کا یہ مقصد فوت ہو جائے گا۔ کسی دوسرے باغی نیتا نے قتل کے ان واقعات کی اس طرح کھلے عام مذمت نہیں کی جتنی اس نے کی۔ اس کی نوجوانی' اس کی پاکدامنی اور شاہی خاندان سے اس کے تعلق نے اسے ایک بہادر درویش بنا دیا تھا اور ایسے شخص کے لیے یہ سعادت تھی کہ اس کی موت مکہ جیسے مقدس مقام پر ہو۔ جو آج بھی ہر متقی مسلمان کی خواہش ہوتی ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ مشرق وسطی اور وسطی ایشیا کے زیادہ تر علاقوں کا سفر کرنے کے بعد اس نے کوئی یادداشت نہیں چھوڑی اور اس سے بھی بڑھ کر افسوس کا مقام یہ ہے کہ اس کے اپنے ملک والے اب بہت کم اس کا نام لیتے ہیں۔

فیروز شاہ کی بیوہ نے حکومت ہند سے بطور ہمدردی گزارہ بھتہ دیئے جانے کی اپیل کی اور نومبر 1881ء میں اسے پانچ روپے ماہانہ کی پنشن اس شرط پر دی گئی کہ وہ کبھی دلی نہیں لوٹے گی۔ لارڈ رپن نے اس حقیر رقم کو بڑھا کر سو روپے ماہانہ کر دی۔ لیکن یہ بھی واضح کر دیا گیا کہ یہ صرف بیگم کو تاحیات ملے گی' ان کے بعد کسی اور کو نہیں۔

# ضمیمہ — 1

خارجہ سیاسی مشورہ -3022 ‘31 / دسمبر 1858ء

## برجیس قدر کے نام بیگم کا جاری کیا گیا فرمان

موجودہ وقت میں کچھ کمزور دماغ بے وقوف لوگوں نے یہ خبر مشتہر کردی ہے کہ انگریزوں نے ہندوستان کے لوگوں کی غلطیوں اور جرائم کو معاف کر دیا ہے۔ یہ بات بہت حیرتناک لگتی ہے۔ کیونکہ انگریزوں کی روایت رہی ہے کہ وہ کسی غلطی کو چاہے وہ چھوٹی ہو یا بڑی‘ کبھی معاف نہیں کرتے۔ حد تو یہ ہے کہ اگر کوئی چھوٹی سی بھی غلطی لاعلمی یا لاپروائی کی وجہ سے ہو جائے تو اسے بھی کبھی معاف نہیں کرتے۔

10/ نومبر 1858ء کا وہ فرمان جو اس وقت ہمارے سامنے آیا ہے وہ بالکل واضح ہے‘ اور جیسا کہ کچھ احمق لوگوں نے اس فرمان میں پوشیدہ مقصد کو نہ سمجھتے ہوئے‘ صرف اس کے لفظوں کے بہاؤ میں آکر‘ کچھ کا کچھ سمجھ بیٹھے ہیں‘ اس لیے ہم جو رعایا کی بہبودی کے لیے ہمیشہ فلاحی حکومت ہیں اور اودھ کی رعایا کے سرپرست اور گارجین ہیں‘ بہت غور و فکر کے بعد یہ فرمان جاری کر رہے ہیں‘ تاکہ ملکہ عالیہ کے فرمان کے خاص نکات میں پوشیدہ مقاصد کو واضح کر دیا جائے اور ہماری رعایا ان سے متنبہ ہو جائے۔

اول‘ فرمان میں یہ لکھا گیا ہے کہ ہندوستان کا ملک جو کمپنی‘ ایک ٹرسٹ کی شکل میں اختیار کیے ہوئے تھی اسے ملکہ عالیہ نے اپنے اختیار میں لے لیا ہے اور مستقبل میں ملکہ عالیہ کے قوانین کی پابندی کی جائے گی۔ اس پر ہماری عقیدت مند اور مذہبی رعایا کو کوئی بھروسہ نہیں ہے۔ کیونکہ کمپنی کے قوانین‘ کمپنی کے ذریعہ نافذ کیے گئے بندوبست کے قوانین‘ کمپنی کے انگریز کارکن‘ گورنر جنرل اور کمپنی کا عدلیہ کا انتظام بغیر کسی تبدیلی کے آج بھی ویسے ہی نافذ ہے تو پھر اس میں کون سی نئی بات ہے جو ہمارے لوگوں کے لیے فائدہ مند ہے جس پر وہ بھروسہ کر سکیں۔

دوسرے‘ فرمان میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ کمپنی نے آج تک جو معاہدے کیے ہیں وہ سب ملکہ کو قابل قبول ہیں۔ لوگ اس شق کو غور سے دیکھیں۔ کمپنی نے سارے ہندوستان پر قبضہ

کرر کھا ہے اور اگر اسی انتظام کو قابل قبول سمجھا گیا ہے تو اس میں کون سی نئی بات ہے؟ کمپنی نے کہا تھا کہ وہ بھرت پور کے سردار کو اپنے بیٹے کی طرح سمجھے گی اور پھر اس کے علاقے پر قبضہ بھی کرلیا۔ لاہور کے چیف کو لندن لے جایا گیا۔ اور اب تک وہاں سے واپس آنا ان کو نصیب نہیں ہوا۔ ایک طرف انہوں نے نواب شمس الدین خاں کو پھانسی لگائی' اور دوسری طرف اپنے ہیٹ اتار کر انہیں سلامی دی' پیشوا کو انہوں نے پونا ستارہ سے جلاوطن کیا اور انہیں بھور میں تاعمر قید کردیا۔ ٹیپو سلطان کے ساتھ جو انہوں نے بدعہدی کی اس کے بارے میں ہر شخص جانتا ہے' بنارس کے راجا کو انہوں نے آگرہ میں قید کرلیا۔ گوالیار کے سردار کے ملک میں بہتر انتظام قائم کرنے کے لیے وہاں انہوں نے انگریزی توانین جاری کردیئے۔ انہوں نے بہار' اڑیسہ اور بنگال کے حکمرانوں کا نہ ہی کوئی نام و نشان چھوڑا اور نہ ہی ان کی نسل کا کوئی شخص۔ انہوں نے فرخ آباد کے رئیس کو برائے نام ماہانہ بھتہ دیا۔ اور ان کے علاقہ پر قابض ہوگئے۔ شاہجہان پور' بریلی' اعظم گڑھ' جونپور' گورکھپور' اٹاوہ' الہ آباد' فتح پور وغیرہ جو پہلے ہماری ملکیت تھے' ان پر تنخواہ کی ادائیگی کے بہانے انہوں نے قبضہ کرلیا۔ جب کہ معاہدے کی آرٹیکل 7 کے مطابق' جسے انہوں نے قسم کھا کر لکھا تھا کہ اب ان کے علاوہ وہ ہم سے کچھ بھی نہیں لیں گے' اور اگر کمپنی کے انتظامات اور معاہدوں کو قبول کیا گیا ہے تو موجودہ اور پہلے کے انتظامات میں کیا فرق ہوا؟ یہ سب تو پرانے معاملات ہیں۔ لیکن حال ہی میں سارے معاہدوں اور سارے عہد کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اور باوجود اس کے کہ وہ ہمارے کئی ملین روپوں کے قرض دار ہیں' بغیر کسی سبب کے بدانتظامی اور لوگوں میں پھیلے انتشار کا بہانہ کر کے انہوں نے ہمارے صحن میں جمع اسباب پر جن کی ملکیت لاکھوں روپے میں ہوتی ہے' قبضہ کرلیا۔ اگر ہماری رعایا سابق حکمران واجد علی شاہ کی حکومت سے پریشان تھی تو اب کیا ہوگیا۔ وہ کیوں ہمارے ساتھ ہیں۔ کوئی بھی حکمران ہو' وہ آج تک اتنی وفادار نہیں ملی ہے اور نہ ہی اتنے لوگ اس کے لیے اپنی جان دینے کو تیار ہوئے جتنے ہمارے لیے۔ پھر کس چیز کی کمی ہے؟ وہ کیوں نہیں ہم کو ہمارا ملک لوٹا رہے ہیں؟

مزید برآں فرمان میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ اب وہ اپنی حکومت میں کوئی توسیع نہیں کرنا چاہتے تاہم وہ قبضہ کرنے سے باز بھی نہیں آرہے ہیں۔ اگر ملکہ عالیہ نے حکومت کی باگ ڈور سنبھال لی ہے تو پھر ملکہ عالیہ ہمارا ملک کیوں نہیں واپس کررہی ہیں جب کہ ہمارے تمام لوگوں کی یہی خواہش ہے۔ یہ بات دنیا جانتی ہے کہ کسی بھی بادشاہ یا مہارانی نے کبھی بھی پوری فوج یا پوری رعایا کو بغاوت کے لیے سزا نہیں دی ہے۔ اور کوئی بھی عقل مند آدمی پوری فوج اور ہندوستان کے عوام کو سزا دیئے جانے کو کبھی مناسب نہیں سمجھے گا۔ کیونکہ جب تک لفظ سزا باقی ہے یہ انتشار چلتا رہے گا۔ ایک مشہور مثل ہے "مرتا کیا نہ کرتا' اور یہ ناممکن ہے کہ ہزار آدمی ایک لاکھ پر حملہ کریں اور وہ ہزاروں بچ بھی جائیں۔

تیسرے' فرمان میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ گرچہ عیسائیت سچا مذہب ہے تاہم دوسرے

عقائد کے ماننے والوں پر ظلم نہیں کیا جائے گا اور قانون کی نگاہ میں ہر شخص برابر ہوگا۔ عدلیہ کا انتظام کب سے مذہب کے سچے یا جھوٹے ہونے پر منحصر ہونے لگا۔ وہی مذہب سچا ہے جس میں صرف ایک خدا کو ماننے کی بات کہی گئی ہے' دوسرے خدا کو نہیں۔ جب کسی مذہب میں تین خدا ہوں تو نہ تو مسلمان' نہ ہندو' نہ یہودی' نہ زرتشت یا آگ کی پرستش کرنے والے اسے سچا مذہب سمجھ سکتے ہیں۔ سور کھانا' شراب پینا اور چربی ملی گولی کو کاٹنا اور سور کی چربی آٹے اور مٹھائیوں میں ملانا' اور سڑک بنانے کے بہانے ہندو اور مسلمانوں کی عبادت گاہوں کو توڑنا۔ لیکن گرجا گھروں کی تعمیر کرنا اور سڑکوں اور گلیوں میں پادریوں کو بھیجنا تاکہ وہ عیسائی مذہب کی تبلیغ کرسکیں، انگریزی اسکول قائم کرنا' لوگوں کو انگریزی آداب سیکھنے کے واسطے ماہانہ بھتہ دینا جب کہ ہندو اور مسلمانوں کی عبادت گاہیں آج بھی ویسی ہی پڑی ہوئی ہیں۔ ان تمام باتوں کے باوجود لوگ کیسے یہ بھروسہ کرسکتے ہیں کہ ان کے مذہب میں مداخلت نہیں کی جائے گی۔ یہ بغاوت مذہب کو لے کر پھیلی اور اس کے لیے لاکھوں لوگوں نے اپنی جانیں دیں۔ اب ہماری رعایا دھوکے میں نہیں آنے والی۔ شمال مغرب میں ہزاروں آدمیوں کو ان کے مذہب سے بے دخل کردیا گیا اور ہزاروں آدمیوں کو صرف اس بنا پر کہ وہ اپنے مذہب کو ترک کرنے کے لیے تیار نہیں تھے' پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔

چوتھے' فرمان میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ وہ لوگ جنھوں نے باغیوں کو پناہ دی یا ان باغیوں کے سردار تھے جنھوں نے لوگوں کو بغاوت کے لیے اکسایا ان سب کی جانیں لے لی جائیں گی۔ لیکن یہ سزا مقدمہ چلانے کے بعد دی جائے گی اور قاتل اور قتل کی تحریک دینے والوں پر کوئی رحم نہیں کیا جائے گا۔ جبکہ دوسرے لوگوں کو معاف کردیا جائے گا۔ ایک بے وقوف آدمی بھی یہ دیکھ اور سمجھ سکتا ہے کہ فرمان کے تحت کوئی بھی شخص چاہے وہ مجرم ہو یا بے قصور' بچ نہیں سکتا۔ ہر چیز لکھی ہوئی ہے اور پھر بھی بہت کچھ نہیں لکھا ہے اور تاہم انھوں نے یہ صاف طور پر لکھ دیا ہے کہ جو بھی ملوث پایا جائے گا وہ بخشا نہیں جائے گا' چاہے جس کسی گاؤں یا ریاست میں فوج مقیم ہو' اس علاقے یا گاؤں کے رہنے والے بچ نہیں سکیں گے۔ اس فرمان کو پڑھ کر ہمیں اپنی رعایا کی طرف سے بہت زیادہ فکر ہوگئی ہے جو نفرت کے جذبے سے بھری ہوئی ہے۔ اب ہم ایک مختلف فرمان جاری کرتے ہیں۔ ایسا فرمان جس پر ہماری رعایا کو پورا بھروسہ ہوگا اور جو کوئی بھی بے وقوفی میں اپنے کو گاؤں کا سرپنچ بنا کر انگریزوں کے کیمپ میں پیش ہوا ہو' وہ شخص پہلی جنوری سے پہلے ہمارے خیمہ میں آموجود ہو' بلاشک و شبہ کے اس کی ہر غلطی معاف کردی جائے گی اور ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا جائے گا۔ میرے اس فرمان پر یقین کرنے کے لیے یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ ہندوستانی حکمراں اپنی رعایا کے ساتھ ہمیشہ مہربانی اور رحم دلی سے پیش آتے ہیں۔ ہزاروں آدمی اس کے چشم دید گواہ ہیں اور لاکھوں آدمیوں نے اس کے بارے میں سن رکھا ہے۔ لیکن کسی نے اپنے خواب میں بھی نہیں سوچا ہوگا کہ انگریز کبھی کسی کی غلطی کو معاف کردیں گے۔

پانچویں، اس فرمان میں یہ بھی لکھا ہے کہ جب امن قائم ہو جائے گا تو عوامی کام، مثلاً سڑکوں اور نہروں کو بنایا جائے گا تاکہ لوگوں کو سہولت ہو سکے۔ یہاں یہ غور کرنا ضروری ہے کہ انھوں نے ہندوستانیوں کے لیے اس سے بہتر کوئی اور خدمت نہیں سوچی ہے سوائے اس کے کہ سڑکوں کو بنانے اور نہروں کو کھودنے میں وہ مزدوری کا کام کریں۔ اگر لوگ اب بھی یہ نہیں سمجھ سکتے کہ اس کا کیا مطلب ہے تو ان کا خدا ہی حافظ ہے لیکن کوئی بھی شخص اس فرمان سے فریب نہ کھائے۔

# ضمیمہ — 2

خارجہ سیاسی مشاورت۔ نمبر 8'-18/مارچ 1859

## شیخ خیر الدین اور محمد حسن کے درمیان ہوئی مراسلت

### خیر الدین کی طرف سے محمد حسن کو 13 نومبر 1858

بعد القاب

واضح ہو کہ انگریز حکومت بہت طاقتور ہے اور بہت سے باغیوں کا سر کچل دیا گیا ہے۔ تاہم اب مزید خون بہانے کے بجائے یہ رحم دلی سے کام لینا چاہتی ہے۔ ہندوستان کی حکومت اس بات کی خواہش مند ہے کہ باغی اپنے اس طرح کے مفاد پرست رویوں کو ترک کر دیں جن کا نتیجہ صرف، ان کی بربادی ہے اور خرف کے اس خیال کو نکال دیں جو بالکل ہی غلط ہے لیکن عام طور پر پھیلا ہوا ہے کہ جو بھی اپنے کو سپرد کرے گا اسے پھانسی دے دی جائے گی' یہ غلط حقیقت پر مبنی ہے۔ میں یہاں اس خط کے ساتھ ملکہ عالیہ کا وہ فرمان منسلک کر رہا ہوں جو اسی مہینے جاری کیا گیا ہے اور جس میں سبھی کو معاف کر دیئے جانے کا اعلان کیا گیا ہے۔ اس سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ جن پر صرف برٹش حکام یا رعایا کے قتل کا الزام ہو گا' انھیں کو سزا دی جائے گی اور ہر اس رہنما اور شخص کی جان بخشی کر دی جائے گی جن پر اس طرح کا الزام عاید نہیں ہو اور یہ بھی کہ اگر انھوں نے کسی انگریز اہلکار کی جان بچانے کا نیک کام کیا ہو گا تو اس پر بھی غور کیا جائے گا۔ ان حالات میں آپ خود غور کریں کہ باغیوں کے کیمپ میں بنے رہنے سے آپ کو کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ اور اب بھی اگر آپ باغیانہ رویہ برقرار رکھتے ہیں تو بلاشبہ آپ کو یا تو پکڑ لیا جائے گا یا قتل کر دیا جائے گا۔ آپ کے لیے بہتر یہ ہو گا کہ آپ میرے پاس آکر یا جس انگریز افسر کو بہتر سمجھیں اس کے سامنے' اپنے آپ کو پیش کر دیں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ نے کسی انگریز افسر یا رعایا کا قتل نہیں کیا ہے اور آپ اس طرح

کے جرم کے شبہ سے بالاتر ہیں۔ اس لیے آپ رحم کے اس فائدے میں جب شریک ہونا چاہیں تو اپنے علاوہ گونڈہ کے راجا یا دوسرے سرداروں کو بھی اس طرح کا مشورہ دیں۔ اور سپاہیوں کو بتائیں کہ انھیں اپنے گھر جانے کی آزادی ہوگی۔ کوئی بھی ان کا راستہ نہیں روکے گا بشرطیکہ ان پر بھی کسی یورپین یا برٹش رعایا کو مارنے کا الزام نہ عاید ہو۔ جنگ کے دوران کسی کو مارنا جرم نہیں ہے۔

## (۲) بتاریخ 16/ربیع الثانی۔ محمد حسن کی طرف سے خیر الدین کے نام

مجھے آپ کا پُر خلوص مراسلہ موصول ہوا۔ جس مشفقانہ انداز میں آپ نے مشورہ دیا ہے اس کے لیے میں شکر گزار ہوں۔ ملکہ عالیہ کا فرمان بھی موصول ہوا۔ جس میں رحم دلی اور مراعات کی شق دیکھ کر جیسا کہ آپ نے حکم دیا ہے، میں سب کو واقف کرادوں گا، اس کے بعد مستقبل میں ہر شخص اپنے فعل کا خود ذمہ دار ہوگا۔ میں خود بھی ملکہ عالیہ کے انصاف کی یقین دہانی کے بعد اپنے کو ہر غلطی سے بری سمجھوں گا۔ آپ کے خط کے انداز سے میری اپنی معصومیت ثابت ہو چکی ہے۔ مجھے اس سے بہت زیادہ مسرت ہوئی۔ کیونکہ میں نے کبھی بھی کسی یورپین افسر، ان کے عہدے دار، فوجی اور رعایا کو قتل نہیں کیا ہے گرچہ یورپین افسروں اور ان کے سپاہیوں نے ہزاروں معصوم لوگوں کا قتل کیا ہے، عورتوں کو بھی قتل کیا، اندھوں اور سادھوؤں کو بھی قتل کیا۔ ان کی رہائش گاہوں کو آگ لگادی اور ان کی املاک کو لوٹ لیا۔ ملکہ عالیہ کے اس انصاف پسند فرمان کی وجہ سے ہر وہ شخص جو اس قسم کے قتل کا مرتکب ہے، اسے سزا ملنی چاہیے۔ میں ان لوگوں میں شامل ہوں جنھوں نے یورپین افسروں کی جان بچائی ہے، خاص طور پر اس وقت جب فوجیوں میں بغاوت پیدا ہوئی اور سپاہیوں نے بے رحمی سے اپنے افسروں کو بھی قتل کیا، اور اس وقت جس نے بھی یورپین لوگوں کی جان بچانے کی کوشش کی اسے بھی ان لوگوں کے ساتھ قتل کر دیا گیا اور ان کی جائداد لوٹ لی گئی۔ اس وقت بھی میں نے بے خوف ہو کر اپنے محافظوں کو بھیجا۔ اور دو کرنلوں، ان کی بیویوں اور ان میں سے ایک کی بیٹی کی جان بچائی۔ انھیں حفاظت کے ساتھ اپنے پاس رکھا اور محافظ دستے کے ہمراہ انھیں گورکھ پور کے حکام کے پاس بھیج دیا۔ اس کے بعد جب میں نے اپنے آقا کے حکم اور خدا کی مدد سے گورکھ پور کو اودھ کی سلطنت میں واپس کیا، جہاں یہ شروع سے آج تک ان کی مملکت میں شامل ہے، میں نے سبھی مقامی افسروں کو لوٹے اور مارے جانے سے بچایا۔ انھیں زخمی ہونے سے بچایا۔ ان میں بہت سے عیسائی بھی تھے انھیں دور محفوظ مقامات پر بھجوادیا۔ اس لیے میں اس بات کا حقدار ہوں کہ برٹش حکام نہ صرف میری تعریف کریں بلکہ نوازیں بھی۔ اور اب میں اس سچ کو آپ سے بیان کر رہا ہوں جس سے آپ نے مجھے خوفزدہ کیا ہے اور جو برٹش حکومت کی طاقت سے متعلق ہے، اس فائدے سے محروم رہتا اگر میں باغیوں کے ساتھ رہتا۔ جو طاقت اور وسائل جو قوت اور خوف پیدا کرنے والی فوج ملکہ عالیہ، جو سب بادشاہوں کی بادشاہ ہے، خدا اسے

تا قیامت سلامت رکھے، اور جس کا حکم چہار عالم میں چلتا رہے' وہ کبھی کامیاب مخالفت کی نفی کر دیتا ہے۔ وہ خداوند عالم جو قادر مطلق ہے اور جو ہر جگہ موجود ہے اور سب کا محافظ ہے' اس کے سامنے اگر کوئی دشمن طاقت ور ہے تو وہ اس سے زیادہ طاقتور ہے۔ جب اس کی مرضی ہوتی ہے تو وہ توانا کو کمزور اور کمزور کو توانا کر دیتا ہے' وہ جسے چاہتا ہے اس کا مرتبہ بڑھاتا ہے اور جسے چاہتا ہے اس کا مرتبہ گھٹاتا ہے۔ اس انتشار کے وقت میں یہ بات سب پر عیاں ہو چکی ہے۔ جب تک خدا کی مرضی نہ ہو نہ تو کوئی کسی کو قتل کر سکتا ہے اور نہ جلا سکتا ہے اور اگر برٹش حکومت کے پاس خدائی طاقت ہوتی تو وہ سپاہیوں کے ساتھ بدلے کی کارروائی کرتے ہوئے ہر مقامی ہندوستانی کو تباہ و برباد کر دیتے۔ وہ ہزاروں عیسائی جنھیں خون کے پیاسے سپاہیوں نے موت کے گھاٹ اتارا' ان کی زندگی بچ گئی ہوتی۔ اگر آپ نے دنیا میں عروج و زوال کے تاریخی واقعات کو پڑھا ہوتا تو آپ ان سب کو سوئیک اور لوہار کی گائے والی کہانی جیسا پاتے۔ یہ ہر شخص پر ظاہر ہے کہ جو اپنی نسل کے لوگوں کو قتل کے لیے آگے بڑھاتا ہے' اپنے آپ کو خود ہی پہلے قتل کیا ہوا سمجھتا ہے۔ اس لیے مجھے نہ تو پکڑے جانے کا ڈر ہے اور نہ ہی موت کا کوئی خوف ہے۔ اور اگر میں' خدا نہ کرے ایسا ہو' گرفتار کر لیا جاتا ہوں تو بھی میں نے کوئی ایسا جرم نہیں کیا جو فرمان کے مطابق سزا کا مرتکب ہو۔ اور ملکہ عالیہ کی یقین دہانی کے بعد مجھے یہ بھی یقین ہو چلا ہے کہ کوئی بھی شخص مجھے ضرر نہیں پہنچا سکتا۔ بلکہ اس کے برخلاف اگر میں پکڑا جاتا ہوں تو بھی چھوڑ دیا جاؤں گا۔ دوسری طرف اگر میں اپنے مذہب اور اپنے دنیاوی آقا کی وفاداری میں لڑتے ہوئے مارا جاتا ہوں تو دونوں جہان کی کامیابیاں میرے لیے ہوں گی۔ جیسے آپ اور سرکار کے دوسرے ملازمین سرکار کی طرف سے لڑتے ہوئے جہاد کر رہے ہوں' جس کی غرض دنیاوی فائدہ ہو۔ اسی طرح میں بھی اس دنیا میں اور اس دنیا کے بعد بھی اپنے لیے فائدہ دیکھتا ہوں۔ اگر میں اپنے عقیدے اور اپنے آقا کے لیے جنگ کروں۔ چونکہ یورپین افسر اس بات کے لیے مشہور ہیں کہ وہ اپنے ماتحتوں کی غلطیوں کو ان کے جواز کی بدولت جانچتے ہیں تو وہ میری وفاداری سے ضرور متاثر ہوں گے۔ فرمان میں جرائم کے لیے معافی کا وعدہ جن لفظوں میں کیا گیا ہے وہ مبہم ہیں اور واضح نہیں ہیں کیونکہ لفظ معافی بہت سے شرائط کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً کہا گیا ہے کہ عام لوگ جنھوں نے اس بغاوت میں حکومت کو نقصان پہنچانے جیسے جرم کیے انھیں کچھ شرائط کے ساتھ معاف کر دیا جائے گا۔ آپ یاد کریں جو بھی جرم کیا گیا ہے وہ سب حکومت کو نقصان پہنچانے کے تحت آتا ہے' وہ سب اس لیے اسی طرح سمجھے جائیں گے۔ اسی طرح لفظ' عام طور پر' اور شرائط کے واضح بیان ٹھیک ڈھنگ سے نہ ہونے کی وجہ سے دماغ میں شک پیدا ہوتا ہے۔ ہندوستان کے انگریز حکمراں مقامی راجاؤں کے ساتھ ہوئے معاہدے سے مکر گئے ہیں اور معاہدے کی شرائط کی خلاف ورزی کی ہے۔ اس لیے مبہم انداز میں کیے گئے ان معاہدوں کو اب کون دیکھ سکتا ہے۔ جو ہمیشہ اس بات کے عادی رہے ہیں کہ معاہدہ کچھ کریں' اور اس کا دوسرا مطلب نکالیں اور اس کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کہیں کہ ہم

معاہدے کے مطابق کام کر رہے ہیں۔ انگریزوں نے تو حد کر دی کہ انھوں نے اپنے سارے وعدوں کو فراموش کر ان کی مخالفت میں کام کیا اور یہ تو وعدہ خلافی کے لیے مشہور ہیں۔ مثلاً انگریزوں اور لاہور کے راجا، پیشوا اور دوسرے راجاؤں کے ساتھ ہوئے معاہدوں کو لیں۔ میری وفاداری اودھ کے حکمراں کے ساتھ ہے۔ اور دنیا کا ہر شخص جانتا ہے کہ ان دو بڑی طاقتوں اودھ کے بادشاہ اور انگریز حکومت کے درمیان جو معاہدے اور شرائط طے ہوئے تھے' ان کے مطابق انگریزوں کو اس بات کا حق نہیں تھا کہ وہ اودھ کو اپنے قبضے میں لے لیں۔ اس مملکت کے حکمرانوں نے ہمیشہ انگریزوں کی بات مانی اور فوجی مدد کی ہے اور ہمیشہ ان سے دوستی کا جذبہ رکھا ہے۔ انھوں نے کوئی ایسا جرم نہیں کیا جس کی بدولت یہ وفاداری توڑی جاتی۔ وہ تو اس حد تک وفادار رہے کہ انھوں نے انگریزوں کو زبردستی اودھ پر قابض ہونے دیا۔ اور انگریزوں نے تو ان کے محلوں اور ان کی ساری جائداد پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد بھی کسی قسم کی مزاحمت نہیں کی گئی۔ اودھ کے بادشاہ نے تو کبھی نہ انھیں اپنا دشمن سمجھا اور نہ ان سے لڑنے کی جرأت کی۔ بلکہ پہلے تو ریزیڈنٹ سے پھر گورنر جنرل سے اپیل کی اور جب ان دونوں نے ان کی اپیل کو ٹھکرا دیا تو انھوں نے اپنے بھائی اور ماں کو ملکہ عالیہ کے سامنے معاملے کی وکالت کے لیے بھیجا۔ اور کمپنی نے ابھی تک ان پر توجہ نہیں کی۔ اس طرح یہ بدعہدی اور بے وفائی اور معاہدوں کی سراسر خلاف ورزی دیکھ کر سارے سردار انگشت بدنداں ہیں۔ ان کی سلطنت ہمیشہ سے برٹش حکومت کی وفادار رہی۔ تاہم ان پر ہر طرح کے مظالم کیے گئے اور اس لیے اب برٹش حکومت پر کسی کا بھروسہ نہیں رہ گیا۔ میں اس مثل کو دوہرانا چاہتا ہوں کہ ''کون ایسا ہے جسے اس کے عمل کا بدلہ نہیں ملا؟'' ہندوستان کے راجاؤں اور یہاں کی رعایا نے اس ظلم و جبر کو دیکھ کر جس کی وجہ سے فوج نے بغاوت کی (جو خود انگریزوں کے رویے کی وجہ سے پھیلا) اور جس کی وجہ سے ہزاروں خدائی خدمت گاروں کا بے رحمی سے قتل ہوا۔ انگریزوں نے اب تو خود خون کا راستہ کھول دیا ہے جسے بحیثیت حکمراں اسے بند رکھنا چاہیے تھا۔ یہ بغاوت صرف اودھ پر قبضہ کیے جانے کی وجہ سے پھیلی ہے اگر ایسا نہ ہوا ہوتا تو کوئی قتل نہ ہوتا۔ چونکہ ہم میں آپس میں اختلافات بھی ہیں تو ہم میں سے اکثر لوگوں نے باغیوں کو روکنے میں کامیابی حاصل کر لی۔ اگر ملکہ عالیہ اب بھی انصاف سے کام لیتی ہیں اور اودھ کے حاکم کو ان کا علاقہ واپس کر دیتی ہیں تو ساری جنگ اور قتل و غارت گری ختم ہو جائے گی اور ملکہ عالیہ کے انصاف اور رحم دلی کا شہرہ ساری دنیا میں پھیل جائے گا اور ہندوستان کے سبھی سردار دوبارہ وفاداری کا عہد لے کر اس انتشار کو ختم کرنے میں مدد کریں گے۔ ملکہ عالیہ کے فرمان کے لہجے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید وہ ایسا کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں کیونکہ یہ ارادہ ظاہر کیا گیا ہے کہ کمپنی بہادر نے جو معاہدے کیے تھے یا جس کی منظوری دی تھی انھیں وہ پورا کریں گی۔ اور وہ مقامی حکمرانوں سے یہ امید بھی کرتی ہیں کہ وہ بھی ان شرائط اور معاہدوں کی پابندی کریں گے اور یہ کہ موجودہ حدود کو چھوڑ کر وہ مزید علاقوں پر قبضہ نہیں کریں گی۔ ان وعدوں کا لحاظ کرتے ہوئے ملکہ عالیہ کو چاہیے کہ

شجاع الدولہ اور کمپنی حکومت کے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا اس کی پاسداری کرتے ہوئے اودھ کی سلطنت اس کے جائز وارثوں کو واپس لوٹا دیں اور ان معاہدوں پر غور نہ کریں جسے ریزیڈنٹس نے مجبور کر کے بادشاہوں کے ساتھ کیا تھا۔ کیونکہ جو اصل معاہدہ پہلے ہوا تھا اس میں یہ کہا گیا تھا کہ یہ معاہدہ بعد میں آنے والے سبھی جانشینوں پر اسی طرح لاگو ہوگا اس لیے اس کے بعد اس کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ریزیڈنٹس نے بادشاہوں کو مجبور کر کے ان سے جو معاہدے کیے انھیں رد کردیں۔ اودھ کی سلطنت اس وقت بادشاہ کے قبضہ میں ہے اور وہ علاقے جو انگریزوں نے وقتاً فوقتاً انھیں مجبور کر کے حاصل کیے، وہ بھی ان کی حکومت سے اس وقت آزاد کرا لیے گئے ہیں اور زبردستی قبضہ کیے جانے والے علاقوں پر اب توجہ دینے کی ضرورت نہیں۔ اگر لفظ 'جن پر اس وقت قبضہ ہے' ان علاقوں پر بھی لاگو کیا جائے جن پر انگریزوں نے فرمان لکھے جانے کے وقت قبضہ کرلیا تھا اور جن پر وہ اس وقت قابض نہیں ہو سکے تھے' انھیں کی ملکیت میں رہیں گے جن کے قبضے میں تھے۔ اس کا جو مطلب نکلتا ہے وہ میں نے آپ کو لکھ دیا۔ ہم جو اودھ کے بادشاہ کے خادم اور ان پر منحصر ہیں' دونوں جہاں میں اپنی کامرانی کے لیے ضروری سمجھتے ہیں کہ ہم اس سلطنت کے تئیں ہمیشہ وفادار رہیں اور حملہ آوروں کی ہمیشہ مخالفت کریں جو یہاں زبردستی قابض ہونا چاہتے ہیں اور اگر ہم اپنی اس ذمہ داری میں ناکام ہوتے ہیں تو ہم ہمیشہ غدار کہلائیں گے اور دونوں جہان میں روسیاہ ہوں گے۔ "میں اپنے ہاتھ اس وقت تک نہیں روکوں گا جب تک اس کے قبضہ میں وہ نہ آجائے جس کے لیے کوشش کر رہا ہوں۔ یا تو میں اپنی مطلوبہ چیز حاصل کرلوں گا یا ختم ہو جاؤں گا۔" اگر ملکہ عالیہ رحم دل ہیں تو ان مجبوریوں کا خیال کر کے، جس میں ہم ہندوستانی اس وقت پھنسے ہوئے ہیں' وہ قتل کا دروازہ بند کریں اور انصاف سے کام لیتے ہوئے اودھ کا علاقہ بادشاہ کو واپس کر دیں۔ ہم بھی جنگ بند کر دیں گے۔ قتل سے ہاتھ روک لیں گے اور اپنی وفاداری ہر میجسٹی اور اس کے افسروں کے تئیں ظاہر کریں گے۔ پھر اس وقت سارا انتشار ختم ہو جائے گا اور امن قائم ہو جائے گا۔ میں آپ سے استدعا کرتا ہوں کہ آپ میرا یہ خط گورنر جنرل کے ملاحظہ کے لیے بھیج دیں اور اگر وہ فرمان کے مطابق عمل کرنا شروع کر دیں' اودھ کو برباد ہونے سے بچائیں اور شجاع الدولہ سے جو معاہدہ ہوا تھا اسے دوبارہ لاگو کریں۔ اس وقت میں بحیثیت وکیل یہ دیکھوں گا کہ سارے شرائط پر بجا طور پر عمل ہوا ہے یا نہیں۔ میں اس کے فوری جواب کا منتظر ہوں۔

## خیر الدین کی طرف سے محمد حسن کو۔ بتاریخ 28 نومبر

بعد آداب!

آپ کا خط موصول ہو گیا ہے جس کا مضمون دیکھنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ آپ آج بھی خواب خرگوش میں پڑے ہوئے ہیں کیونکہ میں نے تو صرف آپ پر یہ واضح کرنا چاہا تھا کہ اگر آپ فوری طور پر اپنے آپ کو پیش کر دیں تو آپ کے لیے بہتر ہوگا۔ آپ نے اسے نظر انداز

کرتے ہوئے ایک بہت طویل اور لایعنی جواب دیا ہے۔ جس میں آپ نے بڑے احمقانہ طریقے پر یورپین افواج اور حکام پر الزام تراشی کی ہے۔ مثلاً آپ نے لکھا ہے کہ برٹش فوج نے ہزاروں معصوموں 'اندھوں' فقیروں' سادھوؤں' عورتوں اور بچوں کو قتل کیا ہے۔ یہ سارا الزام سراسر جھوٹ اور بے بنیاد ہے۔ آپ اور آپ کا محافظ دستہ ہی درحقیقت اس طرح کے مجرمانہ افعال کرتا رہا ہے اور کر رہا ہے' اور جب آپ کے آدمی معصوم لوگوں کو جہاں کہیں بھی لوٹنا شروع کرتے ہیں تو خود برٹش افواج وہاں جاکر انھیں آپ کی لوٹ مار سے بچاتی ہیں۔ آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ آپ نے کبھی کسی برٹش افسر یا رعایا کو موت کے گھاٹ نہیں اتارا ہے تو پھر یہ کیسے ممکن ہوا کہ آپ نے بالا راؤ کو بلا کر ان کے ساتھ تعاون کیا۔ جس نے کہ اپنے بھائی نانا کے ساتھ مل کر سیکڑوں معصوم عورتوں اور بچوں کو گرفتار کر کے ان کا قتل عام کیا۔ اور اس طرح کا قتل عام بہت سی جگہوں پر کیا، ایسا قتل عام جو کبھی کسی مذہب کی نگاہ میں پسندیدہ فعل نہیں ہے۔ آپ پھر بھی کہتے ہیں کہ آپ اپنے مذہب کی حفاظت کے لیے لڑ رہے ہیں۔ آپ مجھے صرف اس مذہب کا نام بتادیں جو اس طرح کے بہیمانہ افعال کی اجازت دیتا ہو۔ آپ کی آنکھیں بند ہیں۔ کیونکہ آپ یورپین فوجوں اور افسروں کو ان مجرمانہ افعال کے لیے ذمہ دار سمجھ رہے ہیں جو درحقیقت باغی فوجیوں اور بدمعاشوں نے کیے ہیں اور اب بھی کر رہے ہیں۔ جو جنگ آپ جاری رکھے ہوئے ہیں اسے آپ جہاد کا نام دیتے ہیں۔ آپ مجھے بتائیں کہ عورتوں اور بچوں کا قتل اور لوگوں کو لوٹنا کیسے اور کہاں سے جائز ہو گیا۔ جو کچھ بھی آپ نے اودھ سلطنت کی واپسی کے بارے میں لکھا ہے اور اس سلطنت کی واپسی تک اپنے جس عزم کا اظہار کیا ہے' اس کا کوئی مفہوم نہیں نکلتا۔ سرکار نے جس زمین پر ایک بار قبضہ کر لیا' اس کا ایک بیگھہ بھی آپ کو دینے سے رہی۔ اس طرح کی طویل اور بے معنی بحث سے آپ کو کیا مطلب؟ آپ اپنے بارے میں جو چاہیں لکھ سکتے ہیں لیکن سلطنت کے بارے میں آپ کو لکھنے کا کوئی حق نہیں۔ مختصراً آپ سے پھر کہتا ہوں کہ اگر آپ اپنی جان بچانا چاہیں تو آپ فوراً خود کو سپرد کر دیں ورنہ یہ یقین کر لیں کہ بہت جلد برٹش فوجیں آپ پر ہر طرف سے حملہ کریں گی۔ گونڈہ اور بہرائچ پر قبضہ کر کے اپنی بندوقوں سے آپ کو اڑا دیں گی اور ان جنگلوں کو جنھیں آپ محفوظ پناہ گاہ سمجھ رہے ہیں' آگ لگا دیں گی۔ آپ کی ساری باغی فوج' یورپین فوج اور افسروں کے لیے ایک کھیل ثابت ہو گی۔ پھر آپ دیکھ لیں گے کہ سرکار سے ناراضگی آپ کو کہاں کا رکھتی ہے؟ پھر اس کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا کہ آپ خود سپردگی کے لیے تیار ہو رہے تھے۔ میرے لکھنے کا مقصد آپ کو فرمان کی شرائط سے آگاہ کرنا تھا تاکہ پکڑے جانے کے بعد آپ یہ نہ کہہ سکیں کہ آپ نے اسے دیکھا نہیں تھا اور نہ فوراً خود سپردگی کر دیتے۔ آپ فرمان کی زبان کو مبہم کہتے ہیں۔ لیکن میرے نزدیک یہ بالکل واضح ہے۔ اگر آپ اسے غور سے پڑھیں تو آپ ہر چیز سمجھ جائیں گے' اور پکڑے جانے پر اگر آپ یہ ثبوت دیں کہ آپ نے کرنل کے بیوی بچوں کو بچایا تھا تو بھی آپ کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ رحم دلی کی یہ مدت آج سے صرف چالیس دن

تک ہے اور اس کے گزرنے کے بعد آپ کے نیک کاموں پر بھی کوئی نگاہ نہیں کی جائے گی۔ آپ اور دوسرے باغی سرداروں کے ساتھ وہی عمل کیا جائے گا جو فرمان کے جاری ہونے سے پہلے لاگو ہوتا۔ بہتر یہ ہے کہ آپ اس میعاد کے اندر اپنے کو پیش کردیں ورنہ اس جگہ سے اس جگہ جنگلوں میں پھرتے ہوئے آپ کا مارا جانا یقینی ہے۔ اس کا جواب دینے سے پہلے اس پر غور کرلیں اور باغی فوجوں کا کوئی بھروسہ نہ کریں اور نہ ہی بالاراؤ پر، جو ہمیشہ میدان جنگ سے یورپین فوج کو دیکھ کر بھاگتا رہا ہے۔ آپ ان لوگوں سے کیسے یہ امید کرسکتے ہیں کہ آپ کے حکم کے تابع ہو کر وہ جنگ کریں گے۔ جب وہ اپنے سابق آقاؤں کے لیے اتنے زیادہ نمک حرام ثابت ہوئے ہیں جن کا نمک انھوں نے 20 سے 30 سال تک کھایا ہے۔ شاید وہ آپ کو ہی نشانہ بنا کر آپ کو بھی ختم کردیں۔ اگر آپ کے اندر ذرا بھی شعور ہے اور آپ زندہ رہنا چاہتے ہیں تو جو کچھ لکھا ہے اس پر دھیان دیں۔

# ضمیمہ — 3

### خارجہ سیاسی مشاورت نمبر 69-63' بتاریخ 27 / مئی 1859ء

## ناناصاحب اور بالا صاحب کے خطوط

گورکھپور 27/اپریل 1859ء

جناب عالی! مجھے یہ سعادت نصیب ہو رہی ہے کہ میں لیفٹیننٹ گورنر کے حضور دیسی زبان میں تحریر' وہ اشتہار نامہ بھیجوں جو بٹھور کے نانا نے بھیجا ہے اور جسے ایک برہمن کرنل پنکنی کے کیمپ دکھیری میں لایا اور جسے اس نے میجر رچرڈسن جو بنگال کیولری کے کمانڈنگ افسر ہیں' کو دیا۔ ساتھ ہی اس کا ترجمہ اور میجر رچرڈسن کا جواب بھی بھیج رہا ہوں جسے بریگیڈیر روکرافٹ نے مجھے بھیجا ہے۔

گورکھپور کمشنر آفس | آپ کا تاعمر وفادار
27/اپریل 1859ء | دستخط الن سوئنٹن
قائم مقام کمشنر

ہر میجسٹی ملکہ عالیہ' پارلیمنٹ' بورڈ آف ڈائرکٹرس' گورنر جنرل' لیفٹیننٹ گورنر اور سبھی شہری اور فوجی افسران کو بھیجے گئے اشتہار نامہ کا ترجمہ۔

آپ نے سبھی ہندوستانیوں کے جرائم کو معاف کر دیا ہے اور قاتلوں کو بھی معافی دے دی ہے۔ یہ حیرت کی بات ہے کہ آپ کے فوجیوں نے آپ کی عورتوں اور بچوں کو اور ممو خان اور فرخ آباد کے سبھی عہدیداروں کو قتل کر دیا' جو واقعی قاتل ہیں' انہیں آپ نے معاف کر دیا۔ آپ نے جنگ بہادر کو یہ بھی لکھا ہے کہ آپ بیگم اور دوسرے راجاؤں کو اپنی حفاظت میں ان کے ملکوں کو بھیج دیں۔ لیکن یہ تعجب کی بات ہے کہ میں نے بدرجہ مجبوری باغیوں کا ساتھ دیا' مگر مجھے معاف نہیں کیا گیا۔ جب کہ میں نے کوئی قتل نہیں کیا۔ اگر جنرل ہاولا (وھیلر) نے بٹھور سے مجھے نہ بلایا ہوتا تو میری افواج نے کبھی بغاوت نہ کی ہوتی۔ کبھی انہوں نے میرے خاندان والوں کو

خندق میں نہیں بلایا۔ میرے فوجی میرے اپنے ملک کے نہیں تھے۔ اور میں نے ان سے یہ بھی کہا کہ میرے جیسا غریب شخص انگریزوں کو کوئی مادی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ لیکن جنرل ہادلا (دھیلر) نے میری بات نہیں سنی اور مجھ سے خندق میں آنے پر اصرار کیا۔ جب آپ کی فوج نے بغاوت کی اور خزانے پر قبضہ کے لیے آگے بڑھی تب میرے سپاہیوں نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ پھر میں نے غور کیا کہ اگر میں خندق میں چلا جاؤں تو میرے اپنے سپاہی میرے خاندان والوں کو مار دیں گے۔ اور یہ کہ برٹش حکام میرے سپاہیوں کی بغاوت کے لیے مجھے سزا دیں گے۔ اس لیے میرے لیے بہتر یہ تھا کہ میں مر جاؤں۔ میری رعایا مجھ پر دباؤ ڈالتی رہی اور میں باغیوں کا ساتھ دینے پر مجبور ہوا۔ دو تین سال تک میں سرکار کو عرضداشت بھیجتا رہا لیکن اس پر کوئی غور نہیں کیا گیا۔ کانپور میں سپاہیوں نے میری حکم عدولی کی اور انگریز عورتوں اور رعایا کو مارنے لگے۔ میں اپنے وسائل سے جن کو بچا سکتا تھا' بچایا۔ اور جب وہ خندق سے نکلے تو میں نے انہیں کشتیاں فراہم کیں جس میں انہیں الہ آباد کے لیے روانہ کیا۔ آپ کے سپاہیوں نے اس پر حملہ کیا۔ بہت منت سماجت کے بعد میں نے اپنے سپاہیوں کو روکا۔ اور دو سو انگریز عورتوں اور بچوں کی جان بچائی۔ میں نے یہ بھی سنا ہے کہ ان سب کو آپ کی فوج نے اور بدمعاشوں نے اس وقت مار دیا جب میرا محافظ دستہ کانپور سے بھاگا۔ اور میرا بھائی بھی زخمی ہو گیا۔ اس کے بعد میں نے اس اشتہار نامہ کے بارے میں سنا' جسے آپ نے جاری کیا تھا۔ اور تب سے آپ سے لڑنے کو تیار ہوں۔ اور آج تک آپ سے لڑ تا رہا ہوں اور تاعمر لڑتا رہوں گا۔ آپ اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ میں قاتل نہیں ہوں اور نہ ہی مجرم ہوں اور نہ ہی آپ نے کوئی حکم میرے بارے میں جاری کیا ہے۔ اس وقت سوائے میرے آپ کا کوئی دشمن نہیں ہے۔ اس لیے میں جب تک زندہ رہوں گا' آپ سے لڑتا رہوں گا۔ میں بھی ایک مرد ہوں اور آپ سے دو کوس کا فاصلہ بنائے ہوئے ہوں۔ یہ بھی حیرت کی بات ہے کہ آپ جو بہت عظیم اور طاقتور ہیں' مجھ سے دو سال سے جنگ کرتے رہے ہیں اور آج تک میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے۔ وہ بھی اس وقت جب میری اپنی فوج میرا حکم نہیں مان رہی ہے۔ اور میرے پاس کوئی سلطنت بھی نہیں ہے۔ آپ نے سب کے جرم کو معاف کر دیا ہے۔ نیپال کا راجا آپ کا دوست ہے۔ ان سب کے باوجود آپ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے۔ آپ نے سب کو اپنی طرف ملا لیا ہے۔ میں بالکل تنہا ہوں۔ لیکن آپ دیکھ لیں گے کہ اپنے ان آدمیوں کو جنہیں دو سال تک میں نے بچا کر رکھا ہے' کیا کر سکتے ہیں۔ ہم پھر ملیں گے اور تب میں آپ کا خون بہاؤں گا۔ اور یہ خون گھٹنوں بہے گا۔ میں مرنے کے لیے تیار ہوں۔ اور اگر مجھ جیسا تنہا آدمی اتنی طاقتور برٹش حکومت کا واحد دشمن ہے' تو یہ میرے لیے بڑی عزت کی بات ہے اور میرا دل اس مسرت سے لبریز ہے۔ موت تو ایک دن آنی ہی ہے۔ پھر مجھے کس بات سے ڈرنا۔ لیکن جن لوگوں کو آپ نے اپنی طرف ملا لیا ہے۔ وہ ایک دن اپنا منہ موڑیں گے اور آپ کو مار ڈالیں گے۔ آپ عقلمند ہیں۔ لیکن اپنی عقلمندی میں غلطی کی ہے۔ میں نے ایک خط چندر نگر بھیجا' لیکن وہ وہاں نہیں پہنچا۔ اس سے مجھے کچھ

مایوسی ہوئی، ورنہ آپ دیکھتے کہ میں کیا کرتا ہوں؟ میں پھر چندر نگر بھیجنے کی کوشش کروں گا۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو اس خط کا جواب دیں۔ ایک دانا دشمن نادان دوست سے کہیں بہتر ہوتا ہے۔

تاریخ 17/رمضان 1275ھ

مطابق 20/اپریل 1859ء

اس جواب کی نقل جو میجر رچرڈسن بنگال کیولیری کے کمانڈنگ افسر نے اشتہار کے جواب میں بھیجا جس پر مہاراجہ بھٹور کی مہر ثبت ہے اور جس پر تاریخ 17/رمضان 1275ھ کی پڑی ہے۔

وہ اشتہار جس پر بھٹور کے مہاراجہ کی مہر ثبت ہے اور جسے ایک برہمن کے ہاتھ بھیجا گیا ہے جسے میجر رچرڈسن نے موصول کیا اور جو اس کے مضمون سے واقف ہو گئے ہیں۔ اب میں آپ کو لکھتا ہوں کہ وہ فرمان جو انگلینڈ کی ملکہ عالیہ نے جاری کیا' وہ کسی ایک پارٹی یا شخص کے لیے نہیں تھا' بلکہ سب کے لیے تھا اور جن شرائط پر فرخ آباد کے نواب' باندہ کے نواب اور اودھ کے دوسرے راجاؤں اور سرداروں نے اپنے اسلحے رکھے اور خود کو سرکار کے سپرد کر دیا وہ ساری شرائط آپ کے لیے بھی ہیں اگر آپ خود کو سپرد کرنا چاہیں۔ آپ نے جیسا کہ لکھا ہے کہ آپ نے کسی میم یا لڑکے کو قتل نہیں کیا تو یہ اور بھی بہتر ہے کہ آپ بے خوف و خطر یہاں آجائیں۔ اس خط کے جواب کا منتظر

دستخط

جے ایف رچرڈسن
کمانڈنگ بنگال کیولیری

دکھیری کیمپ
23/اپریل 1859ء

سروس پیغام

مسٹر بیڈن کی طرف سے۔ کلکتہ 2/مئی

لیفٹیننٹ گورنر الہ آباد کے لیے

گورنر جنرل ان کاؤنسل کو 30/ تاریخ کا آپ کا پیغام موصول ہو گیا۔ انہیں نانا کا اشتہار اور میجر رچرڈسن کا جواب بھی موصول ہو گیا ہے۔ انہیں یہ جواب پسند نہیں آیا۔ نانا یا دوسرے باغی سردار جنہوں نے قتل کیا ہے' یا جن پر قتل کا الزام ہے' یا جن کی نشاندہی کر دی گئی ہے' ان کی طرف سے ملنے والے سارے اشاروں کے جواب صرف ملکہ عالیہ کے فرمان کا حوالہ دے کر دینا ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ آپ بذریعہ تار میجر رچرڈسن کو مطلع کریں کہ نانا کی طرف سے ملنے والے کسی خط کا جواب نہیں دینا ہے۔ جب تک کہ اوپر سے نہ کہا جائے اور اگر انہیں کوئی خط ملتا ہے تو اسے وہ فوری طور پر مقامی حکومت اور حکومت ہند کو بھیج دیں۔

الیکٹرک محکمہ تار

3/مئی 1859ء

از:

بریگیڈیر ایچ' روکرافٹ 'کمانڈنگ گورکھپور ضلع

بخدمت:

میجر جنرل برچ' محکمہ دفاع حکومت ہند کے سکریٹری کلکتہ

جناب عالی!

میں منسلکہ مراسلے جن کا حاشیہ میں تذکرہ کیا گیا ہے' ہزایکسلینسی وائسرائے اور ہندوستان کے گورنر جنرل کی خدمت میں پیش کرنے کا شرف حاصل کر رہا ہوں۔

دو مقامی مکاتیب جو نانا اور بالاراؤ کی طرف سے 25اور 26/اپریل1859ء کو موصول ہوئے اور ان کے ترجے بھی

ان جوابات کی نقول جو میجر رچرڈسن نے کرنل پنکنی کو منظوری کے بعد بھیجیں

۲۔ میں یہ اطلاع دینے کا شرف حاصل کر رہا ہوں کہ کرنل پنکنی کو حکمنامہ بھیج دیا گیا ہے جس میں انہیں اس طرح کے مراسلے کا جواب دینے سے منع کیا گیا ہے جس پر ان کا کوئی ماتحت دستخط کرے۔ وہ ایسے معاملوں کو اپنے ہاتھوں میں لیں گے اور کوشش کریں گے کہ کیمپ کے کسی آدمی کو اس کی اطلاع نہ ہو۔ اور اس کام میں میجر رچرڈسن اور دوسرے قابل اعتماد افسروں کی مدد دیں گے۔ اور مستقبل میں کسی باغی سردار کی طرف سے ملنے والے اشارے کا جواب دیتے وقت وہ صرف ملکہ عالیہ کے فرمان کا حوالہ دیں گے اور وہ خطوط فوراً حکومت کو بھیجیں گے۔ صرف سرداروں کو یہ اطلاع دیں گے کہ ان کے خط سرکار کو بھیج دیئے گئے ہیں۔

میں ہوں آپ کا خادم<br>
دستخط روکرافٹ بریگیڈیر<br>
کمانڈنگ ضلع گورکھپور

نانا کے ایک خط کا ترجمہ

میجر رچرڈسن نے میرے اشتہار کے جواب میں 23/اپریل1859ء کو صرف ایک بات کا جواب دیا ہے جب کہ اس میں بہت سی باتیں تھیں۔ اسے میں قبول کرتا ہوں لیکن میں اس طرح اپنے کو پیش نہیں کر سکتا۔ اگر کوئی خط ملکہ عالیہ خود اپنے ہاتھوں سے لکھیں جس پر ان کی خاص مہر ثبت ہو اور جو فرانسیسی کمانڈنگ افسر یا ان کا نائب مجھ تک لے کر آئے تو میں ان افسروں پر بھروسہ کرتے ہوئے سبھی شرائط کو بلا جھجھک منظور کر لوں گا۔ میں آپ پر کیوں اعتماد کروں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ آپ نے ہندوستان کے ساتھ کیا دغابازی کی ہے۔ اگر آپ واقعی اس ملک سے شورش ختم کرنے کے لیے دل سے تیار ہیں تو ملکہ عالیہ کے دستخط شدہ خط فرانسیسی کمانڈنگ افسر کے ہمراہ میرے پاس بھیجیں' میں خود قبول کر لوں گا۔ کچھ سال پہلے میں نے اپنا ایک ایلچی لندن

بھیجا تھا۔ اس کو جواب ملکہ عالیہ نے خود اپنے ہاتھوں سے دیا تھا اور اس پر اپنی مہر لگائی تھی' وہ آج تک میرے پاس موجود ہے۔ اگر آپ چاہیں تو یہ کام اسی طرح سے ہو سکتا ہے اور میں اس کی منظوری دیتا ہوں۔ اگر نہیں تو آخر زندگی تو ایک دن جانی ہی ہے۔ میں بے عزت ہو کر کیوں مروں۔ جب تک میں زندہ ہوں میرے آپ کے درمیان جنگ چلتی رہے گی۔ چاہے میں مار دیا جاؤں' گرفتار کر لیا جاؤں یا پھانسی چڑھا دیا جاؤں۔ جو کچھ بھی ہو گا' اس کا فیصلہ صرف تلوار کرے گی۔ بصورت دیگر جیسا میں نے لکھا ہے اگر ملکہ عالیہ مجھے خط بھیجتی ہیں تو میں خود اپنے کو پیش کر دوں گا۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو اس خط کا جواب ضرور دیں۔

دیوگڑھ 22/ رمضان
مطابق 26/ اپریل 1859ء

از: بالا راؤ

## انگریزوں کو دی گئی ایک عرضداشت کا ترجمہ

میں نانا کا بھائی ہوں۔ میں ہمیشہ ان کے ساتھ رہا ہوں۔ انگریزوں کی آمد کے بعد سے انہوں نے مجھے کبھی اس بات کی اجازت نہیں دی کہ میں ان کے حکم کے بغیر کہیں آؤں جاؤں۔ اور ایسا کرنے پر وہ مجھے ہمیشہ عاق کرنے کی دھمکی دیتے رہے۔ جس سے میں ان کے حکم کا تابعدار بنا رہا۔ میرا کسی انگریز ملاقاتی سے بھی تعارف نہیں ہوا۔ اس سے میں اور زیادہ مجبور ہو گیا۔ میری ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ میں ان سب سے الگ رہ کر اپنی عزت بچاؤں۔ کسی بھی شخص نے میرے خلاف کوئی شکایت نہیں کی ہے۔ اگر ایسا کوئی روپ کاری لایا جائے سکے تو میں ضرور مجرم ہوں گا۔ جب انہوں نے کانپور میں بغاوت کی تو وہ مجھے وہاں دھوکے سے لے گئے۔ اور میری عورت کو اپنی عورت کے ساتھ رکھا جو آج بھی ان کے ساتھ ہے۔ اور جب سپاہیوں نے خزانے پر قبضہ کیا تو مجھے اپنی لاچاری کا زیادہ احساس ہوا کیونکہ میں کسی صاحب لوگ سے واقف نہیں تھا۔ فوجی مجھے چھوڑنے کو تیار نہیں تھے۔ اور میرا بھائی مجھے اپنے سے الگ کرنے پر تیار نہیں تھا۔ اس لیے میں اپنے بھائی کے حکم پر چلنے کو مجبور تھا۔ میں نے 9 یا 10 سال کی ایک لڑکی جو فتح پور کے جج کی بیٹی تھی' اسے اپنی بیوی کے پاس چھپا کر رکھا۔ اور جسے بعد میں جنرل بدری نرسنگھ کو دکھایا۔ میں نے گوالیار کے جیواجی سندھیا کو اپنے یہاں ایک عرضداشت بھیجی (وہ آج بھی زندہ ہیں) جب وہ بٹھور آئے انہوں نے جواب دیا کہ وہ بغیر گورنر بھائی کی اجازت کے اپنے پاس نہیں رکھ سکتے۔ اس لیے میں بندی بنا رہا۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ اگر جانچ کی جائے تو ایسا ہی پایا جائے گا۔ اگر آپ مجھے جواب دیں تو میں آپ کے پاس آکر سارا واقعہ بیان کر دوں گا۔ اب آپ کے اختیار میں ہے کہ میرے ساتھ جو چاہیں کریں۔ آپ مجھے قید کر سکتے ہیں' مار سکتے ہیں یا پھانسی لگا سکتے ہیں جو کچھ بھی ہو مجھے موجودہ پریشانیوں سے نجات مل جائے گی۔ اگر آپ میرے اپنے نہیں ہیں تو یہ دنیا بھی

میری نہیں ہے۔ جو بھی مرتا ہے وہ اکیلے مرتا ہے' یہی ہونا ہے۔ آپ کے جواب کے مطابق میں عمل کروں گا۔

بتاریخ 8 بیساکھ سمت 1916 دستخط
مطابق ایچ روکرافٹ بریگیڈیر
25 اپریل 1859 کمانڈنگ گورکھپور ضلع

## میجر رچرڈسن کا بالا صاحب کو جواب

بالاراؤ! آپ کی عرضداشت بتاریخ 8 / بیساکھ سمت 1916 ایک برہمن کی معرفت مجھے کل شام موصول ہوئی۔ میں نے اسے دیکھا اور اس کے جواب میں ملکہ عالیہ کے فرمان کی نقل جوناگری میں لکھی ہے اور جس پر ملکہ عالیہ کی مہر ثبت ہے' بھیج رہا ہوں۔ فرمان میں جو شرائط دی گئی ہیں وہ ملکہ عالیہ جیسی نیک صفت ملکہ ہی لکھ سکتی ہیں۔ اسے غور سے پڑھیں اور پڑھنے کے بعد اس کا جواب مجھے دیں۔ اگر آپ اسے نہیں سمجھ سکتے ہیں تو آپ کے اطلاع دینے پر آپ کو سمجھانے کی کوشش کروں گا۔ یا آپ چاہیں تو آپ کو میں ایک بھروسہ بند آدمی بھیج سکتا ہوں جس کے آنے جانے کی حفاظت کی ذمہ داری میری ہوگی۔ اسے میں وہ سب کچھ سمجھادوں گا جو آپ نہیں سمجھ سکے ہیں۔ آپ ملکہ عالیہ کے فرمان کو غلط نہ سمجھیں۔ آپ نے لکھا ہے کہ آپ کے پاس ایک عیسائی بچہ ہے۔ میں آپ کو مرد سمجھتا ہوں۔ اس لیے آپ کی یہ ذمہ داری ہے کہ آپ اس بچہ کو محفوظ رکھیں۔ ملکہ عالیہ کے فرمان میں جو کچھ لکھا ہے اس کے علاوہ میرے پاس آپ کو دینے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ چونکہ اس وقت میرے پاس کوئی سنسکرت پڑھنے والا نہیں ہے' اس لیے آپ کی عرضداشت پڑھنے میں دشواری ہو رہی ہے۔ بہتر ہو کہ آپ اس کا جواب اردو یا ناگری میں دیں۔

## باب یازدہم

# تجزیہ

ہم دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح 1857ء کی تحریک شروع ہوئی' کس طرح اسے فروغ ملا اور کیسے اس کا خاتمہ ہوا۔ کیا یہ سپاہیوں کی بے چینی کا اچانک اظہار تھا یا کچھ چالاک سیاست دانوں نے اس طرح کی بغاوت کے بارے میں پہلے سے سوچا سمجھا منصوبہ بنا رکھا تھا؟ کیا یہ بغاوت صرف فوج تک محدود تھی یا عوام نے بھی اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ کیا یہ عیسائیوں کے خلاف ایک مذہبی جنگ تھی یا گورے اور کالے کے بیچ ایک نسلی جنگ تھی۔ کیا بغاوت کے پس پردہ کچھ اخلاقی جواز تھے یا لڑنے والے لوگ لاشعوری طور پر اپنی تہذیب و تمدن کے لیے لڑ رہے تھے۔ یہ چند سوالات ہیں جن کا جواب واضح طور پر دیا جاتا ہے۔

چپاتی کی کہانی سے اس نظریے کو کافی تقویت حاصل ہوتی ہے کہ پہلے سے تیاری' تشہیر اور سازش کی بدولت یہ بغاوت پھیلی۔ جنوری 1857ء میں گیہوں کی چھوٹی چھوٹی روٹیاں شمالی ہند کے ضلعوں کے بہت سے گاؤوں میں تقسیم کی گئی تھیں۔ گرچہ بعد میں اس کا غلط مفہوم نکالا گیا۔ پھر بھی اس میں شک و شبہ کی گنجائش ہے کہ رازدارانہ طور پر تقسیم کی گئی ان روٹیوں کے پس پردہ کوئی شرارت پیش نظر تھی۔ ضلع کے افسران نے اس میں خاصی دلچسپی دکھائی اور اس کے بارے میں پوری تفتیش کی۔ متھرا کے تھارن ہل لکھتے ہیں: ''یہ واقعہ اچانک اس طرح پیش آیا کہ سرکار بھی اس کی طرف فوراً متوجہ ہوگئی' جس نے اس کی تفتیش کا حکم دیا۔ لیکن ساری محنتوں کے باوجود یہ نہیں جانا جاسکا کہ کس شخص نے اسے تقسیم کرایا ہے اور اس کی شروعات کہاں سے ہوئی اور اس کا مطلب کیا تھا؟ اس عجیب و غریب واقعہ کے چند دنوں بعد اس کا ذکر بھی بند ہوگیا۔ اور پھر اسے فراموش کردیا گیا۔ سوائے ان چند لوگوں کے جنہیں یہ یاد تھا کہ ویلور کی بغاوت اسی طرح کی روٹیوں کی تقسیم کے بعد ہوئی۔'' گاؤں کے چوکیدار اور وہ لوگ جو ان چپاتیوں کی تقسیم کے ذمہ دار تھے' وہ ویلور کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے اور جن دیہاتیوں میں یہ تقسیم کی گئی' وہ بھی اسے نہیں سمجھ سکے۔ میرٹھ کا ویلس ڈنلپ کہتا ہے کہ ''چوکیداروں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ روٹیاں سرکار کے حکم کے بموجب تقسیم کی جارہی ہے۔ ان چھوٹی چھوٹی روٹیوں کا ایک ضلع سے دوسرے ضلع میں تقسیم کیے جانے کا مفہوم ہندوؤں کے نزدیک مہاماری کو دور کرنا ہے۔'' یہ

روٹیاں فروری کے آخر اور مارچ کے شروع میں نظر آئیں۔ وہ مزید لکھتا ہے "اس وقت سپاہیوں میں جو جوش و خروش نظر آیا اور بغاوت کے بعد ہوئے واقعات کی وجہ سے بہت سے لوگوں نے روٹیوں کی تقسیم کا تعلق اس بد نظمی سے جوڑا ہے، لیکن ایسا کرنے کے لیے ان کے پاس کوئی جواز نہیں تھا اور جن لوگوں نے انہیں تقسیم کیا یا ان معصوم لوگوں میں، جن میں تقسیم کی گئیں جو تعلق قائم کرنے کی کوشش کی گئی اس کی وجہ سے نہ تو بغاوت پھیلی اور نہ بعد میں اس کا کوئی اثر پڑا۔" اس کے خیال میں یہ چپاتیاں ایک طرح سے صلیب کا نشان تھیں۔ ان کی تقسیم کی وجہ یقیناً وہ توہم تھا جس کی بدولت ہیضے کی وبا' جو پچھلے سال شمالی مغربی صوبوں میں پھیلی تھی اور اب بھی بعض علاقوں میں اس کا اثر دکھائی دیتا ہے کو اسے دوبارہ لوٹنے سے روکنا تھا۔ "دلی کے سر تھوفیلس مٹکاف بھی یہ بیان دیتے ہیں کہ ان چپاتیوں کا مقصد اور رشتہ' بیماریوں سے تھا اور جو لوگ انہیں تقسیم کرنے لائے انکا خیال تھا کہ یہ تقسیم سرکار کے حکم کی وجہ سے ہو رہی ہے۔ جاٹ مل' جو بہادر شاہ کے مقدمے کا گواہ تھا اس کا کہنا ہے کہ ان چپاتیوں کا مفہوم الگ الگ لوگوں کے لیے جداگانہ تھا۔ جب کہ کچھ اور لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ ایک اندھی عقیدت کی وجہ سے تقسیم کی گئی تھیں تاکہ آنے والے سانحے ٹالے جا سکیں۔ جبکہ کچھ لوگوں نے اسے سرکار کی سازش سمجھا کہ عیسائیوں کی طرح کا کھانا ہندوستانی بھی کھائیں۔ یہ چپاتیاں بغیر کسی تفریق کے ہندو مسلمانوں میں تقسیم کی گئیں۔ محل کے لوگ بھی حیرت زدہ تھے کہ اس کا کیا مفہوم ہے۔ بدایوں کے ایڈورڈ کو یہ پختہ یقین تھا کہ دیہی علاقے کے سبھی لوگوں کو جن میں یہ کیک یا روٹیاں تقسیم کی گئیں' وہ اس کے اصل مفہوم کو نہیں سمجھ سکے۔ شمالی ہند کے ایک بے نام باشندے نے اس بات کی تصدیق کی کہ یہ چپاتیاں "صرف چھلاوا تھیں' جن کا مقصد کچھ بیماریوں کو بڑھنے سے روکنا تھا.......... اور اس کا کوئی سیاسی مقصد نہیں تھا۔ حکیم احسان اللہ نے گواہی دیتے ہوئے کہا کہ کوئی شخص یہ نہیں بتا سکتا کہ ان چپاتیوں کی تقسیم کا مقصد کیا ہے؟ سر سید احمد کا کہنا ہے کہ جب چپاتیاں تقسیم کی گئیں' اس وقت ہیضہ پھیلا ہوا تھا اور یہ ایک طرح سے ان بیماریوں کو ختم کرنے کا تعویذ تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم آج بھی ان اسباب کو نہیں جان سکے ہیں جن کی وجہ سے چپاتیاں تقسیم کی گئی تھیں۔ کوئی بھی سازش اس طرح سے مبہم ذرائع سے نہیں پنپتی ہے اور اس کے موثر ہونے کے لیے یہ بھی ضروری نہیں کہ اس طرح کے بالکل نئے اور غیر واضح ترسیل کی تلاش کی جائے۔ اور پھر حکومت وقت' اگر اس کے پیچھے کوئی سیاسی مقصد ہوتا تو اس کا ضرور پتہ لگا لیتی۔

یہ چپاتیاں مدھیہ پردیش میں بھی نظر آئیں لیکن وہاں بھی ان کی تقسیم کے پس پردہ کوئی سیاسی سازش نہیں سمجھی جا سکی۔ نیمار کے کیپٹن کیننگ نے سر رابرٹ ہملٹن کو لکھا "۱۸۵۷ء کا آغاز نیمار میں ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں میں چھوٹے چھوٹے کیک کی تقسیم سے ہوا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے یہ واقعہ سارے ہندوستان میں ہوا۔ اور ان کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ ان شورشوں کی طرف اشارہ کرتی ہیں جو سال کے آخر میں ہوئیں۔ جب وہ نیمار میں تقسیم کی گئیں تو

اندور سے لاکر تقسیم ہوئیں۔ اس شہر میں اس وقت ہیضہ کی بیماری پھیلی ہوئی تھی اور بہت سے لوگ مر رہے تھے۔ اس وقت نیماڑ کے لوگوں نے سمجھا اور آج بھی انھیں یقین ہے کہ گیہوں کی چپاتیاں اندور سے بھیجی گئی تھیں اور بھیجنے سے پہلے ان پر کافی منتر وغیرہ پڑھا گیا تھا تاکہ بیماریوں کے جراثیم وہاں سے نکل سکیں۔" اس لیے مدھیہ پردیش میں ان چپاتیوں کی تقسیم کو جراثیم کو ختم کرنے والا سمجھا گیا نہ کہ سیاسی شورش کی ابتداء کرنے والا۔

1858ء میں ہر چیز یا اچانک ہونے والی ہر بات کو شبہ کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔ اس لیے ستمبر میں آٹے کی لوئیاں اور گڑ اور تھیلی کے ساتھ برار میں تقسیم کی گئیں۔ شبہ کیا گیا کہ یہ بمبئی سے آئی ہیں۔ انھیں کیسے تقسیم کیا گیا یہ نہیں جانا جا سکا۔ لیکن ایک افسر کا خیال ہے کہ انھیں نانا اور ان کے آدمیوں نے تقسیم کیا۔ اکتوبر 1858ء میں چھندواڑہ ضلع میں ہلکے زرد رنگ کے دو جھنڈے ناریل کے ساتھ اور ایک سپاری اور پان کے بڑے پتے کے ساتھ گاؤں گاؤں میں تقسیم کیے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ ایسا نانا کے لیے کیا گیا تھا۔ اور اس کے پیچھے کچھ واضح اشارہ بھی تھا کیونکہ شیواجی کا جھنڈا بھی ہلکے زرد کا تھا لیکن ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ایسا کسی مذہبی تنظیم نے کیا ہو۔ کیونکہ آٹے کی لوئیاں اور بادامی رنگ کے جھنڈے بغاوت کے بعد تقسیم کیے گئے نہ کہ پہلے۔

ایک ہندو سادھو سیتارام بابا نے ان چپاتیوں کی نئی توضیح اس وقت کی جب میسور کے جوڈیشیل کمشنر ایچ بی ڈیورکس اور کیپٹن جے ایل پیئرس ان سے گواہی لے رہے تھے۔ سیتارام کی تفتیش میسور میں کئی دنوں تک 18/ جنوری سے 25/ جنوری 1858ء تک چلی۔ انھوں نے سازش کی ایک فرضی کہانی سنائی جسے گوالیار کی بائزہ بائی نے 20 سال قبل شروع کیا تھا اور جس میں بھی اہم راجا شریک تھے۔ بائزہ بائی اس سازش سے الگ ہو گئی جب اس کا مقصد یایاجی راؤ کی تخت نشینی سے حاصل ہو گیا۔ جب بائزہ بائی اس سے الگ ہوئی تو نانا فوراً اس کے نقش قدم پر چلنے لگے۔ وہ ایک ننگے فقیر دسّہ بابا کی کرامات پر منحصر تھا اور اس کی مالی معاونت جموں کے راجا گلاب سنگھ اور متھرا کے سیٹھ لچھمی چندنے کی تھی۔ حیدر آباد کے ایک وزیر جن کے نام کے آخر میں چندیا جنگ آتا تھا وہ بھی اس سازش میں شریک تھے۔ دسّہ بابا نے کمل کے بیج سے ایک چھوٹی مورتی بنائی اور اسے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا۔ ہر ٹکڑا چپاتی کے درمیان میں رکھا گیا اور جہاں جہاں یہ چپاتیاں پہنچیں، وہاں وہاں نانا کا اثر قائم ہوتا گیا۔ اس کے ساتھ ہی سارے ہندوستان کے اسٹیشنوں پر رات میں حملہ کرنے کا منصوبہ بھی بنایا گیا تھا۔ سبھی انگریزوں کو جان سے مارنے اور عورتوں اور بچوں کو ہندوستان نہ پہنچنے دینے کا منصوبہ بھی بنایا گیا تھا۔ منصوبہ کے تحت ریوا کے راجا کو بنارس پر قبضہ کرکے بنگال پر حملہ کرنا تھا۔ سیتارام بابا کے مطابق اس ملک گیر سازش کا مرکز پنجاب میں تھا۔ لیکن اس کا ایک شاگرد دین دیال کو بیراگی کے بھیس میں آنا تھا۔ میسور کے مہاراجا کو بھی اس سازش میں شریک کیا گیا اور جنوب کے دوسرے راجاؤں کو بھی شامل کیا گیا۔ نور جیٹ نے اس کہانی کو من گھڑت کہہ کے ناقابل قبول بتایا لیکن گورنر جنرل نے کہا کہ سیتارام کے

الزامات کی تفتیش کی جائے۔ گرچہ اس کے بیانات میں بہت زیادہ غلطیاں تھیں۔ اس کے بیان کی نقول گورنر جنرل کے ایجنٹس، وسطی ہندوستان حیدر آباد اور حکومت پنجاب کو تفتیش کے لیے بھیجی گئیں۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ کہیں بھی اس پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا گیا۔ سیتارام کی اس من گھڑت کہانی سے کہیں بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ملک گیر بغاوت کے لیے کہیں کوئی منصوبہ بند سازش کی گئی تھی۔

اب اس خط کی کہانی آتی ہے جس کے بارے میں کہا گیا کہ اسے جھانسی کی رانی لکشمی بائی نے لکھا تھا جسے ابھی حال ہی میں پوری میں دریافت کیا گیا۔ یہ خط دراصل تیر تھ استھانوں پر اس کے خاندانی پروہتوں کے نام لکھا ہوا بتایا جاتا ہے۔ یہ خط ہندی میں ہے اور اس پر مارچ 1856ء کی تاریخ درج ہے۔ اگر اسے سچ سمجھا جائے تو اس کا مطلب نکلتا ہے کہ میرٹھ کی بغاوت سے ایک سال پہلے ہی سے رانی بغاوت کی منصوبہ بندی کرتی رہی تھیں، لیکن اس خط کی زبان اور رسم الخط آج کا لگتا ہے۔ اس نے سر رابرٹ ہملٹن کو جو خریطہ بھیجا تھا اس میں مسلم طرز سے تاریخ دی گئی ہے لیکن اس خط میں جو ایک برہمن کو لکھا گیا ہے، انگریزی طرز میں تاریخ درج ہے۔ اس زمانے کے رواج کے برخلاف رانی نے اپنے پروہت کو مانیہ پنڈا جی کہہ کر مخاطب کیا اور آخر میں اپنا نام 'یورس لکشمی بائی' (آپ کا لکشمی بائی، جو غلط ہندی ہے) اس میں مہر بھی ان سے مختلف ہے جو وہ سرکاری خطوط میں استعمال کرتی تھیں۔ ساتھ ہی اس میں چربی ملی گولیوں کا تذکرہ ہے جبکہ یہ گولیاں ہندوستان میں نومبر ۱۸۵۶ء میں آئیں اور سپاہیوں نے اس کے بارے میں جنوری ۱۸۵۷ء کے پہلے کچھ بھی نہیں سنا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ خط میرٹھ سے لکھا گیا تھا لیکن اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ رانی مارچ ۱۸۵۶ء میں اس جگہ یا کسی اور جگہ کبھی گئی بھی تھیں۔ یہ خط کسی کے ذہن کی اختراع ہے اور جس شخص نے بھی اسے لکھا ہے، اسے انگریزی کے طرز مراسلت سے واقفیت ہے۔

کراک رافٹ ولسن کو یہ یقین تھا کہ ہندوستان کے سارے فوجی علاقوں میں ایک ساتھ بغاوت کے لیے تاریخ اور وقت کا تعین پہلے کر لیا گیا تھا لیکن اس نے اپنے اس خیال کی تائید میں کوئی ثبوت نہیں پیش کیا۔ جو بھی واقعات ہمارے سامنے آئے ہیں وہ اس کے اس خیال کی تردید کرتے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا میرٹھ کی بغاوت کوئی پہلے سے سوچی سمجھی سازش کا نتیجہ نہیں تھی۔ لکھنؤ میں ایک رجمنٹ نے مئی کے شروع ہفتہ میں ان گولیوں کو دانت سے کاٹنے سے انکار کیا تھا، جبکہ عام بغاوت مہینہ کے آخر میں ہوئی اور اس کے کافی دنوں بعد پولیس نے بغاوت کی۔ میرٹھ اور دلی کی بغاوت میں پندرہ دنوں کا وقفہ تھا۔ سیتاپور اور سیالکوٹ میں جب مختلف رجمنٹس کو بھاگنے کا کوئی موقع نہیں ملا تو انھوں نے بغاوت کی اور پھر ٹکڑے ٹکڑے کر کاٹ دئے گئے۔ اس کے بعد جس کسی نے کہیں بھی بغاوت کی اس کا یہی حشر ہوا۔ بہت سے معاملات میں تو جیسا کہ معلوم ہے، سپاہیوں نے پریڈ کے دوران اپنے افسروں کو گولی مار دی یا ان کے گھروں میں گھس کر

انھیں ہلاک کیا۔ دوسرے معاملات میں انھوں نے انھیں اور ان کے خاندان والوں کی جان بچائی' انھیں پیسہ بھی دیا اور آنسوؤں کے ساتھ ان سے جدا ہوئے۔ ان افسروں کے ساتھ جو سلوک کیا گیا......... وہ ان کے اپنے رویے یا کردار کی بدولت تھا۔ کہیں بھی سپاہیوں میں ایک طریقۂ کار نہیں پایا گیا۔ اس سے واضح نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ کہیں بھی کوئی سازش کا منصوبہ پہلے سے نہیں بنا تھا۔ بہت سے تاریخ نویسوں نے اختلافات کی تحقیق کو لائق توجہ نہیں سمجھا۔ یہ صحیح ہے کہ زیادہ تر سپاہی جاہل تھے۔ معلومات کی کمی تھی لیکن ان کی اپنی ایک منطق تھی اس لیے الگ الگ واقعات کی الگ الگ توضیح کی جاسکتی ہے' بلکہ اکثر تو سرکار نے حفظ ماتقدم کے طور پر جو حفاظتی تدابیر کی تھیں' ان کی وجہ سے سپاہیوں نے اپنی حفاظت میں بغاوت کی۔ وسط ہندوستان میں مہو اور نصیر آباد' پنجاب میں جہلم اور سیالکوٹ اور شمالی مغربی صوبوں میں الٰہ آباد' اور فتح پور' اودھ کے فیض آباد اور سیکرورہ میں یورپین فوجوں کی آمد کی خبر سے ہی بغاوت پھیل گئی اور سر جان لارنس کا تو یہ کہنا ہے کہ فوجیوں کو غیر مسلح کرنے اور انھیں گھوڑ سوار دستہ سے محروم کرنے کی وجہ سے یہ افراتفری ہوئی اور اس کی وجہ سے بغاوت پھوٹ پڑی۔ یہ پوچھے جانے پر کہ بہت سے سپاہیوں نے ستمبر اکتوبر تک بغاوت نہیں کی' ایک گمنام ہندوستانی مصنف نے اسی لہجے میں جواب دیا" جیسا کہ میں آپ کو بتا چکا ہوں" وہ لکھتا ہے "یہ کوئی سوچا سمجھا منصوبہ نہیں تھا۔ بہت سے لوگوں کو یہ امید تھی کہ بہت سی رجمنٹ کو ختم کیے جانے سے سرکار مطمئن ہو جائے گی لیکن روز بروز انھیں یقین ہوتا جارہا تھا کہ سرکار صرف یورپین افواج کی آمد کی منتظر تھی تاکہ بنگال آرمی کو غیر مسلح کرکے انھیں توپوں سے اڑادیں۔"

جیسا کہ سر سید احمد نے لکھا ہے' اس چربی والی گولی کو لے کر سپاہیوں میں آپس میں کچھ مراسلت ہوتی رہی ہوگی لیکن متحدہ طور پر مزاحمت کا کوئی منصوبہ نہیں بنا تھا۔ کوئی بھی رجمنٹ اس گولی کو پہلے استعمال کرنے کو تیار نہیں تھی۔ وہ اس بات کی منتظر تھی کہ دیکھیں دوسرے کیا کرتے ہیں؟ کرنل کارمیکائل اسمتھ نے جان بوجھ کر میرٹھ میں جو شرارت انگیز حکم دیا اسی کی وجہ سے وہاں بغاوت پھوٹ پڑی۔ یہ خبر ایک اسٹیشن سے دوسرے اسٹیشن تک پہنچتی رہی۔ ساتھ ہی یہ اطلاع ملی کہ تمام معصوم اور وفادار سپاہیوں کو بھی ہر جگہ غیر مسلح کیا جارہا ہے' اس خبر نے بھس میں چنگاری لگائی۔ اگر دوسروں کو بھی ایسا ہی موقع دیا جاتا جو ناصری رجمنٹ کو دیا گیا تھا تو شاید وہ بھی اسی طرح اپنی وفاداری نبھاتے۔ لیکن احتیاطی تدابیر' سخت سزائیں اور افسروں کے ذریعہ سپاہیوں پر بھروسہ نہ کیے جانے کے اظہار نے سپاہیوں کے سامنے کوئی راستہ نہیں کھلا چھوڑا سوائے اس کے کہ مسلح بغاوت کریں۔ پنجاب میں سپاہیوں کو اپنے افسروں پر کوئی بھروسہ نہیں رہ گیا تھا۔ نکلسن نے 59 ویں این آئی کو ایک دن قبل کہا تھا کہ انھیں غیر مسلح کیے جانے کا کوئی سبب نہیں ہے۔ جبکہ دوسرے ہی دن صبح کے وقت ہی انھیں حکم دیا گیا کہ وہ اپنے اسلحے جمع کرادیں جبکہ اس دوران انھوں نے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔

اور نہ ہی سپاہی یا ان کے قائدین کسی غیر ملکی طاقت سے ساز باز کیے ہوئے تھے۔ ایسا کوئی بھی حوالہ یا ثبوت نہیں ملتا جس سے یہ کہا جا سکے کہ بغاوت کی اس تحریک کے پیچھے روس کا ہاتھ تھا۔ بادشاہ پر جب مقدمہ چلا تو یہ الزام لگایا گیا کہ اس نے فارس میں اپنے ایلچی بھیجے تھے۔ یہ فارسی لوگ یقیناً ہندوستان میں شورش پھیلا کر اس وقت خوش ہوئے جب انگلینڈ سے ان کی جنگ ہو رہی تھی۔ شاہ کی طرف سے ایک فرمان' یہ صحیح ہے' جامع مسجد میں لگایا گیا لیکن اسے فوراً ہی ہٹا دیا گیا۔ اور دلی کے عوام اسے نہیں جان سکے۔ اتنے بڑے ملک میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں تھی جو غیر ملکی حکومت کو اپنے لیے بے عزتی سمجھتے اور جس فرمان کی بات کہی گئی ہے' ہو سکتا ہے وہ انھیں میں سے کسی نے لگا دیا ہو۔ چاہے کچھ بھی ہو' کوئی ایک واقعہ بھی کسی سازش کا ثبوت نہیں فراہم کرتی۔ مکند لال جو بادشاہ پر چلائے گئے مقدمے کے دوران بطور گواہ پیش ہوا تھا' نے کہا کہ مرزا سلمان شکوہ کے پوتے لکھنؤ سے آئے تا کہ شاہ ایران اور دلی کے شہنشاہ کے درمیان کوئی سمجھوتہ کرا سکیں۔ مرزا سلمان شکوہ جو شاہ عالم دوم کا پوتا تھا' وہ لکھنؤ میں پناہ گزیں تھا۔ اس کے وارثین نے شیعت کو قبول کر لیا تھا تا کہ وہ شیعہ حکمرانوں کے ساتھ اپنی وفاداری کا اظہار کر سکیں۔ یہ حد سے زیادہ مشکل تھا کہ وہ ایک غیر ملکی طاقت کے ساتھ رازدارانہ مراسلت جاری رکھ سکیں گے' جبکہ ان پر برٹش ریزیڈنٹ کی ہمہ وقت نگاہ تھی۔ چونکہ دلی میں ان کی آمد کوئی راز نہیں تھی۔ مکند لال کے بیان کے مطابق ایک شخص جس کا نام سیدی قنبر تھا' وہ بادشاہ کے خط کے ساتھ ایران گیا۔ لیکن سیدی قنبر نے خود قبول کیا کہ وہ کبھی بادشاہ کا رازدار نہیں رہا۔ اور یہ کہ یہ خفیہ مراسلہ اسی نام کے ایک دوسرے سکریٹری کو دیا گیا تھا۔ حکیم احسان اللہ کو یہ شبہ تھا کہ مرزا حیدر (سلمان شکوہ کا لڑکا) نے بادشاہ کو یہ ترغیب دی کہ وہ شیعت کو قبول کر لیں تا کہ شاہ کے ساتھ جو کہ اس زمانے میں شیعت کا سب سے بڑا سرپرست تھا' مراسلت کا سلسلہ شروع کیا جا سکے۔ اس شبہ کی تائید کہیں سے بھی نہیں ہوئی۔ چاہے کچھ بھی ہو مرزا حیدر دلی میں اودھ پر قبضہ سے پہلے آئے تھے۔ اس وقت تک اودھ کے بادشاہ کو اپنے انگریز دوستوں سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ اور وہ اس شخص کو جسے اپنے یہاں پناہ دی تھی اس طرح کے کام کی کبھی اجازت نہیں دے سکتے تھے۔ اور یہ کبھی ثابت نہیں ہوا کہ سیدی قنبر کوئی خط لے کر شاہ کے پاس گیا تھا۔ یہ الزام سراسر بے بنیاد تھا۔ میجر ہیریٹ نے یہ دلیل دی کہ شاہ نے ہندوستان کے تمام صوبوں کے لیے اپنے درباریوں کو گورنر بنائے جانے کا وعدہ کیا۔ صرف ہندوستان کا تاج بہادر شاہ کے لیے چھوڑا گیا۔ اس سے یہ ثابت نہیں ہو تا کہ دلی کے بادشاہ کا ایران کے شاہ سے کوئی سمجھوتہ ہوا تھا لیکن یہ یقیناً ایران کے شاہ کی ایک سفارتی چال تھی' تا کہ وہ دلی کے بادشاہ کی حمایت حاصل کر سکے' اور اس کے ذریعے سے ان ہندوستانیوں کی بھی جواب بھی بہادر شاہ کو قانونی طور پر ہندوستان کا شہنشاہ سمجھتے تھے۔ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ یہ بھی ثابت کیا جائے کہ بہادر شاہ سپاہیوں سے 11 مئی سے پہلے مراسلت جاری رکھے ہوئے تھا۔ جیسا کہ سر جانس لارنس نے بجا طور پر لکھا ہے "ایسا قیاس کرنا

رانی لکشمی بائی کی مہر

ہندی میں لکھے گئے خط میں لگی سیل
جسے رانی لکشمی بائی سے
منسوب کیا جاتا ہے

ممکن ہی نہیں کہ اگر شاہ نے اس طرح کا ارادہ کیا تھا کہ وہ ہندوستان میں برٹش طاقت کا خاتمہ کرنے کے لیے ان پر حملہ آور ہو تو یقیناً جب ہماری قسمت کی بازی لگی ہوئی تھی تو ہم سے امن کا معاہدہ کیا ہوتا اور اس طرح سے ہندوستانی فوجیوں کو مدد پہنچائی ہوتی جو فارس میں پھنسے ہوئے تھے۔ اگر شاہ نے واقعی ایسی کوئی کوشش کرنے کو سوچا ہوتا تو کیا وہ اپنے ایلچی پنجاب اور پشاور نہیں بھیجتا؟ اگر اس نے ایسا کیا ہوتا تو سازش کے کسی بھی اشارے کو ثابت کیا جا سکتا تھا۔ لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ بات یہ ہے کہ ہم نے جو کچھ بھی دلی کے بادشاہ کی سازش کے بارے میں سنا ہے اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے ہندوستان میں سپاہیوں کے ساتھ کسی قسم کی کوئی سازش نہیں کر رکھی تھی اور نہ ہی فارس یا روس کے ساتھ۔" مسٹر کرشن لال ان دلائل کی تردید مرے کے ایک خط کے حوالے سے کرتے ہیں۔ مسٹر مرے فارس میں برٹش سفارت نگار تھے۔ اس نے یہ خط لارڈ کیننگ کو لکھا تھا۔ جس میں کہا گیا تھا کہ ایک اعلیٰ مرتبہ کے فارسی افسر نے قبول کیا ہے کہ وہ شمالی ہندوستان میں مسلم سرداروں کو خط لکھتا رہا ہے تاکہ وہ غلامی کی زنجیر کو توڑ سکیں۔ اس اعتراف سے محض ارادے کا اظہار ہوتا ہے' اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ کوئی سازش کرنے کے لیے کم سے کم دو پارٹی کا ہونا ضروری ہے۔ صدر اعظم نے اپنی طرف سے کیے گئے یک طرفہ کام کا حوالہ ضرور دیا ہے لیکن یہ نہیں بتایا کہ دوسری طرف سے کیا جواب ملا۔ بہادر شاہ نے یقیناً پٹیالہ کے راجا اور شمالی ہندوستان کے دوسرے سرداروں کو بغاوت کے دوران اس طرح کے اشارے بھیجے تھے۔ لیکن ان کی طرف سے حمایت کا کوئی جواب نہیں موصول ہوا۔ پہلی عالمی جنگ کے دوران جرمنی کے قیصر ولیم دوم نے بہت سے ہندوستانیوں کو خط بھیجا لیکن ان میں سے کوئی بھی جرمنی کا حمایتی نہیں بنا۔ ہمیں یہ بھی نہیں پتہ کہ مرے نے جن خطوط کا حوالہ دیا ہے وہ مکتوب الیہ کو کبھی پہنچے بھی یا نہیں؟

جس واحد غیر ملکی اقتدار سے باغی سرداروں نے کبھی مدد چاہی وہ نیپال تھا جس سے یہ حمایت بغاوت کے بعد' نہ کہ اس سے پہلے حاصل کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس طرح پہلے سوال کا جواب مل جاتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت نہ پہلے سے منصوبہ بند تھی' نہ ہی ہندوستان کی کسی سیاسی پارٹی نے اور نہ ہی کسی غیر ملکی طاقت نے جو انگریز کا مخالف تھا' نے اسے تحریک دی۔ اس کی ابتداء سپاہیوں کی بے چینی سے ہوئی اور عوام میں انگریزوں کے خلاف جو غم و غصہ تھا اس سے اسے تقویت ملی اور زیادہ تر سپاہیوں کا اپنا نقصان ہوا کیونکہ انگریزوں کی پالیسی ہمیشہ انھیں بے کار کرنے کی رہی ہے۔

بغاوت کی اس تحریک کو بہت سے ذرائع سے تقویت پہنچی۔ انگلینڈ کے منصوبہ سازوں میں بہت سے ایسے شامل تھے جو اپنے ملک کے سیاسی نظریوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔ مختلف پارٹیاں جن کے مختلف اصول و نظریے ہوں' وہ ہمیشہ کسی ملک کی قانونی حکومت کے خلاف فوراً اپنی حمایت کرنے لگتے ہیں' کیونکہ اس طرح ان کی بے چینی اور ناراضگی کو کسی اور تحریک کی

بدولت کھلے اظہار کا موقع مل جاتا ہے۔ یہی ہندوستان میں ۱۸۵۷ء میں ہوا۔ یہ تحریک جس کی ابتداء فوجی بغاوت سے ہوئی پورے ملک میں صرف فوج تک ہی محدود نہیں رہی۔ یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ ہندوستانیوں کی جو تعداد فوج میں شامل تھی' ان میں سے بہتوں نے بغاوت میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ بلکہ اکثر انگریز حکومت کی طرف سے ہندوستانیوں سے لڑتے رہے۔ ان میں سے اکثر لوگ باغی نہیں تھے۔ اور نہ ہی ہر بھگوڑا باغی یا غدار تھا۔ کانگڑہ اور نو پور میں چوتھی این آئی کی وفاداری پر کبھی کوئی شک نہیں ہوا۔ اور جن سپاہیوں کو آگرہ میں غیر مسلح کیا گیا تھا' انھیں بعد میں آوٹ رام کے کہنے پر دوبارہ سروس میں بحال کر دیا گیا۔ الہ آباد میں بغاوت کرنے کے بعد این آئی خاموشی سے اپنے گھروں کو چلی گئی۔ اندازاً آخر تک تقریباً تیس ہزار آدمی وفاداری نبھاتے رہے۔ تقریباً اتنے ہی آدمیوں کو غیر مسلح کر دیا گیا تھا یا وہ بھاگ گئے تھے۔ صرف 70 ہزار آدمیوں نے بغاوت میں حصہ لیا' وہ یقیناً اگر مل کر مقابلہ کرتے تو خطرناک ہو سکتے تھے۔

یہ باغی ہندوستان کے ہر گوشے سے اور ہر قوم سے شامل ہوئے۔ اگر دلی میں رج پر سکھ شامل تھے تو شہر کے اندر بھی بہت سے سکھ موجود تھے۔ اور مندسور میں ولایتی اور افغانوں کی اکثریت باغی فوج میں شامل رہی۔ یہ ایک طرح سے فیشن ہو گیا تھا کہ کبھی اس بغاوت کو مسلم تحریک سمجھا جاتا تو کبھی ہندو تحریک۔ لیکن ہمیشہ دونوں قوموں کے لوگ باغی فوج میں برابر سے شریک رہے۔ نانا کے پاس عظیم اللہ خاں تھے۔ بہادر خان کے پاس شوبھارام اور جھانسی کی رانی کے پاس بھروسہ مند افغانی محافظ۔ بغاوت کے ابتدائی دنوں میں اسے اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کی تحریک سمجھی گئی اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ انھیں ناکام کرنے کے لیے نچلی ذات کے ہندوؤں اور آدی باسی قبائلیوں کو بھرتی کیا جائے۔ لیکن اودھ کے باغی فوجیوں میں پاسیوں کی اکثریت تھی اور بھیلوں نے راجپوتانہ اور وسط ہندوستان میں باغیوں کی حمایت کی جبکہ سنتھالوں نے ایک بار پھر سرکار سے جنگ کرنے کا فیصلہ کیا۔ کیونکہ سرکار ساہوکاروں کی مدد کر رہی تھی۔ کوئی ایک قوم کوئی ایک ذات مکمل طور پر ایسی نہیں تھی جو اجتماعی طور پر سرکار کی حمایت میں یا اس کے خلاف لڑ رہی ہو۔ حد تو یہ ہے کہ اکاد کا انگریز بھی باغیوں کے ساتھ لڑ رہے تھے اور بہت سے انگریزوں کی 15 اور 45 شاہی خاندان کے لوگ حمایت یا مخالفت میں بٹے ہوئے تھے۔

اس بات کو دھیان میں رکھنا چاہیے کہ اسباب اور نتائج بغاوت اور انتشار کو ایک جیسا نہ سمجھنا چاہیے۔ کوئی ضروری نہیں کہ کوئی قانون شکن شخص محب وطن ہی ہو۔ جب انتظامیہ فیل ہو گئی تو شاطروں اور بدمعاشوں نے اس سے فائدہ اٹھایا۔ گوجروں نے بغیر کسی حمایت اور تعصب کے دونوں پارٹیوں کو ایک ساتھ لوٹا۔ وہ سیاسی گروپ بندی یا کسی سیاسی تحریک میں کوئی یقین نہیں رکھتے تھے۔ دیہی علاقوں میں بہت سے چھوٹے موٹے واقعات ہوئے جو خاص تحریک کی بدولت رونما ہوئے لیکن اس نے اس تحریک میں کوئی معاونت نہیں کی۔ سہارنپور کے بنجاروں نے اپنی حکومت قائم کر لی۔ گوجروں کا ہر علاقہ میں الگ الگ راجا تھا۔ ایک عجیب و غریب معاملہ متھرا کے

دیوی سنگھ کا تھا۔ اس کے پیش روؤں کے پاس چند گاؤں تھے اور اس نے خود اپنے کو چودہ گاؤں کا راجا ہونے کا اعلان کر دیا۔ اسے یہ خیال ہوا کہ برٹش حکومت ختم ہو گئی ہے۔ جب تھارن ہل اسے گرفتار کرنے کے لیے وہاں پہنچا تو اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ راجا ایک گنوار شخص ہے جس کے اندر شر کی کوئی صلاحیت نہیں ہے۔ گوجر اور بنجارہ راجا' یا چودہ گاؤں کے راجا نے اس بغاوت کے سبب پیدا ہوئی گڑبڑی سے جو موقع حاصل ہوا اسے ذاتی فائدے کے لیے استعمال کیا' لیکن انھوں نے اپنے کو تحریک سے نہیں جوڑا۔ اگر آدیباسی قبائلیوں نے اپنے آپ لوٹ مار مچائی تو ایسی بھی مثالیں ہیں جب بدمعاش اور ضرورت مند لوگ لوٹ کی امید لے کر باغی فوج میں شامل ہوئے۔ مہاجی وادی ایک بدنام ڈاکو تھا اور کسی حب الوطنی کے جذبے کے تحت وہ تانتیا کی فوج میں نہیں شامل ہوا۔ مہاراشٹر کا ایک برہمن بلسارے نے جنوب میں اپنے گھر کو اس امید کے ساتھ خیرباد کہا کہ شاید وہ اس سے اپنی زندگی بدل سکے اور وہ باغیوں کی فوج میں شامل ہو گیا۔ بغاوت میں اگر ہم ایسے افراد کو شامل بھی کر لیں تو مختلف سطحوں سے اس بغاوت کو عوامی تعاون ان جگہوں پر حاصل ہوتا گیا جو مغربی بہار سے پنجاب کے مشرقی سرحد تک پھیلے ہوئے تھے۔

مدراس کی پریزیڈنسی پر ان واقعات کا کوئی اثر نہیں پڑا اگرچہ فوج میں بے چینی کہیں کہیں ضرور نظر آ رہی تھی۔ لیکن یہاں کا تعلیم یافتہ طبقہ ہمیشہ انتظامیہ کا ساتھ دیتا رہا اور واضح الفاظ میں اس طرح کی شورشوں کی مذمت کرتا رہا۔ بنگال میں گرچہ سپاہیوں نے کئی جگہوں پر بغاوت کی لیکن کہیں بھی انھیں عوام سے کوئی تعاون نہیں ملا۔

اس کے برخلاف کچھ ثبوت ہمیں ڈھاکہ کے دو امراء کے ذریعے لکھے گئے ایک خط سے ضرور ملتا ہے جو کالی نرائن چودھری اور مغل آغا غلام علی کا بتایا جاتا ہے۔ جس میں انھوں نے یہ کہا ہے کہ انھوں نے باغی رجمنٹس کو کچھ مالی تعاون دیا۔ لیکن لیفٹیننٹ گورنر نے اسے ایک ایسے چالاک آدمی کا کارنامہ قرار دیا "جو موجودہ شورش کے زمانے سے فائدہ اٹھا کر دشمنوں سے کچھ رقم حاصل کرنا چاہتا تھا۔" کلکتہ کا سبھی تعلیم یافتہ طبقہ اور بنگال کے زمیندار' مدراس کے وفادار شہریوں سے بغاوت اور فوج کی مذمت کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ اس طرح کی چھوٹی موٹی بغاوت اکثر ہر بڑے ملک میں ہو جایا کرتی ہے۔ آسام میں منیرن دتہ کو پھانسی لگائی گئی اور مدھو ملک جو بنگالی تھے' انھیں دس سال کی سزا اس لیے دی گئی کہ وہ آہوم راجہ کے پوتے کندر پشوار سنگھ سے سازش بھری مراسلت کر رہے تھے اور اسے اس بات کے لیے اکسا رہے تھے کہ وہ اپنی قدیم سلطنت کو ان' سپاہیوں کی مدد سے دوبارہ حاصل کر لے۔ میجر ہالرائڈ' جو جورہاٹ کے ڈپٹی کمشنر تھے کے تعلقات منیرن سے اچھے نہیں تھے اور جب گواہی پر انھیں جو سزا دی گئی وہ کافی نہیں تھی۔ خاص طور پر اس وقت جب ان پر مقدمہ چلانے والے اور مقدمے کا فیصلہ کرنے والے خود ہالرائڈ تھے۔

اڑیسہ کے سنبل پور کے دو شہزادے سریندر شاہی اور ادونت شاہی جو اس وقت قید میں

تھے' بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوئے لیکن وہ خود کو معافی ملنے کی صورت میں پیش کرنے کے لیے آمادہ تھے۔ اڑیسہ کے سردار عام طور پر حکومت کا ساتھ دیتے رہے۔ پورہاٹ کے راجا نے کچھ شر ضرور پھیلایا کیونکہ انہیں اس بات کا احساس تھا کہ سر ائی کیلا کے راجا نے ان کی حق تلفی کر کے ان کی جگہ کسی اور کو تخت نشین کر دیا۔ بہار البتہ زیادہ محتاط تجزیاتی مطالعہ چاہتا ہے کیونکہ بہار میں کنور سنگھ پیدا ہوئے تھے جو بغاوت کے سب سے نمائندہ سردار تھے۔ سوائے شاہ آباد کے باقی سارے علاقے وفادار رہے۔ مظفر پور' چھپرہ' موتیہاری اور باڑھ کو یورپین افسروں نے خالی کر دیا تھا اس کے باوجود بھی ان ضلعوں میں خاموشی طاری رہی۔ کمشنر سیموئل کا کہنا ہے کہ سارن کے لوگوں نے بہت نظم وضبط سے کام لیا۔ ''بہار کے ضلع میں عوام عام طور پر اس خیال کے ماننے والے تھے کہ اب ہماری حکومت ختم ہونے والی ہے۔ اس لیے اب انھیں وہاں سے کہیں اور جا کر بسنا پڑے گا اس لیے انھوں نے لوٹ مار شروع کر دی۔'' بڑے زمینداروں نے عام طور پر قانون شکنی سے اجتناب کیا اور سرکار کی پیسے اور افراد سے مدد کی۔

سونپور کا بڑا میلہ امن کے ساتھ ختم ہو گیا۔ لفٹیننٹ گورنر نے اس کی رپورٹ دیتے ہوئے لکھا ''بغاوت کی کہیں بھی کوئی منظم سازش نظر نہیں آئی۔ جو باغی تھے انھیں انھی کے ضلعوں میں شکست دے دی گئی۔ چھوٹا ناگپور ضلع میں کچھ آدیباسی قبائیلوں اور ان کے سرداروں نے چھٹ پٹ شورش ضرور کی جن میں اکثر تو ذاتی رنجش کی وجہ سے یا انگریزوں کو ناپسند کرنے کی وجہ سے ہوئیں۔ صرف کنور سنگھ کے علاقے میں جہاں عوام اس کے وفادار تھے' انھوں نے باغیوں کو ضرور پناہ دی۔ لیکن یہ اندازہ کرنا مشکل ہے کہ شاہ آباد کے کسان راجپوت ہیرو سے خاص عقیدت رکھتے تھے یا اس وجہ سے کہ انھیں بغاوت کے اسباب سے لگاؤ تھا۔

بمبئی پریزیڈنسی میں صرف ستارا' کولھاپور' نارگنڈ اور ساونت واڑی کے ضلعوں میں تھوڑی بہت بغاوت پھیلی۔ یہ قابل توجہ بات ہے کہ بغاوت کی یہ آواز ستارا ضلع میں کسی مراٹھا سردار نے نہیں اٹھائی بلکہ ایک ہندوستانی چپراسی نے۔ بمبئی میں ایسی ایک سازش کا پتہ پولیس کمشنر فورجٹ کو لگا جسے اس نے اسے فوراً کچل دیا۔ اس طرح مہاراشٹر کچھ جگہوں پر چھوٹی موٹی بے چینی کے اظہار کے بعد اپنے روایتی سکون پر دوبارہ واپس آ گیا۔ یہ بھی حیرت کی بات ہے کہ خود پیشوا کو اپنی گھریلو ریاست میں کسی طرح کا کوئی تعاون نہیں ملا۔

صرف شمالی مغربی صوبے کے اودھ اور روہیلکھنڈ علاقوں میں اس بغاوت کو کافی کامیابی ملی۔ لیکن روہیل کھنڈ کے علاقے میں جہاں تقریباً ایک سال تک برٹش حکومت کا کوئی وجود نہیں رہا' وہاں بھی بجنور اور مراد آباد ضلعوں سے کوئی ٹھوس مدد نہیں ملی۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح نجیب آباد کے نواب کو بجنور کے ہندو زمینداروں نے وہاں سے بھگا دیا۔ اور کس طرح اس ضلع کا انتظام کچھ وقتوں کے لیے برٹش حکومت کی طرف سے سید احمد پر آ پڑا تھا جہاں انھیں کوئی فوجی مدد بھی حاصل نہیں تھی۔ اس طرح یہ نتیجہ نکالنا غلط ہو گا کہ مراد آباد کے لوگ بغاوت کا ساتھ

دے رہے تھے۔ بلکہ یہاں یہ تحریک فرقہ وارانہ منافقت کا شکار ہوگئی۔ اور عملی طور پر مراد آباد ضلع رام پور کے وفادار نواب کے تحت رہا۔ صوبے کے باقی حصوں میں بھی نئی انتظامیہ کوئی تعاون نہیں حاصل کر سکی۔ گرچہ خان بہادر خاں نے اس بات کی بہت کوشش کی کہ ہندوؤں کو اپنے ساتھ ملا سکیں۔ یہ بھی صحیح ہے کہ اس نے چالیس ہزار کی فوج تیار کرلی تھی لیکن درگاداس بندو پادھیائے کا کہنا ہے کہ اس کی فوج میں لوگ صرف ملازمت کی غرض سے شامل ہوئے، انھیں بغاوت کے اسباب سے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ اور اسی غرض سے ہزاروں غریب لوگ بھی برٹش کیمپ میں چلے گئے تھے۔ عوام اس طرف چلے جاتے جدھر ملازمت ملنے کی امید ہوتی۔ شمالی مغربی صوبوں کے بہت سے بااثر تعلقداروں نے باغیوں کا ساتھ دیا گرچہ بہت سے ان کے دوسرے ساتھی اپنے غیر ملکی آقاؤں کے وفادار بنے رہے۔ اگر مین پوری کے راجا نے اپنے ساتھ ہوئی ناانصافی کی بنا پر بغاوت کا ساتھ دیا تو اس کی جگہ لینے والا پرتھوی پال سنگھ ہمیشہ سرکار کی مدد کے لیے تیار رہا۔ میرٹھ اور سہارنپور ضلعوں سے انگریزی حکومت کا بالکلیہ خاتمہ نہیں ہوا۔ پول وھیل کی شکست کے دو دن بعد آگرہ کے سبھی دولتمند اشخاص اپنی وفاداری ظاہر کرنے کے لیے لفٹیننٹ گورنر سے ملنے گئے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی اس وفاداری کے اظہار میں خلوص کے ساتھ نہ شامل ہوئے ہوں لیکن یہ یقین ہے کہ وہ باغیوں کے ساتھ نہیں تھے۔ شہر کے سب سے بڑے تاجر جوتی پرشاد کی مدد کے بغیر حکومت کے لیے ناممکن تھا کہ وہ ضروری وسائل جٹا سکے۔ اسی طرح دلی کے آس پاس کے گاؤں والے بھی اپنی وفاداری کے معاملے میں بٹے ہوئے تھے۔ رانکس نے دعویٰ کیا کہ ''اسے ذاتی طور پر معلوم ہے کہ مئی 1857ء میں مین پوری کے عوام ہمارے لیے نیک اور بہتر خیالات رکھتے تھے۔'' وہ لکھتا ہے ''میسرس فلپس اور براثلی جو اعلیٰ عہدوں پر تعینات تھے، وہ 10/ جون کو آگرہ پہنچے۔ یہاں آنے کے لیے انھوں نے دوآبہ کے فرخ آباد اور ایٹہ اور روہیل کھنڈ کے بدایوں کے علاقے کو صرف تین یا چار محافظ گھوڑسواروں کے ہمراہ طے کیا۔''' ''اسی جون کے پورے مہینے میں مسٹر آرتھر کاکس مین پوری کے جج، مسٹر واٹسن علی گڑھ کے مجسٹریٹ، ڈاکٹر کلارک مسٹر ہربرٹ ہیلکنٹن اور کچھ دوسرے لوگ علی گڑھ یا اس کے آس پاس اپنے عہدوں پر کام کرتے رہے۔ گرچہ اس اسٹیشن پر بغاوت پھیل چکی تھی۔ ایسا اس لیے ممکن ہوا کہ یہاں کے لوگ عام طور پر ہمارے خلاف نہیں تھے اور اسی لیے یہ تین گھوڑسوار افسروں کو لے کر گرینڈ ٹرنک روڈ سے دلی آگئے۔ گرچہ ہر طرف راستے میں باغیوں کی بڑی تعداد موجود تھی۔'' ''بغاوت کے ابتدائی دنوں میں کیپٹن سین فورڈ کی میرٹھ سے انبالہ تک کی مسافت اور ہڈسن کا تھوڑے سے دستے کے ساتھ انبالہ سے میرٹھ آنا یہ ثابت کرتا ہے کہ جن علاقوں سے یہ گزرے وہاں کے لوگ ہمارے مخالف نہیں تھے۔ اسی طرح 1858ء کے ابتدائی مہینوں میں میڈلے نے دلی سے کانپور کا سفر بغیر کسی ضرر کے طے کیا۔ گرچہ یہ سڑک محفوظ نہیں تھی کیونکہ نانا کے بھائی اپنے پانچ سو فوجیوں کے ساتھ کالپی جا رہے تھے۔'' اس نے خود بھی دلی سے مسوری

اور مسوری سے آگرہ کا سفر بغیر کسی خوف کے طے کیا۔ لیکن رائک کے ساتھ یہ نتیجہ نکالنا مناسب نہیں ہوگا کہ انگریزوں کی چھوٹی چھوٹی پارٹیوں نے دیہی علاقوں کو غیر محفوظ نہیں پایا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان علاقوں میں رہنے والے عوام سرکار کے وفادار تھے۔ جو نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے وہ یہی کہ وہ سب ان معاملوں سے اپنے کو لاتعلق رکھے ہوئے تھے۔ انھوں نے کسی ایک طرف جھکنا مناسب نہیں سمجھا۔ حد تو یہ ہے کہ ان صوبوں میں بنگال یا مدراس جہاں کوئی فتنہ کھڑا نہیں ہوا، وہاں کے لوگ بھی کسی ایک کا حمایتی ہونا پسند نہیں کرتے تھے۔ ان صوبوں میں بھی لاتعلقی پھیلی ہوئی تھی اور کسی کی چاہت کا فقدان بھی پایا جاتا تھا۔ اس کے باوجود کریمیا اور فارس کی خبریں ہندوستان میں بہت دلچسپی سے سنی جاتی تھیں۔ ڈاکٹر الگزینڈر روف جو تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کے بہت نزدیک تھا، اس نے ان کے خیالات کا تجزیہ اس طرح کیا ہے "بنگالی عوام کی اکثریت ان سارے معاملات کو بہت بے گانگی اور لاتعلقی کی نظر سے دیکھتی رہی، ان کے بارے میں یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ ہمارے وفادار ہیں یا غیر وفادار۔ کیونکہ لاکھوں آدمیوں کے دلوں میں بے چینی تو ضرور پائی جاتی ہے تاہم اس بات میں کوئی شک نہیں کہ بہت سے لوگوں کا جھکاؤ حکومت کی طرف تھا۔ اگر اسے لگاؤ کا نام دیا جائے تو غلط فہمی کا امکان ہے۔"

1857ء کی تحریک کی مقبولیت کا تجزیہ کرتے وقت ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ کسی بھی بغاوت یا انقلاب کے وقت صرف عوام کی اقلیت ہی اس میں فعال کردار ادا کرتی ہے۔ جبکہ اکثریت اکثر غیر فعال بنی رہتی ہے اور ایسے وقت میں صرف چند ہی افراد ایسے ہوتے ہیں جو موجودہ نظام سے کھلے عام اپنے کو وابستہ کرتے ہیں۔ کسی بھی جگہ پر ہونے والی کسی بھی بغاوت کو ہر شخص کا تعاون حاصل نہیں ہوتا۔ خود امریکہ میں وفادار لوگوں کی ایسی اکثریت تھی جنھوں نے کناڈا ہجرت کرنے کو پسند کیا، اس وقت جب اس ملک کو آزادی حاصل ہوئی۔ اسی طرح فرانس میں انقلاب کے وقت بہت سے شاہی افراد نے بھی انقلاب کا ساتھ دیا۔ جب اکثریت کی ایک بڑی تعداد کسی تحریک کی مقصدیت سے ہمدردی رکھتی ہے تو اس وقت اسے قومی پیمانے کی تحریک تو کہا جا سکتا ہے لیکن اس میں بھی بہت سے لوگ اپنا تعاون نہیں کرتے۔ اودھ اور شاہ آباد کے علاوہ کہیں سے بھی قومی جنگ کی کوئی علامت نہیں ملتی۔ لیکن اسے فوج کی بغاوت کا نام دینا بھی غلط ہوگا۔ کیونکہ یہ بغاوت ایک تحریک بن گئی اور بعد میں اس نے سیاسی رُخ اس وقت اختیار کر لیا جب میرٹھ کے باغیوں نے اپنے کو دلی دربار سے وابستہ کیا اور بہت سے زمیندار اور عوام نے بھی ان کے ساتھ تعاون کیا۔ جس لڑائی کی شروعات مذہب کے نام پر ہوئی تھی، اس کا خاتمہ آزادی کی لڑائی کی شکل میں ہوا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ باغی، غیر ملکی حکومت سے اپنا پیچھا چھڑانا چاہتے تھے اور پرانا نظام پھر سے واپس لانا چاہتے تھے۔ جس نظام میں دلی کا بادشاہ سارے ملک کا قانونی وارث تھا۔

صرف اودھ میں اس بغاوت نے قومی بغاوت کا رُخ اختیار کر لیا۔ گرچہ اس اصطلاح کو

صرف محدود معنوں میں ہی استعمال کیا جاسکتا ہے کیونکہ اس وقت تک ہندستانی قومیت کا تصور بھی نہیں پیدا ہوا تھا۔ پنجابیوں کے نزدیک ہندستانی اب بھی اجنبی تھے۔ بہت کم بنگالیوں کو بھی یہ احساس تھا کہ وہ اسی طرح ملک کے باشندے ہیں جیسے کوئی مراٹھی۔ وسط ہندستان اور راجپوتانہ کے لوگ جنوب کے لوگوں سے اپنا کوئی تعلق نہیں محسوس کرتے تھے۔ ملک کی ایکتا کے تصور نے مختلف قسم کی ایکتا کے تصور کو جنم دیا۔ گرچہ اب بھی یہ تصور سماج میں عام طور پر نہیں پھیلا تھا۔ لیکن ساری نسلی' مذہبی اور لسانی اختلافات کے باوجود ہندستان کے لوگوں نے یہ محسوس کیا کہ ان میں انگریزوں کے خلاف کوئی بات مشترک ضرور ہے' اسی لیے ایک راجپوت رزمیہ گو نے اپنی رزم کے لیے بھرت پور میں جاٹوں کی فتح کو اپنا موضوع بنایا اور بندیلوں کو نیپال میں انگریزوں کی شکست سے کافی خوشی ہوئی تھی۔ جب ملکی وفاداری کا تصور نہ ہو' اس وقت مذہب بہت اہم رول ادا کرتا ہے اور 1857ء میں ہر طرح کے لوگوں نے مذہب کی حفاظت میں سپاہیوں کا ساتھ دیا۔ اودھ کے تعلقداروں نے' جن کے علاقوں پر زبردستی قبضہ کیا گیا تھا' انھوں نے اپنی فوجیں اکٹھی کیں۔ انھیں نہ صرف سیاسی شکایتوں کا بدلہ لینا تھا بلکہ ایک اخلاقی جرم کو بھی درست کرنا تھا۔ جیسا کہ محمد حسن نے کہا تھا کہ اودھ کے سرداروں کی نگاہ میں انگریز حملہ آور تھے اور انھوں نے محسوس کیا کہ وہ نہ صرف اپنے بادشاہ بلکہ اپنے عقیدے کی حفاظت کے لیے بھی لڑ رہے ہیں۔ زمینداروں کی اس وفاداری نے حب الوطنی کے جذبے کو تقویت پہنچائی کیونکہ عوام کی اکثریت اپنے قائدین کے جذبات کی تائید کر رہی تھی۔ گرچہ اس میں کچھ استثنائی صورت بھی تھی جیسے بلرام پور اور شاہ گنج کے راجاؤں نے اپنے نئے آقاؤں کی وفاداری یا اس خیال سے کہ آخر میں انگریزوں کی ہی فتح ہوگی' حکومت کا ساتھ دینا مناسب سمجھا۔ پھر بھی جنھیں بعد میں ان کی دور رس نگاہوں کے لیے وافر انعام بھی دیا گیا' بینی مادھو اور دیوی بخش جیسے لیڈران اپنی ذمہ داریوں کے راستے پر چلتے رہے۔ گرچہ اس کی وجہ سے انھیں موت کا سامنا کرنا پڑا۔ رسل کو اس بات کے کافی شواہد ملے کہ عوام ان کی بہت تکریم کرتے تھے کیونکہ شنکر پور کی شکست کے بعد گاؤں والوں کے چہرے غمگین' اداس بنے رہے۔

اودھ کے محب وطن لوگوں نے اپنے بادشاہ اور ملک کے لیے لڑائی کی۔ گرچہ وہ سب آزادی کے حامی نہیں تھے کیونکہ ان میں انفرادی آزادی کا کوئی تصور نہیں تھا۔ انگریز حکومت نے ایک سماجی انقلاب برپا کر دیا تھا۔ انھوں نے عورتوں کی بہت سی محرومیوں کو دور کیا تھا۔ قانون کی نگاہ میں انھوں نے ہر شخص کے برابری کے درجہ کو تسلیم کیا تھا اور انھوں نے ہزاروں کاشتکاروں کی زندگی بہتر بنانے کی کوشش کی تھی۔ باغی لیڈروں نے ترقی کے ان اقدام کو پیچھے موڑ دیا ہوتا۔ انھوں نے بہت سی اصلاحوں کو بھی ختم کر دیا ہوتا اور پھر پرانے زمانے کے اس نظام کو رائج کر دیا ہوتا جہاں ایک عام آدمی امراء جیسا انصاف نہیں پا سکتا تھا۔ اور کاشتکار "تعلقداروں کے رحم و کرم پر منحصر تھے اور جہاں انھیں سخت سزائیں دی جاتیں۔ مختصراً وہ ایک دوسری طرح کا انقلاب لانا

چاہتے تھے۔ فوجی فتح سے یہ انقلاب آپاتا یا نہیں؟ یہ دوسرا سوال ہے۔

نہ ہی یہ گورے کالے لوگوں کے درمیان کوئی جنگ تھی۔ ہندوستان میں سبھی سفید فام لوگوں کو، چاہے ان کا تعلق کسی بھی ملک سے ہو، ایک ہی جیسا سمجھا گیا۔ لیکن کالے لوگوں کے ساتھ ایسا نہیں۔ "اگر فوجوں کے ساتھ ان کے مددگار نہ ہوتے تو فوجیں بالکل بے کار ہو جاتیں۔ یہ ہندوستانی خانساماں تھے جو سفید فام فوجیوں کے لیے گولیوں کی زد میں ہوتے ہوئے بھی ان کا کھانا تیار کرتے۔ یہ ہندوستانی بہشتی تھے جو جنگ کے دوران بھی اپنی زندگی کا خطرہ مول لیتے ہوئے ان کے لیے پانی لاتے اور یہ پالکی بردار تھے جو زخمیوں کو خطرے کے مقام سے نکال کر اسپتالوں میں پہنچاتے اور ہندوستانی خادم ان کا ہر طرح سے خیال رکھتے۔ لیکن اگر ان سارے غیر حملہ آوروں کی تعداد بھی نکال دیں تو بھی دلی میں 11200 موثر فوج تھی جن میں سے تقریباً 7900 ہندوستانی تھے۔ اس لیے یہ سیاہ فام باغیوں اور ان کے سفید فام حکمرانوں کے درمیان جنگ تھی جن کا ساتھ بہت سے سیاہ فام لوگوں نے بھی دیا۔ یہ معاملہ ایسے غلام کا تھا جو اپنے مشترکہ آقا کے سامنے دوسرے غلام کی بیڑیاں کاٹ رہا تھا۔

1857ء کی جنگ کا کوئی اخلاقی سبب نہیں تھا۔ جیسا کہ عام طور پر جنگوں میں ہوتا ہے۔ اس جنگ میں بھی سچائی یا صداقت پہلا شکار ہوئی۔ کیونکہ دونوں طرف کی پارٹیاں جھوٹے پروپیگنڈے میں لگ گئیں۔ اب اتنا وقت گذرنے کے بعد یہ پتہ لگانا بہت مشکل ہے کہ کیا اس جھوٹے پروپیگنڈے کا سہارا جان بوجھ کر لیا گیا یا ان پارٹیوں کو یہ یقین تھا کہ انھیں جو اطلاعات مل رہی ہیں وہ سچ پر مبنی ہیں۔ اس جنگ کا نام بجا طور پر، جیسا کہ ریس نے کیا ہے "مذہبی کٹر پسندوں کی عیسائیوں کے خلاف جنگ کا نام دیا جاسکتا ہے لیکن غدر کے زمانے میں ان کے مذاہب کی تعلیم کا جنگجوؤں پر کوئی اثر نہیں دکھائی دیتا۔ دونوں طرف کے لڑاکو اپنی اپنی حمایت میں مقدس کتابوں کا حوالہ بھی دیتے۔ عیسائیوں نے یہ جنگ جیت لی، لیکن عیسائیت نہیں جیت سکی۔ ہندو اور مسلمان دونوں کی شکست ہوئی، لیکن ان کے عقیدوں کی نہیں۔ عیسائیت نے مغربی سائنس کی طرف ہندوستانی دماغ کو متاثر کیا لیکن مشنریوں کو اپنی تبلیغ میں کوئی کامیابی نہیں ملی۔

1857 کی جنگ وحشیوں اور مذہبی لوگوں کے درمیان کی جنگ بھی نہیں تھی کیونکہ کسی بھی پارٹی نے انسانیت کے رویے اور اس کے ذریعے لازم کی گئی حدود کی پابندی نہیں کی، جس کی پاسداری کرنے کا دونوں فریق نے وعدہ کیا تھا۔ یہ ایک غیر انسانی جنگ تھی ان لوگوں کے درمیان جو خوف و نفرت کی وجہ سے پاگل ہو گئے تھے۔ اس لڑائی میں حصہ نہ لینے والے لوگوں کا بھی اتنا ہی نقصان پاگل فورس کی وجہ سے ہوا جتنا کہ مسلح لوگوں کا۔ عمر اور صنف کی تفریق بھی مٹ چکی تھی۔ حد تو یہ ہے کہ موت کے بعد بھی لاشوں کی بے حرمتی کی گئی۔ اب ان برے دنوں کو یاد کرنا مناسب نہیں ہے، لیکن تاریخ کو یہ تحریر کرنا ہے کہ جنگ انسان کو کس قدر درندہ بنا دیتی ہے۔ تہذیب کا وہ نقاب جو ہم اوڑھے ہوئے ہیں، وہ کتنا مہین اور نازک ہوتا ہے اور کس طرح ہمارے

اندر کا وحشی انسان جاگ پڑتا ہے اور کیسے ہندو مسلم اور عیسائی سبھی آسانی کے ساتھ قدیم اور آدیباسی بربریت کی طرف لوٹ پڑتے ہیں، جن کے آباواجداد کو مذہب اور تہذیب نے انسان بنادیا تھا۔

پھر بھی اس بات کو ملحوظ رکھنا پڑے گا کہ انگریز، اپنے ساتھیوں کے بہیمانہ قتل، عورتوں کی بے حرمتی اور بچوں کو کچلے جانے کی ظالمانہ داستانوں کو سُن کر ہی پاگل ہو اٹھے تھے۔ انھوں نے اس بات پر کوئی توجہ نہیں کی کہ وہ ان ظالمانہ کہانیوں کی صداقت پر غور کر سکیں اور بدکردار لوگ جذبات سے مغلوب ہو کر کس طرح ان ظالمانہ حرکتوں میں شریک ہوئے اور کیسے کیسے اس کی تشہیر کی گئی۔ وہ لوگ بھی جو مقدس اور متبرک سمجھے جاتے تھے وہ بھی یہ بھول گئے کہ یہ خدا کی طرف سے بدلہ لیا گیا ہے اور پھر منبروں سے انھوں نے بدلہ لینے کی آواز اٹھائی۔ اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں کہ انگریز بدلہ لینے کے لیے بے چین ہو گئے۔ کلی فورڈ جو گڑگاؤں کا اسسٹنٹ کلکٹر تھا، اس نے سنا کہ اس کی بہن اور مس جینکنس کو ''محل کے اندر ننگا کر دیا گیا اور پھر چاندنی چوک میں انھیں رسوں سے باندھ دیا گیا اور بادشاہ کے لڑکوں کی موجودگی میں انھیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا۔'' کلی فورڈ کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ ان کی بہن کو مارے جانے سے پہلے باغیوں نے کھلے عام اس کی عصمت دری کی ہو گی۔ اس لیے اس کے دماغ میں سوائے بدلہ لینے کے اور کوئی بات نہیں آئی۔ اور جب دلی کی شکست ہوئی تو اس نے گرفتھ کو بتایا کہ ''جو کوئی بھی اس کے سامنے آیا اس نے ان کی جان لے لی، چاہے وہ عورت ہو یا بچہ۔''

اس سے بھی بُری خبر بنگلور سے ملی لیکن اس کا بھی تعلق دلی سے تھا۔ اس میں کہا گیا کہ 48 عورتوں کو دلی کی سڑکوں پر ننگا کر کے پریڈ کرائی گئی۔ سب کے سامنے ان کی عصمت دری کی گئی اور پھر بڑی بے رحمی کے ساتھ انھیں مار دیا گیا۔ بعد میں جانچ سے یہ ثابت ہوا کہ مس کلی فورڈ اور مس جینکنس کو محل میں ان کے کمروں میں مارا گیا تھا اور ان کی کوئی بے حرمتی نہیں کی گئی تھی۔ اور لیکی نے ان 48 عورتوں کی کہانی کو ''ہندوستانی بغاوت کے سلسلہ میں پھیلے افسانے'' کے تحت ہی رکھا، ولبر فورس نے ایک عورت کی کہانی سنائی جو ایک کیپٹن کی بیوی تھی۔ جسے کھولتے ہوئے گھی میں ڈال کر میرٹھ اور دلی کے باغیوں نے مارا تھا۔ مجنڈی ان بچوں کی لرزہ خیز کہانیاں سناتا ہے جنھیں مصلوب کیا گیا تھا اور اسی طرح کی بہت زیادہ بہیمانہ کہانیاں خود انگلینڈ اور ہندوستان میں برٹش کیمپ میں روز پہنچتی رہیں۔

جب انگریزوں کو فتح حاصل ہوئی تو پھانسی پر لٹکانا یا زندہ جلا دینا روزمرہ کا معمول ہو گیا۔ معصوم بے گناہ اور مجرموں کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا گیا۔ کیپٹن اولیر جونس لکھتا ہے۔ ''یہ بہت لرزہ خیز بات ہے کہ بے چارے کسانوں کو گولی سے مار دیا گیا یا پھانسی چڑھا دیا گیا جبکہ وہ شاطر بدمعاش جنھوں نے یہ سارے ظلم ڈھائے تھے، بچ کر نکل گئے۔ لیکن شاید اس طرح کی جنگوں کا یہی نتیجہ نکلتا ہے اور شاید یہ ناگزیر بھی ہو جاتے ہیں۔'' رسل نے رینالڈ کے آدمیوں کے ذریعہ

بلا کسی تفریق کے لوگوں کو مارے جانے کی خبر سنی۔ ''مقامی لوگوں کو قطار در قطار کھڑا کر کے بغیر کسی تفریق کے آخری آدمی تک مار دیا گیا۔ جو افسر' ان کی کمانڈ کر رہا تھا وہ شاید نیل کے نقش قدم پر چل رہا تھا۔ دو دنوں کے اندر سڑک کے دونوں طرف پھندا ڈال کر 42 آدمیوں کو پھانسی دی گئی اور بارہ آدمیوں کو صرف اس لیے پھانسی دی گئی کہ وہ اپنے چہرے کا رخ دوسری طرف کیے ہوئے تھے۔ وہ جہاں کہیں بھی رُکتا تمام کے تمام گاؤوں میں آگ لگادی جاتی۔ ان ظالمانہ حرکتوں کی کوئی تاویل یا جواز پیش نہیں کیا جاسکتا۔ رسل اسی طرح سے ٹھنڈے دماغ کے ساتھ ظلم کیے جانے کی اور بھی مثال دیتا ہے' جو ظاہر کرتی ہیں کہ جنگ کے دوران انسان کس طرح درندہ بن جاتا ہے' وہ انسان جو عام حالات میں بہت زیادہ مہذب اور نرم دکھائی پڑتا ہے۔ ایسا ہی لکھنؤ میں ہوا۔ ''جب فوسیلیر دروازے تک پہنچا۔ ایک کشمیری لڑکا اپنے ساتھ ایک ضعیف اندھے آدمی کو لے کر اس چوکی تک آیا اور ایک افسر کے قدموں پر گر کر ان سے پناہ کا طالب ہوا۔ اس افسر نے جیسا کہ اس کے دوستوں نے بتایا' اپنا ریوالور نکالا اور اس ناتواں کے سر پر دے مارا۔ اس کے آدمیوں نے شرم شرم کا نعرہ بلند کیا۔ پھر اس نے اس پر گولی چلائی جو اس کی ٹوپی سے ہوتی ہوئی نکل گئی۔ تیسری بار پھر اس نے اپنا ٹریگر دبایا لیکن نشانہ چوک گیا۔ لیکن چوتھی بار وہ نشانہ لگانے میں کامیاب ہو گیا۔ اور اس لڑکے کا خون اس کے قدموں پر پڑا۔ اس دوران اس کے آدمی اس پر چیختے چلاتے رہے۔

جنڈی لکھتا ہے کہ اس طرح کا یہ تکلیف دہ سانحہ شاید بغاوت کی ظالمانہ تاریخ میں سب سے بہیمانہ باب تھا۔ یہ واقعہ لکھنؤ میں پیلی کوٹھی پر قبضے کے بعد ہوا۔ جہاں اینڈرسن' جو سکھ رجمنٹ کا مقبول نوجوان افسر تھا' جس نے اپنی جان گنوائی تھی۔ اپنے افسر کی موت سے اشتعال میں آکر سارے سکھ سپاہی اس تنہا آدمی سے بدلہ لینے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اسے دونوں پیروں سے پکڑ کر اسے دو حصوں میں پھاڑنے کی کوشش کی۔ اس میں ناکام ہونے پر وہ اسے دونوں پیروں سے گھسیٹتے چلے اور پورے راستے اس کے چہرے کو اپنی بندوق کی سنگین سے بھونکتے رہے اور وہ بے چارہ پورے راستے کراہتا رہا۔ اس کی چیخ و پکار نکلتی رہی۔ سپاہی اس کے بدن میں چھرا بھونکتے رہے اور اس کے جسم کو کچلتے رہے۔ اس کا خون اس سفید ریت کو رنگین کرتا رہا جس پر اسے گھسیٹا جارہا تھا' لیکن ابھی ان کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔ ابھی وہ سانس لے رہا تھا۔ وہ زخموں سے چور ہو چکا تھا' پھر بھی اُسے کھینچ کر سوکھی شاخوں پر ڈال دیا گیا جنھیں اسی مقصد کے لیے جمع کیا گیا تھا۔ اور پھر اسے آگ لگادی گئی۔ اس سے زیادہ کوئی اور ظالمانہ منظر نہیں ہو سکتا تھا۔ اس دوران وہ اپنے آپ کو آزاد کرانے کی جدوجہد کرتا رہا۔ زخموں اور درد سے پاگل ہو کر وہ کسی صورت سے ان کے چنگل سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ گرچہ وہ آدھا جل چکا تھا لیکن اسے پھر پکڑ کر واپس لایا گیا اور آگ میں ڈال دیا گیا۔ اور پھر اسے اس وقت تک پکڑے رکھا گیا جب تک وہ جل کر مر نہیں گیا۔ فاتح اور مفتوح کے درمیان اس جنگ نے جسے نسل اور مذہب کے فرق نے اور زیادہ دشمنی میں بدل دیا تھا' تہذیب اور انسانیت کی ساری نشانیوں کو ختم کر دیا تھا خواہ وہ ہندوستانی ہوں یا انگریز۔ رسل کا کہنا ہے

کہ عورتوں کی بھی جس حد تک بے حرمتی کی جاسکتی تھی کی گئی۔ لیکن یہ بھی نوٹ کرنے کی بات ہے کہ دونوں طرف سے ایسے بھی لوگ موجود تھے جو اس قسم کے وحشیانہ افعال سے نفرت کرتے تھے۔ کلائیڈ کو اس قسم کے وحشیانہ حرکت پر پابندی لگانی پڑی۔ حد تو یہ ہے کہ ہنری منکاف نے بھی گاؤں والوں کو صرف اس لیے کوڑے لگانے کی مخالفت کی کہ وہ پوشیدہ اسلحوں کے بارے میں اطلاع نہیں دے رہے تھے۔ شہزادہ فیروز شاہ' عورتوں اور بچوں کو قتل کرنا نہ صرف ایک جرم سمجھتا بلکہ سب سے بڑا گناہ بھی۔ اس غیر مہذب اور غیر انسانی جنگ کے دوران بہت سی مہربانیوں' رحم' شجاعت اور معافی کے بھی واقعات ملتے ہیں جنھیں دیکھ کر ہمیں انسانیت کے مستقبل سے مایوسی نہیں ہوتی۔

جب بغاوت کچل دی گئی اور امن و امان بحال ہو گیا تو جیک پانڈے اور ٹار ایٹکن اپنے معمولات میں لگ گئے۔ لیکن بغاوت کے بعد بہت سے ذمہ دار انگریز اور ہندوستانیوں نے ان پر پھر سے غور کرنا شروع کیا۔ یہ بغاوت ناگزیر تھی۔ کوئی بھی محکوم ملک ہمیشہ کے لیے کسی غیر ملکی حکومت کی غلامی نہیں قبول کرتا' چاہے یہ تلوار مخمل کے غلاف میں ہی کیوں نہ ہو۔ ہندوستان میں شاید یہ تلواریں فوجیوں کے ہاتھ میں تھیں۔ ہندوستانی فوجی اور ان کے غیر ملکی آقا کے درمیان نسل' زبان' یا مذہب، کا کوئی بندھن نہیں تھا۔ ہندوستانی شاید برٹش تاج کے لیے اتنی وفاداری نہیں محسوس کر سکتا جتنا ایک انگریز اپنی ماں کے دودھ کے ساتھ کرتا ہے۔ نمک کی روایتی وفاداری نے اپنے آقاؤں اور ملازموں کو ایک دھاگے سے باندھ رکھا تھا۔ لیکن نمک کی یہ وفاداری خود وفاداری اور حب الوطنی کا بدل نہیں ہو سکتی۔ سپاہی اپنی روٹی کے لیے ملازمت پر مجبور ہوئے تھے۔ اور دیر سویرا انھیں اپنی اس بے عزتی سے اشتعال میں آنا ہی تھا کیونکہ ایک سپاہی کی حیثیت سے اس کی یہ ذمہ داری تھی کہ وہ اپنے ملک کو غیر ملکی حکومت کے تحت بنائے رکھے۔ شاید یہ بغاوت 1857ء میں ہی ہونی تھی کیونکہ سلطنت کے آئین میں اس کے بیج بوئے جاچکے تھے۔ 1859ء میں بہت سے انگریزوں کو یقین ہو گیا کہ اب ہندوستان پر فتح پائی جاچکی ہے۔ انھیں یہ بھی یقین تھا کہ اس ملک پر حکومت صرف تلوار کی بدولت کی جاسکتی ہے۔ اور اس لیے فوج کو دوبارہ منظم کیا جانا اشد ضروری تھا۔ ریکٹس چاہتا تھا کہ ہندوستان بھر میں افریقہ کی فوج رکھی جائے۔ فورجٹ نے مشورہ دیا کہ ہندوستان میں برٹش کالونی بنائی جائے۔ لیکن اس کالونی میں مزید اضافہ انگلستان سے لاکر نہ کیا جائے۔ وہ اس ملک والوں سے شادی کریں اور ایک ایسی نسل پیدا کریں جو خون اور تمدن کی وجہ سے انگریز کی وفادار رہے۔ ہربرٹ ایڈورڈ نے پورے ہندوستان کو عیسائی بنانے کا مشورہ دیا۔ کیونکہ مذہب تبدیل کرنے والوں نے ہی اکیلے حکمراں طبقے کا ساتھ دیا۔ جبکہ ہندو اور مسلمان اس کے خلاف کھڑے ہو گئے۔ انگریز یہ جانتے تھے کہ عوام کو ان کی حکومت سے کوئی پیار نہیں ہے۔ گرچہ انفرادی طور پر بہت سے انگریز اور ہندوستانی ایک دوسرے کے دوست تھے۔ ایک مشورہ یہ بھی دیا گیا کہ ہندوستانیوں کا مکمل طور پر فوج سے انخلا کر دیا جائے

اور صرف یورپین فوج کو یہاں حکومت قائم کرنے کے لیے رکھا جائے۔ گرچہ شروع سے ہی یہ محسوس کیا گیا تھا کہ بہت بڑی انگریزی فوج ہندوستان سے ملنے والی رقم پر بہت بڑا بوجھ ہو گی۔ اور جیسا کہ میڈلے نے کہا تھا کہ بعض حالات میں یہ فوج بھی ناکام ہو جائے گی' اگر ان کی مدد مناسب ہندوستانی فوج کے ذریعہ نہیں کی گئی۔ اس طرح ہندوستانی فوج بچی رہی گرچہ دلی سے انھیں بالکل نکال دیا گیا تھا۔ ان کی تنخواہ اور ترقی کی امید میں یہ فرق مستقل بنا رہا حتیٰ کہ پہلی عالمی جنگ شروع ہو گئی۔ اور ایک بھی ہندوستانی' فوج میں کمیشنڈ رینک حاصل نہ کر سکا۔ انگریز یہ نہیں بھول سکے کہ 1857 میں انھیں کس طرح کی شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اور وہ اس بات کے لیے بالکل تیار تھے کہ مستقبل میں وہ کسی کمزوری کا مظاہرہ نہیں کریں گے۔ یہی کوکا بغاوت اور جنرل ڈائر کے امرتسر میں اندھادھند گولی چلانے کے اسباب کی وضاحت کرتا ہے۔ عورتوں اور بچوں کے قتل کو بھولا نہیں جا سکا تھا۔

تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو پہلے سے ہی مسلح بغاوت کا یقین نہیں تھا اور اس بغاوت کی ناکامی نے ان کے اس خیال کو مزید تقویت دی۔ ان کی ساری امیدیں انگریزوں کی رواداری پر منحصر تھیں۔ اور جب کبھی کوئی اپنے کو ان کا اہل ثابت کرتا تو ہیمپڈن' ملٹن اور برک کے ملک کے لوگ اس کی امیدوں کو پوری کر دیتے۔ لیکن اس کی امید جب پوری نہیں ہوتی تو مایوس ہو جاتا اور اس کی وفاداری متزلزل ہو جاتی۔ بعد میں ایک ایسی نسل پیدا ہوئی جسے اٹلی اور روسی انتشار پسندوں کے تشدد بھرے راستوں پر زیادہ یقین تھا' بہ نسبت پُر امن مظاہروں کے۔ وہ بغاوت کو نہیں بھول سکا تھا۔ دو عالمی جنگوں کے درمیان ہندوستان نے انقلابی فوجی بغاوت کرنے کی اپنی کوشش میں کوئی ڈھیل نہیں دی۔ ہندوستان کی برٹش حکومت کو روز بروز یہ یقین ہوتا گیا کہ قومی ہندوستانی کی سیاسی جنگ میں وہ زیادہ دنوں تک فوج پر منحصر نہیں رہ سکتی۔ غیر مسلح عدم تعاون کی مہاتما گاندھی کی تحریک نے ہندوستانیوں کو ایک نیا فلسفہ دیا اور ہندوستان میں برٹش حکام پر ضرب کاری لگائی۔ انگلینڈ ہندوستان سے باعزت طریقے سے رخصت ہو گیا۔ ہندوستان نے آزادی سے زیادہ حاصل کر لیا' جس کے لیے 1857 میں اس کے سورماؤں نے جنگ کی تھی۔ اسے اب فریڈم اور لبرٹی دونوں حاصل ہو چکی تھی۔

# کتابیات

غدر کی تاریخ کے بارے میں شائع شدہ اور مسودہ جاتی ذرائع اس قدر وسیع ہیں کہ ان کی مکمل کتابیات ترتیب دینا مشکل ہے۔ بہت سے گم شدہ مسودے بھی تلاش کیے جارہے ہیں' جبکہ بہت مختصر کتابیں اب حاصل کرنا ممکن نہیں۔ سرکاری ریکارڈ کا زیادہ تر حصہ اب بھی ہندوستان کے نیشنل آرکائیوز میں مل جاتا ہے۔ اردو اور فارسی میں غدر سے متعلق بہت سے ریکارڈس کی پریس لسٹ شائع ہوچکی ہے۔ میں نے زیادہ تر خارجہ محکمہ کے سیاسی اور خفیہ ریکارڈس 1857 سے 1859 'محکمہ داخلہ کے 1857 سے 1859 'شعبۂ دفاع کی 1857 سے 1859 تک کی کارروائیوں اور فارسی اور اردو کی دستاویزات جو دلی کی شکست کے بعد محل سے دریافت ہوئیں' کا استعمال کیا ہے۔ زیادہ تر فوجی ریکارڈ اب شائع ہوچکے ہیں۔ پنجاب حکومت کے ریکارڈ آفس میں اب بھی مولوی رجب علی کے فارسی اور اردو میں پنجاب کے راجاؤں کو لکھے مراسلے' خاص طور پر دو مسودے جن کا نام نقل مراسلہ جات اور نقل ثقہ جات' نیز غدر سے متعلق کاغذات جنھیں انتظام مفسدان کا نام دیا گیا ہے' کا بھی خاص طور پر استعمال کیا ہے۔ پنجاب کی دستاویزات کے قیمتی حصے چار جلدوں میں ریز (Raynor) کی ایڈیٹر شِپ میں شائع ہوچکے ہیں۔ مغربی بنگال کے ریکارڈ آفس میں بہار کی بغاوت اور رترے کے سکھوں سے متعلق بہت سی دستاویزات موجود ہیں۔ جبکہ مقدموں کی بہت سی دستاویزات آج بہار کے ضلع ریکارڈس میں موجود ہیں جو بہت سے تاریک پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اترپردیش اور مدھیہ پردیش کے آرکائیوز میں بھی غدر سے متعلق بہت سی دستاویزات موجود ہیں 'انڈیا آفس لائبریری (دولت مشترکہ تعلقات دفتر) بھی ایسے تمام مواد کے لیے بہت اہم ذخیرہ ہیں۔ سرکاری ریکارڈ کے علاوہ جن میں سے زیادہ تر ہندوستان میں موجود ہیں 'لائبریری کے محافظ خانے میں نوٹس اور دستاویزوں کی چار جلدیں موجود ہیں جنھیں سر جان کے نے استعمال کیا ہے (Home Misc 724-27)۔ ان جلدوں میں کچھ تو ایسے شائع شدہ بیانات اور تصویریں ہیں جو دوسری جگہوں پر موجود ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ کچھ ایسے نجی کاغذات اور

مراسلے بھی ہیں جو بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ جنرل ہیر سے ڈی او (ڈیمی آفیشیل) کے مراسلوں سے بھی سپاہیوں کے خوف و شبہات پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ سرپی گرانٹ نے جو عرض داشت بھیجی تھی، اس میں تفصیل سے سپاہیوں کی شکایات درج ہیں۔ (ہوم Misc نمبر 725 کی جلد نمبر 2) کاغذات کے درمیان دو خطوط بھی پائے گئے ہیں جو بنی مادھو نے اپنے ایک انگریز دوست کو اپریل 1858 میں لکھے تھے۔ کیدار ناتھ جو دلی میں انگریزوں کا مخبر تھا، اُس کی ڈائری سے ظاہر ہوتا ہے کہ 20 مئی 1857، کو ہی حکیم احسان اللہ، محبوب علی خاں اور ملکہ زینت محل پر شبہ کیا گیا تھا کہ وہ انگریزوں سے ساز باز کر رہے ہیں۔ ان کے علاوہ منشی موہن لال نے غدر کی جو تفصیلات بریگیڈیر چیمبرلین کے لیے لکھیں اور جسے انھوں نے بعد میں سرجان کے (Sir Johan Kaye) کو دے دیا، وہ بھی کافی دلچسپ ہیں۔ ان تفصیلات پر موہن لال کے اپنے دستخط ہیں۔ اور تفصیلات کے ساتھ اس نے جو خط لکھا تھا وہ بھی اس کے ہاتھ کی تحریر ہے۔ موہن لال نے غدر کے جن اسباب پر روشنی ڈالی ہے ان کا مقابلہ سر سید احمد کی تحریروں سے کیا جا سکتا ہے۔ وہ بہادر شاہ کو پہلے کی کسی سازش سے بری کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اس نے کچھ باغیوں کو یہ کہتے سنا جسے بعد میں انھوں نے قبول بھی کیا کہ میرٹھ کے غدر سے پہلے اور قیدیوں کی رہائی سے پہلے انھیں دلی آنے کا کوئی خیال بھی نہیں تھا۔ اس کے علاوہ لارڈ الفنسٹن نے 9 ستمبر 1857 کو جیکب کو جو خط لکھا تھا اس میں نرمی برتتے جانے کی صلاح دی تھی۔ یہ بھی بہت قیمتی اثاثہ ہے۔ اسی طرح مارٹینو کے 5 مئی 1857 اور 20/ اکتوبر 1864 کے خطوط بھی کافی اہم ہیں کیونکہ ان سے عظیم اللہ کی چال پر روشنی پڑتی ہے۔ نیل کی ڈائری اور مراسلوں کے اقتباسات تیسری جلد (ہوم Misc نمبر 725) میں موجود ہیں۔ وہ بہت کھلے لفظوں میں ان طریقوں کی مذمت کرتا ہے جو تعلقداروں کی ملکیت کو فروخت کرنے میں استعمال کی گئیں۔ اپنی ڈائری میں وہ لکھتا ہے کہ ایک یورپی خاندان اور کچھ عورتوں کو کانپور شہر میں بحفاظت پناہ دی گئی تھی۔ کے نے دلی کے محاصرے کی وہ تفصیلات جو اس بارے نے لکھی تھیں، ان میں جمع کر دی ہیں۔ (جلد 3 صفحات 1377 سے 1457) بارے اس میں اس اجتماعی مقدمے کی تفصیل درج کرتا ہے جس میں 20 سے زیادہ شہزادوں کو موت کی سزا سنائی گئی تھی۔ چوتھی جلد (ہوم 727Misc) میں دلی کی شکست کے بعد شائع ہوا وہ پمفلٹ بھی ملتا ہے، جس میں انگریزوں پر ہندوستانی عورتوں کی بے حرمتی کا الزام لگایا گیا ہے۔ ان کے علاوہ دلی کے محاصرے کی تفصیلات جو شہر کوتوال مبارک شاہ نے بغاوت کے دوران لکھی تھیں، اس کا اصل مسودہ بھی شامل ہے۔ یہ تفصیلات، مسٹر ایڈورڈ کی درخواست پر لکھی گئی تھیں، جس نے بعد میں اس کا ترجمہ کیا اور مصنف یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ برٹش مخالف سرگرمیوں کے بارے میں معصوم رہا ہے اور زبردستی باغیوں کا ساتھ دینے کے لیے مجبور کیا گیا۔ اس کے مطابق حکیم

احسان اللہ ہمیشہ برٹش مفاد کے لیے کام کرتے رہے۔ مترجم نے جو نوٹس لکھے ہیں وہ اکثر جگہوں پر غلط ہیں۔

ٹوکوجی راؤ ہولکر کی ڈائری، جواب مدھیہ پردیش حکومت کی تحویل میں ہے اور اندور کے سردار مولے کی سوانح حیات کی ابھی جانچ پرکھ باقی ہے۔ ابھی حال ہی میں ایک ڈائری دریافت ہوئی ہے جسے کہا جاتا ہے کہ عظیم اللہ خاں کی ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں لگتی۔

کلکتہ کی نیشنل لائبریری میں اس زمانے کے اخبارات کے بہت سے قیمتی تراشے موجود ہیں۔

## شائع شدہ ریکارڈ

ذیل میں شائع شدہ ریکارڈ کی جو تفصیلات دی گئی ہیں ان میں سے زیادہ تر کو پارلیمانی کاغذات کے تحت شامل کیا گیا ہے۔

A copy of procedings or communications from the Court of Directors of the East India Company to the Gov. Genl. of India re: proposed Proclamation of Lord Canning and the late despatch from the Secret Committee with reference thereto, 1858.

Coldstream, *see* Muir.

Collection of official narratives of the Mutiny furnished by the magistrates or commissioners of the various localities, 1858.

Conduct after the disaffection and mutiny of the native refgiments. and its consequences. N.D.

CORRESPONDENCE connected with the removal of Mr. W. Tayler from the Commissionship of Patna. Correspondence connected with the arrest and trial of Lootf Ali Khan, a banker in Patna. Mr. Tayler's orders under which the officers at Gaya, Mozufferpore, Barh, Nowada, Sherghotty, and Chumparun abandoned their stations. Remarks by Mr. Samuells on Mr. W. Tayler's "Brief Narrative of Events" connected with his removal. Calcutta, 1858.

CORRESPONDENCE, re. departure of Mr. Hudson, Syed Uckber Allie, and Khirat Allie Khan from England, and their arrest and detension, etc., 1859.

CORRESPONDENCE re. artillery forces in India, from the commencement of the Mutiny, 1859.

CORRESPONDENCE re. dismissal of Mirza Ali Akbar, etc.,1858.

CORRESPONDENCE re. prize property, 1860.

CROMMELIN, CAPT. W.A., Memorandum on the three passages of the River Ganges at Cawnpore during the rainy season of 1857, by the Oude Field Force under command of the late Major-Genl. Sir Henry Havelock. Calcutta, 1858.

Depatch from the Governor-General re. the organisation of H.M. European forces, 1860.

EXTRACTS from the Calcutta Gazette illustrative of the services rendered by the Bengal Yeomanry Cavalry during the Indian Mutiny of 1857 to 1859. Calcutta, (1880 ?).

FORREST, G.W., ed. Selections from the Letters, Despatches and other state papers preserved in the Military Department of the Government of India, 1857-58, 4 Vols., Calcutta, 1893-1912.

GENERAL ORDERS & DESPATCHES, relating to Relief of Garrison of Lucknow, etc., Calcutta (1859?).

Inglis, Maj.-Genl. Sir J. E.W., Reports on the engineering operations during the defence of Lucknow in 1857: being extracts from the report of Maj-Genl. Si" John Inglis, on the defence of the Residency at Lucknow, 1857.

Jacob, Sir G.LE G., Correspondence regarding an omission in a Parliamentary Return and on the claim to the medal, etc., of troops serving under Major-General G.Le Grand Jacob, during the Indian Mutiny and Rebellion. Ventnor, 1865.

Letters of Captain Evans, Deputy Commissioner of Zillah Poorweh, Oude on the state of his district, 1858.

Letter of Captain Evans, Deputy Commissioner of Zillah Poorweh, Oude on the state of his district, 1858.

Lushington, S., Banda and Kirwee Booty. Judgment of the Hon'ble S. Lushington, delivered in the High Court of Admiralty of England, London, 1866.

Minute by the Lt.-Governor of Bengal on the Mutinies as they affected the Lower Provinces under the Government of Bengal. Calcutta, 1858.

Muir, Sir William, Records of the Intelligence Department of the Government of the North-West Provinces of India during the Mutiny of 1857. ed. Coldstream, 2 Vols. Edinburgh, 1902. MUTINY IN INDIA, Narraitive of Events regarding the Munity in India Indies, 1857.

Mutiny In India. Further papers relative to the Mutinies in the East of 1857-58, and the restoration of authority, 2 Vols., Calcutta, 1801.

Mutiny Report- Punjab. Selections from the public correspondence of the Administration for the affairs of the Punjab Vol. IV,

No. 1 containing Punjab Mutinity Report, 1858.

Outram, Sir James, James Outam's Campaign in India, 1857-58, London, 1860.

Papers connected with the reorganization of the Army in India supplementary to the Report of the Army Commission, 1859.

Papers re. the Banda and Kirwee Booty, 1863 and 1864.

Papers re. the mutinies in the East Indies, 1857.

PARLIAMENTARY PAPERS: 1857 Nols. XXIX, XXX; 1857-58 Vols. XLII, XLIV; 1859 Vols. XVIII, XXIII, XXV, XXXVII; 1860 Vol. L; 1863 Vol. XL.

Particulars of Regiments which mutinied in 1857,1859.

Press-List of Mutiny Papers, Calcutta, 1921.

Proceedings of the Trial of Bahadur Shah. Calcutta, 1895.

Punjab Government Records: Mutiny Correspondence, 2 Vols., Lahore, 1911. The Mutiny Reports, 2 Vols. ed. Raynor, A.Lahore 1911.

Reports on Administration of Cis-Sutlej during Mutiny, 1858.

Report of the Committee on the measures resorted to, or which were available, and the lines of communication adopted for reinforcing our army during the revolt in India, 1858.

Return of officers who served in the expedition to Persia and diring Return of officers who served in the expeditionto Persia and during the rebellion in India whose services have been mentioned, 1861.

Return of the name or number of each regiment in India which has mutinied since the 1st day of January 1857, etc. 1859.

Return re. regiments in the native the late Mutiny, 1863.

SEVESTRE, A.A.,A Short and useful compilation from the Calcutta Government Gazette about Fall of Delhi, Calcutta, 1858.

GENERAL WORKS

ADYE, GEN. SIR J., The Defence of Cawnpore, by the troops under orders of Major-Genl. Charles A. Windha. London, 1859.

ADYE, GEN. SIR J., Recollections of a Millitary Life.London,1895.

ANDERSON, CAPT. R.P., A Personal Journal of the Siege of Lucknow. London, 1858.

ANSON MAJ. O.H.S.G., With H.M. 9th Lancers during the India Mutiny. London, 1896.

ATKINS, J.B., Life of Sir W.B. Russell. 2 Vols. London, 1911.

ATKINSON, CAPT. G.F.,The Campaign in India, 1857-58. London 1859.

BALDWIN, REW. J.A., Indian Gup: untold stories of the Indian Mutiny. London, 1897.

BALL, C., History of the Indian Mutiny. 2 Vois. London, N.D.

BARKER, GENL. SIR G.D., Letters from Persia and India, 1857 59, London, 1915.

BARTRUM, MRS. K.M.,A Widow's Reminiscences of the Siege of Lucknow. London, 1858.

BANDOPADHYAYA, DURGADAS, Bidrohe Bangali. Calcutta, 1925. (Bengali)

BANDOPADHYAYA, PANCHKARI, Sipahi Bidroha (Bangali)

BASU, MAJ, B.D.,Rise of Christian Power in India. Calcutta, 2nd ed. 1931.

BELL, MAJ. E., The English in India: letters from Nagpore written in 1857-58. London, 1859.

BHATTACHARYA, MAHASHWETA, Jhansir Rani. Calcutta, 1956. (Bengali)

BHUPAT LAL, Virangana Raso. (Hindi)

BONHAM, COL. J., Oude in 1857. London, 1928.

BOURCHIER, COL, G., Eight Months' Campaign against the Bengal
Sepoy Army, during the Mutiny of 1857. London, 1858.

BROCK, W., A Biographical Sktch of Sir Henry Havelock. London, 1858.

BROWNE, J., Cawnpore and the Nana of Bithoor. Cawnpore, 1890.
BROWNE, J., Lucknow and its Memorials of the Mutiny. Agra, 1886.
BROWNE, J., The Lucknow Guide. Lucknow, 1874.
BURNE, O.T., Clyde and Strathnairn. Oxford, 1891.
CAMPBELL, SIR GEORGE, Memorirs of my Indian Carrer. 2 Vols. London, 1893.
CARDEW, MAJOR F.G., Hodson's Horse, 1857-1922. Edinburgh, 1922.
CASE, MRS. A., Day by Day at Lucknow. London, 1858.
CAVE-BROWNE, J.., The Punjab and Delhi in 1857. 2 Vols. Edinbargh, 1861.
CAVENAGH, SIR ORFEUR, Reminiscences of an Indian Official. London, 1884.
CHALMERS, COL. J., Letters written from India during the Mutiny and Waziri campaigns. Edinburgh, 1904.
CHICK, N.A., Annals of the Indian Rebellion, 1857-58. Calcutta, 1859-60.
CHUNDER, BHOLANAUTH, Travels of a Hindoo. 2 Vols. London, 1869.
CHURCHER, E.J., Some Reminiscences of three-quarters of a Century in India London, 1909.
COLVIN, SIR AUCKLAND, Life of John Russell Colvin. Oxford, 1895.
COOPER, F., The Crisis in the Punjab, from the 10th of May until the Fall of Delhi. London, 1858.
COOPLAND, MRS. R.M., A Lady's Escape from Gwalior and life in the Fort of Agra during the Mutinies of 1857. London, 1859.
COSENS, LT. -COL, F.R., AND WALLACE, C.L., Fatehgarh and the Mutiny. Lucknow, 1933.
CRUMPS, LIEUT. C.W., A Pictorial Record of the Cawnpore Massacre. London, Calcutta, 1858.
CULROSS, J., The Missionary Martyr of Delhi: London, 1860.
CURETON, GEN. SIR C., A Short account of the Services of the General Sir Charlos Cureton, K.C.B., dirung the Indian Mutiny. Colchester, 1893.
DANGERFIELD, G., Bengal Munity. London, 1933.
DANVERS, R.W., Letters from India and China during 1854-58. London, 1898.
DIGBY, W., 1857. A friend in need. 1887. Friendship forgotten. London, 1890.
District Gazetteers.
DIVER, M., Honoria Lawrence. London, 1936.
DODD, G., History of Indian Revolt and of the expeditions to Persia, China and Japan. London, 1860.
DODGION, General views and special points of interest of the city of Lucinow. London, 1860.
DUBERLY, MRS. H.F., Campaigning Experiences in Rajpootana and Central India, during the suppression of the Mutiny, 1857-58. London, 1859.
DUFF, Dr. A., The Indian Rebellion; its causes and results, in a series of letters. 2nd ed. London, 1858.
DUNLOP, R.H.W., Service and Adventure with Khakee Ressalah; or, Meerut

Volunteer Horse during the Mutinies of 1857-58. London, 1858.
DURAND, H.M., The life of Major General Sir Henry Marion Durand. 2 Vols. London, 1883.
EDWARDES & MERIVALE, Life of Sir Henry Lawrence. London, 1875.
EDWARDS, W., Facts and Reflections connected with Indian Rebellion. Liverpool, 1859.
EDWARDS, W., Personal Adventures during the Indian Rebellion in Rohilkhand, Futtehghur, and Oudh. London, 1858.
EWART, Story of a Soldier's Life, 2 Vols. London, 1881.
FAYRER, SIR JOSEPH, Recollections of my Life. Edinburgh, 1900.
FITCHETT, W.H., Tale of the Great Mutiny, London, 1939.
FORBES, A., HAVELOCK. London, 1890.
FORBES-MITCHELL, W., Reminiscences of the Great Mutiny, 1857-59, including the relief, siege, and capture of Lucknow. London, 1897, and 1904.
FORGUES, E.D., La Revolte des Cipayes, pisodes et recits de levie anglo-indienne. Paris, 1861.
FFORJETT, C., Our Real Danger in India. London, 1877.
FORREST, G.W., History of the Indian Mutiny. 3 Vols. Edinburgh and London, 1904-12.
FORREST, G.W., Field Marshal Sir Neville Chamberlain. Edinburgh, 1909.
FRASER, COL. H.E., Our Faithful Ally, the Nizam. London, 1865.
GERMON, COL. H.E., Our Faithful Ally, the Nizam. London, 1865.
GERMON, MRS. R.C., A Diary kept by Mrs. R.C. Germon at Lucknow between the months, May and December, 1857. London, 1870.
GHALIB, ASADULLAH KHAN, Dastambu. Agra, 1858. (Urdu)
GHULAM NABI, Tarikh-i-Jhajjar. (Urdu)
GIBNEY, CAPT. R.D., My Escape from the Mutinies in Oudh. 2 Vols. London, 1858.
GILBERT, H., The story of the Indian Mutiny. London, 1916.
GIMLETE, LT.-COL. G.H.D., A Postscript to the Records of the Indian Mutiny. London, 1927.
GODSE. Majha Pravas, Poona, 1948. (Marathi)
Gloden Commemoration of Indian Mutiny Veterans. London, 1908?
GOLDSMIDT, SIR F.J., James Outram. 2 Vols. London, 1881.
GORDON-ALEXANDER, LIEUT.-COL. W., Recollections of a Highland Subaltern during the Campaigns of the 93rd Hughlanders in India, under Colin Campbell, Lord Clyde. London, 1898.
GOUGH, GENERAL SIR H., Old Memories. Edinburgh, 1897.
GOWRING, T., A Soldier's Experience or A Voice from the Ranks Nottingham, 1902.

GRAHAM, G.F.I., Life and Work of Sir Syed Ahmed Khan, K.C.S.I., Calcutta, 1909.

GRANT, SIR HOPE, Life and Work of Sir Syed Ahmed Khan, K.C.S.I., Calcutta, 1909.

GRANT, GEN. SIR H. AND KNOLLYS, H., Incident: in the Sepoy War, 1857-58. Compiled from the private journals of General Sir H. Grant, K.C.B. Deinburgh, 1873.

GREATHED, H.H., Letters written during the Siege of Delhi. London, 1858.

GREENE, CAPT. D.S., Views in India, taken from Drawings. London, 1859.

GRETION, LT. -COL. G.LE M., Campaigns and History of the Royal Irish Regt. from 1684 to 1902. Edinburgh, 1911.

GREY, COL. L.J.H., Tales of our Grandfather; ed. by F.&C. Grey. London, 1912.

GRIFFITHS, C.J., Siege of Delhi. London 1910.

GROOM, W.T., With Havelock from Allahabad to Lucknow. London, 1894.

GUBBINS, M.R., An account of the Mutinies in Oudh, and of th siege of the Lucknow Residency. London, 1859.

GUPTA, RAJANIKANTA, Sipahi Juddher Itihas. 5 Vols. Calcutta, 1886-1900. (Bengali).

HALLEWAY, Essay on the Indian Muttny, N.D.

HALLS, J.J., Two Months in Arrah in 1857. London, 1860.

HANCOCK, COL. A.G., A Short Account of the Siege of Delhi in 1857. Simla, 1892, 3rd ed. 1899.

HARE, J.C., The Story of two Noble lives, 3 Vols. London, 1895.

HARRIS, MRS, J.A., Lady's Diary of the Siege of Lucknow. London, 1858.

HEDAYET ALI, A few Words relative to the late Mutiny of the Bengal Army and Rebellion in the Bengal Presidency. Calcutta, 1858.

HERFORD, CAPT. I.S.A., Stirring Times under Canvas. London, 1862.

HILTON, E.H., The Tourists Guide to Lucknow, Lucknow, 1916.

History of the Delhi Massacre by a Lady, 1958.

History of the Siege of Delhi, by an Officer who served there, 1861.

HODSON, G.H., Hodson of Hodson's Horse. London, 1889.

HOLLOOWAY, J., Essays on the Indian Mutiny. London, 1864.

HOLMES, T.R., Sir Charles Napier. Cambridge, 1925.

HOPE, The Story of the Indian Mutiny. 1896.

HUTCHINSON, CAPTAIN G., Narrative of the Mutinies in Oude. Calcutta, 1859.

HUXHAM, MRS., A Personal Narrative of the Siege of Lucknow. N.D.

INGLIS, LADY J., Siege of Lucknow, a diary. London, 1892.

INNES, LIEUT, -GEN. J.J. MCLEOD, Lucknow and Oude in the Mutiny. London, 1896.

INNES LIEUT. -GEN, J.J. The Seopoy Revolt: a critical Narrative. London, 1897.

JACOB, SIR G. LE. G., Western India before and during the Mutinies. London, 1872.

JAFAR THANESRI, Tarikh-i-Kalapahi musammi ba Turikh-i-ajib. Ambala, 1885. (Urdu)

JOCELYN, COL. J.R.J., History of Royal and Indian Aritillery in Mutiny of 1857. London, 1915.

JONES, CAPT. O.J., Recollections of a Winter Campaign in India : in 1857-58. London, 1859.

JOYCE, MICHAEL., Ordeal at Lucknow, the Defence of the Residency. London, 1938.

JWALA SAHAI, The Loyal Rajputana. Allahabad, 1902.

KALYAN SINGH, Lakshmi bai-ki-Raso. (Hindi)

KANHAYA LAL, Tarikh-i-Bhagawat0Hind. Lucknow, 1916. (Urdu)

KAVANAGH, T.H., How I won the Victoria Cross. London, 1860.

KAYE, SIR JOHN WILLIAM, A History of the Sepoy was in India, Vol. I 9th ed., London, 1880. Vols. II & III 4th ed. London, 1878.

KAYE, Lives of Indian Officers, 2 Vols. London, 1867.

KEENE, H.G., Fifty-seven: London, 1883.

KEENE, H.G., Keene's Hand-book for visitors, Allahabad, Cawnpore and Lucknow. Calcutta, 1896.

KEELY, Relief of Arrah.

KILLOUGH, LE COMTE H. RUSSELL- 16,000 lieues a travers l'Asieet l'Oceanie; voyage execute pendant less annees 1858-61. Premiere seric-Siberie, Mongolie, Chine, Colonies Australiennes, Deuxieme serie-Nouvelle-Zeande, Indes, Himalaya, etc. Parix' 1866.

KNIGHT, A.E., The Romance of Colonization. India from the Aryan invasion to the great Sepoy Mutiny. London, 1897.

KNOLLYS, H., see Grant, Sir H.

LANDON, P., '1857'. London, 1907.

LANG, J., Wanderings in India and other Sketches of Life in Hindostan. London, 1859.

LAWRENCE, LIEUT. -GEN. SIR G., Reminiscences of forty-three years in India, 2nd ed. London, 1875.

LAWRENCE, SIR H.M., Essays, Millitary and Political. London, 1859.

LAWRENCE, T.B., Six years in the North West, from 1854 to 1860. Being extracts from a private diary, with a glimpse of the rebellion of 1857-58....Part I. Calcutta, 1861 ?

LEATHER Arrah in 1857.

LEE, F.W., The Indian Mutiny up to the Relief of Lucknow. 1918 ?

Letters from Lucknow and Cawnpore. Greenwich (Privately printed), 1858.

LIND AF HAGEBY A., Reisebilder and Skizeen aus Indien und demletzten

indischen Kriege. 1857-59. Leipzig, 1861.
LOCKWOOD, E., The early days of Marlbough College, London, 1893.
LOW, C.R., A Memoir of Lt.-General Sir Granet J. Wolseley. London, 1878.
LOW, MISS U., Fifty years with John Company, London, 1936.
LOWE, Central India during the Rebellion of 1857 and 1858.
MACCREA, R., Tablets in Memorial Church. Cawnpore, 1894.
MACKAY, J., From London to Lucknow: with memoranda of Mutinies. Marches, Flights, Fights and Conversations. 2 Vols. London, 1860.
MACKENZIE, COL. A.R.D., Mutiny Memoirs. Allahabad, 1892.
MACKENZIE, MRS. C., Six years in India. Delhi: The City of the Great Mogul. London, 1857.
MACMUNN, LT.-GENL. SIR G.F., The Indian Mutiny in Perspective. London, 1931.
MAJENDIE, MAJ. V.D., Up among the Pandies: or, a year's service in india. Sondon, 1859.
MALET, H.P., Lost Links in the Indian Mutiny. London, 1867.
MALLESON, COL. G.B., History of the Indian Mutiny. 3 Vols. Vols. I and II, 2nd edition. London, 1878; Vol.III, London, 1880.
MALLESON, COL. G.B., Indian Mutiny of 1857; with portraits and plans, 3rd ed. London, 1906.
MALLESON, LT.-COL. W., The Revolt in Central India. Simla, 1908.
MANGIN, A, ed: La Revolte Au Bengale. Tours, 1862.
MARSHMAN, J.C., Memoirs of Sir Henry Havelock. London, 1860.
MARTIN, C., La Puisance militarire des Anglais dans l'Inde et l'insurrecion des cipayes Paris 1859.
MARTIN, R.MONTGOMERY, The Indian Empire, 3 Vols. London 1858-61.
MARTIN, R.M., La Revolte de l'Inde. Paris, 1860.
MAUDE, LT.-COL. F.C., Memories of the Mutiny: with which is in corporated the personal narration of John Waiter Sherer. 2 Vols. London, 1894.
MAUNSELL, F.R., Siege of Delhi. London, 1912.
MCLEOD, MAJ. -GEN. A., On India. London, 1872.
MEAD, H., The Sepoy Revolt: its Causes and its Consequences. London, 1857.
MECHAM, LIEUT. C.H., Sketches and Indcients of the siege of Lucknow, London, 1858.
MEDLEY, CAPT. J.G., A Year's Campaigning in India from March 1857 to march, 1858. London 1858.
MEEK, REV. R., The Martyr of Allahabad. Memorials of Ensign Arthur Marcus Hill Cheek. London, 1857.
MEHTA, ASHOKA, 1857, The Great Rebellion.
METCALFE, H., Chronicle of Private Henry Metcalfe edited by Sir Francis Tuker. London, 1953.

METCALFE, SIR T., Two native Narratives of the Mutiny at Delhi. Westminster, 1898.

MINTRUN, R.B., From New York to Delhi, by way of Rio de Janeiro, Australia, and China. New York, 1858.

MITRA, CHANDICHARAN, Jhansir Rani. (Bengali)

MONTALEMBERT,, C.F., De Troyen, Le Comte de., Un debat sur l'Inde au Parlement Anglais, Bruxelles, 1858.

MORISON, J.L., Lawrence of Lucknow, 1806-57. London, 1934.

MUKHERJEE, HIRENDRANATH, Indian Struggle for Freedom. Bombay. 1946.

MUKHOPADHYAYA, SAMBU CHANDRA, The Mutinies and People, or, Statements of Native Fidelity exhibited during the outbreak of 1857-58. By a Hindu. Calcutta, 1859. Reprinted 1905.

MUNRO W., Records of Service and Campaigning in many lands. 2 Nols. London, 1887.

MUTER, MRS. D.D., My Recollections of the Sepoy Revolt. London, 1911.

MY GARDEN in the City of Gardens (Lucknow), A memory, with illustrations. London and New York, 1905.

NAPIER, H.K., Field-Marshal Lord Napier of Magdala. London, 1927.

NAPIER, Biographical Memoir of the late Capt. G.W.W.Fulton. Narrative of Indian Revolt from its outbreak to the capture of Lucknow by Sir Colin Campbell. London, 1858.

NARRATIVE of the Indian Mutinies of 1857, Compiled for the Madras Military Male Orphan Asylum. Madras, 1858.

NASH, J.T., Volunteering in India; or an authentic narrative of the military services of the Bengal Yeomanry Cavalry diring the Indian Mutiny and Sepoy War. London, 1893.

NIZAMI, HASAN, Delhi-ki-Jankuni. Delhi, 1925. (Urdu)

NIZAMI, HASAN, Delhi-ki-Saza. Delhi, 1946. (Urdu)

Norgate, Lt. Col. Tr. & Phillott, Lt.-Col. D.C., From Sepoy to Subadar. Calcutta, 1911.

NORMAN F.M. SIR H.W., A Narrative of the Campaign of the Delhi Army. London, 1858. North, Journal of an English Officer in India. London, 1858.

NORTON, J.B., The Rebellion in India: How to prevent another. London, 1857.

OWEN, M., Memorials of Christian Martyrs etc. London, 1859.

PAGET, MRS. L., Camp and Cantonment. London, 1865.

PALMER, India Life, Sketches 1816-66. Mussoorie, 1888.

PEARSON, H., The Hero of Delhi. London, 1939.

PARASNIS, D.B., Maharani Lakshmi Bai Saheb Hyanche Charitra Satara, 1894. (Marathi)

PINCOTT, F., Analytical Index to Sir John W. Kaye's History of the Sepoy War

and Col. G.B. Malleson's History of the Indian Mutiny. London, 1880.
PITT, F.W., Incidents in India and Memories of the Mutiny. London, 1896.
POLEHAMPTON, E. & POLEHAMPTON, T.S., A Memoir; Letters and Diary of the Rev. Henry S. Polehampton, M.A., Chaplain of Lucknow 3rd ed. London, 1859.
PRICHARD, I.T., The Mutinies in Rajpooana. London, 1860.
RADCLIFFE, F.W., *see* Lee.
RAIKES, C., Notes on the Revolt in the North Western Provinces of India. London, 1858.
RAMSAY, Rough Recollections of Millitary Service and Society. London, 1882.
READ, A.E., Narrative of Events at Agra. Agra. 1857.
REES, L.E.R., Personal Narrative of the Siege of Lucknow, from its Commencement to its relief by Sir Colin Campbell. 3rd ed. London, 1858.
REU, B.N., Marwad ka Itihas. 2 Vols. Jodhpur 1940. (Hindi)
Revolt of the Sepoys, 1858.
RICH, CAP. G., The Mutiny in Sialkot. Sialkot, 1924.
ROBERTS, FIELD-MARSHAL EARL, Forty-one years in India. 2 Vols. 1897. London.
ROBERTS, FIELD-MARSHAL EARL, Letters written during the Indian Mutiny. London, 1924.
ROBERTSON, H.D., District Duties during the Revolt in the North West Provinces in India, in 1857. London, 1859.
ROTTION, J.E.W., Chaplain's Narrative of the Siege of Delhi from the Outbreak at Meerut to the Capture of Delhi. London, 1858.
ROWBOTHEM, W.B., Naval Brigade in the Indian Mutiny, 1857-58. London, 1947.
RUGGLES MAJ.-GEN. J., Recollection of a lucknow Veteran, 1855-76. London, 1906.
RUSSELL, SIR W.H., My Diary in India in the year 1858-59. 2 Vols. Lodon, 1860.
SAVARKAR, V.D., The Indian war of Independence 1857. Londoıı, 1909 and Bombay, 1947.
SAYYID AHMED KHAN, RISSALAH Asbab-e-Bhgawat-i-Hind. 1858. English Translation by Graham and Colvin. Benares, 1873. An earlier translation by Lees with a memorandum by R. Temple, Calcutta, 1860.
"SCRUTATOR," English tenure of India 1857.
SEDGWICK, LT.-COL. F.R., Indian Mutiny of 1857. London, 1908.
SEYMOUR, C.C., How I won the Indian Mutiny Medal. Benares, 1888.
SHAD AZIMABADI, Tarikh Suba-i-Bihar. Azimabad, 1893. (Urdu)
SHADWELL, GENERAL., Tairikh Suba-i-Bihar. Azimabad, 1893.(Hindi)

SHEPHERD, W.J., A Personal Narrative of the Outbreak and Massacre at Cawnpore, during the Sepoy Revolt of 1857. Lucknow, 1879, 1886.

SHERER, G.M., Brief Narrative called for by Sir James Outram showing how 73rd Native Infantry was saved etc. Jersey, 1860.

SHERER, J.W., Daily Life during the Indian Mutiny : personal experiences of 1857. London, 1898. *Also see* Maude.

SHERRING, REV. M.A., The Indian Church during the great Rebellion. London, 1859.

SHOWERS, LT.-GENL. C.L., A Missing Chapter of the Indian Mutiny. London, 1888.

SIEVEKING, I.G., A turning point in the Indian Mutiny. London, 1910.

SITARAM, *see* Norgate and Phillott.

SMITH, R.B., Life of Lord Lawrence. 2 Vols. London, 1883.

SOMERVILLE, E.C.E., Wheel-tracks. 1923.

SOPPITT, MRS., Diary of an Officer's wife Reprinted in Fitchett 1912 ed.

STARK, H.A., The Call of the Blood or Anglo-Indians and the Sepoy Mutiny. Rangoon, 1932.

STEWART, COL. C.E., Through Persia in disguise, with Reminiscences of the Indian Mutiny. London, 1911.

STEWART, The Victoria Cross. London, 1916. Story of the Indian Mutiny, 1857-58. Edinburgh (c. 1913).

SWANSTON, W.O., My journal. Uxbridge, 1890.

SWINEY, Historical Records of the 32nd Light Infantry, 1702-1892. London, 1895.

SYLVESTER, Recollections of the Campaign in Malwa and Central India. Bombay, 1860.

TAGORE, JYOTIRINDRANATH, Jhansir Rani. Calcutta, 1900. (Bengali)

TAYLER, W., The Patna Crisis.

TAYLER, W., Thirty-eight years in India. 2 Vols. London, 1882.

TAYLER, W., Veritas Victrix. 1878.

TAYLOR, MISS A.C., Sir Alexander Tayler. 2 Vols. London, 1913.

TAYLOR, P.M., The Story of My Life. Edinburgh. London, 1878.

TEMPLE, SIR R., Men and Event of My Time in India. London, 1882.

THACKERY, COL. SIR E.T., Reminiscences of the Indian Mutiny (1857-58) and Afghanistan. London, 1916.

THACKERAY, COL. SIR E.T., Two Indian Campaigns, in 1857-58. Chatham, 1896.

The Defence of Lucknow by a Staff Officer, 1858.

The Indian Mutiny to the Fall of Delhi. Complied by a former Editor of the "Delhi Gazette." London, 1857.

THOMPSON, E., The other side of the Medal. London, 1930.

THOMSON, CAMP. M., The Personal Adventures and experiences of a Magistrate during the Rise, Progress, and Suppression of the Indian Mutiny. London, 1884.

TRACY, L., Red year. London. 1908.

TREVELYAN. SIF G.D., Cawnpore. London. 1899.

TROTTER, L.F., Life of John Nicholson. London, 1898.

TTOTTER, L.J., The Bayard of India, Edinburgh, 1903.

TUKER, *See* Mitcalfe.

TURNBULL, LIEUT. -COL. J.R., Letters written during the siege of Delhi. Torquay, 1876.

TURNBULL, MAJOR J.R., Sketches of Delhi, 1858.

.TYRRELL, I., From England to the Antipodea and India-1846 to 1902. Madras, 1902.

VALBEZEN, E.DE, The English in India. London, 1883.

VERNEY, E.H., The Shannon's Brigade in India. London, 1862.

VERNEY, G.L., The Devil's Wind. London, 1956.

VIBART, COL. E.,The Sepoy Mutiny as seen by a subaltern, from Delhi to Lucknow. London, 1898.

VIBART, COL. H.M., Richard Baird Smith. Westminster, 1897.

WALKER, T.N., Through the Mutiny. London, 1907.

WALLAGE, C.L., *See* Cosens.

WALSH, REV. J.J., A Memorial of the Fattehgurh Mission and her martyred Missonaries, with some remarks on the Mutiny in India. Philadelphia, 1859.

WHITE, Complete History of the Great Sepoy War.

WILBERFORCE, R.G., An Unrecored Chapter of the Indian Mutiny London, 1894f.

WILLAMS, REV. E.A., The Cruise of the Pearl round the World. With an account of the operations of the Naval Brigade in India. London, 1859.

WLLIAMSON, DR. G., Notes on the Wounded from the Mutiny in India: with a description of the prepartions of gunshot injuries contained in the Museum at Fort Pitt. London, 1859.

WILLIAMSON, J.V., Fallen Heroes of the Indian War: a poem in memory of Havelock, and other Britons gloriously fallen in defence of English supremacy in Asia during the Sepoy Rebellion of 1857-58. 1858.

WILSON, M., History of Behar Indigo Factories: Reminiscences of Behar. Calcutta, 1908.

WILSON, ST. GENL. T.F., Defence of Lucknow : a Diary recording the daily events during the siege of the European Residency, from 31st May to 25th September, 1857; by a Staff Officer. London, 1858.

WOODRUFF, The Men who ruled India. London, 1954.

WOLSELEY, The story of a Soldier's life. London, 1905.
WOOD, FIELD-MARSHAL SIR E., The Revolt in Hindustan, 1857-59. London, 1908.
WYLLY, Neill's Blue Caps. Aldershot, (1924) 1925.
YEOWARD, G., An Episode of the Rebellion and Mutiny in Oudh of 1857 and 1858. Lucknow, 1876.
YOUNG COL. K., Delhi, 1857: Ed. by Genl. Sir Henry Norman & Mrs. Keith Young. London, 1902.
ZAHIR DELHVI, , Dastan-i-Ghadar. Delhi, 1912. Lahore. N.D. (Urdu)
ZAKAULLAH, Tarikh-i-Hind. (Urdu)

## PAMPHLETS

A. K. LORD ELLENBOROUGH'S BLUNDER, The causes of the Mutiny 1857
A few Remarks on the Bengal Army and Furlough Regulations, with a view to their improvement. By a Bombay Officer, Bombay, 1857. A letter from a Layman in Indian on the Policy of the East India Company in matters of Religion, London, 1858.
An Account of the outbreak at Bolarum, London, 1856.
ALEXANDER. REV. T., The Cause of the Indian Mutiny : being an exposition of the second Psalm, etc. London, 1857.
ALLEN, C., A Few Words about the 'Red' pamphlet, By one who has served under the Marquis of Dalhousie. London, 1858.
Basis of the reorganisation of our power in India, by an old resident. 1858.
Brief Narrative of Events connected with the removal of W. Tayler from Patna, 1857.
CAMPBELL, R.J.R., India: its government, misgovernment and future considered. London, 1858.
Cause and Effect: the rebellion in India. By a resident in the North Western Provinces of India. London, 1857.
Causes of the Indian Revolt. By a Hindu of Bengal. Edited by M. Lewin. London, 1857.
CRAWSHAY, G., The Immediate Cause of the Indian Mutiny, as set forth in the official correspondence. London, 1858.
Crisis in India: causes and proposed remedies by a Military officer, 1857.
EVANS, REV. T., Three Lectures on the Revolt of the Bengal Army in 1857. Mussorie, 1899.
FORJETT, C., Reply to Gen. Jacob's Pamphlet, London, 1879.
FROM. LONDON to Calcutta by the Overland Route. Calcutta, 1873.
GARDINER, GEN. SIR R., Cursory View of the present crisis in India together

with the military power of England, respectfully addressed to the members of the House of Commons. London, 1857.

GARDINER, GEN. SIR R., Military Analysis of the remote and proximate causes of the Indian Rebellion, drawn from official papers of the Government of India. London, 1858.

GARDNEAR, GEN. SIR R., Military Analysis of the remote and proximate causes of the Indian Rebellion, drawn from official papers of the Government of India. London, 1858.

GURNEY, REV. J.H., The Moral of a sad story. Four Sermons on the Indian Mutiny, etc. London, 1857.

INDIA: the Revolt and the Home Government. Calcutta, 1857.

MALLESON, COL. G.B., The Mutiny of the Bengal army by one who served under Sir Charles Napier, commonly know as the Red pamphlet. 2 parts. London, 1857-58.

MERCER MAJ.. E.S., A Letter to Rt. Hon. the Earl of Ellenborough (on the causes of the Indian Mutiny of 1857). London, 1861.

NAPIER, R., Report on Engineering Operations at Siege of Lucknow, 1859.

NORMAN, FIELD-MARSHAL SIR H.W., Lecture on the relief of Lucknow. Simla, 1867.

OOLICH, CAPT. L. VON., The Military Mutiny in India: its origin and its results. London, 1858.

SCOT, CAPT. P.G., Personal Narrative of the Escape from Nowgong to Banda and Nagode. Dumfries, 1857.

TAYLER, W., Selection of Letters from distinguished Indian statemen and others, regarding my services during the Rebellion of 1857. First series. London, 1868.

TAYLOR, M., Letters.

The Mutinies. The Government. and the People. By a Hindu. Calcutta, 1858.

The Mutiny in the Bengal Army by a Retired officer. London, 1857.

The Sepoy Rebellion. Reprinted from the London Quarterly Review. London, 1858.

The Thoughts of a Native of Northern India on the Rebellion, its causes and remedies, etc. London, 1858.

TUCKER, H.C., A Glance at the Past and the Future in connection with Indian Revolt. 3rd ed. 1857.

TUCKER, H. C., A Leter to an official concerned in the Eduction of India. London, 1858

URQUHART, D., The Rebeilion in India. The wondrous tale of the greased cartridges. London, 1857.

WATERFIELD, A.J., Children of the Mutiny: a record of those now living who were in India during the Sepoy War, 1857-59. 1935.

WHEELER, E., What shall we do at Delhi ? An Englishman's letter to the Humanitarians. London, 1857.

WHY is the Native Army disaffected ? (A Letter.) By an Old Indian. Calcutta, 1857.

JOURNALS

*Army Quarterly.*

Thornton, Lt.-Col. L.H., Some Lucknow Memories, Vol. 25, 1932

*Asiatic Quarterly Review*

Tyrrell, Lt.-General G.H., The Services of the Madras Native Troops in the suppression of the Mutiny of the Bengal Army. Vol. 26, 1908.

*Assam Review*

Sharma, B., Mutiny in Assam. 1932-33

*Bengal Past and Present.*

Chattopadhyaya, H.P., Mutiny in Bihar, Vols. LXXIV-LXXV, 1955-56.

Datta, K.K., Popular discontent in Bihar on the Eve of the Movement of 1857-59. Vol. LXXIV, 1955.

Krishnalal, Sack of Delhi as witnessed by Ghalib, Vol. LXXIV, 1955.

*Blackword's Magazine.*

Alison, A., Lord Clyde's Campaign in India, October, 1858.

Bagley, F.R., A small Boy in the Indian Mutiny, Vol. 227, 1930.

Indian Mutiny, the last phase, Vol. 191,1912.

MacMunn, Some New Light on the Indian Mutiny, Vol. 224, 1928.

The Bengal Mutiny, September, 1857.

The first Bengal European Fusiliers in the Delhi Campaign, January, 1858.

The first Bengal European Fusiliers after the fall of Delhi, June, 1858.

The First Bengal European Fusiliers at Lucknow, July, 1858.

The Company's Raj. November, 1857.

Oude, May, 1858.

Our Indian Empire, December, 1857.

*Calcutta Review.*

A judicial trial during the Indian Mutinies, Vol. 115, 1902.

Brown, J., Capture of Lucknow, June, 1860.

Brown, J., Havelock's Indian Campaign, March, 1859.

Chattopadyyaya, H.P., The Sepoy Army: its strength, composition and recruitment on the eve of the Mutiny of 1857. May, July-September, 1956.

Cust, R.N., A District during a Rebellion. September, 1858.
Cave-Browne's The Punjab and Delhi in 1858. Vol. 38, 1863. Innes, H.J., The Literature of the Rebellion. March, 1859.
Mackenzie, Mrs. C., English women in the Rebellion, September, 1859.
Macpherson, A.G., Siege of Lucknow, September, 1858.
Malleson, Col. G.B., Havelock, September, 1860.
Moegling, T., The Indian Crisis of 1857. December, 1857.
Outram at Alambaugh. March, 1860.
Sir Hugh Rose, Vol. 41, 1865.
Smith, G., The Poetry of the Rebellion, December, 1858.

*Chambers Journal.*

Tytler, H.C., Through the Sepoy Mutiny and Siege of Delhi Vol. 21, 1931.

*Harper's magazine*

Shackleton, R., A soldier of Delhi. October, 1909.

*Indian Antiquary.*

Crooke, W., Sons of the Mutiny. April and June, 1911.

*Indian Historical Records Commission, Proceedings.*

Banerjea, B.N., The Last days of Nana Sahib. Vol. XII, 1929 bhargava, K.D., A note on Tantia Topi. Vol.XXV, 1948. Two unpublished proclamations of Nana Sahib. Vol. XXV, 1948. Datta, K.K., A contemporary Account of the Indian Mutiny. Datta, K.K., Memorial of an Indigo planter. XXXVIII, 1954. Datta, K.K., Memorial of an Indigo planter. XXXVIII, 1954. Datta, K.K., Some original Documents relating to the Indian Mutiny of 1857-59. Vol. XXX, 1954. Rawlinson, G.G., Two Captures of Gwalior Fort. Vol. XII, 1929.
Samaddar, J.N., Two Forgotten Mutiny Heroes. Vol. X, 1927.
Suri, V.S., Rajab Ali Manuscripts in the Punjab Government Record Office. Vol. XXIX, 1953.
Taimuri, M.H.R., Some unpublished Documents on the death of the Rani of Jhansi and the Mutiny in Central India. Vol. XXIX, 1953.

*Journal of the Bihar Research Society.*

Datta, K.K., Contemporary Account of the Indian Movement of 1857. Vol. XXXVI, 1950.

*Journal of the Punjab Historical Society.*

The Post office in the Mutiny. Vol. IV, 1916.

*Journal of the Royal Engineers.*

Smith, Lt.Col. R.B., Baird Smith Papers during the Indian Mutiny. Vol. 19, 1914.
Thackeray, Col. Sir E.T., A subaltern in the Indian Mutiny. Vol. 44, 1930.

*Journal of the Royal United Seriveces Institution.*

First Shot in 1857. 1916.

Maisey, Lt.-General F.C., Account by an Eye Witness of the taking of the Delhi Palace. Vol. 60, 1930.

Seton, Sir J., Outram's Division Watching Lucknow. Vol. 28, 1885.

*Journal of the Siciety of Army Historical Research.*

Lang, A.M., Diary and Letter. Vol. X, 1951.

*The Listener.*

Dashwood, Untimely Arrival at the Siege ofLucknow. 2nd December, 1936.

*Mariner's Review.*

Fraser, E., The Pearl's Brigade in the Indian Mutny. Vol. XII.

*National Review.*

Wilfred Heely's Letters from India, 1934.

*Nineteenth Centuary.*

Bennett, Mrs. A., Ten Months' Capitivity after the Massacre at Cawnpore. June-July, 1913.

*Patna University Journal.*

Datta, K.K., Some Newly Discoverd Records relating to the Bihar phase of the Indian Movement of 1857-59. Vol. VIII, 1954.

*Royal Historical Society, Transactions.*

Buckles, F.W., Political Theory of the Indian Mutiny. Vol. V, 1922.

Dewar & Garrett, Reply to Mr. F.W. Buckles' Political Theory of the Indian Mutiny. Vol. VII, 1924.

*Transactions of the Geographical Society.*

Roberts, Field-Marshal Earl, Delhi, the Mogul Capital of India and its siege in 1857. Vol. II, 1894.

*United Service Magazine.*

Burton, Indian Military Leaders. Vol. 174, 1916.

Women Warriors in India. Vol. 175,1916.

*Westminster Gazette.*

Mrs. Mariott's Narrative, 27th & 28th May, 1907.

The present book is the result of the work which Dr. Sen has undertaken at the commission of the Government of India. The only directive was that he should write the book from the standpoint of a true historian.

I am glad to find that Dr. Sen had treated the subject objectively and dispassionately. He has sought neither to condemn nor to condone and treated the British and the Indian participants in the struggle in a truly historical perspective .

ABUL KALAM AZAD

1857 (Urdu)
ISBN : 81-230-0958-5
PRICE : Rs. 556.00